قیمت فی جلد مجلد پانچ روپیہ
بلا جلد چار روپیہ

فہرست اسمار شعرا مندرجہ خمخانہ جاوید جلد سوم

ردیف حرف دال

تذکرۂ ہزار داستان

معروف بہ

خمخانۂ جاوید

جلد سوم

خادم

خادم - شیخ خادم علی خان مرحوم خادم از رؤسا قصبہ کیتھل من مضافات سرہند (حال تحصیل ضلع کرنال)، انکے چچا قادر علی خان بسبب ملازمت عماد الملک غازی الدین خان فرخ آباد میں سکونت پذیر ہوئے اور یہ بھی اُنکے ساتھ وہیں جا رہے۔ نواب احمد خان مخاطب بہ ناصر جنگ بنگش نے آپ کو مظفر جنگ کا اتالیق مقرر فرمایا تھا آپ غلام محمد آزاد کے شاگرد تھے اردو فارسی دونوں زبانوں میں مشہور انشا پرداز تھے۔ یہ کلام کا انتخاب ہے ؏

ہر چند ٹالتا ہے تو لیکن تری طرف
آتا ہوں پھر پھرا کے میں قبلہ نما کی طرح

سج دھج میں آن بان میں ترکیب طور میں
بھاتی ہے ہمکو اپنے ہی اس خوش ادا کی طرح

خادم سخن تو اور بھی کہتے ہیں خوب خوب
پر ہم سے سیکھ لے کوئی طرز و ادا کی طرح

عاشق ہوا ہوں اک بتِ بالا بلند پر
صد آفریں ہے میری بھی عالی پسند پر

مجکو کہتے ہو کہ جیسے باہر ہو
آپکے کہنے سے کب باہر ہوں

ہے کہیں یہ بھی رہ و رسم وفاداری کی
دل مرا چھین کے یوں راہ بتائی تو نے

پاس سے میرے جو وہ غرفہ نشیں اُٹھ جائے
طاقت و صبر و قرار و دل و دیں اُٹھ جاوے

تیرے قامت کا اگر شور نہ ہو کیا شک ہے
سارے عالم سے قیامت کا یقیں اُٹھ جاوے

کفِ افسوس ہی پھر بیٹھے ملیں گے تا حشر
ہائے گر یار دمِ بازپسیں اُٹھ جاوے

اُس سے در پردہ کچھ اظہار محبت کا کروں
یہ بغل کا مرے دشمن جو کہیں اُٹھ جاوے

ہم نشیں پاؤں کو ہاتھ اُسکے لگاتا تو ہے تو
ہے غضب اُس کا اگر ہاتھ کہیں اُٹھ جاوے

خادم **خادم**۔ جناب عتیق الرحمٰن خان صاحب تلمیذ جناب قدرت رامپوری۔ باوجود تلاش انکے حالات بہم نہ پہنچ سکے یہ اشعار انکے ہیں۔

کعبہ سے دیر کی لی راہ مسلماں ہوکر
بت کا بندہ ہیں ہوا صاحب ایماں ہوکر

یہ شرارت ہے نئی جان جلانیکے لئے
دل طلب ہم سے کرو غیر کے مہماں ہوکر

خاص **خاص**۔ محمد حیدر خاں خاص پسر الٰہی بخش خاں منشی پلٹن شاہی شاگرد شاہزادہ جمعیت شاہ ماہر۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی میں موجود تھے۔ تذکرہ نویسوں نے یہ اشعار انکے لکھے ہیں۔

تھی جدائی گرچہ پہلو میں مرے وہ یار تھا
ناز تھا۔ آزردگی تھی۔ رنج تھا انکار تھا

ہم نشیں جھیلیں نہ کیا کیا یادِ مژگاں میں تری
گاہ نشتر تھا جگر میں گاہ دل میں خار تھا

دیکھ لے نقشہ اگر اُس عالم تصویر کا
تو تو کیا زاہد دل آوے اُس پہ تیرے پیر کا

مار کر مجکو ہوا تو قتلِ عالم پہ دلیر
حلق تھا میرا فساں قاتل تری شمشیر کا

کیوں تقاضائے خلش ہر دم نفس کے ساتھ ہے
دل میں شاید رہ گیا ہے کوئی پیکان تیر کا

خاطر **خاطر** منشی سید محمد صالح صاحب لکھنوی شاگرد جناب فاخر لکھنوی۔ زمانۂ حال کے شعرا میں سے ہیں۔ ان کا کلام لکھنو کے گلدستوں میں نظر سے گذرا اور یہ چند شعر درج تذکرہ کئے گئے۔

تپش نے اُٹھکے کلیجے کی کیا کام تمام | درد آخر کو مرے درد کا درماں نکلا
مالکِ حور و جناں کہتے تھے سب رضواں کو | جاکے دیکھا تو درِ یار کا درباں نکلا
کچھ خلش کا تو مزہ دل کو ملے ای صیاد | تو رگِ جاں میں مری توڑ دے نشتر اپنا
کر عہد پہ اُس عہد شکن کے نہ بھروسا | جز یاس نہیں نخلِ تمنا میں ثمر اور
کس منہ سے کہا تھا کہ تجھے شاد کرینگے | کس دل سے یہ کہتے تھے کہ بیداد کرینگے

خاطر

خاطر۔ جناب رائے سورج نراین صاحب تلمیذ حضرت ظہیر دہلوی۔ انکے اُستاد نے ان کی دو غزلیں بھیجی تھیں اُن میں سے چند شعر درج ہوئے حالات اور کلام بارہا طلب کئے۔ مگر دستیاب نہیں ہوئے۔

تقصیر نظر کی ہے نہ آئیں جو نظر میں | آنکھوں میں سمائے ہیں وہ بیٹھے ہیں جگر میں
مرغوب ہے اس درجہ انھیں اپنی نمایش | آئینے لگا رکھے ہیں دیوار میں در میں
پڑتے ہیں زباں پر مری چھالے دمِ گفتار | کیا قہر کی گرمی ہے مرے سوزِ جگر میں
دل چھین لیا دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے | کیا سحر ہے اُس شوخ کی دزدیدہ نظر میں

خاطر

خاطر۔ منشی سید ظفر حسن صاحب لکھنوی تلمیذ حضرت جلیل۔ روزگار کی وجہ سے بمبئی میں رہتے ہیں آپکی اکثر غزلیں نظر سے گذریں۔ باوجود کوشش حالات معلوم نہ ہوئے۔ کچھ اشعار منتخب ہوکر ضبطِ تحریر میں آئے۔ اگرچہ مدتِ مشق کچھ زیادہ نہیں ہے مگر موزونیِ طبع کے ساتھ شوخی اور خوش مذاقی انکے کلام سے آشکار ہے مضمون کی طرف بھی خیال کی پرواز ہے۔

چل بسے ہوش و خرد میں ہاتھ ملکر رہگیا | اک چھلاوہ میرے دل میں مجھکو چھلکر رہگیا
ہائے رے جوشِ شباب وہ اُف رے مستانہ روش | جب قدم رکھا کسی کا دل کچل کر رہگیا
جب اُٹھانے کے لیئے میرے چلا دربانِ یار | میں بشکلِ نقشِ پا در پر مچل کر رہ گیا
خوب کی جلوہ نمائی مرحبا اے برقِ طور | ہو گیا بے ہوش کوئی کوئی جل کر رہگیا
یادِ گیسو سے اگر رات کو اُلجھن میں رہا | دن کو بیتاب خیالِ رُخِ روشن میں رہا

نہ مٹا خونِ شہیدانِ ستم کا دھبہ
حشر تک بن کے شفق چرخ کے دامن میں رہا

وقتِ آخر بھی نہ دیدار کی حسرت نکلی
کب وہ آئے ہیں کہ جب دم نہ مرے تن میں رہا

گر یہی دل کی تڑپ ہے تو پسِ مردن بھی
دفن یاروں نے کیا مجکو ہیں مدفن میں رہا؟

اپنے صیاد کے احسان بھلا دوں کیونکر
میں قفس میں بھی رہا یوں کہ نشیمن میں رہا

کبتک رہیگا بادۂ الفت سے سرگراں
للہ اب تو ہوش میں آ کچھ سنبھل کے چل

فقیرِ عشق ہیں پروائے ملک و مال نہیں
ہمارے پاس وہ شے ہے جسے زوال نہیں

تری نگاہ کا ہر بار اٹھ کے جھک جانا
یہ کیا ہے مجھ سے مرے دلکا گر سوال نہیں

کسیکی فتنہ خرامی سے حشر برپا ہے
وہ بدنصیب ہے اب بھی جو پائمال نہیں

ہو مجھ سے وصل کا وعدہ عدو سے ایفا ہو
تمھیں کہو کہ یہ فقرہ نہیں یہ چال نہیں؟

یہ کچھ شوقِ شہادت ہے کہ ہم سر بیچکر اپنا
برائے نذرِ قاتل آج خنجر مول لیتے ہیں

یہاں کے واسطے کیا کیا تزک کیا کیا تکلف ہے
وہاں کیواسطے بھی کچھ تونگر مول لیتے ہیں

خریداری دلوں کی اور نیچی نیچی نظروں سے
پرکھتے کس طرح ہیں اور کیونکر مول لیتے ہیں

وہ ہونگے اور بکجاتے ہیں جو تقدیر کے ہاتھوں
کوئی بیچے تو ہم لے دِل مقدر مول لیتے ہیں

جذبِ الفت پردہ دار روئے زیبا کیوں نہو
میرے دِل کے آئینہ میں تیرا نقشہ کیوں نہو

بیحجابی، وکشش چشمِ تمنا کیوں نہو
جسکو آنکھیں دے خدا محوِ تجلی کیوں نہو

کیا حیا ہے نیچی نظروں کے تصدق جائیے
تم نہ آنکھ اپنی اٹھانا کوئی مرتا کیوں نہ ہو

بات جب بنتی بھی دے برگشتگی تقدیر کی
ہیں بجا بھی کچھ کہوں اُنسے تو بیجا کیوں نہ ہو

آنسو ٹپک پڑے جو مری التجا کے ساتھ
کچھ رحم کھاکے ہوئے وہ مسکرا کے ساتھ

جویائے معرفت ہو تو باطن پہ کر نظر
کبتک چلے گا شیخ یہ تقوی ریا کے ساتھ

قاتل نہ توڑا آس ہماری دمِ اخیر
تیرِ نگاہ بھی کوئی تیغِ ادا کے ساتھ

تقدیر کی ہے بات جو اب بھی نہ ہو قبول
آمین کہہ رہے ہیں وہ میری دعا کے ساتھ

خاک میں مرکے یہ حسرت کے سوا لے نہ گئے
قبر میں ساتھ امیروں کے دوشالے نہ گئے

حشر تک سنگِ لحد بن کے رہے چھاتی پر
صدمے فرقت کے پسِ مرگ بھی ٹالے نہ گئے

ہوش بھی کر گئے ہمراہ نظر کے پرواز
شیخ جی پیکے جو بہکے تو سنبھالے نہ گئے

تشنہ کام و تشنہ لب کو آب جو درکار ہے
دِل کو تیری آرزو اور مجھکو تُو درکار ہے

کچھ نشاں اِس کا ملے گر ہو حقیقت پر نظر
جستجو میں اُسکی اپنی جستجو درکار ہے

خاک تیرے نقشِ پا کی مُنہ پہ مل لیتے ہیں وہ
کوچۂ اُلفت میں جنکو آبرو درکار ہے

تیری وحدت کثرتِ عالم پہ ہے چھائی ہوئی
ایک ہے لیکن زمانے بھر کو تُو درکار ہے

خاطر

خاطر۔ مرزا معظم سلطان خاطر خلف اکبر مرزا محمود شاہ شاکر گورگانی دفتر ٹریفک سپرنٹنڈنٹ۔ ایس پی۔آر۔ دہلی میں کلرک ہیں اور چالیس سال کے قریب عمر ہے۔ تلمذ اپنے والد بزرگوار سے رکھتے ہیں۔ انداز کلام مندرجۂ ذیل اشعار سے نمایاں ہے۔

دیکھنا کچھ ہے ٹھکانا ہیبتِ جلاد کا
خنجرِ فولاد سے باہر ہے دم فولاد کا

جستجو میں عمر کھوئی تب ملا اتنا سُراغ
خود فراموشی بھی اک کلمہ ہے تیری یاد کا

تجھکو دعوےٰ ہے خدائی کا تو آ بسم اللہ
میرا دِل تیرے لیئے عرش معلی ہوگا

مٹ نجائے تربتِ عاشق بسملِ دل کہیں
دیکھکر رکھئے قدم آگے مری جان دیکھکر

مُفت کا دل سُنکے ہی خوبانِ عالم کا ہجوم
کیا گری پڑتی ہے دُنیا جنس ارزاں دیکھکر

ابھی کچھ تھے ابھی کچھ ہیں۔ ابھی بنے ابھی بگڑے
عدو کے سامنے وہ میری حالت بنکے آتے ہیں

عجب انداز ہیں محفل میں اُنکے آنے جانیکے
شرارت بن کے جاتے ہیں قیامت بنکے آتے ہیں

سمجھ لو تم ہمارے ضعف کے آثار جتنے ہیں
حسینوں میں سب اندازِ نزاکت بن کے آتے ہیں

کسنے نکالا انکو گھروں سے جو ہو گئیں
آباد حسرتیں دلِ خانہ خراب میں

دِن بھر جو تمکو دیکھ کے اُٹھتے ہیں ولولے
ارمان وہ بنکے شبکو جگاتے ہیں خواب میں

ہیں دل کے آبلے مرے دریا سے کچھ چھٹے
کسکی بندھی ہوئی یہ ہوا ہے حباب میں

خاک

خاک میر طالب حسین ابن سید میر عظیم علی ساکن قصبۂ چلکانہ ضلع سہارنپور۔ اثنا عشری مذہب کے پیرو تھے اور قدیم وضع اور قطع کے پابندِ مذہب بزرگ تھے۔ چالیس سال تک ریاستِ سرمور ناہن میں معقول عہدوں پر مثل وکالتِ شملہ لاہور اور آخر میں مشیر ریاست بھی رہے اور اپنے آقا کو اپنی حسنِ خدمات سے رضامند رکھا۔ سنہ ۱۳۱۱ھ میں سفرِ حجاز اختیار کیا مگر قسطنطنیہ میں جہاز زیادہ عرصہ رُکے رہنے کے باعث سعادتِ حج سے محروم رہے۔ شعر گوئی کے دلدادہ تھے مگر غزل کم کہتے تھے۔ زیادہ تر طبیعت کا میلان اخلاقی اور نعتیہ مضامین کی جانب تھا۔ ایک طولانی مثنوی "گلِ باغِ ارم" تیس چالیس جزو کی حسنِ آداب و اخلاق میں جو مستورات کے درس کے لائق ہے تصنیف کر کے سنہ ۱۲۹۴ھ میں شائع کی تھی۔ قصائد اور متفرق کلام بھی بہت سا یادگار رہا۔ آخر سنہ ۱۹۰۸ء میں ۶۶ سال کی عمر پا کر ریاستِ ناہن میں انتقال کیا اور وہیں سپردِ خاک کئے گئے۔ کچھ کلام اُن کا بعد انتخاب پیشکش ہے:

از قصائد

نہیں مطلع مہِ نو مدحتِ ابروئے احمد کا
بنا ہے تدِ بسم اللہ اونچا ہو کے سرمد کا

بیانِ خوبیِ تصویر بھی وصفِ مصوّر ہے
جو ہے وصفِ محمد وصف ہے ربِ محمد کا

گنہگاروں کا حصہ ہے ترے دریائے رحمت میں
یہیں تو بڑھ گیا ہے حوصلہ کچھ نیک سے بد کا

خدا کا گھر ہے مولد والدِ شبیر و شبّر کا
جو پیدا ہو خدا کے گھر میں وہ مختار ہے گھر کا

علی کے ہاتھ پر کی جس نے بیعت خلد میں پہنچا
خدا کا ہاتھ پکڑا اُس نے اور بازو پیمبر کا

از غزلیات

پھول کی طرح رہوں بو کی طرح سے جاؤں
بار ہو وے نہ کسی پر مرا مرنا جینا

شعلۂ عشقِ بتاں دل میں چھپا کر رکھا
ہم نے اِس آگ کو چھاتی سے لگا کر رکھا

سوزِ فرقت سے کبھی آہ نہ آئی لب تک
آگ کے ساتھ دھوئیں کو بھی دبا کر رکھا

دیکھ آئینے میں ابرو کو ہے مائل قاتل
آپ تلوار سے اپنی ہوا بسمل قاتل

سر جو کاٹا ہے تو دیر بھی پڑا رہنے دے
نالہ کر سکتا ہے کیا جب نہ ہو سائل قاتل

کہیں کمر میں بل آ نہ جائے یہ بوجھ اُس نے کہاں اُٹھائے
کہ سر پہ زلفوں کا بار بھی ہے گلے میں پھولوں کا ہار بھی ہے

خاکسار

خاکسار میر محمد یار متخلص بہ خاکسار معروف بہ میر کلو شاہ جہان آبادی فیلن صاحب لکھتے ہیں کہ خاکسار عرف کلو سوداؔ اور میر حسن سے پیشتر تھا اور میر تقی کے اشعار کو ایام طفلی میں اصلاح دیتا تھا۔ لیکن میر صاحب اس امر کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اپنے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ جب میں اُسے مشاعرہ میں بُلاتا تھا تو وہ آنے سے جان چُراتا تھا۔ نسّاخ انھیں جانِ جاناں مظہرؒ کا شاگرد بتاتے ہیں۔ بہر حال ایک خوشگو اور عاشق مزاج شاعر تھے۔ قدیم تذکروں میں یہ بھی نظر سے گذرا کہ ان کا لقب "شاہ الشعرا" تھا۔ آپ قدم شریف دہلی کے خادموں میں تھے۔ قلندرانہ وضع رکھتے تھے سوداؔ اور میر کے عہدِ شباب میں کہنہ مشق گنے جاتے تھے۔ زبانِ ریختہ کے بڑے مشاق تھے۔ صاحبِ دیوان اور شاعر خوش بیان تھے۔ علی ابراہیم علی خان مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ اشعار اس عزیز کے میرے ہاتھ نہیں لگے اور یہی باعث ہے کہ تذکروں میں آپ کے اشعاروں کی کمی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

تھا زلیخا کو جو جاں سے مہِ کنعان عزیز
ہمنے بھی تجھ سے تو بے مہر نہ کی جان عزیز

کیوں نہ ہو وہ مصحفِ رو جان سے مجھے ہووے زیاں
کس مسلمان کو نہیں دین اور ایمان عزیز

خاکسار عرش سے بھی دیکھا پرے تیرا مزاج
آپ میں آ ذرا اپنے تئیں پہچان عزیز

تیغِ قاتل سے رہے محروم سب بے تقصیر ہم
روزِ محشر کو اُٹھیں گے اِس لیئے دلگیر ہم

کیا ہے حاصل تجھے ناصح مرے سمجھانے سے
آہ جوں شمع ہے راحت مجھے جل جانے سے

ترے باغباں کا یہ دیکھا سلیقہ
کہ نرگس کو بویا نہ بوئیں یہ آنکھیں

دِل شیفتہ کر کے کیا لیا تُو
اے خانہ خراب کیا کیا تُو

تری زلف سیہ سے اے پیارے
مجھ کو اک سر ہزار سودا ہے

رونے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی
اِس خانماں خراب کو چُپکا خدا کرے

کیا ہے اِس خاکسار کی تقصیر
یہ مگر تم کو پیار کرتا ہے

قیامت بھی ہو گی تو میری بلا سے
مجھے داد خواہی کی طاقت کہاں ہے

خاکسار

خاکسار۔ محمد بلاقی خاکسار تخلص ساکن مراد آباد۔ سپاہی وضع عاشق مزاج۔ وارستہ رنگ شخص تھے اور قدرت اللہ شوق کے دلی دوست اُنہیں کے فیض صحبت سے گاہ گاہ ریختہ بھی کہتے تھے۔ شاہ عالم ثانی کا زمانہ پایا تھا۔ عالم جوانی میں فوت ہوئے یہ چند شعر تذکرۂ شوق سے درج ہوئے ؎

مرے دیدۂ تر بہا کر چلے	دو آبے میں یہ گھر ڈوبا کر چلے
کیا تیغ ابرو سے مجھ کو شہید	یہ کیا خوب جوہر دکھا کر چلے
دکھا ساق سیمیں تو اب شمع کو	رولا کر۔ گلا کر۔ جلا کر چلے

خاموش

خاموش۔ حضرت میاں عبد اللہ شاہ بنّوری چشتی صابری۔ یہ بزرگ نہایت عالی خاندان اور صاحب سجادہ حیدر آباد دکن میں تھے۔ عارفِ باکمال و سالکِ حال و قال مشہور تھے تنہائی پسند۔ اکثر جہاں رہتے تھے خاص اوقات کے سوا کسی کو آنے کی اجازت ہوتی تھی اور شبانہ روز خاموش رہا کرتے۔ کبھی اشد ضرورت ہوتی تو کسی سے بات کر لیتے گویا اسم بامسمّٰی خاموش تھے۔ باوجود ان مشاغلِ صوفیانہ و مجاہدانہ کے فن سخن سے طبیعت مانوس تھی۔ آپ کا کلام بھی عارفانہ اور بالکل تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا اور رسید ہا سادہا ہے ایک بہت مختصر دیوان قریباً پندرہ سال ہوئے چھپا تھا اُس سے کچھ اشعار انتخاب کر کے درج کیے جاتے ہیں۔ سال وفات معلوم نہ ہوا ؎

بھلا ہُوا سو ہُوا۔ یا بُرا ہُوا سو ہُوا	طرف سے یار کی جو کچھ ہوا ہوا سو ہوا
قریب مجھ سے ہو پھر کیوں نظر سے غائب ہے	جمال اپنا تو مجھ کو دکھا ہُوا سو ہُوا
ایک مدت حرم و دیر میں ڈھونڈا تا عق	سیمبر بر میں چھپا تھا مجھے معلوم نہ تھا
بظاہر ملاقات ہوتی ہے مشکل	مگر خواب میں تو ملا کیجیے گا
ہم عشق کے بندے ہیں سو شیخ و برہمن	کیا تم سے کہیں کفر ہے اسلام ہمارا
صحرا میں رہیں باغ میں ہم کا ہیکو جائیں	گلشن میں نہ ہو جب کہ وہ گلفام ہمارا

شام کثرت ہے نمایاں زلفِ روئے یار پر
صبح وحدت کے ہیں جلوے یار کے رخسار پر

چلے بت خانے کو خدا حافظ
زاہدو! اپنا تو خدا حافظ

ستم کو تیرے کب ستم جانتا ہوں
عنایات و لطف و کرم جانتا ہوں

دو عالم کی ہستی ہے موہوم ساری
جسے دیکھتا ہوں عدم جانتا ہوں

نہ مہر و وفا نے جفا چاہتا ہوں
بہر حال تیری رضا چاہتا ہوں

پروانے کیسے جلتے ہیں محفل میں آ کے دیکھ
پوشیدہ عاشقوں سے تو ای شمع رو نہ ہو

دیکھ صورت کو تری ہوش نہیں رہتا ہے
اپنا احوال بھلا کیا میں سناؤں تجکو

خاموش دیکھ ارض و سما میں ہے کسکا نور
سورج میں کون ماہ درخشاں میں کون ہے

شمع پروانے کو جلاتی ہے
شمع کا دل جلا دیا کس نے

روشن ہوئی جب شمع تو پروانے سے بولی
اب تیرے پر و بال جلانے کے دن آئے

تجھے جبکہ ڈھونڈا نظر آپ آیا
عیاں ہوں میں تجھ میں نہاں مجھ میں تو ہے

کرے قتل گر ہمکو انکار ہے کب
وہ تلوار کس کی ہے یہ کس کا گلو ہے۔

خان۔ اشرف خان نام تھا۔ دہلوی الاصل تھے۔ پھر لکھنو چلے گئے۔ جب دہلی میں رہتے تھے تو انجمن مشاعرہ ترتیب دیتے تھے غلام ہمدانی مصحفی سے فن شعر میں مستفید ہوئے۔

رہی کچھ تھوڑی سی وحشت کی ہوا میرے بعد
پہلے میں وحشی ہوا قیس ہوا میرے بعد

تو ابھی سے تو نہ اس بت کی طرفداری کر
مجھ سے ہو جائیو اے دل نہ جدا میرے بعد

اس برائی کے سزاوار ہمیں ہیں پیارے
گالیاں کسکو سناؤ گے بھلا میرے بعد

اے خان غم فراق میں تم زہر کھا مرو
اس کے سوا نہیں کوئی تدبیر دوسری

خان۔ محمد خان نام سعادت یار خان رنگین سے تلمذ تھا۔ نیک طینت خوش اخلاق شخص تھے۔ اوائل اٹھارہ صدی میں دہلی میں موجود تھے۔ یہ دو شعر انکے ملے۔

یاد جس وقت تری آتی ہے
مجھکو ہچکی وہیں لگ جاتی ہے

دنیا میں ہم جو آئے تو کیا کام کر چلے	ناحق ہم اپنے نام کو بدنام کر چلے

خاور

خاور۔ میرزا محمد اکبر خان خاور مرحوم ابن مرزا محمد مہندی سیستانی شاگرد میر وزیر صبا راجہ صاحب والئے پٹیالہ کی سرکار سے سو روپیہ کا مشاہرہ مقرر تھا۔ ۱۲۹۵ھ میں پینتالیس سال کا سن تھا۔ لاہور میں عربی اخبار موسومہ "نفع العظیم" کے اڈیٹر تھے بڑے جید فاضل اور اکثر فنون سے ماہر تھے۔ فارسی اشعار نہایت عمدہ کہتے تھے۔ سیاحی کا بہت شوق تھا اکثر اطراف ہندوستان کی سیر کی تھی۔ فارسی شعر اکثر کہتے تھے چنانچہ کوہ نور وغیرہ لاہور کے پرانے اخباروں میں بسا اوقات ان کا کلام شائع ہوتا رہا اپنے زمانے کے اکثر مشاہیر سے روشناس تھے۔ ۷۰ برس سے زیادہ عمر پائی۔ آپ کا دل و دماغ علمی معلومات کا ذخیرہ تھا اور انھیں اپنے عہد کی زندہ تاریخ سمجھنا چاہیئے۔ مدتوں دہلی لاہور لکھنؤ میں رہے۔ کثیر الاحباب اور بڑے زندہ دل بزرگ تھے۔ انتخاب کلام حسب ذیل ہے:

معمور ہے داغوں سے سراپا مرے دل کا	شکل شجر طور ہے نقشہ مرے دل کا
دیوانگی نے بادشہ وقت بنایا	چلتا ہے پریزادوں میں سکہ مرے دل کا
مر مر کے بسر کرتا ہوں میں زیست کو اپنی	رہ رہ کے ٹپکتا ہے پھپولا مرے دل کا
جیتا ہوں نہ مرتا ہوں عجب کچھ ہی پڑا ہوں	کیا پوچھتا ہی حال ہے کیسا مرے دل کا
ساقی نے دیا جام مئے ناب نہ خاور	پانی کی طرح بہ گیا شیشہ مرے دل کا

جنوں رنگ لائے کچھ ایسا ہمارا	پریزاد دیکھیں تماشا ہمارا
نہ دیکھا ہو جس نے کبھی رقص بسمل	وہ آج آکے دیکھے تماشا ہمارا
بگولا بنی پھرتی ہے خاک اپنی	موئے پر بھی وہ ہی ہے سودا ہمارا
بھری ہی ہوا شاہ خوبان کی دیں میں	ہما بن کے پھرتا ہے سایا ہمارا
لہو پی کے چھوڑیگی وہ زلف مشکیں	گھٹا یہ سکھائے گی دریا ہمارا
نچھوڑینگے ہم کوئے دلبر کو واعظ	یہ جنت ہماری یہ طوبا ہمارا

ہوئے ہو تم اُس بے مروت کے خاور	نہ ہے وہ کسی کا نہ ہوگا ہمارا

خاور

خاور - میرزا نواب بہادر خاور باشندہ خیر آباد ملازم سرکار معتمد نواب بہرام الدولہ بہادر خویش نواب سر سالار جنگ بہادر مرحوم وزیر حیدر آباد دکن - زیادہ حال معلوم نہیں یہ انکا کلام ہے :-

کس نے جھانکا ہے آج محمل سے	صبر جاتا رہا مرے دل سے
جا کے اب در پہ اُسکے بیٹھ رہیں	یہی ٹھیرا ہے مشورہ دل سے
پوچھتے کیا ہے ماجرا وہاں کا	کوئی پھرتا جو کوئے قاتل سے
سیکڑوں روز قتل ہوتے ہیں	شوق ہے اُنکو رقص بسمل سے

خاور

خاور - میرزا احمد سلطان خاور گورگانی ابن میرزا مظفر بخت خلف میرزا شاہرخ بہادر فرزند دوئم حضرت بہادر شاہ ثانی - عمر اب پچاس سال سے متجاوز ہے - یہ خود مرزا فیروز شاہ خلف مرزا سلیم کے داماد ہیں - اور ۱۳۰۶ھ سے ضلع بھونگر ریاست حیدر آباد دکن میں عیفہ دار انعام ہیں تصانیف سے ایک رسالہ موسوم بہ "خورشید خاور" نظر سے گذرا - اُس میں سے چند اشعار انتخاب ہو کر درج تذکرہ کیے جاتے ہیں کلام میں کوئی بات بجز سادگی قابل ذکر نہیں معلوم ہوتی :-

خالق ہے وہی غمزہ و انداز و ادا کا	جسنے کہ بتایا کہ یہیں ڈھنگ آہ و بکا کا
ضرورت دشت پیمائی کی اب جاتی رہی خاور	کہ گھر میں ہی مزا آنے لگا ہمکو بیاباں کا
ہوئی ہے نعش غم دل اور جگر پر مرتسم ایسی	کہ سینے کے قفس میں بند دو طاؤس ہیں گویا
بڑھتا ہے شوق طاعت اصنام اور بھی	لطف ثواب سنتے ہیں جب پارسا سے ہم

اشعار از قصیدہ در مدح اعلیٰحضرت نظام خلد آشیان

ازل ہی میں نہوں جسکو عطا اوصاف سلطانی	وہ ہرگز کر نہیں سکتا جہانداری جہاں بانی
روش وہ سیدھی سادھی ہے ہمارے قدر قدرت کی	سمجھ سکتی ہی جس سے خلق حضرت کی خداوانی

دروغ و مکر دونوں دشمنوں کو زہر لگتے ہیں	تکلف اور بناوٹ کے ہیں بے حد دشمن جانی
بڑھی مشقِ سخاوت رفتہ رفتہ ایسی حضرت کی	کہ کم عمری میں ہیں مشہورِ عالم حاتمِ ثانی
انھیں کے عہد دولت مہد میں ہم جیسے شاد ہیں	کہ حسنہ خاطروں کی دل سے فرماتے ہیں مہمانی

خبر

خبر۔ سید محمد مہدی بلگرامی ولد سید محمد عسکری یہ بزرگ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے پھوپھا اور استاد تھے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کیا کرتے تھے۔ بمقام بھاگل پور سنہ ۱۲۷۶ ہجری میں انتقال کیا یہ اُن کے اشعار ہیں۔

ہنسنے رونے کا بھلا کب سر و ساماں باندھا	تم نے ہی دیدہ و دانستہ یہ طوفاں باندھا
سدِ وصال رنجشِ دلدار ہو گئی	اتنا بڑھا غبار کہ دیوار ہو گئی

خبر

خبر۔ میر نادر حسین صاحب شاگرد مشتاق لکھنوی۔ آپ دورِ موجودہ کے شاعر ہیں حالات باوجود تلاش بہم نہ پہنچے۔ کلام حاضر ہے ؎

اِک نہ اِک دن جان دیدو نگا میں تیرے ہجر میں	گر یُوہیں اے بے وفا تو مجھ سے بیگانہ رہا
جستجو قیس کی منظور تھی ورنہ کیا تھا	دشت میں پھرتی تھی کیوں صاحبِ محمل خاموش
ممنون ہُوا دردِ جگر کا میں شبِ وصل	سینے پہ رکھا ہاتھ ترس کھا کے کسی نے
دیکھا نہ گیا اِس سے مرے سینے کی جانب	خورشید کو اندھا کیا داغِ جگری نے

خبیر

خبیر۔ مولوی غلام محمد خان خٹک خبیر فرخ آبادی۔ حضرت رشک کے تلامذہ سے ہیں انکے بزرگ رؤسا بنگش کی سرکار میں ملازم تھے اور غلام قادر خان انکے والد مہاراجہ سیندھیا کی فوج میں رسالہ دار تھے۔ یہ خود ایک عرصہ تک نواب کلب علیخاں والی رامپور کے مصاحب رہے۔ صاحبِ دیوان و مثنوی "دریائے عشق" و "سخن فیض" ہیں ؎

تشنۂ آبِ اجل جان کے مجکو شاید	آبِ شمشیر پلانے میرا قاتل آیا
سب ہے ماہ پر آگئے ترے مہتاب کا عالم	خورشید میں نقشہ ہے چراغِ سحری کا
سکھتے ہیں تقتلِ عشاق میں آکر سفاک	آئیں تو روبرو وہ کون ہیں مرنیوالے

خرد

خرد۔ نواب فخر الدین خان خرؔد دہلوی۔ خلف نواب شرف الدین محمد خان۔ قلعۂ دہلی میں بہادر شاہ کے زمانے میں بخشی گری کے منصب پر ممتاز تھے۔ نواب مصطفی خان شیفتہ کے گہرے دوست تھے۔ اُنکے کلام کی بھی انھوں نے ہی تدوین کی تھی۔ یہ اُنکے اشعار ہیں۔

ہماری اُن کی محبت آہ ابر و برق کی سی ہے
ہم اُنکو دیکھکر روتے ہیں اور وہ ہمپہ ہنستے ہیں

لبوں پہ جان ہے جلدی پہونچ کہیں ظالم
یہ آرزو ہے کہ دم تیرے رُوبرو نکلے

خرد

خرد۔ حکیم مرزا محمد علی حسین خان خرؔد عرف حکیم انور آغا لکھنوی مقیم حیدر آباد دکن پنشن خوار سرکار تھے ایران بھی گئے تھے۔ انگریزی میں بھی معقول دستگاہ تھی سنہ ۱۲۳۸ھ سال پیدایش تھا۔ دکن میں عرصۂ دراز تک رہے اور مشاعروں کے انعقاد سے شعر و سخن کا چرچا جاری رکھا غزلوں کے علاوہ قصیدہ گوئی میں بھی ملکہ تھا۔ دس یا بارہ برس ہوئے حیدر آباد میں انتقال کیا۔ دکن کی علمی صحبتوں میں اکثر شریک رہتے تھے استعداد علمی بہت اچھی اور پایہ کی تھی اور ہزارہا اشعار اساتذہ کے نوک زبان تھے لکھنؤ کے اساتذہ کی صحبت پائی تھی ؎

قیس لیلیٰ کے سبب عشق میں کامل نکلا
لوگ مجنوں جسے سمجھے تھے وہ عاقل نکلا

سخت جانوں پہ نہ آساں ہوئی مشکل دم نزع
دم بھی مشکل میں جو نکلا تو بمشکل نکلا

خرؔد اُس طفل نے دل لے لیا نادان بنکر
ناسمجھ جسکو سمجھتے تھے وہ عاقل نکلا

خوش سلیقہ دلبرانِ وقت ہیں مطلب کے دوست
یہ عدوئے جان ہیں دشمن سب کے اور پھر سب کے دوست

کچھ تو سمجھا ہوں جو خود جان کے کھویا ہے دل
تجھ میں وہ بات ہے جس بات کا جویا ہے دل

شعر بے عشق کبھی لایق تاثیر نہیں
ساز ہے سوز نہیں۔ شمع ہے تنویر نہیں

جب سے تو جلوہ نما اے بتِ بے پیر نہیں
بزم میں شمع نہیں۔ شمع میں تنویر نہیں

دستِ قدرت نے بنایا ہے مرقع تیرا
جو کہ مانی سے کھنچے وہ تری تصویر نہیں

مثل غالب ہوں خرؔد قائلِ قولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

میں کیا ہوں کون ہوں نہوا عمر بھر یہ علم
خود اپنی معرفت سے رہا اشتباہ میں

حور و قصور جنت و عفو و ثواب و اجر
سب کچھ ہے ایک تیرے کرم کی نگاہ میں

کیونکر چھپے گا نالہ و افغان ہیں درد دل
غماز اب کئی مرے رازِ نہاں کے ہیں
مر کر بھی قید غم سے نہ آزاد ہونگے ہم
اک مرغ جان ہے سات قفس آسماں کے ہیں
افکار دنیوی سے ہیں اہل عدم پرے
یہ سب تعلقات خرد اِس جہاں کے ہیں
نگاہِ رنداں ہی رخنہ افگن ہے رخنہ افگن نگاہِ رنداں
ٹپک رہی ہے شراب خم سے شراب خم سے ٹپک رہی ہے
پس فنا بھی ہی یادِ گیسو ہے یادِ گیسو پس فنا بھی
مہک رہی ہے لحد ہماری لحد ہماری مہک رہی ہے
پسند گوشہ نشینی جو ہمکو زیست میں تھی
رہے مزار میں یوں جیسے اپنے گھر میں رہے
بخیل ایسے گرفتار حرص دنیا ہیں
کہ دم بھی جسم سے نکلے تو مال و زر میں رہے
غیر ہیں سب نہیں اپنوں میں بھی اپنا کوئی
سمجھے اپنا نہیں اپنوں میں بھی اتنا کوئی
اب وہ نوبت ہے کہ دشمن بھی مجھے کہتے ہیں
ہائے کیا تُو نے یہ احوال بنا رکھا ہے
اُس پری نے دم نزع آکے مری بالیں پر
ملک الموت کو دیوانہ بنا رکھا ہے

خرد - صاحبزادہ مرتضیٰ خان خرد رامپوری پہلے آغا غنی سے مشورہ کرتے تھے پھر حضرت جلال سے اصلاح لینے لگے - صاحبزادہ محمد علی حسن خاں کے بیٹے ہیں ۱۲۶۶ھ سال پیدائش ہے - انکا کلام بہت اچھا ہوتا ہے طبیعت میں جدت شوخی مضمون آفرینی سب کچھ ہی اب سنا ہی کہ بسمل تخلص کرلیا ہے - بعض بعض شعر بے مثل کہہ جاتے ہیں -

کلیسا کیا حرم کیا بت کدہ کیا ؟
تمہیں ڈھونڈا ہے گھر گھر ہمنے کیا کیا
نہیں گر خون پہلو میں ہوا دل
شب فرقت پھر آنکھوں سے بہا کیا

خواہشیں ہوتیں مگر کوئی نہ ارماں ہوتا
کاش اس دل کی جگہ سینہ میں پیکاں ہوتا
منہ کو آنچل سے چھپاتے جو تم آکر شب وصل
جلوۂ حسن چراغ تہِ داماں ہوتا

اپنا یہ حال - انکی توجہ ادھر نہیں
سچ ہے کسی کے دلکی کسیکو خبر نہیں
ایماں کی خیر حضرت زاہد منائیے
یہ بُت وہ ہیں کہ جنکو خدا کا بھی ڈر نہیں

میں بھی اللہ سے روز ایک نیا دل مانگوں
آئے دن آپ جو تازہ ستم ایجاد کریں

خلش درد بھی یارب ہے یہاں روز افزوں
ظلم پر ظلم وہ بیداد پہ بیداد کریں

فرقت میں سوا اسکے تمنا مجھے کیا ہو؟
وہ درد اُٹھے دل میں کہ جسکی نہ دوا ہو

خلش کی لذتیں تا قاتل مرے دل سے کوئی پوچھے
مرا دل توڑ کر ناوک ترا جب دم نکلتا ہے

دل و دین کی خرد ہو خیر وہ آتا ہے بن ٹھن کر
کہ جسکی سادگی میں حسن کا عالم نکلتا ہے

کچھ زیادہ تپشِ دل ہو یہاں بھی ہر شب
روز افزوں جو یونہی حسن خدا داد رہے

بیدار ہوں یا خواب کا عالم ہے الٰہی
حیرت ہے شب وصل کہ وہ میرے گھر آئے

جب میں کہتا ہوں حشر آنے دو!
کہتے ہیں وہاں بھی گر خدا نہ سنے

خرد

خرد- خواجہ محمد شفیع الدین انصاری خرد تلمیذ آزاد سہارنپوری دکن میں سکونت ہے اور ڈاکخانہ میں ملازم ہیں۔ داغ صاحب کے ہاں اکثر نشست رہتی تھی ایک مختصر دیوان بھی چھپا ہے۔

اس طرح ہوتے نہ ہم خوار و ذلیل و رسوا
تیرا سودا نہ اگر زلف پریشان ہوتا

رام اُس بت کے ہوئے سینکڑوں مشتاق جمال
کھنچکر قشقہ جو وہ شوخ جبین پر نکلا

حسرت و یاس و الم کا ہے جو بالین پہ ہجوم
آج پُرسا ترے بیمار قضا لیتے ہیں

انتظار شب ہجراں کا کہوں کیا عالم
آنکھ دروازے سے ہر وقت لڑی رہتی ہے

خرد

خرد- منشی ہر دیال پرشاد سر رشتہ دار محکمہ سکرٹریٹ دربار گوالیار دور موجودہ کے کہنے والے ہیں۔ باوجود بار بار دریافت کوئی حالات بہم نہ پہنچے رسالہ ارمغان شاہجہانپور میں عرصہ تک انکی غزلیں شائع ہوتی رہیں اُس میں سے کچھ اشعار منتخب ہو کر درج تذکرہ کئے گئے۔

آنچل سے چھپاتے ہو عبث روئے منور
اس ابر میں یہ چاند نہاں ہو نہیں سکتا

کبتک ترے سودائے محبت کو چھپاؤں
وہ جوش ہے دل میں کہ بیاں ہو نہیں سکتا

ہم تو نگاہِ لطف کے اُمیدوار تھے
آنکھیں پھرائیں یار نے یہ کیا ستم کیا

اتنا کوئی کہدے کہ اُنسے جا کر
بیمار کو دیکھ لو تم آکر

گریباں چاک و دامن پارہ پارہ
بڑی مشکل ہے کس کسمیں رفو ہو

مدتوں ہمنے ترے در پہ جبیں سائی کی	یوں مٹایا خطِ تقدیر کا لکھا کس نے
رات دن آنکھوں میں تصویر پھرا کرتی ہی	تم کو ہمنے نہیں دیکھا ہی تو دیکھا کس نے
وائے قسمت نہ دمِ نزع بھی صورت دیکھی	اُسنے منہ پھیر لیا غیر جو حالت دیکھی
عشق گیسو میں بلا کے غم رہے	اپنے جینے سے بھی برہم ہم رہے
دل پر نگاہ ڈالکے اُسنے لگا دی آگ	شعلہ چراغ طور کا برقِ نظر میں ہے
دن رات خرد کوچۂ جاناں کی کرو سیر	مطلب نہیں کیا حور سے کیا باغ ارم سے
جب سے ہوائے عشق عدو لگ گئی ہمیں	مُرجھا گئے ہیں پھول سے رخسار اور بھی

خرم

خرمؔ۔ پنڈت گلاب رائے مجو متخلص بہ خرمؔ دہلی وطن تھا انکے صاحبزادے پنڈت کنھیالال شگفتہ عرف مجو مبارک تخلص ڈپٹی کلکٹر تھے اب پنشن پاتے ہیں اور پوتے انکے پنڈت سورج نراین منصف ہیں

دل جلا کیا کوئی آتا ہے یہاں	خرمؔ آتی ہے مجھے بوئے کباب
غبارِ خط نہیں خرمؔ ہے گرد اس رشتے تاباں کے	مدور ہے بنی کیا خوب میری آہ کی صورت
یاد آتی ہے مجھے خرمؔ جو وہ زلفِ سیاہ	سانپ پھرتا ہے مری چھاتی پہ لہراتے ہوئے

خرم

خرمؔ۔ منشی سیتل پرشاد خرم حیدرآبادی۔ شاید منصبدار ہیں ظریف اور خوش طبع آدمی ہیں ۶۰۔ ۷۰ برس کے درمیان عمر ہے۔ حیدرآباد کے اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے ہیں ؎

ملیں گے خاک میں ہم خاکسار ہیں ای چرخ	کریگا کیا بھلا دشمن ہمارا تو ہو کر
ہوئی ہے جیسے کہ کن سے نمود ہستی کی	فنا بھی ہوگی یونہیں ایک روز ہو ہو کر
خدا کو روزِ قیامت میں منہ دکھانا ہے	رواں جہاں سے ہو خرمؔ تو سرخرو ہو کر

خستہ

خستہؔ قطب بخش نام۔ سید محمد کرمانی کی اولاد اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مجاور تھے خوش خلق و مہذب نیک اور باوضع بزرگ تھے۔ کبھی کبھی شعر گوئی کی طرف بھی توجہ کرتے تھے اور اس فن میں بھورے خان آشفتہ سے مشورہ کرتے تھے۔ یہ انکے اشعار ہیں ۱۸۴۸ء سے پہلے انتقال کیا ؎

چہرہ اُس بُت نے جو ناگاہ لب بام کیا	روز خورشید درخشاں کا وہیں شام کیا
جسکو پروا ہی نہیں کوئی مرے یا جیوے	دل دیا ہائے میں اُس شوخ کو کیا کام کیا
جور و جفا مت کرو دل کو نہ آزار دو	چاہ کے پیاسوں کو ٹک شربت دیدار دو
ہائے رے نامنصفی خلوت و جلوت کے بیچ	سب کو بلاؤ صنم اِک ہمیں دھتکار دو

خستہ

خستہ عبداللہ خاں عرف میاں جیون۔ اصل وطن کشمیر تھا مگر یہ خود دہلی میں پیدا ہوئے اُنکے والد نواب مجد الدولہ عبداللہ خان بہرام جنگ کے رفقا میں تھے جو شاہ عالم ثانی کے وزیر تھے اور اپنے والد کے بعد یہ بھی اُس منصب پر ممتاز رہے متواضع اور خوش مزاج شخص تھے۔ فن سخن میں حکیم ثناء اللہ خاں فراق کے شاگرد تھے۔ یہ اُن کے اشعار ہیں +

جو کوئی لاوے پیام اُس کے آج آنے کا	میاں میں صدقے ہوں اُسکے زباں ہلانے کا
دست قاتل پہ مرے خوں کی جو تھی رنگینی	ایسی رنگت کا کبھی رنگ حنا نے نہ دیا
سایہ ساں پہنچے تو تھے پاؤں تلک گر پڑ کر	اُسنے دامن کو بھی پر ہاتھ لگانے نہ دیا

جب خاک غریباں پہ تم اِس حال سے آؤ	انصاف کرو کیونکہ نہ برباد ہو کوئی
یہانتک تو ہوئے محو تمہارے کہ جہاں میں	لو ہم سے قسم ہمکو اگر یاد ہو کوئی

خستہ

خستہ حکیم محمد سلیم خاں مرحوم خلف حکیم محمد عظیم خاں دہلوی از خاندان حکیم محمد شریف خاں (حکیم محمود خاں صاحب) منصب دار ریاست جیپور۔ ان کا وطن اصلی دہلی تھا مگر بعد غدر جیپور میں مستقلاً سکونت اختیار کرلی تھی مہاراجہ رام سنگھ والی جیپور کے دربار میں ذی رسوخ اور صاحب اثر تھے آخر عمر میں کونسل عالیہ کے سررشتہ دار بھی ہوگئے تھے۔ علم طب میں ایسا دخل تھا کہ دُور دُور جواب نہ رکھتے تھے انکے مطب اور حذاقت کی آجتک شہرت چلی آتی ہے علاوہ ازیں شاعری میں بھی دستگاہ معقول تھی پندرہ برس ہوئے ۵۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ بڑے خلیق زندہ دل وسیع مشرب بزرگ تھے شعر بہت خوب کہتے تھے۔ گو مشق کم تھی۔ مذاق سخن صاف شستہ اور رنگ میں پختگی پائی جاتی ہے۔ طبیعت معانی خیز پائی تھی۔ علم طب میں ایک

طویل کتاب اپنے آقائے نامدار کی فرمایش سے لکھی تھی جو چھپ بھی گئی ہے حضرت ظہیر انور نواب رونق تسلیم وغیرہ کے جلسوں میں شریک رہتے تھے۔ بہزار دقت و تلاش یہ چند اشعار ملے۔

محشر میں دیکھئے لب معجز نما کے کام / ملتا ہے بات بات پہ دفتر گناہ کا
بے جرم ہوں پہ قتل مرا پر ضرور تھا / کیا کم ہے یہ قصور کہ میں بیقصور تھا
واں تھی حیا سے مانع گفتار خامشی / سمجھے سب اہل بزم کہ اُسکو غرور تھا
غیر سے اُلفت نہیں ضد ہی سہی / تمکو وعدے بھی نہیں ہیں یاد کیا
بر نا امیدئ مطلب کہ یاس مرنے سے / ہر بے کسی کہ دم مرگ انتظار رہا
وفا نہیں تو نہیں مورد جفا ہی سہی / ہزار شکر کہ میں داخل شمار رہا

خستہ

خستہ۔ جناب حیدر علیخان صاحب بہادر فضل اسسٹنٹ کمشنر ملک برہما۔ حالات باوجود تلاش دستیاب نہو سکے صرف ایک غزل ہاتھ آئی اُسکے چند شعر درج ذیل ہیں۔

تجھکو غیر دل سے جو اُلفت ہو گئی / ہے ہمیں بھی تجھ سے نفرت ہو گئی
چین سے گذری شب وصل صنم / صبح ہوتے ہی قیامت ہو گئی
گھر سے نکلا ہے بت محشر خرام / شہر میں برپا قیامت ہو گئی
زلف سلجھانا بھی اُن کو بار ہے / اس قدر نازک طبیعت ہو گئی
کیا سبب ہے اے بُت ظالم تجھے / نام سے خستہ کے نفرت ہو گئی

خستہ

خستہ۔ جناب منشی معشوق اللہ خاں صاحب تلمیذ حضرت داغ۔ باوجود کوشش حالات دستیاب نہوئے۔ چند رسالوں سے کلام منتخب ہو کر نقل ہوا۔

دل لیا نازو ادا نے تیغ نے جان و جگر / خون جو کچھ تھا بدن میں اُسکو پیکاں لیچلا
ہے کدھر جذب محبت کیا ہوا تیرا اثر / دیکھ پہلو سے مرے دل کو وہ پیکاں لیچلا
ساقی نگاہ لطف ہو پھر میگسار پر / لینا خبر کہ نشۂ مے ہے اُتار پر

خستہ

خستہ۔ حکیم غلام حضرت خاں صاحب رامپوری شاگرد امیر مینائی۔ آجکل کے

شاعروں میں ہیں کلکتہ میں عرصہ تک مطب کرکے اب رامپور اپنے وطن چلے آئے ہیں اور ٹھیکہ داری کرتے ہیں۔ فقیر منش اور بہت خلیق اور مہذب شخص ہیں چند غزلیں نظر سے گذریں اُنکا انتخاب درج ذیل ہے۔

اُنکے انکار سے کیا کام تھا تجکو خستہ	اپنا مطلب کسی پہلو سے نکالا ہوتا
جنازہ اُٹھنے دو عاشق کا پھر سنور لینا	ابھی تو رات ہی پچھلے پہر سنور لینا
وفورِ ضعف سے بیمارِ غم کو مشکل ہے	جگر سے ہاتھ اُٹھا کر جگر پہ دھر لینا
دل آپ گرفتار ہو گیسوئے دوتا میں	کمبخت مجھے کیوں لئے جاتا ہی بلا میں
جو مر گیا اُلفت میں ہوا نام اُسیکا	اُبھرا وُہی جو ڈوب گیا بحرِ فنا میں
آرزو میری کوئی کیا نخلِ ماتم کی تھی شاخ	جو کلی کمبخت میں آئی وہ مرجھائی ہوئی
حسرتیں جو دل میں میرے رہ گئیں تھیں وقتِ ذبح	منہ چھپائے حشر میں پھرتی ہیں شرمائی ہوئی
کس بلاکش کی ہے آئے خستہ یہ رحلت کی گھڑی	شامِ غم پھرتی ہے گھر گھر آج گھبرائی ہوئی

خستہ

خستہ۔ منشی جیالال خستہ دہلوی۔ دفتر میونسپل کمیٹی میں ملازم ہیں ۴۰ برس سے زیادہ عمر ہے شعر گوئی کا شوق اور یہ کلام کا نمونہ ہے۔ مذاق ستھرا اور پاکیزہ ہے۔

جوشِ مستی سے جھکی جاتی ہیں آنکھیں اُن کی	خود اُنھیں محو کئے دیتا ہے جوبن اُن کا
دل کوئی مانگا ہوا ہے عاشقِ ناشاد کا	آپ کیوں باقی رکھیں ارماں کوئی بیداد کا
نہ وہاں تجھسے پری پیکر نہ ہیں حوروں کا شیدائی	نہ جنت میرے قابل ہے نہ میں جنت کے قابل ہوں
الٰہی کس طرح گذرے گی مجھسے ہیچکارے کی	نہ ماہر ہوں کسی فن میں نہ عالم ہوں نہ فاضل ہوں
جلتے پائے کوئی ہشیار نہ میخانہ سے	ہو گیا عہدِ صراحی کا یہ پیمانے سے

خسرو

خسرو۔ خسرو اقلیم معانی بادشاہ جہانِ شیریں زبانی خواجہ ابوالحسن عرف امیر خسرو۔ کون ہی جو اس خسروِ معانی سے آگاہ نہیں۔ کیا علمائے کرام کیا صوفیانِ عظام کیا خاص و عوام کس کو حضرت امیر خسرو سے واقفیت نہیں۔ اگرچہ عام طور سے شعرائے فارس کے اعلیٰ طبقہ میں انکا شمار ہوتا ہی مگر اردو زبان کے تاریخ دان جانتے ہیں کہ حضرت امیر خسرو کو خدا نے وہ

قوّتِ ایجاد عطا کی تھی کہ تمام اصنافِ نظم و نثر میں صدہا مضامین تازہ کے گُل کھلا گئے نظم فارسی میں اس درجہ کمال تھا کہ شیریں کلامی اور قبولیت عام کیوجہ سے آپ کا لقب طوطیٔ ہند مشہور ہے۔ فن موسیقی میں مہارتِ تام رکھتے تھے اسی طرح جب ہندی کی طرف التفات کی باگ کو پھیرا سینکڑوں راہیں اسمیں نکال لے گئے خدا کی قدرت پر نظر کرنے والے کہاں ہیں دیکھیں! وہ لڑکا جو اُردوئے شاہی کی بدولت ہندوستان کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا اور اس بھیڑ بھاڑ سلطنتوں کے بناؤ بگاڑ میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔ خدا کے سہارے سے قوت پکڑ کر ایسا ہوا کہ امیر خسروؒ کو مل گیا اور اُنھوں نے اپنی پیرانہ سالی کا سہارا سمجھکر اپنی گود میں لیا اور گویا چھاتی سے لگا کر رکھا۔ ہندی اور عرب و عجم و ترک کے میل جول سے جو زبان اُردوئے شاہی میں پیدا ہو گئی تھی اسوقت سب لوگ اپنے اپنے کام اُس سے لیتے تھے مگر کوئی پہچانتا نہ تھا۔ امیر خسروؒ نے اُسکو روشناس کرنے کا ذمہ لیا اور یہی پہلے شخص ہیں جو اُسکو زبان جان کر کام میں لائے۔ اور فارسی۔ ہندی بھاشا وغیرہ کے ساتھ اس نئی زبان کو پیوند کیا۔ خالق باری اور اُسکے سوا سینکڑوں پہلیاں۔ کہہ مکرنیاں۔ دوسخنے۔ غزلیں۔ غرض کہ بہت کچھ اس رنگ میں کہا جو آجتک لوگوں کی زبانوں پر ہے۔ اسکو یہاں بالتفصیل بیان کرنا ضرور نہیں یہ مختصر عبارت اسلئے لکھدی گئی کہ اجنبی واقف ہوجائیں یعنی اس اُردو زبان میں جس شخص کو سب سے پہلے کسی مستقل تصنیف اور فکر کا موقع مِلا اور شہرت بھی حاصل ہوئی وہ حضرت امیر خسروؒ ہیں ✦

امیر خسروؒ کی ولادت تیرہویں صدی عیسوی کے درمیان مومن آباد ضلع ایٹہ میں ہوئی اِن کے اسلاف چنگیز خاں کے وقت میں ماوراءالنہر سے ہندوستان میں آکر رہے۔ اُنکے والد سیف شمسی ایک بڑے جرّی ولدار سپاہی تھے امیر خسروؒ کی سات برس کی عمر ہوئی تھی کہ وہ کسی معرکے میں کام آئے۔ عماد الملک اِن کے نانا نے جو شاہی مشیر تھے اِنکی پرورش اور تربیت کی ✦

حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے برگزیدہ مرید و خلیفہ تھے بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ
ان کی مریدی ہی سے ان کے پیر کی شہرت اسقدر پھیلی۔ ان کو اپنے پیر و مرشد کے ساتھ جتنی
محبت و خلوص تھا اُسکے متعدد افسانہ مشہور ہیں گویا فنا فی الشیخ تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ
کے انتقال کا ان کو سخت صدمہ ہوا اور اس رنج و غم کی حالت میں ۱۳۲۵ء مطابق ۷۲۵ھ کو
انتقال فرمایا۔ اور اپنے پیر و مرشد کی قبر کے قریب دفن ہوئے۔

یاوری بخت سے سلطان نظام الدین اولیاؒ کا قیام انکے نانا کے مکان پر تھا۔ اس طرح بچپن
میں شرف ملازمت و استفادہ حاصل کیا۔ اُنھوں نے ہدایت کی تھی کہ "بہ طرز صفاہانیاں بگو" خود فارسی
کتب پڑھائیں۔ اس فیضان سے کلام خسرو میں سوز گداز کی شان پیدا کردی اور اس کا اثر یہ ہے کہ
چھ سو صدیاں گذر جانے پر بھی کلام زندہ اور اب تک دلوں میں اپنا اثر جماتے ہوئے ہے۔ خود اپنے
دیوان تحفۃ الاصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ۱۲ برس کی عمر میں شعر و رباعی کہنا شروع کیا۔
علما اور عمائد مجھے دیکھکر استعجاب کرتے تھے ہیں رات دن مطالعہ اور فکر شعر میں غرق رہتا تھا۔
انوری و سنائی اور خاقانی کے کلام سے مجھے بہت دلچسپی رہی اور ہر اُستاد کے رنگ میں کہنے کی
مشق کرتا رہا۔ اسی لیئے میرے مجموعہ میں تمام اساتذہ کی تقلید اور پیروی کے نمونے جابجا موجود
ہیں۔ خواجہ عزیز الدین گلاتی جو عالم متبحر اور بڑے پایہ کے سخنور تھے اُن ایام میں دہلی میں نظر بند
تھے کسب کمال کا ذوق اُنکی خدمت میں لے گیا انھوں نے کلام سنکر کلمات تحسین و آفرین سے
دل بڑھایا اور اکثر نکات و اشارات سخنوری دل نشین کیئے اور مشکل اشعار کو جنکے مطالب کی
باریکی کو ذہن نہ پہنچتا تھا حل کر کے بتایا۔ فطری مناسبت۔ کثرت مطالعہ۔ ولولۂ شوق شفقت
بزرگان نے رفتہ رفتہ درجۂ کمال کو پہنچادیا۔ خوش قسمتی سے شاہزادہ محمد سُلطان ولیعہد سُلطان
غیاث الدین بلبن جیسا مربی مل گیا اور اس وسیلہ سے دربار شاہی میں بار حاصل ہوا۔

اُنکے نانا کی سرکار میں دو سو ترکی اور دو سو ہندی غلاموں کے علاوہ دس ہزار سوار ملازم تھے
یادگار عمر پائی امیر خسروؒ کی ہینس۲ برس کی عمر تھی کہ اُنھوں نے ۱۱۳ برس کی سن میں انتقال کیا۔

کابل سنتر برس عہدہ عرض بیگی سلطنت پر مامور رہے۔ انکی وفات کے بعد خان اعظم قتلو خاں کی سرکار میں جو سلطان بلبن کا بھتیجا تھا ملازمت اختیار کی کئی قصیدے اسکی مدح میں موجود ہیں خود فرماتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد سامانہ جاکر شاہزادہ بغرا خان صوبہ سامانہ پسر سلطان بلبن کا مصاحب ہوا اور وہ مجھ پر از حد مہربان ہو گیا۔ شبانہ روز اپنے ہمراہ رکھتا تھا۔ ۶۷۸ میں طغرل بیگ صوبہ بنگالہ نے بغاوت کی اور سلطان بلبن خود اسکے زیر کرنے کو شاہزادہ بغراخاں کو ساتھ لیکر روانہ ہوا۔ اور انجام کار وہاں کی حکومت بغراخاں کو دیکر دہلی واپس آگیا اسوقت سلطان کی عمر ۷۵ برس کی تھی۔ میں کابل ایک سال کے سفر اور اعزا کی مفارقت سے بیدل اور شکستہ خاطر ہو گیا تھا۔ ملازمت ترک کر کے شاہی لشکر کے ساتھ دہلی واپس آگیا۔ واپسی پر سلطان محمد ولیعہد نے جو میری سخنوری کی شہرت سنکر کچھ مشتاق ہو گیا تھا۔ مجھے ملتان طلب کر لیا۔ مگر چند ہی ماہ میں مغلوں سے مقابلہ میں سلطان محمد مارا گیا۔ اور سلطان شہید کے نام سے ملقب ہوا۔ میں بھی بدشواری قید سے رہائی پاکر دہلی آیا اور مومن پور عرف پٹیالے میں گنگا کنارے چند ماہ والدہ کی خدمت میں حاضر رہا۔ اس عرصہ میں ۶۸۵ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے انتقال کیا اور بغراخاں کا لڑکا کیقباد تخت سلطنت پر بیٹھا کیونکہ بغراخاں نے بنگال سے معاودت منظور نہ کی۔ دربار میں ملک نظام الدین کا دور دورہ تھا۔ میری بھی طلبی ہوئی۔ مگر میں نے حاتم خاں کی ملازمت ترک کرنی مناسب نہ سمجھی۔

حاتم خاں کے ہاں چند ہی دن گذرے تھے کہ ملک نظام الدین نے قضا کی اور میں دربار شاہی میں بادشاہ کی مصاحبت کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوا۔ کیقباد کی اقبالمندی کا پیمانہ جلد ہی لبریز ہو گیا اور مفلوج ہو کر مر گیا۔ شائستہ خاں جو اسکے لڑکے بخشش الدین کا وزیر تھا بالآخر خود مستقل بادشاہ ہو گیا اور فیروز شاہ کے لقب سے ۶۸۸ میں تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ بڑا ذی علم اور امیر خسروؒ کا بڑا قدردان تھا بڑی بات یہ تھی کہ شاعرانہ باریکیوں اور نزاکتوں کو خود بھی خوب سمجھتا تھا۔ اسکے زمانہ میں امیر خسروؒ مالامال ہو گئے۔ انکے بے تکلف دوستوں میں چار

شخص قابل ذکر ہیں۔ برادر حقیقی تاج الدین زاہد۔ برادر علاؤالدین علیشاہ۔ مولانا شہاب الدین قاضی سراج الدین
یہ شرف قبول کم مصنفین کو نصیب ہوا ہے کہ اُنکی تصانیف خواص و عوام میں مقبول ہوں۔ مگر یہ وصف حضرت
امیر خسروؒ کا حصہ ہے اگر انکی بعض تصانیف مقتدر علما کی حرزِ جان ہیں تو بعض ایسی بھی ہیں جو بچہ بچہ کی
وردِ زبان ہیں۔ اسکی نظیر تحفۃ العراقین اور خالق باری۔ جو تبحر اور جامعیت خدا نے آپ کو عطا کیے تھے وہ
ہر ایک کو نصیب نہیں ہوا کرتے۔ خمخانۂ جاوید میں حضرت امیر خسروؒ کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں کسی معافی نامہ
یا تمہیدی مقدمہ کی ضرورت نہیں۔ پہلا دیوان اردو یا ریختہ میں چاہے کسی کا ترتیب دیا گیا ہو لیکن اسمیں
کسیکو شک نہیں ہوسکتا کہ پہلا شعر اردو کا پہلی تصنیف اردو کی امیر خسروؒ کی عالی دماغی کا مولود ہے۔ اُنھوں نے
آیندہ اُردو کے عنصر انتخاب کیے۔ مسالہ جمع کیا۔ ارکان مہیا کیے اور ایک ڈھانچا بنا کے دکھا دیا۔
غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر پہیلیوں اور بیتوں (دوہوں) کی زبان ایسی صاف اُردو ہے کہ متقدمین
ریختہ کی زبان سے صاف ملتی ہے۔ المختصر امیر خسروؒ اگرچہ سب سے اوّل صاحب دیوان اردو کے نہیں مگر
اوّل اُردو شعر کے موزوں کرنے والے ہیں۔ اور اُردو شعر کے موجد ہونے کی حیثیت سے ہم
انھیں خمخانۂ جاوید کا پیر مغاں تسلیم کرتے ہیں۔

کوئی شخص تحقیق اور صحت سے اُن کی تصانیف کی فہرست یا تعداد نہیں بتا سکتا مشہور ہے کہ
شاہانِ مغلیہ کے کتب خانہ میں ایک لاکھ اشعار سے زائد اُنکے موجود تھے مگر اُسپر بھی گاہ گاہ نیا کلام
شائقین تلاش کرکے لے آتے تھے۔ حضرت کا قول تھا کہ ہندوستانی اسقدر طباع ہیں کہ
معمولی کوشش سے ہر ملک کی زبان۔ محاورہ اور نظم و نثر کہنے میں استعداد کامل پیدا کرسکتے
ہیں اور برخلاف اسکے ایران عرب توران کے ہزار ہا آدمی ہندوستان آئے کسیکو ہندوستانی
زبان بولنی یا لکھنی نصیب نہ ہوئی۔

امیر خسروؒ کو باوجود انتہائے کمال اور کثرت مشق اپنے کلام کو جمع اور مرتب کرنے کا بالکل خیال
نہ تھا چنانچہ دیوان عالم صغرسنی یعنے ۱۹ سال کی عمر تک کا کلام جسکا نام تحفۃ الصغر ہے اُن کے بھائی
تاج الدین نے مرتب کیا اور بڑے اصرار سے اُسپر دیباچہ لکھوا کر مکمل کیا اسی طرح علاؤالدین علیشاہ

کاتب کے بیحد اصرار سے دو ہفتہ کی محنت میں وسط الحیٰوۃ اور غرۃ الکمال دیوان دوم وسوم مدون ہوئے اور دیباچوں سے آراستہ کئے گئے۔ اس بیان میں امیر خسرؔو فرماتے ہیں کہ مثنوی قران السعدین بھی شامل کردی گئی تھی۔ گویا مثنوی مذکور ۳۶ برس کی عمر میں امیر خسرؔو نے تالیف فرمائی تھی معمے کی تصنیف میں جو جو ایجادیں اور اختراعیں کی ہیں اُن کا بھی بالتفصیل ذکر دیباچہ میں کردیا خود فخریہ لکھتے ہیں کہ میرے زمانہ سے پیشتر فارسی میں تین دیوان کسی نے ہندوستان میں نہیں لکھے کچھ عربی اشعار بھی اُس میں شامل کئے ہیں۔

امیر خسرؔو صاحب تصانیف کثیر تھے وہ سب فارسی زبان میں ہیں اور مستند سمجھی جاتی ہیں مثل خمسہ امیر خسرؔو بجواب خمسۂ نظامی وقران السعدین۔ ہاں اردو ہندی سے متعلق جو اشعار انکے مشہور ہیں اور جا بجا دیکھے گئے وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ زبان کے ابتدائی زمانہ میں الفاظ کی کمی کے سبب ادائے مطلب میں جو دقت واقع ہوتی ہے اسکو سب جانتے ہیں۔ مجبوراً دوسری زبانوں کے الفاظ بکثرت لانے پڑتے ہیں۔ چنانچہ یہی کیفیت حضرت امیر خسرؔو کے اُس کلام میں موجود ہے جو اردو کہا جاتا ہے۔

ایک غزل میں جو زیادہ مشہور ہے اُنہیں تو یہ التزام کیا ہے کہ ایک مصرع فارسی زبان میں ہے اور دُوسرا اُردو میں۔ اس صنعت کو غالباً اہل فارس صنعتِ ملمع کہتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں	کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ	سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکین	کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر	نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو	سپیت من کے درائے رکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

لال کی پہیلی

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے	دیکھ سفیدی ہوت انگارا گونگے سے بھڑ جائے
بانس کا مندر واہ کا باشا باشے کا وہ کھاجا	سنگ ملے تو سر پر رکھیں واہ کو راؤ را جا

سی سی کرکے نام بتایا تا میں بیٹھا ایک — اُلٹا سید ھا ہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی تو سن لے میرے لال — عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال

ناخن کی پہیلی

بیبیوں کا سر کاٹ لیا — نہ مارا نہ خون کیا

خضر۔ صاحب عالم مرزا خضر سلطان خضر فرزند ارجمند حضرت بہادر شاہ بادشاہ دہلی کا تخلص ہے فن شعر میں نواب اسد اللہ خان غالب المعروف بہ میرزا نوشہ کے شاگرد تھے۔ انکا کلام آشوب غدر میں تلف ہو گیا۔ غدر میں انکی عمر چھبیس سال کی تھی لفٹنٹ ہاڈسن نے جو انہیں مقبرۂ ہمایوں سے شہر لا رہا تھا رستہ میں انکا رتھ ٹھیرا کر متصل موجودہ جیلخانے کے بضرب گولی انکا کام تمام کر دیا مرزا ابوبکر انکے بھتیجے اور مرزا مغل بھائی نے بھی موت میں انکا ساتھ دیا۔ مرزا خضر سلطان صاحب اولاد تھے لڑکا مرزا عثمان اختر کئی برس ہوئے انتقال کر گیا۔ لڑکی میرزا مجاہد الدین شاہی خلف مرزا مغل سے منسوب تھیں۔ شعر اچھا کہتے تھے اور تلاش مضامین والفاظ بھی بُری نہیں تھی نشست الفاظ بھی درست ہے البتہ کہیں کہیں پُرانی زبان برت جاتے ہیں

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر — غیروں پہ کرم ہو یہ ستم بھی نہیں تھوڑا

لہو میں میرے رنگیں ہوں اگر دیکھوں تو دیکھوں — اُنہوں کے ہاتھ پر رنگِ حنا دیکھا تو کیا دیکھا
نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی نہ سن سکتے ہیں کچھ میری — ہمیں اس وقت میں اے بیوفا دیکھا تو کیا دیکھا

جام جمشید کو آئینہ سکندر کو ملا — خضر میں وہ ہوں کہ حصہ میں مرے دل آیا
چھٹوں کس طرح پھندے سے بتوں کے — مجھے کچھ بن نہیں آتی خدایا
کہتے ہو کہ اک روز تجھے قتل کرینگے — پر یہ بھی تو اے شوخ ستمگر نہیں ہوتا
کہتے ہو وہ بھی ہو بس شیر ہی جیسا تو ہے — مجھ سے اِک چھیڑ ہوئی شکوہ عدو کا ہوا
گالی سے کون خوش ہو مگر حسنِ اتفاق — جو تیری خو تھی وہ ہی میرا مدعا ہوا

تری خاکِ کفِ پا سے نہ بدلوں — کوئی شے گر مجھے اکسیر آکر

میکشوں کے مزار پر رکھنا	ہوں جو بھیگے ہوئے شراب کے پھول
ظلم ہم پر ذرا سمجھ کے کرو	اے بتو بندۂ خدا ہیں ہم

خضر

خضر ۔ شیخ محمد یوسف شاگرد جان صاحب نواب کلب حسین خاں نادر کے تذکرہ سے کلام نقل ہوا اغلب کہ یہ خضر اور اسکے بعد جن کا ذکر ہے ایک ہی صاحب ہوں۔

وعدۂ وصل کے دن ہجر میں ٹھیرائے بہت	ایسے نکلے تو حضور آپ نے فرمائے بہت
ہوئے جھنجلا کے یہیں پاؤں پہ گرا جب انکے	ایسے تو کاسۂ سر ہجر میں ٹھکرائے بہت
شہر سے موسم گل میں جو میں وحشی نکلا	ساتھ کوسوں مرے یارانِ وطن آئے بہت
فاتحہ پڑھکے مری قبر پہ غیروں سے کہا	یاد آئیگا یہ جاں باز ہمیں ہائے بہت

خضر

خضر ۔ یا شیخ محمد یوسف مرحوم خلف شیخ کریم بخش مولوی مقیم سہارنپور کے شاگرد اور فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے اور کسی قدر انگریزی کی بھی مہارت تھی سہارنپور میں ایک انگریزی کارخانہ گنے پیلنے کا تھا اس میں عرصۂ دراز تک کلرک رہے۔ مرنج مرنجان۔ شریفانہ مزاج پایا تھا۔ پہلے یوسف تخلص کرتے تھے آخر میں خضر اختیار کیا سنہ [illegible] میں کتب دینیہ کی کما حقہٗ مطالعہ اور مناظرہ کے بعد آبائی مذہب سنت جماعت کو ترک کرکے شیعہ ہوگئے اور آخر عمر تک اس کا اعلان کرتے رہے سنہ [illegible] میں بعمر ۷۳ سال انتقال کیا کچھ اشعار سہارنپور سے ایک عنایت فرما نے بھیجے وہ درج کیے جاتے ہیں ؎

جو عمر وحشت فقات سے ہوا تھا فروگذاشت	وہ زاہدوں کے گنبدِ دستار نے کیا
جوانی میں جو رہبر تھے ہمارے دو سے بیدردم	وہ پیری میں ہمیں اب دور سے رستہ بتاتے ہیں
بلا سے کعبہ پکڑے خضر کوئی رات کہتا تھا	دہائی ہے خداوندا یہ بت ناحق ستاتے ہیں
کس طرح ہم خوش ہوئے وہ جو تجھ سے ستمگر چھوٹے	یہ غضب ہے کہ تلوار سے جوہر چھوٹے
جب چھٹا [illegible] ہم ہیں ہمیں کیا نہیں	شیشہ پہلو سے مرے ہاتھ سے ساغر چھوٹے

خطا

خطا ۔ دہلوی ۔ ان کا حال صرف اتنا معلوم ہے کہ سنہ [illegible] کے قریب جب یہ غزل مرزا قربان علی بیگ

سنا اک نے دہلی کے مشاعرہ میں پڑھی تو انھوں نے اُس پر مصرعے لگائے تھے جو بہت چست اور انکی خوش مذاقی کا کامل ثبوت ہیں۔

یا وہ گو غیر ہیں اپنا تو یہ دستور نہیں
پر ابھی مرگ کا خواہاں دلِ رنجور نہیں

جان دینے میں ہمیں عذر کچھ اے حور نہیں
ترک کیفیت دنیا ہمیں منظور نہیں

ورنہ اک دم میں پہنچتے ہیں عدم دور نہیں

خط لکھا تھا جو پئے تسکین دلِ خانہ خراب
اب نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے نہ آنکھوں میں ہے خواب

اور بھی کر دیا کمبخت کو میں نے بیتاب
کیا کہوں حالتِ بیتابیٔ اُمیدِ جواب

کوئے جاناں میں چلا جاؤں یہ مقدور نہیں

خطا - جناب شفقت حسین صاحب ۱۸۹۹ء میں چھاؤنی سیبری میں موجود تھے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا

وصل میں بھی نہیں ہوتے ہیں مزے یہ حاصل
ایسا پتھر کا جگر لاؤں کہاں سے یارب

لذتیں دردِ جدائی کی جو پاتا ہوں میں
عیش میں شاد نہ ہو درد میں ناشاد نہ ہو

کسی کا فرادا کا جب سے اسنے تیر کھایا ہے
دلِ بسمل نے پہلو میں مرے محشر اُٹھایا ہے

میں تم کو مفت دیڈالوں جو آمادہ ہو لینے پر
یہاں تک اس دلِ آفت طلب نے اب ستایا ہے

خطیر - مولوی سید امراؤ علی ولد میر امیر علی فرخ آبادی ۱۳۲۲ھ میں ۲۵ برس کی عمر تھی اوائل سن تمیز سے شعر کہتے ہیں طب میں بھی دخل ہے۔ فن شعر میں امداد حسین خاں صفیر سے فیض پایا ہے۔ یہ انکا کلام ہے۔

لحد کو غیر کوئے یار میں کب دیکھ سکتے ہیں
مری تربت کے پتھر اُنکی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں

تلاشِ کوچۂ دلبر میں پائے شوق تھکتے ہیں
پتہ ملتا نہیں دیر و حرم میں ہم بھٹکتے ہیں

یہ ظاہر موم ہیں پوچھو نہ اِن کی سختیٔ باطن
یہ آہن دل ہیں جنکے رنگ کُندن سے دمکتے ہیں

آج غصہ میں وہ زنداں کی طرف آتا ہے
بیڑیاں پاؤں میں بولیں تو قیامت ہوگی

اپنے دامن سے مرے مُنہ کو چھپالے قاتل
دیکھ کر دیدۂ مذبوح کو حسرت ہوگی

میرے اخلاط میں ہے زلفِ سیہ کا سودا
جب پریزاد نظر آئیں گے وحشت ہوگی

دَور موقوف نہ ہوگا ستم ایجادوں کا
یار اُٹھ جائے گا پہلو سے جو گھبرا کے خطیر

حشر تک روز زمانے میں قیامت ہوگی
حشر میرے لیے صبحِ شبِ فرقت ہوگی

خلش

خلش منشی جگیشر پرشاد خلفِ منشی کاشی ناتھ متوطن سیرامپور ندرہ ضلع گیا آپ کو مولنا عبدالرؤف عشرت لکھنوی سے تلمذ ہے۔ بابو ٹھاکر پرشاد وکیل کے ہاں بالفعل محرر ہیں کچھ کلام بھیجا تھا اُس میں سے یہ چند شعر منتخب ہوئے۔ ابتدائی شوق ہے۔

کاٹ لے سر خلش کا ای قاتل
شبِ وصل دلبر خفا ہوگیا

آج ہو جائے فیصلہ دل کا
الٰہی یہ کیا ماجرا ہوگیا

ہائے اسپر بھی تجھے رحم نہ آیا افسوس
رقصِ بسمل کی تڑپ اُنکو خلش دکھلاؤ
آہ میں ہو اثر تو پھر کیا ہے

ملگئے خاک میں ہم نقشِ کفِ پا ہوکر
آج بیٹھے ہیں وہ مشتاقِ تماشا ہوکر
آئیں وہ میرے گھر تو پھر کیا ہے

خلش

خلش۔ مولنا خواجہ سید کرامت علی صاحب خلش۔ آپ سید خواجہ نظام الدین علی صاحب گورنمنٹ پلیڈر کے حقیقی بھتیجے اور اولاد حضرت خواجہ اجمیر سے ہیں تیرہ برس کی عمر سے شوق شاعری ہوا۔ ابتدا میں حضرت ابوالحسن صاحب ساکت رامپوری سے غزل میں مشورہ کیا کرتے تھے دو سال بعد صلاح لینی ترک کردی۔ پھر چند غزلیں نواب عبداللہ خاں مطلب کی تحریک سے نواب فصیح الملک مرزا داغ کو دکھائیں کثرتی بدن تھا اور ورزش کا بھی شوق تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں حکیم مومن خان مومن دہلوی کا مقلد ہوں اور انہیں کو اپنا اُستاد مانتا ہوں۔ نواب محمد ابراہیم علی خاں صاحب بہادر والی ٹونک نے آپکے ذہن رسا کی تعریف سُنکر آپ کو زمرۂ استادانِ سخن میں داخل کرلیا ٹونک اور اجمیر میں زیادہ تر قیام رہتا تھا۔ معاملہ بندی۔ روزمرہ شستگی زبان نشست الفاظ آپ کا حصہ تھا۔ شوخ مزاجی طبیعت میں خلقی تھی۔ الغرض مشق سخن قابلِ تعریف تھی ۴۰-۴۲ سال کی عمر میں ۱۹۰۴ء میں انتقال کیا۔ بیس پچیس شاگرد بھی تھے دیوان تیار تھا۔ مگر شائع نہیں ہوا کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو

مجھکو کسی نے بھیجے تھے کل یاسمن کے پھول
تلووں سے اسنے مل دیئے مارے جلن کے پھول

پھولوں میں آپ آئے ہیں میرے پہن کے پھول
مرجھائے بھی نہیں ہیں ابھی تو کفن کے پھول

دلمیں کھٹک رہی ہے خلش دوستوں کی یاد
کانٹے سے بنے ہوئے ہیں سفر میں وطن کے پھول

کیا گھٹاؤں سے دھواں دھار ہیں ساون بھادوں
روز روشن ہیں شبِ تار ہیں ساون بھادوں

قتل کرتے مجھے بے یار ہیں ساون بھادوں
کوئی جلتی ہوئی تلوار ہیں ساون بھادوں

مینہ برستا ہے ترستے ہیں وہ گھر جانے کو
اب تو کچھ میرے طرفدار ہیں ساون بھادوں

ابر دوڑا ہوا جاتا ہے سوئے میخانہ
کھل گیا صاف کہ میخوار ہیں ساون بھادوں

ابرِ نیساں ہے خلش دستِ گہر بار خلیل
بخشش و فیض میں سرکار ہیں ساون بھادوں

ہم بزم میں صرف انکی نظر دیکھ رہے ہیں
کچھ اس سے نہیں بحث کدھر دیکھ رہے ہیں

اب بزم میں انکو بھی نہیں دیکھتا کوئی
آپس میں سب اک اک کی نظر دیکھ رہے ہیں

بیٹھے ہیں مرے پاس مگر دل میں خلش ہے
گھبرائے ہوئے جانبِ در دیکھ رہے ہیں

قصور اس میں تمہارا کچھ نہیں ہے بے خطا تم ہو
نہ یوں محوِ وفا میں ہوں نہ سرگرمِ جفا تم ہو

مجھے اب کچھ نہیں معلوم ہیں کیا اور کیا تم ہو
تمہارا مدعا میں ہوں کہ میرا مدعا تم ہو

برا ہوتا ہے ہر اک بات کا حد سے گذر جانا
نہ اتنا باوفا میں ہوں نہ اتنے بے وفا تم ہو

کھڑے تھے میکدے میں منہ چھپائے حضرت زاہد
بڑی مشکل سے پہچانا تمھیں مردِ خدا تم ہو

وہ رشکِ غیر پر بولے طبیعت اپنی اپنی ہے
کسی پر مبتلا ہم ہیں کسی پر مبتلا تم ہو

برابر کی محبت میں یہی تو حال ہوتا ہے
کبھی تم سے خفا ہم ہیں کبھی ہم سے خفا تم ہو

شبِ وعدہ پڑیگی بات پھر آخر کشاکش میں
ہم اپنی وضع کے پابند پابندِ حیا تم ہو

تعلق اٹھ گیا جس روز سے دونوں شے مر میں ہیں
نہ تم سے ہمنوا ہم ہیں نہ ہم سے ہمنوا تم ہو

وعدہ کر جاؤ مرے دل کے بہلنے کے لیئے
سیکڑوں حیلے ہیں پھر وقت پہ ٹلنے کے لیئے

تعلق ہی نہیں باقی تو پھر میری شکایت کیوں
تمہیں مطلب نہیں مجھ سے تو پھر میرا گلہ کیوں ہے

وہ میرے قتل پر تیار خوش کرنیکو دشمن کے
اُسے یہ غم کہ اُنکے ہاتھ سے اسکی قضا کیوں ہے

خلش ۔ فردوس علی خلش عزیز و شاگرد عبد الحکیم بسمل مندرجہ ذیل اشعار ایام نابالغی کے ہیں ایام غدر میں زندہ تھے

اُس سے دل مل کے دلا دیکھ تو کیا کیا ہوا
ہم کو کیا تیرے ہی کچھ حق میں یہ اچھا نہ ہوا

کچھ اثر تھا نہ آہ سے مقصود
یہ بھی اک طبع آزمائی تھی

ضعف سے لب پہ تھم گئے نالے
ورنہ آفت فلک پہ آئی تھی

کیا مزے سے خلش گذرتی تھی
جبکہ اُس بُت سے آشنائی تھی

خلش ۔ منشی نصیر الدین کاتب خلش باشندہ میرٹھ ۔ شاگرد منشی احمد حسن شوکت چند شعر انکی طبع زاد درج کئے جاتے ہیں

نصیحت کا اثر واعظ تری مجھ رند پر کیا ہو
جو دختِ رز پہ مرتا ہو وہ کیا حوروں پہ شیدا ہو

لبِ زخمِ جگر بوسہ اگر لیں تیغِ بُرّاں کا
ہمارے خوں بہانے کا اُنہیں خاصا بہانا ہو

گلوئے تشنہ کامانِ شہادت کام آجائے
اگر خونِ تمنّا کا لبِ خنجر کو چسکا ہو

خلش ۔ منشی محمد حسام الدین سب انسپکٹر پولیس حسن گنج وانا ؤ ارمغان ۹۴ سے یہ کلام منتخب ہوا۔ احسان شاہجہاں پوری کے تلامذہ میں ہیں۔

جسنے دیکھا گر پڑا مثلِ کلیم
جلوۂ رُخ اُن کا برقِ طور تھا

منہ کی کھائی حشر کے دن شیخ نے
زہد و طاعت پر بہت مغرور تھا

دل وہ اچھا جس میں تیرا غم رہے
دم وہ اچھا جس کا تو ہمدم رہے

وصل کی شب میں حیا آنے نپائے
شوخ چنچی کا وہی عالم رہے

اے خلش دل میں کھٹکنے کے لئے
یادِ مژگاں بن کے خارِ غم رہے

خلق ۔ میر حسن علی خلق خلف الرشید میر حسن صاحب بدر منیر مقیم فیض آباد لکھنوٴ اپنے والد مرحوم کے شاگرد و صاحبِ دیوان تھے۔ ترتیب تذکرۂ شوق کے زمانے میں وجیہ و خوبرو جوان تھے خاندانی رسم کے بموجب مرثیہ کہتے تھے۔ میر خلیق انکے حقیقی بھائی تھے ۱۸۰۳ء کے بعد سو برس کی عمر میں وفات پائی ؎

عجب عالم میں بے ہوشی کے وہ مجھکو نظر آیا
کہ اتنا بھی نہ آیا ہوش جو پوچھوں کدھر آیا

بیقراری میں کٹی رات تو یاں اپنے تئیں
چین سے زلف میں دل کیونکہ رہا ہوویگا

دل لگاتے تو لگایا پہ نہ تھا کچھ معلوم
جی پہ کیا گذریگی اور جان پہ کیا ہوویگا

خلق

خلق - منشی محمد مستجاب خان نام اصل وطن انکا قاسم گنج ضلع فرخ آباد ہے۔ عرصہ سے بصیغہ ملازمت سرکار نظام حیدر آباد دکن باقاعدہ فوج میں ملازم ہیں پہلے اضلاع دکن میں متعین تھے اب چند سال سے خاص بلدے میں مامور ہیں قریب ۴۵ سال کے عمر ہے خلیق اور نیک آدمی ہیں۔ فن سخن میں حضرت داغ دہلوی مرحوم کے شاگرد ہیں اکثر اپنے استاد مرحوم کی خدمت میں حاضر رہے شعر خاصا کہتے ہیں۔ اپنے استاد کے رنگ کی اچھی طرح تقلید کرتے ہیں مشاقی اعلیٰ درجے کی ہے زبان کی صفائی سلاست اور ستھراپن انکے کلام میں پایا جاتا ہے۔ یہ انکے کلام کا انتخاب ہے۔

اسکی نظروں سے وہ بچتا بلبلِ ناشاد کا
آڑ میں سے تاکنا چھپ چھپ کے وہ صیاد کا

صبر بھی اور صبر مجھسے عاشقِ ناشاد کا
ظلم بھی اور ظلم پھر تجھ سے ستم ایجاد کا

عیش زیبا ہے تمھیں غم زیب دیتا ہے اسے
وہ تمھارا ہے تو یہ حصہ دلِ ناشاد کا

عاشقی کا لطف جب ہے دل بھی ہوں عاشق کے دو
ایک طالب وصل کا ہو ایک ہو بیداد کا

لو رہا وہ امتحاں میں سخت جاں ثابت قدم
لو وہ آخر ہو گیا دم خنجرِ فولاد کا

خلق کا اب پاؤں قابو میں دل کہنے میں ہے
ہاتھ لینا میرے مولا وقت ہے امداد کا

کاکل میں ہے گیسو میں ہے مٹھی میں تری ہے
دنیا میں مرے دل کا ٹھکانا ہی نہیں اور

مژگاں تری سفاک نگاہیں تری خونریز
پھر اسپہ نمک پاش یہ حسنِ نمکیں اور

اقرار میں اک گھات تو انکار میں اک بات
دیتی ہے مزا آپ کی ہاں اور نہیں اور

جاتے ہیں مسافر جو شب و روز عدم کو
بستی کوئی بستی تو نہ ہو زیر زمیں اور

خزاں رہی تو تڑپتے تھے بیقرار سے ہم
بہار آئی تو شوریدہ ہیں بہار سے ہم

وہ دل گیا وہ اڑے ہوش وہ گئے اوسان
سنبھالنا کہ چلے اپنے اختیار سے ہم

یہ چشم مست کی اُلفت نے کر دیا بیخود — کہ خود بخود نظر آتے ہیں بادہ خوار سے ہم
عاشق کی زندگی ہے سہارے کی زندگی — اُمید چاہیئے دلِ اُمید وار میں
کیا بات ہے تری نگہ ناز واہ واہ — عاشق کا کام کر ہی دیا ایک وار میں

ڈھونڈے کوئی بے مثل اگر حسنِ بشر میں — وہ کھُبتے ہیں آنکھوں میں وہ چھُبتے ہیں نظر میں
اُس مہرِ منور کی قیامت ہے تجلی — بجلی کی طرح کوندتی پھرتی ہے نظر میں
نہیں پروا کسیکی کیا کہ تم ایسے ہو خوش قسمت — وہی ملتا ہے جو مانگو وہی ہوتا ہے جو چاہو

بے خبر ہے حُسن کے انداز سے — آنکھ ہے اُس کی نشیلی ناز سے

قیامت ہو ترے کوچہ میں تیری دلربائی سے — بپا ہے شور محشر کُٹنے والوں کی دہائی سے
رُخِ روشن ہے آئینہ قدِ موزوں ہی بالا — زمانہ محوِ حیرت ہے کسی کی خود نمائی سے

سُرخ ڈوروں میں نگاہِ یار ہے — خون میں لتھڑی ہوئی تلوار ہے
اور کس کا میرے دل پر وار ہے — آپ ہیں یا آپ کی تلوار ہے
نگہ ناز ہے تلوار ادا قاتل ہے — اب بھی مشکل نہ ہو آساں تو بڑی مشکل ہے

خلیق

خلیق - مرزا طہور [?] علی ولد مرزا ہوشدار جو مشہور مرثیہ خوان اور ماہرِ فنِ موسیقی تھے اُردو شعر بھی کہتے تھے محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں حسب طلب نواب نوازش محمد خان شہاب جنگ مرشد آباد کو گئے تھے اور وہ زمانہ اُنکے آغاز جوانی کا تھا۔ سنہ ۱۱۹۹ ہجری میں صوبہ بنگال میں کسی عہدہ پر مامور تھے مرثیہ اچھا کہتے تھے فیلن صاحب نے اُنکا پورا ایک مرثیہ اپنے تذکرے میں درج کیا ہے اور اصنافِ سخن میں سے کچھ نہیں لکھا۔ لہذا اُس مرثیہ کے چند بندوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہوا صغرا پہ جب ظاہر کہ بابا کا سفر ٹھہرا — مجھی کو چھوڑنا گھر میں اُنھیں مدِ نظر ٹھہرا
یہ سب بے درمیاں اب کوچ کُنبے کا سحر ٹھہرا — دم اُس بیمار کا غم سے لبوں پر آنکے ٹھہرا
لگیں کہنے الٰہی آج میرا دم نکل جائے
جو بابا کے جدا ہونیکا دل سے غم نکلجاوے

جُدائی مجھ سے باباجان کی دیکھی نجائیگی
نظر باباکی صورت جسگھڑی مجکو آئیگی
مری جانِ حزیں ہرگز نہ یہ صدمہ اُٹھائیگی
اکیلی گھر میں یہ دُکھیا پڑی آنسو بہائیگی

تیقن ہو نہ صُورت اچھّی ہونے کی کوئی ہوگی
نہ بابا گھر میں آوینگے نہ میری زندگی ہوگی۔

یہ خط کس کا ہو آج آیا مُطالعہ جسکو فرماکے
پھوپی زینب کو چپکے سے کہی کیا بات بلوا کے
ہوئی تشویش اور آنسو بہے چہرے پہ بابا کے
گئیں حجرے میں کیوں باباکے اماجان گھبرا کے

یہ ہو کیا مشورہ ہوتا بتانے ہوش جاتے ہیں
سکینہ گو دہیں بیٹھی ہے اور مجھ سے چھپاتے ہیں

خلیق

خلیق۔ شاعر شیرین زبان میر مستحسن خلیق دہلوی خلفِ ارشد میر غلام حسن حسن مرحُوم برادر خورد میر احسن خلق۔ لکھنو اور فیض آباد میں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے مشقِ سخن کا شوق دامنگیر ہوا حسن خلق کی رعایت سے خلیق تخلص اختیار کیا اور مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ انھیں ایام میں میرزا تقی ترقی نے چاہا کہ فیض آباد میں شعر و سخن کا چرچا ہو۔ مشاعرہ قائم ہوا اور خواجہ حیدر علی آتش کو لکھنؤ سے بُلوایا پہلے ہی جلسہ میں جو میر خلیق نے غزل پڑھی اُس کا مطلع یہ تھا۔

مثلِ آیئنہ ہو اُس رشکِ قمر کا پہلو
صاف اِدھر سے نظر آتا ہو اُدھر کا پہلو

آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہو تو میری کیا ضرورت ہو چندروز کے بعد میر حسن اُنکے والد نے قضا کی۔ عیال کا بوجھ انکے سر آپڑا اور شعر شاعری کے خیالات پست ہوگئے بڑے پُر گو تھے۔ غزلیں بیچا کرتے تھے اِس پر بھی دیوان مکمّل کرلیا تھا۔ مگر اُسے رواج نہیں دیا۔ تمام عمر مرثیہ گوئی میں بسر کی میر ضمیر اور میرزا فصیح مرثیہ گو انکے ہمعصر تھے۔ میر خلیق کے اداے کلام اور پڑھنے کی خوبی دیکھنے اور سُننے کے قابل تھی۔ خوبی محاورہ اور لُطف زبان جو انکے مرثیوں میں پایا جاتا ہے وہ انکے ہمعصروں کے کلام میں مفقود ہے۔ لکھنؤ میں انکی اور انکے تمام گھرانے کی زبان محاورہ کے لحاظ سے مستند سمجھی جاتی تھی۔

ہرچند چاہا کہ کلام دستیاب ہو مگر اُنکے عزیزوں کی لاپرواہی سے مجبور ہو کر پُرانے تذکروں سے کچھ اشعار انتخاب کر کے درج کیے گئے ہیں

غفلت میں فرق اپنی تجھ بن کبھو نہ آیا — ہم آپ میں نہ آئے جب تک کہ تو نہ آیا

اشک جو چشمِ خوں فشاں سے گرا — تھا ستارہ کہ آسماں سے گرا

مجرائی طبع کُند ہے لطفِ بیاں گیا — دنداں گئے کہ جوہرِ تیغِ زباں گیا

گذری بہارِ عمر خلیق اب کہیں گے سب — باغِ جہاں سے بلبلِ ہندوستاں گیا

کہا میں نے جو اے گُل کچھ وفا کر — تو وہ ہنس پڑا وہ کھِل کھِلا کر

ہے حسن ترا مہرِ درخشاں کے برابر — دنداں در و لب لعلِ درخشاں کے برابر

کیا چاہیئے عاشق کے تجھے قتل کو خنجر — ابرو ہیں ترے خنجرِ براں کے برابر

جس گھڑی تم کو نہیں پاتے ہیں ہم — جی ہی جی میں اپنے گھبراتے ہیں ہم

کسکے خرامِ ناز کا پامال ہوں خلیق — لگتی ہے چوٹ دلکو مرے ہر قدم کیساتھ

مرغانِ قفس کرتے ہیں سب نغمہ سرائی — کیا فصلِ بہاری کی چمن سے خبر آئی

گلشن میں یہ کس شخص کا ہے ڈھیر کہ بُلبل — منقار میں لیجا کے کئی پھول دھر آئی

مدت سے ہم رہتے تھے جس گھر میں ہم اور یار — اب دیکھ کے وہ خالی مکاں آنکھ بھر آئی

کیا پوچھتے ہو حال اسیرانِ قفس کا — گلشن سے جو بیخود ہو نسیمِ سحر آئی

ایسا تو جہاں میں کوئی ہو و یگانہ رُسوا — آفت جو خلیق جگر افگار پر آئی

دل میں تھا آتے ہی اُسکے جائیں لگ آغوش سے — جب وہ آیا سامنے تب رہگئے خاموش سے

خلیق

خلیق - جناب منشی ارشاد حسین صاحب خلف حاجی محمد امداد حسین صاحب صفیر مرحوم رئیس فرخ آباد ۱۸۸۵ء کے قریب زندہ و سلامت موجود تھے بعد کا حال معلوم نہیں یہ کلام کا نمونہ ہے

سمجھے تھے جسکو دوست وہ دشمن نظر میں ہے — امیدِ خیر کیا ہو کہ شر ہر بشر میں ہے

تاثیر جس کا نام ہے وہ اے شبِ فراق — آہِ سحر میں ہے نہ دعائے سحر میں ہے

دیکھیں ہم اور پھولوں کو کیا محوِ چشم ہیں
نرگس کا پھول تو نظر باغ بھر میں ہے
انصاف کر کہ ہم کسے چاہیں ترے سوا
تو ہی بتا کہ نادرہ کس بشر میں ہے

خلیق

خلیق۔ جناب محمد نصر اللہ خاں صاحب باشندہ حسن پور تلمیذ جناب میر لکھنوی ان کا کچھ حال باوجود تلاش میسر نہ ہوا ناچار اندراجِ کلام پر اکتفا کیا گیا ؁

آئی نظر کسی کی جو ترچھی نظر مجھے
دل کی خبر رہی نہ جگر کی خبر مجھے
ممکن نہیں کہ چھوڑ دے دردِ جگر مجھے
رہنے دے اب خدا یہ ہی اک چارہ گر مجھے
اے رفتگانِ راہِ عدم پھر بھی آیئو
کچھ پوچھنی ہے تم سے عدم کی خبر مجھے
نہ ہوتے ہم جو رسوائے زمانہ
یہ شہرت آپ کی ہوتی کہاں سے

خلیق

خلیق۔ عالیجناب راجہ دیبی داس صاحب سوم تعلقدار پائگاہ حیدرآباد کے امرائے عظام میں سے ہیں منشی حفیظ سے تلمذ ہے۔ دو شعر نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں ؁

یوں تو اک روز تجھے آنا ہی اک موت ضرور
گر شبِ ہجر میں آجاتی تو احسان ہوتا
بڑھ گئی مرہم کافور سے سوزش دونی
کاش زخموں پہ مرے وہ نمک افشاں ہوتا

خلیق

خلیق۔ جناب منشی محمد خلیق صاحب ساکن بٹاوہ ضلع خاندیس۔ آجکل کے شاعروں میں ان کا شمار ہے رسالوں میں غزلیں شایع کراتے رہتے ہیں اُن میں سے چند شعر انتخاب ہوئے۔ کوئی خاص بات قابلِ ذکر ان کے کلام میں نہیں ہے ؁

آج کوئی آنے والا ہے ضرور
یہ پتا بے تابیٔ دل سے ملا

قاصد نے اسکی نوک پلک کا کیا جو ذکر
نشتر سا ہائے میرے جگر میں چبھو گیا
لایا نہ کچھ جواب ہمارے سوال کا
قاصد ہمارا جاکے اُدھر ہی کا ہو گیا
اے بیکسی بہائے ہیں کسنے یہ چار اشک
آکر مرے مزار پہ یہ کون رو گیا
رسوا ہوا ذلیل ہوا تیرے عشق میں
جو کچھ مرے نصیب میں ہونا تھا ہو گیا
کہے گا کون مسیحا تجھے زمانے میں
مریضِ عشق کا جب کچھ تجھے خیال نہیں

جو مرتے ہیں کا ذرا بھی تمھیں خیال نہیں	ہمیں بھی جائیے اب حسرت وصال نہیں
لگی ہیں راہ رخوں کی نگاہ حضرتِ دل	بتائے دیتے ہیں اچھی یہ دیکھ بھال نہیں

خلیق

خلیق منشی عبدالخالق دہلوی کسی پنجابی سوداگر کی دوکان پر ملازم ہیں۔ استعداد علمی بہت معمولی ہے مگر شاعری کا شوق حد اعتدال سے متجاوز ہے۔ جو کچھ آمدنی ہوتی ہے اُس کا کثیر حصہ اِس فن کے شوق کی نذر کر دیتے ہیں سائل صاحب اور منشی چندربھان کیفی انکے اُستاد ہیں۔ اور شعرا سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ قابلِ قدر رسالوں ہیں کئی نظمیں انکے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ اِن نظموں ہیں تاریخی مضامین ایسی جامعیت اور قابلیت سے سلسلہ وار لکھے گئے ہیں، جن سے اِنکے مصنف کی علمی استعداد، اور واقفیت عامہ کے متعلق اچھی رائے قائم کی جاسکتی ہے اور مشقِ سخن بھی پختگی اور سنجیدگی کا پہلو لیئے ہوئے ہے۔ واقعات کا تسلسل بہت خوبی سے دکھایا ہے اور روانی قابلِ تعریف ہے ٭

ڈر تو یہ ہے جو دل لے وہ ستمگر آنکھیں	اُلٹی چھریاں کہیں ہو جائیں نہ پھر کر آنکھیں
یہ تماشا ہے نیا صُلح بھی ہے جنگ بھی ہے	دل ملے پر بھی لڑا کرتی ہیں اکثر آنکھیں
کہتے ہیں مجھپہ مرتی ہے دنیا تو کیا عجب	ایسا کوئی جہاں ہیں طرحدار بھی تو ہو
کہتا ہے مجھ سے داورِ محشر کے رُوبرو	دل سے نکال دعویٔ باطل کی آرزو
ریا کاری ہیں ساری عمر کر دی رائگاں اپنی	جہاں ہیں جسنے جنت کی تمنا ہیں عبادت کی
ہیں جسکو دیکھا دل ہو گیا اُس کا بس اے زاہد	نکر تعریف میرے سامنے حوران جنت کی
اے قیس تجکو دشت نوردی سے کیا حصول	لیلیٰ کے دل ہیں شکل نکال اپنی راہ کی
پامال یوں نہ کیجئے وقتِ خرام ناز	فریاد کچھ تو سُنئے دلِ دادخواہ کی
اُمید و یاس ہیں دل کا عجب دستور رہتا ہے	کبھی مسرور رہتا ہے کہیں رنجور رہتا ہے
ریا کاری خدا کے گھر ہیں بھی ای حضرت زاہد	زباں پر نام حق دِل ہیں خیال حور رہتا ہے

نوحۂ وفات نظام

کیا غضب ہے ای اجل دنیا میں کوئی ذی حیات — تیرے دستِ ظلم سے زندہ نہ رہنے پائے ہائے
چشم بد دور اپنے حق میں جو ترے آگے کہے — دین و دولت اسکو ہی نظر کھا جائے ہائے
کیسے کیسے خاندانوں کو کیا تو نے تباہ — کیسے کیسے گھر بنے تو نے اُجاڑے ہائے ہائے
نامیوں کے کھوج تک باقی نہ رکھے نام کو — صفحۂ ہستی سے وہ نام و نشاں مٹوائے ہائے
بے گنہ نادان جواں سب پر پھری تیغ جفا — یہ ستم یہ ظلم تیرا کس سے دیکھا جائے ہائے
تھا جو گلدستہ میں ای بادِ فنا چوٹی کا پھول — کیا غضب ہے کیا ستم ہے وہ ہی گل مرجھائے ہائے
جسکے لکھتے تھے قصیدے شاعرانِ ذی شعور — اُن سے نوحے مرثیئے اب اُسکے تو لکھوائے ہائے
سب جسے آنکھوں میں رکھیں آہ وہ ہر دلعزیز — کارواں سے مثلِ یوسف یوں بچھڑ کر جائے ہائے
شادیانے جسکے بجتے اُسکی یہ نوبت ہے آج — پیچھے میت آگے ماتم اُسکا ہوتا جائے ہائے
بین کے نغموں کے بدلے بین کا ہے شور و غل — دھوم سے اُس کا جنازہ یوں اجل اُٹھوائے ہائے
جھاڑتے تھے روز و شب جو اُسکے پاپوش کی گرد — اُسکی میت پر انھیں سے مٹی اب ڈلوائے ہائے
فرشِ دیبا کی بھی جسکو سلوٹیں تھیں ناگوار — اُس تنِ نازک کو تو یوں خاک میں ملوائے ہائے
ہاتھ جو بہرِ سلام اُٹھتے تھے جس کے رُوبرو — آج اُسی کی فاتحہ کو ہاتھ وہ اُٹھوائے ہائے
چھا گئی ہے کیا غم و اندوہ کی دلپر گھٹا — ہے سیہ پوش اُسکے ماتم میں یہ کعبہ ہائے ہائے
قیصری دربار میں جو شوق سے آنے کو تھا — ای اجل اُسکو ہی تو ملکِ عدم پہنچائے ہائے
حشر تک ماتم رہے گا اِس غمِ جانکاہ کا — شاہ آصف جاہ جیسا شخص یوں مر جائے ہائے

سرگذشت دہلی

اُجڑا ہوا نہیں ہے ہرگز دیارِ دہلی — پوچھے ہمارے دل سے کوئی بہارِ دہلی
ہیں زندہ یادگاریں نقش و نگارِ دہلی — کچھ نام کر گیا ہے ہر تاجدارِ دہلی
تاریخ دفن اِس میں ہندوستان کی ہے — یونان و مصر و فارس سارے جہان کی ہے
بھارت میں جبکہ ڈنکا پانڈو کا بج رہا تھا — وہ بھیم وہ یدھشتر وہ کرشن سج رہا تھا

کوروں کے دل میں جا کر ارجن گرج رہا تھا
بانکوں کا بانکپن بھی جن سے نہ بچ رہا تھا

اُنکے محل تھے کیا کیا جمنا ترے کنارے
اندر پرست دہلی کہتے تھے تجھکو سارے

بھیشم کے دَور دورے کوروں کی حکمرانی
ایسے ہوئے پرچھپت کلجگ نے ہار مانی

پھر جنمے جے نے اپنی کی تیس مار خانی
اب نام اسکا سُن لو کھنڈرات کی زبانی

حسرت سے کہہ رہے ہیں دالان ٹوٹے پھوٹے
ہمپر بھی نقش کاری ہمپر بھی تھے بیل بوٹے

تجھکو پرانے قلعہ آباد رکھنے والا
دُنیا کے حادثوں سے آزاد رکھنے والا

تعمیر میں نرالی ایجاد رکھنے والا
وہ کون نامور تھا بنیاد رکھنے والا

کیا تجھ میں خوبیاں تھیں کیا شانداریاں تھیں
کس شاہِ ذی حشم کی جہانداریاں تھیں

دہلی میں راجپوتی لہرا رہا نشاں تھا
اقبال اوج پر تھا ہمدرد آسمان تھا

کروٹ جو ایک بدلی غوری کا آستاں تھا
دُھنتا تھا سر پتھورا مندر مرا یہاں تھا

چونسٹھ تھے اُس میں کھنبے کھمبوں میں زینتیں تھیں
اِن مورتوں میں کیا کیا عالم کی صورتیں تھیں

مینار قطب صاحب کب سے کھڑا ہوا ہے
کچھ بول چال مُنہ سے کیا تو لڑا ہوا ہے

کیوں سربلندیوں سے اتنا بڑا ہوا ہے
تیری بنا میں کس کا پتھر گڑا ہوا ہے

اے التمش کی مسجد تُو ہی نشاں بتا دے
کرتی تھی حکمرانی رضیہ کہاں بتا دے

چتوڑ کی لڑائی دولت پہ جان دینا
وہ قوم کی حمیت عزت پہ جان دینا

خلجی کا شوخ چنچل صورت پہ جان دینا
جانباز پدمنی کا عصمت پہ جان دینا

ہیں زندہ داستانیں بستی رہیگی جبتک
جمنا کنارے دہلی بستی رہیگی جبتک

تغلق نے تخت چھینا قلعہ نیا بنایا
فیروز شہ نے اپنا پھر کوٹلہ بسایا

سنگین لاٹ گاڑی سُکھ سے رہی رعایا
یک لخت قہر کیسا نازل ہوا خدایا

تاتاریوں کو لیکر تیمور لنگ آئے
دِلی کے رہنے والے جانوں سے تنگ آئے

لاکھوں کے خوں بہائے کی لوٹ مار کیسی
تیغِ دودم ہوئی تھی سینے کے پار کیسی

آہیں نکل رہی تھیں بے اختیار کیسی | بچوں کے واسطے تھی ماں بیقرار کیسی

ایسا نہ دن دکھائے دشمن کو بھی الٰہی! | دہلی کو مدتوں تک جیسی رہی تباہی

وہ خاندانِ لودھی بابر کا چڑھ کے آنا | میدانِ پانی پت میں توپوں کا دندنانا

دیتا تھا جان کیسا آزادیوں پہ رانا | آتا ہے یاد مجھکو اُس وقت کا زمانا

تھی باپ کی محبت بیٹے پہ جان دیدی | مفتوحہ سلطنت کی اُسکو عنان دیدی

کی ہے شہِ ہمایوں نے سلطنت اُدھوری | زوروں پہ چڑھ رہا تھا جب شیر شاہ سوری

گردش میں تھا نصیبا ہندوستاں سے دُوری | ایرانیوں نے کردی آخر مراد پُوری

بیرم کی جاں نثاری اب تک زبان زد ہے | وہ نیک نام زندہ دنیا میں تا ابد ہے

کیا تربتِ ہمایوں پہ مقبرہ بنا ہے | صفدر کا مدرسا ہے درگاہِ اولیا ہے

طوطیٔ ہند نامی خسرو یہیں ہُولہے | تیرا جہاں آرا سبزہ ہرا بھرا ہے

غالب کی ہے یہیں پر اُجڑی ہوئی نشانی | اُردو لحد کے اُوپر کرتی ہے نوحہ خوانی

درگاہِ قطب صاحب سنگِ مزار دیکھے | سہروں میں پھول دیکھے پھولوں میں خار دیکھے

شاہوں کے جشن کیا کیا پروردگار دیکھے | آخر کو زیرِ تربت سب تاجدار دیکھے

سُکھ نیند سو رہے ہیں قبروں میں شاہزادے | بادِ سحر جگادے بادِ سحر جگادے

انسان کو جان پیاری جاں کو بدن پیارا | بلبل کو گل مبارک گل کو چمن پیارا

عاشق کو کوئے جاناں شیروں کو بن پیارا | شاہِ جہاں کو دہلی ہمکو وطن پیارا

رکھیں گے یاد اسکو جیتے رہینگے جب تک | جام شراب عشرت پیتے رہینگے جب تک

دہلی کے لال قلعہ فردوس کے نمونے | اقبال دوڑتا تھا قدموں کو تیرے چھونے

دربار شاہجہانی دیکھا ہے خوب تو نے | پائی تھی کامیابی کس کس کی آرزو نے

کس تخت پر مرصع طاؤس جلوہ گر تھے | فرمانروائے دولت بیٹھے ہوئے کدھر تھے

دیوانِ خاص تیرا دیوانِ عام تیرا | آئین کے موافق ہر انتظام تیرا

شوکت کنیز تیری، رتبہ غلام تیرا
مشہور ہو رہا تھا دنیا میں نام تیرا

انصاف پروری سے دِلّی پری ہوئی تھی
اِس شہر میں اٹا ٹٹ دولت بھری ہوئی تھی

ہاں تجھکو جامع مسجد رضواں پہ برتری ہے
جب تک ہے حوض جاری ان نام میں تری ہے
عالم فریب منظر انداز دلبری ہے
نیکی کی جڑ ہری ہے نیکی کی جڑ ہری ہے

جنّت میں کیوں نمازی جائیں نماز پڑھنے
دِلّی میں جب فرشتے آئیں نماز پڑھنے

حامئ دین احمد اورنگ زیب نامی
لیکن رہا ہے کس کا جاہ و حشم دوامی
ارکانِ سلطنت کی لیتا رہا سلامی
مغلوں کے دبدبہ میں آنے لگی تھی خامی

ایسے سحر سے بیٹھے جلسوں میں شام کر دی
اِن عیشی جیوڑوں نے ترکی تمام کر دی

ایسے ہوئے محمد شاہ زمان رنگیلے
دربار میں طوائف آتے تھے بے وسیلے
نقال بھانڈ کتھک مجرا کریں سجیلے
شیشہ کی یہ صدا تھی جام شراب پی لے

رندوں کا لال قلعہ میخانہ بن رہا تھا
خود بادشاہِ دہلی مستانہ بن رہا تھا

نادر کی فوج آئی نشہ حرام کرنے
مسجد میں آکے بیٹھا جب قتل عام کرنے
پابند عیش جاتے کیوں روک تھام کرنے
پہنچا وزیر اعظم جھک کر سلام کرنے

نادر ہوا روانہ پھینکے اُٹھا کے لاشے
مستِ شراب عشرت کرنے لگے تماشے

چوپٹ تھے شاہ عالم اندھیر چھا رہا تھا
ہر شخص اپنا اپنا نقشہ جما رہا تھا
ظالم غلام قادر آنکھیں دکھا رہا تھا
ہلکر اُچھل اُچھل کر فتنے اٹھا رہا تھا

دہلی نے ہائے کیا کیا آشوب دہر جھیلے
آئے کبھی مرہٹے چھائے کبھی رہیلے

ساعت سعید آئی پھر وقت نیک آیا
سب سے نجات پائی جب لارڈ لیک آیا
دِلّی کو فتح کرنے انگریز ایک آیا
بارے ہوا بڑا دن کھانے میں کیک آیا

سکّہ جمایا اپنا اب الیسٹ انڈیا نے
ہرسے تھے شور و غل تھے بجتے تھے شادیانے

بس ایک لاکھ پنشن پاتا تھا شاہِ دہلی
پر نام تھا ابھی تک عالم پناہِ دہلی

پھر انقلاب آیا بگڑی سپاہِ دہلی
پھر خاک میں ملایا کالوں نے جاہِ دہلی

مغلوں کی سلطنت کا نام و نشان نہ رکھا
بابر کا نام لیوا باقی یہاں نہ رکھا

تھے سب مشیرِ شاہی دربار میں چھچھورے
گاتے رہے ملاریں سنتے رہے کٹورے

مارے گئے ہزاروں دم باز مفت خورے
ستھراؤ کر رہے تھے تتیا ربند گورے

شاہِ سخن کے اکثر مضمون قید کرکے
بھیجا ظفر کو آخر رنگون قید کرکے

شہزادیوں پہ توڑا کیسا غضب خدا نے
پھرتی تھیں تنکے چنتی جنگل میں بے ٹھکانے

تھے خاک کے بچھونے ڈیرے نہ شامیانے
تکیے کے بدلے پتھر رکھنے لگیں سرہانے

پھولوں میں تُل رہی تھیں نازوں میں پل رہی تھیں
ڈیوڑھی نقاب ہو کر گھر سے نکل رہی تھیں

ملکہ ہوئی یہاں کی وکٹوریہ پیاری
فرمان کردیا تھا امن و اماں کا جاری

بازار میں لنڈن کی نکلی بڑی سواری
دربارِ قیصری کی بڑھ کر تھی شانداری

ہندوستاں کے راجا خیل و خدم سے آئے
اقبال و جاہ و حشمت جتنے قدم سے آئے

پھر اڈورڈ ہفتم نے کی صلح پسندی
رشیا سے رشتہ جوڑا جرمن سے بھائی بندی

خوش انتظامیوں کے صدقے تھی عقلمندی
دہلی کا کارونیشن شاہانہ سربلندی

پیلِ دماں پہ نکلے کرزن سوار ہو کر
چلنے لگی سواری بادِ بہار ہو کر

اب آپ جارج پنجم دربار کر رہے ہیں
فیضِ قدم سے بن کو گلزار کر رہے ہیں

امن و اماں کا سب سے اقرار کر رہے ہیں
تعریف روزمرہ اخبار کر رہے ہیں

یہ جشن ہو مبارک یہ جشن ہو مبارک
ہندوستان، دہلی، انگلینڈ کو مبارک

چہرہ ہے نور افشاں کیا شانِ قیصری ہے
اقبال و دبدبہ سے عالم کو تھرتھری ہے

قبضہ میں بحر و بر ہیں مشہور سروری ہے
نوشیرواں سے بڑھ کر انصاف گستری ہے

زیر و زبر ہیں یکساں ایسی ہے حکمرانی
پیتے ہیں شیر بکری اب ایک گھاٹ پانی

ریلوں کی ہے ترقی جاری ہے ڈاکخانہ
زوروں پہ ہے تجارت صنعت کا ہے زمانہ

نہروں سے آبپاشی کھیتوں پہ آبیانہ
فوج پولس معیّن بھرپور ہے خزانہ

سکھوں کا ڈھنگ دیکھا مغلوں کا طور دیکھا
ایسا نہ عہد دیکھا ایسا نہ طور دیکھا

اقبال کی رہیگی دولت شفیق جب تک
ہے عدل کی جہاں میں رحمت رفیق جب تک

آزادیوں کا حامی لبرل فریق جب تک
ہم بھی دعائیں دیں گے ہر دم خلیق جب تک

ملکۂ و جارج پنجم انصاف و عدل پیشہ
زندہ رہیں ہمیشہ زندہ رہیں ہمیشہ

دہلی کی شان دُگنی ہو جائیگی یقین ہے
اُجڑا ہوا نہیں ہے اُجڑا ہوا نہیں ہے

خلدِ بریں سے بہتر اس شہر کی زمیں ہے
ہر نقش دلفزا ہے ہر بات دلنشیں ہے

لندن بنا ہوا ہے ہندوستاں میں دہلی
ہے انتخاب بیشک سارے جہاں میں دہلی

بنسی کی صدا

سکھی میں مست ہوں بنسی کی دھن سے
کہوں گی جو مجھے کہنا ہے اُن سے

تجھے میں کیا بتاؤں رے جی کہاں ہے
تو ہی مجھکو بتا دے پی کہاں ہے ؟

برہ کی آگ سے میں جل رہی ہوں
تڑپتی ہوں کلیجہ مل رہی ہوں

نگاہِ ناز سے بسمل ہوئی ہوں
فقط بسمل نہیں بے دل ہوئی ہوں

میرے چت چور کو کوئی بُلا دے
سُنا دے، پھر کوئی بنسی سُنا دے

مری آنکھوں میں وہ رنگیں ادا ہے
مرے کانوں میں بنسی کی صدا ہے

کسی کا مدھ بھری گوری میں دم ہے
مرا اس بانس کی پوری میں دم ہے

اسی غماز نے مارا ہے مجھ کو
اسی آواز نے مارا ہے مجھ کو

مروں گی جان دونگی سر دُھنونگی
سنونگی پھر وہی بنسی سُنونگی

وہی بنسی رسیلی ہے سُریلی
وہی بنسی رنگیلی ہے چھبیلی

وُہی بنسی بھرا ہے سوز جس میں
نئی آواز ہے ہر روز جس میں

وُہی بنسی جو بے جاں بولتی ہے
مگر رازِ حقیقت کھولتی ہے

وہی ہنسی مجھے دکھ دے رہی ہے	لب جاناں کے بوسے لے رہی ہے
وہی ہنسی کٹی جو بانس ہو کر	کھٹکتی ہے جگر میں پھانس ہو کر
اسی ہنسی میں جادو بھر رہا ہے	اسی ہنسی نے میرا من ہرا ہے
مرونگی جان دونگی سر دھنونگی	سنونگی پھر وہی ہنسی سنونگی

خلیل

خلیل شرف الدولہ منتظم الملک نواب محمد ابراہیم خان بہادر مستقیم جنگ خلف خواجہ عبدالحکیم لکھنوی از اہل خطہ۔ آپ محمد علی شاہ بادشاہ کے وزیر اور موزونی طبع کے اقتضا سے نواب علی شور علی خان کے شاگرد تھے۔ غدر میں مارے گئے بڑے متقدر اور والا منزلت امیر تھے۔ لکھنؤ میں انکے نام کی کوٹھی ابتک مشہور ہے گاہ گاہ شعر کہتے تھے ملاحظہ ہوں ۔

سن کے حال شب فرقت بولے	کہیئے کچھ اور بھی فرمائیے گا
نزع میں دیکھ کے فرماتے ہیں	ہم جلا لیں گے جو مر جائیے گا
وصل میں کہتے ہیں بھولے بنکر	کس طرح ہجر میں مر جائیے گا
ایسے وعدے بھی وفا ہوتے ہیں	ہاں بجا سچ ہے ضرور آئیے گا
مثل مہ نو عشق میں اس رشک قمر کے	اٹھتی ہے سدا مجھ سے وفا کوش پہ انگشت
دیوانہ ترا بادیہ پیما ہوا اگر	دوڑیگا اسکے لینے کو خود قیس بن کے پاؤں
دیکھی قریب چشم جو گیسوئے مشکبار	تشبیہ دی کہ ہیں یہ غزال ختن کے پاؤں
ہاتھوں پہ سر جو معرکہ امتحاں میں تھا	پیچھے ہٹے نہ ایک قدم کوہکن کے پاؤں
درگاہ میں خدا کی دعا ہے یہی خلیل	ہوں روز حشر سر پہ مرے پنجتن کے پاؤں

خلیل

خلیل سخنور خوش فکر میر دوست علی خلیل مرحوم خلف سید جمال علی باشندۂ قصبۂ ڈولی اودہ خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کے شاگردوں میں نامور تھے انکی خوش کلامی کا بڑا شہرہ تھا۔ نواب نادر مرزا نیشاپوری کی مصاحبت میں بسر اوقات کرتے رہے سنہ ۱۲۷۹ھ میں کلکتے بھی گئے تھے انکا اردو دیوان مطبع نامی لکھنؤ میں چھپا تھا۔ مگر معتبروں سے سنا کہ اچھا کلام بیشتر ضائع ہوگیا اردو دیوان

مطبوعہ میں شامل نہو سکا اخلاق اور معرفت کا رنگ بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتا ہے خلیل کے کلام میں اجنبی اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار زیادہ ہے اور تشبیہ و استعارہ کا شوق حد اعتدال سے متجاوز ہے مراعاۃ النظیر اور صنعت تجنیس کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔ بعض اشعار بالکل فحش کا رنگ لیئے ہوئے ہیں۔ زلف۔ کنگھی۔ مانگ۔ چوٹی۔ خط و خال کے مضامین کثرت سے نظم کیئے ہیں۔ صاف عاشقانہ شعر غزلوں میں کم نکلتے ہیں۔ نازکخیالی اور شگفتگی مضامین کی طرف توجہ کم معلوم ہوتی ہے اسی لئے کلام میں دلکشی (جیسی کہ ایسے سخنور کے ہاں امید کیجا سکتی ہے) نہیں ہے عموماً جو ایک مصرعہ میں زور ہوتا ہے وہ دوسرے میں قائم نہیں رہتا۔ ہمنے اپنی پسند کے مطابق عاشقانہ اور اخلاقی مضامین کے اشعار کا انتخاب کیا ہے مگر دیوان میں ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے سلطان عالم واجد علی شاہ کے عہد میں نظامت اور چکلہ داری کے عہدہ پر ممتاز رہے تا حیات کمال عیش و عشرت سے بسر کرتے رہے۔ دیوان مطبوعہ کا خلاصہ درج ذیل ہے

ناقصوں پر نظر حسرت نہ رکھتا جو فلک
لعل پتھر کو نہ پھر سیپ کو گوہر ملتا

جب عرض حال کرتا ہوں کہتا ہے وہ صنم
کچھ اور کہیئے یہ تو ہے قصہ سنا ہوا

دل ہی میں نہیں کچھ ترا جلوہ تو ہر اک کو
شمع حرم و دیر و کلیسا نظر آیا

وہ رنگ ہے تیرا کہ ترے رنگ کے آگے
جس رنگ کو دیکھا ہے وہ پھیکا نظر آیا

آدمی وہ ہے کہ جو حضرت آدم کی طرح
شیر مادر کا بھی شرمندہ احساں نہوا

چپ کس لیئے رہتے ہو خلیل جگر افگار
بتلاؤ تو کیا حال ہے اے یار تمہارا

کبھی دیکھا جو اُبلتے ہوئے مے کو خم سے
جوش اپنی بھی جوانی کا ہمیں یاد آیا

اہل دنیا ہیں تمام اپنی غرض کے بندے
پڑ گئی جب کوئی مشکل تو خدا یاد آیا

کیا بہار میں جسنے بت پا جو لٹکا
گیا نہ زلف کا سودا ہزار سر پٹکا

شب فراق میں بیتاب ہوں نے گیند کیطرح
فلک پہ مجکو اُٹھایا زمیں پہ دے پٹکا

کٹتی نہیں ہیں محرم الفت کی بیڑیاں
جو مر گیا وہ قید سے آزاد ہو گیا

یار نے آ کے دمِ نزع کہا
کیا ارادہ ہے کدھر جائیے گا

جو بن رہتا نہیں کسی کا
یہ دھوپ ہے سایہ ہے پری کا

ہاتھ پورا نہ پڑا زخم لگائے اوچھے
قتل کرنا بھی نہ تجھکو مرے جلاد آیا

جس نے پوچھا یہی جواب ملا
آدمی باوفا نہیں ملتا

طالبِ مقصود گر ہے اپنی ہستی کو مٹا
ہو گیا جس وقت خود گم مدعا مل جائیگا

عاشق ہوں بتو تم مجھے جو چاہو سزا دو
اللہ کا بندہ ہوں گنہگار تمہارا

قاتل نے بعد قتل مرے مسکرا دیا
کیا خوب خوں بہا کے مجھے خوں بہا دیا

کھنچتے ہو دور ہم سے ہمارا قصور ہے
کیوں چاند کہہ کے تمکو فلک پر چڑھا دیا

شبِ غم میں دلِ پر قلق جب ہوا
خیال اُس کا آکر خبر لے گیا

بزم سے یار نے یہ کہکے نکالا مجھکو
اُٹھئے، گھر جائیے، دم لیجئے، ستائے بہت

حرص نعمت کی بہت کرتی ہے انسانکو خراب
پھوٹ جائے بدن کھیر جو کھا جائے بہت

اے پری ہیں ترے دیوانے کے مرنیسے خراب
ہتکڑی، طوق، رسن، خانۂ زندان زنجیر

جبیں پہ غصے سے پڑ گئی چین پھر الٹی آنکھیں بھویں چڑھا کر
دہن کا بوسہ جو اس سے مانگا بگڑ گئے صاف منہ بنا کر

نکر تصور بتوں کا دل میں محل تو یہ ہے کہ کچھ حیا کر
خلیل کعبہ میں بت پرستی خدا خدا کر خدا خدا کر

بلا ہے سایہ بھی ان بتوں کا خدا بچائے ہر اک بشر کو
پری کو دیوانہ چٹکیوں میں بناتے ہیں یہ اڑا اڑا کر

ہوئی ہے مدت میں وصل کی شب حشر تک ہو سحر نمایاں
کروں میں آمیں جھکا کے سر کو خدا سے تو اے صنم دعا کر

بتوں کو بھی بد نہ کہیو واعظ خدا کو گر ایک جانتا ہے
نکال حرفِ دوئی نہ منہ سے خدا خدا کر خدا خدا کر

حسینوں میں حسن ضو قمر میں گلوں میں بو سنگ میں ہے آتش
کیا ہے عالم کو تو نے حیران ہر اک میں جلوہ دکھا دکھا کر

بتانِ ہندوستاں میں تو نے بہت سی کی سیرت پرستی
خلیل کعبے میں چل کے یہاں سے بسر کوئی دن خدا خدا کر

کوئی بلبل نہ کسی پھول کا شیدا ہو خلیل
گل کے پردے میں رہے وہ نہ اگر بو ہو کر

رونے پہ باندھ لے جو مری چشم تر کمر
کیسی زمیں فلک پہ ہو پانی کمر کمر

سوز و گداز عشق سے ہو جائینگے فنا
اپنا مآل کار ہے شکلِ مآلِ شمع

حشر برپا ہو کہیں لوگ قیامت آئی
ربع مسکوں میں ہو ہلچل جو چلو چار قدم

جانِ جاں عاشقوں میں نام جدائی کا تو لو
موت کا ذکر نہیں کرتے ہیں بیماروں میں

دل سے ہم شیدائے چشمِ یار ہیں
نرگسِ بیمار کے بیمار ہیں

چھیڑتے ہیں عاشقانِ زار کو
خوب رو کتنے غریب آزار ہیں

کیا اُسکی جستجو نے چھڑوا دیئے ہیں مسکن
پروانے ہیں چمن میں بلبل ہیں انجمن میں

مری قدر کیا ہو جہان میں کہیں مجھسا کوئی بشر نہیں
وہ دوا ہوں جس میں شفا نہیں وہ دعا ہوں جس میں اثر نہیں

مرے دلکو جسکا خیال ہے شب و روز شوقِ وصال ہے
وہ کہاں ہے، کون ہے؟ کیا ہے شے ابھی تک کچھ اسکی خبر نہیں

نہیں دم زدن کی یہ ہے جگہ جو خیال بھی ہو عروج کا
تو صدا یہ آتی ہے کان میں کہ بس آگے بابِ اثر نہیں

مرے سمجھے ہیں جو معاملے وہی اُسکو خوب ہے جانتا
یہ مقامِ راز و نیاز ہے دل و جاں کو اُسکی خبر نہیں

کرے دید اُسکی مجال کیا وہ جمال دشمنِ ہوش ہے
جھلک اُسکی جسکو نظر پڑی اُسے پھر کسی کی خبر نہیں

وہ جو کرتے ہیں مرا امتحاں پڑیں بیچ والے نہ درمیان
اگر آگ میں بھی وہ پھینکدے تو خلیل کچھ مجھے ڈر نہیں

اللہ رے حسنِ عارضِ رنگین کے عکس سے
یاقوت بن گیا ہے گہر گوشِ یار میں

ہو نہ غصہ آگئے ہیں لختِ دل نالوں کے ساتھ
باغباں گلبرگ منقارِ عنادل میں نہیں

سر ترے زانو پہ ہو دم نکلے جب اے مہ لقا
اور کچھ حسرت ترے بیمار کے دل میں نہیں

زندگانی کا سبب عاشق کی ہجر یار ہے
زیست پروانہ کی وصلِ شمع محفل میں نہیں

ہمتِ مردانہ ہے میری مجھے مشکل کُشا
غیر سے خواہانِ مدد کا وقتِ مشکل میں نہیں

عمر غفلت میں بسر ہوتی ہے اپنی روز و شب
کچھ نہیں معلوم ہم سوتے ہیں یا بیدار ہیں

کسکو یاں تابِ رقم واں کسکو پڑھنے کا دماغ
ورنہ قاصد شرح شوق وصل کے طومار ہیں

دل ہی دل میں گفتگو رہتی ہے باہم روز و شب
میرے اُسکے درمیاں تقریر کی حاجت نہیں

وصف روئے نگار کرتا ہوں
لکھتا ہوں شرح داستانِ چمن

مسلمان جانتے ہیں شمع قندیل حرم تجھکو
چراغ دیر ہے تو اے صنم چشم برہمن میں

خالی ہیں سبو شیشے ہیں تہی لبریز شراب سے جام نہیں
چلتے ہیں یہاں سے بادہ کشو اس بزم میں اپنا کام نہیں

جو مر گئے انکو زیر زمیں کچھ راحت و رنج سے کام نہیں
شادی ہے یہاں صبح نہیں اندوہ سواد شام نہیں

ہوں بندۂ عشق حسن بتاں کچھ دیر و حرم سے کام نہیں
مذہب ہی جدا ہے محبت کا یاں کفر نہیں اسلام نہیں

بلبل ہیں شگفتہ ہنستے ہیں گل ہے باغ میں دھوم بہار آئی
دے موت خدا تجھکو شبنم یہ رونے کا ہنگام نہیں

شاعر ہوں خلیل تخلص ہے کعبہ تک ہند سے جاتے ہیں
کیوں ننگ ہے تجھکو ملنے میں اے بت میں بھی گمنام نہیں

خدا کو بھول گئے لوگ فکر روزی میں
خیال رزق ہے رزاق کا خیال نہیں

ترک دنیا خوب ہے حرص ہوا اچھی نہیں
ہر کس و ناکس کے آگے التجا اچھی نہیں

عشاق کو محفل سے اٹھاؤ نہ حسینو!
آئے ہیں ہوا کھانے کو بیمار چمن میں

تم سیر کو جاتے ہو دھڑکتا ہے میرا دل
بلبل کہیں مر جائیں نہ دو چار چمن میں

ناز سے منہ کو جو زلفوں میں چھپا لیتے ہو
جی سے بھایا ہے یہ انداز تمہارا مجھکو

تم سنو یا نہ سنو نالے کیئے جاؤں گا
درد دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہو

اجل ہے گھات میں دم توڑتا ہوں تم مسیحا ہو
اکیلا چھوڑ کر جاؤ نہ بیمار محبت کو

جس سنگ پہ چاہو جبہہ سا ہو
پر شرط یہ ہے کہ بے ریا ہو

کیونکر نہ کہوں تمہیں مسیحا ٭
درد دل زار کی دوا ہو ٭

اچھے نہیں ہیں جوشش وحشت کے رنگ ڈھنگ
تیور کچھ اب کے سال برے ہیں بہار کے

دم سے طلسم آدم خاکی کا ہے خلیل
پھرتی ہیں پتلیاں یہ سہارے سے تار کے

پاؤں پر خم رہی جبین نیاز
زندگی یوں بسر ہوئی میری

طالب وصل ہوں نہ چھیڑ مجھے
دل لگی کیا غریب سائل سے

نہو جو داغ جگر تو غلط ہے دعوی عشق
بغیر مہر سند معتبر نہیں ہوتی

کیونکر ڈروں نہ اسکے خط مشک خام سے
پہنچے ہیں سیدوں کو بہت رنج شام سے

چمن چمن یہ نسیم سحر پکار آئی	خزاں نے کوچ کیا بلبلو بہار آئی
جلوۂ یار نہ تھا دارو ئے بیہوشی تھی	دیر تک ایک نظر دیکھ کے بیہوش رہے
داغ دیجاتی ہی برسات میں بے یار گھٹا	ابر تر آگ کلیجہ کو لگا جاتا ہے
دھوم سنتے رہے آج آتی ہی کل آتی ہے	قامتِ یار کے آگے نہ قیامت آئی
جمال حور کا مٹی کی مورتوں کو دیا	کمال صنعتِ پروردگار دیکھ چکے
محبت مرض ہے محبت دوا ہے	محبت اجل ہے محبت شفا ہے
شرافت ہی حسنِ عمل سے خلیل	جبیں پر کہاں شیخ و سید لکھا ہے
ہوتی ہی شکست اسکو جو مجھ رند سے اکثر	جب دیکھئے توبہ درِ قاضی پہ کھڑی ہے
فرقت کی نہیں شب شب آفات یہی ہی	رؤناتھا جسے روز میں وہ رات یہی ہی
لاکھ نازک ہو رشتۂ الفت	ٹوٹتا ہے یہ تار مشکل سے
عشق اپنا اثر آخر کو یہ دکھلاتا ہے	پہلے غم کھاتے تھے ہم اب ہمیں غم کھاتا ہے
نظارۂ معشوق سے سیری نہیں ہوتی	ہو وصل بھی تو وصل کی حسرت نہیں جاتی
لاکھ پردوں میں ہوں پھر چھپتے نہیں	چتونیں چاہت کی تیور پیار کے
دِل پہ بے یار کچھ عجب گذری	کیا کہوں کس طرح سے شب گذری
یہ بھی معلوم وصل میں نہ ہوا	کب ہوئی صبح رات کب گذری

خلیل

خلیل ۔ جناب حافظ خلیل حسن صاحب مانکپوری خلف حافظ عبد الکریم ۱۲۷۶؁ھ سال ولادت ہے۔ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل کے جواب حیدرآباد میں ہیں بڑے بھائی ہیں حضرت امیر مینائی کے یہ بھی شاگرد ہیں اور مدت تک ریاستِ رامپور میں انکی خدمت میں رہے ہیں پھر کئی برس گوالیار رہے۔ اب پندرہ سولہ برس سے ریاستِ بلرامپور میں ملازم ہیں مہاراجہ صاحب بہادر آپ کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ اِنکی تصنیف سے علاوہ دیوان کے تین چار عاشقانہ مثنویاں بھی ہیں قصائد کا ایک بہت بڑا ذخیرہ آپ کے پاس ہے۔ تاریخ گوئی میں آپ کو کمال حاصل ہے

علمی استعداد خاصی ہے۔ بہنگام ترتیب تذکرہ جو کلام بھیجا اُس کا انتخاب درج تذکرہ کیا گیا۔ کلام میں صفائی روزمرہ کے علاوہ، معاملہ بندی، شوخی، اور بندش کی خوبی سب باتیں موجود ہیں ملاحظہ ہو

نالے ہیں اُٹھتے بیٹھتے کیوں لب پہ اے خلیل	بیٹھے بٹھائے تم کو یہ آزار کیا ہوا
دی وفا دل سے دوست نے مجھکو	اب بھلا اعتبار ہو کس کا
تم ہو، میں ہوں، گلا ہے، خنجر ہے،	اور اب انتظار ہے کس کا
پڑی تھی تم پہ نظر دل کو کیوں کچل ڈالا	قصور آنکھ کا تھا دل گناہگار نہ تھا
چاہتا ہے دل جسے، جب وہ ہی پہلو میں نہیں	چاندنی چھٹکی تو کیا، ٹھنڈی ہوا آئی تو کیا
مدتوں یاد وہ شب روز کی باہم صحبت	یا کبھیں راہ میں بھی دیکھ کے کترا جانا
اتنی مدت سے تو تم دل میں مرے رہتے ہو	اور کچھ حال نہ تمنے مرے دل کا جانا
تم تو فرسودہ ہر اک بات پہ ہو جاتے ہو	ہمکو بھاتا نہیں یہ پھول سا مرجھا جانا
آئے ایسے ہی ہاں نظر کا تیر	دیکھنا اب نہ تم خطا کرنا
ہائے دل کا علاج کون کرے	وہ نہیں جانتے دوا کرنا
دوگے کب تک بتوں پہ جان خلیل	چاہیئے اب خدا خدا کرنا
اطاعت عشق میں کرتے ہیں وہ نازک مزاجوں کی	ادھر انکو مناتے ہیں اُدھر دلکو سنبھالے ہیں
رحم کر اب بھی مرے دل پہ ذرا اے کافر	کھا چکا اب تو تری زلف کے جھٹکے لاکھوں
پھانسی بنتے ہیں، کبھی جال کبھی، دام کبھی	گیسوؤں کو بھی ترے یاد ہیں ٹکے لاکھوں
ہائے کیا شوخی ہے، کیا انداز ہے، کیا حسن ہے،	جس طرف گذرے، وہ بسمل کر گئے دو چار کو
گال اُنکے، اور گلہائے چمن، اے عندلیب	صدقے ان پھولوں پہ کر ڈالوں ترے گلزار کو
سخت جاں ایسا ہوں قاتل سے گلا کٹتا نہیں	دیکھتی ہے تیغ مجھکو، اور میں تلوار کو
دل نہ وابستہ ہو کیوں، زلفِ گرہگیر کے ساتھ	اُنس ہو جاتا ہے، دیوانے کو، زنجیر کے ساتھ
ضبط سے کام ہمیشہ ترے بسمل لیں گے	جان دیدینگے ترا نام نہ قاتل لیں گے

ہائے ملتے نہیں کہتے ہیں کہ جلدی کیا ہے
اُنچے ہیں سن کے اور اس ضد کے ہیں صدقے قربان

عید آئیگی تو ہم ہنستے گلے مل لیں گے
صبح سے آج وہ مچلے ہیں کہ ہم دل لیں گے

فراقِ جاناں میں ہے یہ حالت کہ سبکو مجھ سے ہے اک عداوت
نہ آپ آنکھیں ہمیں دکھائیں نہ ہمکو محفل سے اب اُٹھائیں

ذرا جو آنکھ لگ گئی ہے تو دل اُچھلکر جگا رہا ہے
ہمیں تو خود درد ہی جگر کا اب انجمن سے اُٹھا رہا ہے

آرزو تھی تری دل میں اُتر آتی تصویر
یہی کرتے مری جاں دل پہ جو قابو ہوتا
عشوہ نہ کرینگے، کہ وہ غمزہ نہ کرینگے

ہم اُسے سر کو جھکائے ہوئے دیکھا کرتے
سامنے ہمکو بٹھا کر تمھیں دیکھا کرتے
آئیں گے جوانی پہ تو کیا کیا نہ کرینگے

رہی محفل تری یونہی بھری غیروں سے آئے دن
جگہ ہمکو بھی ملجائے پسِ دیوار تھوڑی سی

خوشبو جو پسینہ کو ترے دی ہے خدا نے
نظر اِس طرف انکی کیا ہوگئی
صبا کی ذرا شوخیاں دیکھنا

یہ بات کسی پھول کی خوشبو میں نہیں ہے
مرے دردِ دل کی دوا ہوگئی
کہ بُو اس کی لاکر ہوا ہوگئی

دِل آج بہت دیر سے پہلو میں نہیں ہے
سمجھتا ہوں اُنہیں تیری نشانی

اُلجھا تو تمہارے کہیں گیسو میں نہیں ہے
لگاؤں کیوں نہ داغوں کو جگر سے

نہ لالی میں وہ رنگت ہے، نہ پھولوں میں وہ شوخی ہے
مرا سینہ بنا ہے غیرتِ گلزار داغوں سے
بہت روئے ہیں آیا ہے نظر جب پھول لالے کا

بجھادی شعلۂ عارض سے کسنے آگ گلشن کی
ہم اپنے گھر میں بیٹھے کر رہے ہیں سیر گلشن کی
اِسی صورت اِسی رنگت کا اک دل ہم بھی رکھتے تھے

سخت جانی مری گردن نہیں کٹنے دیتی
تیغ جلّاد کی بیکار ہوئی جاتی ہے

کوئے جاناں کو سمجھتا نہیں کم کعبہ سے
نہ جلاؤ، نہ جلاؤ، میری تربت پہ چراغ
نامہ بر ہوش میں آ مجھ سے یہ کیا کہتا ہے!

پاؤں سے میں نہ چلوں گا کبھی سر کے ہوتے
حاجتِ شمع نہیں داغِ جگر کے ہوتے
خط سیاہی سے لکھوں خونِ جگر کے ہوتے

خلیل ۔ عالیجناب معلیٰ القاب امین الدولہ وزیر الممالک نواب حافظ محمد ابراہیم علیخان صاحب بہادر

خلیل

صولت جنگ۔ جی، سی۔ ایس۔ آئی۔ فرمانروائے ٹونک۔ نواب محمد علی خان سابق نواب ٹونک کے خلف اکبر ہیں ۱۸۴۸ء مطابق ۱۲۶۵ھ سال پیدائش ہے ۱۸۶۶ء میں بعد معزولی اپنے والد کے مسندنشین ہوئے۔ ایام نابالغی میں ریاست کا انتظام صاحبزادہ عبیداللہ خان فیروز جنگ کی تفویض رہا۔ یکم جنوری ۱۸۷۰ء کو کامل اختیارات حکمرانی عطا ہوئے۔ نواب صاحب خود تجربہ کار زمانہ دیدہ باخبر ہیں ریاست کی سلامی جو انکے مسندنشین ہونے کے وقت گیارہ توپ کی تھی اب پھر سترہ توپ کی ہوگئی ہے۔ بائیں تئیں برس صاحبزادہ عبیداللہ خان وزیر مدار المہام ریاست رہے اُنکی وفات کے بعد انتظام ریاست میں کچھ خلل واقع ہوا، اور کونسل ہوگئی اب پھر دوبارہ اختیارات ریاست مل گئے ہیں۔ نواب صاحب کے گیارہ فرزند ہیں شعروشاعری کا بھی شوق ہے پہلے جناب بسمل خیرآبادی برادر کلاں جناب مضطر سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے اُنکی وفات کے بعد جناب مضطر اُستاد بنائے گئے اور اُنکی اُستادی کے زمانے میں نواب صاحب کی غزلیں بعض گلدستوں کے ذریعے ملک میں پھیلیں۔ اپنے دوسرے اُستاد جناب مضطر کو اُنھوں نے "اعتبار الملک" "افتخار الشعراء" "اقتدار جنگ" اور "خان بہادر" کے خطاب سے معزز فرمایا۔ علاوہ جناب مُضطر کے آسد، ظہیر، کوثر، خلش، وغیرہ اکثر شعراء اُن کے دامن دولت سے وابستہ رہے اور بعض اب بھی ہیں۔ کلام بہت پاکیزہ اور صاف ہے، شوخی اور جودت متانت اور سلاست، موقعہ بموقعہ مناسب مقدار میں پائی جاتی ہے۔ اشعار میں رنگینی بھی ہے۔

روٹھوں میں اور مجھے منائیں آپ	جذبۂ اُلفت کا جب اثر جانوں۔
کلیاں تمام باغ کی رہ جائیں بن کے پھول	تم دستِ نازنیں سے جو چھولو چمن کے پھول
نخلِ وفا میں آئے ہیں رنج ومحن کے پھول	شاخِ جفا نے پائے ہیں مہرو وفا کے پھل
تجھ پر نثار لاکھ چمن ہر چمن کے پھول	تجھ پہ فدا ہزار کلی ہر کلی کا رنگ
یہاں تو اے میرے آمرزگار کچھ بھی نہیں	کوئی ہے زُہد پہ نازاں کوئی عبادت پر
خیالاتِ جہاں کس طرح سے اسمیں سماتے ہیں	دل ایک چھوٹی سی شے ہے یہ تعجب کا محل یہ ہے

زمانہ جانتا ہی ناز بردار جفا ہم ہیں
خدائی دیکھتی ہے دشمن رسم وفا تم ہو

مروت ہیں، وفا ہیں، ناز بردار ہیں، چاہت ہیں
ذرا ہیں بھی سنوں کس بات ہیں مجھسے سوا تم ہو

جو واپس ہم نے دل مانگا خلیل اُس سے تو وہ بولے
کہ اچھا ہے وفا اب کون نکلا ہم ہیں یا تم ہو

وفا کریا نہ کر تو جان، مجھ کو کیا تری مرضی
تجھی کو سب کہیں گے بیمروت دیکھنے والے

ستایا ہے دل ظالم نے کی بیدل لگی اچھی
اسی کا نام الفت ہی تو اِس سے دشمنی اچھی

نہ پوچھو حال شب جدائی جو دلکو رنج و محن ہوا ہے
تمہاری سر کی قسم ہی صاحب کہ صبح کرنا کٹھن ہوا ہے

جو قصۂ زلف چھڑ گیا ہی تو پہروں طول سخن رہا ہے
سکوت سب نے کیا ہی او بت جو تیرا وصف دہن ہوا ہے

جو روئے گلگوں کا دھیان آیا تو دل نے لطف چمن دکھایا
خیال آنکھوں کا جبکہ باندھا تو صید مضمون ہرن ہوا ہے

بُرا ہی جبدن سے عشق گیسو نہ دل پہ قابو رہا ہے مُو
ہمارے قبضے میں ای پری رو سواد ملک ختن ہوا ہے

یہاں تو نور کا تڑکا ہے یاد روئے روشن ہیں
وہ کوئی اور ہونگے شام فرقت دیکھنے والے

خمار

خمار حکیم برجموہن لال صاحب خمار بریلوی شاگرد حضرت ہوش۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ ۱۸۷۰ء میں زندہ و سلامت موجود تھے اور اُس زمانے کے مشاعروں میں شریک رہتے تھے کلام سے پایا جاتا ہے کہ چند غزلیں حضرت اسیر لکھنوی کو بھی دکھائی تھیں۔

تاسف کیا کریں ہم سر کے جانیکا بھلا قاتل
چلو اچھا ہوا گردن سے اپنا بار سر کا

یوں لکھا احوال اپنے دیدۂ بیدار کا
پھول اِک خط میں بنایا نرگس بیمار کا

اے شیخ جا کے بزم میں اُس می پرست کی
دیکھوں گا میں کہ کس طرح ہشیار آئیگا

جب دیا کاندھا جنازے کو مرے اُس مہر نے
بن گیا پھولوں کی چادر کا ہر اک گل آفتاب

قابل تشبیہ اُس دم ہو کہ جب پیدا کرے
یہ دہن یہ چشم یہ ابرو یہ کاکل آفتاب

وہ پھر آگیا کہ پھری ساری خدائی ہم سے
دوست بھی ہمکو ستانے لگے دشمن ہو کر

لکھنؤ کیوں نہ بریلی کو کہیں ان روزوں
اب تو سرسبز یہاں باغ سخن دیکھتے ہیں

آب کوثر کی ہمیں چاہ نہ ہو بعد فنا
آب خنجر سے گلا اسلیئے تر کرتے ہیں

ہو اسیر و ہوش کی جس پر عنایت آنکھ نے
کیوں نہ پھر اُسکی زمین شعر میں جاگیر ہو

قطعہ

کہا یہ اُن سے کہ اک بوسہ ہم اگر لیلیں
تو کہیئے آپکا نقصان اِس میں کیا ہو جائے

بگڑ کے کہنے لگے وہ کہ مُنہ کو نوالو
تمہارے واسطے دستور کیا نیا ہو جائے

کبھی خمار نہ محتاجِ جام صہبا ہو
جو چشمِ مست کا بوسہ کوئی عطا ہو جائے

اُسی کو کہتے ہیں پاس جو بیقرار رہے
اُسی کا نام ہے دل جس میں اضطرار رہے

خطا رقیب کریں دیں سزا مجھی کو آپ
کسی کا جرم ہو کوئی قصوروار رہے

جھکائیں سر کو حسین آ کے سارے عالم کے
سرِ مزار اگر نقشِ پائے یار رہے

اُٹھے جبتک نہ دھواں اُس نے واں ہو کیا اشک
کہیں پانی بھی برستا ہے گھٹا سے پہلے

وہ بیکس ہوں سو بار آ کر قضا
سرہانے مرے نوحہ گر ہو گئی

خمیر

خمیر۔ اِنکا نام اور حال باوجود تلاش معلوم نہ ہوا۔ ایک پُرانی بیاض میں کچھ اشعار نظر پڑے اُس میں سے یہ چند شعر منتخب ہوئے۔ غالباً نواح اودھ کے باشندے تھے اور مذاقیہ شعر کہنے میں معقول دسترس تھی ✣

نہ پیس اتنا لے گردشِ آسماں
کہ ہر استخواں کارواں ہو گیا

رُخِ پُرملاحت کا بوسہ ملا
نمک خوار میں آپکا ہو گیا

جو غم شب کے خاصے میں سب بچ رہا
وہی صبح کا ناشتہ ہو گیا

لبِ شیریں کی یاد میں اے خمیر
جو چھلکے تلے گلگلا ہو گیا

فقرے تمہارے چھڑکے ہوئے نون مرچ کے
کیا چٹ پٹے بڑے ہیں وہی کے مسالہ دار

خمیر اشعار سے میرے نکیوں بھوکوں کی سیری ہو
کہ مجھ کو فیض پہنچا ہے یہ نعمت خوانِ عالی سے

قطعہ

روکھی سوکھی بھی آبرو سے ملے
یہ بھی اس وقت میں غنیمت ہے

جب کہا اُن سے ایک بوسہ دو
یہ جو رخسار ہیں گلابی سے

ٹھسکے بولے کہ جان جائے گی
ہاتھ اُٹھاؤ اباس کابی سے

خنجر۔ شیخ محمد عبداللہ خان ولد پیر بخش فاروقی ساکن اجمیر۔ سرسہ ضلع حصار میں کئی برس تک ریل کے محکمہ میں ٹھیکہ داری کرتے رہے آوائل مشق میں بطور خود کہتے رہے جب کچھ نیک و بد کی تمیز ہوئی تو سید زماں خان صاحب دہلوی کے شاگرد ہو گئے۔ کچھ کلام غلام عبدالقادر خان الغنی ناگپوری کو بھی دکھایا تھا اپنا دیوان موسوم بہ "چمنستانِ گفتار" عرصہ ہوا چھپوا کر شائع کر چکے ہیں۔ کلام معمولی درجے کا ہے کوئی خاص بات قابلِ ذکر انکے کلام میں نہیں ہے لکھنو کی طرز کے مقلد ہیں اور اُسی رنگ میں کہتے ہیں۔ سرسری نظر میں کچھ اشعار منتخب ہو کر درج تذکرہ کئے گئے

نہ شاکی ظلم کا ہُوں میں نہ خواہاں ہوں عنایت کا
کیا ہے میں نے جامہ زیبِ تن صبر و قناعت کا

کیا ہے اُن سے تُو نے آج کیا دیدار کا وعدہ
ترے سودائیوں میں شور کیسا ہے قیامت کا

جب تک نہ سہے رنج و غم و زحمت و تکلیف
کچھ مرحلہ عشق میں حاصل نہیں ہوتا

نیند آتی ہے تصورِ ابرو میں کیا مجھے
چلتا گلے پہ ہے مرے خنجر تمام رات

ہجرِ ساقی میں خونِ دل اپنا
پیتے ہیں ہم شراب کی مانند

کس طرح یار تجھ کو پائیں ہم
رہبر اپنا کسے بنائیں ہم

واعظ و شیخ بکے جائیں تو ہوتا کیا ہے
رند کب پند و نصیحت کو سُنا کرتے ہیں

رُلایا خوں جہاں کو تیری چشم ارغوانی نے
کھلایا زہر لاکھوں کو تری پوشاک دھانی نے

بہائے خون کے دریا تری تلوار نے قاتل
بجھائی پیاس لاکھوں کی ترے خنجر کے پانی نے

لکھا تقدیر کا ارے ناداں ؎
کہیں مٹتا بھی ہے مٹانے سے

جُھکا جاتا ہے دل اُس بت کی جانب
وہ قبلہ ہے تو دل قبلہ نُما ہے

خنجر۔ نواب محمد حسین خان باشندۂ فرخ آباد۔ دَورِ موجودہ کے شاعر اور غالباً مولانا طاہر فرخ آبادی کے تلامذہ میں ہیں۔ رسالہ نیرنگ سے کلام منتخب ہوا ؎

نکلنا حسرتوں کا اپنے دل سے کچھ نہیں آساں
اگر نکلی کوئی حسرت بڑی مشکل سے نکلے گی

بوقتِ نزع گر بالیں پہ میری تم نہ آؤ گے
تو یہ جانِ حزیں نکلے گی پر مشکل سے نکلے گی

خنجر منشی محمد عبد الغفور خان گھڑی ساز میرٹھ شاگرد مولٰنا شوکت شعر خاصہ کہہ لیتے ہیں موزوں طبع شاعر ہیں یہ چند شعر کلام بہم رسیدہ میں سے انتخاب ہوکر درج تذکرہ کئے گئے ۔

جان و دل صبر و تحمل لیلئے اک وارہیں	بار بار آئے تو کیا چھوڑ و گے جسم زار ہیں
درد غم رنج و تعب ارمان و حسرت ساتھ ہوں	ساتھ دل کے دفن یہ گنج شہیداں کیوں نہ ہو
نہ شاخ گل پہ تو بیٹھ اتنا پھول کر بلبل	خزاں ہے گل کے لیئے اور گل خزاں کیلئے
فرشتے بولے لحد میں جو داغ دل دیکھا	اسی کی روشنی کافی تھی دو جہاں کے لیئے

خنجر

خنجر - خنجر تخلص منشی محمد سعید ولد سید عبد المجید سادات حسینی سے ہیں - قدیم وطن دہلی تھا - مگر ایام غدر میں دہلی چھوڑ کر قصبۂ "نونی" میں جو دلی سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہے سکونت اختیار کرنی پڑی - لیکن جب تعلیم و تربیت کے قابل ہوئے تو آپکے والد ماجد نے "نونی" میں مدرسہ نہونے کی وجہ سے سکندر آباد میں جہاں آپ کی ننہال ہے سکونت منتقل کرلی - یہاں آپنے پہلے عربی فارسی میں تعلیم پائی پھر سرکاری مدرسہ میں داخل ہوئے اور مڈل تک پاس کیا - اسی دوران میں فن طب بھی تحصیل کرتے رہے - انگریزی کا مطالعہ بھی اسی وجہ سے چھوڑ دیا طب میں مہارت حاصل کرکے اب سکندر آباد میں مطب کرتے ہیں اپنے ماموں حضرت قاضی غیاث الدین صاحب خورشید سے مشورہ کرتے ہیں - نثر کا شوق بھی نظم کے ساتھ رہا - چند ناول بھی لکھے جو "جہاں نما" اور دیگر اخبارات میں ہفتہ وار شائع ہوا کیئے - رسالہ "ید بیضا" کے کئی سال تک اڈیٹر رہے -

نظم میں غلو رکاکت اور تعقید سے کلام کو بچاتے ہیں - متروکات کا بھی زیادہ خیال ہے یہی وجہ ہے کہ قاضی صاحب کے رنگ سے آپ کا رنگ جداگانہ ہے - کچھ شاگرد بھی کرلئے ہیں جن میں قمر، سکندر آبادی وحشمت، شاہجہاں پوری صاحب دیوان ہیں - کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو -

نظر آئے ہر اک ذرہ میں جلوہ شان وحدت کا	جو آنکھیں کھول کر دیکھے تماشہ تیری قدرت کا
دل چھپایا ہی تو نے مٹھی میں	ہاتھ لا اے نگار کیا کہنا !
وصل کے ذکر پر تجاہل سے	اُنکا وہ یار بار کیا، کہنا

دیکھ کر اشتیاق بسمل کا
غیر نکلا نہ تیری محفل سے

عرش پر ہے دماغ قاتل کا
کیا یہ ارمان تھا مرے دل کا

کچھ یہی واماندگی ہیں قیس کے کام آگئی
تھک گیا مجنوں تو پہنچی آہ محمل کی طرف

بہاریں جسکی قسمت میں تھیں لوٹیں اُسنے ای خنجر
خدا شاہد ہے یکتا ہوں تمھارے جاں نثاروں میں

مرا شیون مری فریاد بھی پہنچی نہ گلشن تک
نہ مجھسا پاؤ گے عاشق جو ڈھونڈھوگے ہزاروں میں

یہ مانا مجمع اغیار میں بولا نہیں جاتا
مگر کچھ تو کہو آنکھوں میں ہونٹوں میں اشاروں میں

سحر آتے ہیں، شام آتے ہیں وہ آتے ہیں آپ آئے
آؤ، ملجاؤ گلے، رُخ سے اُلٹ دو پردہ
ذرا چھیڑا جنوں نے کشمکش ہونے لگی باہم
مزے کیا کیا گناہوں میں گنہگار و نکو آتے ہیں
چارہ گر، درد کی کیا خوب دوا کرتے ہیں
میرے ہوتے ہوئے کیوں خنجر پہ ہو مشق ستم
آج کیا ڈر ہے کرو شوق سے عشاق پہ ظلم

دلِ بیتاب کو ابتک رکھا ہے ان سہاروں میں
کہیں خلوت میں بھی عاشق سے حیا کرتے ہیں
خدا جانے کہاں کی لاگ ہے دستِ گریباں میں
تری رحمت نے وہ پیدا کیئے ہیں لطف عصیاں میں
اُس کے پیکاں کو مرے دل سے جُدا کرتے ہیں
شرم آتی ہے مجھے آپ یہ کیا کرتے ہیں
دیکھنا تم کہ یہ کل حشر میں کیا کرتے ہیں

تم ماتمِ رقیب میں یُوں نوحہ گر نہ ہو
میں خوگر وفا ہوں مزا ہے فراق میں
شوخی نے پائی نشو و نما تیری آنکھ میں
دریائے عشق میں دُرِ مقصود کب ہاتھ آئے
حسرت دید میں مر جائیں تو عشاق کہیں
جان و دل لے لیئے خنجر یہ کرم ہے اُنکا
ساقیا ٹال نہ پیاسا مجھے میخانے سے
دل ملا شیشے سے آنکھیں لڑیں پیمانے سے

دیکھو کسی غریب کا ٹکڑے جگر نہ ہو
گو اُس صنم کا وصل مجھے عمر بھر نہ ہو
تو وہ ہے جسکی لاکھ میں نیچی نظر نہ ہو
جس کو یہ ہو خیال کہ اپنا ضرر نہ ہو
جلد اے کاش نقاب رُخِ زیبا اُلٹے
میرے احسان تو کیا اُنکے ہیں احساں اُلٹے
میرے حصے کی چھلک جائیگی پیمانے سے
ہم کہاں جاتے ہیں ساقی ترے میخانے سے

تھا تنگ ظرف جو باہر ہوا پیمانے سے — شیخ نکلا ہے بہکتا ہوا میخانے سے
محتسب میرا یہ پیمان ہے پیمانے سے — توبہ توڑوں گا میں خشتِ خمِ میخانے سے
پیری میں جوانی کا مذکور ہی کیا کرنا — اک خواب ہی بھولا سا اک بات ہے مدت کی

بلادوں عرش کو تابِ تواں مجھ میں یہاں تک ہے — تمہارا یہ تغافل بس مرے ضبطِ فغاں تک ہے
پھنکا جاتا ہوں ہمدم سوزِ فرقت سے کہوں کیونکر — لگی اک آگ سی گویا مرے دل سے زباں تک ہے
کسیکی تشنہ کامی کا تقاضا ہے یہ قاتل سے — مجھے بھی دیکھنا ہے تیغ میں پانی کہاں تک ہے

خنجر

خنجر۔ ابو البیان محمد سید عالم خنجر مودودی مارہروی۔ دورِ موجودہ کے شعرا میں سے ہیں اور فنِ سخن میں حضرت احسن مارہروی سے اصلاح لیتے ہیں۔ مولٰنا نذیر احمد کی مفصل سوانح عمری مرتب کی ہے اور بھی چند کتب انکی تصنیف سے ہیں۔ ۴۰ سال کے قریب عمر ہے۔
آپ کو انشا پردازی میں اچھا ملکہ حاصل ہے۔ اور فکرِ معاش سے بھی بدرجہ اوسط آسودہ ہیں۔ یہ کلام کا انتخاب ہے۔

گل اپنے رنگ و روپ پہ پھولا ہوا ہے کیا — دو دن کی ہے بہار ہمیشہ دھرا ہے کیا
ناراض کیوں ہوئے جو کہا تم کو بے مثال — تعریف حُسن کی ہے کوئی بد دعا ہے کیا
ہم ٹھان کر گئے تھے کہ سب کچھ کہینگے حال — پوچھا نہ اُسنے یہ بھی ترا مدعا ہے کیا
کہتے ہیں جسکو ڈھونڈتے ہو وہ تو دل میں ہے — خنجر تمہاری عقل پہ پردہ پڑا ہے کیا
کیا عجب عقدۂ دشوار جو آساں ہوگا — درد جب حد سے گذر جائیگا درماں ہوگا

غیر سے ربط تجھے مجھ سے قضا کو نفرت — کون حالِ دلِ بیمار کا پرساں ہوگا
وعدۂ وصل سے کیا خوش ہوں کہ کھٹکا یہ ہی — حسرتیں نکلیں جو دل سے تو یہ ویراں ہوگا
وہ بھی دن ہوگا خدایا کہ بر آئے گی اُمید — وہ بھی دن ہوگا کہ کوئی مرا مہماں ہوگا
کہنا جو اُسنے تھا وہ میرے دل میں رہگیا — اصلی خیال شکوۂ باطل میں رہ گیا
دل نظروں نظروں ہی میں اُڑا لیگئے وہ صاف — میں دیکھتا کا دیکھتا محفل میں رہ گیا

جس کو دیکھا اُسی پہ لوٹ گیا
دل سا بھی کوئی من چلا نہ ہوا
یار رہا ہیں پہ جب تک آ نہ لیا
تن سے دم، دم سے تن جدا نہ ہوا
فصلِ گُل آئی گو ہزاروں بار
نخلِ دل ہی مرا ہرا نہ ہوا

کہتا ہے ہر گھڑی دلِ زحمت طلب یہی
کچھ چاشنیِ دردِ محبت ضرور ہو
اللہ رے اثر تری برقِ نگاہ کا
جل جائے اِک نظر میں اگر کوہِ طور ہو

ہوتی ہے عیاں لاکھ حجابوں میں تجلی
پردے میں نہاں وہ رُخِ روشن نہیں رہتا

مہرو نے ہی طعنہ یہ دیا آج سرِ بزم
عاشق کی زباں پر کبھی شیون نہیں رہتا

جب اُسکی شوخیاں بچپن میں لکو چھپنے لیتی ہیں
تو پھر کیا کچھ نہ ڈھائیگا ستم وہ نوجواں ہو کر

خوفِ عدو وہاں تھا یہاں خوفِ حشر ہے
دنیا میں چین تھا نہ ہمیں ہے مزار میں
اپنے گناہ پر جو ہوا مجھکو انفعال
رحمت نے اُسکی لے لیا مجھکو کنار میں
خونِ شہیدِ ناز کے دھبے جو پڑ گئے
نقش و نگار بن گئے شمشیرِ یار میں
حاسد کا گر گزر نہیں جنت میں ایخدا
دشمن کا کیوں قیام ہے پھر کوئے یار میں

ہمارے جذبۂ دل میں اگر تاثیر ہو جائے
سنبھل جائے مقدر کار گر تدبیر ہو جائے
دعا میں اسقدر یارب مری تاثیر ہو جائے
کہ اُس سے جو کہے یہ عاشقِ دلگیر ہو جائے
نشانِ قبر تک ظالم نے اِس ڈر سے مٹایا ہے
مبادا گردِ عاشق اُٹھکے دامن گیر ہو جائے
کھنچے نقشہ بھلا کس طرح اُسکے روئے تاباں کا
مصوّر دیکھکر جب صورتِ تصویر ہو جائے
پریشاں کیوں نہ ہو قاتل ہماری سخت جانی سے
گلے پر پھیرتے ہی کُند جب شمشیر ہو جائے

وہ نازنیں شبِ وصل اسطرح حجاب میں ہے
زباں پہ قفلِ خموشی ہے مُنہ نقاب میں ہے
مٹائی محفلِ ہستی جگایا فتنۂ حشر
اثر بلا کا تری چشمِ نیم خواب میں ہے
وفورِ طیش سے رخسار اور سُرخ ہوئے
دو چند حسنِ رُخِ دلربا عتاب میں ہے
ادھر خیالِ جدائی ادھر خیالِ سحر
وصال میں بھی مری جان اک عذاب میں ہے

خنجر

خنجر: منشی مرزا افدا علی لکھنوی شاگرد سیف شاہجہانپوری۔ آپکے والد مرحوم کا نام منشی آغا صاحب تھا۔ کٹرہ سرائے میوا میں آپکا مکان ہے استعداد علمی بقدر ضرورت ہے، ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ اِس حساب سے اب چوبیس برس کا سن ہے سولہ برس کی عمر سے شعر گوئی کا مذاق شروع ہوا، پہلے چند غزلیں خواجہ عشرت لکھنوی کو دکھائیں اب جناب سیف شاہجہانپوری سے تلمذ اختیار کیا ہے، چھ سات ناول بھی لکھ چکے ہیں۔ اب حال میں حضرت واجد علی شاہ کی تالیف پریخانہ کا ترجمہ کرکے شایع کیا ہے، مثنوی انجام عشق زیر طبع ہے۔ کلام اور حالات جو انھوں نے ہنگام تحریر تذکرہ ارسال کیے اُنکا خلاصہ حاضر ہے

تھا جس سے دل کو چین وہ کاشانہ چھٹ گیا — اب جی کے کیا کریں درِ جانانہ چھٹ گیا

وہ وحشت ناک سناٹا وہ پرہیبت شب ہجراں — وہ گھبرا کے در و دیوار پر میری نظر جانا

ہماری سرد آہوں سے وہ بجھنا شمع محفل کا — اندھیرے میں وہ گھبرا کر کسی کم سن کا ڈر جانا

برائی دخترِ رز کی نہ ہوتی پھر سرِ ممبر — اگر زاہد کبھی اک گھونٹ بھی تو نے پیا ہوتا

ظلم سے کوئی فائدہ نہ ہوا - مرگیا میں ترا بھلا نہ ہوا — مجکو بے کیسے یاد کرتے ہیں - ہائے وہ درد آشنا نہ ہوا

غش میں جو ہیں مریضِ غم ہوش میں آئے یا نہ آئے — گیسوئے مشکبوئے یار تیری بلا کو کیا غرض

بدلی رہی جو یوں ہی کچھ روز آسماں پہ — پیرِ مغاں کے بر میں ہوگی قبائے واعظ

ہوگی سحر کو گرمی بازارِ حسن سرد — شب بھر دکھائے شعلۂ رخ کی بہار شمع

قلبِ لیلیٰ میں ہوا قیس کی آمد کا خیال — آئی جب بادِ صبا پردۂ محمل کی طرف

اِک عمر پیا ہجر میں خونِ جگر و دل — ہے پر مجھے ناداں ہوس جام ابھی تک

راہ میں کعبہ پڑا تھا کرلیا جھک کر سلام — سامنے آتے ہوئے اُس بت کے شرماتے ہیں ہم

بیکسی میں اپنی دل رویا جو فرطِ ضعف سے — درد نے اُٹھکر کہا کروٹ بدلواتے ہیں ہم

آئے تھے بے آبرو ہو کر جہاں سے رات کو — اضطرابِ دل سے پھر اُس بزم میں جاتے ہیں ہم

جفاؤں سے کلیجہ پک گیا ہے پیش خدا اب تو — تری فریاد لیکر او بتِ مغرور جاتا ہوں

لپٹ جالے غبارِ عاشقِ ناشاد دامن سے　　کہ وہ گورِ شہیدِ ناز سے بچ کر نکلتے ہیں

افسوس دل میں رہ گئی سب دل کی آرزو　　پوری ہوئی نہ ایک بھی بسمل کی آرزو

ممکن نہ تھی جو لیلیِ پردہ نشیں کی دید　　مجنوں کو تھی نظارۂ محمل کی آرزو

دل نے جس جلوہ کو پہلو میں نہاں دیکھا ہے　　تم نے موسیٰ وہ سرِ طور کہاں دیکھا ہے

توبہ پہ گر ہی بجلی اور گھر کے گھٹا چھائی　　اب پیرِ مغاں بوتل کونے میں دھری کیوں ہے

یہ خشکیِ لب کیا ہے یہ زردیِ رُخ کیسی　　گر درد نہیں دل میں آنکھوں میں تری کیوں ہے

کس غیرتِ گلشن کا سودا ہے تجھے اوگل　　اس فصلِ بہاری میں یہ جامہ دری کیوں ہے

عشق سے کب غرض تھی وصلِ بتاں　　جان اپنی ہمیں گنوانی تھی

ناامیدی نہ مٹا داغِ تمنا دل سے　　اس گلستاں میں یہ اک پھول کھلا رہنے دے

کبھی تو ہو آرزوئے کعبہ ہوس کبھی کوچۂ بتاں کی　　بتاؤں کیا حال اپنے دل کا لگی ہے ظالم کو لو کہاں کی

صبا یہ پیغام میرا کہنا جو کوچۂ یار میں گذرنا　　کہ جاں بلب ہے مریضِ فرقت خبر بھی ہے کچھ تمھیں وہاں کی

ادھر ہے صیاد ادھر ہیں گلچیں چمک رہی ہے فلک پہ بجلی　　خدا ہی کچھ باغباں بھی ہم سے ہے آگہی اب خیر آشیاں کی

[illegible]

خندان — میرزا امجد علی رامپوری۔ دورِ موجودہ کے شاعر ہیں۔ رسالۂ نیرنگ رامپور سے کلام نقل ہوا۔

ہوا معلوم کہ بس ہو گیا سب خوں پانی　　جائے خوں جبکہ مری چشم سے آنسو نکلا

ہم تو سمجھے تھے جبھی قافلۂ صبر لٹا　　چشمِ خونبار سے جس روز کہ آنسو نکلا

بزم میں آپ کی کب چین کسی نے پایا　　پیٹتا سر، کوئی سینہ، کوئی زانو نکلا

خندہ — میر شجاعت علی صاحب خندہ بریلوی ظرافت پسند تھے۔ طبیعت میں ظرافت بیحد تھی۔ ۱۲۶۰ھ کے قریب بریلی میں زندہ و سلامت موجود تھے۔ دس بارہ غزلیں ہنگامِ ترتیبِ تذکرہ ہاتھ آئیں ان کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو +

ایک سے ایک شبِ ہجر میں بڑھ کر آیا　　کبھی پسّو، کبھی کھٹمل، کبھی مچھّر آیا

پھوس سے یار کو جاڑوں میں تنہا پایا شبِ وصل
کام آخر مرا ٹوٹا ہوا چھپر آیا
اپنی گھوڑی کو جُدا کر تو سڑک سے ای شیخ
ہِنہِناتا ہوا خندہ کا وہ خچر آیا

ہوں کوئی دس سیر چاول اور من بھر شیر ہو
ڈالدو کھاری نمک تو خوب میٹھی کھیر ہو
مے پرستو شیخ صاحب کی یہ اب توقیر ہو
پاؤں میں گھنگرو بندھیں اور ناک میں اک تیر ہو
کیا کوئی چھیڑے انھیں اور کیا لگائے کوئی ہاتھ
ناک کے پکڑے سے جنکی پھوٹتی نکسیر ہو
ہے دہن کا انکے بوسہ میرے سودا کا علاج
جس طرح اے خندہ تلّی کی دوا انجیر ہو

مرا رقیب الٰہی ذلیل و خوار رہے
گلے میں ٹوٹی ہوئی جوتیوں کا ہار رہے
لحاف اوڑھ کے چھپر پہ مائیوں بیٹھے
کہ جب نکاح کے دن انکے تین چار رہے
لگا کے آگ بجھانے کو جاؤں دیکھوں اسے
مرے محلّہ میں آکر اگر وہ یار رہے

ہضم ہوتے نہیں اب پانچ روپے رشوت کے
لوگ کھاتے تھے پچاسے کے پچاسے پہلے
سینہ پر مار کے ہاتھوں کو وہ سر کوٹتے ہیں
ڈھول پیچھے سے بجا کرتے ہیں تاشے پہلے

جو شعرِ غیر کو اپنا بنا کے پڑھتا ہے
چھپے ہزار وہ لیکن مری نگاہ میں ہے

خواجہ

خواجہ نواب فیاض الرحمن احمد المعروف بہ پیارے صاحب خواجہ مقیم کلکتہ خاندان شاہی میسور سے ہیں شعر گوئی کا بھی شوق ہے۔ مولوی سیّد حیدر طبا طبائی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ یہ اِن کا کلام ہے۔

آئینہ لیکے کیجئے انصاف
کیوں نہ عاشق ہوں ایسی صورت پر
رحم بلبل پہ چاہیئے صیّاد
چادرِ گل ہو اُس کی تربت پر

اے صبا مجنوں سے کہدے چھوڑدے وہ دشت کو
وحشتِ دل لے چلی مجھکو بیاباں کی طرف
سب لے دیئے جان عشق میں اصلا نہیں عاشق کو چین
جائے پروانہ نہ کیوں شمع شبستاں کی طرف
دیکھ لو جذبِ دلِ مجنوں کی تاثیر اے بتو!
محملِ لیلیٰ رواں ہے خود بیاباں کی طرف

خواہاں

خواہاں۔ مولوی سیّد قاسم علی نقوی خلف سیّد ولدیت علی سیّد بریلوی سنہ ۱۲۶۴ سالِ ولادت

سے ہے بزرگ انکے امروہہ کے رہنے والے تھے اپنے بزرگوں کی تقلید سے شعر گوئی کا اوائل عمر میں شوق ہوا۔ راجہ کالیچرن صاحب رئیس بریلی کی اُستادی کا شرف آپ کو حاصل ہے اور بریلی ہائی سکول میں فارسی کے مدرس ہیں۔ اکثر شاعری کا مشغلہ رہتا ہے کم وبیش چالیس سال سے آپ شعر کہتے ہیں اور بریلی کے اکثر نومشق شاعر آپ سے اِس فن میں مستفید ہوتے ہیں بندش مضمون کی طرف جسقدر توجہ ہے اُسی قدر شستگی زبان کی جانب سے بے پرواہی معلوم ہوتی ہے ہنگام ترتیب تذکرہ میں پچیس غزلیں نظر سے گذریں جن کا انتخاب ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے ۔

وہ مہر وش اگر سرِ بازار آویگا ۔ خود ماہِ مصر ین کے خریدار آئیگا
ہوگا جو شوقِ آمدِ جاناں میں اضطراب ۔ تسکین دینے وصل کا اقرار آئیگا
روئینگے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے ۔ مدت کے بعد ملنے جو ہر خار آئیگا
ایسا ہوں بدنصیب کہ بن جائیگا وہ دھوپ ۔ سر پر مرے جو سایۂ دیوار آئیگا
دیدارِ چشمِ ساقیِ میکش کریگا مست ۔ جو خمکدے میں جائیگا سرشار آئیگا

عیشِ وصلِ یار سے فرقت کا غم کم ہوگیا ۔ عید کا چاند اِن دنوں ماہِ محرم ہوگیا
آیا خیال پھری زلفِ یار کا ۔ بگڑا دماغ نافۂ مشکِ تتار کا

فرقتِ ساقی میں بگڑی ہے کے میخانے کی بات ۔ کون پوچھے خم، صراحی، جام، پیمانے کی بات
یارِ زینت دوست کو ہے شوقِ آرائش کمال ۔ ذکرِ آئینہ ہے دن بھر رات بھر شانے کی بات
قید خانے میں مجھے فصلِ بہار آئی ہے ۔ کھول ای دستِ جنوں پاؤں کی زنجیر کے پیچ

خطِ نسخ پھیرا کتابی رخوں پر ۔ ترے مصحفِ رخ نے قرآن ہوکر
جانبِ کعبہ جو گذرے بتِ پُرفن ہوکر ۔ بتکدہ شیخ حرم آئے برہمن ہوکر

پژمردہ فکرِ صبحِ شبِ وصل سے ہے دل ۔ پہلے مجھے پڑے ہیں چراغِ سحر سے ہم
فرطِ عصیاں نے کیا ہی مجھے محرومِ نجات ۔ رحمتِ حق جو کرے پاس تو کچھ دور نہیں
عشق ابرو میں ہرے زخمِ جگر کرتے ہیں ۔ آب شمشیر سے اِس کھیت کو تر کرتے ہیں

مہمان جان کے لئے ترک ترے تیروں کو
خاطریں دل سے مرے زخم جگر کرتے ہیں

محضرِ ظلم جفا جو کے سند ہونے کو
مُہر پر مُہر مرے زخم جگر کرتے ہیں

ہے یہ سوزِ دلِ محزوں کہ ہر اک قطرۂ آب
آبلہ بنتا ہے ہونٹوں کو جو تر کرتے ہیں

شہدا لیتے ہیں اُٹھ اُٹھ کے قدم قبروں سے
وہ اگر گنجِ شہیداں میں گذر کرتے ہیں

آجکل زور پہ ہے گردشِ قسمت اپنی
عیب ہوجاتا ہے خواہاں جو ہنر کرتے ہیں

قتل ہوجاؤں تو نیند آئے مجھے آرام سے
صبح کا جھوکا ہوائے دامنِ شمشیر ہو

جان پڑ جائے مرقعہ میں اگر آجائیں آپ
مائل پرواز ابھی ہر طائر تصویر ہو

کریں وہ غیر کی خاطر ہمارے جیتے جی
نہ کیسے لطفِ حیات اپنا بدمزا ہوجائے

چھٹے گا عشق بتوں کا کبھی نہ خواہاں سے
ہزار متقی بن جائے پارسا ہوجائے

اے ادب آکے ذرا دیکھ مقامِ تسلیم
راہِ معشوق میں سر رکھتے ہیں پا سے پہلے

پڑی جس طرف کارگر ہوگئی
قیامت وہ تیغ نظر ہوگئی

خواہش

خواہش حافظ مولا بخش صاحب خواہش شاہجہاں پوری شاگرد حافظ نثار احمد صاحب ثابت۔ یہ دو شعر انکے ملے ؎

دلِ دوپارہ کو گر عشق کا بخار رہے
تو مرکے صورتِ سیماب بیقرار رہے

ڈاک بجلی سے خبر کسواسطے جاتی ہے جلد
کیا نمونہ تار برقی ہے نظر کے تار کا

خواہش

خواہش منشی امیر حسن نام خلف اکبر مولوی حکیم سیّد امداد علی کاہش جونپوری حنفی مذہب قادری مشرب اور فنِ شعر میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔ موضع بڑا گاؤں ضلع جونپور میں شادی ہو جانے کے باعث قیام اختیار کرلیا تھا۔ کچھ عرصہ مہاراجہ بنارس مرحوم کی سرکار میں ملازم بھی رہے تھے بعارضۂ سل حضرت کاہش کے انتقال کے تین چار سال بعد رحلت کی ؎

جمع زلفوں کے جو اجزائے پریشاں کرتے
بیتِ ابرو کو ترے مطلعِ دیوان کرتے

کھول کر زلف کو رُخ پر ترے لٹکا دیتے
ہم اسی پیچ سے ہندو کو مسلماں کرتے

حال کیا ہم نفسِ سرد کا تجھ سے کہتے	گرم کیا تجھکو ہم اے نالہ سوزان کرتے
عید کے روز مرے گھر جو وہ آتا خواہش	دل تو پہلے ہی دیا جان بھی قربان کرتے

خواہش

خواہش میر اللہ داد متوطن الہ آباد قاضی محمد خلیل کی بیاض سے ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔

ہر قدم پر ہیں آفتیں برپا	چال ہے یا کوئی قیامت ہے

خوب

خوب ڈاکٹر خوبداد خان صاحب ہیڈ اسسٹنٹ محکمہ کمسریٹ انکے والد صبح خان ریاست رامپور کے باشندے تھے انہوں نے ۱۸۹۶ء میں اپنا دیوان بھی چھپوا دیا ہے شعر خاصہ کہہ لیتے ہیں مضمون بھی نکل آتا ہے اور خیال بھی صاف ہوتا ہے۔ سرسری نگاہ میں جو شعر اچھے معلوم ہوئے انتخاب کر کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

مظہر ہے دل تجلی حق کے ظہور کا	ہر دم مشاہدہ ہے یہاں اسکے نور کا
سینہ ہمارا وادیٔ سینا سے کم نہیں	عالم ہمارے قلب پہ ہے کوہِ طور کا
کیوں ہے شیدا بتانِ کم سن کا	ناز کب تک تم اٹھائے گا ان کا
گھائل جگر و دل ہوئے صرف ایک نظر سے	ہے وصف نگہ میں تری کیا تیغ دودم کا
ہے کس غضب کی الٰہی بہار گلچیں پہ	کہ ہوتے ہیں گل و غنچے نثار گلچیں پر
آیا گلزار سے اے شوخ جو کل تو ہو کر	رنگ ایک ایک گلِ تر کا اڑا اڑ بو ہو کر
کوئی مسجد کو چلا اور کوئی بتخانے کو	میں چلا جھومتا ساقی ترے میخانے کو
ہو سکتا ہے تو بحر کرم ہم سے کب جدا	ہوتا نہیں الگ کبھی دریا حباب سے
کی یہ کل ترکیب اُن کی ضد گھٹانے کیلئے	زلف کے شانے نے بوسے ہنسنے شانے کیلئے

خوب

خوب۔ خوب چند نام عرف پاپا لال تیئیں برس کی عمر ہے۔ شیخ محمد صاحب ہزبر سے تلمذ ہے ابھی مشق سخن کی ابتدا ہے۔ حیدرآباد دکن وطن ہے۔ کلام مرسلہ میں سے یہ چند شعر منتخب ہو کر درج کئے گئے۔

زمین ہے سرخ مانند شفق خون شہیداں سے	نہ کیوں ترک فلک کو رشک کے کوئے قاتل سے

زمیں پر وہ تڑپ کر اس ادا سے جان دیتا ہے محبت ہے ترے تیر نظر سے	قضا بھی لوٹ جاتی ہے تمہارے رقص بسمل پر نکالوں کس طرح اسکو جگر سے

خورشید

خورشید۔ سید محمد خورشید علی بلگرامی ۱۹ شعبان ۱۱۵۹ ہجری میں بمقام بلگرام پیدا ہوئے ذوق علم جبلی تھا۔ سید محمد خلف علامہ عبد الجلیل بلگرامی کی خدمت میں تحصیل علم کیا آخر شعر کا شوق دامن گیر ہوا فارسی کہنے لگے پہلے شیخ صانع بلگرامی بعدہ شیخ محمد صدیق سخنور سے اصلاح لی اُسکے بعد حضرت آزاد بلگرامی کو بذریعۂ خط وکتابت حیدر آباد دکن اپنا کلام اصلاح کے لیئے بھیجا۔ اُس وقت تک فصاحت تخلص کرتے تھے حضرت آزاد نے خورشید تخلص بدل دیا اُس کے بعد شیخ علی حزیں علیہ الرحمۃ سے فیض پایا۔

آغاز شباب میں بمقام کوڑا جہاں آباد سرکار شاہ عالم بادشاہ میں سرفراز اور الف خان رسالہ دار کے ہمراہ ہوئے۔ ملازمت ترک کر کے پھر نواب سید نور الحسن خان بلگرامی کے پاس چلے آئے انکے قرابت قریبہ میں تھے وہ ضلع شاہ آباد میں صاحبان انگریز کی طرف سے متعہد تھے خان صاحب نے اپنا کاروبار انکے سپرد کیا۔ آخر سرکار انگلشیہ میں بلیا کی تحصیل انکے سپرد ہوئی تھی کہ مرض لقوہ میں مبتلا ہوئے اور ۱۲ صفر ۱۲۰۱ ہجری کو انتقال کیا۔ طرز زمانہ کے موافق کبھی کبھی اُردو میں فکر سخن کرتے تھے یہ چند اشعار اُنکے لکھے جاتے ہیں۔ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی انکے پڑپوتے تھے۔

مرا دل ہے مائل اب اُس تند خو کا لگا تیر اُلفت یہ دل میں کسو کا	جو پیاسا ہے ہر آن میرے لہو کا کہ جاری ہے آنکھوں سے دریا لہو کا
اسقدر بیتابیاں ہیں اس دل بیتاب کو	بیقراری جس طرح آتش پہ ہو سیماب کو
صبا کہیو پیام اتنا مرا اُس یار جانی کو	کوئی کھوتا ہے تیرے ہجر میں اپنی جوانی کو
بیمار عشق کے ترے جینے پہ حرف ہے	پانی کہاں وہ اسکے بھی پینے پہ حرف ہے
وہ آئے چڑھ کے گھر سے لڑائی کیواسطے	یاں پاؤں ٹیکتے ہم ہیں صفائی کیواسطے

یارب جُدا نہووے کسی سے کسی کا دوست	کرتا دُعا ہوں ساری خدائی کیواسطے

خورشید

خورشید - میر سیّد علی مرحوم خلف سیّد مظفر علی قوم سیّد مذہب شیعہ - آپ قصبہ چلکانہ ضلع سہارنپور کے باشندے اور اچھے خاصے تعلیم یافتہ، خوش باش، خوش گذران زمیندار تھے، مزاج میں تہذیب، متانت اور تواضع کا سلیقہ قابلِ تعریف تھا - باہر کے باکمال جو سہارنپور آتے اِنکی کشش اخلاق سے اکثر انکے مہمان ہوتے تھے - فنِ سخن میں خورشید، اور فنا، دو تخلص کرتے تھے، مذاقِ سخن کی تحریک سے خود بھی دہلی اور لکھنؤ گئے اور وہاں کافی عرصہ تک باکمالوں کی صحبت سے فیضیاب ہُوئے - آخر عمر میں زیادہ تر نعت کہنے کا شغل رہتا تھا - دیوان غزلیات سُنا ہے کہ مرتب تھا مگر اولاد کی غفلت سے اُسکی اشاعت کی نوبت نہ آئی کربلا و نجف کی زیارت سے بھی بہرہ اندوز ہوئے تھے آخر ۸۵ برس کی عمر پاکر اپنے وطن ہی میں ۱۸۸۸ء میں وفات پائی - دونوں طرح کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو -

گلچیں نے کوئی تازہ جفا کی چمن میں کیا	جھونکے اُداس آج جو بادِ صبا کے ہیں
مارا ہے گر، جلا بھی تو اے غیرتِ مسیح	ہم کب سے منتظر تری قُم کی صدا کے ہیں

برق کو غیرت یہ دلواتی رہی	ابر کو ہر لحظہ شرماتی رہی
مثلِ دریا جوش میں آتی رہی	چشمِ تر یہ اشک برساتی رہی
آبرو برسات کی جاتی رہی	

دل سے دنیا کی ہوس جاتی رہی	گو وہ باغِ سبز دکھلاتی رہی
عقلِ دور اندیش سمجھاتی رہی	حُر کو فوجِ شام بہکاتی رہی
حبِ حیدر راہ بتلاتی رہی	

خورشید

خورشید پنڈت سورج پرشاد خورشید وکیل فرخ آباد خلف پنڈت آسا رام - اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے دیوان مطبوعہ نظر سے گذرا اُس کا انتخاب درج ذیل ہے کلام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے ۱۲۹۵ھ تک حیات تھے +

پرنیاں شہ کو مبارک ہو گدا کو کمل
میں تو دیتا ہوں دعا تم مجھے دشنام ہی دو

جامہ بخشا ہے جنوں نے مجھے عریانی کا
کچھ تو ملجائے صلہ مجکو ثنا خوانی کا

اقبالِ خداداد کی ہے اور ہی صورت
آئینہ بنانے سے سکندر نہیں ہوتا

کھلنی ہی نہیں دل کی کلی باغ جہاں میں
مٹھی میں جو غنچہ کی طرح زر نہیں ہوتا

آج مختار ہیں جو ظلم و دچاہیں کرلیں
حشر کو ہوگا مرے ہاتھ میں دامن انکا

ید بیضا کو ہتیلی کا پھپولا سمجھیں
دیکھیں جو حضرتِ موسیٰ رخِ روشن انکا

خوابِ راحت ہی کہاں نادان چرخ میں
گردشِ ایام ہے اے دل یہ گہوارہ نہیں

گردشِ ایام سے پھرتا نہیں اپنا نصیب
اخترِ قسمت مرا ثابت ہو سیّارہ نہیں

کون سا منوں نہیں تیری نگاہِ ناز میں
کان ہے جادو کی چشم شعبدہ پرداز میں

بھتی کسے جوشِ جوانی میں خبر انجام کی
عشق بازی کھیل اک سمجھے تھے ہم آغاز میں

نہیں جاتی اصالت آدمی کی صحبتِ بد سے
ہوا آہن رہے جو پاس آہن کے طلا برسوں

عشق لکڑی کو بھی ہو بے سروساماں کرتا
بیدِ مجنوں میں گل و برگ و ثمر کچھ بھی نہیں

نہ ذبح کر مجھے ظالم کہ صید لاغر ہوں
عبث لہو میں نہ بھر ہاتھ منتِ پر کے لیئے

دہانِ زخم سے چوسا زبان خنجر کو
مزے وصال کے کیا کیا نہ ہمنے مر کے لیئے

غبار ہو کے پڑے دیدۂ رقیب میں ہم
لیئے عدو سے جو بدلے تو ہمنے مر کے لیئے

اربابِ صفا زنگِ کدورت سے بری ہیں
خورشید کے چشمے میں تو کائی نہیں ہوتی

ملکِ عدم کو اب کوئی پیاسا نجائیگا
قاتل نے آبِ تیغ کی رکھی سبیل ہے

پھٹ جائیگا شکم غمِ دنیا بہت نہ کھا
اے بوالہوس غذا یہ نہایت ثقیل ہے

پھولو نہ بلبلو اچمن بے ثبات پر
غنچوں کی جو چٹک ہے وہ کوس رحیل ہے

خورشید

خورشید۔ خورشید احمد خورشید از اولاد حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی ہی اوائل میں شاہ رؤف احمد سے بیعت کی بعد میں شاہ سعد اللہ حیدرآبادی سے فیض یاب ہوئے اطراف ہندوستان

اور خراسان۔ فرغانہ۔ سمرقند۔ فارس۔ بخارا۔ بلخ۔ ممالک دور دراز میں مدت سفر کیا اور ہر صاحب کمال سے فیض حاصل کیا۔ فن شعر میں پہلے شاہ رؤف احمد صاحب رافت اپنے پیر سے اور آخر میں مومن خان اور نواب اسد اللہ خان سے مستفید ہوئے دہلی میں ولادت ہوئی تھی۔ فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر خوب کہتے تھے۔ یہ آپکے کلام کا انتخاب ہے ٭

کہاں پہلو میں دل خورشید جسکو ہم تسلّی دیں	جو کچھ تھا آنسوں کے ساتھ خوں ہو کر نکل آیا
جاتا نہیں آنکھوں سے تصور کبھی خورشید	موجود ہے ہر وقت وہ گویا میرے آگے
نوید وصل یہ مانا کہ جھوٹ ہے خورشید	کسی طرح کوئی تسکین اضطراب تو دے
بتوں کے عشق سے باز آتے ہی نہیں خورشید	رلاتا ہے تمکو محبت میں کیا مزہ کھتے

خورشید

خورشید ۔ سیّد محمد مصطفےٰ خورشید عرف مولوی للّن نبیرہ مولٰنا سیّد دلدار علی صاحب مجتہد العصر اوائل عمر سے شعر گوئی کا شوق رہا عربی فارسی اور فنون شاعری مثل عروض وقافیہ سے اچھی طرح واقف ماہر تھے فن سخن میں پہلے اپنے ماموں سیّد محمد جعفر اُمید اور پھر آغا حجو لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے علاوہ غزل کے مرثیہ و نوحہ و سلام بھی کہتے تھے۔ اکثر ایام محرم میں مثل اور مرثیہ خوانوں کے یہ بھی باہر جایا کرتے تھے دو مرتبہ کربلائے معلّٰی کی زیارت بھی کی۔ نواب مہدی علی خان ماہر داماد نواب تاج محل صاحبہ کی لڑکی ان سے منسوب تھیں۔ انکے خاندان میں اکثر بزرگ صاحب علم وفضل گذرے ہیں۔ کئی سال تک ایک ماہوار رسالہ "شعر و سخن انتخاب" نامی اپنے اہتمام سے نکالتے رہے ۵۴ برس کی عمر میں ۱۹۰۱ء کو انتقال کیا۔ ایک دیوان اُردو ایک رسالہ موسوم بہ "افادات" اِن سے یادگار ہے۔ افادات میں اپنا حال اور عروض و قافیہ اور اپنے متروکات وغیرہ تحریر کیے ہیں۔ یہ مختصر رسالہ نہایت قابلیت سے لکھا ہے شاعری اور عروض میں مشاق شاعر تھے اور مذاق سخن بھی اچھا تھا اکثر ارباب فن اِنکے شاگرد ہیں۔ اِنکے کلام کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے ٭

موسیٰ کی طرح طالب دیدار کون ہو	اس دل میں کیا نہیں جو سر کوہ طور تھا

ہیں بخشتا گناہ کیے گو کہ سے کریم — رحمت کو چھوتے تو ہمارا قصور تھا

زہاد سے کہتا ہے وہ بت سامنے آ کر — اب دیکھ لو گر شانِ خدا کو نہیں دیکھا

تنکا تنکا جمع کیوں کرتے بناتے کس لیے — ہم نہ سمجھے تھے کہ برباد آشیاں ہو جائیگا

مرمٹوں کی تربتیں کردو برابر شوق سے — یہ بھی اپنی بے نشانی کا نشاں ہو جائیگا

مانا نظر پڑی تھی دل آیا پھر اسپہ کیوں — آنکھوں کی کیا خطا سب اِسی کا قصور تھا

عشقِ جاناں میں ہوئی باعثِ رونق ہر شے — درد بھی دل میں رہا زینتِ پہلو ہو کر

ستم کیے تو کیے اب تو صاف ہو مجھ سے — جو کچھ ہوا وہ ہوا یہ کہو خفا تو نہیں

طلب پہ بوسہ کی کیوں اسقدر بگڑتے ہو — زبان ہی سے کہا تھا چلو لیا تو نہیں

حفظِ جان ہجر میں اشفاق بہت ہے اے دوست — کسکو کہدے اُسے دیدوں میں امانت تیری

یہ منہ کو پھیر کے کیسے اشارے ہیں دمِ ذبح — حلال کرتا ہے ظالم کسے دکھا کے مجھے

عاشق ہی کا یہ دل ہے کہ ساکت ہے میری جان — پتھر بھی جو ٹوٹیں گے تو فریاد کریں گے

بتوں کے قبضۂ قدرت کو کوئی کیا جانے — یہی ہیں وہ کہ جو برسوں خدا کے گھر میں رہے

ہم ایسے زار بھی کہیں دیکھے ہیں اے حباب — تن کے عوض ہوا ہی ہوا پیرہن میں ہے

دل سے اُٹھے نہ دھواں عشق میں جلتا تمہی — یوں تو اک شمع بھی ہے بزم میں جلنے کے لیے

دم ہے تیرا جہاں میں شبِ فرقت باقی — نہ رہیگی کوئی دنیا کی مصیبت باقی

ہر آن بانیِ ستم و جور ہو گئے — تم تو جوان ہوتے ہی کچھ اَور ہو گئے

خورشید

خورشید۔ حاجی میرزا خورشید احمد خاں خورشید۔ خلف شاہ انوار الحق ساکن گوپامئو نواب عظیم جاہ۔ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ شاہزادہ ارکاٹ کے داماد ہیں اور مدراس میں رہایش ہے زیادہ حال معلوم نہ ہوسکا۔

خالی ہی ہاتھ جائیں گے آئے تھے جیسے ہم — لایا ہو جو کچھ بھی تو پھر لیکے جائے کیا؟

اب وہ تیرِ مژہ چلاتے ہیں — دل کو تو وہ مرے بناتے ہیں

رُخ کے بوسے جو لیتی ہے کاکُل	ہم یہاں پیچ و تاب کھاتے ہیں

خورشید

خورشید منشی خوش وقت علی خان خلف منشی داؤد خان نفانہ دار اکبر آباد کے رہنے والے اور میرزا فتح اللہ برق کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ نواب کلب حسین خان نادر کے دوستوں میں تھے، نہایت خوش فکر اور طباع سخن سنج تھے، آٹھ نو شعر سے زیادہ کی غزل نہیں کہتے تھے مگر غزل مرصع ہوتی تھی اور اہل مشاعرہ پھڑک جاتے تھے۔ منیر شکوہ آبادی کے ہمعصر اور نواب فرخ آباد کے ہاں ۱۸۵۴ء میں ملازم تھے۔ طاہر اکبر آبادی نے اپنے بچپن میں انھیں دیکھا تھا۔

بوسے دہانِ تنگ سے تم جی پھڑک گیا	یہ کس طرف گلاب کا غنچہ چٹک گیا
ایذا اُٹھا چکا ہوں محبت کے درد کی	کھینچی کسی نے آہ میرا دل دھڑک گیا
گردن میں ہے کمندِ محبت پڑی ہوئی	جتنے کھنچے حضور میں آگے سرک گیا
خورشید مرحبا یہ محبت کا جوش ہے	آئی بہار ہاتھ میں ساغر چھلک گیا
جدائی کے صدموں کو ٹالے ہوئے ہیں	چلے جاؤ ہم دل سنبھالے ہوئے ہیں
عجب مست اللہ والے ہوئے ہیں	چُنے موتیوں کے نوالے ہوئے ہیں
لحد تنگ کس بل نکل جائیں گے	مرینگے تو سانچے میں ڈھل جائینگے

جبتک ہے روح جسم میں چلتے ہیں ہاتھ پاؤں	دولھا کے دم کے ساتھ یہ ساری برات ہے
پیری میں ولولے وہ کہاں ہیں شباب کے	اِک دُھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

خورشید

خورشید - میرزا عباس عرف میرزا خورشید مدرس فارسی مدرسۂ کراچی۔ چندے حیدر آباد سندھ میں بھی ملازمت کی تھی ۱۸۷۶ء میں زندہ تھے۔ شعر اچھا کہتے تھے اور ترکیبیں بھی صاف سُتھری برتتے تھے۔ طبیعت کا میلان زیادہ تر مضمون کی طرف ہے۔ یہ انکا کلام ہے۔

جگہ دی جب سے دل میں ہمنے عشق شوخِ پُرفن کو	بنایا دوست کو دشمن بنایا دوست دشمن کو
مجھے زنجیر پا کیوں مانع صحرا نوردی ہو	گلا دیتی ہے میری گرمیٔ رفتار آہن کو
فلک کی فتنہ پردازی سے شاید جا نبری ہووے	اگر تحت الثریٰ یا لامکاں ملجائے مسکن کو

ہُوا برباد تیری راہ میں مشتِ غبار اپنا	جھٹکنا پر نچھوڑا تو نے ظالم اپنے دامن کو
چمن میں آنکھ کھولی تھی کہ صیّاد آگیا سر پر	رہی حسرت یہ بلبل کو نہ دیکھا میں نے گلشن کو
رقیب روسیہ پر بھی کبھی تیغ آزمائی ہو	ہمارا کیا ہے ہم تو لو جھکا دیتے ہیں گردن کو
کریں پھر محفلِ کثرت میں کیوں ہنگامہ آرائی	ملے گر مجلسِ وحدت میں جا شیخ و برہمن کو
ہُوا خورشید عاشق اُن پہ جو اچھا سمجھتا ہی	سمجھنا دوست کو دشمن سمجھنا دوست دشمن کو

خورشید

خورشید ۔ مہرِ سپہر فصاحت وسخندانی نیر اوجِ بلاغت وزباندانی قاضی غیاث الدین احمد صاحب خورشید ابن قاضی حسام الدین احمد مرحوم بزرگوں کا وطن شاہجہاں آباد دہلی ہے مگر اب عرصہ سے قصبہ سکندرآباد ضلع بلند شہر میں سکونت ہی وہاں کا عہدۂ قضا روز آبادی سے انکے خاندان میں چلا آتا ہی۔ جناب خورشید بہ سلسلۂ ملازمت چند سال ریاستِ گوالیار میں رہے اب عرصہ سے خانہ نشین ہیں دہلی مقام پیدایش ہی اور وہیں انہوں نے اپنی ننہال خاندانِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی میں تعلیم وتربیت پائی مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے برادرزادہ مولانا محمد حسن تائب مرحوم تلمیذ فخر الشعرا میر نظام الدین ممنون سے فن شعر کی تحصیل کی اور مولانا مرحوم نے نہایت دلسوزی اور محنت سے رموزِ سخنوری ونکات شاعری کو ان کے دلنشین کیا۔ سن شریف اب ۱۹۱۴ء میں ۵۸ برس کا ہی صاحب دیوان ریختہ ہیں۔ اکثر غزلیں حضرت داغ دہلوی اور دیگر مشاہیر زمانہ حال کی زمینوں میں کہی ہیں اور حق یہ ہی کہ اپنی خداداد ذہانت اور مشاقی فن کا سکہ بٹھا دیا ہے۔ راقمِ تذکرہ کے ملاقاتی ہیں۔ دہلی میں دو مرتبہ خاص مجھ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے کلام بھی منتخب کرکے بھیجا قاضی نجم الدین برق شاگرد رشید حضرت مومن انکے حقیقی چچا تھے۔ سخن طرازی میں اعلی درجے کی قابلیت حاصل ہی پڑھتے بھی اچھا ہیں ترکیب بیان نہایت دلچسپ ہی اور متانت سے خالی نہیں انکے کلام میں اکثر اشعار ناخن بدل پائے جاتے ہیں۔ بلاغت او فصاحت دونوں اپنے اپنے محل پر انکے کلام میں اپنا اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ مضمون آفرینی کا بھی خاصہ ملکہ ہی۔ بڑے

مہذب متین اور منکسر المزاج شخص ہیں فکر سخن سے کسی وقت خالی نہیں رہتے۔ دیوان اگرچہ چھپا نہیں مگر مرتب موجود ہے ؎

شایانِ حمدِ حق جو نہ مضمون رقم ہوا / اِس جُرم میں قلم کا سدا سر قلم ہوا
چھُوٹا یہ رنج و غم سے اُنہیں یہ الم ہوا / میں خوش ہوا اُنہیں مرے مرنیکا غم ہوا
طاعت نہ کام آئی نہ بندوں کی بندگی / آخر شریکِ حال اُسیکا کرم ہوا
دونوں گھروں میں ایک تجلی کا ہے ظہور / جلوہ وہی ہے دیر ہوا یا حرم ہوا
کس باوفا کو یاد کیا گالیوں سے آج / کس کے کھُلے نصیب یہ کس پر کرم ہوا
کچھ فخر جامِ جم کو نہیں اُنکے دور میں / جو جام اُنکے مُنہ سے لگا جامِ جم ہوا
مجکو تو دوستوں سے بھی ملنے کا رشک تھا / دشمن سے تم ملے یہ ستم پر ستم ہوا

خوں ہونے کے لیئے خاک میں ملنے کے لیئے / روز اس دل میں نئے ہوتے ہیں ارمان پیدا
کرتے ہو ستم مہر و محبت کے عوض میں / یہ جرم تو تعذیر کے قابل نہیں ہوتا
کہدیا شوق میں پہلے تو یہ رونا اب ہے / ہائے قاصد کی زباں اور فسانہ دل کا
رفتہ رفتہ ترے بیمار نے صحت پائی / ضعف سے درد گھٹا موت سے آزار گھٹا
لیکے کب نکلے ہیں ہم گوہرِ مضموں خورشید / آہ جس وقت میں نرخ دُرِ شہوار گھٹا

صحرا چمن کیا مرے پائے فگار نے / گلگوں ہر ایک خار بیاباں کا ہو چکا
اک ناتواں کا خوں اور اتنے سنان و تیر / دل سے مقابلہ صفِ مژگاں کا ہو چکا
دلمیں، جگر میں، سینہ میں، پہلو میں جابجا / قبضہ کہاں کہاں ترے پیکاں کا ہو چکا
اُس بُت نے ایک کو نہ رکھا اپنے دین پر / مذہب خراب گبر و مسلماں کا ہو چکا
تھاموں دل و جگر کو میں کیا ایک ہاتھ سے / اک ہاتھ مدتوں سے گریباں کا ہو چکا
ہوگا خرام ناز سے کیا اہلِ حشر پر / محشر تو ایک جنبشِ داماں کا ہو چکا

میسر تک نہیں خارِ وطن بارِ وطن کسکا / پڑا ہے دشتِ غربت میں یہ لاشہ بے کفن کسکا

مجھے مرنے پہ کیا کیا رشک ہے اُس مرنیوالے کے
یہ تم بیٹھے ہوا ایسا سوگ لیکر جانِ من کسکا

عقیدہ کھُل گیا اُس کا پڑی کافر نظر جس پر
ڈھکا رکھتی ہے پردہ اُسکی چشم سحر فن کسکا

زبانِ شکر رعب حسن سے واں بند ہوتی ہے
کھُلے شکووں پہ اُسکے روبرو جاکر دہن کسکا

خوشی میں جسکا گذرے وقت غم سے کیا غرض اُسکو
وہ محوِ عیش و عشرت ہیں سُنیں رنج و محن کسکا

پڑے ذرا تو کلیجے کی آگ پر پانی
جگر کے داغ پہ پھُوٹے جو آبلہ دل کا

دل تڑپتا ہے مزے لیلیکے اِس نخچیر کا
او قدر انداز کیا کہنا ہے تیرے تیر کا

درازی میں کوئی اُسکے برابر ہو نہیں سکتا
شبِ غم کے مقابل روزِ محشر ہو نہیں سکتا

پابندِ حیا رہنا یا ترکِ حیا کرنا
اوّل شبِ وصلت ہے آخر نہیں کیا کرنا

طبیعت اس قدر بگڑی کہ اندازِ سخن بگڑا
کوئی مضموں جو تیرے وصل کا ای جانمن بگڑا

یہ قد بوٹا سا، لب گلبرگ تر، عارض گلِ رنگین
چمن کا رنگ تیرے سامنے رشک چمن بگڑا

کس جا نہ جلوہ گر تری وحدت کا نور تھا
جلوہ ترا تھا عام نظر کا قصور تھا

کیا اُسکو ہو خبر کسی خاطر شکستہ کی
وہ مستِ ناز اپنی جوانی میں چور تھا

واہ کس شوق سے تھم تھم کے چھُری پھیری ہے
میری گردن پہ ہوئے آپکے احسان بہت

شرارت چشم پر صدقے، فدا شوخی ہے چتون پر
ادائے دلفریبی آپ غش ہے اُن کے جوبن پر

خوشی وہ غیر کی کرتے ہیں میرے رنج دینے کو
مرے صدقے میں گویا یہ کرم ہوتے ہیں دشمن پر

غنیمت ہے ہوا مر کر تو لطفِ زندگی حاصل
وہ ظالم فاتحہ پڑھنے کو آیا میرے مدفن پر

نکالا قتل کا میرے نیا انداز قاتل نے
رکھی ایک تیغ پر گردن، رکھی اک تیغ گردن پر

مجروح دل پہلو میں ہے زخمی جگر سینہ میں ہے
یہ بھی کوئی دستور ہے گھائل ہے گھائل کے پاس

خورشید راہِ عشق میں اس گرم رفتاری کیساتھ
کیوں سرد ہو جاتے ہو تم آتے ہو جب منزل کے پاس

جوشِ وحشت میں بہم ربط ہوا ہے ایسا
ہاتھ ہوتا نہیں دم بھر کو گریبان سے الگ

یہ مری خاک ہے ظالم تو جھٹکتا کیوں ہے؟
اب نہوگی یہ ترے گوشۂ داماں سے الگ

کانوں میں بیوفا نہ پہن یاسمن کے پھول
ہیں آج تیرے کشتۂ رنج و محن کے پھول

شیریں نے ایک دن نہ بنایا گلے کا ہار
تیشہ سے روز جھڑتے رہے کوہکن کے پھول

یارب دلوں کی خیر وہ کہتا ہے دلفریب
دیکھیں تو کوئی دیکھے ہمیں اور نہ آئے دل

خورشید کس غضب کی کہانی کہی کہ آج
اپنی طرح ہمیں بھی کیا مبتلائے دل

مایوس ہو گئے ہیں قبولِ دعا سے ہم
ملتا تو مانگتے نہ تمہیں کو خدا سے ہم

کہتے ہیں سکو شوق کہ نکلا جدھر سے تو
آنکھیں ملا کئے ترے ہر نقشِ پا سے ہم

ہاں سچ تو ہے جو تم سے ستمگر کو دیدیا
ایسے ہی دق ہوئے تھے دلِ مبتلا سے ہم

کام آئیگی مصیبتِ ہجراں میں ایکدن
پیدا کرینگے رسم محبت قضا سے ہم

قامت میں قیامت کے برابر تو نہیں تم
فتنہ ہو مگر فتنۂ محشر تو نہیں تم

پھرتے ہو خفا مجھسے پھر الٹی ہے شکایت
پھر جاؤ تو کچھ میرا مقدر تو نہیں تم

کہنے کو کہدیں یونہی ابھی دل کا راز ہم
دیکھیں بھی دردِ دل کا کوئی چارہ ساز ہم

سجدہ خدا کو کرتے ہیں دل میں بتوں کی یاد
نادم ہیں خود کہ پڑھتے ہیں کیسی نماز ہم

جب ظلم کریں آپ تو کیونکر نہ کہیں ہم
کیا خوب ستمگر کو ستمگر نہ کہیں ہم

تم کو تو نہ توفیق ہوئی پرسشِ غم کی
پھر آپ بھی حالِ دلِ مضطر نہ کہیں ہم

آتے ہی ترے بزم میں اک پڑ گئی ہلچل
اس پر بھی تجھے فتنۂ محشر نہ کہیں ہم

شوخی ہے طبیعت میں فصاحت ہے زباں میں
خورشید کو کس طرح سخنور نہ کہیں ہم

آبلے پاؤں کے برسوں سے لئے پھرتے ہیں ہم
اپنے قسمت کے تو کانٹے بھی بیاباں میں نہیں

دستِ وحشت کو مرے اب تو ملے گی فرصت
ایک جنوں اب تو کوئی تار گریباں میں نہیں

گھر کے آیا ہے ابرِ باراں میکدہ پر جوشِ رحمت ہے
رہیگی حرمت توبہ کہاں تک بادہ خواروں میں

کہیں کس منہ سے ہجر یار میں مونس نہیں کوئی
ابھی اک بیکسی باقی ہے اپنے غمگساروں میں

عیش کے یار تو اغیار بھی بن جاتے ہیں
دوست وہ ہیں جو برے وقت میں کام آتے ہیں

دیکھیے ہجر کی شب میں ہو سحر تک کیا حال
غش پہ غش مجکو ابھی سے سرِ شام آتے ہیں

ایک پر ایک گرا پڑتا ہے مشتاقِ جمال
شور برپا ہے کہ اب وہ لبِ بام آتے ہیں

کچھ عجب لطف اُٹھاتی ہے طبیعت خورشید
جب کبھی سُننے میں اشعار نظام آتے ہیں

دونوں ہیں دردِ عشق کے بیمار کیا کروں
دل کی دوا کروں کہ میں اپنی دوا کروں

جی چاہتا ہے عشقِ گزشتہ کا ماجرا
بیٹھا کوئی سُنا کرے اور میں کہا کروں

کہتے ہیں لوگ مر کے یہ چھوٹے گا رنج سے
مجھکو یہی ہے غم کہ غمِ جاوداں نہیں

پانی ہو تری تیغ کا اور اپنا گلا ہو
چھُوٹنے کا نہیں ہاتھ سے گر آبِ بقا ہو

ہنگامۂ محشر تری چالوں سے بپا ہو
ٹھکرا کے کہے تو میرے مردے سے کھڑا ہو

مرنے کے بعد تم ہی تو آؤ گے قبر پر
تم ہی تو فاتحہ بھی پڑھو گے اُٹھا کے ہاتھ

لگیگی ایک گھر کی آگ سو گھر اسلیئے چپ ہُوں
چھلکیگا اِک جہاں دل سے جو آہِ آتشیں نکلی

کروں اصرار کیونکر وصل کے وعدہ پہ ڈرتا ہُوں
نہوگی عمر بھر پھر ہاں اگر منھ سے نہیں نکلی

شبِ وعدہ اُمید و یاس کے جھگڑے رہے کیا کیا
کبھی ٹھہرا دلِ مضطر کبھی جانِ حزیں نکلی

یا تو ہمارے دل کو اِلٰہی قرار دے
ورنہ تو اِن بتوں پہ ہمیں اختیار دے

جدھر اُس کی کافر نظر ہو گئی
خدا کی خدائی اُدھر ہو گئی

وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہیں
جدھر ہو گئی بس اُدھر ہو گئی

جگر ہو کہ دل ہو وہ تیغِ نظر
جہاں پڑ گئی کارگر ہو گئی

جواب داد خواہاں داورِ محشر کو کیا دو گے
بتو اِک روز تم کو بھی خدا کو مُنہ دکھانا ہے

جسقدر تم کو تغافل ہو محبت ہو ہمیں
بیوفائی ہیں تمھاری یہ کمال اچھا ہے

قوت نہ آہ کی ہے نہ طاقت فغاں کی ہے
حالت بہت خراب دلِ ناتواں کی ہے

قاصد کے اب پیام زبانی پہ ہے یہ رشک
کیوں اِس زباں پہ بات بھی اُنکی زباں کی ہے

آنکھوں کو لطفِ دید کا کانوں کو بات کا
قسمت جو دیکھیئے تو ترے پاسباں کی ہے

بدظن ہے رازداں سے نگہباں سے مشتبہ
اے بختِ خفتہ ایسی بھی غفلت کی نیند کیا
کیا پوچھتے ہو دل پہ جو گذری فراق میں
ہے شرم تیرے ہاتھ عدو سے گداز عشق
تا مشتِ استخواں کو نہ میرے ملے جگہ
قبضہ بتوں کا گھر میں خدا کے بھی ہو گیا
خورشید شاعری میں فصاحت کا ہے مزہ
جور و بیداد کو دیکھوں کہ میں اسکو دیکھوں
کششِ دل ہو مددگار تو کیا غیر کا گھر
میں تو دیکھوں نہ کبھی بھول کے اسکو خورشید
تم تو تم ناز عدو کے بھی اٹھائے ہوتے
تصور میں ہمارے کاش یہ تاثیر ہو جاتی
نہ اٹھتا حشر کے دن بھی مرا سر اس ندامت سے
شرر افشاں جو مجنوں آہ تیرے دل سے نکلیگی
ذرا مجھ پر ترحم سخت جانی آج برسوں میں
آنکھیں وہ فتنہ گر میری آنکھوں میں ڈالکے
حسن اور عشق کے جھگڑو میں مزا جب آئے
دلِ ایماں کا خدائی میں ٹھکانا نہ رہا
سوزشِ دل کے ہوئے اور یہ درماں اٹھ لئے
جو سنتے ہو تو سننا غمزدوں کا دردِ دل پیچھے
نہیں کچھ بازیٔ طفلاں لگانا دل کہیں خورشید

آفت میں جان اپنے دلِ بدگماں کی ہے
آخر کچھ انتہا بھی تو خوابِ گراں کی ہے
تم سن بھی لو یہ تاب ہمیں کب بیاں کی ہے
کچھ جسم میں نمود ابھی استخواں کی ہے
حجت ہے اُن کو یہ کہ زمیں آسماں کی ہے
بندی نماز کی ہے منادی اذاں کی ہے
سچ پوچھئے تو شعر میں لذت زباں کی ہے
وہ کسی وقت مرے حال سے غافل نہ رہے
تو تو جنت میں بھی اے حور شمائل نہ رہے
کیا کروں جب مرے کہنے میں مرا دل نہ رہے
ایک دن یہ بھی محبت میں ہوا رکھا ہے
کہ قید آہوں میں آکر یار کی تصویر ہو جاتی
مرے خوں سے جو آلودہ تری شمشیر ہو جاتی
بجھاتی آگ لیلیٰ پردۂ محمل سے نکلیگی
گلے ملنے کی حسرت خنجرِ قاتل سے نکلیگی
سینے سے لے گیا ہے ابھی دل نکال کے
حیلہ گر تم سا ہو اور نہ آئے طبیعت میری
دعوی کرتا ہے وہ کافر کہ ہے جنت میری
لب پہ آ آ کے پھرے نالہ سوزاں اُلٹے
ذرا ہاتھوں سے اپنے انتقام لینا تم جگر پہلے
وہ کھیلے کھیل الفت کا جو کھیلے جان پر پہلے

کہنے تو ہیں کہ دل میں ترے گھر بنائیں گے
پر سوچتے ہیں دل میں کہ کیونکر بنائیں گے

میں وہ محروم قسمت ہوں نہ جانا آجتک میں نے
اُمید وصل کیا ہے حسرتِ دیدار کیسی ہے

مہروش تجھ سے خجل شب کو قمر ہو کے رہے
رُخ سے سر کے جو دوپٹہ تو سحر ہو کے رہے

جس کو دیکھا نگہ ناز سے مارا اُسکو
دیکھ لینا تری آنکھوں کو نظر ہو کے رہے

میں تو ترے سبب ہوں مصیبت میں مبتلا
تُو میرے ساتھ اے شب ہجراں بلا میں ہے

قسمت کا اپنی پیچ کھلا ہے نہ کھُل سکے
وہ اور ہے جو آپ کی زلف دوتا میں ہے

خورشید ایسی چوٹ لگی ہے کہ کیا کہوں
ہر وقت اک کھٹک سی دل مبتلا میں ہے

دیکھئے غم میں ترے جان رہے یا نہ رہے
ہے کوئی دن کی یہ مہمان رہے یا نہ رہے

تو سلامت رہے آباد ہے تجھ سے دُنیا
ہمسے ناشاد مری جان رہے یا نہ رہے

فائدہ حجتِ ناحق سے بس اتنا کہدو
تم کہیں رات کو مہمان رہے یا نہ رہے

یار ہے، شیشہ و ساغر ہے، کروں کیوں تاخیر
پھر خدا جانے یہ سامان رہے یا نہ رہے

سانس کے ساتھ نکلتے ہیں شرارے مُنہ سے
سوزشِ دل نے کلیجے کو جلا رکھا ہے

دلربا گھات میں پھرتے ہیں کوئی چھین نہ لے
دل کو اب تک تو میری جان بچا رکھا ہے

آفتِ جان تو حسینوں کی ادا ہوتی ہے
ورنہ دیکھو تو ترے حسن میں کیا رکھا ہے

خورشید

خورشید۔ منشی شیخ محمد سعید خورشید۔ موضع شفیع ضلع منٹگمری پنجاب میں مقیم اور حضرت جلال لکھنوی کے شاگرد تھے۔ شعر گوئی کا خاصہ مادہ ہے۔ یہ انکا کلام ہے:

ٹھوکریں کھاؤ سرِ طور تمہیں اے موسیٰ
جلوہ گر دل ہی میں ہمنے رُخ جاناں دیکھا

اسکو جلنا تھا تو شمع سرِ محفل ہوتا
رونقِ بزمِ بتاں کاش میرا دل ہوتا

کسی کے قتل کو اُس کی بلا نکلتی ہے
کہ جسکے کوچے سے بسمل قضا نکلتی ہے

خورشید

خورشید۔ پنڈت بلدیو کشن صاحب ٹکو المتخلص بہ خورشید۔ آپکے والد بزرگوار ریاستِ جموں و کشمیر میں بعہدہ سپرنٹنڈنٹ پولیس ممتاز تھے۔ آپ خود لاہور میں انسپکٹر تحصیل

چونگی ہیں اور ٹمپرنس ایسوسی ایشن لاہور و کشمیری پنڈت نیشنل ایسوسی ایشن کے سکرٹری ہیں
اوائل سے فن شاعری کا شوق ہے اور اٹھارہ اُنیس برس سے طبیعت ادہر مائل ہے عشقیہ
غزلیں کہنے سے اجتناب ہی۔ زیادہ تر ٹمپرنس سوسائٹی کے متعلق مضامین پر طبع آزمائی کرتے
ہیں۔ اور اکثر ٹمپرنس سوسائٹی کے سالانہ جلسوں اور مسنروا لوج کے اجلاسوں میں دادِ سخن دیا
کرتے ہیں۔ آپ اپنا دیوان مرتب کر رہے ہیں جسے عنقریب چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔
زمانۂ حال کے شعرا میں انکا شمار ہے۔ کلام میں سادگی ہے زبان شستہ ہی اور نفس مضامین
اخلاقی ہوتا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

نہ وہ اوصاف ہیں ہم میں نہ وہ اُلفت رہی دیں
ہماری غفلتوں سے دیکھئے سارا وطن بگڑا

ذرا دیکھو تو بگڑی کسقدر حالت ہماری ہے
روش بگڑی، چلن بگڑا، ہمارا پیرہن بگڑا

اگر دل میں خیالاتِ من و مائی نہ لاؤ تم
تو اس اُجڑے چمن کو آج ہی رونق پہ پاؤ تم

میں کیا منہ سے کہوں میں کون ہوں دنیا میں کیا ہوں میں
بشر کی ہستیٔ ناپاک کا اک آئینہ ہوں میں

میری ہستی بنائی خاک کے ذروں نے مل مل کر
اسی باعث سے تو اک خاک کا پُتلا بنا ہوں میں

خدا کی جب نظر میں کُل بشر دنیا کے یکساں ہیں
تو دل میں کیوں خلش رکھتے ہو پھر ہندو مسلماں ہیں

نہیں بگڑا ہے اب بھی کچھ اگر تھوڑا سنبھل جاؤ
کدورت چھوڑ دو اور جانب اصلاح تم آؤ

طبیعت میں مری کچھ اندنوں ایسی صفائی ہے
ضیائے آئینہ منہ دیکھنے کو دل میں آئی ہے

فروغ ماہ تاباں جذبۂ دل نے مرے لوٹا
یہاں سرخی ہوئی پیدا وہاں زردی سی چھائی ہے

کہاں لکھا ہے مذہب میں کرو تم بیر آپس میں
غضب ہے گر زمانے میں جُدا بھائی سے بھائی ہے

انتخاب از قصیدۂ تہنیتِ تاجپوشی

خیابان کھل گئے فصل چمن میں اب بہار آئی
شمیم اٹکھیلیاں کرتی نویدِ جانفزا لائی

یہ دہلی ہے کہ جنت آگئی ہے باغِ دنیا میں
کہ حوریں بھی فلک پر آج ہیں دیکھو تماشائی

یہ ہیں وہ کون جنکے عہد میں یوں ہمنے پائی ہے
کہ پیتے شیر اور بکری بھی ہیں اک گھاٹ پر پانی

ندا آئی ہمارے جارج پنجم شاہ انگلستان
ہمایوں فال ہے، نیکو سیر، نیکو طبیعت ہے
رعایا ہند کی تیار ہے اب جاں نثاری پر
دعائے خیر ہے تجھ پر سدا ظل الٰہی ہو

پہنک رکئے اورنگِ شہی پر تاج سلطانی
تو اے قیصر جہاں میں منبع بحر سخاوت ہے
کہ اس میں اِک زمانے سے وفاداری کی عادت ہے
ہما بن کر ترے سر پر یہ چتر تاج شاہی ہو

آج دہلی بنی ہے رشکِ چمن
لاڈلی ہے شہانِ ذی جم کی
آج شہ کی سواری آتی ہے
پیش کرتا ہوں طشت کاغذ پر
کیوں نہ خورشید بھی ضیا پائے

آج دہلی بنی نئی دلہن
یہ دلاری ہے جارج پنجم کی
یہ بھی پھولوں نہیں سماتی ہے
ہوں جو منظور یہ مرے گوہر
بزم شعر میں نام پا جائے

خورشید

خورشید۔ صاحب عالم مرزا خورشید عالم گورگانی خلف الرشید مرزا فخرو ولیعہد بہادر شاہ ثانی۔ ان کا نام تاریخی ہے سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں پیدا ہوئے۔ غدر کے وقت اُنکی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ جوانی میں نہایت خوبرو زیبا منظر جوان تھے۔ ورزش جسمانی کا ہمیشہ شوق رہا۔ فن سپہ گری سے خوب واقف ہیں۔ لکڑی اور بانک دونوں خوب جانتے ہیں۔ بنوٹ سے بھی کسی قدر واقف ہیں۔ غلیل لاجواب لگاتے ہیں۔ شعر بھی بہت اچھا کہتے ہیں۔ زبان ٹکسالی اور اُسی چار دیواری کے اندر کی ہے جس کا نام کبھی قلعہ معلیٰ تھا۔ اصلاح دینے کا ملکہ اچھا ہے اور زبان کی صحت کے متعلق آپ کی معلومات وسیع اور قابل داد ہیں۔ نہایت بامذاق ہنس مکھ یارباش شہزادے ہیں۔ بڑے خوش گلو اور موسیقی کے فن سے ماہر ہیں۔ تباہی قلعہ کے بعد ۲۵ سال رامپور اور دہلی رہے۔ نواب یوسف علیخان صاحب نے سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا تھا۔ جو اب تک ملتا ہے۔ بلکہ اب نواب صاحب حال نے کچھ اُس پر اضافہ کر دیا ہے سنہ ۱۸۹۰ء سے اپنے علاتی بھائی حضرت داغ دہلوی مرحوم کے پاس حیدر آباد دکن رہے وہاں سے بھی دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ پاتے ہیں سنہ ۱۸۷۷ء کے جشن جوبلی میں جو چند شاہزادوں کی جدید پنشنیں مقرر ہوئی تھیں اُنمیں

یہ بھی شامل تھے۔ چنانچہ پچاس روپیہ ماہوار سرکار برطانیہ سے مقرر رہے۔ حضرت داغ کی وفات کے بعد گاہے دکن گاہے دہلی رہے اب تین برس سے رامپور میں مقیم ہیں۔ اگرچہ فطرۃً طبیعت موزوں پائی ہے مگر شعر گوئی کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہے۔ نواب حامد علیخاں صاحب والئے رامپور انکی بہت قدر و منزلت کرتے ہیں۔ مرزا خورشید عالم کے صرف ایک لڑکی ہے نواسے کو انھوں نے اب متبنیٰ کر لیا ہے اور دکن کی پنشن اُسکے نام منتقل کرادی ہے۔

راقم تذکرہ سے مخلصانہ تعلقات ہیں بڑے خوش مزاج خوش تقریر ہیں۔ کلام کے لئے بہنگامِ نظرِ ثانی بار بار تقاضا کیا مگر فطری تساہل نے اقرار کی تکمیل کی نوبت نہ آنے دی اشعار ملاحظہ ہوں

گھر سے نکلے ہیں وہ اِس ٹھاٹ سے تن کر باہر	ہاتھ میں تیغ علم میان سے خنجر باہر
غش جو آیا مجھے محفل میں تو ظالم نے کہا	تجکو منظور ہے مرنا تو کہیں مر باہر
جب سے برباد ہوئے کوئی ٹھکانا نہ مِلا	ٹھوکریں کھاتی پڑیں پھرتے ہیں ہم در باہر

جو میری طرف سے بہتیں بھڑکاتے ہیں دشمن	ایک ایک مرے دل میں ہے ایک ایک نظر میں
ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم جبکو یہاں تک پہنچے	ساری دنیا ہے وہی حشر کے میداں میں نہیں
رازِ سربستہ ہے پیدائشِ عالم سے کھُلا	لُطف ظاہر میں جو ہے وہ کبھی پنہاں میں نہیں
وہ کہتے ہیں ہمارا چاہنے والا بھی ایسا ہو	زمانے سے انوکھا ہو تو دنیا سے نرالا ہو
وہ دل لیکر کسی کا پھیر دیں یہ ہو نہیں سکتا	پرایا مال وہ اپنا سمجھتے ہیں کسیکا ہو
شبِ وصل اُسنے شرما کر یہ شوخی سے کہا آخر	ہمیں چھیڑے تو غارت ہو ہمیں دیکھے تو اندھا ہو
ستم سہنے کا ساری عمر کے یہ پھل مِلا ہمکو	وہ اب سب سے یہ کہتے ہیں جو عاشق ہو تو ایسا ہو
نہ میں سچا نہ تم سچے تو آخر کون سچا ہے	خدا کے سامنے یہ پیش ہو جھگڑا تو اچھا ہو
ہُوا حاصل یہ ہمکو دوستوں کی بیوفائی سے	کہ ہم نے عمر بھر کو توبہ کر لی آشنائی سے
مِلے بھی بات بھی کر لی ڈھٹائی سے رکھائی سے	بنے پھر جان کر انجان میری آشنائی سے
نہ میں سچا نہ تم سچے نہ میں جھوٹا نہ تم جھوٹے	چلو قصہ ہوا طے فائدہ کیا اب لڑائی سے

تمھیں اُن سے غرض ہے اُنکا تم اچھا بُرا دیکھو
ہمیں کیا کام غیروں کی بھلائی سے بُرائی سے

دل لیا ہے تم نے جس انداز سے
کوئی لے سکتا بھی ہے اس ناز سے

ہر روز یہ پُرسش ہے کہ تم کیوں ادھر آئے
اُمید پر آتے ہیں جو اُمید بر آئے

جاتے تھے کہیں اور اِدھر بھول کر آئے
کیا دیدہ و دانستہ وہ خود میرے گھر آئے

فرقت کی دعاؤں میں الٰہی اثر آئے
آئے نہ ستمگر تو کچھ اچھی خبر آئے

جاتے تھے میرے کوچہ سے پوچھا تو وہ بولے
ہم تیری بلا سے جدھر آئے اُدھر آئے

بے چین ہو تم اور مجھے رشک ہے اس کا
اللہ کرے آج عدو کی خبر آئے

رحم آ ہی گیا دیکھ کے قاتل کو مرا حال
کام اپنے بُرے وقت میں زخم جگر آئے

محشر ہوا جل ہو کہ وہ کافر ہو کوئی ہو
ہم منتظر اُسکے ہیں کہ جو پیشتر آئے

اِک حشر بپا اور ہُوا روزِ قیامت
محشر میں بُرے حال سے جب وہ نظر آئے

کیا غیر سے لڑ آئے ہیں کہتے نہیں بنتی
گھبرائے ہوئے وہ ادھر آئے اُدھر آئے

اُس شوخ نے بالوں میں پروئے ہیں جو موتی
خورشید ہمیں ابر میں تارے نظر آئے

وہ نشیلی آنکھ اک عیار ہے
دیکھنے کو مست ہے ہشیار ہے

آرزو بنکر نہ کوئی بھی رہا
آپ کا ہر تیر دل کے پار ہے

مَیں ہوں عاشق میری بدنامی ہے کیا
اُن کا چرچا بھی سر بازار ہے

آپ سے بنتی نظر آتی نہیں
روز جھگڑے روز کی تکرار ہے

کون مرتا ہے کسی کے واسطے
جان کا کھونا بہت دشوار ہے

یہ تری محفل ہے یا ہے میکدہ
جسکو دیکھو مست ہے سرشار ہے

جان سے بڑھکر ہمیں ہو تم عزیز
تُم ملو تو اور کیا درکار ہے

اگلے لوگوں کا چلن کچھ اور تھا
اب زمانے کی نئی رفتار ہے

دِل ستانے کے لیئے موجود ہے
جان جانے کے لیئے تیار ہے

خورشید

خورشید - سید خورشید عالم۔ خلف شمس الشعرا مولوی سید مقصود عالم تھانوی۔ ان کا نشوونما غدر کے عین بعد میں تھا۔ نواب کلب حسین خاں نادر نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے، چند شعر انتخاب ہوکر درج ہوئے۔ ان کے والد بڑے پایہ کے سخنور تھے انھیں سے انھیں تلمذ تھا ؎

اے اجل یہ قتل پر کس کا اشارا ہوگیا	صف بہ صف جو لشکرِ مژگاں صف آرا ہوگیا
ہاں یہ حرفِ شوق ہیں ہے معجزِ شق القمر	نالہ از خود دل کی بیتابی سے پارا ہوگیا
قتل گہ میں یہ شہیدوں کا بہا یا ہے لہو	نیچے کا گھاٹ دریا کا کنارا ہوگیا
گھر میں اے خورشید جب شکلِ قمر مہماں ہوا	نیر اعظم نصیبوں کا ستارا ہوگیا

خورشید

خورشید - پنڈت جوالا پرشاد ایم اے وکیل چیف کورٹ لاہور آپ رائے بہادر پنڈت جانکی پرشاد اکسٹرا سسٹنٹ کمشنر اور منشی مرحوم کے صاحبزادے اور قوم کے کشمیری برہمن ہیں، اوائل شباب میں موزونی طبع کے باعث طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ یہ انھیں ایام کا کلام ہے نہ معلوم اب یہ مشغلہ جاری ہے یا بند ہوگیا۔ ۴۰ برس کا سن ہے۔

آزمانا تجھے ہم چاہتے تھے مدت سے	تیغ جلا و دکھا آج تو جوھر اپنا
خون ہی تن میں نہیں جسکا کہ ڈر ہے قاتل	کس لیے چلتا ہے دامن تو بچا کر اپنا
جسکو کہتا ہے تو خورشید قیامت واعظ	دیکھ ہے داغِ نہاں میں ہے تو پڑھ کر اپنا
ایک حسرت ہی گئی ساتھ مرے زیرِ لحد	اور کوئی بھی نہ ساتھی ہوا مر کر اپنا
مانگا بوسہ تو کہا تو بھی ہوا اس قابل	منہ تو جا دیکھ ذرا آئینہ لیکر اپنا
ہوا دستِ قضا سے بھی یہ کشتہ سیماب	ہائے مر کر بھی نہ ٹھیرا دلِ مضطر اپنا
کیوں نہ خورشید فلک پر ہو دماغ آج ترا	باغ ہے، جام ہے، اور پاس ہے دلبر اپنا

خوشتر

خوشتر - منشی عبدالرحمن محمد محسن باشندہ منگرول کاٹھیاواڑ۔ رسالہ العصر لکھنؤ سے کلام نقل ہوا

شمع رو جائیں کہاں اُٹھ کے تری بزم سے ہم	دل کو پروانہ کی مانند جلا بیٹھے ہیں

شربتِ وصل ہی بیمارِ محبت کا علاج ۔۔۔ چارہ گر کیوں لئے بالیں پہ دوا بیٹھے ہیں
دکھا دو چاہنے والوں کو تم اندازِ محبوبی ۔۔۔ سما جاؤ نظر میں سب کی دلمیں سب کے گھر کرلو
اسی اندازِ حیا سے اور چوری کھا گئی آنکھ ۔۔۔ کہا تھا مجھسے کسنے جھیپ کر ترچھی نظر کرلو
جو محفل ہی وہ مقتل ہو جو بیدل ہیں وہ بسمل ہیں ۔۔۔ جو خنجر ہاتھ میں اپنے کبھی تم بن سنور کرلو

آپ کہتے ہیں بجا حضرتِ ناصح لیکن ۔۔۔ کیا کروں کہیئے جو قابو میں مرے دل نرہے
ہو مدد تیری جو اے ہمتِ مردانۂ عشق ۔۔۔ جس کو مشکل میں سمجھتا ہوں وہ مشکل نرہے
میری خواہش گذر درد ہو دلمیں مرے ۔۔۔ درد کہتا ہے میں پہلو میں ہوں دل نرہے

خوشتر۔ شاعرِ شیوا بیان سخنورِ شیریں زبان منشی جگناتھ ولد منشی منا لال سری باستب کایستھ ساکن لکھنؤ، عہدِ واجد علیشاہ میں سرکارِ شاہی میں متصدی گری پر فائز تھے۔ انکی "رامائن منظوم" و "شری بھاگوت" و "چتر گیت" بہت مشہور ہیں۔ مذہبی مسائل اور حکایات کو بہت خوبی اور فصاحت سے نظم کیا ہے ۱۲۷۹ھ میں انکا انتقال ہوا، بخوف طوالت رامائن میں سے چند اقتباس کرکے انکے حال کو ختم کیا جاتا ہے۔

خوشتر

راجہ رام چندر جی کا بن باس ہونا

مشعبد ہے عجب یہ پیرِ گردوں ۔۔۔ کہ ہر دم اسکی صورت ہے دگرگوں
جفا پیشہ، ستمگر، فتنہ خو ہے ۔۔۔ برائے رنج ہر کس حیلہ جو ہے
اگرچہ پیر ہے، لیکن ہے بے پیر ۔۔۔ ہمیشہ منقلب ہے اسکی تدبیر
کسی کا خوش نہیں آتا اسے عیش ۔۔۔ برائے جنگ پھرتا ہے لئے جیش
ہر اک کے عشق میں ہے رخنہ انداز ۔۔۔ میان ہر بشر ہے فتنہ پرداز
سدا اس سنگدل کا ہے یہ شیوہ ۔۔۔ کہ پتھر مارتا ہے دیکھ میوہ
یہ وہ زنبور ہے چرخِ ستم کیش ۔۔۔ کہ پہلے نوش دے پیچھے چڑھے نیش
شہنشاہِ اودھ تھا یعنے اک روز ۔۔۔ سریرِ زرفشاں پر رونق افروز

منتھرا کا رانی کیکئی کو [illegible] پر آمادہ کرنا

مرصّع سر پہ زیبا تاجِ زرّیں — عیاں چہرے سے نورِ ماہ و پرویں
پئے آرائشِ تاجِ زر افشاں — کیا آئینہ پیشِ روئے تاباں
نگاہِ شہ پڑی کاکل پہ اک بار — سفید آئے نظر بال اُس میں دو چار
خزاں دیکھی بہارِ زندگی میں — اماں دیکھی خدا کی بندگی میں
سنا جب ساروا نے یہ فسانہ — ہوئی سوئے اودھ پیدل روانہ
ہوئی جاکر وہاں پر حیلہ انگیز — نہ پایا کوئی دشمن اُس جگہ تیز
کنیز اک کیکئی کی منتھرا نام — زبس تھی عقل و دانش سے وہ ناکام
کیا نطقِ زباں کو اُس کے اِغوا — وہ نکلی شہر میں بہرِ تماشا
جو دیکھا یہ اودھ میں جلوۂ عیش — حضورِ کیکئی آئی بصد طیش
سراپا تن میں روشن آتشِ خشم — رواں مانندِ دریا چشمۂ چشم
کہا یوں کیکئی سے باغم و آہ — کہ کیا غافل ہے تو اے بانو شاہ
بھرت کو شاہ نے گھر سے کیا دُور — خلافت ہے بنامِ رام مسطور
محبت پر ہے نازاں شہ کی ناحق — یہ تیرا ہے خیالِ خام مطلق
بظاہر تجھ پہ عاشق ہے شہنشاہ — ولے باطن میں کوشلا کی ہے چاہ
یہ کوشلا کا ہے سب مکر اور فن — کہ بیشک سوت کی ہو سوت دشمن
خلافت کا اگر ہو رام کو تاج — ترا فرزند ہو روٹی کو محتاج
یہ سنکر کیکئی بولی غضبناک — کہ کیا کہتی ہے تو اے شوخ بیباک
اگر ہو رام کو تاجِ خلافت — بھرت کو ہے زہے فخر و سعادت
مرے دل کے بر آئیں سب مطالب — بھرت اور رام ہیں یک جان و دو قالب
نہو اُن میں کبھی ہرگز جدائی — اگر ہو اک طرف ساری خدائی
تو ہے بد باطن و بدکار و بدذات — غضب تو نے نکالی منہ سے یہ بات

کہا پھر منتھرا نے باصفائی — بھلائی میں ہوئی حاصل برائی
کوئی ہو بادشہ کیا مجکو مطلب — نہیں لونڈی سے بیوی ہونگی میں اب
ولے میں ہوں کنیز بانوئے شاہ — کیا راہِ نمک خواری سے آگاہ
کہا میں نے براہِ خیر خواہی — مبارک رام کو ہو بادشاہی
نہیں خواہش مجھے کچھ سیم و زر کی — خطا کی میں نے گر تم کو خبر کی
مجھے مطلب نہیں ہے کچھ کسی سے — خوشی اپنی ہے مالک کی خوشی سے
ولے کیا کیجئے اِس دل کا چارا — بُرائی ہے تمھاری ناگوارا
زمانے میں ہے یہ روشن سبھوں پر — کہ دشمن ہے برادر کا برادر
خصوصاً جبکہ ہووے بادشاہی — مقدر ہو برادر پر تباہی
زبانِ چرب سے جب کی یہ تقریر — ہوئی تب کیکئی بیزار و دلگیر
ہو دلگیر تب بولی وہ نادان — کہ ہے تدبیر اس مشکل کی آسان
کیئے ہیں شہ نے جو دو عہد محکم — کہو تم شہ سے امشب شاد و خرم
سحر گہ رام ہوں صحرا کو راہی — بھرت کو دیجئے دیہیم شاہی
کیا یوں کیکئی کو جبکہ اغوا — ہوا برگشتہ دِل پھر کیکئی کا
عروسی پیرہن تن سے کیا چاک — ہوئی آشفتہ غلطاں برسرِ خاک
کیئے غم سے پریشاں مشکبو بال — بچھایا مکر و فن کا خاک پر جال
بوقتِ شب ہوا شاہِ نکو روز — محل میں کیکئی کے رونق افروز
پریشاں حال دیکھا کیکئی کا — ہوا دلگیر شاہ عالم آرا
یہ اُسکے عشق میں دیوانہ تھا شاہ — کہ تھی وہ شمع رو پروانہ تھا شاہ
نہ تھی بیتابیِ معشوق منظور — نہ کرتا تھا کبھی نزدیک سے دور
جو فرشِ گل پہ کرتی تھی سدا خواب — اُسے دیکھا زمین پر در تپ و تاب

ہوا آشفتہ خاطر دیکھکر شاہ
سر بالین پر ویں پر گیا ماہ

کہا اے جانِ شاہِ عالم آرا
ہوا کیا رنج دل پر آشکارا

زروئے شکر بولی کیکئی تب
کیا تم نے مرا کہنا سدا سب

کیئے تھے پیشتر دو مجھ سے اقرار
کئے تم نے وفا اتبک نہ زنہار

کہا دسرت نے اے جانِ شہنشاہ
کرو مطلب سے اپنے مجھکو آگاہ

بجا لاؤں اُسے بالراس والعین
دلِ بیتاب کو بخشو ذرا چین

قسم ہے رام کی گر جان مانگو
تو حاضر ہے نہیں افسوس مجکو

یہ سنکر کیکئی با دیدۂ تر
ہوئی حاضر حضور شاہ اٹھکر

کہا ہیں شاہ سے مجکو دو مطلب
وفائے عہد ہے شاہوں کو اَنسب

بھرت کو سلطنت کا دیجئے کام
بیاباں ہیں رہیں چودہ برس رام

یہ سنکر ہوگیا بے ہوش دسرت
گرا سر سے زمیں پر تاجِ دولت

ہوا چہرہ غم و اندوہ سے زرد
کہا یوں کیکئی سے با دمِ سرد

بھرت کو تاج دوں اے راحتِ دل
جدائی رام کی لیکن ہے مشکل

جو آیا دیکھنے سے رام کے ہوش
ہوا با گریہ وزاری ہم آغوش

زبس غم سے نہ تھا یارائے گفتار
رہا مانند نرگس محو دیدار

کہا تب رام سے ماں نے یہ مضموں
بھرت سے مجکو تم پیارے ہو افزوں

کیئے تھے شاہ نے دو مجھ سے اقرار
وفا میں اُنکی اب ہے صاف انکار

اگر دنیا میں چاہو بول بالا
بجا لاؤ قرارِ شاہِ والا

کہا شاہِ دو عالم نے زہے بخت
مبارک ہو بھرت کو افسر و تخت

یہ کہکر شاہ سے رخصت ہوئے رام
پڑا دولت سرائے شہ میں کہرام

ہوئے مادر سے رخصت رام جاکر
بہت روئی گلے مل مل کے مادر

ہوئی بیتاب سیتا سن کے یہ حال
پریشاں صورتِ سنبل کیے بال

ہوا جینا اسے بے رام مشکل
نہ لائی تاب ہجر گل عنادل

فراقِ رام کب ہو اس کو منظور
غضب ہے شمع سے پروانہ ہو دور

سیا پھر آئی پیشِ مادرِ رام
پریشاں موئے زلفِ عنبریں فام

ہوئی پابوسِ خوشدامن ادب سے
ہوئی رخصت کی خواہاں رو کے سب سے

ہوئی دلگیر خوشدامن یہ سنکر
کہا اے راحتِ دلہائے مضطر

بیاباں میں نہیں عورت کا ہے کام
نہ کر برباد ناحق ننگ اور نام

کہا سیتا نے اے خوشدامنِ پاک
نہوں جانے سے میرے آپ غمناک

نہیں بہتر ہے اس سے کوئی دولت
کرے عورت جو شوہر کی اطاعت

رہا کب دامنِ شوہر ہو زن سے
کہیں سایہ جدا ہوتا ہے تن سے

رواقِ طاق و منظر کا اڑا رنگ
ہوا غم سے مشبک سینۂ سنگ

زبس تھے غم سے گریاں سقف و دیوار
نظر آتے تھے روزن چشم خونبار

مکانِ شاہ کے ہر طاق و منظر
پئے گریہ تھے مشکل دیدۂ تر

ہزاروں چشم سے روتا تھا دریا
حباب اس کے ہوئے دیدے سراپا

کیا غم سے سحر نے پیرہن چاک
اڑائی سر پہ اپنے شام نے خاک

جہاں گریاں تھا سب آہ و فغاں سے
فرشتے گل فشاں تھے آسماں سے

نہ کھولی آنکھ ایسی شہ نے کی بند
یکایک جبکہ چھوٹے دونوں فرزند

زمیں پر شاہ تھا اِس طرح بیتاب
کہ ہو جس طرح سے آتش پہ سیماب

لہو بہتا ہر بنِ مژگاں سے جاری
پسند آنکھوں کو آئی اشکباری

اودھ میں زاغ نالاں بن میں بلبل
اُگے کانٹے یہاں پھولے وہاں گل

چلے جسدم اودھ سے رام و لچھمن
گرا لنکا میں سر سے تاجِ راون

... [illegible]

خوشدل

خوشدل۔ محمد حمید الظفر خان رامپوری خلف عباس خان۔ زندہ دل شخص ہیں اور اسی وجہ سے اپنے حسب حال تخلص تجویز کیا ہے۔ مرزا عابد حسین اوج رامپوری کے تلامذہ میں ہیں رامپور کے مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔

یاد آکے وہ تبسم ہمکو رلا رہا ہے
سوز غم محبت دل کو جلا رہا ہے

ہر لحظہ سامنا ہے تازہ مصیبتوں کا
یہ عشق تیرا مجکو کیا کچھ دکھا رہا ہے

حال زبوں ہمارا کیا پوچھتا ہے ہمسے
کچھ تو ستا رہا ہی کچھ غم ستا رہا ہے

کس شوق سے ہم اسکی صورت کو دیکھتے ہیں
کس ناز سے وہ اپنے منھ کو چھپا رہا ہے

الفت نے تیری ظالم آخر ہمیں مٹایا
اب کیوں ستا رہا ہے اب ہم میں کیا رہا ہے

ایک دن تھا وہ کہ تیرا کوچہ تھا اور ہم تھے
جنگل میں جوش سودا اب تو پھرا رہا ہے

میں وہ ہوں یاد تیری رہتی ہے ہر گھڑی دل میں
تو وہ ہے اپنے دل سے مجھکو بھلا رہا ہے

اس شوخ کا بگڑنا تقدیر کا تھا بننا
باہیں گلے میں ڈالے خوشدل منا رہا ہے

اس سے عشاق کو ملتی ہے حیات جاوید
آب حیواں ہے کہ خنجر کا ترے پانی ہے

خوشوقت

خوشوقت۔ منشی خوشوقت رائے صاحب عرف راجہ بینی جی تخلص خوشوقت شاگرد آتش و میر وزیر علی صبا بخشی الملک راجہ لالجی بہادر بخشی زمانہ شاہی لکھنؤ کے بیٹے تھے گاہ گاہ مست تخلص بھی کر لیتے تھے۔ غدر کے دس بارہ برس بعد انتقال کیا۔ لکھنؤ کے عمائد میں گنے جاتے تھے اور کبھی کبھی فکر سخن سے دل بہلاتے تھے۔ کلام بہم رسیدہ کا یہ انتخاب ہے۔

گیسوؤں کا جو لئے دام وہ گلفام آیا
بلبل دل مرا خود اُڑ کے تہ دام آیا

تخت و تاج و علم و طبل شہنشاہوں کا
سب دھرا رہگیا جب موت کا پیغام آیا

نہ پوچھو درد کہاں سینے میں ہے عاشق کے
غش آگیا ہے ابھی تو جگر جگر کرتے

شکل مہ و خورشید تو کب دل میں گڑیگی
جب آنکھ پڑے گی کسی اونچے پہ پڑیگی

اس دل کے لگانے کا ہم انجام نہ سمجھے
پتھر میں یہ برچھی نہ کسی طرح گڑے گی

نوکِ مژۂ یار کا کرنا نہ تصوّر	نکلے گی نہ پھر دل میں جو یہ پھانس گڑ گئی
ہو صُلح کی تدبیر عبث یار سے خوشوقت	رلجائیگا خود آپ سے قسمت جو لڑ گئی
عجب کمال پہ جوبن ترا شباب میں ہو	یہ ضَو نہ نُور نہ مہ میں نہ آفتاب میں ہو
ادا جان لیتی ہے جانی تمھاری	قیامت ہوئی ہے جوانی تمہاری
فدا تم پہ ہیں ہوں تم اَوروں کو چاہو	یہ قسمت مری قدر دانی تمہاری
تمھارا ہے وردِ زباں ذکر ہر دم	وظیفہ مرا ہے کہانی تمہاری
یہ خوشوقت آتش کے فیض و کرم سے	زبان زد ہوئی خوش بیانی تمہاری

خیال

خیال - غلام حسین خان خیال برادر زادہ و شاگرد برکت اللہ خان برکت شاعر فارسی بہت پرگو شاعر تھے - ایک لاکھ شعر کے قریب کہے تھے - بیگم سمرو کے ملازم تھے ۱۲۴۳ھ میں انتقال کیا - سُنا ہے کہ پانی پت میں انکے دو دیوان موجود ہیں - یہ اِنکے کلام کا نمونہ ہے -

تجھے تو غیر کو منظور منہ دکھانا تھا	نقاب کھولنا گرمی سے اک بہانہ تھا
پھر نئے سر سے ہوا خانۂ مجنوں آباد	پاؤں جب ہمنے دھر آنکے دِیرانے میں
حاضر ہیں ہم تو آؤ شمشیر کیں نکالو	جو دل کی آرزو ہو اُس کو کہیں نکالو
جرعہ افشاں ہو ہماری خاک پر غافل کبھی	ہم بھی لے ساقی تری محفل کے میخواروں میں تھے
مژگاں کی یہ کاوش نہیں ناوک فگنی ہے	ابرو کی اشارت نہیں شمشیر زنی ہے
تیرا شگفتگی پر دل آیا ہے اے خیال	اے غنچۂ فسردہ تجھے بھی ہوا لگی

خیال

خیال - منشی جیسکھ رائے خیال کایستھ دہلوی - فارسی شعر بھی کہتے تھے - شاہ نصیر کے ہمعصر تھے - کلام درد انگیز ہے - زبان، بندش، مضمون، سب خوبیاں لایق داد ہیں - افسوس ہو کہ با وجود تلاش اِسی قدر اشعار ایک بیاض میں سے دستیاب ہوئے ؛

تو جور و ستم کر نہ سکھائے سے کسی کے	کچھ پھل نہیں پائیگا ستائے سے کسی کے
حسرت ہی رہی جی میں مرے آہ پس از مرگ	بالیں پہ دمِ نزع نہ آئے سے کسی کے

آئے یا سمن اُس سے نہ مقابل ہو کہ جس کا	میلا ہو بدن ہاتھ لگائے سے کسی کے
پھر داغِ جگر ہو گئے غیروں کے بھی تازہ	تربت پہ مری پھول چڑھائے سے کسی کے

خیال

خیال۔ مولوی محمد ریاض حسن خان خلفِ اوسط مولوی حکیم محمد ہادی حسن خان نایاب رئیس اعظم موضع رسول پور ضلع مظفر پور۔ ترتیب تذکرۂ ہذا کے وقت جو حالات آپ نے قلمبند کرکے بھیجے اُن کا خلاصہ یہاں درج ہے آپ لکھتے ہیں کہ "میری ددھیال، ننھیال دونوں شیخ ہیں آبا و اجداد ہمیشہ صاحب اعزاز و امتیاز رہے۔ عہد مغلیہ میں جو عزت و ناموری اُنھوں نے پیدا کی اُن پُرانی باتوں کا تذکرہ فضول ہے۔ عہد انگلشیہ میں میرے پردادا مولوی مولا بخش خان بہادر سی۔ آئی۔ ای نے غدر کے زمانے میں گورنمنٹ اور ملک کی جو خدمتیں کیں اُن کا ذکر کتابوں میں موجود ہے چنانچہ گورنمنٹ نے اُنھیں اسٹار آف انڈیا (نجم الہند) کا خطاب دیا۔ اُنکے بڑے صاحبزادے حاجی محمد امیر حسن خان مرحوم و مغفور میرے دادا تھے میں ۱۲ رجب ۱۲۹۴ھ ہجری کو پیدا ہوا۔ چنانچہ ایک ترکیب میں خود کہتا ہوں۔

در ہزار و دو صد و چار و نود ہجری سال	روز اثنا عشر از ماہ رجب پیش زوال
پیکر خاکیٔ من از عدم آمد بوجود	ہمچو نجمے کہ ز بیت الشرف آید بوبال

میں چھ برس کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ دادا نے تعلیم و تربیت کی۔ فارسی عربی مختلف اُستادوں سے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جن میں سب سے زیادہ حکیم حافظ سید فرزند علی صاحب دہلوی سے استفادہ ہوا۔ شعر و سخن کا مجھے بچپن ہی سے شوق تھا۔ چھ سات برس کی عمر میں ڈیڑھ دو ہزار اردو و فارسی اشعار یاد تھے۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ اس عمر میں بھی میں بعض اچھے شعروں سے متاثر ہوتا تھا۔ گیارہ برس کی عمر سے میں نے شعر کہنا شروع کیا۔ چنانچہ میری پہلی غزل کا پہلا شعر یہ ہے۔ ؎

تیری اے حور غضب ہیں آنکھیں	چشم بد دور غضب ہیں آنکھیں

جب تک مولانا فرزند علی جناب دہلوی مرحوم یہاں رہے اُن کو کلام دکھاتا رہا۔ پھر

رمضان ۱۳۱۱ھ ہجری میں حضرت داغ مرحوم سے تلمذ اختیار کیا۔ اُردو میں میر تخلص خیال ہے
اور فارسی میں دانش۔ فارسی میں جناب خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی کے فیض اصلاح
سے مشرف ہوتا ہوں۔ اب شعر و سخن کا اتفاق کمتر ہوتا ہے "

جناب خیال واقعی ایک عمدہ اور با مذاق طبیعت و قابلیت کے شخص ہیں۔ فارسی میں بہت
اعلیٰ قابلیت رکھتے ہیں۔ علاوہ نظم کے موجودہ زمانے کی روشنی کے موافق نثر بھی اچھی کہتے ہیں
اس زمانے میں آپنے ایک فارسی مشہور کتاب نامہ دانشوران ناصری کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے
جو انجمن ترقی اُردو نے پسند کیا اور جسکی صحت زبان کی مولانا شبلی جیسے ماہر نے داد دی
علاوہ شعر و سخن کے شکار کا بھی شوق ہے نشانہ اچھا لگاتے ہیں۔ راقم تذکرہ سے خط و کتابت
رہتی ہے۔ کلام بہم رسیدہ میں سے کچھ اشعار منتخب ہو کر درج کیے جاتے ہیں۔ زبان درست
بندش چست مضامین صاف عاشقانہ رنگ میں کہتے ہیں۔ اپنے والد کا دیوان بھی آپنے اپنے
کلام کے ساتھ ارسال کیا تھا۔ اب انکا کلام ملاحظہ ہو جو اُن غزلوں سے انتخاب کیا گیا ہے
جو خود جناب خیال نے مؤلف تذکرہ کو ارسال کی تھیں۔

یہ نہ کہیئے کہ مجھ پہ کس کا حق	بندہ پرور میری محبت کا
بعضوں کی خامشی میں بھی اظہار ہے خیال	رستہ بتاتے ہیں لبِ خاموش نقش پا
جمال ان میں جلال ان میں پھر اینٹھ شان استغنا	بتوں میں کیا کہوں جلوہ مجھے کس کا نظر آیا
گوشۂ خلوت، دلکو فراغت رات سہانی جوبن جوانی	یار بغل میں ہاتھ میں بوتل آج مزا ہے بادہ کشی کا
دیکھو خیال آئینہ لگا کر کیسی ادا سے چھائی ہو منہ پر	کہتے تھے ہم عشق و محبت جان کا گھن ہے روگ ہے جی کا
صاف طینت صاف باطن ہے خیال	جب ملا جس سے ملا دل سے ملا
اللہ اللہ رے اُس بت کا جمال	دیکھ کر جسکو خدا یاد آیا
پائے بوسی ہے عبث بے فیض کی	دیکھ کیا دریا کو ساحل سے ملا
دیکھ لی ہمنے سخاوت آپ کی	ایک بوسہ وہ بھی مشکل سے ملا

کیا بات ہی عدم ہیں کہ دُنیا سے جو گیا
دلدار کی ہوس ہیں دل اپنا ہی کھو گیا
خوش ہوں کہ باوفا تو ہوں اُسکی نگاہ ہیں
میرا سوال وصل۔ پھر اُسکی وہ گالیاں
جس سے دیکھا چار دن دیکھا ملاپ
دشمنی کی ابتدا ہے دوستی
مل گئیں آنکھیں تو اِس کی کیا خوشی
رہ رہ کے تولتے ہو کیا خنجر دودم کو
پھیلا ہی نور اُسکا سارے جہاں میں یکساں
کسکے یہ نقش پا ہیں کوئے عدو میں یارب
اُس بت نے میرے دل میں گھر کر لیا تو کیا ہے
دیکھا ہی جب سے اُسکو اتنے نڈھال کیوں ہو

آیا نہ پھر پلٹ کے وہیں کا وہ ہو گیا
لالچ ہیں فائدے کی یہ نقصان ہو گیا
ہر چند سر گیا وہ مجھے مان تو گیا
پھر پوچھنا وہ طنز سے کہئیے سُنا جواب
یہ بھلا کس کام کا تیرا ملاپ
وہ ہی بگڑا ہم سے جس کا تھا ملاپ
لطف جب ہی دل سے ہو دلکا ملاپ
گردن یہ پھیر بھی دے اب آ بنی ہی دم پر
اے کعبہ والے تمکو کیا ناز ہے حرم پر
سر جھک رہا ہی اپنا سجدے کو ہر قدم پر
آخر بتوں کا قبضہ اک روز تھا حرم پر
خود روتے ہو خیال اب ہنستے تھے پہلے ہم پر

رُکا کیوں ہاتھ کیسی بیخودی چھائی یہ قاتل پر
تمھیں دیکھا ہی جسنے اُسکو اکثر ہو ہی جانا ہی
رہے طالع نہ ہے قسمت خط اُس کا میرے پاس آیا
جسے تو پردہ سمجھا ہے یہ دودِ آہ ہے مجنوں

وہ بیٹھا ہے چھُری رکھے گلوئے نیم بسمل پر
تمھارے چاند سے چہرہ کا دھوکا ماہِ کامل پر
کبھی رکھتا ہوں آنکھوں پر کبھی سر پہ کبھی دل پر
ذرا آنکھیں جما کر دیکھنا لیلیٰ کے محمل پر

آئے جو فاتحہ کو پڑی آنکھ یار پر
محشر میں کچھ نہ داور محشر سے کہہ سکا
چتون تو کہہ رہی ہے وفا نام کو نہیں
قیس اپنی دھن میں ہی اُسے اسکی خبر نہیں
کیا کس کی نگہ نے اسکو بیتاب

شیشہ بجائے سنگ ہو میرے مزار پر
رحم آ گیا مجھے نگہ شرمسار پر
دل دے جو کوئی تمکو تو کس اعتبار پر
محمل میں کیا گذرتی ہے محمل سوار پر
تڑپتی کیوں ہے بجلی آسمان پر

ہماری زندگی ہے آپکے ہاتھ
نہیں، پر مرتے ہیں جیتے ہیں ہاں، پر

ہمیں نے تو ستم بے شمار جھیلے ہیں
ہمیں تو ہیں کرم بے حساب کے قابل

دعائے وصلِ صنم کے لئے حرم کو گئے
چلے گناہ کو بھڑے ثواب کے قابل

کباب دل ہو تو جمتا ہے نشۂ مئے عشق
گزک ہے خاص یہی اک شراب کے قابل

نہ آئی دخترِ رز لب میں جنابِ شیخ کے ابتک
نہ ہو کسطرح شک رندوں کو حضرت کی کرامت میں

خبر کیا پوچھتے ہو اپنے بیمارِ محبت کی
جو دم ارمان میں ٹوٹا تو نکلی جان حسرت میں

شہرت ہوئی تمھاری ہمارے ہی عشق سے
معشوق جس نے تم کو بنایا ہمیں تو ہیں

بے بندگی کے جبکو ہوا انعام کی امید
عاصی ترے وہ بارِ خدایا ہمیں تو ہیں

آئینہ دیکھتے ہیں تو کہتا ہے اُن سے عکس
تم سا حسیں بھی جسپہ ہو شیدا ہمیں تو ہیں

کل دیکھکر خیال کو تسکین ہو گئی
سمجھے تھے ہم کہ شہر میں رسوا ہمیں تو ہیں

نہ طاقت فغاں کی نہ ضبط فغاں کی
یہ زوروں پہ ہے ناتوانی ہماری

اِس تغافل کو ہمیں جانتے ہیں
یہ بھی اک طرح کی ہشیاری ہے

گالیاں دینے لگے جب خوش ہوئے
یہ نئی بخشش نیا انعام ہے۔

یہ بلا شرحِ مصیبت پر جواب
دل لگانے کا یہی انجام ہے

ہوش اک جلوہ میں لیلے وہ جمال اُنکا ہے
دلکو بیتاب جو رکھے وہ خیال اُنکا ہے

آج رہ رہ کے جو یوں عذرِ جفا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

لذتیں عالمِ اُمید کی برحق لیکن
عالمِ یاس میں کچھ اَور مزا ہوتا ہے

چُپ رہوں تو وہ سمجھتا ہے کچھ آزار نہیں
اور دُکھ درد سُناؤں تو خفا ہوتا ہے

دے چکے دل تو پھر اب روتے ہو بیکار خیال
چوک جب ہو گئی پچتانیسے ہوتا کیا ہے

جب کہا ایفائے عہد وصل کو کہنے لگے
کیسا وعدہ؟ کب کا وعدہ؟ ہو مجھے کچھ یاد بھی

یہ وفا، یہ جاں نثاری، یہ جگر، یہ دل کہاں
بندہ پرور غیر پر کی ہے کبھی بیداد بھی

جو گرا قعرِ محبت میں نہ اُبھرا وہ خیال
کیا بُری اُفتاد ہے یہ عشق کی اُفتاد بھی

قدرِ وفا نہ ہو جب بے سود پھر وفا ہے
کچھ اور اب ارادہ ہم نے بھی کر لیا ہے

آنے کی کس کے اے دل اُمید کر رہا ہے
جھوٹا زمانہ بھر کا وہ ایک چالیا ہے

آنکھوں میں کھُبنے والی دل میں اُترنے والی
تیری ہر ایک شوخی تیری ہر اک ادا ہے

تم جانو یا نہ جانو جو حال ہے ہمارا
اللہ دیکھتا ہے اللہ جانتا ہے

سیماب، شمع، بجلی، ہیں بیقرار کتنیوں
عاشق کی بیقراری سب سے مگر جدا ہے

آنکھ اُس سے کیوں ملائی؟ کیوں تو نے چوٹ کھائی
میں دل سے پوچھتا ہوں دل مجھ سے پوچھتا ہے

جب تک بغل میں دل تھا یہ تجربہ نہیں تھا
مشہور ہے کہ انساں کچھ کھو کے سیکھتا ہے

ناصح تجھے خبر کیا وہ خوب رُو ہے کیسا
ہم کیا مٹے ہیں اُس پر عالم مٹا ہوا ہے

سینے سے ہم لگائے رہتے ہیں داغ دل کو
کیونکر نہ ہو پیارا کس کا دیا ہوا ہے

کیا مفت چاہتا ہوں کچھ بھیک مانگتا ہوں
دینا ہی ہوگا بوسہ جب نقدِ دل لیا ہے

رسوائیوں کا تیری پھیلا خیال چرچا
جس سے جہاں ملے ہیں یہ تذکرہ سُنا ہے

نیند آئی شام کو کچھ بات ہے
یہ ہمارے ٹالنے کی گھات ہے

چال اسکے ساتھ کچھ چلتی نہیں
عشق کی بازی ہمیشہ مات ہے

گالیاں ملتی ہیں جب کیجے سوال
حُسن والوں کی یہی خیرات ہے

تعجب ہے کہ پیری میں بھی داغ عشق باقی ہے
سحر ہوتے ہی ورنہ شمع اُٹھ جاتی ہے محفل سے

مری حالت وہ پوچھیں سُنکے رو دیں میں نہ مانوں گا
مرے خوش کرنیکو قاصد نے یہ باتیں گھڑیں دل سے

مری مشکل کی آسانی ہوئی ہے کیسی مشکل سے
نزاکت سے چھٹا پڑتا تھا خنجر دستِ قاتل سے

تم اپنے طالب دیدار سے ناحق اُلجھتے ہو
جو ارباب ہمم ہیں جھک کے ملتے ہیں وہ سائل سے

جناب داغ کا فیضان ہے یہ شاعری اپنی
خیال اس فن کو سیکھا ہے بڑے اُستادِ کامل سے

خیال - ابوالمعانی جناب مولوی سید محمد علی صاحب شاہجہان پوری تلمیذ امیر مینائی لکھنوی

خیال

آپکے والد محمد اکبر علیخان شاہجہانپور کے باشندے تھے۔ جناب خیال غالباً شاہجہان پور کی عدالت میں مختاری کرتے ہیں۔ شعر خاصہ کہتے ہیں اور کسی رنگ میں بند نہیں۔ زبان، بیان مضمون سب باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ آپنے شعر و سخن کا ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ مگر اب عرصہ سے بند ہے۔ الغرض شاہجہاں پور میں جہاں اچھے شاعروں کی کمی نہیں انکے کلام کی بھی اچھی خاصی شہرت ہے۔ ۵۰ برس کے قریب سن ہے کچھ کلام نظر سے گزرا اُسکا انتخاب حاضر کیا جاتا ہے۔

کوئی پُرسانِ حالِ بینوا ابتک نہیں آیا	ترے بسمل کا پیغامِ قضا ابتک نہیں آیا
یہ کیا ہے کیوں چھپایا منہ مجھے حیرت زدہ پاکر	تمہیں افسوس اندازِ حیا ابتک نہیں آیا
دیکھے کوئی عروج تری جلوہ گاہ کا	ایک ایک کوہ طور ہے ہر سنگ راہ کا
لاکھوں فریب ایک وہ اندازِ گفتگو	لاکھوں فتور ایک کرشمہ نگاہ کا
تم اپنے گریباں کی خیر مانگو	بلا سے ہوا چاک دامن کسیکا
قیامت ہے آنے میں میری طبیعت	بلا ہے اُبھرنے میں جوبن کسیکا
بنا بنایا ہے ابھی شوق خود نمائی کا	خدا نہیں ابھی سامان ہے خدائی کا
اُسی کی چشم کی گردش کا آسمان بسمل	شفق شہید اُسی پنجۂ حنائی کا
دکھایا مجکو جو وحشت نے وادیٔ پُرخار	کہا جنوں نے یہ حق ہے برہنہ پائی کا
بتوں کو پیار کرے جان کھوئے دل کھوئے	اور انکے سامنے جھوٹا بنے خدائی کا
نہ پوچھ لے مرے وعدے کے بھولنے والے	اجل کو یاد ترے اعتبار پر نہ کیا
بٹھایا ہے مجھے خاموش رعبِ حسن نے لیکن	بتایا ہے نگہ کو لوٹ جانا تیرے جوبن پر
نگاہِ شرمگیں سے اُسنے جب دیکھا یہ دل بولا	کوئی تیر اور بھی ظالم ابھی میں نیم بسمل ہوں
واہ رے خوبیٔ قسمت یہ سنا ہے کہ وہ آج	میری تقدیر کا دشمن سے گلا کرتے ہیں
افشاں جبیں پہ دوش پہ گیسو چھٹے ہوئے	طرفہ چراغ جلتے ہیں کالوں کے سامنے

ساقی کی مست آنکھوں پہ دل لوٹے جاتے ہیں	شیشے جھکے ہوئے ہیں پیالوں کے سامنے
کیا جلوہ بیحجاب ہو جب گر پڑیں کلیم	اٹھتا ہے لطف دیکھنے والوں کے سامنے
ستم ہے حشر میں وہ مسکرا کر مجھ سے کہتے ہیں	ادھر تو دیکھنا کسکی شکایت ہونیوالی ہے
نامہ بر مجھ سے پوچھتا کیا ہے؟	ق ہیں نشاں صاف کوئے قاتل کے
کہیں پرزے اڑے ہوئے خط کے	کہیں ٹکڑے پڑے ہوئے دل کے
کھینچ ناوک کو نہ ظالم یہ جفا رہنے دے	ایسے مہماں کو کلیجے سے لگا رہنے دے
زندگی کے مزے اٹھائیں گے	ہو کے مہمان تیغ قاتل کے
الٰہی کیا کروں حسرت بھری آنکھ	اٹھیں صدہا محبت کی نظر سے
خیال اس درد کا رہ رہ کے اٹھنا	کوئی پوچھے مرے دل سے جگر سے
درد اٹھتا ہے تو کس پیار سے دل کہتا ہے	اٹھ مرے راتوں کو اٹھ اٹھکے جگانیوالے
کوئی دم اور ٹھہر جایئے جلدی کیا ہے؟	آپ کیا ہم بھی تو ہیں آپ سے جانیوالے
مقدر میں عشق بتاں لیکے آئے	ازل سے غم جاوداں لیکے آئے
وہ کہتے ہیں سنکر مری حسرتوں کو	تم آئے کہ اک کارواں لیکے آئے
چلے گا نہ یاں تیرے خنجر کا فقرہ	وہ گویا ہاتھ بھر کی زباں لیکے آئے
سلام اب تو جاتے ہیں اے کعبہ والو!	یہاں ہمکو وہم و گماں لیکے آئے
کہاں ہیں خیال اور کہاں کوئے قاتل	بڑے اک مرے مہرباں لیکے آئے

خیال

خیال سید شمس الحق تام گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کے رہنے والے منشی امتیاز احمد خان صاحب راز رامپوری کے تلمیذ رشید ہیں عرصہ چھ سات سال سے ریاست رامپور میں وکیل ہیں کلام بامزہ ہوتا ہے۔ زبان کی جانب توجہ ہے مضمون بھی خوب نکالتے ہیں۔ رامپور کے مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔ پڑھتے بھی اچھا ہیں۔ بدرجۂ اوسط تمام خوبیاں انکے کلام میں موجود ہیں۔ اگر موجودہ مشق جاری رہی تو عنقریب اچھا کہنے والوں میں انکا شمار ہو جائیگا

مضمون میں شوخی اور طبیعت میں جدت بلا کی ہے، روزمرہ صاف اور بندش بہت چست ہے

ترا غم بھی دل سے جدا کر دیا
اُسے اب تو آتخلیہ کر دیا

یہ کیوں تم نے محشر بپا کر دیا
یہ کیا تم کو سوجھی یہ کیا کر دیا

خزاں دیدہ تھا زندگی کا چمن
محبت نے کچھ کچھ ہرا کر دیا

ملے عمرِ رفتہ تو پوچھونگا میں
تجھے کس نے مجھ سے خفا کر دیا

جان نثاری کے یہ انعام دیئے جاتے ہیں
اُلٹے سیدھے مجھے الزام دیئے جاتے ہیں

کچھ زباں ہم بھی ہلائیں تو پھر اچھا کیا ہو
آپ دشنام پہ دشنام دیئے جاتے ہیں

بادۂ ناب نہیں، بادۂ کوثر واعظ!
اِسکی قیمت میں کھرے دام دیئے جاتے ہیں

مفت دو گھونٹ پلانے ترے صدقے ساقی
ہم غریبوں سے کہیں دام دیئے جاتے ہیں

اور کچھ گانٹھ گرہ میں نہیں اپنی ساقی
شیخ جی جامۂ احرام دیئے جاتے ہیں

رند دستارِ فضیلت نہ اُتاریں واعظ
آپ مینخانے سے بے دام دیئے جاتے ہیں

جب رُخ سے ترے نقاب سرکی
آنکھیں روشن ہوئیں نظر کی

لایا ہے جواب میرے خط کا
ہو عمر دراز نامہ بر کی

بل کھا کے خیال میں بھی آئی
اللہ رے نازکی کمر کی

کیوں وصل دعا پہ منحصر ہو
محتاج ہے خود دعا اثر کی

ہر کام ہے دوسرے کے بس میں
اللہ رے بے بسی بشر کی

دم بھرتے ہو میری دوستی کا
یہ آج ہوا چلی کدھر کی

آفت ہے شباب کی تجلّی
کیا دھوپ کڑی ہے دوپہر کی

اُس بت کو خیالِ دید یا دل
کچھ قدر نہ کی خدا کے گھر کی

ترے کوچے میں تیری دید کی خواہش تو کیا لائی
ہماری موت آئی گھیر کر ہمکو قضا لائی

اجل روٹھی ہوئی تھی آپکے بیمار فرقت سے
خدا رکھے سلامت جانکنی کو یہ منا لائی

بھری محفل میں ہم آغوش غیروں سے تجھے دیکھا
یہی اک دیکھنا باقی تھا، یہ قسمت دکھا لائی

خطا کیا دل کی مجرم آنکھ ہے لاکھوں ہیں ہم کہدیں
مصیبت کے دنوں سے عیش کے دن جب مجھے بدلے
عدو بدلے تو بدلے ہوں مگر ہم تجھ سے کب بدلے
مجھے دم توڑتے دیکھا تو ڈر کر پھیر لیں آنکھیں
یہ کیوں تیوری چڑھاتے ہو یہ کیوں آنکھیں دکھاتے ہو
خیال اب تو ہوا برہم سخن کا اور ہی عالم
خیال اتنا نہیں کوئی جو پوچھے بات بھی دلکی
دلِ بیتاب چٹکی سے مسل کر وہ یہ کہتے ہیں
پرائی آگ ہیں ای سوزِ الفت کون پڑتا ہے
کہا جب میں نے تم کسواسطے دشمن سے ملتے ہو
کوئی جینے سے خوش ہوتا ہے یہ مرنے پہ مرتا ہے
کہے دیتے ہیں یہ کھولیگی اک دن رازِ الفت کو
جفا کا ڈھنگ طرزِ جور اڑانا کوئی آسان ہے
یہ راہِ عشق بھی دنیا کی راہوں سے نرالی ہے
نہ آیا کام میرے کوئی بھی صحرائے غربت میں
اُٹھا رکھی ہو جو میں نے کوئی تدبیر ایسی ہے
گلہ جور و ستم کا ہے نہ شکوہ ہے جفاؤں کا
دکھا دینگے کسی دن بے بُلائے کون آتا ہے
خدایا کیوں مرے ہی کام بن بن کر بگڑتے ہیں
خیال اُس بُت سے نکلے کام یہ کہنے کی باتیں ہیں

یہی کُنبے لڑی تھی، ہاں یہی ہم پہ بلا لائی
خیال، اغیار کا تو ذکر کیا ہے دوست سب بدلے
وہی جیسے کے تیسے ہیں نہ جب بدلے نہ اب بدلے
ہیں صدقے مجھ سے بدلے بھی جو تم آئیں تو کب بدلے
یہ کس دن کی عنایت کے لیئے جاتے ہیں اب بدلے
جو پہلے رنگ تھے انداز تھے وہ سب کے سب بدلے
رُلاتی ہے مجھے آٹھ آٹھ آنسو بے کسی دلکی
یہی دل ہے اجی تعریف کرتے تھے اِسی دلکی
مرے آنسو ہی آ آ کر بجھاتے ہیں لگی دلکی
تو وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بولے خوشی دلکی
زمانے سے نرالی زندگی ہے زندگی دلکی
خیال اچھی نہیں ہر لحظہ ہر دم بیخودی دلکی
ابھی کچھ روز گردوں اُس ستمگر کے چلن دیکھے
کہ جس میں ہر قدم پر راہزن ہی راہزن دیکھے
خیال اپنی غرض کے یار یارانِ وطن دیکھے
مگر مشکل ہے تیرا وصل، کب تقدیر ایسی ہے
کہ عادت ہی تری ای آسمان پیر ایسی ہے
بتا دینگے کہ جذبِ عشق کی تاثیر ایسی ہے
الٰہی کیا مجھی کم بخت کی تقدیر ایسی ہے
کہ میں ایسا نہ میری خوبیٔ تقدیر ایسی ہے

خیال محمد صفدر علیخان خیال شاگرد امیر سنہ ۱۸۹۲ء میں دفتر امیر اللغات میں کام کرتے تھے

خیال

بعد کا کچھ حال معلوم نہ ہوسکا۔ کچھ منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں۔ شعر خاصہ کہہ لیتے ہیں۔

دلِ بیمار نہ تجکو کبھی اچھا دیکھا ۔۔۔ عمر بھر دامِ غم و رنج میں اُلجھا دیکھا
وصل و ہجر میں اُس بت کی تماشا دیکھا ۔۔۔ عاشقوں کو کبھی مرنا کبھی جینا دیکھا
خیر ہے آپ گرے طور پہ کیوں غش کھاکر ۔۔۔ کچھ تو فرمائیے کیا حضرتِ موسیٰ دیکھا
بوسہ لینے نہ دیا پیار اہنیں کرنے نہ دیا ۔۔۔ کبھی آئے بھی تو شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا
پاس ہی ہوتے تو کاہیکو یہ جھگڑا ہوتا ۔۔۔ آسرا دیکے مجھے آپنے مرنے نہ دیا

خیالی

خیالی جناب محمد نسیم اللہ صاحب مبارکپوری شاگرد مہر غازیپوری ۱۹۰۲ء کے نسیم دکن سے کلام منتخب ہوا معمولی کہنے والوں میں ہیں، چند اشعار انکے نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں ×

چاہتا عزت نظر رکھتا اگر تو فقیر پر ۔۔۔ اے خیالی مبتلا ہوتا نہ رانجھا ہیر پر
کانپ اُٹھے عرش والے بھی شب فرقت مگر ۔۔۔ اُف نکی اُس سنگدل نے آہ پُر تاثیر پر
کرگیا سُرمہ اثر پہلے نگاہ ناز سے ۔۔۔ لیگیا بازی بُت کافر کا جادو تیر پر
چھوٹنا مشکل ہے صیادِ اجل کے دام سے ۔۔۔ لاکھ سر ٹپکا کرے مارا کرے نخچیر پر

شیشہ و ساغر نہ محفلِ میں سبو درکار ہے ۔۔۔ ساقی مہوش سے کہدو ایک تو درکار ہے
غزالانِ ختن کے ہوش ہوتے ہیں خطا یکسر ۔۔۔ کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے
خیالی یادِ زلفِ یار میں کاٹے نہیں کٹتی ۔۔۔ درازیِ شبِ فرقت خدا جانے کہاں تک ہے

خیالی

خیالی منشی محمد فخر الدین خیالی خلف مولوی عبد العلی متوطن رائے بریلی ۱۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی دان تھے فن طب میں بھی دخل تھا اور علم عروض و قوافی میں کمال حاصل تھا۔ فن سخن میں منشی امیر اللہ صاحب تسلیم سے لکھنو جاکر استفادہ کیا، وہ نہایت توجہ سے انکی غزل بناتے تھے تکمیلِ علوم و فنون کے بعد ریاستِ حیدر آباد دکن میں کچھ عرصہ تک چالیس روپیہ ماہوار پر ملازم رہے۔ پھر بھوپال میں ملازمت اختیار کی۔ اِنکی تصانیف سے "نثر خیالی" در مدح شاہ جہان بیگم والیٔ بھوپال اور ایک ضخیم مثنوی چار سو صفحہ کی زیور طبع سے

آراستہ ہو چکی ہے۔ دو مثنویاں اور ایک دیوان ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ فارسی میں سید محمد محمود صفہانی سے اصلاح لی ہے۔ شاعری میں آپکا انداز کلام میر سے ملتا ہے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کیا کرتے تھے۔ شاگردوں میں حکیم محمد وزیر فکر نظام آباد دکن میں شہرہ دار ہیں۔ کلام سے علمی قابلیت مترشح ہوتی ہے۔ انتخاب یہ ہے

تنِ دل میں مرے یاد آئی جب تیری جاں ہو کر
فراموش آپ کو میں نے کیا ہے بے نشاں ہو کر

نہ پہنچا گا خیالی تو کبھی اُس شوخ کے دل تک
جو پہنچا گوش گل میں بھی تو بلبل کی فغاں ہو کر

کیا بیخود کسی کی نرگسِ مخمور شہلا نے
رخِ گلگوں دکھایا آج مجھکو جام صہبا نے

بہت کھینچا پھرا میں گوشہ گوشہ سخت جانی سے
کباب کی طرح کھینچا مجھے میری تمنا نے

خیالِ روئے رنگیں نے خیالی کر دیا مجھکو
مرا مرنے پہ بھی دامن نہ چھوڑا طبع شیدا نے

حسرت برس رہی ہے مری تربتِ خاک پر
چادر نہ پھول کی ہے نہ شمع مزار ہے

دکھلا رہا ہے چرخ پس از مرگ رفعتیں
بادِ صبا کی دوش پہ میرا غبار ہے

خبیر۔ ابوالخیر مظہر عالم قاضی بہیروی باشندۂ نور بھنگا سوو موجودہ کے کہنے والوں میں ہیں یا بہار میں انکے کلام کی خاصی شہرت ہے۔ چالیس برس کے قریب عمر ہے۔ یہ کلام کا خلاصہ ہے

یہ وہ نکتہ ہے کہ سمجھیں اسے اسرار پسند
ہے فرشتوں کو بھی خالِ رخِ دلدار پسند

سرِ شوریدہ کو چوکھٹ پہ مجھے رکھ دینا
اب کرے یا نہ کرے اِسکو درِ یار پسند

دِل ہے تو اسکے ہونگے خریدار اور بھی
ہم ڈھونڈ لیں گے تم سے طرحدار اور بھی

ہمکو یہ دیکھنا ہے کہاں تک کرے گا جور
ہاں اے جفا شعار ستمگار اور بھی

فتنے اُٹھا رہی ہے تمہاری نگاہِ ناز
ڈھاتی ہے حشر شوخیِ رفتار اور بھی

خبیر۔ لالہ نرہری پرشاد منتظم دفتر معتمد شکاری حیدرآباد دکن آپنے فن سخن میں میر احمد علی مہر سے استفادہ کیا تھا سنہ ۹ء کے خدنگ نظر سے کلام انتخاب ہوا زیادہ حالات باوجود تلاش دستیاب نہو سکے ۔

وحشتِ دل ان دنوں ایسی گریباں گیر ہے
طوق گردن میں ہے میری پاؤں میں زنجیر ہے

لاکھ کوشش سے انہیں اے دل سنایا حالِ ہجر
کہہ چکا اپنی سی اب آگے تری تقدیر ہے

داد منشی غلام حسین خاں داد میکش تھانوی کے شاگرد ہیں۔ کئی برس ہوئے پیام محبوب نامی ایک رسالہ دکن سے شائع کیا تھا، جو تھوڑے عرصہ میں بند ہو گیا، کلام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں۔ انتخاب ملاحظہ ہو۔

اک دن تو قصد کیجے تماشائے آب کا	مضطر ہے موج آنکھوں میں دم ہے حباب کا
چھپتا ہے اہلِ درد کا کب رنگ اتحاد	ہے اشکِ عندلیب میں عالم گلاب کا
سُن کے شکوہ وہ بے وفائی کا	بولے جھوٹا ہے تو خدائی کا
اے بتو بندہ پروری سیکھو	تم کو دعوی ہے گر خدائی کا

دارا صاحبِ عالم و عالمیان میرزا محمد دارا بخت دارا مرحوم عرف میرزا شبّو۔ ولیعہد اوّل حضرت ظلِ سبحانی محمد بہادر شاہ اخیر بادشاہ دہلی۔ شاگرد رشید ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق ۱۱ر جنوری ۱۸۴۹ء میں بعمر پچاس سال انتقال فرمایا اور شاہ چراغ دہلی کے مزار کے قریب میں دفن ہوئے آپ حضرت ابوظفر کے خلفِ اکبر تھے اور مشہور ہے کہ عمر میں صرف بارہ برس چھوٹے تھے، اِنکی والدہ زکیۃ النسا بیگم مرزا سلیمان شکوہ کی دختر تھیں جو اکبر شاہ کے حقیقی برادر خورد تھے، آپکے آٹھ اور بقول بعضے بارہ فرزند دلبند تھے۔ جن میں سے دو میرزا احمد اختر اور مرزا نصیر الملک اب بقید حیات ہیں، اور ایک صاحبزادی بھی زندہ و سلامت موجود ہیں۔ میرزا دارا بخت صاحب مولانا فخر الدین کے خلیفہ تھے اور میر محمدی صاحب سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اور مولانا عماد الدین کے خط نسخ اور نستعلیق میں شاگرد تھے۔ بہت نیک خصلت بھولے بھالے شاہزادے تھے۔ آپکے کلام میں حضرتِ ذوق کا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔ انتخابِ کلام ہدیۂ ناظرین ہے۔

سحاب پارۂ دامن ہے آبدیدوں کا
نمودِ برق طپیدہ ہے دلِ طپیدوں کا

جہاں ہوئے ہیں گلِ سرخ خاک سے پیدا
اسی زمیں میں ہے مدفن ترے شہیدوں کا

اثر یہ رکھتی ہے فریاد دردمندوں کی
بڑا ہے صبر ستمگر ستم رسیدوں کا

کوئی بھی ساتھ کسی کے گیا نہ اے دارا
عدم کو جاتا ہے کیا قافلہ جریدوں کا

خط میں گر وصل کا مضمون لکھیں ہم دارا
آرزو کا کوئی ہرگز نہ ملے حرف سے حرف

جا پھنسا حلقۂ زلفِ بتِ عیار میں دل
لیگئی کھینچ کے شامت دہنِ یار میں دل

ستا کے جھانکے نہ طرف غیر کے وہ پردہ نشیں
اپنا رکھ آئے ہیں ہم روزنِ دیوار میں دل

شعلہ رو یہ ترے عارض پہ نہیں خالِ سیاہ
جل گیا گر کے کوئی آتشِ رخسار میں دل

دل لگی کیونکہ ہماری ہو کہیں اے دارا
لگ گیا اپنا تو اک کوچۂ دلدار میں دل

کسی کی چشمِ میگوں کا تصور ہمکو ہے دارا
قدم اٹھتا نہیں ہے لغزشِ مستانہ رکھتے ہیں

وہ جو دریا میں نہانے کو گیا شب دارا
چومتا تھا قدم اُس مہ کے بھنور پانی میں

ہم خاک ہو کے آئے ہیں کوچہ میں یار کے
لیکن یہ خوف ہے کہ صبا کو خبر نہ ہو

ہم سن چکے ہیں شورشِ رفتار کسی کی
اب شورِ قیامت کا بھی دھڑکا نہیں ہمکو

ہے کشتیٔ عمر اپنی جو گردابِ فنا میں
مانند حباب اپنا بھروسا نہیں ہمکو

یوں لاکھ اہلِ دانش تدبیر تو بنا لو
بگڑی ہوئی ولیکن تقدیر تو بنا لو

بدلہ ستم کا لینا ٹھہرا فلک سے دارا
آہِ جگر کو اپنے تم تیر تو بنا لو

دل سے لطف و مہربانی اور ہے
مہربانی کی نشانی اور ہے

قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے
عشق کی میرے کہانی اور ہے

چشمِ گردش نہ ہے تو اُس کی نگاہ
اِک بلا آئی ناگہانی اور ہے

اُس مسیحا دم کو لائے گا خدا
کوئی دم کی زندگانی اور ہے

روکنے سے میرے کب رکتے ہیں اشک
بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے

کیوں علاج ضعف کرتا ہے طبیب ہمسے اے دارا وہ کب ہوتا ہے صاف	دم بدم یاں ناتوانی اور ہے اُس کے دل میں بدگمانی اور ہے
مت لگا مہندی بتِ بے پیر اپنے ہاتھ سے غیر کے ہاتھوں سے میرا قتل کیوں منظور ہے	مل لے تو خون دلِ دلگیر اپنے ہاتھ سے ہائے لے قاتل لگا شمشیر اپنے ہاتھ سے

دارا

دارا۔ عالیجناب نواب خواجہ بہاؤالدین خان بہادر دلاور جنگ دارا، امیر حیدرآباد دکن شعرائے دکن میں نامور اور صاحبِ دیوان ہیں سنہ ۱۲۷۳ھ سالِ پیدایش ہے۔ خواجہ حسین علی خان شکوہ کے فرزند رشید اور نواب وقارالدولہ نورالحسین مرحوم کے داماد اور شاگرد ہیں خوش رو خوش وضع خندہ پیشانی رئیس تھے، کلام مزے کا اور پاکیزہ ہے۔

بھری ہیں سینۂ عاشق میں حسرتیں کیا کیا پھنسایا زلف میں کمبخت میری آنکھوں نے	صنم برائے خدا اُس سے مدعا دل کا خطا نظر کی ہے اس میں قصور کیا دل کا
اُنکو میرا مجھکو اُنکا اعتبار آنے تو دو عرش پر پھر میں قدم رکھوں معاذاللہ کی جا	دوستی کے درمیاں قول و قرار آنے تو دو پاؤں کے نیچے زمیں کوئے یار آنے تو دو

داغ

داغ دہلوی۔ میر محمدی داغ۔ خلف الرشید میر سوز مرحوم۔ خوش رُو زیبا شمائل اور بڑے وجیہہ جوان تھے۔ قسّامِ ازل نے اُنکی طبیعت میں ایک خاص درد ودیعت کیا تھا جسکی جھلک انکے کلام میں ملتی ہے۔ شفیق باپ کی صلاح نے اُس میں اور چار چاند لگا دیئے تھے بیس برس کی عمر میں ایک شعلہ رُو کے عشق میں مبتلا ہوئے، چند روز اُسکی صحبت میں نہایت عیش و عشرت سے اوقات بسر کی۔ آخرکار فلکِ تفرقہ پرداز کی کارسازی سے دامِ مفارقت میں پھنسکر جان دی۔ یہ واقعہ شاہ عالم ثانی کے زمانہ کا ہے۔ حالتِ نزع میں بہت انتظار کے بعد ایک اشتیاق نامہ اپنے مطلوب کو بھیجا جسکے سرنامہ پر یہ شعر لکھا۔

از جاں رمقے بود کہ مکتوب تو آمد	دیگر چہ نویسم خبرم خوب گرفتی

اِس جواب کے لکھتے ہی طائر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔

اِسی کے پاس تھا دل کیا ہوا ہے ہمنشیں دیکھو	اِدھر دیکھو اُدھر دیکھو یہیں دیکھو کہیں دیکھو
اِسی کے پاس پھرو رشک کے یہ جو مسکراتا ہے	اُسی کی جیب دیکھو ہاتھ دیکھو آستیں دیکھو!
پکڑنا چور کا مشکل نہیں گر کچھ سمجھ ہووے	ہوائی رنگ دیکھو ماہتابی سے جبیں دیکھو
یہ چاہ نہیں بھلی بری ہوتی ہے	جی لیتی ہے دوستی بری ہوتی ہے
لگتا نہیں جی کہیں بھی اُسکے بن آہ	سچ کہتے ہیں یہ لگی بری ہوتی ہے

داغ

داغ - تاجِ سخنوری کا گوہر شب چراغ نواب میرزا خان داغؔ دہلوی ثم المخاطب بہ سلطان الشعرار، بلبلِ ہندوستان، جہاں اُستاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ فصیح الملک بہادر مرحوم و مغفور، بتاریخ ۱۲، ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۶ھ مطابق سنہ ۱۸۳۱ء ۱۴ بیساکھ سمت ۱۸۸۸ بکرمی روز چہارشنبہ بمقام شاہجہاں آباد دہلی محلہ بلیماران میں پیدا ہوئے لائق جوتشیوں نے متعدد زائچے آپکی پیدایش کے وقتاً فوقتاً تیار کیئے، کیونکہ مرزا صاحب کو فنِ نجوم سے صرف دلچسپی ہی نہ تھی، بلکہ خود بھی اِس فن میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے، سات برس کی عمر میں آپ کی تعلیم شروع ہوئی، لیکن جملہ علوم و فنون میں تکمیل کا عدیم المثال موقعہ قلعۂ معلیٰ دہلی میں سنہ ۱۲۶۰ھ میں باریاب ہوکر حاصل ہوا، اگرچہ اِس سے پہلے بھی رامپور میں مولوی غیاث الدین، صاحبِ غیاث اللغات سے فارسی کی چند درسی کتابیں پڑھی تھیں، مگر جب قلعہ میں مستقل طور سے آئے تو مولوی سیّد احمد حسین ولد میر غلام حسین شکیبا جو میر تقی میرؔ کے شاگرد تھے آپکے معلّم مقرر ہوئے خوشنویسی میں پہلے اُستادِ زمانہ سیّد امیر پنجہ کش دہلوی کے شاگرد ہوئے، اور پھر معمولی اوقات میں مرزا عباد اللہ بیگ سے جو اُنکے شاگردِ رشید تھے اصلاح لیتے رہے، مرزا صاحب کو قلعۂ شاہی کے متوسّل ہونے سے جو خصوصیت اور آسانیاں تعلیم میں نصیب ہوئیں وہ عام طور سے اور لوگوں کو میسّر نہیں آسکتیں۔ اجمالاً فنِ شہسواری و سپاہگری کے کل اُصول اور کرتب قلعے میں رہ کر آپنے سیکھے۔

لکھنے کی مشق جن سے کی تھی انھیں سے بانک بھی سیکھی، اور مرزا سنگی بیگ سے جو خاندانِ میر حامد علی خاں کے مشہور پھکیت تھے پھکیتی اور علی مد سیکھی، گھوڑے کی سواری کی مشق سجن خاں اور بندو خاں چابک سوارانِ شاہی سے کی، اور بندوق اور تیر اور چوزنگ لگانے اور سیناکاٹنے میں خاص ولیعہد بہادر سے شرف یاب ہوئے؛ غرضکہ اسی طرح اور مختلف فنون متفرق لوگوں سے حاصل کیے، قلعے میں پہنچکر جہاں اور باتوں کا چرچا دیکھا وہاں سب سے زیادہ شاعری کی گرم بازاری پائی، آپکی خداداد ذہانت اور ہونہار طبیعت کا رجحان اسی طرف زیادہ رہا، اور اس آتشِ شوق کے بھڑکانے والے سامان بہت کچھ جمع ہوگئے، خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ کا زمانہ تھا وہ بادشاہ اور ولیعہد کے استاد ہونے کی وجہ سے اکثر اوقات قلعۂ معلّٰی ہی میں تشریف رکھتے تھے، مرزا صاحب کی ذہانتِ خداداد اور تیزیِ طبع دیکھ کر آپکے مربّی و سرپرست صاحب عالم میرزا ولیعہد بہادر نے آپ کو حضرت ذوق کا شاگرد کرادیا، اُس وقت آپکا سن گیارہ یا بارہ برس کا تھا، قلعے کے علاوہ شہر میں مختلف مقامات پر مشاعرے ہوا کرتے تھے، مرزا صاحب نے پہلے پہل نواب مصطفٰی خان مرحوم المتخلص بہ شیفتہ کے مشاعرے میں غزل پڑھی، جسکی طرح میں پہلا مطلع یہ فرمایا تھا۔

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں	کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بیتاب نہیں

اگرچہ اب یہ مطلع موجودہ دیوانوں میں نہیں رکھا گیا ہے، مگر اہلِ نظر اس مطلع کو دیکھ کر بارہ تیرہ برس کے لڑکے کی جودتِ طبع کا اندازہ کرسکتے ہیں، اُسی زمانے کے ایک مطلع کو سُن کر سے

لگ گئی چُپ تجھے اے داغ حزیں کیوں ایسی	مجکو کچھ حال تو کمبخت بتا تو اپنا

مولانا صہبائی نے تحسین و آفریں کے کلمے کہے تھے،

ہنگامۂ غدر سے دس ماہ پیشتر ۱۸۵۶ء میں بقضائے الٰہی یکایک وبائے ہیضہ میں ولیعہد بہادر نے انتقال کیا، مرزا صاحب کو اس حادثے اور صدمے سے سخت رنج پہنچا، ہنوز اس صدمے کی یاد دلِ غمگین سے نجانے پائی تھی کہ دس مہینے بعد ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا، اور کامل ۲۴ برس

تک جس عیش و عشرت سے زندگی بسر ہوئی تھی اُس دور کا گویا خاتمہ ہوگیا، اس انقلاب زمانے کے بعد مرزا صاحب مع اپنے قبائل کے رامپور چلے گئے اور نواب یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں کے سایۂ عاطفت میں پناہ گزین ہوئے۔ نواب موصوف اپنی حیات تک لطور مہماں نوازی سلوک کرتے رہے، انکے بعد نواب خلد آشیاں کلب علیخاں بہادر نے بھی وہی قدردانی کی اور مرزا صاحب کو اپنی مصاحبت میں رکھا، اور بطور معتمد خاص کارخانجات اصطبل و گاڑی خانہ و فراشخانہ و کنول خانہ و شتر خانہ سپرد کیا، ۲۴ برس تک مصاحبت کے ساتھ آپنے ان خدمات کو نہایت خوبی، عمدگی اور دیانت سے سرانجام دیا۔ نواب خلد آشیاں کو ان پر بہت بھروسہ اور اطمینان تھا اور عزت و قدر کی نظروں سے دیکھتے تھے، رامپور میں نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے زمانہ سے شعر و سخن کی گرم بازاری شروع ہوگئی تھی، اور نواب کلب علیخاں بہادر کے عہد میں جو فروغ ہوا اُسکی کیفیت اظہر من الشمس ہے، غالب، شاہزادہ حیا، بحر، قلق، عروج، اسیر، منیر، تسلیم، جلال، امیر مینائی وغیرہ سب نامی شعرا ریاست کے دعاگو تھے اور بجز غالب مرحوم کے سب وہیں قیام رکھتے تھے، ان سب لکھنؤ کے سربرآوردہ شعرا کے مجمع میں گو دلی کے شعرا میں صرف ایک مرزا صاحب ہی کا دم تھا، لیکن انکی خداداد معجز بیانی نے کسی کو ان پر غالب نہ آنے دیا اور یہ ہمیشہ آسمان شاعری پر آفتاب کی طرح چمکتے رہے، یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دہلی میں قیام کے ہنگام میں جب نواب یوسفعلیخاں مرزا ولیعہد کے مصاحب تھے تو بچپن میں مرزا داغ اور نواب کلب علیخاں کا عرصہ تک ساتھ رہا تھا اور وہ بچپن کا خلوص نواب مرحوم نے تادم آخر بڑی وضعداری سے نبھایا۔

رامپور کے مشاہیر امرا کے ہاں اور خاص نواب صاحب کی طرف سے بھی مشاعرہ ہوا کرتا تھا اور اس سرکاری مشاعرہ کا اہتمام و انتظام مرزا صاحب ہی کے سپرد ہوتا تھا، مشاعرہ میں انکی غزل پر لوگوں کی نگاہیں رہا کرتی تھیں اور انکا یہ حال ہوتا تھا کہ اکثر بوجہ انتظام و اہتمام مشاعرہ اپنی غزل کہنے کی فرصت نہ ملتی، جسوقت مشاعرہ شروع ہوجاتا اُس وقت

برابر کے کمرے میں ایک شاگرد کو لیکر ٹہلتے اور شعر کہتے جاتے تھے اور وہ لکھتا جاتا تھا، یہانتک کہ ان کا نمبر آیا اور غزل پڑھی، شعر پڑھنے کا انداز بھی وہ انوکھا اور نرالا تھا کہ جس نے سنا ہے وہی اس لطف کو جانتا ہے، اوّل تو ڈیل ڈول تنومند اور شیشں پھر اس پر بڑی آواز یہ قدرتی مناسبتیں پڑھنے میں وہ شان پیدا کر دیتی تھیں کہ سننے والے بیتاب ہو جاتے تھے اور معمولی شعر بھی مشاعرے میں سب سے اعلیٰ نظر آتا تھا، مولانا حالی فرماتے تھے کہ حضرت آسیہ کی زبان سے خود انھوں نے رامپور میں سُنا کہ ”وہ بھئی مشاعرے میں کیا جائیں ہماری طولانی غزلوں کو کوئی نہیں پُوچھتا اور مشاعرہ ختم ہونے پر داغ کی غزل سب کی زبان پر ہوتی ہے“، مرزا صاحب غزل خوانی کے وقت اور لوگوں کی طرح ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے تھے، نہ خواہ مخواہ بناوٹ کی آواز سے گلے کی رگیں پُھلاتے تھے، نہایت سادہ طور سے با آواز شعر پڑھتے اور کسی کسی لفظ پر زیادہ جوش کے وقت صرف ایک ہاتھ اُٹھا دیتے تھے، مرزا صاحب کا دیوان انکے شاگردوں کے پاس رہتا تھا جو وقت پر پیش کیا جاتا تھا اور اُسی میں دیکھ کر غزل پڑھا کرتے تھے۔ ریاست رامپور میں مرزا صاحب کا قیام کم و بیش چالیس سال تک رہا اور مختلف اوقات سفر کا اتفاق ہوا، نواب خلد آشیاں کے ہمراہ حج کعبہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، ایک مرتبہ دلی اور لکھنؤ پٹنہ وغیرہ کئی مقامات میں ٹھیرتے ہوئے کلکتے تشریف لے گئے اور وہاں کم و بیش تین ماہ تک قیام کیا ؎

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں	عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

جس روز آپ پٹنہ پُہنچے ہیں کسی رئیس شہر کے ہاں مشاعرہ تھا آپکے آنے کی خبر سنکر عمائد شہر آپ کو باصرار تمام مشاعرے میں لے گئے آپنے فی البدیہہ بیس بائیس شعر جو جاتے وقت کہہ لئے تھے مشاعرے میں پڑھے اور خاطر خواہ داد پائی، کلکتے میں ناخدا کی مسجد کے سامنے آپ ٹھیرے تھے، جبتک وہاں رہے برابر مٹیا برج کے شعرا اور اہلِ بنگالہ سے ہم صحبت رہے اور شعر و سخن کے خوب چرچے رہے، نواب کلب علیخاں بہادر کے انتقال کے بعد ۱۸۸۶ء میں کونسل کا

تقرر ہوا، جنرل عظم الدین خاں سے الگی نہ بنی، اس وجہ سے ریاستِ رامپور سے دست کش ہوئے اور دہلی چلے آئے، حیدر آباد دکن جانے تک کے وقفہ میں مختلف مقامات لاہور، امرت سر، ریاست کشن کوٹ، بنگلور، آگرہ، علی گڈھ، متھرا، جیپور، ریاست منگرول، اجمیر شریف ان سب شہروں میں اپنے تلامذہ اور مشتاقوں کو اپنی ملاقات سے شرف بخشا، آخر ۱۳۰۵ھ میں آپ حیدر آباد تشریف لے گئے، اور پہلے پہل چند روز محلہ بازار شیدی عنبر میں مولوی سیف الحق ادیب دہلوی مترجم اخبارات کے پاس اور پھر اسی کے متصل ایک دوسرے مکان میں مقیم ہوئے، آپ کی شہرت اور ناموری نے دلوں میں پہلے ہی گھر کر لیا تھا، تمام شہر میں دھوم مچ گئی، شدہ شدہ بندگانِ عالی حضور میر محبوب علی خان بہادر نظام دکن خلد اللہ ملکہ کو بھی معلوم ہوا، اور اس درمیان میں آپ کی پہلی عرضی راجہ گردھاری پرشاد بہادر عرف بنسی راجہ المتخلص بہ باقی کی معرفت پیشگاہِ سلطانی میں پہنچ چکی تھی، پہلی بار جو قصیدہ آپنے حضور بندگانِ عالی دام اقبالہٗ کی مدح میں لکھا تھا اُس کا مطلع یہ ہے۔

میں ہوا بادیہ پیما طرف ملک دکن	سرمۂ چشم غزالاں ہوئی گرد دامن

اسکے بعد کچھ عرصہ کے لیئے دلّی چلے آئے، ابھی یہیں تھے کہ نواب آسمانجاہ نے بذریعۂ شقہ طلب کیا، چنانچہ پھر حیدر آباد پہنچے اور باریابی کے منتظر رہے، حیدر آباد کی امیدواری اور اُسکے مصارف وہی لوگ خوب جانتے ہیں جنھوں نے وہاں کے اُمیدواروں کا حال دیکھا یا سنا ہے، بالآخر آپکے صبر و استقلال نے یہ نتیجہ خیر دکھایا کہ ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ روز شنبہ ۹ بجے شب کے مولوی ظہور علی صاحب کے مکان پر فرمانِ رحمت نشان یعنی حضور بندگانِ عالی آصف جاہ سادس کی غزل ایک سر بمہر لفافے میں چند چوبدار لیکر حاضر ہوئے اور زبانی یہ بھی کہا کہ صبح آٹھ بجے حاضرِ دربار ہونے کا حکم ہوا ہے، آپ نے اُسی وقت اُس غزل کو دیکھ کر واپس کیا اور صبح حاضر دربار خاص ہو کر نذر پیش کی، بس اسی تاریخ سے سلسلۂ اصلاح شروع ہو گیا، شرف حضوری کی جو تاریخ کہی یہ ہے، ؎

	تو کہد و ملے داغ سلطان سے	حضوری کی تاریخ پوچھیں اگر	

پھر تو روزانہ مراحم خسروانہ بڑھتے گئے، نو مہینے بعد ایک مراسلہ معتمد محکمۂ صرف خاص صادر ہوا کہ سرکار نے آپکے نام چارسو پچاس روپیہ حالی کا وظیفہ روز ورود سے جاری کیا، پھر چھ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ کو بحکم سلطانی آپ کا وظیفہ ایک ہزار ماہوار مقرر ہوا، اور ورود حیدرآباد کیوقت سے اس تاریخ تک ایکہزار ماہوار کے حساب سے مرحمت فرمایا گیا، اس شاہانہ عطیہ کی تاریخ کہی

اس ترقی کی کہو اے داغ یہ تاریخ تم	ابتداسے اپنی ساڑھے پانسو نقدی بڑھی

گویا پچھلے نقصانات کی تلافی بھی شاہانہ الطاف کی بدولت کماحقہ ہوگئی اور ہر طرح آسودگی اور فارغ البالی نصیب ہوئی، علاوہ اس مقررہ وظیفے کے وقتاً فوقتاً جو عطیات شاہی ہوئے انکی تفصیل بیکار ہے، علاوہ بیش قیمت مرصع گھڑی وجیغہ وقبضہائے شمشیر وچپہائے دستی، و پارچہ جات کشمیری وبنارسی ایک موضع جسکو حیدرآبادی زبان میں مقطعہ کہتے ہیں اور جو بلدۂ حیدرآباد سے دس بارہ کوس پر واقع ہے عطا کیا، اس موضع کی آمدنی کم وبیش دو ہزار روپیہ سالانہ تھی، قیمتی اشیاء کے سوا وقتاً فوقتاً نقد انعامات بھی پاتے رہے، جس کے متعلق بتحقیق سُنا گیا کہ قریب چھبیس ہزار روپیہ کے جو انعامات میں دیئے گئے تھے خزانۂ خاص میں انکے نام جمع ہیں اور یہ حکم سلطانی تھا کہ مرزا صاحب جس وقت چاہیں یہ رقم وصول کرلیں، مگر یہاں الطافِ شاہی نے اسقدر مستغنی اور مالامال کردیا تھا کہ تادمِ آخر اس رقم کے منگانے کی ضرورت نہ پڑی، مرزا صاحب نے حیدرآباد میں اٹھارہ برس مستقل قیام کیا، اور نہایت عزت وآبرو سے بسر کی، ریاست میں اعلیٰ طبقے کے امراکی باہمی مخالفتوں کا بازار اس زمانے میں خوب گرم تھا، اور ہر نئے اُمیدوار یا ملازم کے لیئے اپنی ترقی کے واسطے منجملہ اور ذریعوں کے ایک بہت بڑا ذریعہ یہ ہوتا تھا کہ وہ کسی ذی اقتدار رئیس کا درباری اور خوشامدی بنے، اور دوسرے رئیسوں کے خلاف سازشوں میں شریک ہو، اس ترکیب سے مربّی رئیس کے دل میں جگہ پیدا کی جاتی تھی اور یہی ذریعہ ترقی ہوتا تھا، مگر ظاہر ہے کہ آخر میں ایسی باتوں کا نتیجہ اُسی

کے لیے مضر ہوتا تھا، چنانچہ اس مرض کا اثر تھوڑا یا بہت ابتک باقی ہے جسکے ہاتھوں اکثر عہدہ داروں نے بکفِ افسوس ملتے ہوئے حیدرآباد چھوڑا ہے بہرحال مرزا داغ مرحوم نہ کوئی ملکی خیال کے آدمی تھے، نہ جنگی، نہ انھیں شاعری کے سوا کسی مشغلہ سے کام تھا۔ اگرچہ خوشامد درآمد کے لیے شاعری ایک اچھا ذریعہ ہے مگر حضرتِ داغ نے اس قسم کی تمام باتوں سے ہمیشہ احتراز کیا، یعنی وہاں رہ کر بجز بندگانِ عالی متعالی اعلیٰ حضرت قدر قدرت خلد اللہ ملکہ کے بڑے سے بڑے رئیس کے نہ خوشامدی بنے نہ درباری، ہمیں جہاں تک علم ہے کہہ سکتے ہیں کہ کسی خاص تقریب کے سوا (اور وہ بھی ایک دو دفعہ) مرزا صاحب کسی رئیس ذی اقتدار کے ہاں محض اسکی خوشنودی مزاج کے لیے نہیں گئے، ہمیشہ بندگانِ عالی کی تحریک یا اجازت سے کہیں آتے جاتے تھے، مرزا داغ کا حیدرآباد میں جو اعزاز و اکرام ہوا وہ کسی پر پوشیدہ نہیں ہے، اور بیشک تمام اردو کے شعرا کے طبقے میں یہ بات قابلِ فخر ہے کہ اس سلسلے میں ظاہری اعزاز کے لحاظ سے ایک شخص ایسا بھی ہو گیا، دکن کی قلمرو میں نعمت خان عالی کے بعد اس رتبہ پر فصیح الملک داغ فائز ہوئے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آپنے اس حصول ترقی و اعزاز کے مدارج طے کرنے میں زیادہ تر اپنی مدد آپ کی ہے، یہی وہ قابلِ قدر بات ہے جس نے آپ کو خوددار بنایا اور جس نے آپ کو اُمرا کی چھوٹی خوشامدوں سے باز رکھا جس نے ہمیشہ نیک نام رکھا، اور مرنے کے بعد متفق اللفظ ایک دنیا نے یہی رائے قائم کی، اُنکی عام بے غرضی اور بے تعلقی کی یہ حالت تھی کہ دوسرے امیروں کا کیا ذکر ہے، مہینوں او بغیر طلب محض اپنی مرضی سے اپنے آقائے ولی نعمت کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے اگرچہ اپنے ذاتی کتنے ہی کاموں کا ہرج ہوتا ہو الغرض از حد محتاط رہے اور دور اندیشی کو کام میں لاتے رہے، اس خیال کو اُنھوں نے ایک شعر میں ظاہر کیا ہے اور خوب کہا ہے۔

میں وضع کا پابند ہوں گو جان بھی جائے	جب کوئی بلائے نہیں آتا نہیں جاتا

اُمرا اور اراکین سلطنت کے علاوہ اپنے معمولی احباب اور نیاز مندوں سے وہ اس طرح ملتے تھے کہ باہم کوئی مغائرت معلوم نہ ہوتی تھی، بوجہ پیرانہ سالی اور کثرتِ امراض کے سبب زیادہ کہیں آتے جاتے نہ تھے البتہ اُنکے پاس جو شخص آتا تھا اُس سے نہایت اخلاق اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے، حیدرآباد میں شاعروں کی کثرت مشہور ہے مگر آپ بجز چند مشاعروں کے دو وہ بھی کبھی کبھی کسی عام مشاعرے میں نجاتے تھے، حاجی ابراہیم خانسامان جو حضور بندگانِ عالی نظام مرحوم کے مقرب اور بڑے بارسوخ اور ذی اقتدار شخص تھے ابتدا سے اُن میں اور مرزا صاحب میں باہم بہت محبت و اخلاص کا برتاؤ تھا وہ مہینے دوسرے مہینے اپنے گھر مشاعرہ کیا کرتے تھے اور اُس مشاعرے میں اکثر بندگانِ عالی حضور نظام دکن کی تازہ غزل آیا کرتی تھی، اس مشاعرے میں مرزا صاحب البتہ اکثر جایا کرتے تھے اور حضور نظام کی غزل بھی خود ہی پڑھتے تھے، یا دو ایک مرتبہ مدار المہام بہادر اور راجہ رائے رایاں بہادر آنانت ونت کے مشاعروں میں شریک ہوئے ورنہ کسی مشاعرے سے غرض نہ تھی۔

مرزا داغ دلی کے رہنے والے تھے اور جس طرح کہ اس شہر کے رہنے والوں میں عموماً خوش دلی و مذاق و لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی کا مادہ ہوتا ہے اسی طرح مرزا صاحب کی کوئی بات لطیفے سے خالی نہ ہوتی تھی، اُنکی مسلسل تقریر اُنکی دلکش گفتگو میں خدا جانے کس قیامت کے مزے تھے کہ جی یہ چاہتا تھا ہر وقت سنے ہی جائیے، وہ بالکل اپنے اس شعر کے مصداق تھے۔

باتیں سُنئے تو پھڑک جائیے گا	گرم ہیں داغ کے اشعار یہ کیا

ہمکو ایک معتبر ذریعے سے اُنکے چند لطیفے ملے ہیں۔ تفریح ناظرین کے لیئے ذیل میں درج کرتے ہیں مولوی حسن رضا خان صاحب حسن بریلوی شاگرد رشید حضرت داغ مرحوم کا بیان ہے کہ زمانۂ قیام رامپور میں ایک روز میں حاضر خدمت ہوا دیکھا کہ ایک نہایت ہی ضعیف العمر صاحب عربی لباس پہنے ہوئے بیٹھے گا رہے ہیں، جب وہ اُٹھ گئے تو میں نے پوچھا "یہ حضرت یہ ذاتِ شریف کون تھے؟" فرمایا تم واقف نہیں، عرض کیا نہیں، فرمایا سچ کہتے ہو

گزارش کیا۔ واقعی عرض کرتا ہوں، فرمایا "میاں یہ جنت کے قوال تھے" اسی طرح ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک صاحب تشریف لائے، آپ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے، وہ واپس گئے سلام پھیر کر اپنے ملازم سے فرمایا "انھیں بلا نا!" وہ جا کر لایا۔ پوچھا کیوں آئے تھے۔ پھر چلے کیوں گئے؟ کہا آپ نماز پڑھتے تھے اور مجھے ایک دوسرا کام تھا۔ فرمایا "میں نماز پڑھتا تھا لاحول تو نہیں پڑھتا تھا" ایک مرتبہ نواب خلد آشیاں کے سامنے (سانس) کی تذکیر و تانیث پر بحث ہو رہی تھی۔ جو فریق مذکر کہتا تھا وہ دلّی والوں کے کلام سے سند پیش کرتا، فریق مخالف لکھنو والوں کے اشعار سے ثبوت دیتا تھا، مرزا داغ خاموش بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے، کہ نواب صاحب نے انکی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، مرزا داغ تم کچھ نہیں کہتے۔ فرمایا فریقین تھک لیں تو میں ایک قولِ فیصل عرض کرونگا، دونوں فریقوں نے بالاتفاق کہا کہ آپ ہی کے سر فیصلہ ہے۔ فرمایا "میرے نزدیک مؤنث کی سانس مؤنث ہے۔ اور مذکر کا مذکر" اس پر سب ہنس دیئے اور گفتگو ختم ہو گئی۔ ایک مرتبہ رامپور کے مشاعرہ میں طرح دیگئی "ہمکو رونا ہے خندۂ گل کا" آپ کچھ علیل تھے، مسہل ہو چکے تھے طرح پر غزل نہ کہی تھی، تلامذہ نے اصرار کیا۔ ناتوانی کا عذر فرمایا۔ مگر بعض ضدی شاگردوں نے نہ مانا فرمایا خیر قلمدان لاؤ! سب خوش ہو گئے کہ استاد غزل تصنیف فرمائیں گے، اب کان مشتاق ہیں اور نگاہیں اُستاد کا منہ تک رہی ہیں کہ یہ مطلع ارشاد ہوا ؎

ہمکو کیا لطف ساغرِ مُل کا	کبھی کچھ بڑھی ملی کبھی چھلکا

احسن مارہروی کی زبانی سنا کہ ایک دن احباب و تلامذہ خدمتِ اُستاد میں حاضر تھے اور آپ غزل کہہ رہے تھے، مرزا مظفر حسین بیگ بارق تخلص بھی حاضر تھے انھوں نے اُستاد کے فکرِ بے ساختہ اور تصنیفِ برجستہ کو دیکھ کر معمولی طور پر کہا کہ خدا جانے آپ کس طرح شعر کہتے ہیں ذرا دیر نہیں ہوتی کہ پورا شعر کہہ دیتے ہیں، اُستاد نے یہ سنکر فرمایا "بھائی تم کس طرح شعر کہتے ہو،" انھوں نے جواب دیا کہ حضرت ہم تو کسی خاص وقت

پلنگ پر لیٹ کر اور حقہ سامنے رکھکر فکر سخن کرتے ہیں۔ کبھی اس طرف کروٹ لی کبھی اُس طرف کبھی اُٹھے، کبھی بیٹھے، اِس مشکل سے کوئی شعر نکلتا ہے، فرمایا "آپ شعر نہیں کہتے بلکہ شعر جنتے ہیں"، اُنکی سحر بیانی اور قبولیت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ ہندوستان میں شاید کوئی قصبہ و قریہ ایسا ہو کہ جہاں اُنکا کلام خواص سے لیکر عوام تک کی محفلوں اور سماع کی صحبتوں میں گایا نہ جاتا ہو، مرزا داغ کا حق بہ حیثیت مصلح زبانِ اُردو قیامت تک مٹنے والا نہیں، اُنھوں نے بہت سے ثقیل اور غیر فصیح الفاظ ترک کر دیئے، موافق اور مخالف دونوں اس امر کے شاہد ہیں کہ غزل کے جسقدر موضوع ہیں اُن تمام صفتوں پر حضرت داغ حاوی تھے اور بلاشبہ تغزل کے عدیم النظیر اُستا اور فرد یگانہ تھے۔ اسیر۔ منیر۔ حالی۔ ظہیر۔ مجروح۔ زکی سالک۔ جلال۔ امیر۔ سب اُنکی قادر الکلامی کے معترف اور مداح تھے، بہر حال اس شعر کے پتلے کی خوش آیند باتیں قدرتی طور پر ناموزوں طبائع میں موزونی پیدا کرنے بلکہ شاعر بنا دینے کے لئے کافی سامان تھیں، مرزا صاحب کے روزمرہ واقعات اور حالات کی تفصیل و تشریح کے لئے ایک مبسوط کتاب چاہیئے۔ آپ نے اٹھارہ برس حیدر آباد میں بعزت و آبرو بسر کر کے ۹۔ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۷۔ فروری ۱۹۰۵ء کو آٹھ روز مرض فالج میں مبتلا رہ کر دارِ فانی سے انتقال فرمایا۔ گذشتہ سالوں میں تین چار مرتبہ حاسدوں نے اُنکی وفات کی خبر اُڑائی۔ حتیٰ کہ اخباروں میں قطعات تاریخ وفات تک درج کر دیئے۔ اِس لئے چند روز لوگوں کو اِس کے ماننے میں تامل رہا لیکن آخر کار اس مرتبہ خبر صحیح نکلی۔ انتقال کے بعد بحکم سلطانی عید بقر کے دن آپ کا جنازہ مکہ مسجد (حیدر آباد) میں لایا گیا جہاں بعد دوگانہ عید جنازے کی نماز پڑھی گئی۔ پھر یوسف صاحب شریف صاحب کی درگاہ میں دفن کئے گئے۔ جناب امیر مینائی مرحوم بھی اِسی جگہ آسودہ ہیں۔ تجہیز و تکفین کے مصارف کے لئے خزانہ شاہی سے پانچ ہزار روپیہ عطا ہوا تھا۔ انتقال کی یوں تو ہزارہا تاریخیں شعرا نے لکھیں مگر یہاں ایک تاریخ ابو المعظم مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی اُنکے داماد کی لکھی جاتی ہے۔ کیونکہ یہی

تاریخ لوحِ مزار پر کندہ ہوئی ہے۔ اس تاریخ کے سوا آپ کے نام اور تخلص ہیں تاریخ وفات نکلتی ہے یعنی (نواب میرزا داغ) اس تاریخ میں بکثرت توارد ہوا ہے قریب قریب ہر ایک تاریخ کہنے والے نے اور مادوں کے ساتھ یہ مادہ بھی نکالا ہے۔

قطعۂ تاریخ از جناب سائل دہلوی

رفت از دہر چوں فصیح الملک	لرزہ اُفتادہ در تمامیٔ ہند
اوستادِ نظام آصف جاہ	موردِ لطفِ شاہ حامیٔ ہند
رسبت برقامتش قبائے سخن	زیب بر وے خطاب جامیٔ ہند
سلکِ نظمش بسان سلکِ گہر	جوہریٔ سخن نظامیٔ ہند
شد وفاتش بشام یوم الحج	دفن شد روز عید سامیٔ ہند
آہ دل برکشید و سائل گفت	مدفن پاک داغ نامیٔ ہند

اسی طرح اُنکے پیارے شاگرد سیّد رضی الدین کیفی نے تاریخ کہی۔ کیفی نوشت بلبل ہندوستان برفت

داغ نواب میرزا گفتم

یہ قیامت تک کسی کے دل سے مٹنے کا نہیں   مادہ تاریخ کا داغ فصیح الملک ہے

مرزا صاحب کے تین دیوان اور ایک مثنوی مطبوعہ موجود ہے اور چوتھا دیوان یادگار داغ بھی تیار تھا۔ چاروں دیوانوں میں گلزار داغ و آفتاب داغ زمانہ قیام رامپور کے چھپے ہوئے ہیں۔ ان دیوانوں میں اکثر وہی غزلیں ہیں جو رامپور کے مشاعروں میں کہی گئی تھیں اُن غزلوں میں ایک عجیب دلکشی اور سحر آفرینی ہے یہ وہ فکر سخن ہے جو بڑے بڑے ماہران و اُستادان فن کے مقابلے میں کیا گیا تھا اور اسی نے جہاں اُستادی کا سکّہ سب کے دلوں پر بٹھا دیا تھا۔

"مہتاب داغ" حیدرآباد کے قیام کا نتیجہ ہے اور وہیں پہلی مرتبہ چھپا اب دوسری بار راقم تذکرہ نے اُن کے ورثا سے حقوق تصنیف لیکر بڑے اہتمام سے چھپوایا ہے اور شائقین کے فائدہ اور اشتیاق کی نظر سے نصف قیمت کر دی ہے۔ اس دیوان میں مضامین کے ساتھ

سلاست زبان کا بہت لحاظ کیا ہے۔ اس دیوان کا ایک ایک شعر سہل ممتنع ہونیکے علاوہ ایسا دلچسپ اور دلکش ہے کہ ایک مرتبہ سننے کے بعد اُس کا لطف دل سے نہیں جاتا۔ مثنوی جس کا نام "فریاد داغ" ہے زمانہ قیام رامپور میں کہی گئی تھی۔ اور اس مثنوی کی اصلیت یہ ہے کہ ایک طوائف منی بائی المعروف با لمتخلص بہ حجاب کلکتے کی رہنے والی بے نظیر کے میلے میں رامپور آئی۔ مرزا صاحب کی منظور نظر ہوئی بس اسکی محبت و فراق کا وہ افسانہ ہے۔ حق یہ ہے کہ سچا واقعہ ہونے کی وجہ سے اُسکا ہر شعر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔ زبان کے ساتھ تمام شاعرانہ خوبیوں کا لحاظ رکھا ہے۔ یہ تینوں دیوان اور مثنوی کئی کئی بار چھپ چکی ہیں اور ہر جگہ موجود ہیں۔ یادگار داغ نامی چوتھا دیوان سید علی احسن نے مرزا داغ مرحوم کی وفات کے بعد لاہور سے شائع کیا۔ لیکن چونکہ بلا اجازت ورثائے مرزا مرحوم یہ دیوان شایع ہوا۔ اس لئے اصلی مسودات اور غزلیات مکمل طبع نہ ہوسکیں آخر کار راقم تذکرہ نے بعد حصول حق تصنیف بقیہ غیر مطبوعہ کلام بطور ضمیمہ یادگار داغ مرتب کر کے شائع کیا۔

اُن کے عادات اور حسن اخلاق کے متعلق اتنا لکھنا کافی ہے کہ طبیعت ایسی مرنجان مرنج تھی کہ کیا دنیاوی معاملات اور کیا شاعری کے میدان میں کبھی کسی سے بدمزگی نہ ہوئی۔ ہجو لکھنے لکھانے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اعراض و تعریض اُن کے مسلک سے باہر تھے۔ بعض ہم عصر اُستادان فن کو اُن سے حسد ہو تو ہو۔ وہ خود اس الزام سے بالاتر تھے۔ ایک اس کی زندہ نظیر وہ اشتیاق اور خلوص تھا۔ جو انھوں نے امیر مینائی مرحوم کی حیدر آباد میں جھانداری اور تیمارداری میں ظاہر کیا۔ اسی طرح حضرت جلال۔ مجروح۔ ظہیر۔ تسلیم۔ راسخ۔ نساخ شعرائے ہم عصر سے اون کے تعلقات ہمیشہ شگفتہ رہے۔ شاعری کی دنیا میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ شاذ ہی کسی کو موجد یا مقلد ہونے کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ ہاں صاحب طرز ہونا جُدا بات ہے۔ جرأت نے شوخ کلامی اور معاملہ بندی کا جو رنگ نکالا۔ اُسے منشی مادھو رام جوہر فرخ آبادی نے (جنکا ذکر خیر اور کلام حصہ دوم میں درج ہو چکا ہے) اِس خوش اسلوبی

سے سانچے میں ڈھالا کہ وہی تغزل کا زیور قرار پایا۔ حضرت داغ نے اپنی طبع وقاد کی صنعت کاری سے اسے ایسا اجالا اور مرصع کیا کہ معشوقۂ مجاز کے سر کا جھومر بن گیا۔ غزل کی شاعری کا سرتاج قرار پایا۔ استاد کامل فن نے اُسے ایسا کر دکھایا کہ ہر کس و ناکس کے دل کو بھایا۔ اور ہر کوئی اسی رنگ میں لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ فرق اتنا ہوا کہ کسی کو کسی حد تک کسی کو کسی درجہ تک اس تقلید میں کامیابی ہوئی۔ مگر بعض نامی شعراء اس تقلید میں اپنا اصلی رنگ بھی کھو بیٹھے۔

حضرت داغ یہی نہیں کہ غزل گوئی کے مسلم الثبوت اُستاد اور اپنے طرز میں لاثانی تھے۔ بلکہ وہ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ان کے دیوان سے مل سکتا ہے۔ مثنوی شاعری کے نہایت مشکل اصناف میں سے ہے۔ اور ہم فریاد داغ کا ذکر اوپر کر آئے ہیں۔ قصیدہ۔ بلاغت سخن۔ مہارت فن۔ علوئے تخیل۔ پختہ کلامی۔ اور علمیت و تبحر کی معیار سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اردو میں مرزا رفیع کے بعد شیخ ابراہیم ذوق اور میر ممنون کے قصاید ہی مقبول ہوئے اور مستند مانے گئے۔ لیکن حضرت داغ کے جو قصاید مہتاب داغ میں موجود ہیں۔ وہ اپنی آن بان میں کسی ہم عصر کے قصیدوں سے کم نہیں۔ اور انکی قادر الکلامی اور مشاقی فن کا سکہ بٹھاتے ہیں۔ میرزا داغ کی اوستادی میں سوائے کم سواد حاسدوں کے اور کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ ان کے کلام کا خاص رنگ۔ سہل ممتنع۔ فصاحت۔ روزمرہ کی صفائی شوخی مضمون اور بیاں کی جدت ہے۔ چنانچہ ہزارہا اشعار اور صدہا غزلیں قبول عام و خاص کا تمغہ پاکر لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ زبان کے چٹخارے اور لوچ کے ساتھ ساتھ بندشیں بہت چست ہوتی ہیں اور اکثر محض الفاظ کے اُلٹ پھیر سے شعر میں جان ڈالدیتے ہیں۔ ان کی پرگوئی اور قادر الکلامی حیرت انگیز ہے۔ چھوٹی بحر ہو یا طویل۔ زمیں شگفتہ ہو یا سنگلاخ۔ اپنے زور طبیعت سے آمد کا مزا دکھا دیا ہے۔ غرض کہ کہیں بھی اپنے رنگ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ آورد کا تمام کلام میں کہیں شائبہ تک نہیں ہے۔ گلزار داغ کی غزلوں

کے مطالعے سے پایا جاتا ہے کہ غور و فکر سے شعر کہتے تھے شعر کی بندش اور الفاظ کے ہر ایک پہلو پر نظر غایر ڈالتے تھے۔ مہتاب داغ ہیں اس کے برخلاف ایک حیرت انگیز روانی پائی جاتی ہے۔ طبیعت ہے کہ دریا کی طرح اُمڈی چلی آتی ہے۔ زبان صاف شستہ۔ بندش میں تصنع کو ذرا دخل نہیں۔ بااین ہمہ مضمون میں شوخی اور تیکھا پن اس درجہ ہے کہ شعر بے مثل ہوجاتا ہے۔ اور دل میں چٹکی لئے بغیر نہیں رہتا حُسن و ادا کے دلفریب نظارے اختلاط کی نوک جھونک کے مضمون۔ جس صفائی اور نفاست سے ان کے دیوانوں میں پائے جاتے ہیں وہ انھیں کا حصّہ ہے۔

المختصر اس سے کسی کو انکار نہیں کہ شہرت خاص و عام اور قبول و وام کے لحاظ سے بلا مبالغہ اس زمانہ میں کسی شاعر کو اس نعمت کا عشر عشیر بھی نصیب نہیں ہوا جو حضرت داغ کا حصّہ ہے۔ داغ کا ہر شعر عجیب مقناطیسی جذب اور بجلی کی حرارت رکھتا ہے۔ جس کی تاثیر سننے والے کے دل کو بے چین کئے دیتی ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کا پیدا کرنا شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ مگر ہر کوئی اسے پیدا بھی نہیں کرسکتا۔ اگر جذبات۔ احساسات اور خیالات کی ہو بہو اور بولتی چالتی تصویر کھینچنا۔ قدرت کی نقاشی کے مرقع میں جگہ پا سکتا ہے۔ تو ہم حضرت داغ کو نیچرل شاعری کے دربار میں سب سے اونچی جگہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

شعرا کی کثیر تعداد آپ کے تلمذ سے مستفید ہوئی۔ اور جسقدر اچھے شاعر آپ نے ملک میں پیدا کئے۔ اسکی نظیر آجتک دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ اُردو شاعری پر آپ کا دوہرا احسان ہے۔

کل شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے۔ جن میں سے بعض ارشد تلامذہ کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ حضور نظام جنت مقام۔ بیخود بدایونی۔ نسیم بھرتپوری۔ بیخود دھلوی مرزا سائل دھلوی۔ آغا شاعر دہلوی۔ ڈاکٹر محمد اقبال۔ حسن بریلوی۔ بیباک۔ حیرت۔ آزاد رسا۔ فیروز۔ اشک۔ احسن۔ مارہروی وغیرہم۔

ایسے شخص کے کلام کا انتخاب ایک دشوار کام ہے تاہم چند اشعار اُنکے نتائج افکار سے ناظرین کی تفریح کیلئے نقل کئے جاتے ہیں

انتخاب گلزارِ داغ

سلامت منزلِ مقصود تک اللہ پہنچا دے — مجھے آنکھیں دکھاتا ہے ہر ایک نقشِ قدم میرا

مجھے آباد کرتا ہے مجھے برباد کرتا ہے — خدایا دین و دنیا میں کرم تیرا ستم میرا

یہاں بھی تُو وہاں بھی تُو زمیں تیری فلک تیرا — کہیں ہم نے پتا پایا نہ ہرگز آج تک تیرا

صبر سے زاہد نا فہم نہ میخواروں کا — بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہ گاروں کا

اُڑ گئے نام شفا سُن کے نہ ہے خواہشِ مرگ — مُنہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا

دوش پر اپنے جو صیاد نے زلفیں چھوڑیں — اور جی چھوٹ گیا آج گرفتاروں کا

گر میسر ہے بُت ہوش رُبا کو نہیں دیکھا — اُس دیکھنے والے نے خدا کو نہیں دیکھا

جنت ہے مگر خانۂ دشمن بھی الٰہی — آتے ہوئے اس گھر میں قضا کو نہیں دیکھا

آج راہی جہاں سے داغ ہوا — خانۂ عشق بے چراغ ہوا

نہ دل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین پایا نہ خواب دیکھا
خدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا

آخر کو عشق کفر سے ایمان ہو گیا — میں بُت پرستیوں سے مسلمان ہو گیا

رندانِ بے ریا کی ہے صحبت کسے نصیب — زاہد بھی ہم میں بیٹھ کے انسان ہو گیا

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقیں — تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

لے ہی تو آئیں گے اُسے ہم دم — میرے ہی نام سے تو آئے گا

تیرا اک وعدۂ دیدار اور وہ بھی قیامت پر — پھر اُس پر صبر اتنا ہائے دل امیدواروں کا

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں — آپ کے مِلنے کا ہو گا جسے ارماں ہو گا

بن گئی فرقت میں جو کچھ اپنے جی پر بن گئی — ہو گیا جو کچھ ہمارے دل کا عالم ہو گیا

حُسن میں انداز کے آتے ہی نخوت آ گئی — زلف میں پڑتے ہی بل ابرو بھی پُرخم ہو گیا

جس کی بغل میں شب کو وہ ہو اُس کو دیکھئے | جس وقت آنکھ کھل گئی دیدار ہو گیا
اے داغ کیا بتائیں محبت میں کیا ہوا | بیٹھے بٹھائے جان کو آزار ہو گیا

اللہ رے جامہ زیب تری جامہ زیبیاں | پہنا جو تو نے رنگ وہی رنگ کھل گیا

ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا نگاہ اُلفت کبھی نہ کرنا | تمھیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا
ہماری میت پہ تم جو آنا تو چار آنسو گرا کے جانا | ذرا رہے پاس آبرو بھی کہیں ہماری ہنسی نہ کرنا
وہ ہے ہمارا طریق اُلفت کہ دشمنوں سے بھی مل کے چلنا | یہ ایک شیوہ ترا ستمگر کہ دوست سے دوستی نہ کرنا

تمھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب | ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا
بتائیں لفظ تمنا کے تم کو معنے کیا | تمھارے کان میں اِک حرف ہم نے ڈال دیا

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا | مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا
نہ رونا ہے طریقے کا نہ ہنسنا ہے سلیقے کا | پریشانی میں کوئی کام جی سے ہو نہیں سکتا

رہے ہو جس طرح دل میں رہو نظروں میں بھی یونہی | کہاں کی ایسی گھبراہٹ ہے ٹھہرو دم تو لو جانا

ہوا ہے جب سے شہرہ اُس عدوئے دین و ایماں کا | کوئی دل چیر کے دیکھے عقیدہ ہر مسلماں کا
خوشامد میں قدر کی ہو گیا بدنام عالم میں | زمانہ جانتا ہے مجھ کو یہ عاشق ہے درباں کا

حورانِ خلد بولتی ہیں بڑھ کے بولیاں | نیلام ہو رہا ہے تمھارے شہید کا

وائے غفلت کہ اب کیا ہم نے | جو ہمیں پہلے کام کرنا تھا

گذاری میں نے ساری رات یہ کہکر وہ اب آئے | ذرا اے چشم تر تھمنا ذرا اے دل جگر رہنا
ہماری سخت جانی بس نہ ٹھہری کھیل ہی ٹھہرا | قسم ہے تم کو گردن پر چھری تم پھیر کر رہنا

سنبھل سنبھل کے بگڑتا ہے کچھ دِل بیتاب | الٰہی آج یہ صدمہ ہے جان پر کیسا

مر گئے ہم تو وضعداری میں | دوستی کی نباہ نے مارا

جو عاشقی میں خاک ہوا کیمیا ہوا | [illegible] تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا

کم ہوگا داغ سا بھی مکار اب جہاں میں | اُس بت پہ شیفتہ ہو اور نام لے خدا کا

یہ دل کو تاب کہاں ہے کہ ہو مآل اندیش
انھوں نے وعدہ کیا اس نے اعتبار کیا

کچھ آگے داور محشر سے ہے امید مجھے
کچھ آپ نے مرے کہنے کا اعتبار کیا

ڈوب کر سینے میں اس رنگ سے پیکاں نکلا
دل سے بے ساختہ نکلا کہ وہ ارماں نکلا

تری الفت کی چنگاری نے ظالم اک جہاں پھونکا
ادھر چمکی ادھر سلگی یہاں پھونکا وہاں پھونکا

مجھے کیوں کر یقیں ہو آگ ظالم کو جلائیگی
کسی دن آتش رنگِ شفق نے آسماں پھونکا

رہا تھا کونسا ارمان جیتے جی جلانے کا
کہ تو نے لاش کو میری جواب اے بدگماں پھونکا

عشق در پردہ پھونکتا ہے آگ
یہ جلانا نظر نہیں آتا

ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں
وہ تماشا نظر نہیں آتا

جان جاتی دکھائی دیتی ہے
اُن کا آنا نظر نہیں آتا

سینے میں اب کہاں وہ جوش وہ بھی تھا اک ابال سا
بیٹھ گیا کچھ اُٹھتے ہی چھوڑ گیا خیال سا

عرض وفا پہ دیکھنا اوسکی ادائے دلفریب
دلمیں کچھ اعتبار سا آنکھ میں کچھ ملال سا

اوسکی لچک پہ دم فدا اوسکی ادا پہ دل نثار
ہائے وہ شاخ سی کمر ہائے وہ قد نہال سا

تارے ہی گن کے کاٹتے رات فراق کی مگر
نکلا ستارہ بھی کہیں کوئی تو خال خال سا

کوسوں تک اُسکے اُلٹے پاؤں چلا آہ میں غریب
جبتک میری نظر سے نہ پنہاں وطن ہوا

ہاتھوں سے جو بچے تری باتوں سے مر گئے
چٹکی میں تھا جو تیر وہ لب پر سخن ہوا

تہمت نہ رکھ خدا کے لئے مجھ پہ زاہدا
کب میں نے توبہ کی تھی جو میں توبہ شکن ہوا

بات کیا چاہیئے جب مفت کی حجت ٹھہری
اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

نفس کے آنے جانے پر بشر کی زندگی ٹھہری
یہ پوچھو تو مسافر تو نے کیا لطفِ سفر پایا

رہی ہے رات بھر تھم تھم کے رہ رہ کر چپک دلمیں
جگایا ہے کے چٹکی درد نے جب بیخبر پایا

کل چھیڑا لیں گے یہ زاہد اجتو ساقی کے ہاتھ
رہن اک چلو پہ ہمنے حوض کوثر رکھدیا

زندگی میں پاس سے دم بھر نہ ہوتے تھے جدا
قبر میں تنہا مجھے یاروں نے کیونکر رکھدیا

پند گو لطفِ ملاقات اسے کہتے ہیں
خوش کبھی میں نہوا شاد کبھی تُو نہ ہوا

لطف فرما جو وہ رہتا تو ٹھکانا ہی نہ تھا
عین حکمت تھی وہ کافر جو دلِ آزار رہا

خاک میں دل کی صفائی نے ملایا مجھکو
کہ مرا ایک جہاں واقفِ اسرار رہا

عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

جو تمھاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمھیں کہدو منصفی سے تمھیں اعتبار ہوتا

ترے وعدہ پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

یہ مزا تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی
نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

کبھی مسجد میں جو وہ شوخ پریزاد آیا
پھر نہ اللہ کے بندوں کو خدا یاد آیا

میرے قابو میں نہ پہروں دلِ ناشاد آیا
وہ مرا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا

دی مؤذن نے شبِ وصل اذاں پچھلی رات
ہائے کمبخت کو کسوقت خدا یاد آیا

جان لیجائے گا آنا شبِ تنہائی کا
کون اب روکنے والا ہے مری آئی کا

ہو گیا پرتو رخسار سے کچھ اور ہی رنگ
میں نے منہ چوم لیا اُس کے تماشائی کا

رازِ دل کوئی کہے لاکھ میں کیونکر اپنا
داورِ حشر جدا چاہیے محشر اپنا

وہ زمانہ بھی تمہیں یاد ہے تم کہتے تھے
دوست دنیا میں نہیں داغ سے بہتر اپنا

میرے مرنے سے کیا ظالم نے کو سامانِ عیش
پر لبِ مطرب پہ آکر نغمہ شیون بن گیا

اُٹھنا ہی تیری بزم سے دشوار تھا ہمیں
اوسپر سنبھالنا دلِ بے اختیار کا

غش کھاکے داغ یار کے قدموں پہ گر پڑا
بیہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

لطف آرام کا نہیں ملتا
آدمی کام کا نہیں ملتا

دل نے تری گلی سے نہ اُٹھنے دیا مجھے
سو بار قصدِ دیر و حرم ہو کے رہ گیا

غم نے ترے نچوڑ لیا قطرہ قطرہ خوں
نام اسکا تو میرے دل میں تھا پنہاں ناصح
بیداد تری دیکھ کے یہ حال ہوا ہے
شب کو جلتا چھوڑ آئے تھے دل اس کوچہ میں ہم
اے داغ صدمہ غم ہجراں بجا درست
جو عرض تمنا پہ ظالم نے کہا مجھ سے
تو مہر کرم ہو کہ ہم توبہ کریں مے سے
پوچھا تھا محبت میں ہوتا ہے قلق کیسا
لوگ کہتے ہیں بنا دلی بگڑ کر لکھنؤ
مہرباں ہو کے جب ملیں گے آپ
کم نہیں سامان میں ہنگامۂ محشر سے آپ
حضرت زاہد ہر ایک نشہ کو عادت شرط ہے
حضرتِ زاہد نکل آیا فلک پہ آفتاب
ہے طرفہ تماشا سر بازار محبت
اللہ کرے تو بھی ہو بیمار محبت
ابرو سے چلے تیغ تو مژگاں سے چلیں تیر
اسواسطے دیتے ہیں وہ ہر روز نیا داغ
واعظ کی زباں پر تو وہ کلمے ہیں کہ گویا
کل تابِ فغاں تھی تو یہ تاثیر کہاں تھی
اندیشۂ فردا نہ رہے حضرت زاہد
وعدے پہ مری اُنکی قیامت کی ہے تکرار

تھوڑا ہی درد دل میں کھٹکنے کو رہ گیا
ہائے کمبخت ترے منہ سے یہ کیونکر نکلا
عاشق کوئی دنیا میں کسی پر نہیں ہوتا
وہ بھی قسمت سے چراغ راہ دشمن ہوگیا
یہ سب سہی مگر تمہیں جینا ضرور تھا
ابتک نہ ملا ہوگا سائل کو جواب ایسا
دوزخ میں پڑے زاہد بے لطف ثواب ایسا
قسمت نے کہا دیکھ اے خانہ خراب ایسا
پر کہاں اے داغ اُس اجڑے ہوئے گل کا جواب
جو نہ ملتے تھے سب ملیں گے آپ
دیجئے دلکو دعائیں بنگئے اس گھر سے آپ
مر نہ جا بینگے شرابِ چشمۂ کوثر سے آپ؟
پیر و مرشد اب تو اُٹھئے میکدے کے در سے آپ
سر بیچتے پھرتے ہیں خریدار محبت
صدقے میں چھٹیں تیرے گرفتار محبت
تعذیر کے بھوکے ہیں خطاوار محبت
اک درد کے خوگر نہ ہوں بیمار محبت
بخشے ہی نہ جائیں گے گرفتار محبت
کیا کیا لب خاموش پہ قرباں ہے اثر آج
میخانے میں پی لیجئے تھوڑی سی اگر آج
اور بات ہے اتنی کہ ادھر کل ہے ادھر آج

اے شیخ جسکو حور نہ ملیگا بڑہیگا شوق
محشر میں خلق اپنی مصیبت میں مبتلا

وہی تو ہے شعلۂ تجلی کہ وحشت ایمن سے تنگ ہوکر
جھکی ذرا چشم جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی

یاں ملیں خیال اور ہے واں مدِ نظر اور
تمہیں تو ہو جو کہ خواب میں ہو تمہیں تو ہو جو خیال میں ہو

رقیب اچھے ہیں نے مانا برا مجھے تو نے دل سے جانا
مجھسے کہتے ہیں نکالیں گے ہمیں کچھ تدبیر

وہی قاتل وہی مخبر وہی منصف ہے مرا
کہاں کرشمہ برق جمال وطور کہاں

چشم جاناں سے الگ ہو لے حیا
وہ نازک کہ جامہ سے باہر نکل کر

رہبر نے راہِ عشق میں برسوں دیئے چکر مجھے
بیٹھے بٹھائے آئے جو شامت تو کیا علاج

کہتے نہ تھے وہ سن کے برا مان جائینگے
ستم دیکھو بیانِ رنج پر کہتا ہے وہ ظالم

دلوں پر سینکڑوں سکے ترے جوبن کے بیٹھے ہیں
کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں

بھری ہیں عجب ادائیں اُس شوخ سیمتن میں
یہ شوقِ خودنمائی کیا کچھ جنوں سے کم ہے

میت پہ آئینگے وہ یاں مجھ میں دم ہے باقی

جنت کو میں پسند جہنم کو تو پسند
یاں یہ تلاش آئے کوئی خوبرو پسند

جب اپنے اپنی منو چاہی کھلا حسینوں پہ رنگ ہوکر
بڑا مزا اس ملاپ کا ہی جو صلح ہو جائے جنگ ہوکر

ہے حال طبیعت کا ادہر اور ادہر اور
کہاں چلے آنکھیں ملا کر کدہر کو جاتے ہو دل لیں آکر

بھلوں سے کرتے ہیں سب بھلائی کسی برے کا تو کچھ بھلا کر
صاف کہدو کہ دل آیا ہے تمھارا کس پر

اقربا میرے کریں خون کا دعوے کس پر
نظر پڑی تھی کسی دل جلے کی پتھر پر

یوں جھٹکے پڑتے نہیں بیمار پر
تھکے اس طرح جس طرح کوئی چلکر

ظالم سے جب پوچھا کہا اب آگئے منزل کے پاس
دل نے کہا کہ آؤ چلیں یار کی طرف

اے داغ اٹھے اور کہو ماجرائے دل
یہ صدمے تو نہیں آخر کسی پہ ہم بھی مرتے ہیں

کلیجوں پر ہزاروں تیر اس چتون کے بیٹھے ہیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

ایک ٹیڑہ سادگی میں ایک سیدہ بانکپن میں
بیتاب تجھکو لایا خلوت سے انجمن میں

زندہ لپیٹ دینا یارو مجھے کفن میں

تھم تھم کے وار کر کہ مرا دور ست نہ جائے
جب میں نہیں تو لذتِ زخمِ جگر کہاں

کیا کہا پھر تو کہو دل کی خبر کچھ بھی نہیں
کیوں یہ کیا ہے خمِ گیسو میں اگر کچھ بھی نہیں

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

کیسا جواب حضرتِ دل دیکھئے ذرا
پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

ہرچند داغ ایک ہی عیار ہے مگر
دشمن بھی تو چھٹے ہوئے سارے جہان کے ہیں

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

اڑ گئی یوں وفا زمانہ سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

دل لگی دل لگی نہیں ناصح
تیرے دل کو ابھی لگی ہی نہیں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں

چلا ہے کعبہ کو تو خاک چھاننے زاہد
فقط خدا ہی خدا ہے حرم میں خاک نہیں

ملے مجھ سے تو فرمایا تمھیں کو داغ کہتے ہیں
تمھیں ہو ماہ کامل ہیں تمھیں سنتے ہو لالے ہیں

بنے ہوئے ہیں وہ محفل میں صورتِ تصویر
ہر ایک کو یہ گماں ہے ادھر کو دیکھتے ہیں

اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ
میں پائے شوق و دستِ تمنا بریدہ ہوں

اجل کا نام لیں تقدیر کو روئیں مجھے کوسیں
مرے قاتل کا چرچا کیوں ہو میرے سوگواروں میں

مرا ہی دل نہ ہو میں ہی نہوں لے مرگِ مایوسی
خدا جانے یہ کس کی فاتحہ ہے آج یاروں میں

وہ ہے افسردہ دل عالم بجا ہے یہ اگر کہیے
کہ مردے ہیں نہیں پر اور زندے ہیں مزاروں میں

دل کا کیا حال کہوں صبح کو جب اس بت نے
لیکے انگڑائی کہا ناز سے ہم جاتے ہیں

فلک دیتا ہے جنکو عیش انکو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

گلے شکوے کہاں تک ہونگے آدھی رات تو گذری
پریشاں تم بھی ہوتے ہو پریشاں ہم بھی ہوتے ہیں

زمانہ دوستی پر ان حسینوں کی نہ اترائے
یہ عالم دوست اکثر دشمنِ عالم بھی ہوتے ہیں

بظاہر رہنما ہیں اور دل میں بدگمانی ہے
ترے کوچہ میں جو جاتا ہے آگے ہم بھی ہوتے ہیں

جو کہتا ہوں کہ مرتا ہوں تو فرماتے ہیں مرجاؤ
جو غش آتا ہے مجھپر تو ہزاروں دم بھی ہوتے ہیں

کوئی اب تجھ سے آرزو ہی نہیں
اب جو دیکھا تجھے وہ تو ہی نہیں

رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہوں گے
صاف کہدیجئے ملنا ہمیں منظور نہیں

خدا شاہد خدا شاہد ہے کیوں کہتے ہو وعدوں پر
خدا کو کیا غرض میرے تمہارے درمیاں کیوں ہو

تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتا دو مجھکو
دوسرا کوئی تو اپنا سا دکھا دو مجھکو

دیکھئے سیر سر حشر میرے پاس اگر
کہتے ہیں کون ہوں میں جانتے ہو تم مجھکو

میں بھی حیران ہوں اے داغ کہ یہ بات ہے کیا
وعدہ وہ کرتے ہیں آتا ہے تبسم مجھکو

گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کو کیا کرے کوئی

مریض عشق کی کیا پوچھتے ہو یہ پوچھو
کہ زندہ کوئی بھی تیمار دار باقی ہے

رُخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

دم تقریر نالے حلق میں چھریاں چبھوتے ہیں
زباں تک ٹکڑے ہو ہو کر مرا افسانہ آتا ہے

وہی جھگڑا ہے فرقت کا وہی قصہ ہے الفت کا
تجھے اے داغ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہے

ہر دل میں نئی طرح سے ہے یاد کسی کی
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی

یار کا پاس نزاکت دل ناشاد رہے
نالہ تھمتا ہوا رکتی ہوئی فریاد رہے

یہ رنج وہ رنج ہے جسمیں نہ بتوں کو بھولیں
عیش وہ عیش ہے جس میں نہ خدا یاد رہے

یوں تو برسوں نہ پلاؤں نہ پیوں اے زاہد
توبہ کرتے ہی بدل جاتی ہے نیت میری

تدبیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی
بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی

مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد
کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

کیجئے اے قسمت برگشتہ تلاش دشمن
دوست کو ڈھونڈتے ہیں ہم تو عدو ملتا ہے

حق ہی کی بات میں ناصح کا طرفدار ہوں میں
دل کی کہتا ہے جو اس دلکو برا کہتا ہے

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

غش آیا ہاتھ کانپے تیغ کے ٹکڑے ہوئے آخر
کہو تو سخت جانوں کا کرو گے امتحاں پھر بھی

سچ ہے کہ یونہی ڈوب گئیں اپنی وفائیں
ہم تم پہ کسی طرح کا دعویٰ نہیں رکھتے

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمھارا کیا ہے
آنکھ نرگس کی دہن غنچہ کا حیرت میری

دوست خوش ہونے لگے دوست کے مر جانے سے
غم کا یہ کال پڑا ہے مرے غم کھانے سے

روح کسی مست کی پیاسی گئی میخانے سے
مے اُڑی جاتی ہے ساقی تیرے پیمانے سے

قابلِ رحم ہے اُس شخص کی رسوائی بھی
پردے پردے ہی میں کمبخت جو رسوا ہو جائے

سنتے ہیں خوشی بھی ہے زمانہ میں کوئی چیز
ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں کدھر ہے وہ کہاں ہے

دل میں نے دیا تھا جسے دلدار سمجھ کر
کیوں تم وہی معشوق ہو یا مجکو گماں ہے

یہ میرے واسطے تاکید ہے دربانوں کو
کہ اسے میں بھی بلاؤں تو نہ آنے پائے

حور کے واسطے زاہد نے عبادت کی ہے
سیر تو جب ہے کہ جنت میں نہ جانے پائے

رہ رہ کے وہ پچھتائیں کہ کیوں اسکو ستایا
تھم تھم کے میری آہ میں یارب اثر آئے

نہیں ہوتی کسیکو بھی گوارا اپنی ناکامی
جسے تو بخش دیتا ہے جہنم اس سے جلتا ہے

آشفتگی کسی کی اثر کچھ تو کر گئی
بن بن کے زلف رخ پہ تمھارے بکھر گئی

کیا کہیے کس طرح سے جوانی گذر گئی
بدنام کرنے آئی تھی بدنام کر گئی

زاہد شراب ناب کی تاثیر کچھ نہ پوچھ
اکسیر ہے جو حلق کے نیچے اُتر گئی

کچھ زہر نہ تھی شراب انگور
کیا چیز حرام ہو گئی ہے

داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

بوسہ مانگا تو کہا اُسنے بدل کر چتون
آپکو یہ بھی خبر ہے مری عادت کیا ہے

تڑپنے سے دلِ بیتاب کوئی غم نکلتا ہے
ٹھہر جا صبر کر مضطر نہ ہو کیوں دم نکلتا ہے

پیغامبر کی بات پہ آپس میں رنج کیا
میری زباں کی ہے نہ تمھاری زباں کی ہے

سُنکر میرا فسانۂ غم اُس نے یہ کہا
ہو جائے جھوٹ سچ یہی خوبی بیاں کی ہے

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

غم اُٹھانے کے واسطے دم ہے
زندگی ہے اگر تو کیا غم ہے

اچھی صورت پہ غضب ٹوٹ کے آنا دل کا
یاد آتا ہے ہمیں ہائے زمانہ دل کا

اِن حسینوں کا لڑکپن ہی رہے یا اللہ
ہوش آتا ہی تو آتا ہے ستانا دل کا

حسینوں کی وفا کیسی جفا کیا
جو دل آیا تو پھر اچھا بُرا کیا؟

تو ہی اپنے ہاتھ سے جب دلربا جاتا رہا
دل کی بھی پروا نہیں جاتا رہا جاتا رہا

داغ ہر ایک زباں پر ہو فسانہ تیرا
وُہ دن آتے ہیں وہ آتا ہے زمانہ تیرا

دُعا مانگ لو تم بھی اپنی زباں سے
کہ پورا ہو جو مدعا ہے کسی کا

قبضہ کرتا ہے ہر ایک حور شمائل اپنا
آج ہم وقف کئے دیتے ہیں لو دل اپنا

اوپری دِل سے بپا گریہ وزاری رکھنا
آخری وقت ذرا شرم ہماری رکھنا

آئیں تھم تھم کے مرے دل کو جراحت کے مزے
تیغ بے آب ذرا کُند کٹاری رکھنا

عاشقی سے ملے گا اے زاہد
بندگی سے خدا نہیں ملتا

نہ بدلے آدمی جنت سے بھی بیت الحزن اپنا
کہ اپنا گھر ہے اپنا اور ہے اپنا وطن اپنا

اسپر بھی تو نہیں ہے غم عشق میں کمی
کھاتا ہے ایک جہاں تمھارا دیا ہوا

بیخود رہے وصال میں بیہوش ہجر میں
کیا جانے ہم سے کب وہ ملا کب جُدا ہوا

کس کس طرح سے ہمکو جلاتے ہیں رات دن
وہ جانتے ہیں داغ ہے ہم پر مٹا ہوا

اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا
کنکھیوں سے مجکو مگر دیکھ لینا

جسدن وہ مرے قتل کے سامان میں ہوگا
وہ دن بھی کبھی گردشِ دوران میں ہوگا

بزم دشمن میں نہ کِھلنا گُل تر کی صورت
جاؤ بجلی کی طرح آؤ نظر کی صورت

بزم میں دیکھا ہے کس حسرت سے ہیں نے سوئے دوست
مجکو دشمن سے گلے مل کر جو آئی بوئے دوست

آپ اپنے کو تو چشم شوق پہلے دیکھ لے
کیا ہنسی ہی کھیل ہی یوں دیکھ لیا روئے دوست

اے وعدہ فراموش رہی تجھکو جفا یاد
یہ بھول بھی کیا بھول ہے یہ یاد بھی کیا یاد

اُستاد نے اچھا سبق عشق پڑھایا
جب اس کو بھلاتا ہوں یہ ہوتا ہی سوا یاد

حسرت آتی ہے دلِ ناکام پر
اس کو دے ڈالوں خدا کے نام پر

آئے کوئی تو بیٹھ بھی جائے ذرا سی دیر
مشتاق دید لطف اُٹھائے ذرا سی دیر

ہوتی ہیں اتنی بات کی برسوں شکایتیں
کوئی اگر کسی کو ستائے ذرا سی دیر

سب خاک ہی میں مجکو ملانے کو آئے تھے
ٹھیرے رہے نہ اپنے پرائے ذرا سی دیر

تم نے تمام عمر جلایا ہے داغ کو
کیا لطف ہو جو وہ بھی جلائے ذرا سی دیر

دِلّی سے چلو داغ کرو سیر دکن کی
گوہر کی ہوئی قدر سمندر سے نکل کر

تمکو تو آرزو کی خلش بھی نہیں ہوئی
کیا جانو کیا گذرتی ہے اُمیدوار پر

جانچ لو ہاتھ میں پہلے دِلِ شیدا لیکر
نہیں پھرنے کا مری جان یہ سودا لیکر

ناز ہوتا ہے اُنھیں مال پرایا لیکر
دُون کی لیتے ہیں میرا دل شیدا لیکر

دِل کا سودا جو کرے تجسے وہ سودائی ہو
دام دینے ہی نہیں مال پرایا لیکر

رکھدیا ہاتھ میرے مونہ پہ بُت کافر نے
صبح اُٹھنے نہ دیا نام خدا کا لیکر

اپنی آنکھوں سے تو دیکھی نہیں لگی چوری
کیوں گنہگار رہوں میں نام کسی کا لیکر

مزے لوں درد کے میں تھوڑے تھوڑے ظلم سہ سہ کر
ستم کیجئے تو تھم تھم کر جفا کیجئے تو رہ رہ کر

حضرتِ زاہد ہماری چھیڑ کی عادت نہیں
گدگدی ہوتی ہے دِل میں پارسا کو دیکھکر

ہم مٹے جس پر تیری بیساختہ وہ بات تھی
تو بھی عاشق ہو ہی جاتا اُس ادا کو دیکھکر

یہ حوروں پہ مرتا ہے سب دیکھے بھالے
نہیں کوئی عاشق مسلماں سے بڑھکر

اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہاں کی سیر
دِل خوش نہ ہو تو کس کا تماشا کہاں کی سیر

دیکھ کر فیاض کو کہتی ہے کیا طبع بخیل
موت بھی قارون کی ہوتا اگر حاتم کے پاس

دل ہے مرا ہر ایک رفیق کہن کے پاس
جتنا وطن سے دور ہوں اُتنا وطن کے پاس

کامل ہو عشقِ پاک تو پرویز سا رقیب
شیریں کو لائے شوق سے خود کوہکن کے پاس

اے بیکسی رہیگی نہ بے پردہ اپنی لاش
میت خود اُٹھ کے جائیگی گور و کفن کے پاس

غربت سے ہم پھریں تو کہیں پھر پلٹ نہ جائیں
احباب کچھ نشان بنا دیں وطن کے پاس

محبت میں تکرار کا ہے مزہ
گلے ہوں جو باہم دگر دیر تک

صبر کر اے دلِ مضطر وہ نہیں ملنے کے
کل سے آج اُنکی ہوئی ہوگی یونہی آج سے کل

آپ جن کو ہدف تیر نظر کرتے ہیں
رات دن ہائے جگر ہائے جگر کرتے ہیں

تھک گئے نامۂ اعمال کو لکھتے لکھتے
کیا فرشتوں کا بُرا حال بشر کرتے ہیں

ہو چکا قطع تعلق تو جفائیں کیوں ہوں
جن کو مطلب نہیں رہتا وہ ستاتے بھی نہیں

خوب خوش باش گذر اہل صفا کرتے ہیں
نہ خفا ہوتے ہیں ایسے نہ خفا کرتے ہیں

اُڑائی خاک تیری جستجو میں ہر کہیں برسوں
پھری بگڑی آسماں بنکر مرے سر پر زمیں برسوں

نہیں تھا تو بھی تھا وہ بیوفا آغوش دشمن میں
کہ میری بدگمانی نے اُسے رکھا وہیں برسوں

آپ کا حال جو غیروں سے کہا ہی مجھ سے
ہیں مرے کان گنہ گار کہوں یا نہ کہوں

ہوش جب آیا تو یہ جانو قیامت آگئی
زندگی میری جبھی تک ہو کہ میں غفلت میں ہوں

دیکھیں تو کیسے فتنے ہیں نیچی نگاہ میں
آئینہ رکھ دے کاش کوئی اُنکی راہ میں

اُمیدوار رحمت باری ہوں اس قدر
ہوتا ہوں میں شریک پرائے گناہ میں

محشر میں کس طرف سے یہ آنے لگی صدا
آنا ہو آئے جسکو ہماری پناہ میں

نظر آتا ہوں نہ اُس بزم سے اٹھ سکتا ہوں
ناتوانی سے بڑے کام لئے جاتے ہیں

مول جنت کا ہوا نقدِ عبادت زاہد
ہے کہیں مال کہیں دام لئے جاتے ہیں

اپنے بسمل کا سر ہے زانو پر
کس محبت سے جان لیتے ہیں

کرچکے سب اپنی اپنی حکمتیں
دم نکلتا ہو تو ہمدم کیا کریں

معرکہ ہے آج حسن و عشق کا
دیکھئے وہ کیا کریں ہم کیا کریں

حیدرآباد اور لشکر یاد ہے
اب کے دلّی میں محرم کیا کریں

ہماری طرف اب وہ کم دیکھتے ہیں
وہ نظریں نہیں جن کو ہم دیکھتے ہیں

غنیمت ہے چشمِ تغافل بھی اُن کی
بہت دیکھتے ہیں جو کم دیکھتے ہیں

بُرا نہ جان حسینوں کو مان اے واعظ
خدا گواہ یہ بندے خدا کے پیارے ہیں

وفا کرو کہ جفا اختیار ہے تم کو
بُرے ہیں یا ہیں بھلے جیسے ہیں تمھارے ہیں

زمیں پہ رشکِ مہ و مہر ہیں حسیں لاکھوں
فلک پہ وہ ہی تو چمکے ہوئے ستارے ہیں

زمانہ کیا ستائے گا فلک آزار کیا دے گا
مصیبت اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی کہ بیدل ہوں

کہاں کی داد خواہی حشر میں جب کہا اُسنے
ترا جی چاہتا ہے میں گنہ گاروں میں داخل ہوں

جتنی باتیں کام کی تھیں کر گئے سب اہلِ عشق
تو گرفتارِ محبت میں کروں تو کیا کروں

التجائیں جسقدر تھیں سب اس بت کافر سے کیں
اب خدا سے عرضِ حاجت میں کروں تو کیا کروں

ہوش ہی جاتے رہیں تو آدمی کیا کر سکے
دیکھ لوں جب اچھی صورت میں کروں تو کیا کروں

دل سے وہ کافر صنم نکلے تو سب کچھ ہو قبول
جا کے مسجد میں عبادت میں کروں تو کیا کروں

تسلّی مرے دل کو کیا دے رہے ہیں
مرے دلمیں وہ چٹکیاں لے رہے ہیں

عجب خوبیاں خوبرویوں میں دیکھیں
بُرائی میں بھی سب سے اچھے رہے ہیں

جدھر سے وہ گذرے قیامت بپا تھی
کہ نقشِ قدم تک تڑپتے رہے ہیں

خط میں لکھے ہوئے رنجش کے کلام آتے ہیں
کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں

تابِ نظارہ کہاں دیکھے جو ان کے جلوے
بجلیاں کوندتی ہیں جب لبِ بام آتے ہیں

نہ کسی شخص کی عزّت نہ کسی کی توقیر
عاشق آتے ہیں تمھارے کہ غلام آتے ہیں

بتوں سے اب معافی چاہتا ہوں
خدا سے کچھ کہا تھا بے خودی میں

وہ لے کر کیا کریں عشاق کا دل
دم نہیں دل نہیں دماغ نہیں

کسی میں داغ ہے کانٹا کسی میں
کوئی دیکھے تو اب وہ داغ نہیں

دم شماری دل مجبور بری ہوتی ہے
جان کی خیر اسی میں ہے کہ تو گن ہی نہیں

یہ تو نہیں کہ تمسا جہاں میں حسیں نہیں
اس دلکو کیا کروں یہ بہلتا کہیں نہیں

کیا ہے بوسہ کا وعدہ مگر ہے وہ احسان
کوئی یہ جانے کہ دونوں جہان دیتے ہیں

وہ رنج بندے کو اپنے خدا نہیں دیتا
جو مجکو ایک مرے مہربان دیتے ہیں

واعظ بڑا مزا ہو اگر یوں عذاب ہو
دوزخ میں پاؤں ہاتھ میں جام شراب ہو

یارب شمار جرم سے بس منفعل نکر
تنخواہ تو نہیں ہے کہ جس کا حساب ہو

دربردہ تم جلاؤ جلاؤں نہیں چہ خوش
میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو

زاہد کو بڑا ناز ہے میکش کو بڑا عجز
اللہ کو مقبول مگر دیکھئے کیا ہو

یارب بنا دے تو اسی صورت کا اور کچھ
اس آسماں سے تنگ ہیں یہ آسماں نہو

واعظ بجا ہے کہئے جو ویرانہ کو بہشت
جنت اسیکا نام ہے آدم جہاں نہو

آج مجھ سے حضرت ناصح یہ چلکر کہہ گئے
آسماں سے اب فرشتے آئینگے تعلیم کو

اپنے دل کا حال ہے دم بھر میں کچھ دم بھر میں کچھ
آگ لگ جائے الٰہی اس امید و بیم کو

انھیں یہ جستجو ہے مرنے والا کوئی پیدا ہو
مگر بہتر سے بہتر ہو مگر اچھے سے اچھا ہو

تری زلفیں بھی ہیں صیاد آنکھیں بھی شکاری ہیں
تماشا دیکھنے کا ہے جو میرے دل پہ جھگڑا ہو

کیوں کرتے ہو دنیا کی ہر اک بات سے توبہ
منظور تو ہے میری ملاقات سے توبہ

دنیا میں کوئی بات ہی اچھی نہیں زاہد
اس بات سے توبہ کبھی اس بات سے توبہ

اہل دول نہ دیکھیں مجھے چشم کم سے داغ
دولت لگی پڑی ہے مرے دم قدم کیساتھ

ظاہر میں اختلاط کی باتیں ہوا کریں
دل میں اگر نہیں ہے محبت نہیں سہی

غم جگہ دل میں پا ہی جاتا ہے
آدمی کو یہ کھا ہی جاتا ہے

گر مرض ہو دوا کرے کوئی
مرنے والے کا کیا کرے کوئی

جب پڑا ہے وقت کوئی ہوگئے ہیں سب الگ
دوست بھی اپنا نہیں بیگانہ تو بیگانہ ہے

بُرائی بچا ہی بُروں سے نباہ ہے
اگر ہے تو دنیا میں مشکل یہی ہے

تو بھی اے ناصح کسی پر جان دے
ہاتھ لا اوستاد کیوں کیسی کہی

کس طرح کہوں قفس تیرے دلکو لگی ہے
نالوں نے کبھی آگ بھی محمل کو لگی ہے

کس نے یوں پیار کیا کس نے وفا ایسی کی
کیوں کریں قتل کسیکو وہ ہمارے ہوتے

تارے گن گن کے گذاری شب دیجور فراق
کیا مصیبت تھی جو گنتی کے ستارے ہوتے

زلفیں بکھری ہوئیں تمنے جو سنواریں تو کیا
کام بگڑے ہوئے عاشق کے سنوارے ہوتے

ہر دم اُسیکی دُھن ہے اوسیکا خیال ہے
چھوٹے چھٹائے ربط پہ اب تک یہ حال ہے

دل لے ہی چلے ناز سے شوخی سے ہنسی سے
اب اُنکی بلا آنکھ ملانی ہے کسی سے

کہتا ہے کہ مر جاؤ تو کچھ ہم کو یقیں ہو
بیدرد کی اس شرطِ وفا کو کوئی دیکھے

کرتا ہے امام آج بہت سہو کے سجدہ
پوشیدہ جماعت میں وہ کافر تو نہیں ہے

نظر کعبہ میں اس بُت پر پڑی ہے
کہاں جاکر مری قسمت لڑی ہے

ناوک لگا جگر پہ تو دل پر سناں لگی
کاری لگی نظر تری کافر جہاں لگی

تو اگر سُن لے تو کیا جانے کرے کیسا غرور
دیکھکر سمجھا ہے جو تیرا تماشائی تجھے

جلوہ بے پردہ تو ہوتا ہے فقط ہوش ربا
وہ قیامت ہے جو چلمن کی جھلک ہوتی ہے

جسنے سونگھی ہو وہ خوشبو کوئی اُس سے پوچھے
باسی ہارونکے جو پھولوں میں مہک ہوتی ہے

پی کر نہ توبہ کی ہو تو واعظ زباں چلے
یہ اعتراض کیوں ہے کہ مے خوار کیوں ہوئے

وہ دل پہ چھری پھیر گئے ناز و ادا سے
اب کوئی مرے کوئی جئے اُنکی بلا سے

ہم تیرے سوا اور ہوں کس چیز کے طالب
کیا چھوڑ دیا مانگنے والوں نے خدا سے

ہر بندہ خدا پر کب تک ستم رہے گا
جو تیرے دلمیں کافر کب تک ٹھنی رہیگی

ہزار ہیں رنگ عاشقی کے جو انکو بھاتے وہ اُن کو جانے
عداوت انکو ہو آج جس سے اُسی پہ کل مہربانیاں ہیں

تمھیں کو ہم ہو فا کہیں گے تمھیں سے ہم التجا کرینگے
جو دشمنی کر سکیں نہ پوری وہ دوستی ہم سے کیا کرینگے

عکس بھی آئینہ میں چار گھڑی بعد آیا
بڑھ گئی حد سے سوا انکی نزاکت کیسی

جور معشوق کی پرسش ہی نہیں دنیا میں
اپنے بندہ سے خدا کو ہے محبت کیسی

لے ہی تو لینگے گنہگاروں کے ہوتے زاہد
یہ تو دوزخ کے بھی قابل نہیں جنت کیسی

چھیڑ ہر وقت کی اچھی نہیں یہ یاد رہے
کبھی کیسی ہے کبھی اپنی طبیعت کیسی

کہتے ہیں وہ ہماری اطاعت کریگا کیا
جس بندۂ خدا سے نہ طاعت ادا ہوئی

حوصلہ چاہیے انساں کو پائے جو عروج
پست ہمت کو بلندی بھی جو ہو پستی ہی

داغ دشمن سے بھی جھک کر ملیئے
کچھ عجب چیز ملنساری ہے

جو پوچھا کبھی شغلِ تنہائی اُن سے
کہا گنتے ہیں ہم خطائیں تمھاری

نگہ نکلی نہ دل کی چور زلفِ عنبریں نکلی
اِدھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

اُٹھی دستِ دعا کیا ضعف نے ایسا گھلایا ہے
جسے ہیں ہاتھ سمجھا تھا وہ خالی آستیں نکلی

چین سے آپ رہیں کچھ مری پروا نہ کریں
کیا شبِ ہجر بلا ہے کہ مجھے کھالے گی

دِل نہیں مال تو اِس کا تمھیں لالچ کیسا
تم نہیں چور تو دُزدیدہ نگاہی کیسی

اِس سے بڑھ کر تو گنہگار نہ دیکھا نہ سُنا
جب کیا عشق تو ناکردہ گناہی کیسی

بنایا ان حسینوں کو تباہی کے لیئے ورنہ
ترقی سی ترقی عالمِ اسباب کو ہوتی

مَیں بُرا ہوں تو بُرا جان کے ملئے مجھسے
عیب کو عیب سمجھئے تو کہاں رہتا ہے

لامکاں تک کی خبر حضرتِ واعظ نے کہی
یہ تو فرمائیں کہ اللہ کہاں رہتا ہے

انہیں قدموں نے تمھارے انہیں قدموں کی قسم
خاک میں اتنے ملائے ہیں کہ جی جانتا ہے

داغِ وارفتہ کو ہم آج ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

ایک جہان نے آتے ہی یہ گھر لوٹ لیا
وہ جو دِل میں ہے تو باقی نہیں ارماں کوئی

کہتے ہیں وہ جلائیں گے ہم تجھکو حشر تک
دشمن کی قبر تیرے برابر بنائیں گے

وہ کم سنی میں کھیل بھی کھیلیں گے تو یہی
مٹی کی تیغ و ناوک و خنجر بنائیں گے

اپنی بھی شامت آگئی توبہ کے ساتھ ہی
عہدِ شباب کے جو کہیں آشنا ملے

اللہ دے تو فقر کی دولت ہے سلطنت
جتنے فقیر مجھکو ملے بادشا ملے

بچھڑے ہوئے معشوق ملیں سبکو الٰہی
تنہا کوئی جنت میں نہ جائے میرے آگے

اک چیز ہے اس عالمِ ہستی میں بشر بھی
دنیا کا طلبگار بھی دنیا سے حذر بھی

ملے زاہد پیر کو حور توبہ
وہاں ہوں گے رعنا جوان کیسے کیسے

ترا ثانی کہاں پیدا فقط کہنے کی باتیں ہیں
اگر سارا زمانہ مان لیگا ہم نہ مانیں گے

بلا سے گر کوئی اس بات کا دل میں برا مانے
مگر معشوق ہو وعدہ کا سچا ہم نہ مانیں گے

سوال اُن کا یہ ہے دنیا میں کر لو فیصلہ ہم سے
اُٹھاؤ گے اگر عقبیٰ میں جھگڑا ہم نہ مانیں گے

بڑھے تکرار کیوں پہلے ہی اس کا فیصلہ کر لو
یہ کہنا مان لینگے ہم یہ کہنا ہم نہ مانیں گے

زور و زر سے بھی کہیں داغ حسیں ملتے ہیں
اپنے نزدیک تو ہے سب سے اطاعت اچھی

جب کہا میں نے کہ لو مرتا ہوں میں
بولے بسم اللہ اچھی بات ہے

محفل میں کس نے آپ کو دل میں چھپا لیا
اتنوں میں چور کون ہے پہچان چاہیئے

ہاں ہاں ٹھہر ٹھہر کے اُٹھا رخ سے تو نقاب
پیدا طبیعتوں میں بہت جوش ہو گئے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

مجھکو مزا ہے چھیڑ کا دل مانتا نہیں
گالی سنے بغیر ستمگر کہے بغیر

[illegible]

اُلجھے ہیں آج صبحکو منہ کس کا دیکھکر
توڑا ہے آئینہ کو وہ بیزار سب سے ہیں

جو پارسا ہیں خوف انھیں اس قدر کہاں
ڈرتے گناہگار خدا کے غضب سے ہیں

دیکھئے اُن سے ملاتا ہے خدا کون سے دن
کون سی رات ہو مقبول دعا کون سے دن

اے نجومی تجھے دعویٰ ہے تو یہ حکم لگا
کون سے وقت ملینگے وہ بتا کون سے دن

داغ سے عید کے دن بھی نہ ملے وہ آکر
یہ گیا وقت پھر آئیگا بھلا کون سے دن

رنج پر رنج دیے جاتے ہیں
اپنی کرنی وہ کیے جاتے ہیں

طور بے طور ہوئے جاتے ہیں
وہ تو کچھ اور ہوئے جاتے ہیں

یہ عنایت پہ عنایت ہے ستم
لطف بھی جور ہوئے جاتے ہیں

گھڑیوں بڑھتا ہے حسینوں کا جمال
اور سے اور ہوئے جاتے ہیں

کرے گا بیوفائی مجھ سے تو ساماں ایسے ہیں
تری جانب سے مجھکو وہم میری جان ایسے ہیں

مرے دل میں برچھی چبھو کر کہا
خبردار تو نے اگر آہ کی

یہ جرم وفا پر مجھے ارشاد ہوا ہے
بخشے جو تجھے بخشنے والے کی خطا ہے

اب داغ کے احوال سے مطلب تمھیں کیا ہے
اچھا ہے تو اچھا ہے برا ہے تو برا ہے

دنیا میں جانتا ہوں کہ جنت ملی مجھے
راحت اگر ذرا سی مصیبت میں مل گئی

اس کو ملجائے اگر چاہت کی داد
چاہنے والے کو پھر کیا چاہیے

بہت تکلیف پائی ہے بہت صدمے اٹھائے ہیں
طبیعت اب کہیں بے اختیار آئے تو کیا آئے

خاک اس سے عشق نے چھنوائی تھی
وحشت میں مجنوں کی مٹی لائی تھی

ہے یہی افسردہ دل کو لطفِ باغ
ہم نے چن لی جو کلی مرجھائی تھی

فاتحہ کو بھی لحد پر نہیں آتا ہے کوئی
جیتے جی سب سے ملاقات ہوا کرتی ہے

ہیں ادائیں سب ادائیں اس سراپا ناز کی
اک نیا انداز پیدا ہوگا جتنا دیکھئے

مجھکو راہِ عشق میں سوجھا نہ اپنا نیک و بد
رہنما کہتا ہے رستہ ہے ٹیڑھا دیکھئے

یہ بات بات میں کیا نازکی نکلتی ہے
دبی دبی ترے لب سے ہنسی نکلتی ہے

ٹھہر ٹھہر کے جلا دل کو ایک بار نہ پھونک
کہ اس میں بوئے محبت ابھی نکلتی ہے

بجائے شکوہ بھی دیتا ہوں میں دعا اس کو
مری زباں سے کروں کیا وہی نکلتی ہے

ہزار بار جو مانگا کرو تو کیا حاصل
دعا وہی ہے جو دل سے کبھی نکلتی ہے

ادا ادا سے تری کھنچ رہی ہیں تلواریں
نگہ نگہ سے چھری پر چھری نکلتی ہے

سمجھ تو لیجئے۔ کہنے تو دیجیے مطلب
بیاں سے پہلے ہی مجھ پر چھری نکلتی ہے

یہ دل کی آگ ہے یا دل کے نور کا ہے ظہور
نفس نفس میں مرے روشنی نکلتی ہے

صنمکدہ میں بھی ہے حسن اک خدائی کا
کہ جو نکلتی ہے صورت پری نکلتی ہے

غمِ فراق میں ہو داغ اسقدر بیتاب
ذرا سے رنج میں جان آپکی نکلتی ہے

بزم سے میکے اٹھانے کے لیئے
پوچھتے ہیں آپ کو کچھ کام ہے

جو چھید ڈالے دل کو تمھاری نگاہ ہے
جو پیس ڈالے دل کو تمھارا خرام ہے

مجرم بتوں کا بھی ہوں خدا کا بھی چور ہوں
دونوں میں ضد ہے ایک گنہ گار کے لیئے

ہمت کا ہارنا نہ مصیبت میں چاہیئے
تھوڑا سا حوصلہ بھی طبیعت میں چاہیئے

آجائے راہِ راست پہ کافر ترا مزاج
اک بندۂ خدا تری خدمت میں چاہیئے

حاتم کا دل ہو۔ دولت قاروں ہو۔ عمر خضر
اے داغ یہ کسی کی محبت میں چاہیئے

دل دو طرح کا تیری محبت میں چاہیئے
راحت میں ایک ایک مصیبت میں چاہیئے

کچھ لاگ کچھ لگاؤ طبیعت میں چاہیئے
دونوں طرح کا رنگ محبت میں چاہیئے

اپنا بھی کام نکلے وہ ناراض بھی نہ ہوں
ایسے مزے کی بات شکایت میں چاہیئے

نقشے ہیں یا دیدۂ دیدار طلب کے
رہ جاتی ہے پلکوں میں نگہ ضعف سے دب کے

مسجد میں تو گنتی کے مسلمان ہی دیکھے
میخانے میں جلوے نظر آتے ہیں سب کے

کیا سخت گھڑی تھی کہ مری آنکھ لڑی تھی
یہ درد یہ آزار یہ آلام ہیں جب کے

لطفِ ایذا طلبی کیا کہیئے
درد آرام ہوا جاتا ہے

دلِ بیمار میں چٹکی لے لو
ابھی آرام ہوا جاتا ہے

قطعہ

اب تم سے کہوں جو کچھ ہے دلمیں میرے
سب تم سے کہوں جو کچھ ہے دلمیں میرے

پہلے یہ کہو کہ میں نہ مانوں گا بُرا
جب تم سے کہوں جو کچھ ہے دلمیں میرے

دانا

دانا منشی روشن لال خلف منشی رائے کا لیستھ باشندۂ لکھنو نواب عاشور علی خان بہادر کے شاگردوں میں تھے اور ۱۲۷۴ھ میں حیات تھے۔ چند شعر ملے درج کئے گئے۔

آتی نہیں جو زلفِ گرہ گیر ہاتھ میں	سودا ہوا لپیٹ لو زنجیر ہاتھ میں
دیکھے بغیر چین مجھے ایکدم نہیں	رہتی ہے رات دن تری تصویر ہاتھ میں
آہن کو مس کہ جس جو کیا بن گیا طلا	ایسی ہے میرے یار کی تاثیر ہاتھ میں

دانش

دانش منشی تصدق حسین دانش خلف مولوی لطف علی متوطنِ نواح جونپور میر مونس کے شاگرد اور ساکن ۲ ہجری اعظم گڈھ میں، سن شریف قریب ۵۰ برس کے ہے یہ اُنکے اشعار ہیں۔

صفتِ حور کہاں تک میں سنوں واعظ سے	ذکر کرتا ہے صُراحی کا نہ پیمانوں کا
اے شہِ حُسن ہوا عصر کا قاروں میں بھی	دِل سے نکلا نہ خزانہ مرے ارمانوں کا
وہ میری ملاقات کو آئے مرے گھر آج	مدّت میں دعاؤں نے دکھایا ہے اثر آج
درپیش ہے بتخانہ و کعبہ کا دورا ہہ	اب وحشتِ دِل دیکھئے لیجائے کدھر آج
اُداسی چھا رہی ہے شمع بالیں کو ترستی ہے	مزارِ کشتۂ اُلفت پہ اک حسرت برستی ہے
تم اتبک واعظو! پتھر کے بوسے جا کے لیتے ہو	مقرر خانۂ کعبہ سے پیدا بُت پرستی ہے
غرض کیا خضر سے رہبر جنوں ہے وحشتِ قسمت	کُھلیں ہیں صاف یہ راہیں بلندی ہے نہ پستی ہے
آکر مریضِ عشق کا لاشہ اُٹھایئے	مردے کو اپنے آپ مسیحا اُٹھایئے

دانش

دانش حکیم احمد حسین خان دانش لکھنوی شاگرد احسان شاہجہاں پوری۔ کلام معمولی درجہ کا ہے۔ انتخاب کلام یہ ہے۔ باوجود کوشش حالات نہیں ملے۔

کہوں میں اُس سے دل کا مدعا کیا؟	جو جھلا کر کہے تو نے کہا کیا؟
رہی محمل نشیں بجا سے لیلے	رہ گیا پردہ قیس کے دِل کا
تیر چھوڑا مرے سینے کی طرف آخر کار	لو پسند آ ہی گیا اُنکو نشانہ دِل کا
الم میں، درد میں، آہ و بُکا میں	پڑا ہے ایک دِل کس کس بلا میں

خنجر یار کے گلے مل کے	ہم نکالیں گے حوصلے دل کے
گو رسائی نہیں وہاں اپنی	رُوح پھرتی ہے گردِ محفل کے
جوبن کا اشارہ ہے ڈوپٹہ سے کسی کے	کس طرح چھپاؤ گے اگر ہم ابھر آئے

دانش

دانش - قاضی محمد بشیر الدین خلف اصغر قاضی محمد رمضان علی، وطنِ قدیم سکندرآباد ضلع بلند شہر ہے - آجکل اجمیر میں جاگیر حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کامدار ہیں - نوجوان شریف اور تیز طبع ہیں، قاضی نجم الدین برق شاگرد رشید مومن خان انکے حقیقی تایا تھے - قاضی صاحب کا ہنوز عنفوان شباب ہے اور فن سخن کی ابتدا ہے - آختر سہارنپوری سے تلمذ اختیار کیا ہے - کلام ملاحظہ ہو -

وہ دل چُرا کے نظر بھی چرائے بیٹھے ہیں	پرائے مال کو کیسے چھپائے بیٹھے ہیں
تماشا ہو ترے در پر ترے جانباز یوں آئیں	کسی کے ہاتھ میں دل ہو کسی کے ہاتھ میں سر ہو
وہاں پہلے ہی وہ اپنے نگہباں آپ بن بیٹھے	بھلا پھر ہم غریبوں کی رسائی ہو تو کیونکر ہو
نہ خود آؤ نہ تم تصویر ہی اپنی یہاں بھیجو	تمہارے دیکھنے والوں کو پھر تسکین کیونکر ہو
اللہ رے درازی اُس زلف دلربا کی	بڑھ بڑھ کے آج باتیں کرتی ہے آسمان سے
کچھ لب ہی جانتے ہیں کچھ دل ہی جانتا ہے	بوسوں کی لذتوں کو پوچھو مری زباں سے
اب دل پہ آبنی ہے اب جاں پہ آبنی ہے	اِس آپکے ستم سے اِس جورِ آسماں سے

دانش

دانش - حافظ محمد بشارۃ الحق صاحب دانش، مولوی نور الحسن نازش کے بیٹے اور حکیم سیّد اولاد علی صاحب کاہش مرحوم کے پوتے تھے - آپکے بزرگوں کا وطن جونپور ہے - صاحب گنج میں ایک مسجد کے امام تھے اور اُسی مسجد میں اپنے اہتمام سے ایک مدرسہ تعلیم دینیات کا قائم کر رکھا تھا جس میں خود درس دیتے تھے - چند ہی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں - فن شاعری میں سیّد شاہ محمد اکبر صاحب ابوالعلائی داناپوری سے استفادہ کرتے تھے - عین عنفوان شباب میں ۱۳۲۹ھ ہجری میں وفات پائی مختصر

کلام درج ذیل ہے۔

یہ دل محفوظ تھا سینے میں میرے کس حفاظت سے
چرایا تیری آنکھوں نے اسے کیسی شرارت سے

جو یاد آتے ہیں صدمہ ہجر کے دل کانپ جاتا ہے
شب غم ہنسنے رو رو کر سحر کی ہے کس آفت سے

قدم اٹھنے نہیں دیتی گناہوں کی گرانباری
نظر اونچی نہیں ہوتی ہے اے دانش ندامت سے

ساقی سے کہو دور میں ساغر آئے
ہاں دختر رز خوب نکھر کر آئے
لائی ہے انھیں بھی مے انگور کی تاک
واعظ بھی یہاں آنکھ بچا کر آئے

دانش

دانش حکیم میرزا فدا احمد صاحب خلف حکیم مرزا غلام عباس آپکی ولادت ۱۲۷۲ھ؁ میں بمقام لکھنو ہوئی آپکے والد نے آپکو صغرسنی کیحالت میں یعنی صرف نو برس کی عمر میں چھوڑ کر قضا کی اُنکے سوم کے روز جناب مرزا بہادر ناظم صاحب نے انکو تعلیم و تربیت کیلئے مرزا محمد جعفر کے سپرد کیا اُنکے داماد حکیم میر علی ضامن شوق خلف رشک مرحوم کے فیض صحبت سے انھیں شاعری کا چسکا پڑ گیا اور شروع میں انھیں سے اصلاح کا سلسلہ رہا، اس عرصہ میں دیگر علماء سے استعداد علمی کی تکمیل کی۔ اور پھر کامل تیس سال تک طلباء کو درس دیتے رہے، تاریخ گوئی کی بھی مشق ہے جب خاصہ ملکہ ہوگیا تو جلال مرحوم سے اصلاح لینے لگے بیس پچیس شاگرد بھی ہیں۔ تلاش الفاظ اور بندش کا سلیقہ قابل داد ہے۔ اور مضمون پیدا کرنے کا خیال رکھتے ہیں اب مشق سخن کو ۳۰ برس کا زمانہ ہوگیا کمیٹی رسالہ معیار کے ممبر اور صاحب استعداد کہنے والوں میں ہیں۔

بجز اُس قاتل بیرحم کے دیکھے گا کیا کوئی
تڑپنا قلبِ مضطر کا پھڑکنا مرغِ بسمل کا

ہماری آہِ عالم سوز پر وہ خوب ہنستے ہیں
ابھی بھولا نہیں تنکا ہمیں بجلی سے جل جانا

سمجھا تھا ہجر یار میں کس کو چشم تر
دل بیقرار تھا تو جگر نا صبور تھا

پابند حکم ضبط تھے بگڑے نہ اشک و درد
آنکھوں کی کچھ خطا تھی نہ دل کا قصور تھا

جگر سے قدرداں کے بعد لطفِ شاعری کیسا
غزل لکھنے کو اے دانش نہیں اٹھتا قلم میرا

بجز اُس قاتل بیرحم کے دیکھے گا کیا کوئی
تڑپنا قلبِ مضطر کا پھڑکنا مرغِ بسمل کا

سکھاتی ہے تمنائے شہادت میرے قاتل کو
جفا سے قتل تم کرنا وفا پوچھے تو مکر جانا

تا قیامت رہے یہ داغ محبت دل میں
گھر کی زینت ہے جدا روشنئ خانہ جدا

اسکو کیوں بیہوش کرتی ہے ہوائے کوئے دوست
بس گئی جسکے مشامِ جان و دل میں بوئے دوست

جس جگہ ہے قبر مجھ سے عاشقِ ناشاد کی
آسماں کی جان ہے اتنی زمینِ کوئے دوست

آسماں کی ہر شکایت میں گلہ ہے یار کا
سمتِ دشمن آنکھ ہے روئے سخن ہے سوئے دوست

کچھ تجھی پر نہیں موقوف سبھی دیتے ہیں رنج
درد بھی مجھکو ستاتا ہے تری خو ہوکر

اے گھٹا جلدی برس کس کا تجھے ہے انتظار
شور ہو پھر میکشوں کا خانۂ خمار میں

دل لیئے در پر کھڑے ہیں دیکھیے عاشق حضور
پیشکش ہو جائے انکی نذر بھی سرکار میں

خوش نصیب اسمیں ہے معلوم نہیں کون سا دل
جسکو وہ شاد کریں یا جسے ناشاد کریں

دیکھکر ہر حال میں مجنوں کو، لیلیٰ نے کہا
کونسی اس مرے دیوانے میں ہشیاری نہیں

جل چکا پروانہ جب اے شمع پھر روئی تو کیا
قابلِ تسکین عاشق تیری غمخواری نہیں

پھول ہیں شکلوں سے پھولونکا سبد قبریں نہیں
موت سا گلچیں گلزارِ جہاں کوئی نہیں

حکایت دردِ دل کی دردِ دل ہے
ارے ظالم ہیں در گزرا بیاں سے

ابتدائے شب ابھی تو ہے فراقِ یار کی
رات یہ جتنی بڑھے گی داغ جلتے جائینگے

کیا کیا ہمنے یہاں آئے تھے ہم کسواسطے
جائینگے دنیا سے جبدم ہاتھ ملتے جائینگے

جو شبِ وصل ان آنکھوں نے سماں دیکھا ہے
تمنے موسیٰ وہ سرِ طور کہاں دیکھا ہے

دل کو دنیا سے اٹھائے ہوئے میں بیٹھا ہوں
نہیں معلوم وہ کس وقت مجھے یاد کرے

ضبط میں اسکے بھی تاثیر کوئی ہے کہ نہیں
جو زمانے کے ستم سہکے نہ فریاد کرے

ہے کسی کے لئے مخصوص زمانے کی خوشی
دل کو جو دیکھ کے آئینۂ غم شاد کرے

چھینٹا ہوں میں در کعبہ و بتخانہ پر
کوئی بت راہِ خدا میں مجھے آزاد کرے

ہزاروں حال بدلے سیکڑوں پہلوئے غم نکلے
مریضانِ محبت کے بڑی مشکل سے دم نکلے

کلیجا کچھ ہوا ٹھنڈا اُسوقت میرے قاتل کا	لہو میں دل کے جب ڈوبے ہوئے تیر ستم نکلے
ڈبو دیگا زمانے بھر کو وہ طوفان آئے گا	جو دو آنسو بھی تیرے اے غریق بحر غم نکلے

داؤد

داؤد - ندیم الدولہ خلیفۃ الملک حافظ محمد داؤد خاں بہادر داؤد مستقیم جنگ دہلوی معروف بہ "حافظ داؤد" بہادر شاہ ثانی نے انکے والد حافظ محمد خلیل سے قرآن شریف پڑھا تھا۔ خود حافظ صاحب نہایت عالی حوصلہ سخی اور باہمت رئیس تھے۔ درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی میں ایک وسیع باؤلی ۱۲۶۳ھ میں بنوائی جس میں قریب پچیس تیس ہزار روپیہ کے لاگت آئی ہوگی، بازار چاوڑی میں ایک وسیع مکان معروف بہ "حافظ داؤد کا کمرہ" ابتک اُنکی یاد دلاتا ہے۔ اب بیگم صاحبہ وجانہ کی ملکیت ہے، یہ خود ابتدائے تخت نشینی ابوظفر سے غدر تک داروغگی نذر و نیاز اور علاقہ خانسامانی شاہی سے مشرف رہے۔ دو چار غزلیں حافظ قطب الدین مشیر اپنے عزیز کے مشورہ سے کہیں تھیں ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا۔ طبیعت موزوں تھی مگر شعر کم کہتے تھے یہ چند شعر اُنکے نتائج افکار سے درج ہیں *

نگہ سے ناز سے غمزے سے اور ادا سے بھڑکے	بزورِ عشق نہ ہم کونسی بلا سے بھڑکے
گو بظاہر نہ منہ دکھاؤ گے	کیا کبھی خواب میں نہ آؤ گے
مرچکا داؤد کب کا اُسکے غم میں ہمنشین	دم چرانے کا ابھی تک اُس صنم کو دھیان ہے

داؤد

داؤد - مولوی محمد داؤد ابن مولوی علی محمد صاحب وکیل عباسی متوطن امروہہ بتاریخ ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۸۳ ہجری بمقام امروہہ پیدا ہوئے اور بتاریخ ۱۷ جون ۱۹۰۸ء بمقام فتح آباد انتقال کیا اور اُسی قصبہ میں احاطۂ عیدگاہ میں مدفون ہوئے۔ ابتدائے عمر میں عربی فارسی کی تحصیل کی۔ بارہ سال کی عمر میں محمڈن کالج علیگڈھ میں داخل ہوئے طبیعت کو درد و محبت و زندہ دلی کے عناصر کا بڑا حصہ ملا تھا۔ بارہ سال وہاں تعلیم پاکر ۲۴ برس کی عمر میں سندِ بی اے حاصل کی۔ ایام طالب علمی ہی میں شعر و سخن کا چسکا لگ گیا، اور طبیعت کی شوخی اُس رنگ کو اور بڑھا رہی۔ اکثر نظمیں دوست احباب کی تفریح

طبع کے لیئے لکھیں، بعد سند یابی کالج ہی میں معلم مقرر ہوئے، پھر صاحب پرنسپل کی سفارش
سے نائب تحصیلدار مقرر ہوگئے اور تحصیل اترولی و آگرہ و کاسگنج و مین پوری میں قائم مقام نائب
تحصیلدار رہے، اور بالآخر فتح آباد ضلع آگرہ میں جاکر مستقل عہدہ پایا، وہاں اُنھوں نے
دو برس تک نہایت قابلیت سے کام انجام دیا۔ اِنکے حُسنِ اخلاق، دیانت اور حفظ مراتب
سے سب احباب اِن سے رضا مند رہتے تھے، شعر سے شوق تھا۔ اکثر مشاعروں میں شریک
ہوا کیئے، اور طرحی غزلیں پڑھیں، قدیم اور جدید دونوں شاہراہوں کے سالک تھے۔ اشعار
سے خصوصاً مرثیہ سرفراز یوسف خاں سے انکی غیر معمولی لیاقت اور معاملہ بندی اور مضمون
پسند فکر کا رنگ مترشح ہے، حق یہ ہے کہ یہ مرثیہ اپنے رنگ میں فرد ہے، مثنوی "شکوہ یار" نامی
اور ایک سچّے کی دوستی کا امتحان" اِنکی تصنیف ہیں اور یہ دونوں تصانیف اِنکی چھپ کر شایع
ہوئیں۔ مولنا حالی کے اکثر اشعار کو تضمین کیا ہے، بلا کے ذکی و ذہین تھے۔ اِنکے کلام
سے اِنکی شوخی، اور طبیعت داری، ذکاوت ٹپکتی ہے، تھوڑی سی مشق میں بہت اچھا ملکہ پیدا
کرلیا تھا، اگر زندگی وفا کرتی تو کیا عجب کہ اس فن میں بھی نام و نمود حاصل کرتے بڑی تلاش سے
کچھ کلام ملا اس کا انتخاب درج ذیل ہے:

جب پئے سیرِ چمن وہ گلِ رعنا اُٹھا	پائے بوسی کے لئے خواب سے سبزہ اُٹھا
توبہ میں غیر کے اُٹھ جانے کی تشویش فضول	اُس کا اب ذکر ہی کیا جو کوئی اُٹھا اُٹھا

جب دمِ نزع مجھے پاؤں رگڑتے دیکھا		ہاتھ ملتا ہوا بالیں سے مسیحا اُٹھا
میں نے جب وادیٔ غربت میں رکھا اپنا قدم	ق	خارِ پا بوسی کی خاطر بہ تمنا اُٹھا
پئے تسلیم درختوں نے جھکائیں شاخیں		میری تعظیم کو جنگل میں بگولا اُٹھا
آندھیاں آئیں ہوا خواہی کا دم بھرنے کو		خیر مقدم کا ہر اک سمت سے غوغا اُٹھا
پیشکش خاکِ اکسیر کی زر ذرّوں نے		کچھ نہ کچھ لیکے ہر اک ساکنِ صحرا اُٹھا
طرب و عیش کا سامان کیا تھا بھاری		کیا کہیں ابر ہی تقدیر سے ہلکا اُٹھا

نقد دل دیکے جو اندوہ والم مول لیا
خود میں حیران ہوں یہ کیا مجھے سودا اُٹھا

شوق دیدار نے فرقت میں سزا دی اچھی
سیکڑوں بار میں بے چینی سے بیٹھا اُٹھا

آج ہوگی مرے نالوں کی فلک سے مٹھ بھیڑ
اب کوئی دم میں سنوگے کہ یہ پردا اُٹھا

زندگی تلخ ہے اب ضبط کئے سے حاصل
صبر کرتے تھے رہے صبر کے جبتک قابل

ہوگیا کثرتِ اندوہ سے جینا مشکل
حال بیحال کئے دیتی ہے بیتابیِ دل

اب خموشی سے زیادہ خفقان ہوتا ہے
آخر افسانۂ غم آج بیان ہوتا ہے

اِس عشق کے طفیل لڑائی رہی سدا
تقدیر سے، رقیب سے، ناصح سے، یار سے

انصاف کی ہے بات ہیں پھر کیا گلہ کروں
جب ڈالدے وہ ہاتھ گلے میں پیار سے

کیوں ہو نہ زلفِ یار کو تارِ کمر سے ربط
دستور ہے کہ ملتے ہیں سب رشتہ دار سے

رہزن ادہر ادا ہے اُدہر زلف پُرشکن
یارب بچائیو مجھے اِس لوٹ مار سے

قربان عشق کے کہ ہم آزاد ہو گئے
قیدِ حیا سے، شرم سے، ذلت سے، عار سے

قطعہ

جانا وہ اُنکا صبح شبِ وصل ہائے ہائے
نیچی نظر کئے ہوئے اور شرمسار سے

کچھ کچھ وہ پیچ زلف سیہ کے کھلے ہوئے
وہ لال لال آنکھوں میں ڈورے خمار سے

فرطِ حیا سے گردنِ نازک میں خم ذرا
جوشِ غضب وہ سینے پہ کچھ کچھ ابھار سے

کب تھا وفورِ خواب سے کچھ تن بدن کا ہوش
بیخود سے، بیحواس سے، بے اختیار سے

برہم ہوئی وہ بزم شبِ وصل ہو چکی
بیٹھے ہیں پھر فراق میں ہم سوگوار سے

میری طرف سے آپکے دل میں ہے کیوں غبار
تقصیر ایسی کیا ہوئی اس خاکسار سے

ناصح کی گفتگو سے مرا ناک میں ہے دم
آتے ہیں دیکھئے شترِ بے مہار سے

یہ جھوٹ اور ہمسے بس اب رہنے دیجئے
ہم بھی تو رات جھانک رہے تھے دڑار سے

قطعہ

سُن کر پیا سے مرا نام یُوں کہا
وہ ہی نہ دُبلے پتلے نحیف و نزار سے

معلوم ہے مجھے بڑے اُستاد ہیں جناب
یُوں دیکھنے میں سیدھے سے پرہیزگار سے

خود مجکو تجربہ ہے بس اکبا بیاں کروں
خالق بچائے ایسے شریروں کے وار سے

بند خمسہ

طاقت تو رنج اٹھانے کی ہم میں رہی ہے کب
غم جھیلنے کا آپ ہی کچھ پڑ گیا ہے ڈھب
تاب و توان و ضبط گئے دل کے ساتھ سب
اک خو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

[illegible]

تیرے نزدیک ہیں سب ایک سے کعبہ ہو کہ دیر
تیری محفل میں بھی رہتی ہی عجب طرح کی سیر
تجھکو اپنوں سے کوئی انس نہ بیگانوں سے بیر
یار کو یار سمجھتا ہے نہ تو غیر کو غیر
تو تو اچھا ہے مگر تیرے بُرے ہیں برتاؤ

دیگر

ہو کے باہم عہد و پیماں رہ گئے
منہ سے کہتے کہتے وہ "ہاں" رہ گئے
پورے ہوتے ہوتے ارماں رہ گئے
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

مسدس

غور کر دل میں ستمگر یہ جفائیں کب تک
شکوۂ جور و ستم لب پہ نہ لائیں کب تک
ظلم کی حد بھی کوئی ظلم اٹھائیں کب تک
دل میں جو آگ لگی ہے وہ دبائیں کبتک
شرح ایں آتش جاں سوز نگفتن تا کے
سوختم سوختم ایں برق نہفتن تا کے

بند خمسہ

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں
سُن کے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے داؤد کے یہاں
پہلے یہ دیکھے وہ اُس کام کے ہے بھی شایاں
اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپکی اور آپکے گھر کی صورت

گھبراہٹ

کیا بُری شے ہے یہ گھبراہٹ بھی جس میں آدمی
آپ کچھ کہتا ہے منہ سے کچھ نکلتا ہے مگر
ایک منشی سے شتر خانے پہ جو مامور تھا
پوچھا اک انگریز نے نوکر ہو تم کس کام پر
بات تو کچھ بھی نہ تھی، لیکن نہیں معلوم کیوں
ہو گئے اسوقت وہ سُنکر پریشاں اسقدر

"میں شتر خانے کا منشی ہوں" یہ کہتے تھے وہ	کہہ گئے گھبرا کے یوں "ہوں منشی خانے کا شتر"

زمزم

ایک دن کچھ آدمی بیٹھے ہوئے	کر رہے تھے گفتگو باہم دگر
اُن میں تھا اک شخص ایسا بھی کہ جو	کر چکا تھا غیر ملکوں کا سفر
ہوتے ہیں چالاک ایسے لوگ سب	وہ مگر اوروں سے تھا چالاک تر
جھوٹ کہتا تھا مگر سچ کی طرح	اُس کی باتیں تھیں نہایت پُر اثر
ہو رہا تھا تذکرہ ہر قسم کا	کر رہے تھے بحث ہر مضمون پر
باتوں باتوں میں کہا سیّاح نے	میں عرب میں بھی رہا ہوں سال بھر
سُن کے یہ بات اور تو سب چُپ رہے	سب نے اُسکا قول سچ سمجھا، مگر
ایک کے دل میں یہ شک پیدا ہوا	کیا تعجب جھوٹ کہتا ہو اگر
اِس سے کچھ حالات واں کے پوچھیے	سوچ کر یہ اُس نے قصہ مختصر
اُن سے پوچھا آپکا ہوتا تھا واں	خدمتِ زمزم میں بھی گاہے گذر
سُن کے اُسکے منہ سے یہ سیّاح نے	سمجھا زمزم نام ہے کوئی بشر
بولے جی ہاں اُنکی خدمت میں تو میں	روز حاضر ہوتا تھا وقتِ سحر
آج دُنیا میں نہیں اُنکا جواب	ہے تقدس ختم اُنکی ذات پر
اب تو بوڑھے ہوتے جاتے ہیں بہت	کیوں نہوں ہیں بھی تو ستر سے اُدھر
سن کے یہ سب نے لگایا قہقہہ	اور کہا تم کو نہیں یہ بھی خبر
اِک کنوئیں کا نام ہے زمزم وہاں	آپ یہ سمجھے کہ ہے کوئی بشر
جب نہ بن آئی کوئی معقول بات	تب کہا سیاح نے یوں جھینپ کر
اُس زمانے میں تو تھے وہ آدمی	ہوگئے ہونگے کنوئیں اب کیا خبر

مرثیہ سردار یوسف خان بلوچستانی طالب علم علیگڈھ کالج ۱۸۹۶ء

خشک اور ویران صحرا ہیں بلوچستان کے
اک کھلا تھا پھول نازک اور نہایت خوشنما

باغبان دہر نے دیکھا نہ ہوگا کوئی پھول
اس سے بہتر پر فضا اور دلفریب اس سے سوا

گلشن عالم میں لاکھوں گل کھلے ہونگے مگر
کم ہوا ہوگا کوئی اس سے زیادہ دلربا

لیکن اسکے واسطے موزوں نہ تھی وہ سرزمین
وہ گل تر ایسے ریگستاں کے قابل نہ تھا

نامناسب تھی وہاں کی خاک اسکے واسطے
تھا مضر پانی وہاں کا اور مخالف تھی ہوا

کرکے اُس پر غور آخر ایک ذی تدبیر نے
وہاں کے خار وخس سے اس گل کو علیحدہ کرلیا

سرزمین ہند میں اک باغ دیکھا پر بہار
مختلف اقسام کے پھولوں سے جو معمور تھا

بوئے جنسیت وہاں کی آب وگل میں دیکھکر
اس گل نوخیز کو اس باغ میں لاکر رکھا

اس چمن میں کھل رہے تھے پھول صدہا رنگ کے
جنکی بوئے خوش سے تھا سارا جہاں مہکا ہوا

مہرباں تھا باغباں وربار آور تھی زمین
موسم گل جوش پر تھا راس تھی آب وہوا

چونکہ واں سامان ایسے روح پرور تھے بہم
رات دن ہوتی گئی اس گل کی شادابی سوا

حسن وخوبی میں ترقی دمبدم ہونے لگی
تازگی بڑھتی گئی ہوتی گئی زائد جلا

حیف چرخ کینہ ور نے ظلم پر باندھی کمر
کردیا گلشن سے اسکو وقت سے پہلے جدا

رنگ وبو نے اسکے دکھلائے نہ تھے جوہر ابھی
ہونے پایا تھا نہ کامل طور سے نشو ونما

لیگئی قسمت اسے پھر کھینچکر سوئے وطن
جو کسی پہلو سے اسکے واسطے موزوں نہ تھا

پھر وہی موج بلا انگیز تھی چاروں طرف
پھر اسی طوفان آفت خیز کا تھا سامنا

لیکن اس گل کو کہاں اُن سختیوں کی تاب تھی
ایک ہی جھونکے میں آخرکار وہ مرجھا گیا

جس چمن میں وہ گل رعنا رہا تھا چندروز
آج تک اسکی جدائی کا ہے واں ماتم بپا

گل گریباں چاک ہیں اسکے غم فرقت میں سب
ڈھونڈتی پھرتی ہے ہرسو اسکی نکہت کو صبا

ہے یہ مجمل ہی بیاں کافی سمجھنے کے لیے
اسکے کہنے کی ضرورت کیا کہ وہ گل کون تھا

جسکی کل مسند نشینی کی سنی تھی خوش خبر — وائے قسمت آج ہم لکھتے ہیں اُس کا مرثیا

لُطف جینے کا اُٹھایا تھا نہ یوسف نے ابھی — اُس کا مرنا ہر طرح بیوقت و بے ہنگام تھا

جسقدر ارمان دل میں تھے وہ دل میں رہ گئے — زیست کا افسوس ہے کچھ بھی نہ حظ حاصل ہوا

رحم آیا اے فلک تجکو نہ اُس کے حال پہ — تو نے کس موتی کو خاک و خوں میں غلطاں کیا

کسکو دُنیا سے اُٹھایا اے خدا ناترس موت — دل بھر آتا ہے یہ کس سے جہاں خالی ہوا

کونسے تاریک بادل میں چھپا ہے چاند وہ — دفعتًہ آنکھوں کے آگے کیوں اندھیرا چھا گیا

اے گلِ مشکیں نفس کیوں آگئی تجھ پر خزاں — اے خزاں اُس پھول کو پامال کیوں تو نے کیا

تیرے مرنیکا زمانہ تھا نہ یوسف خاں ابھی — کھائی ہوتی کوئی دن تو اور دنیا کی ہوا

باغِ عالم میں نہ دیکھی تھی ابھی تیری بہار — ہائے کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ تو مرجھا گیا

داستاں تیری کئے دیتی ہے دلکو پاش پاش — مُنہ کو آتا ہے کلیجا واقعہ سُن کر تیرا

وہ تنِ نازک ترا زخموں سے ہوکر چُور چُور — بے کفن بے گور خاک و خوں میں ہوگا پڑا

جان دی ہوگی نہیں معلوم کس تکلیف سے — کیا اذیت ہوگی جب سینے میں دم ہوگا رکا

تیرے قاتل نے کی بچپن پہ بھی تیرے نظر — جسنے تیرا خون بہایا کون وہ بیدرد تھا

چھوڑ کر کالج چلا تھا جبکہ تو سوئے وطن — ہے ہمارے سامنے ابتک سماں اُس روز کا

وہ دمِ رخصت ترا رو رو کے جانا یاد ہے — دل سے جانیکا نہیں اُس دن کا وہ جانا ترا

کہہ رہی تھیں حسرت آلودہ نگاہیں تیری صاف — ہو رہا ہے تو ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا

اپنے واپس آنے کا آنا نہ تھا تجھکو یقین — سب تجھے سمجھا رہے تھے اور تو مایوس تھا

کچھ دلاسوں کا نہوتا تھا ترے دل پر اثر — بند ہوتا تھا نہ ہرگز آنسوؤں کا سلسلا

اب یہ ثابت ہوگیا تیرا ہی کہنا تھا درست — تھا غلط جو کوئی کہتا تھا کہ پھر تو آئے گا

غیر ممکن ہے کہ تجھکو بھول جائیں جلد ہم — مدتوں ہوتا رہے گا ذکر کالج میں ترا

جس طرح کھیلوں میں تھا حاصل یدِ طولیٰ تجھے — ایسی ہی علمی ترقی کا بھی تجھکو شوق تھا

سر بر آوردہ رہا اسکول میں تو جس طرح	کرکٹ و فٹ بال میں بھی ویسے ہی ممتاز تھا
اب نہ تو ہے اور نہ کالج میں ترا کوئی نشاں	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

دبنگ

دبنگ ۔ حافظ سراج احمد پھکڑ باشندہ مُراد آباد یہ ایک شعر اُن کا قابل اندراج ہاتھ آیا

شیخ جی کا بھی انتقال ہوا	کوئی دنیا میں مسخرا نہ رہا

دبیر

دبیر ۔ منشی محمد ابراہیم خلف منشی ذوالفقار علی، نکوڑ تحصیل رڑکی ضلع سہارنپور وطن ہے حضرت ظہیر دہلوی سے تلمذ ہے، بارہ تیرہ برس کا عرصہ ہوا حضرت ظہیر جب راقم کی استدعا پر کامل بتیس سال بعد دہلی اپنے وطن دس بارہ روز کے لیے تشریف لائے اون ایام میں انکا کلام بھی حضرت ظہیر نے تذکرہ کے لیے عنایت فرمایا تھا اور ارشاد کیا تھا کہ اگرچہ میری شاگردی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا، تاہم یہ نوجوان ذہین اور طباع اور ہوشیار معلوم ہوتا ہے، اسکے بعد کچھ کلام براہِ راست اور کچھ حضرت ظہیر نے وقتاً فوقتاً ارسال فرمایا جس کا خلاصہ درج ہے انکی عمر اب بیالیس سال کے قریب ہوگی، شعر کا سلیقہ اچھا ہے، اور مذاق شستہ اور سلیم پایا ہے، بندش چست اور تراکیب موزوں اور خوش اسلوب ہوتی ہیں، روزمرہ کی صفائی کے ساتھ نازکخیالی کا لطف بھی موجود ہے، سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں زورِ طبیعت سے اچھے اچھے مزیدار مضمون نکالتے ہیں،

بنے واماندگی سے کیوں دُعا کا تیر پتھر کا	مگر کھتا ہے دل وہ کافرِ بے پیر پتھر کا
گرا انبارِ غم کا جب بیاں کرتا ہوں حسرت سے	بنا دیتی ہے سامع کو مری تقریر پتھر کا
کیا ہے قتل مقتل میں ہزاروں بیگناہونکو	کلیجا رکھتی ہے ظالم تیری شمشیر پتھر کا
صدائے شور وغل زنداں سے اب ہرگز نہ آئیگی	ترا دیوانہ ہو بیٹھا مع زنجیر پتھر کا
خدایا بت پرست ایسا ہوں ہی جان تک دیدوں	ذرا مانگے تو منہ سے چہرۂ تصویر پتھر کا
نہ صرف آنکھیں ہی پتھرائی ہیں اے بت دیکھکر تجکو	سراپا ہو گیا ہوں صورتِ تصویر پتھر کا
اثر صحبت کا ہوتا ہے بلاشک اے بت کافر	بنا دے کیا عجب مجھکو تری تاثیر پتھر کا

اُچٹ جاتا ہے خنجر چلتے چلتے دستِ قاتل سے
نکل آئی ہیں پتھر کی لکیریں سرنوشت اپنی

داغ کھائے، رنج پائے، غم اُٹھائے، عندلیب
دُور ہو کم بخت، بختِ نارسائے عندلیب

کون سنتا ہے چمن میں نالہائے عندلیب
اُڑ گیا بادِ خزاں میں طائرِ رنگِ چمن

ہمصفیرانِ چمن کو قیدیوں کی کیا خبر
ایک تو ہے بیوفا تجھ میں نہیں بوئے وفا

یہ غزل اپنی پسندِ خاطرِ عشاق ہے
کسقدر ہے دلکش و جانکش مقامِ کوئے دوست

کس طرح رضواں سے ہو نا اہتمامِ کوئے دوست
اے فلک کیا پوچھتا ہے تو مقامِ کوئے دوست

اللہ اللہ ازدحامِ خاص و عامِ کوئے دوست
اہتمامِ خلد پر ہے ناز رضواں کو اگر

سب طرف سے دیدۂ باطن کو جب یکسو کیا
کر دیا محشر بپا اُسکے خرامِ ناز نے

ہو مبارک زاہدوں کو نزہتِ گلگشتِ خلد
تعزیر کے قابل ہیں ابھی اہلِ زمیں اور

للہ ذرا صبر کرلے جانِ حزیں اور
رہتے نہ ترے سایہ میں اے چرخِ بریں ہم

تم آئینہ خانے میں ذرا جاکے تو دیکھو

بنایا سخت جانی نے تہ شمشیر پتھر کا
الٰہی دے مجھے اب ناخنِ تدبیر پتھر کا

دل لگا کر گل سے کیا پھل پھول پائے عندلیب
گوشِ گُل تک بھی نہ پُہنچائی صدائے عندلیب

ہے عبث نقارخانے میں صدائے عندلیب
رہگیا نخلِ تہِ دامِ اسیرِ دعائے عندلیب

کون پُہنچائے چمن تک نالہائے عندلیب
دیکھ تو ہر گل ہے پابندِ رضائے عندلیب

ہے دبیر اس میں سراسر ماجرائے عندلیب
چلدیئے دنیا سے ہم سنتے ہی نامِ کوئے دوست

خلد سے بڑھکر ہے عز و احترامِ کوئے دوست
سطحِ عرشِ بریں ہے زیرِ بامِ کوئے دوست

ہو نہ ہو ہنگامۂ محشر ہے نامِ کوئے دوست
دیکھ جائے آکے حسنِ انتظامِ کوئے دوست

پھر جدھر دیکھا نظر آیا مقامِ کوئے دوست
نفسی نفسی کہہ اُٹھا ہر خاص و عامِ کوئے دوست

جھانکتے ہیں اسطرف کبکِ خرامِ کوئے دوست
پامال ہم انھیں شوق سے کر چرخِ بریں اور

باقی ہے ابھی ایک دمِ بازپسیں اور
اے کاش جو ہوتی کہیں دو ہاتھ زمیں اور

ہاں پھر بھی یہ کہنا کہ ہمارا سا نہیں اور

جس دل پہ مری جان ترا نام ہے کندہ
بہتر نہیں اُس دل کے نگینے سے نگیں اَور

واہ کیا کہنا ہے اِس گفتار اور رفتار کا
قابل تحسیں ہے نغمہ لائق انعام رقص

جی اُٹھے مردے ہزاروں شوخیٔ رفتار سے
تم باذنی سے بھی بڑھکر کر گیا ہی کام رقص

حرصِ دُنیا سچ تو یہ ہی سبکو کرتی ہی خراب
سیم و زر کیواسطے کرتے ہیں سیم اندام رقص

دیکھے ہیں جس کسی نے ترے پیرہن کے پھول
تنگ چمن ہیں اسکی نظر میں چمن کے پھول

نازک بدن ہیں اتنے کہ اللہ کی پناہ
دشوار ہو گیا اُنھیں اُٹھنا پہن کے پھول

جنت کے سبز باغ دکھاؤ نہ واعظو!
وعدے ہیں آپکے شجر مکر و فن کے پھول

یا رنگ اڑا ہے رنگ چمن تیرے خوف سے
بن بنگئے ہیں لالہ وگل بھی سمن کے پھول

کیوں بات بات میں نہ کھلیں غنچہائے دل
گویا کہ مُنہ سے جھڑتے ہیں اس گلبدن کے پھول

کس کی بہار کس کا چمن اپنے وقت پر
ہر شے نظر کے سامنے آتی ہی بنکے پھول

فیضِ بہارِ باغ کلامِ ظہیر سے
کھلتے ہیں لے دبیر نہالِ سخن سے پھول

اُسکی صورت دلمیں ہی اور دل ہی مٹھی میں مری
ہیں لیئے بیٹھا ہوں تصویر خیالی ہاتھ میں

دستِ مشاطہ میں سینہ ہے تری زلفِ دراز
ہتھکڑی پڑتی نہیں اس لاؤ بالی ہاتھ میں

نان جو بھی ہے ہتھیدستی میں نعمت اے دبیر
ایک پیسہ اشرفی ہو جائے خالی ہاتھ میں

حالِ دلِ پُر درد نہ محتاجِ بیاں ہے
سب عرض مطالب مری صورت سے عیاں ہے

ہر چند کہ تو خلق کی نظروں سے نہاں ہے
پر نور کا جلوہ ترا ہر شے میں عیاں ہے

تو کیا نہیں پہلو میں نہیں دل بھی ہمارا
بے جائے تعجب نہ مکیں ہے نہ مکاں ہے

رکھتے تھے جو نخوت سے قدم عرش بریں پر
اب اُنکا زمیں پر نہ کہیں نام و نشاں ہے

یہ لیجے نقدِ دل حاضر ہے اور موجود جاں تک ہے
گراں اِس بوسۂ لب کا بہا دیکھیں کہاں تک ہے

آنا ہے تو خدا کے لیئے جلد آ کہیں
آنکھیں لگی ہوئی ہیں یہاں فرش راہ سے

خط تیرہ بختیوں کے وہی جانتا ہی خوب
پالا پڑا جسے تری زلفِ سیاہ سے

ملتے ہیں ہم کسی سے تو ملتے ہیں لے دبیر	اُلفت سے، دوستی سے، محبت سے، چاہ سے
نہ مدفن کا نشاں باقی نہ خاک اُستخواں تک ہے	مٹایا اے فلک تو نے یہاں تک ہے یہاں تک ہے

خاکساروں سے حذر ہے خاکساری سے گریز	جستجو اس پر ہوس ہے نسخۂ اکسیر کی
ہیں ہمہ تن وقفِ تسلیم و رضا ہوں عشق میں	ملک ہے سرِ تیغ کی، جاگیر ہے دلِ تیر کی
آپ اپنے ظلم سے رسوائے عالم تم ہوئے	کیا کیا کھیل تم نے جو میری نعش کی تشہیر کی
اے دبیر اب ہند میں یکتا ہیں مولانا ظہیر	دھوم تھی اگلے زمانے میں جنابِ میر کی

دبیر

دبیر۔ امام کعبۂ بلاغت ناظمِ عطارد تحریر حضرت مرزا سلامت علی دبیر مرحوم

خمخانۂ جاوید کا اک جام ہے یہ بھی

اِن باکمال مرثیہ گو کے جدِ اعلیٰ ملّا ہاشم شیرازی نثار تھے جو ملّا علی شیرازی کے بڑے بھائی تھے، ملّا ہاشم کے بیٹے مرزا رفیع متخلص بہ رفیع۔ اُنکے فرزند مرزا غلام محمد مرحوم اُن کے بیٹے مرزا غلام حسین مغفور تھے، مرزا غلام حسین مغفور کے خلف الصدق مرزا سلامت علی دبیر مرحوم تھے، شمس الضحیٰ مطبوعۂ میر عابد علی صاحب میں وہ فرمان بھی ہیں جو شاہانِ دہلی نے مرزا صاحب کے بزرگوں کو لکھے تھے، اور جن فرمانوں سے ظاہر ہے کہ مرزا غلام محمد اور مرزا رفیع و ملا ہاشم شاہانِ دہلی کے میر منشی سلطنتِ ہندوستان تھے اور میرزا غلام حسین صاحب کے حقیقی نانا میرزا عنایت اللہ خاں ابن مرزا ابوظفر خاں ناظم صوبۂ کشمیر کے تھے اور میرزا غلام حسین صاحب کے ماموں مرزا اشہامت علی خاں شاہزادگانِ دہلی کے اتالیق اور خطِ نستعلیق لکھوانے پر مامور تھے۔

مرزا دبیر مرحوم کے والدِ ماجد (مرزا غلام حسین مرحوم) نے دہلی کے چند مرتبہ تاخت و تاراج ہوجانے کے بعد دہلی سے لکھنؤ میں آکر سکونت اختیار فرمائی اور اثاث البیت بیچ بیچکر شادی بھی لکھنؤ میں کی۔ مکانات بھی یہیں بنوائے جو اب تک محلّہ نخاس میں موجود ہیں اور آج وہ محلہ کوچۂ دبیر کہلاتا ہے، بعد شادی کے دہلی میں کسی قدر اطمینان ہوجانے پر

پھر مرزا غلام حسین مرحوم دہلی میں تشریف لے گئے، اور دہلی میں سات آٹھ برس تک متواتر رہے
انکا مکان بلّی ماروں کے محلہ میں تھا۔ وہیں مرزا دبیر مرحوم کی دو بڑی بہنیں اور اُنکے
بڑے بھائی مرزا غلام محمد، نظیر مرحوم پیدا ہوئے اور ۱۱ جمادی الاولی ۱۲۱۸ھ کو دہلی ہی
میں وہ آفتاب برج کمال طلوع ہوا جسکو آج تمام ملک "مرزا دبیر" مرحوم کہتا ہے، مرزا دبیر
مرحوم کی ذات پر دہلی کو بھی اُسی طرح فخر حاصل ہے جس طرح لکھنؤ کو، مرزا دبیر پانچ
سات برس کے تھے کہ انکے والد مرحوم پھر لکھنؤ مع اہل و عیال کے آئے اور اپنے اُنہیں
نخاس والے مکانات میں رہے، اور یہ مستغنی المزاج بزرگ مدۃ العمر خانہ نشین ہی رہے،
یہ بھی قابل ذکر امر ہے کہ مرزا دبیر صاحب کو میر انشاء اللہ خان مرحوم کی نواسی بیاہی ہوئی
تھیں، مرزا دبیر مرحوم کی ابتدائے مرثیہ گوئی سے سالے کہ نکوست از بہارش پیدا، ۱۲ برس
کی عمر میں کہ مرزا صاحب ابھی درس و تدریس میں مشغول تھے، انکو شعر گوئی کا شوق ہوا۔ مگر اکثر
مناقب بزرگان دین کہتے تھے انکے والد ماجد میر مظفر حسن ضمیر (مرحوم) کی خدمت میں ان
(مرزا صاحب) کو لیکر پہنچے۔ کلام کی فرمایش پر یہ قطعہ مرزا دبیر نے پڑھا۔ ے

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے	کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر	کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

یہ قطعہ سُن کر تمام حاضرین اور خود میر ضمیر پھڑک گئے، اور میر ضمیر مرحوم نے ارشاد فرمایا کہ
صاحبزادہ تم آیا کرو میں تم کو ضرور بتاؤں گا۔ میر ضمیر ہی نے دبیر تخلص مقرر کیا۔ ادھر مرزا
دبیر مغفور کو ایک قدرتی نیچرل شاعر پاکر دل لگا کر خوب بتایا، ادھر مرزا صاحب کا سلسلہ
درس برابر جاری تھا، یہ بات تمام لکھنؤ میں مشہور ہے کہ مرزا صاحب نے باقاعدہ تحصیل
علم فرمائی تھی اور عالم و فاضل جید تھے۔ ادھر علم کی قوت اُدھر طبیعت کی تیزی۔ ان
سب پر طرّہ لکھنؤ کے باکمالوں کی صحبتیں، رات دن کے علمی مباحثے۔ ان سب باتوں
نے مل جلکر مرزا دبیر کو چند برسوں میں ایک شاعر کامل بنا دیا۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں

ہی مرزا دبیر کا شہرہ ہوگیا، اور اب میر ضمیر صاحب نے یہ شیوہ اختیار فرمایا کہ جو کوئی اُن کا شاگرد کوئی تصنیف صلاح کے لئے اُنکو دیتا وہ اول مرزا صاحب کو دیدیتے اور فرماتے کہ بھئی سلامت علی اول تم اسکو دیکھ کر عیوب سے پاک کردو۔ جو کوئی عیب انکی نظر سے رہجاتا اُسکو میر ضمیر مرحوم خود نکال دیتے تھے، مرزا صاحب کے علم اور نیک نفسی اور خلق و انکسار اور مہمان نوازی نے اِنکو اور بھی چمکایا اور ایسی شہرت ہوئی کہ اب دبیر کا نام لوگ چار مشہور مرثیہ گویوں، ضمیر، خلیق، فصیح۔ دلگیر، کے ساتھ لینے لگے، چنانچہ اس بات کی شاہد عادل مرزا رجب علی بیگ سرور مغفور کے فسانہ عجائب کی مندرجہ ذیل عبارت ہے۔ یہ کتاب عہد غازی الدین حیدر و نصیر الدین حیدر شاہان اودھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اُس زمانہ تک کے تمام مشہور مرثیہ گو اس مختصر عبارت میں آگئے یہ سرور کا کمال قابلِ داد ہے۔

وہ عبارت یہ ہے

"مرثیہ گو بے نظیر، میاں دلگیر، صاف باطن نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مرد مسکین، مکروہات زمانہ سے کبھی چہرہ نہ دیکھا، اللہ کے کرم سے ناظم خوب، دبیر مرغوب، سکندر طالع بصورت گدا، بار احسان اہل دول کا نہ اُٹھایا، عرصۂ قلیل میں مرثیہ و سلام کا دیوان کثیر فرمایا،"

مرزا صاحب کی شہرت کا چرچا سُن کر نواب غازی الدین حیدر (اول شاہان اودھ) نے انکو یکایک بُلوا کر اپنے عزا خانہ خاص میں سُنا۔ مرزا صاحب نے رباعیوں کے بعد اور مرثیہ سے پہلے یہ مطلع فی البدیہ کہکر پڑھا۔

واجب ہے حمد و شکر جناب اِلٰہ میں مجھ سا گدا، اور انجمن بادشاہ میں		فضلِ خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اسوقت راہ میں
	ذرّے پہ چشم مہر ہے مہرِ منیر کو حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو	

تھوڑے دنوں میں مرزا صاحب کا ایسا شہرہ ہوگیا کہ بڑے بڑے رئیس اور شہزادے

اِنکے مکان پر حاضر ہوتے تھے، ادھر محلات میں کئی بیگمیں اور شہزادیاں اِنکی شاگرد ہوگئیں جن میں سے ایک نواب ملکہ زمانیہ زوجۂ نواب نصیر الدین حیدر شاہ اودھ اور دوسری سلطان عالیہ دختر نواب ملکہ زمانیہ اودھ تھیں، یہ دونوں شاہزادیاں مرزا صاحب کو ابا جان کہتی تھیں۔لوگ کہتے ہیں کہ محلاتِ شاہی کی زبان قابل سند ہے اور درحقیقت ہے مگر مرزا صاحب کی زبان کا کمال یہ ہے کہ محلاتِ شاہی میں جب کسی لفظ یا محاورہ روزمرہ کے متعلق بحث ہوتی تھی تو کلام مرزا صاحب سے سند لی جاتی تھی یا اُسکے فیصلہ کا حصر مرزا صاحب پر رکھا جاتا تھا، اِس شہرت سے جسقدر مرزا صاحب کو فائدہ پہنچا اُتنا ہی حاسدوں کا حسد بڑھتا گیا، یہاں تک کہ میر ضمیر کے بعض شاگردوں نے چاہا کہ اُستاد اور شاگرد میں ناچاقی ہوجائے، اِس اجمال کی تفصیل میر محمد رضا صاحب ظہیر لکھنوی دارشد تلامذہ مرزا دبیر مرحوم کی زبانی جو اُن تمام مجالس وغیرہ میں شریک تھے اور جنھوں نے تنقید آبحیات مرزا دبیر کے واقعات میں ۱۸۹۲ء میں لکھی ہے) یہ بیان کرتے ہیں کہ مہاراج بیدہ رام افتخار الدولہ (لکھنؤ کے ایک نومسلم فیاض رئیس) نے ۱۹ ماہ شعبان کو میر ضمیر اور مرزا دبیر سے اصرار کیا کہ اگلے اکیسویں ماہِ رمضان کی مجلس میں آپ دونوں صاحب نیا مرثیہ کہہ کر پڑھیں، دونوں صاحبوں نے وعدہ کرلیا کہ بشرطِ فرصت نیا مرثیہ کہیں گے، مرزا صاحب نے کہ انکی مشق اُس زمانہ میں مثل شباب کے زوروں پر تھی۔رات بھر میں ایک نیا مرثیہ کہا جس کا مطلع یہ ہے "ذرہ ہے آفتاب درِ بوتراب کا،" ۲۰ کو علی الصباح میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا، حضور نے کچھ فکر فرمائی۔فرمایا کہ مجھکو اتنی فرصت کہاں؟ ایک پہلے کا کہا ہوا مرثیہ ہے، اُس میں چند بند نئے کہکر لگا لئے ہیں اور مطلع بدل لیا ہے وہی پڑھ دونگا، مرزا صاحب نے اپنا مرثیہ پیش کیا، دیکھکر بہت خوش ہوئے، مرزا صاحب نے عرض کی یہ سب حضور ہی کا فیض ہے اسے آپ پڑھیں میں کچھ عذر کردوں گا اصرار کے بعد میر ضمیر نے منظور کرلیا، اور یہ قرار پایا کہ فضائل کا حصہ مرزا دبیر پڑھیں اور مصائب کا

حصہ میر ضمیر۔ مشہور ہے کہ میر عابد علی بشیر شاگرد ضمیر نے عین مجلس میں میر ضمیر کو مرزا دبیر کی
طرف سے بھڑکا دیا، مرزا صاحب نے چند رباعیاں پڑھکر وہی نیا مرثیہ شروع کیا، اہل مجلس نے
تعریفوں کے پھول نثار کیے۔ جہاں تک استاد کا حکم تھا وہیں تک پڑھکر منبر سے اترے
میر ضمیر صاحب منبر پر تشریف لیگئے اور یہ فرماکر کہ یہ مرثیہ انھیں کا ہے میرا نہیں کسی پرانے
مرثیہ کے چند بند اور نثر کے کچھ فقرے پڑھے اور منبر سے اتر آئے، بعد مجلس دو خلعت
دونوں صاحبوں کیواسطے آئے۔ میر ضمیر صاحب نے اپنی خلعت پر ٹھوکر مار کر فرمایا کہ
تم اٹھالے جاؤ، اور اٹھ کھڑے ہوئے، مرزا صاحب نے بھی یہ فرماکر کہ جو استاد کے فائدہ
پر اپنے فائدہ کو مقدم رکھے میں اسکو ملعون جانتا ہوں خلعت پھیر دیا۔

اب زمانے نے دوسرا پلٹا کھایا، میر ضمیر صاحب کے اکثر شاگرد نظم و نثر میں مرزا صاحب
پر حملے کرتے تھے انھیں میں سے کسی صاحب کا یہ مصرع آجتک مشہور ہے "بنام دبیر
فلکِ پیر مٹا دوں" ہر مہینے کی گیارہویں کو مرزا صاحب اپنا نیا مرثیہ کہکر پڑھتے تھے
چنانچہ اسی زمانے کا انکے ایک سلام کا شعر ہے۔

نیا مرثیہ نظم ہوتا ہے ہر ماہ	دبیر اسکو سمجھو مہینا ہمارا

مرزا صاحب کا کوئی شاگرد میر ضمیر صاحب کے کسی شاگرد کی بدزبانی مرزا صاحب سے
بیان کرتا تھا تو وہ اسکو جواب دیتے تھے کہ تم سخت بات کا ہمیشہ نرم اور ملائم جواب دو
اور اصل واقعہ سمجھا دو۔ حیاتِ مستعار باقی ہے تو یہ سب شورشیں اور سوزشیں مٹ جائینگی
چند سال یہی عالم رہا، اور اس درمیان میں مرزا صاحب کی شہرت کمال بڑھتی گئی یہانتک
کہ وزیر شاہ اودھ نواب علی نقی خان مرحوم کی مجلس میں مرزا صاحب نے مرثیہ پڑھا سامعین
مجلس میں تمام شاہزادے اور اکثر حکام اور معززین موجود تھے جن میں سے میر ضمیر
صاحب بھی ایک سامع تھے، اثنائے مجلس میں جب حضور عالم (وزیر ممدوح) نے باآواز
بلند تعریف فرمائی، تو مرزا صاحب نے میر ضمیر کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ یہ سب

تصدق جناب استاد کا ہے، بعد مجلس میر ضمیر صاحب نے مرزا صاحب کو اٹھکر گلے سے لگا لیا، اور وہیں سے اپنے گھر لے گئے، اگلی پچھلی باتیں وہ ہرائی گئیں، میر عابد علی بشیر کی خطا ثابت ہوئی۔ میر ضمیر صاحب نے فرمایا کہ اب یہ شخص اس لائق نہیں کہ ہمارے یہاں آئے مرزا صاحب نے دست بستہ عرض کیا کہ انکی خطا بھی میری خطا کے ساتھ معاف فرمایئے میر ضمیر صاحب نے سکوت فرمایا اور نادم ہوئے۔ اور اسکے بعد میر ضمیر صاحب کی گھر کی مجلس میں ہمیشہ مرزا صاحب پڑھتے رہے یہانتک کہ میر ضمیر صاحب کی سوم کی مجلس میں بھی مرزا صاحب نے مرثیہ پڑھا۔ میر عابد علی بشیر مرحوم بھی اپنا کلام مرزا دبیر مرحوم کو دکھلانے لگے اور مرزا صاحب کے خیر خواہ شاگرد ہوگئے تھے۔ مرزا صاحب کے مقابلہ پر جن شاعروں نے علم شہرت بلند کرنا چاہا اُن میں صرف میر انیس کو فروغ حاصل ہوا مرزا صاحب کی خوش فکری کا زمانہ سترہ برس کے سن سے ۱۲۳۵ھ میں شروع ہوا۔ اس کے کامل ۲۳ برس بعد یعنی ۱۲۵۸ھ میں جب مرزا دبیر کی چالیس برس کی عمر تھی میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ آئے، حضرت امجد علیشاہ کا زمانہ تھا، یہ میر خلیق کے فرزند رشید تھے جو عناصر اربع مرثیہ گوئی کے ایک عنصر لطیف تھے، اس وقت رزمیہ مرثیہ گو صرف مرزا ضمیر۔ میر فصیح، اور میرزا دبیر تھے، اپنے والد کی تحریک پر انھوں نے رزمیہ مرثیہ گوئی شروع کی، اور اسکے ساتھ ہی منبر پر تبانا بھی شروع کیا۔ واقعات انیس میں درج ہے کہ میر انیس خود اس امر کے معترف تھے کہ انکے لکھنؤ آنے کے وقت میرزا دبیر کا لکھنؤ میں اچھا شہرہ تھا میر انیس مرحوم میرزا دبیر کے ہم سن بھی تھے، اور لکھنؤ میں آتے ہی اُن کے فروغ کا بڑا باعث یہ ہوا کہ اکثر شرفا نواب زادے جو اُنکے والد کے شاگرد تھے اُنکے طرفدار تھے، لکھنؤ والوں کو بالمقابل کاملوں کی تعریف کرنے میں مزا بھی آتا تھا، اس لیئے دو فریق "انیسیئے" اور "دبیریئے" مشہور ہوگئے اور انکے روبرو بقیہ مرثیہ گو ماند ہوگئے ؀

مرزا صاحب کے اکثر ہمعصر علماء اور کملا نے اُنکی تعریف کی ہے، مثلاً شمس العلما مفتی

میر عباس "عشرہ کاملہ" میں انیسؔ اور دبیرؔ کی نسبت لکھتے ہیں "دونوں صاحبوں کا مذاق جدا جدا ہے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیجا سکتی میر صاحب کا کلام فصیح و شیریں ہے اور مرزا صاحب کا دقیق اور نمکین ہے ۔ ہر پھول کی خوشبو ہے جدا رنگ جدا ہے"

اسی طرح شمس العلماء مولوی سید حامد حسین نے ایک مجمع میں مرزا صاحب کی مندرجۂ ذیل ٹیپ

طے ہر قدم پر ایک مہینے کی راہ تھی	رویت ہلال نعل کی اُس پر گواہ تھی

سنکر فرمایا کہ کسی عرب و عجم نے بھی آجتک یہ مضمون اس خوبی سے نہیں باندھا، اسی طرح تدبیر الدولہ اسیر لکھنوی اور منشی امیر مینائی دونوں کا بیان تھا کہ ہم انیس اور دبیر دونوں کو استاد مانتے ہیں اور ایک کو دوسرے پر علانیہ ترجیح نہیں دے سکتے ۔ قدردانی کمال کے متعلق یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۲۹۱ھ میں مرزا دبیر نابینا ہو گئے تھے، حضرت واجد علیشاہ طاب ثراہ کلکتہ ٹیا برج میں تشریف فرما تھے کہ ایک جرمن کا ماہر آنکھیں بنانے والا ڈاکٹر ان کا ملازم ہوا، بادشاہ کے اشارے سے ایک رفیق نے مرزا صاحب کو لکھا کہ بادشاہ کی خواہش ہے کہ اگر آپ یہاں آئیں تو آپکی آنکھیں بنوا دی جائیں ۔ چنانچہ مرزا صاحب کلکتہ گئے اور نواب مونس الدولہ مصاحب شاہ جمجاہ کی کوٹھی پر مہمان ہوئے اور آنکھیں بنوائیں اور عرضداشت متضمن اطلاع شاہ جمجاہ کو بھیجی، اس کی پیشانی پر شاہ ممدوح نے یہ شعر لکھا۔

گر بر سر و چشم من بیائی	بر قلب نہم کہ کیمیائی

۲۵ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ کو پھر سلطانخانہ مبارک اور سلطین آباد کے امام باڑہ میں مرزا دبیر سے ملاقات ہوئی اور سلطان عالم نے مرزا دبیر کی تعریف اپنے مرثیہ میں فرمائی جس میں سے ایک ٹیپ مشہور ہے۔

بچپن سے لکھے وام سخن میں اسیر ہوں	میں کمسنی سے عاشق نظم دبیر ہوں

جبتک سلطنت اودھ قائم رہی باہر کے [illegible] باصرار مرزا صاحب کو بلاتے رہے مگر مرزا صاحب نے وطن کی مفارقت گوارا نکی، اور یہی جواب کہلا بھیجا کہ ہماری زبان کے سمجھنے والے دلی

اور لکھنؤ کے باہر کہاں ہیں؟ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے دو برس بعد نواب امام باندی بیگم صاحبہ کی طلب پر پٹنہ عظیم آباد تشریف لیگئے۔ اور پھر ہر سال وہاں جاتے رہے وہاں جو پہلی مجلس میں مرثیہ پڑھا اُس سے قبل مندرجۂ ذیل رُباعی بھی پڑھی جس سے اُنکے دلی خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ ؎

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے	اس دور میں جورِ آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنؤ جنت تھا	آدم ٹھہرے جو ہم جناں سے نکلے

بالآخر ۳ محرم ۱۲۹۲ھ کو لکھنؤ میں مرزا صاحب نے انتقال فرمایا، اور اپنے ہی مکان میں دفن ہوئے، آپکے صاحبزادے حضرت اوج بڑے باکمال مرثیہ گو ہیں، اُنکی خدمت میں راقم کو بمقام لکھنؤ دو بار نیاز حاصل ہوا تھا۔ ہنگام ملاقات حضرت نے بکمال توجہ جناب دبیر کے حالات بھی سنائے تھے۔ مندرجۂ بالا حالات کے لیئے راقم منشی افضل حسین ثابت کا مشکور ہے جنھوں نے ایک پورا رسالہ موسوم "خمخانۂ جاوید کا اک جام ہے یہ بھی" مرزا دبیر کے حالات میں بھیجکر خمخانۂ جاوید سے اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا۔

ہم طالعِ ہما مراد ہم رسا ہوا	طاؤس کلکِ مدح اُڑا اور ہما ہوا
مطلع ہمارا مطلعِ مہر سما ہوا	اور دو حرف کلام سراسر ہوا ہوا
مصرع ہوا کہ سرو وہ دارالسلام کا	عطرِ گلِ ارم ہوا حاصل کلام کا

دل کو پئے جمع زر پریشاں نکیا	[illegible]	سر کو گشتۂ بحرِ سامان نکیا
ہم تو ہیں ترے شکر گزار اے گردوں		احسان کیا جو ہمپہ احساں نکیا

بلبل بہ زمانہ ایک گل کا نہوا	[illegible]	محکوم امم و رسل کا نہ ہوا
بندوں کو عبث خیالِ یکتائی ہے		اللہ پر اتفاق کل کا نہ ہوا

امام زین العابدین کی بیکسی قیدخانہ کا فوٹو

عابد نے سوائے خاک بستر نہ رکھا	تپ میں سر بالینِ شفا سر نہ رکھا

زنداں میں نبض ہتھکڑی نے دیکھی		جز داغ کسی نے ہاتھ دل پر نہ رکھا
کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دُنیا سے دبیر	رباعی	باقی سامانِ عیش فانی نکلا اتنا بھی نہ اِس کنوئیں میں پانی نکلا

نیرنگیٔ دُنیا و عبرت

دُنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا برسوں رہا جن کے سر پہ چترِ زریں		کس کس کا نہ یاں ہمنے زمانہ دیکھا تربت پہ نہ اُنکی شامیانہ دیکھا
مر کر بھی نہ چین زیرِ افلاک ملا اے خانہ خراب قبر تیری خاطر	رباعی	اک تارِ کفن نہ گرد سے پاک ملا کھویا بھی جو نقدِ جاں تو کیا خاک ملا
کس عہد میں تبدیل نہیں دَور ہوا اللہ وُہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر	رباعی	گہہ عدل گیے ظلم گیے جور ہوا کیا غم جو زمین اور فلک اَور ہوا
نمرود کو خدائی کے دعوے سے کیا ملا		بندہ جُدا ہوا جو خودی سے خدا ملا
مصرع کے عوض آپ سے طوبیٰ نہیں لیتا اب پُوچھیے کیا مانگتا ہے کیا نہیں لیتا	بند	لو جنّتِ اعلیٰ بھی یہ ادبی نہیں لینا میں نام زباں سے کسی شے کا نہیں لیتا
جز نقدِ رضا کچھ مجھے منظور نہیں ہے		خادم ترا، مدّاح ہے مزدور نہیں ہے
پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل	رباعی	قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا
سمجھے ہیں نامرادیٔ دنیا کو یہ مُراد ہر عضو میں ہے دِل کی طرح سے خدا کی یاد	بند	غم انکے دِل میں شاد ہے دل انکا غم میں شاد قرآن پڑھنا ختم ہے اِن پر دمِ جہاد
بازوئے جنگ مثلِ ترازو ٹلے ہوئے		خود رحل زین پہ، گود میں قرآن کھلے ہوئے
تن لوٹتا تھا یاں تو تڑپتا تھا سر اُدھر اک بیجا اس طرف اک بے خبر اُدھر	بند	زخمی پدر ادھر تھا تو بیجاں پسر اُدھر دریا لہو کا بہتا تھا اِن میں ادھر اُدھر

اِس نہرِ خوں میں سر جو دبیرؔ اُنکے گرتے تھے		مثلِ حباب چاروں طرف بہتے پھرتے تھے
بیٹھ کر خاک پہ غلطاں ہوئے وہ دونو یتیم	بند	لپٹا یوں بھائی سے بھائی کہ ہلا عرش عظیم
تیغ چمکانے لگا بچوں کے سر پر وہ لئیم		اُٹھ سکے تعظیم سے کی دونو نے جھک کر تسلیم
خوف سے بند تھے مُنہ بات نکل جاتی تھی		استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی تھی

غزل کمیاب میرزا دبیر منقول از مجموعہ مرسلہ

دفن کرنا مجھکو کوئے یار میں	قبر بلبل کی بنے گلزار میں
اپنے یوسف کا عزیزو ہوں غلام	چاہیے مجھکو بیچ بازار میں
سر مرا لٹکا کے قاتل نے کہا	پھل لگا ہے آج نخل دار میں
گرمیٔ خوں کی مری تاثیر دیکھ	پڑ گئے چھالے تری تلوار میں
سر کے کٹنے کا مجھے کچھ غم نہیں	خم نہ پڑ جائے تری تلوار میں
قبر میں روزن مری رکھنا ضرور	مر گیا ہوں انتظار یار میں
میرا مرنا اُنکے گھر شادی ہوئی	خون کے چھاپے لگے دیوار میں
بعد مردن میرے لاشے کو دبیرؔ	دفن کرنا کوچۂ دلدار میں

رحمت کا تری اُمیدوار آیا ہوں	رباعی	مُنہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گنہ نے پیدل		تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں
ناداں کہوں دلکو کہ خردمند کہوں	؍؍	یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اِک روز خدا کو مُنہ دکھانا ہے دبیرؔ		بندوں کو میں کس مُنھ سے خداوند کہوں
خیالِ کربلا ہے، اور میں ہوں		بہشتِ جاں فزا ہے، اور میں ہوں
جُنوں موتی بیابانِ نجف کے		یہ دُرِ مدعا ہے، اور میں ہوں
مثالِ دانہ پستا ہوں شب و روز		فلک کی آسیا ہے، اور میں ہوں
ضعفِ دشمن سے حُر نکلا یہ کہکر		بس اب راہِ وفا ہے، اور میں ہوں

دُعا بھی مال و دولت کی نہ مانگوں — ہمیشہ یہ دعا ہے اور میں ہوں
تمنّا دولت و حشمت کی ہے بے جا — دبیر آخر فنا ہے اور میں ہوں

ہے عکسِ گیسو و رُخِ اکبر کہاں کہاں — سنبل کہاں کہاں ہے گُلِ تر کہاں کہاں
گلزار میں، جناں میں، ختن میں، تتار میں — پھیلی ہے نگہتِ گلِ حیدر کہاں کہاں
فرقِ عدو میں سینہ میں جوشن میں زین میں — در آئی ذوالفقارِ دوپیکر کہاں کہاں
بستی میں جنگلوں میں، ترائی میں کوہ میں — شہ کو لیے پھرا ہے مقدر کہاں کہاں

بند

اِس کشتِ روزگار میں تخمِ وفا نہیں — اِس بوستاں کے پھولوں میں بوئے وفا نہیں
اِس بزم کے چراغوں میں نورِ ولا نہیں — اِس بحر کے صدف میں دُرِ مدّعا نہیں
گھر کونسا بسا کہ جو ویراں نہ ہو گیا — گل کونسا ہنسا کہ پریشاں نہ ہو گیا

اگر وہ غیرتِ شمشاد جائے سیرِ گلشن کو — گلوئے سرو میں پہنا دے قمری طوق گردن کو
چمن کی بے ثباتی پر جو اسکا دھیان جاتا ہے — تو کیا روتی ہے شبنم مُنہ پہ رکھکے گل کے دامن کو
رواں کرتا تھا خنجر گاہ گاہے روک لیتا تھا — عجب ناز و ادا سے اُسنے کاٹا میری گردن کو
میں کشتہ ہوں کسی گُل کے مسی آلودہ دنداں کا — چڑھانا باغباں تربت پہ میری برگِ سوسن کو
دلا ان تنگ چشموں سے نہ چشمِ رحم تو رکھو — کسی کے حال پر روتا نہ دیکھا چشمِ سوزن کو
سوادِ نامۂ اعمال کیا یہ اشک دھوئیں گے — نہ شبنم نے کیا تبدیل رنگِ برگِ سوسن کو
دبیر آئیگا کب وہ بھول کر گورِ غریباں پر — جو اکثر روندتا تھا ناز سے پھولوں کے خرمن کو

آتے تھے جوڑ توڑ غضب تیغ تیز کو — سر سے گری جُدا کیا پائے گریز کو
اپنے سے گرم دیکھ کے اُس شعلہ ریز کو — برق و شرر نے نذر کیا حسب و جہیز کو

گھر اپنا اُجاڑ کر بسایا تجھکو — ڈھانپا جو کفن سے مُنہ دکھایا تجھکو
اے قبر کہاں کہاں نکی تیری تلاش — جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھکو

ادنیٰ سے جو سر جھکائے اعلیٰ وہ ہے — جو خلق سے بہرہ ور ہے دریا وہ ہے

کیا خوب دلیل ہے یہ خوبی کی دبیر
گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا

سمجھے جو بُرا آپ کو اچھا وہ ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
جس پھول کو سونگھتا ہوں بُو تیری ہے

بُو گل نے رنگ لالہ نے سرعت ہوا نے دی
یہ ہدیہ کیا ہے اپنی نیابت قضا نے دی

دِل کو مرے شغل غمگساری کا ہے
گردوں کو ہے اگر سرکشی کا غرہ

غفلت میں طور ہوشیاری کا ہے
ہمکو بھی غرور خاکساری کا ہے

یاں شور وہاں غل ادھر آئی اُدھر آئی
وہ تیر گئی خود میں وہ سر میں در آئی

وہ چمکی، وہ تڑپی، وہ چُھپی وہ نظر آئی
گردن سے بڑھی سینہ لیا تا کمر آئی

سِن اُسکا گھٹا تھا جو دلیرانہ بڑھا تھا
مُنہ کی وہی کھاتا تھا جو منہ اُسکے چڑھا تھا

چمکی جو خود سر پہ تو سر سے نکل گئی
سینے میں دم لیا تو کمر سے نکل گئی

شانے پہ جو پڑی تو جگر سے نکل گئی
حیراں تھا خود بدن کہ کدھر سے نکل گئی

اُونچی ہوئی تو فرق عدو کو فرو کیا
گر کر اُٹھی تو راکب و مرکب کو دو کیا

رباعی

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنو جنت تھا

اِس دَور میں جو آسماں سے نکلے
آدم ٹھہرے جو ہم جناں سے نکلے

عباس کے غم سے چشم سرور نم تھی
اشک آنکھوں میں اور زباں پہ عباس کا نام

حالتِ شہِ بیکس کی عجب اُس دم تھی
رُخ زرد، کمر پہ ہاتھ۔ گردن خم تھی

اے ابر تری گہر فشانی کیا ہے؟
یاں گل ہے چراغ انوری کا بالکل

آ، دیکھ کہ یہ دُرِ معانی کیا ہے
اے شمع تری چرب زبانی کیا ہے

بند

اللہ جل شانہ، وہ غفور الرحیم ہے
رحمان و مستعان و رؤف و رحیم ہے

ہم سب ہیں دردمند وہ کامل حکیم ہے
اُسکے سوا بھلا کوئی ایسا کریم ہے

ایمان بھی دے مُراد بھی دے عز و جاہ بھی
روزی بھی بخشے۔ خلد بھی بخشے گناہ بھی

جز حیف کیا جہاں سے سلیماں لے گئے	بند	یوسف بھی زیر خاک سب ارمان لیگئے
شاہانِ دہر کونسا سامان لے گئے		سب کچھ وہ لے گئے کہ جو ایمان لیگئے
کن قافلوں کو خاک نہ اس راہ نے کیا		کن یوسفوں کو غرق نہ اِس چاہ نے کیا
یہ سُن کے مطمئن ہوئے وہ غازی وغنی	بند	منکہ ڈھلا، نہ اشک بہا، وقت جانکنی
نوکان کی مڑی، نہ پھری مُنہ پہ مُردنی		پتھرانا کیسا آنکھ میں دونی تھی روشنی
مرتے ہوئے غضب کی دلیری دکھاتے تھے		رگ رگ سے دم نکلتا تھا اور مسکراتے تھے
مجرئی ہے سوگوار مہ حیدر چاندنی		اشک شبنم ہیں بکا کرتی ہے شب بھر چاندنی
تاکمالِ چار ۱۴ وہ معصوم روشن سب پہ ہو		چودھویں ۱۴ شب کو رہا کرتی ہے شب بھر چاندنی
شمر نے چاہا کہ حضرت سے جُدا عباس ہوں		یہ نہ سمجھا۔ چاند سے چھوٹے گی کیونکر چاندنی
مال و زر کا کیا بھروسہ چاہیئے فکرِ مآل		فی المثل ہے چار دن کی اے تونگر چاندنی
ثابت شر و آفت سے شرافت نہیں ہوتی		کاہل کی یہ پہچان ہے نخوت نہیں ہوتی
پیش اُمرا طالبِ زر جھکتے ہیں		سجدے سے سوا مجرے کو سر جھکتے ہیں
سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی طرح		ہے مال سوا جدھر، اُدھر جھکتے ہیں
دریا پہ تو ظاہر ہیں علمدار گئے		باطن میں وہ کوثر کے طلبگار گئے
تھا بیچ میں دریائے شہادت حائل		وہ ہاتھ میں اس پار سے اُس پار گئے
جز حیف کیا جہاں سے سلیمان لیگئے	بند	یوسف بھی زیر خاک سب ارمان لیگئے
شاہانِ دہر کونسا سامان لیگئے		سب کچھ وہ لیگئے کہ جو ایمان لیگئے
کن قافلوں کو خاک نہ اس راہ نے کیا		کن یوسفوں کو غرق نہ اِس چاہ نے کیا
ہیں وقف ہمیشہ مرے الفاظ و معانی		ہاں قلزم شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی
وزدانِ مضامیں پہ نہ کر سعی کی تاکید		تو مجتہد نظم ہے، فرض اُن پہ ہے تقلید
مضموں نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ		کہتا ہے سخن حضرت اُستاد ہمیشہ

کہنے میں ہے تاثیر خدا داد ہمیشہ
بھولے سے بتادوں تو رہے یاد ہمیشہ
شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں
ہر مرثیہ میں موجد طرز جدید ہوں

آمد شہ عادل کی ہے انصاف کی رہبر
خرمن سے شرر بھاگتے ہیں شیشے سے پتھر
بلبل سے قفس گل سے خزاں شمع سے صرصر
شبنم سے جو سورج تو کتاں سے مہ انور
نیکی سے بدی نام سے اب ننگ جدا ہے
توبہ سے شکست آئینہ سے زنگ جدا ہے

ہر جسم سے یہ دبدبۂ شہ کا بیاں ہے
آرام کہاں، ہوش کہاں، جاں کہاں ہے
تن کہتا ہے سب قافلہ دوزخ کو رواں ہے
دوزخ کی ندا ہے نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے
اب عقل کہاں ہوش کہاں فوج لعیں میں
سب گرد ہوئے راہ سمند شہ دیں میں

اک دم میں یہ طے کرتا ہے دنیا کی حدیں سب
کیسی وہ حدیں آپ سے باہر ہے یہ مرکب
خالی ہیں رکابوں کی طرح چلنے میں قالب
نقرہ ہے، نہ سبزہ ہے، نہ ابلق ہے نہ اشہب
نام اس کا تصور میں گذرتا نہیں کوئی
شوخی کے سبب رنگ ٹھہرتا نہیں کوئی

درخشاں ماہتاب الدولہ کوکب الملک سید علیخاں بہادر درخشاں ستارہ جنگ منجم شاہی ولد میر مغل لکھنوی شاگرد تدبر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی اور انکے باختصاص مقربوں میں شامل تھے مشہور سبع سیارہ کے ایک رکن تھے۔ ستاروں کی مزاج شناسی کے ساتھ ساتھ فن سخن کو بھی خوب نباہتے تھے۔ انکی سخن سنجی پر استاد کو بھی ناز تھا۔ جب فخر الدولہ برق نے اپنے ایک خوش فکر شاگرد مرزا محمد رضا، طور کو دربار شاہی میں پیش کیا، تو منشی اسیر نے انکی نذر بھی دلوادی۔ خود درخشاں نے مولوی حیدر علی طباطبائی سے جنھوں نے انکا مختصر حال رسالہ ادیب میں شائع کیا ہے فرمایا تھا کہ میری اور آفتاب الدولہ قلق کی باریابی ساتھ ساتھ ہوئی تھی اور خطاب بھی ساتھ ہی ملے تھے، انتزاع سلطنت کے بعد برق اور درخشاں بادشاہ کے ہمرکاب کلکتہ گئے اور قلق و اسیر لکھنو رہ گئے درخشاں کا انتقال بھی مٹیا برج ہی میں ہوا، بڑے پرگو اور زود فکر سخنور تھے، دیوان تیار تھا مگر حوادث

کی غفلت سے برباد ہوگیا، مولوی علی حیدر نے بڑی کوشش سے کچھ اجزا اشعار ردیف الف
کے ٹیا برج میں فراہم کیئے اور مضامین کی صورت میں رسالہ ادیب میں شائع کرائے جن سے
ہماری معلومات اور دستیاب شدہ کلام میں معتد بہ اضافہ ہوا جسکے لئے ہم مولٰنا مذکور کے
ممنون ہیں، اُس کا انتخاب درج ذیل ہے، اِنکے تلامذہ میں رئیس الدولہ افسر خوشنویسان
شاہی اچھا کہنے والوں میں تھے، روزمرّہ بہت صاف لکھتے تھے اور نازک خیالی بھی
انکے کلام سے آشکار ہے۔ آپکے اکثر اشعار میں اخلاقی مضامین صفائی سے نظم پائے
جاتے ہیں، جو ناسخ کی طرز کے مقلد کے لیئے کچھ آسان بات نہیں، خود بادشاہ اور جملہ شعرائے
لکھنو اُسی خشک اور بے تاثیر رنگ کے اسیر تھے، الغرض تغزل کا دلفریب رنگ ان کے
کلام میں موجود ہے، مضمون کی بندش ایسی چُست ہوتی تھی کہ ردیف بول اُٹھتی ہے۔
اب کلام ملاحظہ ہو:-

آثارِ صبح حشر ہیں شاید کہ اے اجل مرنا بھی اہلِ ہوش کا ہے غافلوں کو پند ہم اُس سے نقد بوسہ کے اُمیدوار تھے	میرا چراغ عمر جو تو نے بجھا دیا ہم سوے تو یاروں کو اپنے جگا دیا قیمت میں دل کی یار نے خنجر لگا دیا
کہا یہ ساربان سے نجد کے وادی میں لیلیٰ نے نہوگی فکر معنی آشنا محتاجِ غواصی	کہ پہچانا نہیں جاتا ہوا کیا حال مجنوں کا گہر فشاں ہے خود دامن مرے دریائے مضموں کا
ظلم کرتا ہے کتابی چہرا خود پرستی ہے پرستش بت کی	خطِ کوفی میں ہے قرآں میرا کم نہیں کفر سے ایماں میرا
آدمیت کو فقط جوہر انسان جانا ہمکو یہ فیض ہوا عشقِ رخِ گیسو سے شر سے نفرت ہے ہمیں خیر سے رغبت ہے مدام	جس میں اخلاق نہ پائے اُسے حیوان جانا گبر نے گبر مسلماں نے مسلماں جانا کفر سمجھا اسے جسنے اُسے ایمان جانا
حال ابنائے زماں ہے مثل سنگِ آسیا	ایک بے آرام سے کھاتا ہے چکر دوسرا

نیک پر ہے فوق بد کو جب عالم میں تو کیا
کیوں پئے روزی کس و ناکس سے کرتا ہے رجوع
دسترس میرا جو ہو پتھر سے توڑوں آئینہ
ذبح کیا کرتے ہو چھوڑو باندھ کر پر بام پر
اے درخشاں جسکے مضموں سے ہے روشن اک جہاں

حسن نظر آتا ہے مجکو ایک - گو ہر دوسرا
بند کر سکتا نہیں رزقِ مقدر دوسرا
دیکھنے پائے نہ تیرا روئے انور دوسرا
ایک کو دیکھے تو آبیٹھے کبوتر دوسرا
شاہ اختر سا نہیں دیکھا سخنور دوسرا

دریائے محبت کا نہ پوچھو حد و پایاں
نازک ہے فنِ شعر نہایت ہی درخشاں

جی ڈوب گیا جب مجھے ساحل نظر آیا
کہنے سے سمجھنا مجھے مشکل نظر آیا

کوئی میرے لیئے ہی بیخود خواب
ہمیں اتنا خیال آیا تو ہوتا

کیا شرف ذات کا گر فیض کا جوہر نہ ہوا
بخیہ درکار نہیں چشم مروت کے لیئے
بیشتر حالِ جہاں ہمنے پریشاں دیکھا

آبِ گوہر سے لبِ خشک کبھی تر نہ ہوا
آشنا بار کی وحشت سے کبوتر نہ ہوا
گھر ہوا در نہوا، زور ہوا، زر نہ ہوا

بزنگ بوئے گل پہنچے سبکروحی سے اس جا ہم
ہمیشہ رنج میں رکھتی ہے اپنی ہمت عالی

دکھائے برچھیاں سبزہ جہاں دیوار گلشن کا
ہمیں ہے دوست کا احسان، گویا ظلم دشمن کا

جامِ تہی ہیں صورتِ دستِ سوال بھی
آئی قریب گوشۂ ابرو جو زلفِ یار
کل وہ جو مجھ کو دیکھ کے بیگانہ بن گیا
غفلت پہ اپنی کیوں نہ ہوں خونِ دل بہم
رونق فزا ہوا جو درخشاں وہ بت کبھی
جب نگاہِ مست اسکی غیر پر پڑنے لگی
چارہ سازی خلق کی کرتا ہوں گو درماندہ ہوں
کہنے کیواسطے ہیں بہت یار آشنا

گردن کو اپنی شیشۂ مے نے جھکا دیا
اُتری ہوئی کمان پہ چلا چڑھا دیا
میں بھی تو ہوشیار ہوں دیوانہ بن گیا
جامِ شراب عمر کا پیمانہ بن گیا
آئینہ خانہ رشکِ صنم خانہ بن گیا
ہو گیا ثابت بہکنا نرگسِ مخمور کا
بے مروت بیشتر رہتا ہے گھر مزدور کا
لاکھوں میں یاں نکلتے ہیں دو چار آشنا

ناحق ہمیں سمجھتے ہیں اغیار آشنا
ہوتے نہیں کسی کے طرحدار آشنا

قاتل سے ہے اشارۂ ابروئے ماہ نو
دو دن تو ہو نیام سے تلوار آشنا

کب ہے برادرانِ حقیقی کا اعتماد
بے فائدہ بدلتے ہیں دستار آشنا

پوچھوں ہیں لطفِ بوسہ درِ گوش یار سے
کانوں سے ہو اگر لبِ گفتار آشنا

ہے جائے گریہ حال جہانِ خراب کا
ہو چشم مہر و ماہ پہ دامن سحاب کا

تکیہ پہ لطفِ عارضِ رنگیں کو دیکھنا
گویا روش پہ پھول پڑا ہے گلاب کا

کب تک پیوں ہیں ظلمتِ شب کے لہو کے گھونٹ
چھلکائے شیشہ صبح قدح آفتاب کا

کیا آئینہ میں عارضِ رنگیں کی ہے بہار
پانی میں پھول تیر رہا ہے گلاب کا

ہم حُلّۂ بہشت پہن کے چلے گئے
ڈھونڈا کیا کفن میں فرشتہ عذاب کا

رتبۂ اعلیٰ نہ پائے لاکھ گرا دنی بڑھے
قدِ آدم آئینہ کس دن سکندر ہو گیا

زخمیِ تیغِ ادا شب بھر تڑپ کر مر گئے
چاندنی کا کھیت وہ پھولوں کا زیور ہو گیا

زندگی بھر جز ندامت اور کیا حاصل ہوا
مجھ سے فعلِ نیک یا رب تیرے قابل کیا ہوا

غالب ہوئی جو نکہتِ گل پر شمیم زلف
غنچوں نے چٹکیوں میں صبا کو اڑا دیا

وبال اس سر کے کٹنے کا نہ بالا بالا جائے گا
دھواں اسکو نہ اے قاتل سمجھنا شمع روشن کا

سکتے ہیں وہ آئینہ دکھا کر مجھے بولے
پتھر پڑیں اسے شخص تری بے خبری پر

صدمے سے بچاتی ہے طبیعت کی لطافت
پانی پہ کرے کاٹ نہ شمشیر ہوا پر

جو پھول پھینک کے مارا رقیب نے اسکو
لگا ہے رشک کا کاری خدنگ سینہ پر

کس طرح چشمِ شوق کو آئے نظر کمر
تارِ نظر سے اسکی ہے باریک تر کمر

معدوم کوئی چیز نہیں پر دہانِ یار
غائب کوئی جہاں سے نہیں ہے مگر کمر

آیا اگر لکے راہ میں گر خط شوق کو
میرا ہے ہاتھ اور تری نامہ بر کمر

آتا ہے انکو اپنی نزاکت کا جب خیال
پاتے نہیں ہیں آپ وہ دو دو پہر کمر

وحشتِ غربت میں جابائے خارو خس نے برگ و بر
بے گنہ کے سر قلم کرنے پہ ہے کتنا دلیر
سر برہنہ مو پریشاں چشم گریاں سینہ چاک
معرکہ میں عشق کے کی سر سے طے راہ عدم
ناصحا دیکھ نہ غصہ سے سوئے طفل پلک
نہ ہے اِس طرح سنگ آسیا ای چرخ گردش میں
یہ یوں تسبیح دست پارسا اے چرخ گردش میں

منعموں کے واسطے ہے رونق کاشانہ شمع
ہو اگر حاکم تو لے گلگیر سے جرمانہ شمع
رکھتی ہے سامانِ رنج و ماتم پروانہ شمع
آفریں ثابت قدم تھی کس طرح مردانہ شمع
تیری آنکھوں میں کھٹکتے ہیں مجھے پیارے ہیں
نہ ہے یوں ساغر بادہ سدا اے چرخ گردش میں
رہیگا نجم اختر تا کجا اے چرخ گردش میں

خاکساری کمال کی ہے دلیل
وعدہ روز ازل کچھ یاد ہے

ہیں جو ناقص غرور کرتے ہیں
غافلو آئے کیوں کیا کر چلے

طواف تھا جو کبھی دل کے گرد ہم پھرتے
جہاد تھا جو کبھی خونِ آرزو کرتے

درد۔ ملک الشعرا خواجہ میر درد دہلوی خلف الصدق خواجہ میر ناصر عندلیب آپکا مادری سلسلہ خواجہ بہاء الدین نقشبند سے ملتا ہے۔ انکا خاندان قدیم الایام سے دہلی میں پیری مریدی کے باعث نہایت با رسوخ اور صاحب اثر سمجھا جاتا تھا، علوم رسمی سے بخوبی ماہر تھے مشہور مفتی دولت سے مثنوی مولانا روم کے سبق لیئے تھے، آپ نواب ظفر خان بہادر امیر عہد جہانگیر بادشاہ کی اولاد امجاد اور خاندان چشتیہ میں سجادہ نشین تھے شاہ گلشن کے خلیفہ اور علم تصوف و باطنی میں وحید العصر اور یگانہ وقت سمجھے جاتے تھے، کلام انکا نہایت پاکیزہ، فصیح اور درد انگیز ہے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دیوان انکے موجود ہیں، میر تقی میر اور سودا کے ہمعصر تھے، خدائے سخن میر تقی میر نے ان کو آدھا شاعر مانا ہے، اسی طرح مرزا رفیع السودا بھی انکے کمال کے معترف تھے جس کا اظہار کئی مقطعوں میں کیا ہے۔ ؎

سودا بدل کے قافیہ تو اس غزل کو رکھ
اے بے ادب تو درد سے بس دو بدو نہ ہو

الغرض میر درد ایوان شاعری کے ایک بڑے جلیل القدر رکن ہیں۔ ہزار ہا آدمی انکے مرید

تھے۔ قدیم متانت اور تہذیب کی ایک مجسم تصویر تھے، یہ صبر و قناعت ہی کا کرشمہ تھا، کہ سودا
میر، مصحفی، جرأت، انشا، حسرت، سوز، جیسے مشاہیر سلطنت کی تباہی اور رات دن کی
غارتگری سے تنگ آکر تلاش روزگار میں دہلی کو خیرباد کہکے بلاد شرقیہ کو روانہ ہوئے۔
مگر انکے پائے استقلال نے جنبش نہ کی اور اپنی خانقاہ میں اسی طرح بیٹھے رہے دنیاوی
عزوجاہ کی طرف بھی التفات نہ کیا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تا دمِ اخیر مرجع صغیر و کبیر رہے
دربار شاہی سے کچھ تھوڑی سی جاگیر بزرگوں کی مقرر تھی اُسکی آمدنی اور نذر و نیاز سے بخوبی
بسراوقات ہوجاتی تھی، موسیقی میں چونکہ اچھی مہارت رکھتے تھے اس لیے بڑے بڑے
گویئے اور کلاونت اپنی چیزیں بنظر اصلاح و استفادہ سُنایا کرتے تھے، محرم میں مرثیہ اور
سوزخوانی کی محفل ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب ہر مہینے کی ۲۔ اور ۲۴ تاریخ کو مشائخوں کی محفل
کیا کرتے تھے، اور اس میں اکثر اُمرا، و بزرگ اپنا فخر سمجھ کر آتے تھے، حتیٰ کہ خود بادشاہ
حضرت شاہ عالم ثانی کئی دفعہ تشریف فرما ہوئے، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت بلا
اطلاع چلے آیے، اور چونکہ پاؤں میں درد تھا ضبط نہ کرسکے اور ذرا پاؤں پھیلا دیا، اب
خواجہ صاحب کی نازک مزاجی دیکھئے کہ وہ اِس بے ادبی کی متحمل نہ ہوسکی اور اُسی وقت بولے کہ "یہ
امر فقیر کی داب محفل کے خلاف ہے" بادشاہ نے عذر کیا اور معافی چاہی، جسپر میر درد نے
فرمایا کہ "اگر طبیعت ناساز تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چھوٹی بحروں میں جو
شعر کہتے تھے لاجواب اور بےمثل ہوتا تھا، میر تقی میر کے رنگ میں رنگ ملا دیتے تھے
بلکہ تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے انکا کلام زیادہ مؤثر اور دلاویز ہوتا تھا،
تصنیف اور تالیف کا شوق بچپن سے رفیق تھا، چنانچہ اردو دیوان کے علاوہ ایک مختصر
فارسی دیوان بھی ہے، ان دونوں کے علاوہ رسالہ اسرار الصلوٰۃ، واردات درد اُسکی شرح
میں علم الکتاب ایک بڑا نسخہ تحریر کیا، جس میں ۱۱۱ متفرق رسالے ہیں۔ نالۂ درد، آہِ سرد، دردِ دل،
سوزِ دل، شمع محفل، حرمتِ غنا، وغیرہ جن کی شائقین تصوف کی نگاہوں میں بڑی

قدر و منزلت ہے انکی اور تصانیف ہیں۔ اِن کے والد خواجہ ناصر عندلیب بھی شاعر تھے۔
چنانچہ اُنکا بھی ایک مختصر دیوان اور رسالہ "نالۂ عندلیب" موجود ہے، اسی طرح درد کے
چھوٹے بھائی سید محمد میر اثر جن کا ذکر پہلے جلد میں آچکا ہے صاحب دیوان و مثنوی
"خواب و خیال" تھے۔ خواجہ صاحب کی غزل عموماً سات یا نو شعر کی ہوتی تھی، مگر مضامین
سب چُھنے چھٹکے ہوئے، گویا تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دیتے تھے، البتہ جیسا
اِنکے ہمعصر شعرا میر تقی میر۔ سودا اور درد کے شاگرد رشید قائم کے ہاں بعض الفاظ۔ جاگہ
نت، ٹک، تئیں، جیدھر، جواب متروک ہیں مستعمل ہوئے ہیں اِنکے کلام میں بھی وہ پائے
جاتے ہیں، اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں، ہر عہد او رزمانہ کی زبان جداگانہ ہوتی آتی ہے۔
صفائی زبان، وسوز و گداز، و خوش اسلوبی محاورہ او مضمون آفرینی پر شیدا تھے، ۲۴ صفر
سنہ ۱۱۹۹ ہجری یوم جمعہ کو انتقال کیا۔ کسی مرید نے تاریخ کہی "حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا مجنوں"

مقدور کسے ہے ترے وصفوں کے رقم کا	حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
بستے ہیں ترے کوچہ میں سب شیخ و برہمن	آباد ہی تجھسے ہی تو گھر دیر و حرم کا
ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب کا	اور دل میں بھروسا ہے تو ہے تیرے کرم کا
کبھی خوش بھی کیا ہے دِل کسی رندِ شرابی کا	بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا
اکسیر پہ تہوس اتنا نہ ناز کرنا	ہے کیمیا سے بہتر دل کا گداز کرنا
ای آنسوؤ نہ آوے کچھ دلکی بات لب پر	لڑکے ہو تم کہیں مت افشار راز کرنا
ہم جانتے نہیں ہیں ای درد کیا ہے کعبہ	جیدھر ملے وہ ابرو اودھر نماز کرنا
مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا	ہم سبھی مہمان تھے تو آپ ہی صاحبخانہ تھا
ہو گیا مہمان سرائے کثرتِ موہوم آہ	وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوتخانہ تھا
وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا	برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں	ترے عشق میں ہمنے کیا کیا نہ دیکھا
حجابِ رُخِ یار بھی آپ ہم ہیں	کھُلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا
کیا مجھکو داغوں نے سروِ چراغاں	کبھو تُو نے آکر تماشا نہ دیکھا
مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ	کہ جسکو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں	کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا
سینہ و دِل حسرتوں سے چھا گیا	بس ہجومِ یاس! جی گھبرا گیا
تجھ سے ہمنے کچھ نہ دیکھا جز جفا	پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا
پی گئی کتنوں کا لوہو تیری یاد	غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا
کھُل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری	جی میں یہ کس کا تصور آگیا
ہیں تو کچھ ظاہر نہ کی تھی دلکی بات	پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا
فلک پر کون کہتا ہے گذر آہِ سحر کرنا	جہاں جی چاہے وہاں جا پر کسی دلمیں اثر کرنا
مثلِ نگیں جو ہم سے ہوا کام رہگیا	ہم روسیاہ جاتے رہے نام رہگیا
یارب یہ دل ہی یا کوئی مہمانسرائے ہے	غم رہگیا کبھو۔ کبھو آرام رہگیا
ہم کب کے چل بسے تھے پر اے مژدۂ وصال	کچھ آج ہوتے ہوتے سرانجام رہگیا
قدرت سے وہ تپاک تو موقوف ہوگئے	اب گاہ گاہ بوسہ بہ پیغام رہگیا
ساقی مری طرف بھی ٹک اُنکی نگاہ کر	لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہگیا
جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا	تُو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی	ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
جان سے ہوگئے بدن خالی	جس طرف تُو نے آنکھ بھر دیکھا
اگر یُوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا	تو اِک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا
میں جاتا ہوں دلکو ترے پاس چھوڑے	مری یاد تجھکو دلاتا رہے گا

کتنے بندوں کو جان سے مارا | کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما | اس طرف کو کبھو گذر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم | کبھیا رحم تو نے پر نہ کیا

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا | پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں تری حسن کے شعلہ کے حضور | شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
باوجودیکہ پروبال نہ تھے آدم کے | وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا
ذکر میرا تو وہ کرتا تھا صریحاً لیکن | میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا
محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں | دِل نہ تھا کوئی کہ شیشہ کی طرح چور نہ تھا

کیا جفا کے سوا تجھے کچھ اور | اے ستمگار خوش نہیں آتا
درد ہمکو یہ رات دِن تیرا | نالہ زار خوش نہیں آتا
یک بیک نام لے اُٹھا میرا | جی میں کیا اُسکے آگیا ہوگا

تو اپنے دل سے غیر کی اُلفت نہ کھو سکا | میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہو سکا
جُوں شمع روتے روتے ہے گذری تمام عمر | تو بھی تو درد داغِ دِل اپنا نہ کھو سکا

شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں | نے تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ کا

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ہم کنشتِ دِل میں ہو | درد منزل ایک تھی ٹک راہ کا ہی پھیر تھا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا | کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
دِل کسی چشم مست کا سرشار ہو گیا | کِسکی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا

کی تو تھی تاثیر آہِ آتشیں نے اُسکو بھی | جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

تم اوّل ہی آکر جو مجھ سے ملے تھے | نگاہوں میں جادو سا کچھ کر دیا تھا

تو ہی نہ اگر ملا کرے گا | عاشق پھر جی کے کیا کریگا

ہمنے چاہا بھی پر اُسکو جی سے آیا نہ گیا | وہاں سے جوں نقشِ قدم دِل تو اُٹھایا نہ گیا

گذرا تھا بعدِ مدت وہ سامنے سے ہو کر
اے کوہتی نالہ یہ وقت تھا گئی تھا؟

اُس نے قصداً بھی میرے نالے کو
نہ سُنا ہوگا گر سُنا ہوگا

دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

قتل سے میرے وہ جو باز رہا
کسی بدخواہ نے کہا ہوگا

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کِھلا ہوگا

دِل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں بہا ہوگا

کسی سے کیا بیاں کیجے اس اپنے حال ابتر کا
دِل اُسکے ہاتھ دے بیٹھے جسے جانا نہ پہچانا

بے طرح کچھ اُلجھ گیا تھا دِل
بیوفائی نے تیری سُلجھایا

ہم تو کہتے تھے مُنہ نہ چڑھ آسکے
دردؔ کچھ عشق میں مزہ پایا

میں اپنا دردِ دل جا کر کہا جس پاس عالم میں
بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا

گذروں ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں یاں کے لوگ
ہے کوئی دِن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

جان پہ کھیلا ہوں میں میرا جگر دیکھنا
جی ہے یا نہ ہے مجکو اُدھر دیکھنا

گرچہ وہ خورشید رو ہے مرے سامنے
تو بھی میسر نہیں بھر کے نظر دیکھنا

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

ذکرِ وفا کیجئے اُس سے جو واقف نہ ہو
کہتے یہ کس سے ہو تم ٹک ادھر دیکھنا

رباعی

نالۂ دل کا اثر دیکھ لیا دردؔ میں
جی ہی نہ رہ جائے یہ آہ بھی کر دیکھنا

بتخانہ برہمن کا مکرر دیکھا
کعبہ کو بھی شیخ کے میں اکثر دیکھا

دِل لگنے کی صورت نہ کہیں دیکھی ہائے
جو کچھ دیکھا سو خاک پتھر دیکھا

سیرِ باغ و بوستاں تو ہے میسر ہر گھڑی
آ ہی جائیگا ہے فقیر نکلے بھی ویرانے کے بیچ

جو مزے ہیں مر گئیں سو ہمسے پوچھا چاہئے
کوئی جانے آہ کیا لذت ہے مرجانیکے بیچ

اسقدر تھا یا کرم یا ظلم رانی اسقدر
مہربانی اسقدر نا مہربانی اسقدر

کیا کہوں دلکا کسی سے قصۂ آوارگی
کوئی بھی بے ربط ہوتی ہے کہانی اسقدر

جان کو آنے دے لب تک نزع میں کبتک رہوں
دشمنی مجھ سے نکرے ناتوانی اسقدر

ہنس قبر پہ میری کِھل کھلا کر
یہ پھول چڑھا کبھی تو آکر

خارِ مژہ پڑے ہیں مرے خاک میں ملے
اے دشت اپنے کھچیو داماں کی احتیاط

دلکے تئیں گرہ سے کبھی کھولتی نہیں
ہے زلف کو بھی اپنے پریشاں کی احتیاط

داغوں کی اپنے کیوں نکرے درد پرورش
ہر باغباں کرے ہے گلستاں کی احتیاط

کیجے نہ قتل اہلِ وفا جتنے ہیں یہ سب
بارے کہیں ٹھکانے لگے جستجوئے تیغ

صیاد اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو
ہے کس کو زندگی کی توقع بہار تک

لازم ہے گوشۂ شکن زلف میں تری
ظالم کوئی پڑا رہے مجھ سا شکستہ دل

ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا
اِدھر گل پھاڑتے تھے جیب روتی تھی اُدھر شبنم

اپنے ملنے سے منع مت کر
اِس میں بے اختیار ہیں ہم

رباعی

اے درد یہ دردجی کا کھونا معلوم
جوں لالہ جگر داغ سے دھونا معلوم

گلزار جہاں ہزار پھولے لیکن
میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھپر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

اُس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں
پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

موت! کیا تلکے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مرجاتے ہیں

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

درد یاں دو ہی پیمانوں پہ قناعت کیجے
خانہ چشم ہے یہ خانۂ خمار نہیں

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سرتا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

مدت تلک جہان میں ہنستے پھرا کیئے
جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھکر کہیں

مژگانِ تر ہوں، یا رگِ جانِ بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی
اُفتادہ ہوں پہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں

مرے دل کے شیشہ کو بیوفا تو نے ٹکڑے ٹکڑے ہی کر دیا
مرے پاس تو وہی ایک تھا یہ کانِ شیشہ گراں نہیں

بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ
سب اہلِ قبر اسی کا خمار رکھتے ہیں

عشوہ و ناز و کرشمہ ہیں سبھی جان بخش لیک
درد مرتا ہے کوئی اُسکی دوا کرتا نہیں

داد کو تو پہونچنا معلوم ہے
کوئی یاں فریاد سنتا ہی نہیں

ہر دم بتوں کی صورت رکھتا ہے دل نظر میں
ہوتی ہے بت پرستی اب تو خدا کے گھر میں

دل تو سمجھائے سمجھتا ہی نہیں
کھینچئے سودا ہے تو سودا بھی نہیں

کہیں ہوئے ہیں سوال و جواب آنکھوں میں
یہ بے سبب نہیں ہمسے حجاب آنکھوں میں

نہیں شکوہ مجھے کچھ بیوفائی کا تری ہرگز
گلہ تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نباہی ہو

اپنے بندہ پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
یہ نہ آجائے کہیں جی میں کہ آزاد کرو

اے درد یاں نہ دل کو کسی سے پھنسائیو
لگ چلیو سب سے یوں تو پہ دل مت لگائیو

مانع نہیں ہم وہ بتِ خودکام کہیں ہو
پر اس دلِ بیتاب کو آرام کہیں ہو

ہر چند تجھے صبر نہیں درد ولیکن
اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

تیری خوں آشامیاں مشہور ہیں ای تیغِ یار
ایک قطرہ چھوٹے تو پیوے ہمارا ہی لہو

اے درد بہت تو نے ستایا ہمکو
بیدرد بہت تو نے ستایا ہمکو

جاتی ہے مری جان تو راضی رہنا
لے درد بہت تو نے ستایا ہمکو

جو جفا جو ہیں اُنہیں سنگدلی لازم ہے
کام تلوار کو رہتا ہے سدا سان کے ساتھ

نظر جب دل پہ کی دیکھا تو مسجودِ خلائق ہے
کوئی کعبہ سمجھتا ہے کوئی سمجھے ہے بتخانہ

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں سے ستم دیدہ
گر دل ہُوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ

دل بھی تیرا ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

بے خبر تیغ یار کہتی ہے
باقی اِس نیم جان میں کچھ ہے

مرا جی ہے جب تک تری جستجو ہے
زباں تب تلک ہے تری گفتگو ہے

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

تہمتیں چند اپنے ذمّہ دھر چلے
جس لیئے آئے تھے سو ہم کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
چل سکے بس جب تلک ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے
یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کا کیا چلے

درد اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے
جو سانس بھی نہ لے سکے وہ آہ کیا کرے

جی کی جی میں ہی رہی بات نہونے پائی
ایک بھی اُس سے ملاقات نہونے پائی

ہم نہ کہتے تھے کہ ہو جو مت عاشق
پائی دِل اپنی کچھ سزا تو نے

ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا کہیں کیا جی کو رو بیٹھے
بس اب اک ساتھ ہم دونوں جہاں سے ہاتھ دھو بیٹھے

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
اپنا ہی دل ہے یہ کہ جہاں تو سما سکے

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقش قدم کی طرح نہ کوئی اُٹھا سکے

دشوار ہوتی ظالم تجکو بھی نیند آنی
لیکن سُنی نہ تو نے ٹک بھی مری کہانی

گرچہ بیزار تو ہے پر اُسے کچھ پیار بھی ہے
ساتھ انکار کے پردے میں کچھ اقرار بھی ہے

دل بھلا ایسے کو اے درد نہ کیونکر دیجے
ایک تو یار ہے اور تسپہ طرحدار بھی ہے

یہ کیا درد تجھپر مصیبت پڑی ہے	کہ دن رات نالہ ہے اور آہ ہے
نہ ملئے یار سے تو دل کو کب آرام ہوتا ہے	و گر ملئے تو مشکل ہے کہ وہ بدنام ہوتا ہے
فرصتِ زندگی بہت کم ہے	مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے
روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے	اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے
وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیئے	پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیئے
کوئی بھی دوا اپنے تئیں راس نہیں ہے	جز وصل سو ملنے کی ہمیں آس نہیں ہے
آتشِ عشق جی جلاتی ہے	یہ بلا جان ہی پہ آتی ہے
ان دنوں کچھ عجب ہے میرا حال	دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے
سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف	جسکے ہاتھ آئے جام سو جم ہے
درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم	وہی رونا ہے نت وہی غم ہے

درد

درد - مسٹر عزیز الدین احمد صاحب بی۔ اے۔ رسالہ معیار میں اپنا کلام شائع کراتے ہیں اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہوا شعر ملاحظہ ہوں:-

ان سے مل بیٹھنے کی دیر تھی جب مل بیٹھے	ساری بگڑی ہوئی باتوں کو بنا کر اٹھے
وہ جبیں سائی سے پایا جو مقدر میں نہ تھا	لوحِ قسمت کو ہم اس در سے مٹا کر اٹھے
دیکھو اے درد کہیں تم سے اچانہ کہیں	ایسے آئے تھے کہ ہنستوں کو رلا کر اٹھے

دردمند

دردمند - فقیہ صاحب نام، وطن آپکا دکن تھا، لیکن تربیت شاہجہاں آباد میں پائی تھی اور میرزا جانجاناں مظہر کی خدمت میں آکر آداب فقر کی ماہیت حاصل کی اور مرید بھی ہوئے، چند مدت عظیم آباد میں رہ کر نواب غلام حسین خان اور نواب اعظم خاں کے صاحبزادے کی رفاقت میں گذر اوقات کی، بعد ازیں پھر دلی گئے اور کچھ عرصہ وہاں قیام کر کے مرشد آباد تشریف لیگئے۔ مرشد آباد آپ کا تشریف لیجانا نواب نوازش محمد خان شہامت جنگ نواب الہ وردی خان مہابت جنگ کے بھتیجے کی طلب کے باعث ہوا

۱۱۷۶ھ میں مرشد آباد میں انتقال کیا، میرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ میں انکا ذکر کیا ہے یہ اشعار کا انتخاب ہے ایک ساقی نامہ اور دیوان انسے یادگار ہے

پڑی اسکی خوبی کی از بسکہ دھوم — لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم
ارے ساقی اے جانِ فصلِ بہار — یہی تھا ہمارا او تیرا قرار
ہمارے بسر نے کی یہ فصل تھی — فراموش کرنے کی یہ فصل تھی
فلک چرخ مارے گا گر صد ہزار — نہ لاویگا مجھ سا کوئی رو بکار
نظر تو کرو ٹک چمن کی طرف — شگوفے کو آیا ہے مستی سے کف
چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک — کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک
ادا سے لہکنے کی تجھکو قسم — نشہ سے بہکنے کی تجھکو قسم
تجھے ناز مستی کی اپنے قسم — تجھے خود پرستی کی اپنی قسم
ارے بیوفا بے مروّت صنم — میں دیتا ہوں تجھکو قسم پر قسم
تجھے دخترِ رز کی حرمت کی سوں — تجھے مغبچوں کی شرافت کی سوں
تجھے وعدہ کر بھول جانیکی سوں — تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں
جو تو نے کیا مے کو مجھ پر حرام — تو اتنا تو کر ظالموں کے امام
کہ تو سرکشی سے نہ کر پائمال — مرے خون کو اپنے اوپر حلال
یقیں جانیو گر نہ ہوا ایک آن — تری مہربانی کا مجھکو گمان
تو صورت نہ پکڑے ہماری حیات — نکل جائے جی ناامیدی کے ساتھ

دردی

دردی مفتی محفوظ علی باشندۂ بدایوں، جناب کشفی سے تلمذ تھا ایک شعر تذکرۂ قلمی مرسلۂ شفیقی قاضی محمد خلیل سے اخذ کرکے درج کیا جاتا ہے۔

جب ہوگی تو ہوگی زندگانی — اتنو ہمیں موت بھی نہیں ہے

درس

درس منشی منی لال باشندۂ شاہجہانپور، منشی احسان علی احسان مرحوم شاعر نامور شاہجہانپوری کے تلامذہ میں سے تھے، بریلی کے مشاعرہ میں میں نے انھیں دیکھا تھا

۳۵، ۳۶ سال کی عمر اور یہ کلام کا نمونہ ہے ✤

ہزاروں میں کوئی بہتر کوئی لاکھوں میں اچھا ہے		مری آنکھوں میں ہیں لیکن تو خدائی بھر میں یکتا ہے
جہاں میں گو ہر اک بُت کو مسیحائی کا دعویٰ ہے		کرے مردے کو جو زندہ اُسی کا نام عیسیٰ ہے
مجھی سے ہے لگاوٹ بھی مجھی سے ہے تنفر بھی		مری نظروں میں رہتے ہیں مری آنکھوں سے پردا ہے
کسیکو ایک کی ہوگی ہمیں دونوں سے ہے اُلفت		خدا کی یاد ہے دل میں بتوں کا سر میں سودا ہے
طبیعت کو جو خوش آئے وہی بہتر سے ہے بہتر		جو آنکھوں میں سما جائے وہی اچھے سے اچھا ہے

درویش — درویش میر شاہ علی دہلوی آپ کو میر نظام الدین فخر شعرا سے تلمذ تھا، شاہ اللہ دیا کی اولاد میں تھے آخر عمر میں شعر گوئی سے توبہ کر لی تھی۔ شاہ عالم ثانی کے آخر عہد میں بعالم ضعیفی انتقال کیا ✤

درویش کو مجنوں بھی لکھا کرتا تھا عرضی	اِس مملکت عشق میں اُستاد سمجھ کر
ایک شب بیٹھے تھے جس گھر میں کبھی یار سے مل	روز روتے ہیں وہاں کے در و دیوار سے مل

درویش — درویش علی نام ولد خدا بخش سہارنپور، مہدی علی خاں صاحب ذکی کے تلامذہ میں ایک آزاد، شوریدہ سر، موزوں طبع شخص تھے، اور دنیوی کار و بار سے حد درجہ نفور، ریاست رامپور سے بصلۂ خدمتِ آبائی کچھ وظیفہ مقرر تھا اسی پر قناعت کر کے بیٹھ رہے مکان مذکورہ کا دروازہ بند کر کے تنہائی میں بسر اوقات کرتے تھے اور میل جول سے حتی الوسع گریز کرتے تھے۔ ۴۰ برس کے قریب گزرے چالیس سال کی عمر میں انتقال کیا، چند شعر بروقت ترتیب تذکرہ سہارنپور سے ایک مہربان نے بھیجے درج ذیل کیئے جاتے ہیں جن سے اُنکی خوش مذاقی کا کامل ثبوت ملتا ہے

پڑا جو سایۂ گیسو جھجک کے ساقی نے		یہ کہکے رکھدیا ساغر کہ ہے شراب میں سانپ
ہو کے قرباں میں کہا یار سے اے کافر کیش	بند	ہے یہ انصاف کہ ہیں لب پہ ہوں ہجر کے نیش
طاقت آہ بھی رکھتا نہیں اب یہ دلریش		ہنس دیا سُنکے ستمگر نے کہا اے درویش

ایسا ہی ہوتا ہے جب دل کہیں آ جاتا ہے

در پردۂ ستم ہمیہ وہ کر جاتے ہیں کیسے
گر کیجے گلہ صاف مکر جاتے ہیں کیسے
جب ہم سے موافق نہ ہو تقدیر ہماری
کیا عقدہ کشائی کرے تدبیر ہماری

دریا

دریا۔ پنڈت رتن ناتھ دریا خلف پنڈت امرناتھ شعلہ جو سبحان علی خان کنبو کے دیوان تھے۔ باشندہ لکھنؤ اور شاگرد میر اوسط علی رشک ہیں، زبان فارسی اور دری اُردو کی تحصیل عالمانہ درجے کی تھی اور بڑے زبردست ادیب اور محقق زبان تھے دس بارہ برس ہوئے پیرانہ سالی میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا، یہ چند شعر نتائج افکار کے ہاتھ آئے نذر کارگر درج تذکرہ کئے گئے ﴿

ہے گوشِ گل کی بالا کہ چراغ قمر کی لو
اللہ جانے دلکو لگی تھی کدھر کی لو
دریادلوں سے ڈرتے ہیں روشن ضمیر بھی
ٹھہرے کیوں نہ پانی میں شمع قمر کی لو
ذروانِ زخم پانی چراتے ہیں کیوں عبث
کم ہوویگی نہ آتشِ داغ جگر کی لو

حرص کہتے ہیں کسے خواہش دنیا کیا ہے
بے اجازت نہ مرے گھر میں ہوا بھی آئے

دریا

دریا۔ منشی سید محمد عباس ہیڈ کلرک کچہری کورٹ آف وارڈز متھرا، آجکل کے شعرا میں ہیں باوجود مکرر تحریروں کے حالات بہم نہ پہنچے ناچار کچھ اشعار درج کرنے پر اکتفا کیا گیا۔

کعبہ و دیر میں سنتے تھے مکان ہے انکا
پائی اِن سب سے مگر منزلِ جانانہ جُدا
دیکھئے کھینچتا ہے کون مجھے اے دریا
در مسجد ہے جُدا اور درِ میخانہ جُدا
میں تو اس طرزِ اس انداز کا دیوانہ ہوں
زلف بکھری ہے الگ چال ہے مستانہ جُدا
اللہ اللہ یہ ہے اعجاز خیالِ روی دوست
آپ اپنے پیرہن سے آرہی ہے بوئی دوست
ای خوشا قسمت نکلنے کو ہے اب ارمانِ قتل
حلق پر خنجر ہے سینہ ہے تہ زانوئی دوست
بن گئے تصویرِ حیرت چشم حیراں دیکھ کر
خود پریشاں ہو گئے مجکو پریشاں دیکھکر
تو جفائیں اور کرلے کچھ دنوں پر میرے بعد
ظلم سہنے کو ترے ای آسمان کوئی نہیں

ہو بھلا تیرا شب فرقت ایں غم ہے تو
جز ترے دم کے ہمارا مہرباں کوئی نہیں

ناتواں پاکر مجھے سب قافلہ راہی ہوا
ساتھ دے بیکس کا ایسا کارواں کوئی نہیں

حشر میں ہوگا مزا جب میں کہونگا اُن سے
کھینچے اب کچھ یہ ستم دیدہ بھی فریاد کرے

دل میں آنکھوں میں تجھے جلوہ نما دیکھا ہے
پھر بھی یہ شوق ہے کہتا ہوں کہاں دیکھا ہے

نہ کلیسا پہ ہے موقوف نہ کچھ کعبہ پر
ہر جگہ ہمنے تجھے جانِ جہاں دیکھا ہے

دقیق

دقیق۔ جناب میر واجد حسین صاحب وکیل ہائی کورٹ سرکار عالی نظام دکن شاید حضرت داغ سے اصلاح لیا کرتے تھے سنہ ۱۹۰۰ء کے مطبوعہ رسالوں سے کلام کا انتخاب حاضر ہے

حسرت ہی یہی زانوئے دلدار پہ نکلے
للہ ٹھہر جا کہیں اے جانِ حزیں اَور

بگڑے ہی سدا رہتے ہیں سفاک کے تیور
دل لیچکا رہتا ہے مگر درپئے کیں اَور

آلودۂ خوں ہو نہ کہیں آپکا دامن
جلدی سے لگا دیجیے اک ہاتھ کہیں اَور

گھبرائی ہوئی باتوں سے ہوتا ہے ظاہر
جاتے تھے کہیں اور چلے آئے کہیں اَور

یہ ظرف ہمارا ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے
ورنہ تری باتوں سے تو ہو دلکو یقیں اَور

دل

دل۔ شیخ محمد عابد متوطن عظیم آباد، اپنے زمانہ کے بے مثل اور بے نظیر عالم تھے، شیخ محمد روشن جوشش تخلص آپکے بڑے بھائی مشہور شاعر تھے، صاحب سراپا سخن کا قول ہے کہ آپ جسونت رائے ناگر کی اولاد میں تھے، غرضکہ آپ سنجیدہ اطوار، حمیدہ خصال اور طریقۂ یکرنگی میں بے مثل سمجھے جاتے تھے، یہ آپکے اشعار ہیں ✦

تیری زلفوں سے بہت دن ہی تقصیر ہوئی
نقد جاں لیجئے حاضر ہے گنہگاری دل

نالے ہی سدا بھر بھر دن عمر کے بھرتے ہیں
ہیں نزع میں ہم تجھ بن جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ
رہتا ہے مدام آب دیدہ

تمہارے در پہ جو درباں نے آستیں پکڑی
برنگِ نقشِ قدم ہمنے بھی زمیں پکڑی

دل

دل۔ منشی بینی پرشاد دل کایستھ متوطن عظیم آباد پٹنہ۔ مدت ہوئی کہ انتقال کیا۔ کچھ

متفرق کلام دستیاب ہوا اُس کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

پردہ اُٹھا کے تو نے ادھر کو گذر کیا	عالم کے دِل میں تیری محبت نے گھر کیا
نالہ و شور و فغاں، بیتابی ہمراہ ہیں	ہمتو کوچے سے ترے نکلے بڑے سامان لئے
اور روٹھ کے ہمسے جا نہ لے	مت رُوٹھ ہمیں گلے لگا لے
دل چاہتا ہے بولئے ہرگز نہ یار سے	پر بس نہیں چلے ہے دِل بیقرار سے

دل

دل- زور آور خاں باشندۂ علی گڈھ، تذکرہ مرسلۂ قاضی محمد خلیل سے ایک شعر قابل انتخاب نظر آیا۔ درج ذیل ہے، حال باوجود تلاش دستیاب نہوا۔

ساقی نے جو پلایا مجھے میں نے پی لیا	واعظ سب مجھے خبر ہے حرام و حلال کی

دل

دل- عالیجناب والاخطاب اشرف الحکما رنواب لقمان الدولہ فلاطون جنگ محمد حید جان دِل طبیب خاص مقرب باختصاص اعلیحضرت نظام الملک آصفجاہ والی دکن حضرت فصیح الملک بہادر داغ دہلوی کے تلمیذ رشید ہیں، انگریزی کا علم بھی اچھا ہے ڈاکٹری وجراحی سے اچھی طرح ماہر ہیں، خاص حیدر آباد کے باشندے ہیں، عمر ۵۰ برس کے قریب اور سٹاف سرجن ہیں، انکے والد حکیم محمد شرف صاحب حیدر آباد کے نامی طبیبوں میں تھے، مثنوی کا وعظ بہت اچھا بیان کرتے ہیں، صوفی مشرب ہیں، شعر و سخن کا بھی شوق ہے اور اس میں نواب فصیح الملک داغ مرحوم سے فیض پایا ہے۔

مثل نقش پا- برباد کیوں نشاں ہوتا	ہم نہ خاک میں ملتے، تو جو مہرباں ہوتا
افسانۂ گل قصۂ بلبل نہ سُنا اور	اٹھکھیلیاں کچھ اپنی دکھا باد صبا اور
اے شعلۂ سوزانِ دروں جی نہ جلا اور	اے رنج و غم و دردِ نہاں بس نہ ستا اور
اے گردنِ تسلیم و رضا سر کو جھکا اور	آے تیغ ستمگار پھر ایک وار لگا اور
اُس شوخ کی مہندی کا ہوا رنگ دوبالا	خونِ دلِ عشاق جو ہاتھوں میں ملا اور
اے خضر نہ ہادی ہو مرے راہ لو اپنی	اس منزل عشاق کا ہے راہ نما اور

ای ہمتِ مردانہ قدم میں نہو لغزش ای ابروے خمدار پھر اک تیغ نگاہ اور
مجروح ہوا، خستہ ہوا، پس گیا، آخر دِل جس سے زیادہ تھا سزاوار سزا اور

مسیحا کلمہ گو جسکے ہیں وہ گفتار کیسی ہے قیامت جسکی وارفتہ ہے، وہ رفتار کیسی ہے
شہیدِ غمزہ و ناز و ادا واقف نہ تھا پہلے کہ خنجر کیا ہے، کیسا تیر ہے، تلوار کیسی ہے
پریشاں زلف وا بندِ قبا مخمور ہیں آنکھیں کہاں سے آئے ہو، لغزش دمِ رفتار کیسی ہے
بھروسے تیری رحمت کے، سہارے تیری بخشش کے میرے جرم گنہ کی دھوم اے غفار کیسی ہے
تمہاری نرگسِ بیمار تو عینِ شفا ٹھیری مسیحائی کا دعوی اور خود بیمار کیسی ہے
سنبھل جاؤ کہیں اے حضرتِ دل راہ پر آؤ یہ رسوائی سرِ ہر کوچہ و بازار کیسی ہے

تڑپتے ہوئے چھوڑ کر غمزدوں کو کس آرام سے ہو گئے سونے والے
غم و، حسرت و، رنج، یاس و، تمنّا مری لاش پر رو گئے رونے والے
قرار و توانائی، تاب و، طاقت جُدا ہمسے سب ہو گئے ہونیوالے
دل سے وصلِ جاناں کی آرزو نہیں جاتی خاک ہو گئے لیکن جستجو نہیں جاتی

دل

دِل حکیم ضمیر حسن خان شاہجہانپوری۔ قوم کے پٹھان اور شاہ قاسم سلیمان کی اولاد میں ہیں، اگرچہ امیر مینائی کے شاگرد ہیں مگر خود اُساتذہ دہلی کے طرزِ تغزّل کے پیرو ہیں جس میں درد و اثر طرزِ بیان کی نفاست کے ساتھ شاعری کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ عربی فارسی کی استعداد معقول ہے، آجکل طبابت کا مشغلہ رہتا ہے اور کچھ زمینداری بھی ہے، دلی جذبات کے اظہار کو شاعری کا حسن سمجھتے ہیں ناول "دردِ دل" و "دلسوز" آپکی تصنیف سے ہیں نظرِ ثانی کے وقت بھی کچھ کلام موصول ہوا وہ بھی سابقہ انتخاب میں شامل کر کے درجِ تذکرہ کیا گیا۔ کلام کے ملاحظہ سے صاف مترشح ہے کہ فی الواقع انکا دعوی سچا ہے۔ شاعری کا سچا مذاق اِنکے ہر ایک شعر سے ظاہر ہے، اور کلام میں دلاویزی کے ساتھ بندش کی چستی، الفاظ کی برجستگی، خیالات کی نفاست اور بلندی قابلِ ستایش ہے،

بظاہر ہیں تو کہیں حضرت امیر کے تصرف کا نشان انکے کلام میں نظر نہیں آتا۔ غالباً ذاتی مطالعہ دواوین اساتذہ، فطری ذکاوت اور قابلیت انکے مذاقِ شاعری کے ممدو معاون ہوئے، ہر شعر پُرلطف اور بامزا سنجیدگی اور متانت سے معمور ہے۔

ہم اور سنگِ در ہے کسی دلنواز کا　　اللہ رے عروج جبینِ نیاز کا

کیا کیا کیئے سلوک پتنگوں سے شمع نے　　ایک ڈھیر تھا سحر کو شہیدانِ ناز کا

جس حال میں پڑا ہوں یونہیں کاش چھوڑ دے　　مجھ پر بڑا کرم ہو میرے چارہ ساز کا

عاشق کی آہ برقِ تجلی سے کم نہیں　　پردہ کہیں اُلٹ نہ دے اخفارِ راز کا

جب دل میں دردِ عشق اُٹھا ہم اچھل پڑے　　سمجھے کہ یہ کرم ہے کسی دلنواز کا

پہنچے تڑپ کے حضرتِ دل کوئے یار تک　　دردِ جگر نے کام کیا چارہ ساز کا

بیٹھا ہے یہاں دل کو دو عالم سے اُٹھا کے　　اب در سے ترے عاشقِ مضطر نہ اُٹھے گا

زور پر ہے ترا اُبھرا ہُوا جوبن کیسا　　دب گیا اُٹھتی جوانی سے لڑکپن کیسا

پردۂ چشم میں چھپی ہوئی بیٹھی ہے حیا　　کھیلتا ہے تری شوخی سے لڑکپن کیسا

اپنی قسمت ہی جو برگشتہ تو اے حضرتِ دل　　دوست بھی ہمکو بُرا کہتے ہیں دشمن کیسا

کیا کہوں کس آرزو کا خون ہو کر رہ گیا　　دل کی دل ہی میں رہی جب کھچ کے خنجر رہ گیا

نارسائی کا سبب کیا ہے؟ یہی شوقِ طلب　　بڑھ گئے ہم اسقدر آگے کہ رہبر رہ گیا

منزلِ مقصود پر پہنچا وہی آشفتہ حال　　آستانِ یار پر جو کھا کے ٹھوکر رہ گیا

دِل بھی مٹ جاتا تمنائیں اگر مٹنے کو تھیں　　رہنے والا کون ہے کسکے لئے گھر رہ گیا

جی ڈوب گیا جب یہ حقیقت ہوئی ظاہر　　جس بحر میں کشتی ہے وہ ساحل نہیں کھلتا

کہوں کیا حال اے ہمدم شبِ غم کی مصیبت کا　　یہ عالم تھا کہ اب نکلا، نہ نکلا پھر بھی دم میرا

مگر جمعیتِ خاطر ہے آرایش سے وابستہ　　کھُلے جب انکے گیسو کھُل گیا سارا بھرم میرا

شامِ شبِ جدائی جو تھا قلق فزا تھا　　تسکین دینے والا اک دردِ لادوا تھا

مقتل میں رنگ لائی آخر میری خموشی
محمل نشین کے دلمیں چبھتے تھے خار صحرا

ہر قطرہ خونِ دل کا اک شرح مدعا تھا
پیش نگاہ جبتک قیس برہنہ پا تھا

رنگ لایا ہے یہ ضبطِ الفتِ گیسوئے دوست — آخر اپنے پیرہن سے چھوٹ نکلی بوئے دوست
رہنما کی کیا ضرورت عشق کامل چاہیئے — دل جہاں تڑپے سمجھ لینا یہی ہے کوئے دوست
بیخودی میں کچھ نہیں معلوم کس عالم میں ہوں — ڈھونڈتی پھرتی ہے مجھکو نکہتِ گیسوئے دوست
طالع بیدار کیا کہنا خوشی ہے اور ہم — صبح کو اُٹھکر ہمیشہ دیکھتے ہیں روئے دوست
خیر کرنا آج یارب کیوں ہے دلکو اضطراب — گو وہی ہم ہیں وہی گھر ہے وہی پہلوئے دوست
تھک کے جب بیٹھے تو یہ کہکر تلاشِ دوست میں — اے دلِ حسرت زدہ وہ سامنے ہے کوئے دوست
یوں مٹے گا رنج فرقت کاٹ لیں ہم خود گلا — حضرتِ دل کون ہو منت کش بازوئے دوست

تن بر سرِ زمیں ہے دماغ آسمان پر — یعنی سرِ نیاز ہے اُس آستان پر
اقرار وصل اور پھر اُنکی زبان پر — سو جان سے نثار ہیں اپنے بیان پر
اقرارِ وصل کرکے مکرنے سے فائدہ — ہاں ہاں وہی کہو جو ابھی تھا زبان پر
ساقی کی چشم مست نے بیہوش کردیا — پینا خباب شیخ چلے آسمان پر
وعدہ خلاف، عہد شکن کون وہ کہ ہم — اچھا یہ فیصلہ ہے اُنھیں کی زبان پر
کمسن ہیں کیا ہو اُنکو میری حسرتوں کا پاس — انکارِ وصل کھیل رہا ہے زبان پر
ساقی ہمیں کو تشنہ لبی کا گلہ رہا — سب کچھ ہے اور کچھ نہیں تیری زبان پر
اُس بت کے بام تک جو پہنچتے تو لطف تھا — نالے مرے گئے تو کہاں آسمان پر
اے دل یہ آپ ہی کا جگر ہے کہ عشق میں — صدمے ہزار جھیل لیئے ایک جان پر

اُنکی آرایش سے رنگِ بیخودی پائینگے ہم — آئینہ دیکھیں گے وہ تصویر بن جائینگے ہم
اُنکا زانو زیرِ سر، پھر چارہ سازی کا خیال — ہوش میں آ چارہ گر اب ہوش میں آئینگے ہم
مجکو یہ غم سر نہیں تو عشق کا سودا نہیں — اُنکو یہ افسوس اب کسکی قسم کھائینگے ہم

کہتے ہیں چھپایا ہے مرا ناوکِ مژگاں
دل دیکھ کے وہ زخم جگر دیکھ رہے ہیں

دیکھو فریب زخمیِ تیغ نگاہ کا
قاتل سے کہہ رہا ہے کہ میں نیم جاں نہیں

مجھ سے کہاں چھپائیں گے دشمن کی چاہ کو
جو بات اُنکے دل میں ہے میری نظر میں ہے

کیا دیکھیں جامِ مے کی طرف ہم سے بادہ نوش
ساقی کی چشم مست ہماری نظر میں ہے

تنفر تجھکو کیا ہے مے سے زاہد
ہمیں بھی ایسی ہی نفرت کبھی تھی

ملا کے آنکھ جو اُس بت سے گفتگو کرتے
جناب خضر مسیحا کی جستجو کرتے

خرامِ ناز کا انداز یوں دکھاتا تھا
کہ دل کے داغ بھی ٹلنے کی آرزو کرتے

اُسے قلق ہے مرا حالِ غیر سن سن کر
یہ وقت تھا کہ کوئی فکر چارہ جو کرتے

نہیں علاج کے قابل مریضِ دردِ فراق
یہ سچ سہی مگر اپنی سی چارہ جو کرتے

بڑے ہیں نیک بڑے پاکباز حضرت دل
وہ چاہتے ہیں حسینوں سے گفتگو کرتے

خون کی ہر بوند میں جوش آجکل اک دل کا ہے
اِس بھروسہ پر ارادہ کوچۂ قاتل کا ہے

پاس رہکر یہ تکلف ساتھ رہکر یہ حجاب
میرے اُنکے فاصلہ گویا کئی منزل کا ہے

حسرتِ وصل اب کہاں باقی ہے بس یہ آرزو
کاش وہ کہدیں کہ تو مختار اپنے دل کا ہے

پیچھے پیچھے آرہی ہے ہائے ظالم کی صدا
آگے آگے اک جنازہ حسرتِ بسمل کا ہے

حضرتِ دل اک نیا سر ہر قدم پر چاہیئے
تشنۂ خوں ذرہ ذرہ کوچۂ قاتل کا ہے

دل ۔ سید احمد اللہ حیدرآبادی مسکن ۔ مولانا بیدل سہارنپوری کے شاگرد ہیں ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے اور اُس زمانہ میں نومشق تھے ۔ یہ کلام کا انتخاب ہے؎

دل

وہ سر نہیں جس میں کہ ہو سودا کسی کا
وہ دل نہیں جو دل نہ ہو دیوانہ کسی کا

جب دمِ قتل کہا جلوہ دکھا دو تو کہا
وعدۂ قتل تھا کچھ وعدۂ دیدار نہ تھا

خنجر چلا کے حلق پہ کہتے ہیں ناز سے
دیکھا نتیجہ تم نے حسینوں کی چاہ کا

عجب ہے یہ ہمارا چلبلا دل | جسے دیکھا اُسی کا ہو گیا دل

مست و مدہوش و دیوانہ تمھارے پیارے | پھرتے ہیں دشت میں کہتے ہوئے پیارے پیارے
قتل کیوں کرتا ہے بیجرم و خطا تو ہمکو | ہم تو پہلے ہی سے ہیں عشق کے مارے پیارے

دل۔ بابو سید احمد دل جعفری ساکن لاہور، کمالِ دہلی سے کلام نقل ہوا منشی وجاہت حسین وجاہت کے شاگرد ہیں ❊

عمر گذری ہے آہ و زاری میں | اُسکے دل پر اثر ذرا نہ ہوا
چاہنے والے تیرے ہیں لاکھوں | سچ یہ ہے دل سا دوسرا نہ ہوا

تعریف کیا کروں تری چشم سیاہ کی | بے چین کردیا اُسے جس پر نگاہ کی

دل۔ منشی محمد علی حسین خان دل، نوجوان، خوشخو، استعدادِ علم معقول، نوشت وخواند میں مایقری محاورت رکھتے ہیں، حضرت ظہیر کے شاگرد رشید، صاحبزادہ احمد سعید خان عاشق کے شاگرد ہیں۔ یہ چند شعر اُنکے طبعزاد ہیں۔

دشمن سے ملو شوق سے اچھا کوئی دن اَور | تم دیکھو ذرا اس کا تماشا کوئی دن اَور
بیماری اُلفت سے میں ناحق ہوا اچھا | آتا تو عیادت کو مسیحا کوئی دن اور
روکا ہے دلِ زار کو یہ دیکے تسلّی | کم بخت ذرا ٹھہر خدا را کوئی دن اور
وہ غیر تھا چھوڑا اُسے اچھا کیا لیکن | اس دل پہ تو رکھنا تھا اجارہ کوئی دن اَور

دل۔ منشی سید علی حیدر کنتوری۔ لکھنؤ میں بھی اکثر رہنے کا اتفاق ہوتا ہے نوجوان شخص ہیں آجکل کے موزوں طبع خوش فکر کہنے والوں میں ہیں اور معیار کی کمیٹی کی ہم طرح غزلیں کہتے ہیں جو کلام بروقت نظر ثانی ہاتھ لگا اُس کا انتخاب تحریر میں آیا ❊

سب کہتے ہیں گو کعبہ کو یہ خانۂ حق ہے | اللہ رے دل کوئی منزل نہیں رکھتا
حشر کے ہونے سے منظور ہے دیدار ترا | کسکو منظور ہے انصاف کا خواہاں ہونا
جوشِ وحشت کی خبر دیتا ہے دیوانوں کو | آپ سے آپ مرا چاک گریباں ہونا

سنبھل اے دل نہ وصلِ یار کی شادی سے مرجانا	بُرا ہوتا ہے ہر اک بات کا حد سے گذر جانا
تری فرقت کا رنج و غم اُٹھایا تا دمِ آخر	نشاطِ وصل کیا شے ہے نہ ہنسے عمر بھر جانا
جس کے سبب یگانہ و بیگانہ چھٹ گیا۔	افسوس پھر بھی مجھ سے وہ جانانہ چھٹ گیا
رہتا ہے وحشی ترا اُس وادیئے پرہول میں	رُوحِ مجنوں کانپتی ہے جو بیاباں دیکھ کر
اُن پہ بھی جنگل کی تصویریں نظر آنے لگیں	یہ بڑھی وحشت در و دیوارِ زنداں دیکھ کر
ہونگے محوِ شادی و غم وہ ہماری لاش پر	ہنستے جائینگے کف افسوس ملتے جائینگے

دل

دل۔ جناب مرزا بہادر محمد جعفر علی خاں خلف اکبر نواب مرزا محمد عباس علی خاں بہادر جگر مرحوم سابق ڈپٹی کمشنر و رئیس اعظم و جاگیردار لکھنؤ آبائی ریاست کے علاوہ فن سخن بھی میراث ملا ہے، تیس پینتس ۳۵ برس کی عمر اور ذکی و طباع نوجوان ہیں ہنگام ترتیب تذکرہ حالات اور کلام منگائے مگر جواب آنیکے باوصف مطلب برآری نہیں ہوئی

تیر نگاہِ ناز ہوئے دونوں کارگر	اِک دل میں چُبھ گیا ہے مرے اِک جگر میں ہے
صبح شبِ وصال ہے یا صبحِ حشر ہے	ای دل کچھ آج اور ہی رنگ اس سحر میں ہے

دل

دل۔ خواجہ دل محمد ایم اے ابن خواجہ نظام الدین مولد و مسکن لاہور تاریخ ولادت ۹ فروری ۱۸۸۷ء علوم عربیہ اور تعلیم رائج الوقت حاصل کر کے ایک کامیاب طالبعلمانہ زندگی کے بعد ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے امتحان ایم اے مضمون ریاضیات میں پاس کیا اور اُس وقت سے اسلامیہ کالج لاہور میں سینیر پروفیسر ریاضیات کی خدمات انجام دیتے ہیں آپ کی طبیعت کو ادب اور فلسفہ کی طرف شروع ہی سے ایک لگاؤ ہے، اور شعر و اشعار کی طرف میلان لڑکپن کے زمانے سے ہی، غزل بہت کم لکھتے ہیں، نیچرل مضامین اور قومی یا ملکی نظمیں زیادہ تر لکھی ہیں، شعر و اشعار کے متعلق کسی خاص استاد سے تلمذ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ زور طبیعت سے خود ہی جو آیا لکھا ہے، نمونۃً تھوڑا سا کلام ہدیۂ ناظرین کرام ہے

لذتِ دیدار سے مجلس ہے سب سرشار آج	عکس مے سے کم نہیں ہے عکس روئے یار آج

نوکِ خامہ شوق سے منقارِ بلبل بن گئی ✤ ہے صریرِ خامہ گرمِ لذتِ گفتار آج

نرگسِ مخمور کا ساغر بنانا چاہیئے ✤ تاکہ محفل ہووے مستِ شربتِ دیدار آج

دیدۂ احباب روشن ہیں ستاروں کی طرح ✤ ہوگئی ہے چشمِ اعدا کی مگر بیمار آج

کیا عجب فرصت کے باعث گرمِ رقصِ ناز ہو ✤ لوٹی گردونگی صورت چرخ کجرفتار آج

گو نہاں آنکھوں سے وہ دو تین سالوں تک رہے ✤ رل گیا آخر کو خط دید آخرکار آج

جو فدا اوروں پہ ہو کیونکر نہ قدر اُسکی کریں ✤ چاہیئے بلبل کو پہناویں گلوں کا ہار آج ✤

حمد باری

وہ خالق سزاوار تحمید ہے ✤ صریرِ قلم جسکی تمجید ہے

قلم سے ہوئے جسکے سب آشکار ✤ جہاں کے نگارش کدہ کی بہار

اُسی سے عیاں نقش سارے ہوئے ✤ جو چھڑکا قلم تو ستارے ہوئے

یہ سورج دیا جو خدائی کا ہے ✤ یہ دھبّا سا اک روشنائی کا ہے

یہ جاذب کا کاغذ ہے یا آسماں ✤ یہ مشقِ شکستہ ہے یا کہکشاں

یہ قوسِ قزح جو نمودار ہے ✤ یہ آدھا سا اک خطِ پرکار ہے

نہ کیوں اسکے کاموں میں ہو عقل دنگ ✤ ہیں اک خط کے اندر بھرے ہفت رنگ

درخشاں ہیں چرخ پر ماہتاب ✤ کھلی سورۂ نور کی ہے کتاب

شعاعیں ہیں مسطر لگائے ہوئے ✤ طلاکار جدول بنائے ہوئے

کریں تاکہ قدرت کو اُسکی رقم ✤ ہیں پتے ورق اور شاخیں قلم

نظر کیجیے سطحِ تالاب پر ✤ لکھی نظم ہے صفحۂ آب پر

جو جاری کوئی باغ میں نہر ہے ✤ تو اک شعر گویا ہر اک لہر ہے

سنو شورِ قمری فصاحت ہے یہ ✤ قدِ سرو دیکھو بلاغت ہے یہ

جو نور اُسنے چشمِ بشر میں دیا ✤ بتِ خاک کو چرخ پیما کیا

عجب اُسکی ہر شے بنائی ہوئی ✤ ہے تل میں خدائی سمائی ہوئی

ترے منہ میں باقی ہے جبتک زبان ✤ کر اے دل تو تحمید خلاق جان

اے کارواں وہ وقتِ طلوعِ سحر ہوا
طیار آفتاب اُٹھائے سپر ہوا
پرچم بلند صبح کا با کر و فر ہوا
کیا شہسوار تیز عناں ہمسفر ہوا

ہمراہِ آفتاب درخشاں بڑھے چلو!

ہمت ہو جنکے پاس کریں صبر کس طرح
ہو طبع آتشیں پہ روا جبر کس طرح
اِس رہگذر میں کھو دیں وہ قبر کس طرح
اُٹھیں نہ ابخرے تو بنے ابر کس طرح

جوں دودِ آب اُٹھ کے مرجاں بڑھے چلو!

چرخ و نجوم و مشتری و زہرہ و قمر
اپنی زمیں سمجھتے تھے ساکن جسے بشر
سب ہی اپنی راہ میں بڑھتے ہیں سال بھر
کہتے ہیں وہ بھی چلتی ہے اپنے محیط پر

تم بھی بشکلِ گیتی دوراں بڑھے چلو!

نورجہاں کے مرقد پر جو راوی کے کنارے کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہے دو حرف عبرت کہے ہیں

ہاں اے لبِ راوی بتا۔ کچھ رفتگاں کا ماجرا
ہے اب کہاں نورجہاں حور جہاں عصمت کی جان
کل تجھ پہ جن کا راج تھا۔ انجام اُنکا کیا ہوا؟
وہ بلبلِ شیریں زباں۔ وہ قمری ہندوستاں

تیرے کنارے ہی پڑا ٹوٹا سا جس کا آشیاں
عبرت نشاں، عبرت نشاں،

شوکت تھی جسکی پاسباں۔ چاکر سے تھے جاہ و حشم
خیل و خدم ناز و نعم، رخت و خیم طبل و علم
تھی بحر و بر کی سب سپہ۔ حاضر لیے تیغ دو دم
افسوس رکھے رہ گئے، خود چل دیئے سوئے عدم

عالم میں ہے کسکو بقا؟ نامِ بقا کسنے لیا
قصرِ فنا ہے آسماں

آئی کہاں سے موت تو، ایوانِ شاہی میں بھلا
ہاں پر تری پرواز کا، آیا نہیں اُن کو نظر
اُڑ جاتی ہے جیسے مگس، گل سے عسل کو کھینچ کر
کیا پاسباں حاضر نہ تھے، جو روکتے تیرا گذر
یوں کھینچ کر لیجاتی ہے، انساں سے اسکی روح کو
یا ہنس ہو جیسے ہوا ڈنٹھل سے ریشہ کھینچ کر

رہتا ہی باقی بر زمیں۔ افسردہ گل بے رنگ بیں
بے جان جسمِ ناتواں

تضحیک چرخ پر جفا، دیکھو عیاں ہے برملا
ہے جس جگہ وہ مہ لقا، جالا ہی مکڑی نے تنا

تا سائباں کا کام دے، بیگم کے شاہی تاج پر
یا چر رہی ہیں بکریاں، یا بوم کا ہے آشیاں
دو چار باقی پیڑ ہیں، یا ٹھیکیوں کے ڈھیر ہیں
شاہی شکوہ و عز و شاں، اڑ جاتے ہیں شبنم صفت

باقی نہیں رہتا نشاں

دنیا نے گو چھوڑا مگر، خدمت میں ہی نیچر ابھی
وہ بیگم زہرہ جبیں - مرقد سے باہر آن کر
حالت نہ پوچھو راہ کی، آنسو نکلتے جاتے ہیں
دیتی ہی پہرا رات بھر، تربت پہ اسکی چاندنی
اور لیکے مشعل ماہ کی، جاتی ہی جانب شاہ کی
اور پھول کھلتے جاتے ہیں، جب بچھڑے ملتے جاتے ہیں

ہوتا غضب کا ہی سماں

اور جب اندھیری رات ہو، تربت ہی سکو بھاتی ہی
دیتا ہے جگنو ٹمٹما، گورِ غریباں پر دیا
پتے سِسک رہجاتے ہیں، آتی ہی جب ٹھنڈی ہوا
عبرت نگاہی چاہیئے، انجام ہے یہ بیگیاں
شبنم کہیں آ جاتی ہی، موتی کا سہرا لاتی ہے
شاخیں بڑھا کر ہاتھ کو، پڑھتی ہیں گویا فاتحا
حیرت کا بھی دھڑکے ہی دل، ہاں دیکھ کر ایسا سما
گو اس میں ہو شاہِ جہاں یا بادشاہِ ہندوستاں

ہوتا ہے تربت میں نہاں

صریرِ کلک سے کیوں کر ادا ہو داستاں میری
ہیں آوازِ جرس ہوں ہر گھڑی فریاد کرتا ہوں
تغافلہائے ساقی کا گلہ کیجے تو کس منہ سے
میں حسنِ معنیِ صرفِ انا الحق کی نزاکت ہوں
سبق لیتا ہوں استادِ ازل سے میں فصاحت کا
میں حیرت بھی ہوں آئینہ بھی ہوں محوِ تماشا بھی
یہ نے لائے کہاں سے دردِ دل میرا زباں میری
جگا دے کارواں کو خواب سے شاید فغاں میری
گرا دی ایک لغزش سے شرابِ ارغواں میری
نہیں سمجھا نہیں سمجھا حقیقت کو جہاں میری
نوا ہے طائرِ سدرہ ہے یا طرزِ بیاں میری
شرر بھی، سوزِ دل بھی طور بھی برقِ تجلی بھی

دل - شیخ ممتاز علی ابن شیخ شجاعت علی ضلع بارہ بنکی کچھ دن آپکو حضرت دبیر سے تلمذ رہا ہی پھر منشی فضل رسول خان واسطی اور جناب قدر بلگرامی سے مشورہ کرتے رہے تعلقہ داری حقول ہی امیرانہ بسر کرتے ہیں ۱۹۰۰ء میں ۵۴ برس کی عمر تھی

الاماں اسکی ڈھٹائی کچھ کہی جاتی نہیں
چاہنے والوں سے بھی وہ آنکھ شرماتی نہیں

عطر آگئیں آپکی پوشاک سے گلزار میں	نگہتِ گل ہوش میں وہ دوپہر آتی نہیں
چشم بد دُور آپ کی حاضر جوابی کی ہے دھوم	کونسی پھبتی ہے وہ ایسی کہ چھا جاتی نہیں
سُرخ غصّہ سے ہی چہرہ کہہ رہے ہیں جوش سے	چومنے تلووں کو میرے کیوں حنا آتی نہیں
ہوش ہیں کیا خاک آئیں آپکے آشفتہ دل	اب صبا بھی بوئے زلفِ عنبریں لاتی نہیں

دل — منشی محمد حسین قصبہ بسواں ضلع سیتاپور کے باشندے اور جگر کے شاگرد ہیں کلچیں سنہ ۹۹ھ سے کلام منتخب ہوا۔

کوئی کیونکر سنبھالے اِس دلِ بیتاب کو جسمیں	کھٹک ہو، درد ہو، ایذا ہو، بیتابی ہو حسرت ہو
ہماری خاک شاید تیرے دامن تک پہنچ جائے	پسِ مردن تمنا ہے ترے کوچہ میں تربت ہو
چھڑکدے میرے زخموں پر نمک ہنس ہنس کے او قاتل	وہ راحت ہے مجھے جو تیری ہاتھوں سے اذیت ہو

وہ پہلو میں ہیں تو بھی دل ہے بیچین	نہوں پہلو میں تو کیونکر بسر ہو
کسی کے غمزہ و نازو ادا پر	تصدق جان ہو صدقے جگر ہو

دلاور — منشی سید دلاور علی ولد سید قاسم علی شاگرد حضرت داغ۔ ترتیب تذکرہ انتخاب یادگار امیر مینائی کے ہنگام میں ریاستِ رامپور میں ملازم تھے اور بڑے ذکی الطبع اور فہیم کہنے والے تھے سنہ ۱۲۳۸ھ سال ولادت ہے، مذاق سخن سلیم تھا سنہ ۱۲۹۰ھ میں ۲۵ سال کی عمر تھی۔ باوجود کوشش کے حالات معلوم نہ ہوسکے نہ کلام ہی ملا۔

کی جو شکایت تو یہ پایا جواب	آتے ہی کیوں ہو جو ستاتے ہیں ہم
قبر پر فاتحہ کے حیلے سے	گالیاں کچھ سنانے آتے ہیں
عبث بیتاب ہوکر بیقرار ہوتے ہیں کہا ایدل	جگایا کیا اُسے تو نے اُٹھایا شور محشر کو
تم دور رہو اور یہ بے چین نہو جائے	اپنا سا سمجھتے ہو مری جان مرے دل کو
منہ لگائیں غیر کو اتنا دماغ اُنکو کہاں	چھیڑ تھی یہ بھی فقط میرے جلانے کے لیئے

دلاور — محمد دلاور حسین خاں باشندہ موضع اسگا چاند پور۔ جناب تشنہ بلند شہری سے

اصلاح لی ہے اٹھارہ بیس برس کی مشق سخن ہے۔ کلام میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں پائی جاتی۔ استعداد علمی بھی رسمی معلوم ہوتی ہے۔

کروں میں اُنکو رسوا دعویٔ خون کرکے محشر میں	دلاور میرے دل سے یہ گوارا ہو نہیں سکتا
نہ ہوگی سرد یہ گرمی اُلفت خاک ڈالے سے	رہیگی سوزش دل مضطرب زیر زمیں برسوں
نکلتے ہمنے دیکھے ہیں بہت ارمان غیروں کے	ہماری حسرتیں خوں ہوکے بھی دلمیں رہیں برسوں
خیالِ ہمسری ہے تو کرے کسبِ ضیا پہلے	یہ نو عارض انور سے تیرے مہ جبیں برسوں
قدرداں دل کا خریدار دلاور ہو اگر	مفت اس جنس گرانمایہ کو ہم دیتے ہیں
اگر اُس فتنہ گر کی دل کو اُلفت ہونیوالی ہے	تو اُلفت کیا ہے اک خاصی مصیبت ہونیوالی ہے
عدو کو بھیجنے والے ہیں وہ رسم عیادت میں	ہمارے مارنے کی اب یہ حکمت ہونیوالی ہے
ذرا ہشیار ہو کر آئینہ پیشِ نظر رکھنا	مقابل دیکھ کر خود تم کو حیرت ہونیوالی ہے
لئے جاتا ہے اُسکا شوق ہی خود اُسکو مقتل میں	تمہارے ہاتھ سے جسکی شہادت ہونیوالی ہے
ہنوز آغازِ الفت تھا کہ دلکو ہاتھ سے کھویا	خدا جانے ابھی کیا اور حالت ہونیوالی ہے

دلاور

دلاور - نواب دلاور حسین خان لکھنوی شاگرد منظہر آغا منظہر مرحوم

ثنائے رُخ میں وہ رنگیں ہے داستاں میری	ملی نہ بلبل شیراز کو زباں میری
یہ تیغ حسن کا ہے زخم بے خرد جراح	جسے کہ داغ ہے سمجھا وہی ہے جاں میری
نکل بھی جانے دے مجھکو کہ ہو تجھے بھی قرار	تڑپ تڑپ کے یہ کہتی ہے دل سے جاں میری

دلخونش

دلخونش - لالہ بہادر سنگھ کھتری، راجہ خوشحال رائے دہلوی امیر عہد اکبر شاہ ثانی کے پوتے اور غدر کے بعد [illegible]ء تک حیات تھے سرائے دادا کا کٹرہ ابتک مشہور ہے ۔

ہوں ترے ہجر میں جوں دیدۂ نرگس حیران	چشم پوشی نہ کر آ اپنے گنہگار سے مل

دلریش

دلریش - منشی اجل بہاری لال صاحب مختار عدالت علیگڈھ آپ کو علیگڈھ کے نامور شاعر منشی بنواری لال صاحب شعلہ سے تلمذ ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں ۔

رہا ہے کب کوئی دنیا میں دم بھر شادماں ہوکر	ملا ہے کب کسیکو چین دم بھر شادماں ہوکر
حقیقی عشق کی عشق مجازی پہلی منزل ہے	چلو سوئے خدا اے زاہد و کوئے بتاں ہوکر
یہی دل ریش حسرت ہے یہی دل کی تمنا ہے	کہ گذرے عمر باقی خادم ہندوستاں ہوکر

دلسوز

دلسوز۔ خیراتی خان دلسوز، قوم کے افغان باشندۂ علیگڈھ شاہ نصیر مرحوم کے شاگرد اور نواب ظفریاب خان خلف بیگم سمرو کی رفاقت میں تھے ۱۲۵۰ھ کے قریب جیپور میں انتقال کیا، شراب بہت پیتے تھے، مزاج میں شوخی و ظرافت بدرجۂ انتہا تھی، پرانے تذکروں سے کلام منتخب ہوکر درج ہوا۔

ارادہ پائے بوسی کا تھا اے بیداد گر اپنا	گرا قدموں ہی پر تیرے کٹا جس وقت سر اپنا
جگر فراق کے صدموں سے لالہ زار رہا	یہاں خزاں میں سدا موسم بہار رہا

ق

وہ تو کہتے ہیں راز دل اپنا	مت کسی اپنے یار سے کہنا
اور یہاں دل کی بیقراری سے	روز دو تین چار سے کہنا
رات تم اس طرف جو آن پھرے	دن مرے کچھ تو مری جان پھرے
سب سہیں گے ہم اگر لاکھ برائی ہوگی	پر کہیں آنکھ لڑائی تو لڑائی ہوگی

دلشاد

دلشاد۔ خلیفہ عبدالرحمن دلشاد باشندۂ خورجہ، منشی فائق ساکن ہاپڑ سے اصلاح لیتے ہیں دس بارہ برس کی مشق بھی ہے۔

نوبت ترے بیمار کی پہنچی ہے یہاں تک	جو دیکھنے آتا ہے تو دیکھا نہیں جاتا
لے جلد خبر آکے مری عیسیٰ دوراں	بیمار محبت سے اب اٹھا نہیں جاتا

دلگیر

دلگیر۔ منشی چھنولال کایستھ سکسینہ باشندۂ لکھنؤ۔ ایام جوانی میں طرب تخلص کرتے تھے اور غزل میں بھی یہی تخلص لاتے رہے، اوائل شباب میں بڑے رندانہ منش اور رنگین مزاج تھے چنانچہ اسی لاؤبالی عالم میں مذہب آبائی کو ترک کرکے مسلمان ہوگئے اور غزل گوئی کی بجائے مرثیہ کہنا شروع کیا، اور چونکہ صاحب استعداد تھے اس میں اچھا نام پایا شروع میں مرزا

خانی نوازش سے تلمذ تھا، پھر شیخ ناسخ کی خدمت میں آئے۔ مراثی کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔ یہ
خلیق اور فصیح انکے ہمعصر تھے، نواب سعادت علی خان اور غازی الدین حیدر کے زمانے
کے مرثیہ گویوں کے سرتاج سمجھے جاتے تھے جب میر انیس نے مرثیہ کہنا شروع کیا ہے تو انکا عالم ضعیفی تھا

معطر اسکے نہانے سے یکہ آب ہوا	حباب بھر ہر ایک شیشہ گلاب ہوا
کسکو دکھاؤں میں یہ بھلا ماجرائے چشم باتیں تری سنا کریں اور دیکھیں تیری شکل آئے طرب تراجو وہ خوش چشم باغ میں	ناسور بن گئے ہیں عزیزو بجائے چشم دارُوئے گوش یہ ہے تو وہ مدعائے چشم نرگس کے دستے کیجیو تو بھی فدائے چشم

دلگیر

دلگیر۔ ناثر بے نظیر سخنور خوش تقریر شاہ سید نظام الدین دلگیر اکبرآبادی۔ آپکے والد سید عبدالقادر شاہ صاحب قیصر اکبرآباد کے شرفاء روساء میں سے تھے جنکا سلسلۂ نسب حضرت سید عبدالقادر شاہ بغدادی تک پہنچتا ہے جو بغداد سے عَلَم خلافت سیّد عبدالقادر جیلانی لیکر ہندوستان میں آئے۔ یہ عَلَم دوسیر سونے کا ہے اور شاہ دلگیر اب بھی گیارہویں کو اسے اپنی درگاہ میں استادہ کرتے ہیں، شاہ دلگیر کے پردادا سیّد منور علی شاہ جو صاحب عَلَم کے پوتے تھے آخر اٹھارھویں صدی میں جب آگرہ میں مرہٹوں کی عملداری تھی صاحب کرامات مشہور ہوئے۔ نقل ہے کہ مہاراجہ سیندھیا کی ایک لڑکی جو عرصہ سے سخت بیمار تھی شاہ صاحب کی دعا سے بالکل تندرست ہوگئی اسکے صلہ میں مہاراجہ سیندھیا نے بطور شکریہ کئی گانو شاہ صاحب کو بطور معافی عطا کیئے۔ حضرت دلگیر کے والد اور دادا لاٹ صاحب کے درباری بھی رہے۔ شاہ دلگیر کی ولادت ۲۳ فروری ۱۸۵۳ء مطابق ۱۴ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو آگرہ میں میوا کڑے کے محلہ میں ہوئی ابھی چودہ برس کی عمر ہونے پائی تھی کہ خاندانی تنازعوں کے باعث باضابطہ تعلیم کا سلسلہ مسدود ہوگیا تاہم ذاتی شوق مطالعہ کی بدولت فارسی اردو کا مذاق اعلی درجے کا ہے اور انگریزی میں بھی فی الجملہ مہارت حاصل کرلی ہے عربی سے بقدر ضرورت

واقف ہیں، نثر طرازی اور شعر گوئی کا مذاق بچپن سے رفیق رہا۔ چنانچہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر سے برابر مختلف رسالوں اور اخباروں میں مضامین لکھتے رہے کچھ عرصہ آگرہ اخبار اور مفید عام کی ایڈیٹری کے فرائض بھی انجام دیئے فن شعر میں باوجود نغز گوئی اور شیریں گفتاری حیرت ہی کہ آپنے کسی سے باضابطہ طور پر صلاح نہیں لی پڑھنے کا انداز دلکش اور موثر ہے سنہ ۱۹۰۹ء میں دہلی کے کئی مشاعروں میں تشریف لائے اور اپنے دلپذیر کلام سے شائقین کی سامعہ نوازی کی اُس زمانے سے مؤلفِ تذکرہ سے مراسم اتحاد قائم ہوئے جو بفضلہ قائم ہیں۔

دورِ موجودہ کے انشاپردازوں کے زمرہ میں ہماری رائے میں شاہ دلگیر کا پایہ صفِ دوم کے صدر نشینوں میں سمجھنا چاہیئے۔ آپکا تخیل ایک عجیب جدت و لطافت کا پہلو لیئے ہوئے ہے۔ آمد۔ اور اس میں جا بجا انسانی جذبات اور مناظرِ قدرت کے دلفریب نمونے ایسی سلیس و شستہ زبان میں ملتے ہیں کہ خواہ مخواہ انسان تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب شروع سنہ ۱۹۱۳ء سے شاہ صاحب نے ایک رسالہ نظم و نثر موسومہ "نقاد" آگرہ سے شائع کرنا شروع کیا ہے جسکی گو ابھی پوری دو برس کی بھی عمر نہیں ہوئی تاہم وہ موجودہ رسالوں میں نہایت وقیع اور ممتاز سمجھا جاتا ہے اور اُمید ہی کہ اگر شاہ صاحب کی توجہ استقلال کے ساتھ اسکی ترتیب و تہذیب کی طرف منعطف رہی تو یہ رسالہ ادب اُردو کی خدمت کا ایک قابل قدر ذریعہ ثابت ہوگا۔ آپکے اشعار میں نزاکت وجدت خیال۔ تلاش مضمون، مناسب الفاظ۔ شستگی روزمرہ و طرز ادائے بیان الغرض جملہ خوبیاں موجود ہیں۔ پڑھیئے اور لطف اٹھایئے

کیوں نہ دھوکا ہو دہکتے ہوے انگاروں کا	شعلۂ طور ہے جلوہ ترے رخساروں کا
سایۂ دامنِ رحمت میں ہیں عاصی زاہد	دیکھ کیا حشر میں رتبہ ہے گنہگاروں کا
جل اُٹھا آتشِ دل سے مری ہر سنگِ مزار	ڈھیر ہے بعد فنا قبر پہ انگاروں کا
ہار پھولوں کے لیئے پھرتی ہیں حورانِ جناں	آج فردوس میں میلہ ہے گنہگاروں کا

ترے آنے کی خبر جب کبھی مل جاتی ہے / موت منہ دیکھ کے رہ جاتی ہے بیماروں کا
انھیں دونوں سے الٰہی رہے زنداں آباد / غل ہو زنجیر کا نالہ ہو گرفتاروں کا
قصر جنت پہ بھی دیوانوں نے لاتیں ماریں / آگیا یاد جو سایہ تری دیواروں کا ❊

وہ میرا گھر سمجھ کر خانۂ دشمن سے پھر آئے / مرا مطلب نکل آیا بھلا ہو بدگمانی کا
کیے سیراب زخم اے تیغ قاتل آب پیکاں سے / طریقہ تو نے مہمانی میں برتا میزبانی کا
جنابِ خضر سے کہہ دو عبث جینے پہ مرتے ہو / نہ ہو کھٹکا اجل کا تو مزہ کیا زندگانی کا
مئے کہنہ کہاں ہے حضرتِ زاہد وہ آپہنچے / نئے مہمان کو دے ساقی کوئی ساغر پرانی کا
گلے پر میرے خنجر رکھ کے پھر کچھ فکر کرتے ہیں / نتیجہ دیکھیے ہوتا ہے کیا تجویز ثانی کا
چلا ہے نجد کی جانب جو کھنچ کر ناقۂ لیلیٰ / غبارِ قیس کو عہدہ ملا ہے پاسبانی کا
غزل میری نہ تھی دلگیر کچھ توصیف کے قابل / مگر مشکور ہوں اہلِ سخن کی قدردانی کا

ہر طرف جاتی ہیں نظریں تری ترچھی ہو کر / کبھی سیکھے ہی نہیں تیر یہ سیدھا جانا
بند ہوتا ہی نہیں ملکِ عدم کا رستہ / رات دن رہتا ہے جاری یہی آنا جانا
کیا قیامت ہیں ادائیں انکی / دیکھکر مجھکو کن انکھیوں سے وہ شرما جانا
بتکدے دوڑ کے پہنچے کبھی کعبہ کو گئے / آج تک ہمنے ترے گھر کا نہ رستہ جانا
دم آخر ہے ٹھہر جاؤ میری بالیں پر / ابھی آئے ہو، ابھی جاؤگے، جانا جانا
وہ سمجھتے نہیں کچھ بھی یہ سمجھ ہے انکی / کہ مجھے غیر کیا غیر کو اپنا جانا
پہنچے دلگیر وہاں سنکے حسینوں کا ہجوم / عرصۂ حشر کو بھی کیا کوئی میلا جانا

میں لحد میں بھی جو یادِ روئے انور میں رہا / کیا چمک کر نام لوحِ سنگ مرمر میں رہا
جیتے جی تھا چرخ دشمن بعد مردن ہے زمیں / جب بھی میں گردش میں تھا اور اب بھی چکر میں رہا
مجھ سے رخصت ہو کے پیری میں مرا عہدِ شباب / بنکے حسنِ شاعری شعروں کے تیور میں رہا
چین سے آکر جو بیٹھا پھر نہ نکلا حشر تک / تیر اُنکا بن کے ارمان قلب مضطر میں رہا

خانۂ دل کیوں نہو زاہد حسینوں کا مکاں / گھر بتوں کا مدتوں اللہ کے گھر میں رہا
چین کچھ ایسا دیا کنج لحد نے بعدِ مرگ / قبر میں جا کر بھی میں آغوشِ مادر میں رہا
جستجوئے یار نے مجکو پھرایا دربدر / میں نہ مسجد میں نہ کعبہ میں نہ مندر میں رہا
آتشِ عشقِ بتاں سے کوئی کیوں کر بچ رہے / یہ وہ شعلہ ہے شرر بنکر جو پتھر میں رہا
چشم حیرت بن کے نکلا یہ رہا ہر ایک شکل / حشر تک محو آئینہ۔ یادِ سکندر میں رہا

مرنیوالوں کے لیے خنجر بُراں کسکا / راستہ دیکھتی ہے ہمت مرداں کسکا
پہلوئے غیر میں چین سے سونیوالے / چاک ہے مثلِ سحر۔ دیکھ گریباں کسکا
دل سا پروردہ آغوش ہو جب اُنکی طرف / پھر بھلا اور بھروسا کرے انساں کسکا
دہنِ زخم کی نیت نہیں بھرنے والی / چاہیئے کانِ نمک، مجکو نمکداں کسکا
عہد یہ ہے کہ کبھی خود نہ پئیں گے زاہد / کوئی گلرنگ دے پیمانہ تو پیماں کسکا

لدا ہوا ہوں داغوں کے پھولوں سے لالہ زار ہوں میں / خزاں کی بھی ہے جھلک جسمیں وہ بہار ہوں میں
مری جگہ ہے ہر اک دِل میں خاکسار ہوں میں / کیا گھر آنکھ میں دشمن کی وہ غبار ہوں میں
غضب کا شوخ ہے دیکھو تمہارا تیز نگاہ / یہ تاک ہے کہ کسی کے جگر کے پار ہوں میں
اِسی طرح سے نکل جائے حسرتِ پابوس / سرِ مزار ہو تم اور تہِ مزار ہوں میں
اُگا ہوں خاک سے میں بعدِ مرگ گل بن کر / جو دسترس ہو تو تیرے گلے کا ہار ہوں میں
جو ہُوں تو کچھ نہیں، ہوتا مرا نہونا ہے / کسی کے وعدۂ فردا کا اعتبار ہوں میں
سرِ محشر تری تیغِ ادا کا کیوں نہ بسمل ہوں / ترا ہنس ہنس کے یہ کہنا کہ ہاں بسمل کا قاتل ہوں
مری اِس بیخودی پر کیوں نہ آکر ہوش صدقے ہو / نہیں غفلت میں پہچانا وہ بیخود ہوں وہ غافل ہوں
مری تقدیر میں دلگیر رہنا ہی مقدر ہے / نہ نکلی آجتک حسرت میں وہ حسرت بھرا دل ہوں
نہ پُوچھا ہائے اُس ظالم نے اپنے دل فگاروں کو / رکھا اُمید ہی اُمید میں اُمیدواروں کو
ہمیشہ تیری فرقت میں تڑپتے ہی بنھیں گذری / نہ پوچھا موت نے بھی ہائے تیرے غم کے ماروں کو

سروں پر میکشوں کی ابر کا سایہ نہ تھا دنیا میں / عجب کیا اسکی رحمت گھیرے انکے مزاروں کو
نہ تھا ہمدرد کوئی دشتِ وحشت میں سوا انکے / ہماری آبلہ پائی پہ آیا رحم خاروں کو
شکستہ قبر اک میری بھی ہے گنج شہیداں میں / جو آنکلو ادھر تم فاتحہ دینے مزاروں کو
کلیجا کھا گئے رنج و غم و اندوہ سب مل کے / ہجوم غم ہوا اتنا کہ حصے بٹ گئے دل کے
ستم توڑا غضب ڈھایا نگاہِ ناز نے مل کے / پڑی اوپر مگر اندر سے ٹکڑے کر دیئے دل کے
نہ مرتے مجکو بنتی ہے نہ جینے مجکو بنتی ہے / نہ دل ہی میرے قابو میں نہ میں قابو میں ہوں دل کے

دم نزع حسرت بڑی رہ گئی / نظر جانب در لڑی رہ گئی
نہ ڈھونڈا دلِ غیر میں آپ کو / یہ اک چال ہمسے بڑی رہ گئی
دم نزع اے جان آئے نہ تم / مری جان تم میں پڑی رہ گئی
اٹھائے ہوئے ہیں ہم اک کوہِ غم / مصیبت جو سر پر پڑی رہ گئی
ہوئے مرحلے زندگی کے تمام / بس اب ایک منزل کڑی رہ گئی
گئی مرتے مرتے نہ مژگاں کی یاد / یہ برچھی جگر میں گڑی رہ گئی
وہ آئے دم نزع بالیں پہ جب / اجل بھی گھڑی کی گھڑی رہ گئی
ہوئے آپ رخصت مگر مجکو یاد / قیامت کی وہ اک گھڑی رہ گئی
کیا ذبح تم نے نہ دلگیر کو / یہ اک حسرت اسکو بڑی رہ گئی
باتوں میں ہے سحر فتنہ جو کی / دل لے لیا جس سے گفتگو کی
کٹ کٹ کے دعائیں دیرہی ہیں / خنجر کو رگیں مرے گلو کی
ہو قصۂ قیس یا کہ فرہاد / اک شرح ہے لفظ آرزو کی
دل لیکے کسی کا پوچھنا ہائے / کس دل سے ہماری آرزو کی
میں چشم عدو میں ڈالتا ہوں / چھانی ہوئی خاک کو بکو کی
لاکھوں کا نوالہ کر رہی ہے / ہے گور بھی کس بلا کی بھوکی

کہتے ہیں تلاش اسکو دلگیر	خود کھو گئے ایسی جستجو کی

دلگیر

دلگیر۔ سید اظہر حسین عرف چھٹن میاں مارہرہ کے باشندے اپنے بھائی جناب دلیر کے مشورہ سے شعر کہتے ہیں ۱۸۹۵ء سے مشق سخن کرتے ہیں انکے خاندانی حالات بہ تحت ترجمہ جناب دلیر درج ہیں دوبارہ اُنکا اعادہ فضول ہے۔ خاصے شوخ طبع موزوں فکر ہیں زبان بھی شستہ وصاف ہے

رہا دلگیر یوں بھولا ہوا دنیا و دیں برسوں	کہ رگڑی اُس بتِ سفاک کے در پر جبیں برسوں
وہاں بھی جاکے روحِ قیس کو نالوں سے چونکایا	ہلائی خوب دشتِ نجد کی بھی سرزمیں برسوں
نہ چھوٹے گا ہمارے خون کا دھبہ قیامت تک	بتِ سفاک دھوئے لاکھ اپنی آستیں برسوں
اِس طرح سے وہ چلتے ہیں وقتِ خرام ناز	گویا کہ اُنکے پاؤں کے نیچے زمیں نہیں
انداز گفتگو کا کچھ اُلجھا ہوا سا ہے	فقرہ پیامبر کا کوئی دلنشیں نہیں
عدو سے اُنکے لڑنے پر بجا ہے میرا یہ کہنا	دکھائی آپنے تو آج جنگ زرگری اچھی
حنا مالیدہ ہاتھوں نے سجھائی قتل عاشق کی	کسیکے خون ہونے کے لئے مہندی رچی اچھی
بُرا ہے نام ہی اُلفت کا پوچھا ہے تو کہتا ہوں	نہ الفت حور کی اچھی نہ اُلفت آپکی اچھی

دلگیر

دلگیر۔ منشی عبدالوہاب خان صاحب آپکو حضرت امیر مینائی سے تلمذ رہا ہے ۱۸۹۸ء کے حدیقۂ ہادی سے کلام منتخب ہوا، امیراللغات کے دفتر میں بھی کچھ دنوں مددگار رہے زیادہ حال باوجود مکرر دریافت معلوم نہوا کلام منتخب ملاحظہ ہو۔

ند دیتے تھے تم گالیاں اوّل اوّل	نہ تھی ہاتھ بھر کی زباں اوّل اوّل
کوئی پھول مجکو بھی گلشن کا صدقہ	میں آیا ہوں ای باغباں اوّل اوّل
ہمیں کچھ فائدہ اس سے جو چہرے سے نقاب اُٹھے	مزا اُسوقت ہے جب پردۂ شرم و حجاب اُٹھے
جھپک جائیں فلک پر چاند سورج گر پڑے بجلی	تمھارے روئے تاباں سے مری جاں گر نقاب اُٹھے
بوسوں کے بدلے مجکو وہ دیتے ہیں گالیاں	اچھی دوا ہے یہ دلِ بیمار کے لیئے
دلگیر کہتے تھے کہ لگاؤ کہیں نہ دل	رونا پڑا نہ تمکو دلِ زار کے لیئے

غیر پر لوٹ ہیں اب چھوڑ کے چاہت میری ‏ ‏ کچھ جو کہتا ہوں تو کہتے ہیں طبیعت میری
تھی جوانی تو انھیں ناز تھا کیا کیا کل تک ‏ ‏ غیر کی سنتے تھے منت نہ سماجت میری
آج گردوں کی طرف دیکھ کے وہ کہتے ہیں ‏ ‏ ہائے کیا ہوگئی وہ چاند سی صورت میری

دلیر

دلیر- نواب علی محمد خانصاحب لکھنوی۔ آپ کو حضرت عشق لکھنوی سے تلمذ رہا ہے۔ انجمن محمدی کے پریسیڈنٹ تھے ارمغان ۱۹۶۳ء سے کلام منتخب ہو کر نقل ہوا۔ بار بار لکھنو سے حالات دریافت کیے مگر کسی صاحب نے توجہ کی صرف محشر صاحب کی زبانی اتنا معلوم ہوا کہ دس برس ہوئے انتقال کر گئے اور کلام ملنا اب ناممکن ہے۔ چند شعر حاضر ہیں۔

روح عاشق قفس جسم سے آزاد نہ ہو ‏ ‏ ملک الموت اگر شکل پریزاد نہ ہو
دلکا جلنا کیا اُلفت میں گوارا کس نے ‏ ‏ اپنا گھر پھونک کے دیکھا ہی تماشا کس نے
نور سے اُس رخ تاباں کے ہوئیں آنکھیں بند ‏ ‏ بے نقاب آئے بھی وہ تو نہیں دیکھا کس نے
لب جاں بخش پہ تہمت ہی سہی مان لیا ‏ ‏ یہ بتاؤ تو کیا پھر مجھے اچھا کس نے
لاکھ جانیں ہوں تو اک نقش قدم پر صدقے ‏ ‏ دل کے مٹنے کا کیا آپ سے شکوا کس نے

دلیر

دلیر- نواب دلیر جنگ بہادر رئیس مدراس۔ شاید نواب کرناٹک کے خاندان کے رکن ہیں باوصف اہل زبان نہ ہونیکے اُردو فارسی کی طرف بھی توجہ رہی۔ یہ چند شعر نتائج افکار سے ملے درج کیے گئے۔

دیکھنا انکو ہی ممنوع صنم خانوں کا ‏ ‏ کچھ خدا ہوگیا اللہ مسلمانوں کا
دیکھیے عاشق و معشوق کی کیفیت کو ‏ ‏ شمع کیا جلتی ہے جی جلتا ہے پروانوں کا
ایک گردش سے کیا مست تری آنکھوں نے ‏ ‏ کام میخانہ میں ہے ایسے ہی پیمانوں کا
خفا کیوں ہو نکل آئے جو آنسو ‏ ‏ یہ لڑکے ہیں نکل جاتے ہیں گھر سے
حسیں سب اے دلیر اُٹھے چلے جاتے ہیں دنیا سے ‏ ‏ عدم آباد میں شاید کوئی دلچسپ بستی ہے

دلیر

دلیر- نواب امراؤ بہادر ملقب بہ شمشیر بہادر ثانی۔ آپ نواب علی بہادر ثانی کے خلف دوم

اور نواب ذو الفقار بہادر والی ریاستِ باندہ کے پوتے ہیں جو خود مرہٹوں کے فرمانروا باجے راؤ
اول پیشوائے پونا کے خلف اصغر شمشیر بہادر کے پوتے اور جانشین تھے، انکے خاندانی مطبوعہ
حالات سے پایا جاتا ہے کہ ۱۷۲۵ء میں راجہ چھتر سال رئیس پنّا نے پیشوا باجے راؤ سے
غضنفر جنگ محمد خان بنگش صوبہ دار الہ آباد کے مقابلہ کے لیئے امداد طلب کی چنانچہ باجے راؤ
خود فوج لیکر اُسکی حمایت کے لیئے بندیل کھنڈ آئے اور بنگش کو شکستِ فاش دیکر راجہ کے ملک
کو اُسکے چنگل سے آزاد کرایا۔ اِسی معرکہ میں رئیس پنّا کے اہلِ خاندان جن میں اُنکی لڑکی بھی تھی
لشکر اسلامی کی ہزیمت کے بعد آزاد ہو کر راجہ کے پاس واپس آئی۔ مگر رئیس مذکور نے
اس خیال سے کہ یہ لڑکی کچھ روز مسلمانوں کے لشکر میں رہ چکی ہے اُسے اپنی دختر تسلیم
کرنے میں پس و پیش کیا۔ ناچار باجے راؤ جو اُسکے حسن و جمال کو دیکھ کر دل باختہ ہو گیا
تھا اُسے اپنے ہمراہ پونہ لیگیا اور داخل حرم کر لیا، وہاں اُسکے بطن سے ایک لڑکا پیدا
ہوا، یہ بچہ مشکل سے پانچ برس کا ہوا تھا کہ باجے راؤ کا انتقال ہو گیا، چونکہ اُسکے جوان
ہونے پر سرداران ریاست نے اُسے ہندو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لہذا بالاجی باجے راؤ
پیشوا نے اُسے باندا کا علاقہ مدد معاش کے طور پر دیکر مذہب اسلام اختیار کرنے کی اجازت
دیدی۔ باوجود اس ترک مذہب کے یہ خاندان قیام سلطنتِ مرہٹہ تک برابر اپنے آپ کو
مرہٹہ طاقت کا جزو سمجھتا رہا اور باجگذار مطیع رہا۔ نواب شمشیر بہادر بانی خاندانِ باندا اس طرح
باجے راؤ پیشوا کے خلفِ چہارم اور بالاجی باجے راؤ پیشوا کے برادر اصغر تھے ۱۷۶۱ء کی
پانی پت کی لڑائی میں وہ زخمی ہوئے اور بموقع واپسی افواج مرہٹہ جانب دکن بھرتپور میں
انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے، اُنکے لڑکے علی بہادر نے بامداد مادھوجی سیندھیہ بندیل کھنڈ
کے اکثر اضلاع فتح کیئے اور نمک حرام غلام قادر کو جس نے واجب التعظیم شہنشاہ دہلی شاہ عالم
ثانی کی آنکھیں نکال لی تھیں گرفتار کر کے دہلی بھیجا اور اس کارنمایاں کے صلے میں ماہی
مراتب و دیگر مدارج حاصل کیئے۔ ایک یہ خاص رعایت بھی اُن سے کی گئی کہ اُن کے

خاندان کو شاہی مدفن قطب صاحب میں دفن ہونے کی اجازت سرکار شاہی سے عنایت کی گئی۔ چنانچہ جب نواب علی بہادر نے کالنجر میں انتقال کیا تو لاش قطب صاحب میں سپرد زمین ہونے کو دہلی بھیجی گئی، علی بہادر کے انتقال کے بعد نواب امراؤ بہادر کے دادا شمشیر بہادر پونہ سے کالنجر آئے اور سرکار انگلشیہ سے ۱۸۱۲ء میں معاہدہ کیا جسکی رو سے خطاب نواب باندہ اور چار لاکھ روپیہ سالانہ کا علاقہ یا پنشن زیر حمایت سرکار ہمیشہ کیلئے مسلم ہو گیا اس زمانے میں بعض وجوہ سے پیشوا نے ان کا علاقہ ضبط کر رکھا تھا، جب غدر ۱۸۵۷ء ہوا تو اس زمانہ میں نواب امراؤ بہادر کے والد نواب علی بہادر ثانی رئیس باندا تھے، شروع بغاوت میں انھوں نے ۳۰، ۴۰ حکام انگریزی کی جانیں بچائیں، لیکن آخر کار فوج باغی نے انھیں اپنی امداد دینے پر مجبور کیا، بعد خاتمۂ فساد سرکار انگریزی نے علاقہ اور پنشن سابقہ ضبط کر کے تین ہزار روپیہ ماہوار پنشن مقرر کی اور اندور بھیج دیا، جب سے یہ خاندان وہاں مقیم ہے حضرت دلیر کی پیدایش ۱۲۷۳ھ میں بمقام باندا ہوئی تھی۔ اور تعلیم راجکمار کالج اندور میں پائی آپ اور آپکے برادر کلاں نواب ذوالفقار بہادر ثانی پنشن بقدر گزارہ پاتے ہیں اور جیسی فراغبالی و آسودگی اِس قدیم خاندان کی رفعت برقرار رکھنے کو لازم ہے وہ حاصل نہیں۔ فنِ سخن میں آپ کو حضرت جلال لکھنوی سے فیض پہنچا ہے چنانچہ ۱۳۳۹ھ میں دیوان بھی شائع کر چکے ہیں، سیدھا سادہ کلام ہے مضمون آفرینی اور نزاکتِ خیال کی طرف توجہ کم ہے پُرگوئی البتہ ہے اور اساتذۂ سلف وحال کے کلام پر خوب ہاتھ صاف کیا ہے جس کا باعث غالبًا یہی ہے کہ انکا کلام نظر سے نہیں گذرا۔ ہنگام ترتیب تذکرہ مع حالات دیوان ارسال کیا۔ طرز ناسخ کے مقلد ہیں۔ کنگھی۔ چوٹی۔ محرم کے مضامین بر ابر نظم کرتے ہیں سرورق پر یہ شعر درج ہے۔

سخن بہتر سے بہتر اس کا ہمسر ہو نہیں سکتا	یہ دعوے سے میں کہتا ہوں کہ بہتر ہو نہیں سکتا

اِس دعوے کی صداقت کی بابت ناظرین خود فیصلہ کر لیں گے۔ ہم تو چند منتخب شعر

درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ❊

دے ساقیا شراب ہوا چاند عید کا
محتاج میکدہ تھا فقط اس کلید کا

کیا سو رہا ہے چین سے مرقد میں بعد مرگ
زانوئے حور تکیہ ہے تیرے شہید کا

سر بالیں ہے وہ رشکِ مسیحا
کر گئی اب یہاں آکر قضا کیا

کیونکر نہ ہو زبان کا دعویٰ مجھے دلیر
شاگرد ہوں منیر کا سید جلال کا

کمبل بھی اوڑھنے کو انھیں اب نہیں نصیب
دیتے تھے جو فقیر کو رومال شال کا

زہد و تقویٰ کی عبث لیتے ہو زاہد ہم سے
پیتے دیکھا ہے تمھیں ہے اسی برسات کی بات

تیر مژگاں پڑا اسکیے دل پر
خوب کی تم نے چاند ماری رات

ہمسے مطلب ہی جب نہیں تم کو
کیوں کیا کرتے ہو ہماری بات

ہے جلوہ نیا کوئی تو چلمن کے ادھر آج
جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج

تم اٹھکے کہاں جاتے ہو پہلو سے ہمارے
بیٹھو ابھی دنیا سے ہے اپنا بھی سفر آج

زاہد کو آب کوثر و حور و جنان پسند
ہمکو بتان ہند و مے ارغوان پسند

ہوئی فصل جنوں ہیں جوشِ وحشت کی نوید ہی
کہ زنجیروں کی بیلیں چڑھ گئیں دیوارِ زندان پر

مے پی لو رہن رکھ کر رند و عبائے واعظ
سوچی ہے آج ہمنے کیسی سزائے واعظ

کم معاشی ہیں جو رکھتے ہو بہت خرچ دلیر
بات کرتے نہیں کچھ اپنے گھر لینے کے خلاف

انکی زلفوں میں جو ہوتا ہے میرے دل پر بگاڑ
فیصلا کو بیچ میں دونوں کے آجاتی ہے مانگ

خوب جینے کا مزا پاتے ہیں ہم
خون دل پیتے ہیں غم کھاتے ہیں ہم

ہے یہ کیسا غمکدہ اے بزم آرائے جہاں
کتنے اس محفل میں ہیں اور شادماں کوئی نہیں

جو کعبہ میں شیخ حرم دیکھتے ہیں
وہی بتکدہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں

بہت زہد و تقوے میں نازاں ہیں زاہد
گنہ گار تیرا کرم دیکھتے ہیں

سنیں کیونکر دلیر کی فریاد
کانوں کو بالی پتے بھرتے ہیں

کوئی حسرت اگر برسوں میں نکلی بھی تو کیا نکلی
ہزاروں حوصلے وہ ہیں جو دل کے دل میں رہتے ہیں

دردِ دل کا مزا وہ کیا جانیں
جن کا دل عمر بھر دُکھا ہی نہیں

پھیر دیتے نہیں وہ کیوں دل کو
جب یہ کہتے ہیں کام کا ہی نہیں

رخِ زیبا نہیں زلفِ رسا ہیں
یہ ہے اک صبح دو اسکی ہیں شبا ہیں

یہ ایک نشہ محبت کا ہے وہ چارہ گرو
کہ جس کا سارے جہاں میں اُتار کچھ بھی نہیں

وہ لپٹے نشۂ مے میں عدو سے
یہ بیہوشی میں ہشیاری تو دیکھو

اِن روزوں خانداں کو کوئی پوچھتا نہیں
عزت ہے آدمی کی بس اب سیم و زر کے ساتھ

دخترِ رز کا کئی دن سے نہیں ملتا سراغ
آج سنتے ہیں کہ قاضی کے وہ گھر بیٹھ گئی

سچ تو یہ ہے کہ بُری شے ہے تہیدستی بھی
رہن مے کے لیئے زاہد کی ردا آتی ہے

تڑپ جاؤ گے میرا دردِ دل تم
جو سن لوگے کبھی میری زبان سے

مے کو کیونکر نہ وہ بُرا جانے
واعظ اسکے مزے کو کیا جانے

چھوڑے اُلفت وہ کیا حسینوں کی
کو سنے کو بھی جو دعا جانے

ہماری جبیں کے لیئے کعبہ زاہد
کسی شوخ کا آستان ہو رہا ہے

بیہوش ہے اک بیخبری آٹھ پہر ہے
کچھ عاشقِ جانباز کی بھی اپنے خبر ہے

اگلا سا وہ حیف اپنا زمانہ نہ رہا
دولت نہ رہی وہ کارخانہ نہ رہا

کھو بیٹھے اسے ایک مکاں تھا جو دلیر
رہنے کا بھی افسوس ٹھکانا نہ رہا

دلیر منشی سید امیر حسن مارہروی آپکے دادا میر داور علی داور مرحوم اُناؤ کے قدیم باشندے اور ایام غدر میں سرکار انگلشیہ میں تحصیلدار تھے بصلۂ خیر خواہی سرکار سے موضع سلیم پور انعام میں ملا ہوا تھا بعد ازاں اور کچھ دیہات نواح ایٹہ میں خرید فرما کر اور مارہرہ کو پسند کرکے یہاں نقل سکونت اختیار کی اُس میں جناب دلیر کے والد سید الطاف حسین بھی حصہ دار ہیں اور مکانات درگاہ کے قرب میں بنائے تحصیلداری سے ترقی پا کر غدر کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور ۱۸۹۶ء

تک پنشن پاتے رہے۔ ان کا سالِ ولادت ۱۸۷۱ء مطابق ۱۲۸۸ھ ہے۔ فارسی اردو میں خاص دستگاہ ہے۔ مڈل تک انگریزی بھی پڑھی تھی۔ خلیق، نیک خصلت شخص ہیں، طبیعت نہایت شوخ اور چلبلی پائی ہے ابتدائے شعور سے شعر و سخن کا ذوق ہے، شعر اچھا کہتے ہیں۔ فن موسیقی سے بھی ایک گونہ لگاؤ ہے، پہلے جناب مضطر کے شاگرد ہوئے بعد میں فصیح الملک مرزا داغ سے بہ سلسلۂ خط و کتابت تلمذ اختیار کیا اور اس امر کی خاص کوشش کی کہ استاد کے رنگ میں کہیں۔ آجکل زمینداری کے انتظام کا مشغلہ ہے۔ کثرت مشق سے اب ثمرہ میں بے تکلفی کلام میں روانی زبان میں صفائی اچھی پیدا ہوگئی، اکثر مشاعروں میں اپنی خوش گوئی کی داد پاتے ہیں سندیلہ، رامپور، علیگڈھ کے مشاعروں میں شریک ہوئے راقم سے بریلی میں قاضی محمد خلیل کے مشاعرے میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ شوخی مضمون اور طرز بیان قابل تعریف ہے اور جا بجا حضرت داغ کے فیضان کی جھلک ان کے کلام سے آشکار ہے

روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں
بیٹھے بٹھائے آج مجھے ہو گیا ہے کیا

صورت نمائے حسن ہے آشفتگی مری
جو مجھ کو دیکھتا ہے تجھے دیکھتا ہے کیا

اندیشۂ فراق سے کرتا ہے ترکِ عشق
ہمت کو لے دلبر تری ہو گیا ہے کیا

مجمع اہلِ شکایت سے تجھے کیا مطلب
کوئی دل سے کوئی تقدیر سے نالاں ہوگا

تم نہ بے پردہ سامنے آؤ
صبر مجھ سے ہوا ہوا نہ ہوا

ہائے قسمت اسیرِ الفت کی
قید ہی میں رہا۔ رہا نہ ہوا

رشک یہ ہے کہ عدو نے لبِ لعلیں کو ترے
کر دیا چوس کے برگِ گلِ سوسن کیسا

ترکش میں ہیں جو تیر وہ قاتل کے پاس ہیں
جو کھو گیا کہیں وہ مرے دل میں رہ گیا

ہیں سب خیال و خواب کی باتیں اے ہمنشیں
آنکھوں میں رہ گیا نہ کوئی دل میں رہ گیا

یہ سن لو اور جاؤ ہے اگر مدِ نظر جانا
تمھیں آتا ہے گھر جانا ہمیں آتا ہے مر جانا

نہ اپنے دل کو دل جانا نہ اپنے دم کو دم سمجھے
تمھیں کو عمر بھر سمجھے تمھیں کو عمر بھر جانا

کوئی دم کوئی ساعت یاد سے تیری نہیں خالی
ہمیں کیا بے خبر اپنا سا تو نے بے خبر جانا

دلبر خستہ جاں کی خودکشی کو سن کے فرمایا
خدا مرحوم کو بخشے اسے کہتے ہیں مر جانا

گرہ اب کھول دے زلفوں کی لا دل کی لگی ہو لی
بھلا تیرے سوا اے دلربا کس پر گماں ہوگا

کیا ضرورت تھی جو یہ زحمت گوارا کی گئی
کیوں مجھے ناپید ہونیکے لیئے پیدا کیا

عشق میں ضبط مدعا نہوا ‖ آدمی ہیں بہت کیا نہوا
وہ بہت پوچھتے رہے لیکن ‖ ہمسے اظہار مدعا نہو

تمھیں یہ ضد ہے تو دنیا کو چھوڑ دینگے ہم
یہی جہان ہے کیا دوسرا جہاں نہیں

ملیگی کیوں نہ ہمیں قبر میں ستم سے نجات
کہ اس زمین کے نیچے تو آسماں نہیں

یہ سودا تو دیکھو وہاں جا رہے ہیں
جہاں سیکڑوں ٹھوکریں کھا رہے ہیں

یہ کہکر مجھے انکے درباں نے روکا
کریں کیا ہم اس بات کا کھا رہے ہیں

کہیں تم، کہیں ہم، یہ اندھیر کیا ہے
مرادوں کے دن اور یوں جا رہے ہیں

اثر دے الٰہی ہماری دعا میں
ترے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں

پڑھیں طور پر ہم کو اسکی ضرورت
یہیں سب کرشمہ نظر آ رہے ہیں

مستحق ہم بھی ہیں اس لطف کے دشمن ہی نہیں
اس طرف بھی تو ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھو

روکنا دیدۂ خونبار کو اے حضرت دل
داغ آجائے نہ دامانِ وفا پر دیکھو

کراہے کیوں نہ وہ جو آتش فرقت سے جلتا ہو
مجھے پروا نہیں اسکی سُنے جو کوئی سنتا ہو

جنازے کو ہمارے دیکھ کر تم سوچتے کیا ہو
جلا دو اپنے کشتہ کو اگر رشکِ مسیحا ہو

ستمگر حشر ہے یہ آخری دن جسکو کہتے ہیں
قیامت ہے جو وعدہ آج بھی تیرا نہ پورا ہو

بسر ہوتی ہے کیونکر زندگی ایام فرقت میں
یہ اس سے پوچھنے کی بات ہے جو مٹتے مرتا ہو

بہت تو نے ڈرا رکھا تھا مقتل اور خنجر سے
یہیں ہوا اور ابھی ہو فتنہ گر جو کچھ کہ ہونا ہو

خدا نا ترس ہیں کافر حسیں تو جرم کیا اس کا
خدا کو جب نجانیں یہ تو پھر خوفِ خدا کیا ہو

مانگو دعا کہ حشر میں اللہ بخشدے
میرا قصور ہو کہ تمھارا قصور ہو

سن کے بتخانہ کو ہم شہرتِ اصنام چلے
دیکھئے کتنے دن اب مذہب اسلام چلے

دم نکلجائے تو ہو ہجر کی مشکل آسان
موت کام آئے اگر آج تو کچھ کام چلے

آج وہ میری عیادت کو جو آئے تو کہا
تم تو کل کہتے تھے ہم صبح چلے شام چلے

جو تیر آ رہا ہے وہ پار جا رہا ہے
اب دل میں کیا دھرا ہے اب دل میں کیا رہا ہے

وہ کھیل جانتے ہیں اُلفت کے مشغلوں کو
اک بدنصیب اپنی ہستی مٹا رہا ہے

کیا بتاؤں کیا نگاہِ یار ہو کر رہ گئی
میری دل کی مالک و مختار ہو کر رہ گئی

اس نقاہت کا بُرا ہو منہ سے کہتا ہے وہ شوخ
ایک ہی فریاد لے بیمار ہو کر رہ گئی

ظلمتِ شامِ جدائی کب ہٹائے سے ہٹے
سامنے آنکھوں کے اک دیوار ہو کر رہ گئی

غیر کی گردن میں جب بانہیں کسی کی پڑ گئیں
میری مایوسی گلے کا ہار ہو کر رہ گئی

کیا وہاں بھی جا کے پہنچی میری آہِ شعلہ ریز
کیوں ستارے گر رہے ہیں عرش سے ٹوٹے ہوئے

بخشند تجھے اپنے عاشق کا قصور
بندہ پرور کیا کرے انسان ہے

زنداں میں فتنہ گرنے کی یہ تو دستگیری
جب پاؤں میرے باندھے تب ہاتھ کھول ڈالے

گل پیرہن ہزاروں بنتے زیادہ نازک
نظروں میں آئے آنکھوں میں تول ڈالے

خونِ جگر سے اپنے لکھا تھا حال دل کا
واں خط شوق اُسنے پانی میں گھول ڈالے

چودھویں سال میں پہنچے تو کہا اِترا کر
جیسے ہم آج ہیں ایسا ہی یہ کامل ہے

مجھ سے کہتے ہیں کہ تو حشر میں یہ کہہ دیجو
میرا دعوی ہے کسی پر نہ کوئی قاتل ہے

نثر کے شکوے ہیں کہ انشائے غم
نظم کی فریاد اک دیوان ہے

اس قسم کھائیے صدقے جائیے
آنکھ نیچی ہاتھ میں قرآن ہے

یہ فصاحت اور یہ آمد دلبیر
داغ کے فیضِ کرم کی شان ہے

کبھی راہ پر وہ نہیں آنیوالے
سلامت رہیں آنکھ بہکانے والے

مری روح پر ہے قیامت کا صدمہ
تجھے کھیل ہے قبر ٹھکرانے والے

تفصیلوار ذکرِ ملاقات کیجیے
کس سے ملے کہاں ملے یہ بات کیا ہوئی

گلگشت میں یہ سیر ہیں تو سارے گل کھلاتی ہیں
ستمگر تو جو رسوا ہے انھیں باتوں سے رسوا ہے

بے رخی میٹھی نظر کے ساتھ ہے
عیب کیا اچھے ہنر کے ساتھ ہے

آپ کا در باب کعبہ بن نجائے تو سہی
کچھ دنوں گھسنے تو دیجے اپنی پیشانی مجھے

آج سے وہ لطفِ راہ و رسم ظاہر بھی گیا
رازِ دل کہکر ہوئی کیسی پشیمانی مجھے

عقل کا کہنا سمجھ ہی میں نہیں آتا دلیر
کیا خدا جانے یہ سمجھاتی ہے دیوانی مجھے

مدعی کی شکوۂ قسمت کھلگئی　کچھ نہ پوچھیے سب حقیقت کھل گئی
امتحانِ عشق بھی کیا سخت تھا　آدمی کی آدمیت کھل گئی

فریادِ حشر میں ہے یہ اک دردخواہ کی
پرسش یہاں تو ہو مرے حالِ تباہ کی

رکھا نہ عشق تو نے کسی دین کا مجھے
دنیا تباہ کی مری عقبیٰ تباہ کی

افسوس دل کا حال کوئی پوچھتا نہیں
یہ کہرہے ہیں سب تری صورت بدل گئی

جو ہم نے کہدیا تھا وہی عشق میں ہوا
آخر ہماری جان ہی نیارا جل گئی

عزت اُسی کی اہلِ نظر کی نظر میں ہے
سب کچھ بشر میں ہے جو محبت بشر میں ہے

دلیر مرزا تصدق حسین خلفِ مرزا واجد حسین فنِ شعر میں حضرت اسیر مرحوم کے صاحبزادے جناب حکیم مغفور سے مستفید ہیں کم و بیش ۳۰ برس سے مشقِ سخن کرتے ہیں ۵۰ سال سے عمر متجاوز ہے ؎　　دلیر

مدت کے بعد دیکھنے آیا ہے وہ قمر
اے موت آج ہی تجھے آنا ضرور تھا

بجلی تڑپ تڑپ کے گرتی پر نہ یہ تھما
کس درجہ بیقرار دلِ ناصبور تھا

کہتا ہے درد مجھسے نہ بیتاب آپ ہوں
گھر سے وہ چل چکے ہیں کہیں ہونگے راہ میں

رحمت نے اسکو ٹیک کے گلے سے لگا لیا
دیکھا مجھے جو حلقۂ شرم و گناہ میں

خوشی ہے قتل کی اپنے فقط اسواسطے دلکو
کہ خونریزی کا ارماں تو رہا باقی نہ قاتل کو

وہ قاتل فاتحہ پڑھنے کو آیا ہے جو تربت پر
یہ بیجرم و گنہ مقتول ہونے کی خوشی ہے

دلیر منشی علی شبیر ساکن بمبئی رسالہ معیار میں کچھ کلام نظر سے گزرا اسکا انتخاب ضبطِ تحریر میں آیا　　دلیر

گھٹا کے آتے ہی محفل میں آیا جامِ شراب
اک آفتاب گیا اور اک آفتاب آیا

طلسمِ حسن جو دیکھا اچٹ گئی مری نیند
لگی جو آنکھ تو عمر بھر نہ خواب آیا

دلیر میں نے تو خط انکو سینکڑوں بھیجے
مگر نہ نامے کا میرے کوئی جواب آیا

دماغ

دماغ منشی گنگا لال صاحب خلف منشی کنھیا لال۔ میران پور ندرہ ضلع گیا کے رہنے والے ذی علم، خوش وضع اور نہایت متین و خلیق آدمی تھے۔ اردو و فارسی کے علاوہ آپ کو بھاشا و سنسکرت میں بھی دستگاہ حاصل تھی فن شاعری میں حضرت عرش خلف میر تقی میر کے شاگرد تھے ۱۲۶۸ھ میں بعمر ۷۰ سال اس جہان فانی سے رحلت کی۔ ایک دیوان غیر مطبوعہ موسومہ گلشن بیجا ر آپکی یادگار ہے مگر عنقا صفت ہی۔ بہزار کوشش یہ چند شعر دستیاب ہوئے جو ہدیۂ ناظرین کیئے جاتے ہیں *

تیری زلفوں سے اماں ہی کسے یار آج کی رات	انھیں دو کالوں نے رکھا ہمیں مار آج کی رات
صاف ہو وصل میں عاشق سے کدورت کیسی	میرے جاں دور کرو دل سے غبار آج کی رات
درد دل سے جو کراہا تو وہ ہنس کر بولے	جاں بلب کون ہے آوارہ دیار آج کی رات
وہ شب ماہ میں آئے ہیں جو افشاں چنکر	چاندنی دوہری دکھاتی ہے بہار آج کی رات
گلشن حسن پر بہار نہیں	کنگھی چوٹی نہیں سنگار نہیں
قتل کو بس ہے خنجر ابرو	حاجت تیغ آب دار نہیں
باغ عالم میں گل کھلاتے کچھ	اے جنوں موسم بہار نہیں
ایک ہی قسکل کو دو کر کے دکھا دیتے ہیں	جوہر آئینہ قاتل تری تلوار میں ہی

دماغ

دماغ۔ مولوی مرزا سجاد علی لکھنوی۔ دور موجودہ کے خوش فکر ہیں چند غزلوں کا ماحصل درج ذیل ہے۔

کیا تری معجز نما اے یار آنکھیں ہوگئیں	جو کوئی آیا پئے دیدار آنکھیں ہوگئیں
محو میں اتنا خیال دید جاناں میں ہوا	دست و پا بھی ہوئے بیکار آنکھیں ہوگئیں
باغ میں وہ گل نہاں جب میری آنکھوں سے ہوا	مجکو آپ اپنی نظر میں خار آنکھیں ہوگئیں
اتفاقا دید کا موقع بھی جو موقع بھی ملا	شومئی تقدیر سے دیوار آنکھیں ہوگئیں

پیازہ

دوپیازہ۔ ملا عبدالمومن دہلوی معروف بہ ملا دوپیازہ خلف ملا ولی محمد۔ ہر گونہ علم و

فضل میں بہرۂ وافی ونصیبہ کافی رکھتے تھے، ترکی زبان میں کامل عبور تھا چونکہ تمسخر اور مذاق نے آپ کی طبیعت پر غلبہ کر رکھا تھا اس سبب سے فضائلِ علمی نے شہرت نہ پائی۔ محمد جلال الدین اکبر شاہ بادشاہ عرش آشیانی کے جلیس خاص تھے، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کا یہ حال تھا کہ بات بات میں پھلجھڑی کی طرح مُنہ سے پھول جھڑتے تھے، خلوت وجلوت میں ایسی گل افشانیاں کرتے تھے کہ تمام حاضرین دربار مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ جاتے تھے، انکے لطائف وظرائف آجتک زبان زدخلائق ہیں، مشہور زمانہ راجہ بیربل سے ہمیشہ انکی چشمک رہا کرتی تھی اور آپس میں اکثر چوٹیں چلتی رہتی تھیں۔ ان دونوں کی نوک جھوک کے بیسیوں لطیفے اب بھی لوگوں کی زبان پر ہیں، مُلّا صاحب موصوف عرصۂ دراز تک متھرا میں مقیم رہے اور وہی اُنکا اصلی وطن بھی تھا وہاں کے پنڈتوں سے اکثر گرمیٔ صحبت رہا کرتی تھی اور اسی وجہ سے زبانِ ہندی میں بھی آپنے طبع آزمائی کی ہے اکثر فقیروں کو انکے دوہے یاد ہیں۔ فارسی زبان میں بیشتر فکر سخن کرتے تھے اور اس فن میں علامۂ دہر ابو الفضل سے صلاح لیتے تھے ان واقعات کے برخلاف ایک قدیم تذکرہ میں مفصلۂ ذیل حال نظر سے گذرا جسکی صحت میں ہمیں کسی قدر تامل ہے کیونکہ اکبر شاہ اور آصفجاہ مرحوم کے عہد میں تخمیناً دوسو برس کا تفاوت ہے۔ کچھ دنوں بعد آصف جاہ نواب نظام الملک کے دامنِ دولت سے وابستہ رہکر آخر عمر میں قصبہ ہنڈیا ہرود جو نواح قصبۂ چھیپانیر ضلع بھوپال میں واقع ہے وارد ہوئے لوگوں سے پوچھا کہ اس بستی کا کیا نام ہے۔ کسی نے کہا "ہنڈیا" فرمایا کہ دوپیازہ ہنڈیا میں آکر اب باہر کہاں جائے آخر ایسے بیٹھے کہ مرکر ہی اُٹھے اور اسی خاک کے پیوند ہوئے آپ کا مزار اسی مقام پر ہے۔ ایک کتاب مسمی بہ اتراک عالمگیری لغت ترکی زبان میں ان سے یادگار زمانہ ہے، انکے ایک سوایک لطائف بزبان فارسی بھی شائع ہو چکے ہیں اور "النامہ" ایک چھوٹا سا رسالہ جس سے عجیب مذاق حاصل ہوتا ہے مُلّا نامہ کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ زبان اُردو میں یہ چند شعر انکی موزونی طبع کا نتیجہ ہیں

وہ گورا گورا لڑکا بامن کا شوخ گہونا	ایسا لگے ہے مجکو جیوں کھانڈ کا کھلونا
موری کیتی ونتی مان کھیلی بیچ ہیں موری	پیتم کے پیچھے ساری بیسر ہنم بہگونا
دیکھ اسناؤں کا سے وے چند لکھ کہت سے	ایسو مہا کیٹ باسوں مری لگاؤں کیوں نا
پیاری کوں جانے پوچھا سارے نگر ہوں لیں دن	ہم رہ م وشام ورو س ہم خیر و پلونا
شوخی نیٹ کرت ہی پچھکنی یا نقہ مل کر	نیں تاک شیخ کیتی ایسی طرح ملونا
تالی بجی ہی کیا کیا کلھ شیخ جی کے پیچھے	رم ور بفعل ہیں بہاگائے اوڑھنا بچھونا
دو پیازہ از دل و جان قربان چرا نباشم	جوبن رے مدہ کا ماتا وہ سانولا سلونا
آبسے ہیں جو دو پیازہ چلے متھرا سوں	تا بہ پرلو نہ نکالیں گے قدم ہندیا سوں
شاہ ایران ہی یہ چار دہم گو بالفرض	شاہ اکبر کو ہلال شب اول سمجھو
کیونکہ اسکو ہی ہر اک رات ترقی اور اسے	دن بدن روز نئے طور تنزل سمجھو
پیالہ ہیم وسکا چاکھ بیٹھے	بلت ہیں تن بدن پر راکھ دیکھو
نہ دو پیازہ کی دلداری کرتے	مگر صمد گو نہ ہا خواری کرتے
دو پیازہ اب نکس ہنڈیا ہیں سے آئے کے	ماکھی کے ہانتھ پھنس گئے جائے ہیں جائے کے

دوست

دوست شیخ غلام محمد عظیم آباد پٹنہ کے متوطن اور نظامت مرشد آباد میں اوائل انیسویں صدی میں ملازم تھے اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔

کافر ہے جسکے دل میں تری آرزو نہو	کس کام کی زبان اگر گفتگو نہ ہو
صنم جو دیکھ مجکو تو کہے ہے دور آنکھوں سے	کچھ اپنا بس نہیں ظالم ہیں ہوں مجبور آنکھوں سے

دوست

دوست سید خواجہ ولد سید حیات حیدر آباد دکن کے رہنے والے نہایت نیک طینت آدمی ہیں شیخ فدا حسین صاحب مہر سے تلمذ ہے دیوان گلزار دوست چھپ گیا ہے بقول دیگر مشہور لکھنوی کے شاگرد ہیں اور تعلقہ دار جاگیرات دکن ہیں پچاس باون برس کا سن اور یہ کلام کا انتخاب ہے +

ناصح سنتی ہیں ہم نے جہاں کی حکایتیں
جاتا ہے کون کوچۂ جاناں کو چھوڑ کر

منعم عبث ہی دولتِ دنیا پہ یہ غرور
جاتا ہی ایک دن سر و ساماں کو چھوڑ کر

کون کہتا ہی کہ جلتا ہے دلِ عاشقِ زار
خاک ہو جاتا ہے سب جسم پہ جلتا ہی نہیں

لاکھ چاہا کہ کہوں اب نہ ملوں گا تجھ سے
لڑکھڑاتی ہے زبان منہ سے نکلتا ہی نہیں

چھپ گیا جب سے وہ شکل اپنی دکھا کر ای دوست
کسی صورت سے دلِ زار بہلتا ہی نہیں

دلوں میں یاد بھی دونوں طرف مرے انکے
میں انکے گھر میں رہا اور وہ میرے گھر میں رہے

جہاں ہے وہ دلِ مائل وہیں ہے
سخن ہے جس جگہ سائل وہیں ہے

نہ پوچھو حال ہم عاشق تنوں کا
جہاں دلبر ہے اپنا دل وہیں ہے

جہاں پر آپ تنہا بیٹھ جائیں
وہیں ہی جمگھٹا محفل وہیں ہے

سفر ہم ناتوانوں کا نہ پوچھو
جہاں تھک کر گرے منزل وہیں ہے

دوست

دوست منشی دوست محمد خان پٹھان۔ موزونیِ طبع کی امداد سے شعر کہہ لیتے ہیں ورنہ کچھ خاص بات انکے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ ایک دیوان بھی شائع کر چکے ہیں، یہ دیوان کا انتخاب ہی۔

پوچھتے کیا ہو شبِ فرقت کا حال
دل ہمارا رات بھر تڑپا کیا

جو تیری جدائی کا غم دیکھتے ہیں
وہی جلد راہِ عدم دیکھتے ہیں

سچ کہو! رہنے دو بہانے کو
کس نے روکا ہی آنے جانے کو

جو کیا ہم نے عشق میں تیرے
نکرے اب خدا کرے کوئی

بھلا یاد کیونکر بھلائی تمھاری
سمائی ہیں دل میں ادائیں تمھاری

زباں سے ہی کہتے ہیں مرتے ہیں تجھ پر
نہیں مرتے ای دوست مر جانیوالے

دولھا

دولھا۔ نواب محمد حسن علیخاں صاحب دولہ بریلوی شاگرد نواب ہادی حسن خاں صاحب ہادی از خاندان حافظ الملک بہادر ۱۸۷۰ء میں جو بریلی میں مشاعرے ہوتے تھے اُن میں

شریک ہو کر داد غزلخوانی دیتے تھے۔ اُس زمانے کے ایک مجموعہ میں چند غزلیں نظر سے گزریں اور کچھ شعر منتخب ہو کر درج کیے گئے، کلام میں زبان کا لطف موجود ہے تلاش الفاظ و مضامین بھی بُری نہیں ہے ٭

ذکر کس کا نہ تری بزم میں اکثر آیا
پر نہ مذکور ہمارا کبھی دلبر آیا

زلف کا بل نگیا لاکھ جتن ہم نے کیئے
کوئی افسوں نہ کبھی کام نہ منتر آیا

رزق پہنچاتا ہے ہر روز وہ رازق ہمکو
گرچہ ہم لاکھ گنہ شام و سحر کرتے ہیں

دل میں عشاق کے کرتے ہیں ٹھکانا اپنا
گھر میں اللہ کے بُت دیکھو گھر کرتے ہیں

ابر ہو، دریا ہو، خلوت ہو، مُحِبّ بے پیر ہو
تب کہیں حاصل مرادِ عاشقِ دلگیر ہو

غش پہ غش کھاتے ہیں تمکو دیکھکر جن و ملک
تم پری کی شکل ہو یا حور کی تصویر ہو

ہادیٔ معجز بیاں کے فیضِ صحبت کے سبب
کیا عجب دولہ ترے اشعار میں تاثیر ہو

محبت بتوں کی خدا کی قسم
رگِ جان کو نشتر ہو گئی

چلے آئے وہ گھر مرے بن بُلائے
مری آہ کیا کارگر ہو گئی

خفا ہم سے دولہ وہ کیوں ہو گیا
یہ تکرار کس بات پر ہو گئی

دولہ۔ نواب جہانگیر محمد خاں صاحب بہادر مغفور معروف بہ نظیر الدولہ۔ نواب سکندر بیگم صاحبہ والیہ بھوپال سے پہلے اسکے بھائی کی نسبت ہوئی مگر نوبت نکاح کی نہ آئی اور آخر قدسیہ بیگم صاحبہ نے اِن سے نکاح کر دیا۔ بعد بلوغ انھوں نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے لیے بہت دست و پا مارے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے مگر نتیجہ انجام کو اچھا نہ ہوا اور عزیزوں اور اہلکاروں کی سازشوں سے آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ صرف ایک لڑکی نواب شاہجہان بیگم پیدا ہوئی تھیں اُسکے بعد سکندر بیگم صاحبہ سے اَن بن رہی انجام کار چھبیس سال کی عمر میں جام فنا نوش کر کے سفر آخرت اختیار کیا، اِنکے کلام میں جو انکی صاحبزادی نے ۱۲۸۸ھ میں اپنے دیوان کے ہمراہ چھپوا کر شتہر کر دیا ہے عاشقانہ اور معاملہ بندی کے

دولہ

مضامین کثرت سے ہیں اور اُن سے اُنکے دلی سوز و گداز کی جھلک آشکارا ہے جو کچھ قلب پر گذرتی تھی بیشتر وہی نظم کر دیتے تھے تلمذ کا حال معلوم نہیں مگر کلام بامزا اور پُر لطف ہے چھ جزو کے دیوان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

عبث ہو ساتھ پھرنا غیر کے اُس شاہِ خوباں کا
گدا کا ہرزہ گردی ہے ہنر اور عیب سلطاں کا

مساوی ہو نگاہِ لطفِ شہ اپنی رعیت پر
برابر مہرِ تاباں کے ہو ہر ذرہ بیاباں کا

قمر کی طرح کب منت کش خورشید انجم ہیں
نہیں لیتے ہیں عالی طبع ہرگز بار احساں کا

رہیگا علم کی دولت سے جو محروم دنیا میں
نہیں انساں وہ ہمرتبہ کہیئے اُسکو حیواں کا

نہ کیوں وہ شاہِ خوباں تمکنت کو کار فرمائے
سُبک وضعی سے اُٹھ جاتا ہے اکثر رعب شاہاں کا

مرے سر کے تلے سے نزع میں زانو نہ تو سرکا
ہے تکیہ زندگی کا جان پہ تکیہ مرے سر کا

کہاں مخلوق کو ہو فائدہ شاہِ خود آرا سے
گرے کب حلق میں پیاسوں کے قطرہ آبِ گوہر کا

جوں خار دل میں تھی مژۂ یار کی خلش
فرقت میں اُسکی سانس بھی لینا عذاب تھا

خالی ہاتھ آیا ہوں منزل میں الٰہی کیا کروں
لُٹ گیا رستہ میں میرے ساتھ جو اسباب تھا

قتل کرنا عاشقوں کا اک قدیمی رسم ہے
چھوڑ جانا نیمجاں یہ آپ کا ایجاد تھا

قطعہ

رہی جہانگیر اسلیئے نام اُنکا ساری خلق میں
گھر عروسِ دہر کا دُولہ سے جو آباد تھا

تم خفا مجھ سے ہوئے اچھا ہوا بہتر ہوا
میں بھی تو ہرجائی پن سے آپکے بیزار تھا

تیری خاطر پاؤں اُن لوگوں کے اب پڑتے ہیں ہم
جن پہ ٹھوکر مارنے سے ہمکو ننگ و عار تھا

چوڑیوں میں بھی پسندِ دل جہانگیری ہی تھی
جن دنوں دولہ سے اُس پردہ نشیں کو پیار تھا

قطعہ

مت کہہ وہ اپنے گھر تھا وہ غیروں کے گھر تھا
کیا اِس سے فائدہ مجھے اے ہمنشیں ہوا

میرا وصال اُسکے تصور میں ہو گیا
مجھ تک نہ آیا میری بلا سے کہیں ہوا

کب جدا ہے مجھ سے دلبر کب میں دلبر سے جُدا
ہو نہ گوہر آب سے اور آب گوہر سے جُدا

روح تن سے جان بدن سے ہوش ہے سر سے جُدا
کیا کشاکش میں پھنسا ہوں جب سے دلبر ہے جُدا

جسکو غرض ہو جائے وہ طوبیٰ کی چھاؤں میں
بیٹھا ہوں میں تو سایۂ دیوارِ یار میں

تلووں لگی وہ آگ کہ سر سے نکل گئی
مہندی ملی جو غیر نے وہاں پائے یار میں

کاش وہ آرام جاں آئے تو جائے غم کہیں
اُسکی آنے کی اگر ٹھیرے تو ٹھیرے دم کہیں

ہیہات اُسکے ہاتھ میں غیروں کا ہاتھ ہو
آنکھوں سے ہم کو پاؤں نہ ملنا نصیب ہو

ق

اِس انکسار پر ترے سہتا ہوں کیا ستم
پھر بھی یہ ہے دعا مری ایسا نصیب ہو

میں منتوں سے تجکو منایا کروں مجھے
تیری اُٹھائی رنجش بے جا نصیب ہو

حاجت نہیں ہے اور سے ملنے کی پھر تجھے
دولہ سا جبلہ چاہنے والا نصیب ہو

قطعہ

چاہت کو جو میری پا گیا ہے
ہر بات پہ اب وہ روٹھتا ہے

لو جو بھی دِل کو بھا گیا ہے
معلوم نہیں کہ کیا بلا ہے

اُسکے آنے کی نہ ٹھیری سو طرح غم کھا چکے
جان بھی جائے کہیں قصہ مٹے جھگڑا چکے

مجکو طعنہ اور مہرویوں سے ملنے کا دیا
ہیں بھی کچھ اب عرض کر لوں آپتو فرما چکے

جب نہ اک بوسہ ہی دو تم اور نہ اک دشنام دو
دِل بھلا کیونکر ملے اور اُسکی قیمت کیا چکے

خدا نے کر دیا ہے موم تمکو حق میں غیروں کے
دلِ نازک تمہارا پر مری جانب سے پتھر ہے

یہ تو میں کیونکر کہوں تم ہو رہو میرے راجی
فخر ہے میرا اگر تم کر رکھو اپنا مجھے

کیوں ذرا سی بات پر تم نے کیا رسوا مجھے
کہہ دیا ہوتا بُلا کر کان میں تنہا مجھے

آشنا ظاہر میں اور باطن میں بیگانہ صفت
تم نے در پردہ جلا کر خاک کر ڈالا مجھے

آنکھ پھر جاتے ہی اُسکے ہو گیا بیہوش میں
گردشِ چشمِ بُتاں ہے ساغرِ صہبا مجھے

دِل کو مجھ سے توڑ کر اپنا اُسے بندا کیا
آہ ایسے آشنا کو یوں چھڑایا آپنے

دمِ قتل اپنی گردن کب بُتِ بے پیر پھرتی ہے
زہے قسمت گلے پر جو تری شمشیر پھرتی ہے

دولہ

دولہ۔ مرزا علی نقی تخلص دولہ شاگرد مرزا اصغر علی خاں نسیمؔ دہلوی۔ لکھنؤ کے رہنے والے اور حضرت نسیمؔ کے شاگردوں میں بڑے خوش فکر تھے۔ حضرتِ تسلیمؔ و اشرفؔ کے ہم مشق

تھے مگر کلام اُسکے مرتبہ کو نہ پہنچا۔ عرصہ ہوا انتقال کیا۔ یہ چند شعر درج کیے گئے۔

عاشقوں کیواسطے حالِ پریشاں چاہیئے
آتے ہی فصلِ جنوں ٹکڑے گریباں چاہیئے

کل جو کی تھیں شرطیں ہم نے کیجیے ایفا ضرور
آج ہمکو بوسۂ لعلِ درخشاں چاہیئے

چارہ گر تدبیر درماں عاشقوں کے درد کی
ہمکو پہلوئے صنم آغوشِ جاناں چاہیئے

گر نہیں چادر تو دولہ سے وانگو چاندنی
کچھ تو بہرِ پوششِ گورِ غریباں چاہیئے

دولہ جناب منشی علی احمد صاحب بدایونی بیس بائیس برس سے مشق سخن کرتے ہیں اور رسالوں میں اپنا کلام شائع کراتے رہتے ہیں، باوجود کوشش وہ دریافت نہ تلمذ کی کیفیت معلوم ہوئی اور نہ کچھ حال ملا اشعار ملاحظہ ہوں

جذبۂ دل اسے کہتے ہیں کہ مجنوں کے لیے
لیلیٰ پردہ نشیں نے بھی بیاباں دیکھا

ایک ہی تیغ سے عالم کو کیا تو نے حلال
اُف رے کافر کوئی ہندو نہ مسلماں دیکھا

خیر گذری نہ ہوا شوق اُسے زینت سے
سرمۂ چشم صنم خلق کا قاتل ہوتا

کون ہمدم ہے یہاں کس پہ بھروسا کیجے
دل تو دل جان بھی ہے اُنکے طرفدار نہیں

ٹھیریے ٹھیریے مژگاں کو نہ کیجے سیدھا
دل نہ چھد جائے ہمارا کہیں سوفار نہیں

کبتک یہ سہے درد و غم و رنج کے صدمے
اب صبر کی طاقت دلِ بسمل میں نہیں ہے

کس طرح ہجر میں بہلے گی طبیعت میری
کچھ تو کر دیجے تسلیں دمِ رخصت میری

قبر پر پھول چڑھاتا ہے وہ گل لالہ کے
بارِ احساں سے دبی جاتی ہے تربت میری

آپ بچپائیں نہیں سورۂ یٰسین پڑھیں
آپکے سر کی قسم وہ نہیں حالت میری

عید کے دن وہ رقیبوں سے بغلگیر ہوئے
ہاتھ پھیلائے ہوئے رہ گئی حسرت میری

دیوانہ۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ ہمشیرہ زادہ حقیقی راجہ مہاندرین بہادر دیوان و مدار المہام نواب شجاع الدولہ صوبہ اودھ، یہ خود شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے اور عنفوانِ شباب یعنی ابتدائی عہد شاہ عالم ثانی کا تھا اپنے عمِ نامدار کے پاس گئے اور مدة العمر وہیں امیرانہ شان و شوکت سے بسر کی اپنے ہمعصر رؤسا میں داد و دہش اور سیرچشمی اور قدردانی اہل علم و فن کی بدولت صاحب

امتیاز تھے ذات کے کھتری اور بڑے جامہ زیب نفیس مزاج، وجیہ و شکیل جوان تھے۔ فارسی شعر خوب کہتے تھے اور مرزا فاخر مکین سے بہنگام قیام لکھنؤ میں ہزار ہا روپیہ کا سلوک کر کے کامل ۱۲ برس اس فن میں مشق کی تھی اور مرتبہ استادی حاصل کیا تھا۔ مشاعرے بھی بڑے کروفر سے کیا کرتے تھے بنارس اور لکھنؤ میں بہت رہے اور اپنے وقت میں مستند شاعر مانے جاتے تھے۔ چار دیوان فارسی اور ایک دیوان اردو میں ان سے یادگار ہیں میر حیدر علی حیران اور جعفر علی حسرت استادِ جرأت اِنکے قابل فخر شاگرد تھے ۱۲۰۴ھ میں پیکر وجود کو آتش فنا کے سپرد کیا۔ فارسی کلام دس ہزار اشعار سے کم نہ ہوگا *

دِل سدا تڑپے ہے میرا مرغ بِسمل کی طرح	یا کہ سیکھی مرغ بسمل نے مرے دل کی طرح
جان پر آبنی ہمدم مری خاموشی سے	بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر
بزم میں رات بہت سادہ و پُرفن تھے وے	گرمی بزم کہاں اُس بتِ عیّار بغیر
دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا	ہو چکی اسکو شفا شربت دیدار بغیر
دل ہے کہ تیری تیغ کے آگے سے ٹل نجائے	رستم کا کب جگر ہے کہ زہرہ پگھل نجائے
وے یار کہاں کہ یار باشی کیجئے	وے وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجئے
اِک گوشہ میں بیٹھکر دیوانہ تنہا	اب ناخنِ غم سے دل خراشی کیجئے

دیوانہ مرزا محمد علی جان باشندۂ بنارس ۱۲۴۸ھ کے قریب روشن الدولہ کولبرک رزیڈنٹ کے وقت میں دہلی میں اُنکے پاس رہے پھر علیگڈھ میں تحصیلدار ہو گئے تھے اِس سے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔

اُس کا آخر ادھر کلام ہوا	اپنا قصہ اُدھر تمام ہوا
آیا نہ بعد مرنے کے بھی وہ مزار پر	خاک اسکے پیچھے آپکو ہمنے کیا عبث
میری سرگشتگی کو دیوانے	پہنچے کب آسمان کی گردش
جلتے جلتے ایک دن دیوانہ بس اُٹھ جاینگے	جوں چراغِ صبحدم ہم سینہ سوزاں سمیت

دیوانہ

دیوانہ میر طالب علی صاحب دیوانہ مقیم بنارس شاگرد رشید سید عبداللہ وحشی بنارسی ۱۸۷۲ء میں زندہ تھے اور دہلی کے چند مشاعروں میں تشریف لاکر داد سخنوری دی تھی۔ کلام بامزا ہے اور آپکی چلبلی طبیعت کا آئینہ ہے یہ چند شعر ملے درج کئے گئے +

بندہ بے داموں بکا ہے آپکی سرکار میں	شوق سے بیچو کھڑا کر کے مجھے بازار میں
مجھکو حیرت ہے لڑائی کیلئے چھوڑا ہی کیا	گالیاں دیتے ہیں وہ دشمن کو ہردم پیار میں
ہوگیا ناز اُن کو اپنے حسن پر حد سے سوا	جو نہ کہنا تھا کہا سب ہنسنے اُنسے پیار میں
میں بتادوں تمکو ابے مجھ سے گر تقصیر ہو	تم کو بھی لذت ملے ایسی مجھے تعزیر ہو
یہ مزا ہے یار کے لعل نمک آلود میں	لاکھ بوسے لیکے بھی نیت نہ اپنی سیر ہو
اپنے مرنے کا کیا دعویٰ تو بولے ہنسکے وہ	بولتے ہو مر کے تم دنیا میں زندہ پیر ہو
وہ ہی دیوانے کو پہنا دو کہ وہ شاگرد ہے	حضرت وحشی کی جو اُتری ہوئی زنجیر ہو
کیا ہی دفن مجھے شاہراہ میں اُسنے	کہ ٹھوکروں میں ہمیشہ مرا مزار رہے
نہ دشمنوں کیلئے دوستوں سے بچ کرو	کرو وہ بات کہ دشمن بھی دوستدار رہے
لڑی اشک کی حب گہر ہوگئی	تو زردی مرے رُخ کی زر ہوگئی
جو محنت پہ میری نظر ہوگئی	محبت تجھے فتنہ گر ہوگئی +

دیوانہ

دیوانہ منشی بن گوپال باشندۂ شاہجہان پور ۱۸۹۳ء سے شعر کہتے ہیں اور جناب شاد دہلوی سے مشورہ کرتے ہیں زیادہ حال باوجود دریافت نہ مل سکا۔

اگر شان دیکھے مرے بت کی زاہد	پڑھے اُس کا کلمہ مسلمان ہوکر
بتوں کی محبت نے کافر بنایا	چلے دیر کو ہم مسلمان ہوکر
جنازہ اُٹھائیں گی پریاں ہمارا	مرینگے مقرر سلیمان ہوکر
مزا تو یہ ہے میرے دل میں رہو تم	مری آرزو میرے ارمان ہوکر
زندگی کی تھی شب ہجر نہ کوئی اُمید	آگئی جان میں جان آپکے آجانے سے

آپ بھی کچھ دل بنتا ہے کہتے جائیں	یہ سمجھتا ہی نہیں ہے مرے سمجھانے سے
اس سے بڑھکر مجھے اب اور خوشی کیا ہوگی	یار نے عہد کیا غیر کے گھر جانے سے
گھر ہے آپکا بازار ہمیں کیا مطلب	ہمکو کیا کام ہے آئے کوئی جائے کوئی

دیوانہ

دیوانہ قسیم الدین احمد دیوانہ سنہ ۱۹ء میں عدالتِ کلکٹری گیا میں اہلِ محکمۂ مال تھے مولانا کوثر خیرآبادی سے تلمذ تھا۔

ہوا ہے عشق میں وارفتہ ایسا	دلِ ناداں نہیں سنتا کسی کی
ہوئی برگشتہ ایسی میری قسمت	پھری ہے آنکھ مجھ سے اس پری کی
گزرتی ہے جو دل کیا بیاں ہو	نہیں امید اپنی زندگی کی

دیوانہ

دیوانہ۔ جناب حکیم سید باقر علی صاحب جیپوری۔ آپ حکیم سید منور علی صاحب متوطن جیپور کے صاحبزادے ہیں اور عرصۂ بتیس سال ہے گویا سنہ ۱۸ء سے فکر شعر کرتے ہیں پہلے باقرؔ تخلص کرتے تھے پھر دیوانہ تخلص اختیار کیا چند شعر نتایج افکار سے درج ذیل ہیں

فصلِ گل میں مرا کیوں چاک گریباں ہوتا	گر مرے ہاتھ میں اس شوخ کا داماں ہوتا
کرتے فرقت کا گلہ ہم نہ ستم کا شکوہ	غیر سے بھی جو یہ شیوہ ترا جاناں ہوتا
تمکو معلوم صنم حال ہمارا ہو جائے	دل تمہارا جو کسی پر کہیں شیدا ہو جائے
نازو انداز یہ اس شوخ ستمگر کی دلا	زندگانی جسے دشوار ہو شیدا ہو جائے
دیکھ کر حسن خداداد کو ان کے باقرؔ	آدمی کیا جو فرشتہ ہو تو شیدا ہو جائے

دیوانہ

دیوانہ۔ سید محمد فاروق صاحب گورکھپوری، دورِ موجودہ کے خوش فکر اور طباع کہنے والوں میں ہیں، نیچرل نظمیں اکثر رسالوں میں نکلتی رہتی ہیں۔

کثرتِ مشق تماشا دیکھنا	اٹھ گیا آنکھوں سے پردہ دیکھنا
سب مزے دنیا کے ہیں نظروں میں خاک	لذتِ ترکِ تمنا دیکھنا
ہو کے محوِ دیدِ حسنِ گلعذار	ہو گیا میں بھی تماشا دیکھنا

اِک نظر میں خاک کر ڈالا ہمیں — کہیے صاحب تھا یہ کیسا دیکھنا
میری رسوائی کے ہو کے درپے تم — ہو نہ جانا خود بھی رسوا دیکھنا

کیا کہیے شب جو حالِ دلِ بیقرار تھا — اب آئے اب وہ آئے یہی انتظار تھا
تیرِ نظر سے ہیں، مری آہِ رسا سے وہ — دونوں بچ سکے کہ برابر کا وار تھا
خارِ الم کی دل میں خلش رات ہی سے تھی — دیکھا جو صبح کو تو جگر بھی فگار تھا
اہلِ غرض سے دور جو صحرا میں جا بسا — دیوانہ سچ تو یہ ہے بڑا ہوشیار تھا

ردیف ڈال

ڈاکٹر

ڈاکٹر - ڈاکٹر بھولا ناتھ صاحب ملازم ریاستِ رامپور ۱۸۹۹ء - حضرت امیر مینائی کے خرمن فیض سے بہرہ ور تھے جدّتِ خیال کے ساتھ زود گوئی اور خوش کلامی کے جوہر بھی انکے کلام میں پائے جاتے ہیں، زبان بھی بُری نہیں، طبیعت بھی شوخ پائی ہے - اشعار ملاحظہ ہوں

نیم جاں چھوڑ کے مقتل میں نہ جا اے قاتل	تیرے کشتے تو ابھی سانس ذرا لیتے ہیں
یادِ مژگاں کی جو ہے بادیہ پیمائی میں	خوب کانٹوں کے مزے آبلہ پا لیتے ہیں
وائے تقدیر کہ ہم پھرتے ہیں مارے مارے	غیر گھر بیٹھے محبت کا مزا لیتے ہیں
ڈاکٹر ہمکو نہیں اور کوئی بیماری	دردِ الفت کی جو دے کوئی دوا لیتے ہیں
اُدھر پھانسی گلے میں کاکلِ پیچاں نے ڈالی ہے	اُدھر ٹٹی لگائے آڑ میں کُرتی کی جالی ہے
حیا کا ہائے یہ کہنا کہ خواب ناز سے اُٹھ کے	نہیں تو اب یہاں بوسونکی چوری ہونیوالی ہے
اے اجل تجھ سے بھی سخت اور مصیبت آئی	تو نہ آئی ترے بدلے شبِ فرقت آئی
تو نے نالے چرخ کبھی چین سے رہنے نہ دیا	کٹ گیا دن تو بلائے شبِ فرقت آئی
بھولی صورت پہ یہ غصہ یہ ستم یہ شوخی	ڈھل کے کیا حُسن کے سانچے میں قیامت آئی
داورِ حشر سے فریاد بھی ہم کرنے نہ پائے	لب ہوئے بند زباں پر نہ شکایت آئی
ہو گئے فرط قلق سے مرے دل کے ٹکڑے	یاد وئے زخم جگر جب تری صورت آئی
جو تصور میں بھی آئے تو قیامت آئی	وائے قسمت کہ اُسی پر ہے طبیعت آئی
ڈاکٹر سے نہوا دردِ محبت کا علاج	چل دیا چھوڑ کے جس دم تپ فرقت آئی

ردیف ذال

ذاخر

ذاخر - جناب سیّد فرزند حسین صاحب لکھنوی عرف اچّھن صاحب لکھنؤ کے مشہور خاندان مجتہدان کے ممبر ہیں، آپ کو اپنے ماموں نواب سیّد اصغر حسین خان صاحب فاخر سے ابتدائے مشقِ سخن سے تلمّذ رہا ہے، مولانا مہدی حسن صاحب ماہر آپکے رشتہ میں نانا تھے، مشقِ سخن خاصی ہے اور علمی استعداد بھی بُری نہیں قاضی خلیل کے مشاعرے میں بریلی میں ملاقات ہوئی تھی اب غالباً پینتالیس برس کا سن ہوگا، کلام اور حالات بھیجنے کا اقرار کیا تھا مگر باوجود تقاضوں کے ایفا کی نوبت نہ آئی کچھ اشعار جو رسالوں سے چُننے گئے درج ذیل ہیں :-

آنے دے مجھے مری شوریدہ سری کا عالم ۔ کوئی مشکل نہیں شہروں کا بیاباں ہونا
آجتک یاد ہے زینت میں وہ غصّہ کی ادا ۔ آئینہ توڑ کے پھروں وہ پشیماں ہونا

اُسے فریاد سے اپنی نہ تم بدنام کر جانا ۔ نہ کاٹے کٹ سکے طولِ شبِ فرقت تو مر جانا
اُتر کر قبر میں منہ سے کفن تم کیوں ہٹاتے ہو ۔ لڑکپن ہی ہماری دیکھکر صورت نہ ڈر جانا

لاش ہوتی دوشِ قاتل پر تو تھا مرنیکا لُطف ۔ لیکے بسمل کو لحد تک اضطراب آیا تو کیا

رہا کچھ تیغ پر کچھ آستیں پر ۔ نہ گرنے پایا میرا خوں زمیں پر
سیہ بختوں کی جب جا تربتیں تھیں ۔ نہ بجلی بھی گری اُتنی زمیں پر
لحد پہ مہوشوں کا پاکے مجمع ۔ ستارے ٹوٹے پڑتے ہیں زمیں پر

بیخودیٔ قیس کہتی تھی کہ کیوں چُھپتی ہے تُو ۔ شکل تیری خود اُسے لیلیٰ نظر آتی نہیں
تم پریشاں عاشقوں کی بھیڑ سے ہوتے ہو کیوں ۔ ہوں اگر لاکھوں پتنگے شمع گھبراتی نہیں

کھینچ آیا خونِ دل آنکھوں میں اشکوں کی روانی سے ۔ نکالی سوزِ داغِ دل نے آخر آگ پانی سے
یقینِ مرگِ قاتل کو نہیں ہے سخت جانی سے ۔ گلے پر تیغ بعدِ ذبح بھی ہے بدگمانی سے
ہزاروں حسرتوں کا بسملوں کی خوں ہوا قاتل ۔ تڑپنے بھی نہ پایا کوئی خنجر کی روانی سے
یہ خونِ قلب ہے مہندی بھرے ہاتھوں کا نقشا ہے ۔ جو مٹھی بند ہو دل ہے جو کُھلجائے تو دریا ہے

لیا ہے دل کسی کا یا چمن سے پھول توڑے ہیں
ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپکے دامن میں کیا کیا ہے

سر طور اے کلیم اللہ کیجے ہوش کی باتیں
جسے دیکھے نہ کوئی اُسکے ملنے کی تمنا ہے

نزع میں وہ دیکھنے کو آئے ہیں
دم نکلتا بھی ہے دیکھا چاہیئے

جسکے گھر میں بعد مدت کے وہ آئے
شادمانی اُسکی دیکھا چاہیئے

آکے تڑپا جائیں جس دل کو وہ خود
بیقراری اُسکی دیکھا چاہیئے

لحد میں نیند بھی ایسی کہ کچھ ہوئی نہ خبر
جگا جگا کے تھکا مجکو شور محشر بھی

تجھے رقیب اُسنے گر جگہ دی نہ کر غرور انجمن میں اُسکی
یہ بچپنا ہے کہ عکس کو بھی وہ آئینہ سے بلا رہا ہے

عیاں ہیں سامان سرور و غم کے ہیں ظلمت و نور گرد میرے
کوئی حسیں سر کے بال کھولے چراغ مرقد جلا رہا ہے

کچھ ایسے کانپتے ہیں ہاتھ گردن پر ستمگر کے
رگوں سے خط الگ پڑتے ہیں وقت ذبح خنجر کے

مجھے کیا دخل دل کو جس طرح چاہو کرو برباد
مگر اتنا سمجھ لو رہنے والے ہو اسی گھر کے

نکلتے ہیں یہ جتنے اتنی ہوتی جاتی ہے تسکیں
ہیں آنسو کیا شب فرقت میں ارماں قلب مضطر کے

وہی احباب جن سے زیست میں کیا کیا امیدیں تھیں
چلے جاتے ہیں اپنے پاؤں میری قبر پر دھر کے

اثر یہ جذبۂ الفت کا بعد مرگ بھی تھا
وہیں وہ بیٹھ گئے قبر تھی جہاں میری

ذاکر

ذاکر۔ ہزار کوشش و تلاش کے باوصف اِس پُرگو شاعر کا نام معلوم نہ ہو سکا ضخیم دیوان کے معائنہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ دہلی سے آصف الدولہ کے وقت میں لکھنؤ گئے، اور اُنکی شاہانہ داد و دہش سے فیض اُٹھایا۔ امجد علیشاہ کے وقت تک زندہ تھے حضرت ناسخ سے ہمعصرانہ مراسم تھے۔ پُرگو از حد تھے اور ۲۰ جزو کے قلمی دیوان میں فحش و غیر مہذب کلام سے جا بجا نمونے ملتے ہیں، ایک خصوصیت اور ہے کہ غیر مانوس ردیف اور قافیوں میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اِس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید شاہ نصیر کے شاگرد یا ہم مشق رہے ہوں، اِنکے قادر الکلام اور مشاق ہونے میں شبہ نہیں متروک الفاظ اکثر پائے جاتے ہیں۔ آخر عمر بہت غربت اور بے سروسامانی سے

کئی۔ اب دیوان کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

ہمدموں کیا کہوں احوال دل اپنا تمسے　　سمجھے اپنا تھے جسے سو وہ پرایا نکلا
وہ دن تو مجکو ہنستے ہی بس کٹ گیا تمام　　جس روز ہمکو وہ گل خنداں نظر پڑا

موتی مونگا اُسے ملجاتا تھا دہلی وہ تھی　　سوپ میں کوڑی کو جسنے کہ پچھوڑا کیا کیا
شاہ نصیر الدین حیدر کو خدا قائم رکھے　　کون کون ہمنے نہ دیکھا اُس کا نائب ہوگیا
وہ نگاہِ لطف اب اُسکی نظر آتی نہیں　　عشق اپنا اُسپہ شاید آشکارا ہوگیا
نام تو باقی رہا دینے سے اُس کا دہر میں　　صرف گو حاتم کا سب مال و خزانہ ہوگیا

جب مری جانب وہ نظر کر گیا　　سینہ میں سو ٹکڑے جگر کر گیا
منتیں کیں میں نے بہت شوخ کی　　پر نہ مرے پاس ٹھہر کر گیا

ہم کہتے ہیں یا قتل کرو یا بوسہ دو لب ملنے کا　　ان دو باتوں میں تم سے اب بھی نہوا وہ بھی نہوا
شیخ جی بھوکے تھے ایسے کہ سئیسوں سے مانگ　　تھا جو گھوڑے کا وہ ستیا رہیلا کھایا
آیا پڑ سے کو جہاں قاضی کی لونڈی جو مری　　جب موئے قاضی تو پھر کوئی نہ دیکھا آیا
غور کر دیکھا تو ہے رُو و ریا کا یہ مقام　　کوئی بیکس کا اُٹھانے نہ جنازہ آیا
گھر میں تو ہوا اندھیرا اور دیکھے مسجدوں میں　　ہمنے جلائے گھی کے جا کر دئیے تو پھر کیا
احسان کرے لاکھوں رکھے مُنہ پہ تو ہیں خاک　　اِس طرح کا مُو بھر ترا احسان نہ اُٹھے گا

میٹھی نظروں سے وہ اُس کا دیکھنا　　ہائے میرے واسطے کیا سم رہا
جبتک کہ پاس دل رہا اندیشہ ہی رہا　　جانے سے دلکے اب مجھے آرام ہوگیا
ہمارے سینہ کا کیونکر نہ ہووے داغ نیا　　نہ تیل بتی ہے جلتا ہے یہ چراغ نیا
دل دیکھ اُسے کس کا تماشا نہیں سپتا　　ہر چشم سیہ کا یہ بادام نہیں سپتا
یہ بات جو میں سونچا دیکھیگا ہر اک لیکر　　تصویر بنا اُسکی بہزاد بہت رویا
پوچھا اُس شوخ سے میں نے یہ بھلا کسکے لئے　　ف　　ڈال کر میوہ برابر کا بنایا میٹھا

ترش رو ہو کے لگا کہنے نہیں اس سے کیا / جسکو جی چاہا اُسے ہمنے کھلایا میٹھا
کیوں جور و جفا کرتے ہو پوچھا جو کسی نے / کہتا ہے یہ میرا ہے گنہگار محبت

یوں ہولی کھیلتے دیکھا ہے ہم نے آصف کو / گلال سیکڑوں من اُڑتا تھا عبیر سمیت
یہ ہوتا ہی نہیں معلوم کیوں یہاں سے رئیس / نکل گئے ہیں بہت مبلغ خطیر سمیت
جو بخشوانے گئے شیخ ماں سے اپنا گناہ / وہ بولیں بخش دیا میں نے بلکہ شبیر سمیت
جو چار دن سے لگے کہنے شعر ہیں گے اب / وہ طعن کرتے ہیں سودا پہ بلکہ میر سمیت

دم غلامی کا جو کہ بھرتا ہو / بندگی اپنی سے نہ کر آزاد

عجب ہے ذاکر تماشا دیکھا کہ چند روز نہیں اپنے آگے / جنھیں نہ آتی تھی بات کرنی وہ کرتے باتیں بنا بنا کر
جو ہیں اُس شوخ نے پھینکا نگہ کا تیر گردوں پر / وہیں بس ہو گیا مرغِ سحر نخچیر گردوں پر
سنا اُسکو جو ٹھوکر مار کر مردے جلاتا ہے / مسیحا ہو گئے جی اپنے میں دلگیر گردوں پر
شفق پھولی نہیں ہرگز بہا ہے خون دونکا / مہ و خور ہیں چلی ہے آج کیا شمشیر گردوں پر
یہ گل تو کیا ہیں باغِ جہاں کے مُنہ اُس کا دیکھ / کھاتے ہیں رشک سب گلِ باغِ جناں تلک
نازک مزاج جتنے ہیں وُہ سونگھتے نہیں / چھپے کے کہتے پھولوں کو ہیں دردسر کے پھول
مار کر منہ پہ طماچوں کو چھڑا دیوے نسیم / اپنی منقار سے گر گل کو اُٹھالے بلبل

کیا حسن بیاں کروں میں اُس کا / بس دیکھ کے اُسکو مر گئے ہم
سمجھا نہ ہمیں وہ اپنا عاشق / جاں اپنی سے مفت پر گئے ہم

عیاں جو اُسنے کیا وہ عیاں تو سب پر ہے / نہاں جو اُسنے کیا وہ نہاں نہیں معلوم
موسم گل قید میں گذرا تو اے صیاد ہم / کیا کرینگے اب قفس سے تیرے ہو آزاد ہم
خوف کے مارے جو منہ پر نہیں کہتے تجکو / جان لو دل میں وہ اپنے بخدا کہتے ہیں
پی کے مے زاہد تو گلیوں میں پڑے ہیں لوٹتے / شیخ افیوں کے نشے میں ہوتے ہیں ناک میں

قطعہ
رکھے اللہ امجد علی شاہ کو مدام / دیتا دعا ہر ایک اُسے راہ باٹ میں

لندن کے تو سوا ہیں پل ایسا تھا بنا
ذاکر نے بدکے سب کو قلم کرو ہیں کہا
ہوتی تھی گفتگو یہی شہ اور لاٹ میں
بنوایا شہ نے آہنی پل راج گھاٹ میں

نہ آیا حیف وہ ظالم کہا تھا جسنے آنے کو
کوچے سے اپنے تجھے ہے جو اٹھانا مجکو
بڑی قسمت ہے اپنی دوش کیا دیجے لگانے کو
بیٹھنے کا بھی بتا دیجے ٹھکانا مجکو

آنکھ اُٹھا کر تو دیکھو میری طرف
یہ میں جانوں ہوں دوگے آخر رنج
بات آگے نہ کر سکا کوئی
مرنے کے بعد آب ندامت میں غرق ہوں
بات گو مجھ سے اب بھلا نہ کرو
باتیں کر دل کو مبتلا نہ کرو
آنکھیں ایسی دکھا گئے سب کو
تر کرتا بار بار پسینا کفن کو ہے

ہے یقیں مجکو یہ دل میں کریں اُسکے تاثیر
قشقا ہے کھینچا جب سے بت پر جابنے
انگڑائی لیکے تو جو اُٹھا جی پھڑک گیا
سب کالے بال ہوگئے ڈاڑھی کے شیخ کی
مجھ سے وہ آزردہ یار دیکھئے کب تک رہے
پہنچیں اُس تک جو مری آہ رسا کے جھوکے
اسلام تب سے ترک کیا شیخ و شاب نے
کیا پیاری میرے دل کو تری یہ ادا لگی
ترکیب ایسی یاد ہے اُن کو خضاب کی
دل یہ مرا بیقرار ۔ دیکھئے کب تک رہے

ذاکر

ذاکر ۔ مولوی ذاکر علی بنارسی خلف مولوی فضل علی شاگرد مصحفی صاحب دیوان گذرے ہیں مشاق شاعر اور بڑے سخن سنج مانے جاتے تھے نزاکتِ خیال کے ساتھ مضمون آفرینی کا بھی شوق تھا۔

شب جو باتوں میں وہ مہ پیکر بہل کر رہگیا
رنگ سو سو طرح سے گردوں بدل کر رہگیا

لیلیٰ کا جب کہ نجد سے محمل نکل گیا
آرام قیس لاکھوں ہی منزل نکل گیا

لالۂ صد رنگ پھولا کوہ پر تو کیا عجب
شب جو نالاں بیکسی سے یہ دلِ صد پارہ تھا
چلتا ہے وہ قیامت اُس شوخِ نوجواں کا
یہی ہے گر حالِ آہِ سوزاں گرینگے جلکر فلک زمیں پر
کوہکن کا خون کیا کیا رنگ ابھی دکھلائیگا
آسماں سے خونفشاں ہر دیدۂ سیارہ تھا
برپا ہے ہر قدم پر اک شور الاماں کا
یہی ہیں نعرے تو دیکھ لینا کہ حشر ہی حشر تک زمیں پر

دل پھر گیا حرم سے اب دیر میں بسا ہے
پتلیوں تک خون ہو لختِ جگر آنے لگے

دل میں صنم ہے لب پر خدا خدا ہے
لعلِ احمر سنگِ موسیٰ میں نظر آنے لگے

جواہر خانۂ زنداں کو کیا ہے چشمِ پُرخوں نے
مری زنجیر پر نگ جڑ دیئے ہیں اشکِ گلگوں نے

طوفانِ آتشیں پہ ہے عمرِ رواں مری
تو دستِ برہمن سے مارا پڑے گا زاہد

شورِ تنورِ آب زدہ ہے فغاں مری
ناقوس اے ستمگر ٹوٹا تو سکھیا ہے

ذاکر - ببر جان مرحوم خلف میر فخر الدین ماہر لکھنوی، اپنے والد کے شاگرد تھے ۱۲۷۰ھ کے قریب انتقال کیا، اشعار سحر آمیز کہتے تھے، اہلِ مشاعرہ اکثر انکا کلام سن سنکر لوٹ لوٹ جاتے تھے، یہ چند شعر انکے ہاتھ آئے، ہدیۂ ناظرین کیئے جاتے ہیں:

ہوتا ہے جنکو نزلہ تو ذاکر سنا ہے یہ
سمجھے ہے ناس لینا وہ اکسیر ناک ہیں

اُس کو بھی کیسے خلق میں وہ زن مرید ہے
خلوت میں جو پڑے کوئی اپنی دولہن کے پاؤں

وہ دانت بڑھ کے آگے کے آئے ہیں یہ نکل
سمجھو تو شیخ جی کے یہ دو ہیں دہن کے پاؤں

ذاکر ہیں اُنکے در پہ یہ بیٹھا کہ رہ گئے
ہل سکتے اب ذرا نہیں مجھ خستہ تن کے پاؤں

ذاکر - مرزا ذاکر الدین بہادر گورگانی از اولادِ میرزا جواں بخت ولیعہد اول شاہ عالمِ ثانی چونکہ وہ خود بنارس جا رہے تھے اِس لیئے اِنکی اولاد وہیں محلہ شوالہ میں مقیم رہی۔ شاگرد مرزا قادر بخش گورگانی دہلوی، وقت پسند طبیعت پائی تھی اور اکثر مضامین اِس طرح باندھتے تھے کہ صفائی سے دور جا پڑتے تھے تاہم مشاق سخنور تھے ۱۳۰۸ھ تک زندہ سلامت موجود تھے اور سرکار سے اپنی خاندانی پنشن پاتے تھے۔

کوہکن کا سر سمجھکر روئی وہ تقدیر پر
جب حباب آئے نظر شیریں کو جوئے شیر پر

اتنا لاغر ہوں کہ پھنس جاؤں میں اُسمیں مثلِ دم
لپٹے گر تارِ نگاہِ مور مجھ دلگیر پر

وہ ہیں محوِ خود نمائی اور ہم محوِ خیال
دست اندازی ہو کیا تصویر سے تصویر پر

کھو دیئے ذاکر مئے مایوسی و حرماں نے ہوش
گردشِ ساغر کا شک ہے گردشِ تقدیر پر

عشقِ صادق کا اثر ہے آہِ آتشبار میں
آبلے غنچے بنے بلبل تری منقار میں

چار آنکھیں اسکی ہوں چاٹے جو مجھ وحشی کا خون
دیدۂ آہو بنے جوہر تری تلوار میں

ہوشوں کے دھیان ہیں ذاکر کو استغراق ہے
ان دنوں مسکن بنایا ہے تجلی زار میں

خاک اڑانے کی تمنا گر ہمیں وحشت میں ہو
پھر زمیں سو کوس اونچی تجھ سے چرخِ پیر ہو

عاشقوں کے ہاتھ پہلے کاٹتے ہیں وقتِ قتل
تا قیامت میں نہ کوئی ان کا دامن گیر ہو

ہوں وہ افتادہ جو بعدِ مرگ ہو گھٹنے کا قصد
موجۂ ریگِ رواں کی پاؤں میں زنجیر ہو

بے وسیلہ وصلِ معشوقوں کا ہے مجھکو پسند
پونچھ ڈالوں آنکھیں گر سرمہ تسخیر ہو

روشنی ایسی نہ تھی ذاکر تمھاری نظم میں
دھیان ہیں شاید کسی کا روئے پُر تنویر ہو

مری حیات کا باعث وہی نگار رہے
بجائے روح بدن میں خیالِ یار رہے

دبا و نعش کو گردِ نگارہ گلرو میں
کہ میرا حسن کے گلزار میں مزار رہے

دکھاؤ آتشِ رخ پر ہلالِ ابرو تم
کہ جس سے نعل در آتش یہ دلفگار رہے

جدا رخ سے زلف ای قمر ہو گئی
تماشا ہے سب شب سحر ہو گئی

شبِ وصل وعدو کا تھا کیا اے خدا
ذرا آنکھ جھپکی سحر ہو گئی

یہ تڑپے ہیں پس مرگ مدفن میں ہم
زمیں ساری زیر و زبر ہو گئی

ذاکر مولوی محمد ذاکر علی باشندۂ قدیم قصبہ شاہ پور ضلع فتحپور ہسوہ، بہ سبیل روزگار ابتدائے سن شعور سے مختلف اضلاع میں رہے چنانچہ ۱۸۸۶ء میں کئی سال سے آگرہ کی کمشنری میں سررشتہ دار تھے استعداد علمی معقول تھی، انکے کلام سے پایا جاتا ہے کہ فکرِ سخن میں مضمون پیدا کرنے کا خیال بہ نسبت ادائے بیان میں سلاست اور صفائی پیدا کرنے کے زیادہ رہتا تھا اس لیئے باوجود اسکے کہ بڑے پُر گو کہنے والے تھے کلام میں سادگی۔ روانی اور صفائی کا عنصر کم ہے، میرزا حاتم علی بیگ مہر کے مشورہ سے شعر کہتے تھے جو اس زمانے میں آگرہ کے شعرا کے سرتاج مانے جاتے تھے، اور فی الواقع ایک مسلم الثبوت استاد اور اپنے

وقت کے مشاہیر میں ہر طرح ممتاز تھے، دیوان نغمۂ بہار نامی اٹھان ہیں جزو پر اُس زمانہ میں چھپا تھا، ذاکر، منشی خادم حسین رئیس، صفی امروہوی، ماہ لکھنوی، بزم اکبرآبادی وغیرہ سے ہم صحبت رہتے تھے، فارسی میں بھی ایک مجموعہ مختصر ان سے یادگار ہے۔ طولانی غزلوں میں بھی بمشکل ایک دو شعر مغلق اور پیچیدہ تراکیب سے معرا نکلتے ہیں، مگر ہمنے حتی الوسع صاف عاشقانہ زبان کے اشعار چنے ہیں دیوانِ مطبوعہ کا از سرتاپا انتخاب اپنی پسند کے موافق ضیافت طبع شائقین کے لیئے مہیا کیا جاتا ہے اس میں ہمنے اخلاقی مضامین ارادتاً زیادہ چنے ہیں۔

وہ شائق ہوں کہ اپنی جان شیریں دیکے کھاتا ہوں
بہت میٹھا ہے پھل قاتل تری شمشیر بُرّاں کا

سچ پُوچھو تو کچھ جھوٹ سے حاصل نہیں ہوتا
سرسبز کبھی دعوئے باطل نہیں ہوتا

کہدو یہ خریداروں سے مول اسکا نہ پوچھیں
جو دے نقد کوئی وہ بیعانہ ہے اُس کا

رہبر راہِ حقیقت ہے غمِ عشقِ بتاں
وہ مصیبت پڑی سر پر کہ خدا یاد آیا

میں غم کو، مجھے کھائے جاتا ہے غم
وہ میری میں اُس کی غذا ہو گیا

آجتک کیا نہ ہوا اور نہ ہوگا کیا کیا
دیکھا اور دیکھیں گے دنیا کا تماشا کیا کیا

دل ہی دل میں میری باتوں سے کٹے جاتے ہیں غیر
رکھتی ہے میری زباں قاتل اثر تلوار کا

عطر ہے جس کا پسینہ وہ بدن کیا ہوگا
گالیاں جسکی ہیں شیریں وہ دہن کیا ہوگا

بال بکھرے ہیں تو کیوں اتنے پریشاں ہیں حضور
تھوا زلف میں شانہ تو بلا سے نہ ہوا

غیر سے ہم کنار کیا کہنا؟
مجھ سے ملنے میں عار کیا کہنا؟

نہ چلا وبکے آسمان سے کبھی
میرے منتِ غبار کیا کہنا؟

وہ خفا ہم سے تم اُنہیں ذاکر
کئے جاتے ہو پیار کیا کہنا؟

پہلے کہاں تھا خاطرِ جفا سے تو آشنا
اتنا ہمیں سے تو نے ستم ایجاد کر دیا

آفتابِ رخِ پُر نور کی تابش ہے غضب
دھوپ جلنے لگے پڑ جائے جو سایہ اُنکا

ہم پری کہتے ہیں اُنکو وہ ہمیں دیوانہ
ایک مدت سے یہ جھگڑا ہے ہمارا اُنکا

ذاکر خوشی کے ساتھ نہ کیوں پی لیا کروں / کرتی ہے دل سے دور غمِ دو جہاں شراب
زاہد پی لو قسم کھانے کو اک ساغر شراب / ورنہ کب جنت میں دینگے ساقیٔ کوثر شراب
ہو کے ساقی نے ترش رو جو دیا جامِ شراب / سمجھے ہم سرکہ بھی ہے داخلِ اقسامِ شراب
میں نے یوسف جو کہا کہنے لگے پیار سے آپ / کچھ مجھے مول نہیں لائے ہیں بازار سے آپ
تو نے جو بہرِ عیادت کل کا ہے وعدہ کیا / تندرستوں سے بھی اچھے ہیں ترے بیمار آج

دے چکا ساتھ خط کے صبر و قرار / اب مرے پاس کیا رہا قاصد
پھر نجائے خدا سے اسے ذاکر / ہو کے اُس بُت سے آشنا قاصد

ہوں وہ وحشی کہ نہیں چین مجھے گھر باہر / گھر ستاتا ہے جنوں پڑتے ہیں پتھر باہر
کریں تجویز کیا منسوخیٔ تحریرِ قسمت کی / خدا کے گھر سے آیا ہے یہ جھگڑا فیصلہ ہو کر
چاہیے جو اپنی خیر تو جائے نہ شر کے پاس ؛ / ہو جس بشر میں شر نہ رہے اُس بشر کے پاس

ہو کے مفلس بھی نہ شاکی ہوئے تقدیر کے ہم / شکر ہے صبر کی دولت تو بچی زر کے عوض

واں پہنچ کر سب مرے ہو جاتے ہیں بیکار خط / بھاؤ میں ردی کے بکتے ہیں سرِ بازار خط

کیا خاک ہو غمِ دلِ اندوہگیں غلط / لکھا نصیب کا بھی ہوا ہے کہیں غلط
نہیں اِن دو بلاؤں سے کہیں چین / جہاں دیکھو زمین و آسمان ایک
رہا ذاکر نہ بعدِ حضرتِ مہر / زمانے میں سخن کا قدرداں ایک

کترا کے نکل جاتے ہو کیوں راہ میں ہم سے / عاشق ہیں تمھارے کوئی رہزن تو نہیں ہم
گانا سن کے ترا جی سے گزر جاتے ہیں / سینکڑوں ہی تری ہر تان پہ مر جاتے ہیں
اللہ رے بیخودی نہیں اتنا بھی ہمکو ہوش / بیٹھے ہیں کسکے پاس کہاں ہیں خبر نہیں

ٹھہرے یہ پاس آپکے ممکن کبھی نہیں / لیجاتا میرے دلکا کوئی دل لگی نہیں
گھر آپکے بچشمِ گہر بار آئے ہیں۔ / ہم نذر دینے موتیوں کا ہار لائے ہیں

کروں میں کس کس پہ دلکو صدقے ہیں خوبرو کم سے کم ہزاروں / خدا ہی کو اپنے کیوں نہ مانوں کہ ہے وہ تنہا صنم ہزاروں

کہوں میں کس سے کیا حال اپنے جی کا نہیں ہے پرساں کوئی کسی کا
غضب ہے اس میری بیکسی کا کہ ایک ہیں اور غم ہزاروں

مری مصیبت نہ پوچھو کیا ہے بلا کا ہر وقت سامنا ہے
دل اپنا اُس زلف میں پھنسا ہے کہ جسمیں ہیں پیچ و خم ہزاروں

دل بیچتے ہیں ایک صنم خوش ادا کے ہاتھ
قیمت وہی خوشی سے جو دیدے اُٹھا کے ہاتھ

دکھائے لطف یہ گردش نے مجکو غربت میں
جہاں رہے یہی سمجھے کہ ہم وطن میں رہے

تمام عمر سفر میں بسر ہوئی اپنی
مسافرانہ بھی اِک دن نہ ہم وطن میں رہے

کہتے ہیں وہ دکھلا کے مجھے کاکل و عارض
لو دیکھو کہ ہوتی ہے شب ایسی سحر ایسی

مثل اُس کا نہ دیکھا نہ جواب اس کا سُنا ہے
کس مُنہ سے کہیں ہم دہن ایسا کمر ایسی

عاصی ہوں لاکھ پھر بھی جو تو چاہے اے کریم
جنت کو فخر تیرے گنہگار سے ملے

پہچانوگے نہ کعبہ کا رُخ بھی جناب شیخ
گھر تک جو اِن بتوں کے خدا کی قسم گئے

بیان کیا عجب کا ہو اُسکے کہ سایہ تک جس سے دور بھاگے
ملا سکے آنکھ اُس پری سے کسی بشر کی مجال کیا ہے

موت میری شکل سے بیزار ہے
زندگی کی کیا ہو صورت دیکھئے

پھینک دونگا پھاڑ کر فردِ گناہ
واں مری دیوانگی کام آئے گی

تم کہے جاتے ہو میں خاموش ہوں
میں کہوں تو بات کیا رہ جائیگی

ذاکر

ذاکر شیخ برکت اللہ صاحب دہلوی۔ صاحبِ دیوان ہیں، حالات باوجود کوشش مُہیّا نہ ہو سکے نہ دیوان سے کچھ پتہ چلتا ہے طباع اور ذہین شخص معلوم ہوتے ہیں، زبان اور بندش دونوں اچھی ہیں اور اُس میں معرفت کا رنگ اچھی طرح نمایاں ہے، دیوان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

کعبہ میں بتکدہ میں ڈھونڈا ہے خوب تجھکو
آخر کو ہمنے پایا دل میں مقام تیرا

روزِ الست سے اِک سرشار ہم نہیں ہیں
عالم ہے مست پیکرِ وحدت کا جام تیرا

ہر رنگ میں عیاں ہے ہر شکل میں نہاں ہے
گر تُو نہ دیکھے اُسکو تو ہے قصور تیرا

بجلیاں دل پہ گراتا ہے ہزاروں ظالم
محفلِ غیر میں یہ آنکھ لڑانا تیرا

یہ بھی ہے جذبِ محبت کا کرشمہ کوئی
تیغ کھنچتی ہے کھنچا جاتا ہے کچھ دل میرا

پھر کبھی ہے آبلہ پائی جنوں سے آج
سوکھی زبان ہے سرِ ہر خار دیکھنا

بت سے نفرت ہو مگر بیخود ہیں شوقِ حور میں
شیخ صاحب کی ذرا پرہیزگاری دیکھنا

کٹوا کے سر کو خوش تر ار بیخود ہو گیا
اک درد سے بتھا روز کا اب چُور ہو گیا

اسقدر چمکے شبِ ہجراں کہ اختر بن گئے
دل کے داغوں سے اندھیرے میں اجالا ہو گیا

ہم نہ کہتے تھے نہ دیکھو آئینہ یہ کیا ہوا
کس لیئے ششدر ہوئے کیوں تمکو سکتا ہو گیا

سیل گریہ میں تصور انکی مژگاں کا رہا
ڈوبنے والوں کو تنکے کا سہارا ہو گیا

بن گئی ہے دم پہ کیا ای حضرتِ ذاکر کہو
تمکو کیوں دشوار اب راتوں کا سونا ہو گیا

پھر مجھے لیجا کے واں رسوا کیا
جو کیا اے دل بہت اچھا کیا

یہ سُنا ہے غیر سے شکوا کیا
شکر ہے کچھ ذکر تو میرا کیا

ملکے روئیں مجھ سے میری حسرتیں
حسرتوں سے ملکے میں رویا کیا

لختِ دل آنکھوں سے نکلے تو کہا
دیکھ آگے آ گیا تیرا کہا

کہاں کسی ہیں یہ خود نمائی کہاں کسی ہیں یہ دلربائی
اگرچہ دیکھی بہت خدائی پر ایک بت سا نہیں کو دیکھا

آئے ہیں بن سنور کر پہلو میں عاشقوں کے
ارماں بڑھا کیئے ہیں کچھ اور رات ڈھل کر

زلف عارض پہ کھا رہی ہے بل
چھائی کالی گھٹا ہے گلشن پر

چار تنکوں نے گل کھلائے ہیں
بجلیاں لوٹ ہیں نشیمن پر

دلِ خود آکر تصدق ہو گیا شبہائے ہجراں پر
فغاں پر، آہ پر، فریاد پر، حسرت پر، ارماں پر

قیامت ٹھوکریں کھاتی ہے فتنہ پاؤں پڑتے ہیں
عجب انداز سے آتے ہیں وہ گورِ غریباں پر

نگاہِ لطف کی تیری یہ ادنیٰ کارسازی ہے
کہ میرے کام جو مشکل تھے آساں ہوتے جاتے ہیں

بے حجاب آج کس نے دیکھ لیا
بات کھٹتے تو شیخ جی دل کی

کیوں تیغ دو دم آج ترے زیبِ کمر ہے
خوں ریزی عشاق مگر مدِ نظر ہے

محیطِ آبِ غیرت ہوں غریقِ بحرِ عصیاں ہوں
مری تر دامنی سے ہو گئے لب خشک ساحل کے

ذاکر

ذاکر منشی عنایت خاں ذاکر ۱۹۱۰ء میں کراچی بندر میں ریلی برادرز کے دفتر میں کلرک تھے، اُس زمانے کی چند غزلیں ہاتھ آئیں اُنکا انتخاب موجود ہے۔

بتوں سے ہر دن رات صحبت ہماری	دکھاتی ہے کیا دیکھیں قسمت ہماری
چلو آج چلکر پئیں شیخ صاحب	کسی دن تو سن لو نصیحت ہماری
ہم اے شیخ کیا اور لیکر کرینگے	ملیگی نہ اُس سے طبیعت ہماری
وطن جاکے باہم ملیں دوستوں سے	کہاں ایسی ذاکر ہے قسمت ہماری

ذائق

ذائق۔ جناب منشی عبدالعزیز لکھنوی عرصہ تک کراچی بندر کی نیو سٹار وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی میں ڈراما نویس رہے، اس روزگار کے سلسلہ میں تمام ہندوستان کی سیاحت بھی کئی مرتبہ بخوبی ہوگئی اب ۴۰ برس کے قریب عمر ہوگی ۱۹۱۰ء میں نامی پریس کانپور میں بھی ملازم رہے مفصل حالات کے لئے بارہا احباب لکھنؤ سے تقاضا کیا، کسی سے جواب باصواب نہ آیا اشعار بہم رسیدہ کا انتخاب یہ ہے۔

نہ کہتا شب وصل ماجا کسی کا	غضب ہو گیا ضد پہ آنا کسی کا
باقی ہے میرے دل میں خدا جانے کیا اُمید	فرقت میں دم لبوں پہ ہے مرتا نہیں ہوں میں
بے دین کردیا بتِ کافر کی چاہ نے	ڈر سے خدا کا نام بھی لیتا نہیں ہوں میں
شب بھر مجھے چھاتی سے لگائے تھا کوئی شوخ	اِس خواب کی تاثیر کا کیا دیکھیں اثر ہو
شوخی تو یہ دیکھے ستم ایجاد کوئی	کہتا ہے وہ ہمسے کہ نہیں باقی شرہو
وفا کیا کرینگے کسی باوفا سے	ستم کرنے والے جفا کرنے والے
شرمندہ ہے قمر ترے گالوں کے سامنے	سنبل کو پیچ وتاب ہے بالوں کے سامنے
شوخی تمام بھول گیا چرخ کج ادا	چکر میں آگیا تری چالوں کے سامنے

ذائق

ذائق شیخ منیر اللہ کانپوری شاگرد حاذق دور موجودہ کے شاعر ہیں اور یہ کلام ہے۔

شیدائے چشم سیگوں مستانہ ہوگیا ہے	مجنوں ہیں جو ہیں کہتے دیوانہ ہوگیا ہے

مسجد میں بیٹھکر تو پیتا ہے مے جو واعظ
تیرا طریق بالکل رندانہ ہوگیا ہے
ہم کوچۂ بتاں میں چکر لگا رہے ہیں
زاہد ہمارا کعبہ بتخانہ ہوگیا ہے
دل میں بتوں کی اُلفت ذکرِ خدا زباں پر
واعظ کی کچھ نہ پوچھو دیوانہ ہوگیا ہے

ذبیح

ذبیح۔ مرزا امان علی مقیم بہادر بقولِ نساخ شیعہ عقائد سے توبہ کرکے سُنی ہوگئے تھے اور ۱۸۷۰ء تک حیات تھے ۔

اسقدر تو ہو رجوعِ قلبِ عاشق سوئے دوست
منہ جو دشمن کا نظر آوے تو سمجھے روئے دوست
یہ وہی سر ہے کہ اب ہے اپنے زانو پر سدا
بارہا اسی کو تھا میسّر تکیہ زانوئے دوست

ذبیح

ذبیح۔ نواب اسمٰعیل خان ذبیح معروف بہ اچھے میاں، بریلی کے رؤسا میں نواب حافظ الملک رحمت خاں کی اولاد میں تھے، محمد ابراہیم خاں کے بیٹے اور نواب عبدالعزیز خاں عزیز مرحوم کے بھتیجے تھے۔ سترہ اٹھارہ برس ہوئے پچاس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ اُنکے کلام بہم رسیدہ کا خلاصہ ہے جو بڑی وقت سے معرفت شفیقی و مکرمی قاضی محمد خلیل صاحب رئیس بریلی دستیاب ہوا ۔

حافظ آتشِ حب ہے دلِ بیتاب اپنا
آگ اُس پر ہوئی قائم وہ ہے سیماب اپنا
عشق نے ہم سے ازل ہی میں لیا تھا آرام
آنکھ بھی پائی نہ تھی جب سے گیا خواب اپنا
وہ ہوں حباب کہ قطرہ مئے عدم کا تھا
اُبھار لائی ہے اِس نشہ میں ہوائے شراب
اثر شکستہ دلی کا ہے جسمِ لاغر پر
شکن کی طرح پڑا ہوں میں اپنے بستر پر
ملجائے کوئی بت تو اُسے دل میں جگہ دیں
کعبہ کے لیئے ڈھونڈتے پھرتے ہیں صنم ہم
تسکین مجھ سے ہو جو کسی تشنہ کام کی
اے آبِ تیغ یہ بھی ہے اک بات کام کی

ذبیح

ذبیح۔ مولوی سید محمد اسمٰعیل ساکن تحصیل چھبرامئو ضلع فرخ آباد ۱۲۶۲ ہجری سالِ ولادت ہے، نیک نفس خلیق، اور پاک باطن شخص ہیں۔ عربی۔ فارسی کی قابلیت معقول رکھتے ہیں ابتدائے عمر میں علمی کرتے تھے، معلمی کے بعد اپنے بھائی مولوی محمد عمر مرحوم کی نیابت

سے وکالت کا امتحان دیا اور پاس ہو گئے، جب تک انکے برادر مذکور فتح گڑھ میں وکالت کرتے رہے یہ اور مقاموں میں رہے انکی رحلت کے بعد فتح گڑھ میں وکالت شروع کی اور آجتک وہیں وکالت کرتے ہیں، شعر و سخن کا ابتدائے عمر سے شوق ہے، فارسی زبان میں بھی فکر سخن کرتے ہیں بلکہ اردو سے زیادہ اس طرف توجہ ہے، نواب فصیح الملک جہاں استاد حضرت داغ دہلوی مرحوم کے جاں نثار شاگردوں میں ہیں، اگرچہ کسی وقت اپنے استاد کی زیارت سے مشرف نہیں ہوئے مگر انکی عقیدت اور ارادت کی وہ حالت ہے کہ جو ہر وقت کے حاضر باش کو بھی نہیں ہوسکتی، نہایت زندہ دل اور عجب بے فکر طبیعت پائی ہے، اگرچہ وکالت کا کام وہ ہے جو آدمی کو دوسری طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا مگر جناب ذبیح اسکے ساتھ ساتھ اپنے تمام دلچسپیوں کے مشاغل بھی نہیں چھوڑتے، شکار اور شاعری دونوں کا شوق برابر ہے۔ بلکہ یہ التزام ہے کہ سال کو تین فصلوں پر منقسم کرکے ایک ایک فصل کے لیئے اپنا ایک ایک کام مقرر کر رکھا ہے، یعنی چار مہینے قانونی خدمت چار مہینے شاعری، چار مہینے شکار، غرضکہ عجب رنگ کے آدمی ہیں۔ زندہ دلی میں فرد ہیں۔ اکثر شاعری بھی کرتے رہتے ہیں، ۳۰ برس سے مشق سخن ہے اور بدرجۂ اوسط سب خوبیاں انکے کلام میں موجود ہیں ٭

ہاں ہٹ کے ذرا راہ سے ای گیسوؤں والے
بھڑ جائے نہ تجھ سے دل دیوانہ ہمارا

نگاہیں قیس کی ٹکرا رہی ہیں سر قیامت ہے
اٹھا دے اے صبا للہ تو ہی پردہ محمل کا
ادھر شوق شہادت سے رگوں میں خوں کی طغیانی
ادھر چل چل کے رک جانا گلے پر تیغ قاتل کا
ہزاروں بیگنہ دن رات یونہیں قتل ہوتے ہیں
نہ دم رکتا ہے خنجر کا نہ دل دکھتا ہے قاتل کا

یار کے نام پہ لازم ہے فدا ہو جاتا
اک اسی فرض کا باقی ہے ادا ہو جانا
پھر مجھے مورد الزام بناتا ناحق
غیر کی بات پہ پھر مجھسے خفا ہو جاتا
زلف تک شانہ تو پہنچی ہے اب دور ہی کیا
تا کمر بڑھکے انھیں دام بلا ہو جانا

خلش نوکِ مژہ رنگئی دل ہیں پس کر
نہ تو وہ نکلی نہ ارمان ہمارا نکلا

ضبط نے بھر کے طبیعت کبھی رونے نہ دیا
داغِ غم دامنِ دل سے کبھی دھونے نہ دیا

اللہ اللہ تری بیگانہ مزاجی جس سے
غیر تو غیر ہیں اپنا مجھے ہونے نہ دیا

اے ہوا تیری غرض کیا ہے کہ تو نے دم بھر
شمع مرقد کو مرے حال پہ رونے نہ دیا

اے بتو بندہ پروری سیکھو
حوصلہ ہے اگر خدائی کا

ہوئی پھر جو فصلِ بہاری کی آمد
ہرے پھر یہ زخمِ جگر دیکھ لینا

نظروں سے جو اترے ہیں تو سولی پہ چڑھے ہیں
اللہ غنی رتبہ شاہانہ ہمارا

اے فلک زور پہ اپنا جو ستارا ہوتا
پاس میرے بھی کوئی چاند کا ٹکڑا ہوتا

پرتوِ رخ نہ سہی سایۂ کاکل ہی سہی
کوئی تو آکے انیسِ شبِ یلدا ہوتا

وہ مسیحا نہیں آتا ہے تو موت آجاتی
دردِ دل کا تو کسی طرح مداوا ہوتا

میرے مرنے پہ تو مخلوق نہ ہنستی مجھ پر
خوب ہوتا سرِ بالیں نہ مسیحا ہوتا

رخصت اے رشک کہ ہم صلح عدو سے کر لیں
دیکھ لیں ہم بھی کہ لڑتی ہیں نگاہیں کیونکر

کوئی شے عالمِ بالا سے پلٹتی ہی نہیں
اے ذبیح آتی ہیں واپس تری آہیں کیونکر

پہلو سے تیرِ یار نکالا تو اس کے ساتھ
لپٹے ہوئے ذبیح کے نکلے پارہ ہائے دل

یہ عجب بات ہے ساقی ترے میخواروں میں
مست مستوں میں ہیں ہشیار ہیں ہشیاروں میں

تھی مجھے اپنی دوا کے لئے عیسیٰ کی تلاش
وہ ملے بھی تو ملے آپکے بیماروں میں

مناظر ہیں خدا کی صنعتوں سے
خدا رکھے خدا سازان کی آنکھیں

مجھ سے ظاہر میں فلک اور خفا تو دل میں
ایک عدو سر پہ سوار ایک بلا کو دل میں

پھر جان زار بھی نہ تھی عندلیب سے
چھوٹا جو برگِ گل دہنِ عندلیب سے

جلوہ ہے ایک ہم سے نہ پنہاں قریب سے
دیکھا ہے ہم نے دور سے اس نے قریب سے

کل میکدہ میں شیخ کی حالت تھی اور ہی
آتے ہیں آج تو یہ نظر کچھ ادیب سے

موسیٰ کی طرح ہوش ہم اپنے گنوائیں کیوں
کچھ اُنکے رعب حسن سے کچھ میرے خوف سے

بیوجہ مُنہ پھلائے نہیں ہیں چمن میں پھُول
اک آنکھ سوئے گُل تھی تو اک سوئے آشیاں

مرے سینے کے ویرانے میں کیا جانے دھرا کیا ہے
ایک وہ خنجر جو چلنے کو کفِ قاتل میں ہے

آج خوش خوش جا رہا ہے قیس کیوں ناقے کے ساتھ
مجھ سے حاصل میری دلکی حسرتوں کا پوچھنا

مرگِ دشمن کی مجھے اُنکو مرے مرنے کی فکر
وسعت آبادِ جہاں میں جن کی گنجایش نہ تھی

نہیں سمجھتے ہیں زلف سیہ کے دیوانے
مجھے جو دیں وہ عقوبت تو مستحق ہوں میں

شب وصل اُنکے چہرے کی ضیا کچھ اور کہتی ہے
بٹھائے دیتی ہے جی گرچہ کو تہ دستیٔ قسمت

لب جاں بخش کے عیسیٰ نفس ہونیکا کیا کہنا
کسی کی موت قبل از وقت تو آتی نہیں ہرگز

ذکرِ حبیب خوش ہے لفافۂ حبیب سے
نکلی نہ ایک بات زبانِ رقیب سے

بھڑکا دیا صبا نے اِنھیں عندلیب سے
صیاد جب چھُٹا تھا چمن عندلیب سے

نہ تیرا غم نکلتا ہے نہ میرا غم نکلتا ہے
ایک وہ حسرت نکلنے کو جو میرے دل میں ہے

کون تسکین بخش جنبش پردۂ محمل میں ہے
تم وہی آخر کروگے جو تمھارے دل میں ہے

ایک ارماں اُنکے دلمیں ایک میرے دل میں ہے
جمع اُن سب حسرتوں کا خون میرے دل میں ہے

کہ کھیلنی ہے سرِ یار پر قضا اُن کی
جو بخشندیں وہ خطائیں تو ہے عطا اُنکی

لپٹ کر کالی زلفوں کی بلا کچھ اور کہتی ہے
مگر مجھ سے مری آہِ رسا کچھ اور کہتی ہے

مگر تیغ تبسم کی ادا کچھ اور کہتی ہے
مگر اُس کی ادا میری قضا کچھ اور کہتی ہے

میں اُنھیں حالِ زار جو سمجھاتا ہوں
خاطر عزیز دونوں کی ہے تیر یار کو

میری بھلائیاں تو بُرائی میں ہوں شمار
تمھاری دلربائی کے تصدق

تُم سے تو بتوں لِ نہ سکی داد ہماری
ٹالنے کیلئے کہدیتے ہیں ہاں ہاں سمجھے

دم بھر مقام دل میں تو دم بھر جگر میں ہے
دشمن کرے جو غیب وہ داخل ہنر میں ہے

نیا دل روز میں لاؤں کہاں سے
اللہ سے بس اب تو ہے فریاد ہماری

لاغر بھی ہوئے ہم تو تماشے کی غرض سے | قطعہ | کھنچواتے ہیں تصویر پر یزاد ہماری
دم ساؤھے ہوئے اور ذبیح جگر افگار | | محنت کہیں ہو جائے نہ برباد ہماری
اپنی ہستی کو اگر ہم نہ مٹاتے اے جاں | | پھر یہ پیدا کہیں مضمون کمر کے ہوتے

نصیب اچھے اگر اے بلبل شوریدہ سر ہوتے
پھر آتی فصل گل اور پھر ہرے داغ جگر ہوتے

دُھواں آہوں کا سیدھا چرخ تک پہنچا تو حاصل کیا
کہیں ہے سرو کو دیکھا کسی نے بارور ہوتے

رقیب اپنے دلوں میں آپ ہی کٹ کٹ کے مرجاتے
ادھر ہم سر بکف خنجر بکف جب تم اُدھر ہوتے

فرشتوں کوئے جاناں کی ہوا جو تم کو چھو جاتی
ہماری طرح تم بھی خاک اُڑاتے دربدر ہوتے

قفس میں مجکو بازو توڑ کر کیوں قید کرنا تھا
ہوس کچھ تو نکالیتا جو ثابت بال و پر ہوتے

کمال ضعف سے اب پاؤں لڑکھڑانے لگے
گرا گرا مدد اے شوق لے سنبھال مجھے

دل رمیدہ وہیں پھر پھرا کے آتا ہے
ہوا ہے نقطۂ پرکار رخ کا خال مجھے

بوسہ بن مانگے رہا جاتا نہیں
گالیاں کھانے کی عادت ہو گئی

جائے آکر وہ غضب ڈھائینگے کیا
جن کی آمد اک قیامت ہو گئی

ذکر مے کیوں شیخ سنکر پی گئے
کیا کہیں صاحب سلامت ہو گئی

بھول کر یاد وطن آئی نہیں
وادی غربت میں مدت ہو گئی

کی دوا جب سے ترے بیمار کی
اور ابتر اُسکی حالت ہو گئی

کسی سے وہ بگڑتے ہیں کسیکو وہ بناتے ہیں
خدا جب حسن دیتا ہے شرارت آہی جاتی ہے

ہلال عید کی حسرت تو ہوگی روزہ داروں کو
مجھے میرے گلے سے یار کی تلوار ملنے کی

کیوں شراب سخن اپنی نہ ہو خوش رنگ ذبیح
اسکو نسبت بھی تو ہے داغ کے خمخانے سے

بتوں کی اگر ایسی ہی چڑھ بنی ہے
کسی دن خدائی کا دعویٰ کرینگے

ذبیح منشی باقر حسین صاحب طبیعت دار اور ذکی شخص ہیں کلام سے مشاقی بھی پائی جاتی ہے اور علمی استعداد بھی معقول معلوم ہوتی ہے ہر شعر میں بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تلمذ

ذبیح

وغیرہ کی کیفیت نہیں معلوم ہوئی۔ الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ کلام بہت مزے کا اور تعقید
سے پاک وصاف اور تلاش مضمون اور الفاظ سے بھی صاحب مذاق سلیم ہونا ثابت ہے ملاحظہ ہو

نہ بیٹھے چین سے اک دم کہیں ہم شادماں ہو کر — پھرایا گردش قسمت نے دور آسماں ہو کر
کروں عرض ہنر کیا جب نہ ہویاں قدرداں کوئی — کمال اپنا یونہیں مخفی رہا گنج نہاں ہو کر
بزنگ نخل بے برگ وثمر تھی قدر کب اپنی — رہے جبتک جہاں میں ہم رہے بار جہاں ہو کر
تواضع سے بنالیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو — کجی ہم دور کر دیتے ہیں تیروں سے کماں ہو کر
ملی یہ سربلندی جب مٹایا اپنی ہستی کو — ہوئے مسجود عالم اسکے خاک آستاں ہو کر
خزاں کے خوف سے بلبل ہوئی ہے سوکھکر کانٹا — رہیگی آشیاں میں بھی تو خار آشیاں ہو کر
یہ کیسی اپنی غفلت ہے کہ یاد حق سے غافل ہیں — عیاں ہے صبح پیری ہم ابھی مابین منزل ہیں
دل بے مدعا قدر امید و بیم کیا جانے — نقوش کائنات اپنی نظر میں حرف باطل ہیں
رہے ہم سبزۂ بیگانہ بنکر باغ ہستی میں — حقیقت میں جدا سب سے مگر ظاہر میں شامل ہیں
ہوئی جب سلب طاقت کیا نتیجہ پرفشانی کا — ہماری کوششیں عبث ہیں سعی مرغ بسمل ہیں
ذبیح ناتواں جو تھے کبھی آرام جاں اپنے — وہی افسوس دشمن کے فروغ خانۂ دل ہیں
تمھارے ظلم کا ہمکو خیال کچھ بھی نہیں — ملال دل سے ہے تم سے ملال کچھ بھی نہیں
ذبیح عمر سریع الزوال کچھ بھی نہیں — خزان و ہجر و بہار و وصال کچھ بھی نہیں
عبث ہے ان سے توقع وفائے وعدہ کی — مآل کوشش امر محال کچھ بھی نہیں
یہ کیسی طرز عمل ہے خدا سے شرم نہیں — گناہ حد سے فزوں انفعال کچھ بھی نہیں
یوں ہی گذرتے ہیں غفلت میں دن جوانی کے — ذبیح آپ کو فکر مآل کچھ بھی نہیں
رہے پابند تسلیم و رضا ہم ایسے بسمل ہیں — گلے پر خنجر قاتل زباں پر شکر قاتل ہے
نہ ہو کیوں عشق میں ڈوبی ہوئی طرز بیاں میری — جوانی گو نہیں لیکن طبیعت ہے جواں میری
عبث اس خاکدان تنگ و تیرہ میں پھنسے آکر — کہاں یہ قید تنہائی وہ آزادی کہاں میری

وہ مجکو بے وفا کہتے ہیں یہ تائید کرتی ہے
الٰہی ہو گئی اُنکی زباں گویا زباں میری

دکھایا داغِ پیشانی جو آنکھوں نے فرمایا
جبینِ فخر کی زینت ہے خاکِ آستاں میری

عیادت کے لیئے یہ کون آتا ہے دمِ آخر
چلی جو بہرِ استقبال جانِ ناتواں میری

تمنا ہے اسی کی جان دی ہے جسکی فرقت میں
کھڑی ہیں کسلیئے مشتاق حورانِ جناں میری

گذرتا ہے اگر حرفِ طلب اپنے تصور میں
تو ہو جاتی ہے پنہاں شرم سے منہ میں زباں میری

یہ کیسی آہِ آتش بار یارب دل سے نکلی ہے
دگرگوں ہو گئی حالت وہاں اُسکی یہاں میری

بجھے احسان کی خو اسکو عادت شکرِ احساں کی
ترے دل کی طرح ہے کام میں ہردم زباں میری

مرے سوزِ نہاں کا ماجرا تم شمع سے پوچھو
حقیقت کہہ رہی ہے صاف وہ آتش زباں میری

وہاں وہ شانِ آمرزش یہاں شرمِ تہیدستی
کوئی گوشہ نہیں ملتا چھپے غیرت جہاں میری

ذبیح اس عہد میں گو اور بھی ہیں مدعی اسکے
مگر حاصل کہاں یہ خوبیٔ حسنِ بیاں میری

ذبیح

ذبیح منشی محمد اسمٰعیل ذبیح باشندہ کیا مٹی، سعید صاحب کے حقیقی بھتیجے اور انھیں کے شاگرد ہیں پندرہ سولہ برس سے مشقِ سخن کرتے ہیں۔

سنورتی ہے زلفِ پریشاں کسکی
بلا میں کوئی مبتلا ہو رہا ہے

چمن میں جو اٹھکھیلیاں کر رہی ہے
یہ کس گل کا ذکر اے صبا ہو رہا ہے

وہ بُت دیکھکر مجکو مسجد میں بولا
ذبیح آجکل پارسا ہو رہا ہے

ذبیح

ذبیح حکیم منشی محمد اسمٰعیل خان ذبیح دہلوی ابن مولوی ابراہیم خان سابق برانچ پوسٹ ماسٹر پہاڑ گنج پہلے دہلی میں مطب کیا کرتے تھے، اشعار میں ظریفانہ مضامین اکثر لکھا کرتے ہیں افضل الاخبار میں کئی سال تک برابر ضمیمہ میں انھیں کے مضامین نکلتے رہے اب دو تین برس سے نواب احمد سعید خان صاحب طالب جاگیردار لوہارو کی سرکار میں ملازم ہیں پچپن ساٹھ برس کے قریب عمر اور استعداد علمی بقدرِ ضرورت اچھی ہے ✤

دلِ مایوس میں اپنے ہزار ارماں کا مدفن ہے
گماں ہوتا ہے سینہ میں مجھے گورِ غریباں کا

مجھاؤ چپ کرنے میں رسوا یار تو ہو جائیگا	یہ سکوت آخر کو بڑھ کر گفتگو ہو جائیگا
وہ آیا حور پیکر فاتحہ کو	بنا رشکِ جناں مدفن کسیکا
آئینہ نے جو کہا عکس ہوں حیرانوں کا	بول اُٹھی زلف کہ سایہ ہوں پریشانوں کا
میرے زخموں نے اُڑایا یہ ہنسی میں سبکو	شور سنتے تھے بہت اُنکے نمک دانوں کا
ہے زیرِ قدم سیل شہیدوں کے لہو کا	عالم قدِ قاتل میں ہے سرو لبِ جو کا
موتی کی صفا زیر ہے دانتوں کی چمک سے	اِس تاب نے پُل باندھ دیا آب گہر پر
قیامت تک نہ ہوگی کل تو اُن کی	جبیں اُمید وعدہ پر کہاں تک
تاثیر سے نالہ کی پلٹ دینگے مقدر	قسمت نئی لکھنے کو اُٹھاتے ہیں قلم ہم
ملجائے کوئی بت تو اُسے دل میں جگہ دیں	کعبہ کیلئے ڈھونڈتے پھرتے ہیں صنم ہم
مُنہ سے لگا ہوا ترے جامِ شراب ہو	اِک دن تو اتصال مہ و آفتاب ہو
اُڑا دے ہوش بے پیر شیخ کے دو چلو پانی کے	دکھا منکر کو بھی پیرِ مغان تاثیر میخانہ
نگہ میں رکھنا رند و محتسب چھپ چھپ کے آتا ہے	اُچکا ہے اُڑا لیجائیگا کفگیر میخانہ
رکوع و سجدہ کرتے دیکھنا متوالے رندوں کو	جو بانگِ قلقلِ مینا سے ہو تکبیر میخانہ
شراب پاک بندوں کو وہاں حوریں پلائینگی	کہیں جنت نہ ہو واعظ تری ہمشیر میخانہ
تسکین تجھ سے ہو جو کسی تشنہ کام کی	اے آبِ تیغ یہ بھی ہے اک بات نام کی
خنجر کی ادائیں نہ ہوئیں ختم گلو پر	کچھ دیر تو اے حضرتِ خوں تھم گئے ہوتے
خدا جانے جو خواہش اور کچھ ہوتی تو کیا ہوتا	ذرا سے ایک بوسہ پر تمہارا دم نکلتا ہے
ہمارے وصل کا وعدہ وہ کرتے ہیں تو مجمل سا	سخن منہ سے نکلتا ہے تو اک مُبہم نکلتا ہے
ضدِ اُسنے دلا کر مجھے کی رہبریِ عشق	ناصح بھی مرے واسطے گویا خضر آئے
ہجر نے عاشقِ مفلس کو کیا مالا مال	کہ دُرِ اشک کی سینے پہ لڑی رہتی ہے
کہتے ہو تم زخمِ دل سے مسکرایا کس لیئے	تیر کی اُنگلی سے پوچھو گدگدایا کس لیئے

جوشِ جنوں میں بھی نہ پھرے ہم برہنہ پا	یہ آبلے ہی پاؤں کے پاپوش ہو گئے
واعظ پہ بھی تصرفِ پیرِ مغاں ہوا	رندوں میں آکے آپ قدح نوش ہو گئے
شوخی سے بے نقاب ہو وہ جو بزم میں	اتنی پڑیں نگاہیں کہ روپوش ہو گئے

ذبیح

ذبیح مولوی سید عبدالحی صاحب باشندہ دربھنگا (بہار) کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔ کلام ملاحظہ ہو

زندگی اپنی اسی شغل میں گذرے پیارے	لب پہ ہو ذکر ترا دل میں تری یاد رہے
کہیں معشوق بھی عاشق کی خبر لیتے ہیں	اُن کو کیا شاد رہے کوئی کہ ناشاد رہے
کہتا ہے شوقِ قتل میں ہر وار پر ذبیح	قاتل خدا کے واسطے اک وار اور بھی

ذبیح

ذبیح جناب خواجہ محمد اسمٰعیل صاحب ایڈیٹر کیا نگ نواب ڈھاکہ تلمیذ جناب نسیم ابوالعلائی باشندہ بنگال بعد میں حضرت داغ سے تلمذ اختیار کیا، نوجوان شخص ہیں علمی قابلیت خاصی ہے موزونی طبع کے اقتضا سے گاہ گاہ فکرِ سخن بھی کر لیتے ہیں اپنے آقا کے ہمراہ ہندوستان کے مشہور مقامات کی سیر بھی کی ہے یہ کلام ہے

خدا نے شوق کو کیا رہنما میرا بنایا ہے	رہا ہے منزلِ اُلفت میں یہ رہبر بہت اچھا
کبھی خالی نہیں ہیں چال سے عیار کی باتیں	یہ کہتا ہے دمِ عہدِ وفا اکثر بہت اچھا
تم گئے اور ساری بیقراری ہو گئی رخصت	نہ گھبراؤ کہ ہے حالِ دلِ مضطر بہت اچھا
زمانے بھر میں کوئی غیر کو اچھا نہیں کہتا	کہو انصاف سے کہتے ہو تم کیونکر بہت اچھا
گلہ کیوں کروں کیا مرا سر پھرا ہے	گلے پر عنایت سے خنجر پھرا ہے
بہت دیکھے ہیں انقلاباتِ عالم	فلک عمر بھر میرے سر پر پھرا ہے

ذبیح

ذبیح۔ مولوی محمد اسمٰعیل خان باشندہ بھوپال۔ آجکل کے شعرا میں ہیں۔ طرزِ سخن مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے پینتیس برس کی عمر ہے۔

مانگتا ہوں پینے مے ہر دم دعا برسات کی	بھا گئی ہے کچھ ادائے جانفزا برسات کی
ایک جامِ مے کے بدلے رندِ مے آشام سے	لیگئی دل چھین کر بانکی ادا برسات کی
لطفِ دخترِ رز کی اُلفت میں کچھ آیا ہے اسے	مانگتا ہے اب تو زاہد بھی دعا برسات کی

جگھٹے رندوں کے ہیں سب میکدہ آباد ہیں	آرہی ہے کیا ہوائے جانفزا برسات کی

ذخیر

ذخیر۔ میر قربان علی ساکن فیض آباد اودھ آپکا حال صرف اسقدر معلوم ہوا کہ نغمۂ بہار رسالہ میں جو ۱۸۸۶ء میں شائع ہوتا تھا آپکا کلام اکثر چھپا رہتا تھا۔

وہ پاس تھا تو غم دلِ عاشق سے دُور تھا	ساقی کے دم سے دورِ شراب سرور تھا
ہے اوسنئی طور پہ ناحق گمان برق	شمعِ جمالِ یار کا اک وہ بھی نور تھا
کل کیوں سوالِ دید پہ پھبتیں لنترانیاں	عاشق بھی کیا ترا ارنی گوے طور تھا
ہوتے ہیں فیضِ تواضع سے سرافراز بشر	چشمِ مردم پہ قدم رکھتے ہیں ابرو ہوکر
دلِ خود رفتہ تو جاناں کی گلی میں پہنچا	رہ گیا دردِ جگر زینتِ پہلو ہوکر
ہجر عاشق کو عدم میں یونہیں لیجائیگا	جس طرح لائی ہے ہستی میں محبت تیری

ذرّہ

ذرّہ میرزا راجہ رام ناتھ خلف الرشید میرزا راجہ کدار ناتھ۔ امیر عہد عالمگیر ثانی و شاہ عالم ثانی، یہ خود آخر الذکر بادشاہ کے مقرب باختصاص اور پیشکار و ناظر رہے اور چونکہ بادشاہ کا تخلص آفتاب تھا اس رعایت سے اپنا ذرّہ مقرر کیا، چاوڑی میں راجہ کدار ناتھ کی گلی اتبک اِس خاندان کی یادگار ہے

ترے کوچہ میں روز و شب پڑا پھرتا ہی یہ ذرّہ	بجا ہے ایسے دیوانے کے مطلب کو روا کرنا

ذرّہ

ذرّہ۔ میر ولایت علی درصل کوئل علیگڈھ کے متوطن تھے مگر بسبب روزگار آگرہ میں زیادہ حصّہ عمر کا بسر ہوا، شیریں سخن فصیح البیان شاعر تھے اور اپنے اقران و اماثل میں ممتاز یہ ذکر ۱۲۶۸ھ قبل غدر کا ہے، ڈپٹی عبد العلیم نصر اللہ خاں نے اپنے تذکرہ گلشنِ ہمیشہ بہار میں انکا تذکرہ کیا ہے اور انکی خوش خلقی اور مسافر نوازی کی تعریف کی ہے۔ یہ انکا کلام ہے

میں دعا دیتا ہوں تم گالیاں دیتے ہو مجھے	اِس بُرا کہنے سے کہیئے تو بھلا حاصل کیا
کرتی پھرتی ہے جو مٹی کو ہماری برباد	تجھے اِس خاک اُڑانے سے صبا حاصل کیا
کیا ملے گا مرے سودائی بنانے سے تجھے	پیچ دینے سے مجھے زلفِ دوتا حاصل کیا

قطع کرنا تھا مرے دستِ جنوں کو ناصح
کیوں گریباں مرا تو نے سیا حاصل کیا

دستِ قاتل کو مبارک رہے خونِ عاشق
پاؤں کیوں پڑتی ہے ناحق تو حنا حاصل کیا

عمر بھر خاک ہی چھانا کیا میں اے ذرّہ
اور ان مہوشوں سے تو ہوا حاصل کیا

استخواں میری نکھا مجکو ندامت ہوگی
اے ہما گر کبھی ہما سگِ جاناں ہوگا

ذرّہ

ذرّہ منشی ہر پرشاد نقلنویس کلکٹری سلطان پور (۲۰-۱۹۰۹ء ۱۹۸۰ھ) شاگرد جناب لکرشن قمر لکھنوی چالیس سال کی عمر اور یہ کلام کا رنگ ہے۔ باوجود مکرر تحریر حالات نہ ملے۔

اُمید و یاس کے جھگڑے وہ حسرتوں کا ہجوم
عجیب لطف رہا جب تک انتظار رہا

رحیم جان کے تجکو خطائیں کیں میں نے
کریم جان کے تجکو گناہ گار رہا ✦

زمانہ تھا جو موافق شریکِ حال تھے سب
پڑا جو وقت تو کوئی نہ غمگسار رہا

تمھیں کچھ اپنی یہ وعدہ خلافیاں دیکھو
تمھیں کہو کہ تمھارا اب اعتبار رہا

بڑھ گئی حد سے سوا جب سے نقاہت میری
وہ خفا ہیں کہ اڑائی ہی نزاکت میری

جسقدر غیر نے کی اُن سے شکایت میری
اُنکو ہوتی گئی اُتنی ہی محبت میری

باعثِ ترکِ ملاقات جو پوچھا تو کہا
آپ سے ملکے اُلجھتی ہی طبیعت میری

زاہد ثواب ڈھونڈیں قیامت کیواسطے
ہمتو گناہ کرتے ہیں رحمت کیواسطے

ای شیخ جو وہاں ہے وہی بتکدے میں ہے
کعبے کو جائیں کسکی زیارت کیواسطے

چاہو قیامِ حُسن تو بوسہ عطا کرو
صدقہ ضرور چاہیئے دولت کیواسطے

کند ہے خنجر بلا سے آپ چلنے دیجئے
کام کچھ تو تشنہ کاموں کا نکلنے دیجئے

شوق سے تیغِ نگاہِ مست چلنے دیجئے
خوب میرے زخم کے انگور پھلنے دیجئے

سر کے نیچے ہو اگر تکیہ تو جلد آتی ہے نیند
اپنے زانو پر ہمارا دم نکلنے دیجئے

کہاں سے کے لئے ہو کسواسطے پشیماں ہو
یہ کیا ہے آج نہیں آنکھ روبرو ہوتی

ذرّہ

ذرّہ منشی انواری لال باشندہ کلکتہ، حضرت ناسخ کے تذکرہ میں ان کا ایک شعر درج

رہے اُنکے دوست بھی تھے اور ۱۲۸۱ھ میں زندہ تھے۔

دِل وار کی خاطر سے دل آزار بھی چھوڑا	الفت میں سمن رویونکی گلزار بھی چھوڑا

ذکار

ذکا۔ سید اولاد محمد خاں ولد سید غلام امام صادق، حضرت حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی کے حقیقی بھتیجے تھے۔ ۲۷ رجب ۱۱۵۱ھ میں بمقام بلگرام پیدا ہوئے انھوں نے حضرت آزاد کی خدمت میں تربیت و تعلیم پائی اور انھیں کی تحریک و طلبی پر حیدرآباد میں منصب عالی پر سرفراز ہو کر امتیاز خاں خطاب پایا اور بڑے اعزاز و آبرو سے بسر کی۔ آخر اُسی عالی منصبی کے ساتھ بمقام اورنگ آباد دکن ۱۲۱۵ھ میں انتقال کیا۔ فارسی شاعر تھے۔ اور انکا ذکر اکثر فارسی تذکروں میں موجود ہے مگر حسب رواج زمانہ تفننًا کبھی کبھی اُردو بھی کہہ لیتے تھے، یہ اُنکے کلام کا نمونہ ہے۔

ساقی تجھے قسم ہے کہ مے سے بھرے ہوئے	شیشے ہیں انتظار میں کسکے دھرے ہوئے
آوارگی سے باز نہ آوے گا دل مرا	کیا فائدہ ہے اسکو مقید کرے ہوئے
تو ہمسے دوستوں کو نہیں پوچھتا عزیز	معلوم ہوگی قدر ہمارے مرے ہوئے
ہمکو جلو میں دیکھتے ہی شاہِ حسن کے	بولا نقیب حسن ادب سے پرے ہوئے
برسا نہ مینہ اور نہ آنسو ترے چلے	جنگل ذکار کہاں سے ابھی سے ہرے ہوئے

ذکار

ذکا۔ منشی خوب چند دہلوی کایستھ ماتھر ساکن حویلی جنگل کشور معروف گھنٹہ والی چاندنی چوک شاگرد رشید شاہ نصیر دہلوی، ایک بہت بڑا تذکرہ معروف بہ عیار الشعراء انھوں نے تالیف کیا تھا جس میں چار پانچ ہزار اُردو گو شعراء کا حال قلمبند کیا تھا۔ استعدادِ علمی معقول تھی۔ ملازمت پیشہ اور صاحبِ دیوان تھے، مگر وہ سب ذخیرہ اُنکی وفات کے بعد انکی اولاد کی غفلت سے ضائع ہو گیا، اُسکی ایک نقل ڈاکٹر اسپرنگر پرنسپل دہلی کالج کے پاس تھی، ممکن ہے کہ جرمنی میں ہو، انکا دیوان راقم تذکرہ کے پاس موجود ہے، قدیم الفاظ مثل اُدتی، اُدھیں پھر کرکے، ہوئیگا، جتنے، کیدھر، انکے کلام میں پائے جاتے ہیں ۱۲۴۲ھ میں انتقال کیا۔

کر بنائے زندگی پر اپنی اے منعم نظر
فکر کیا کرتا ہے ناداں ہر گھڑی تعمیر کا

غافلو ڈھونڈتے پھرتے ہو جسے عالم میں
غور سے دیکھو وہ ہے دل میں تمہارے بیٹھا

بس نہیں چلتا کہیں زور آور وں سے ای ذکار
یار دل کو لے گیا میں سر پٹک کر رہ گیا

سمجھا میں جسے دوست ہوا وہ ہی مخالف
اخلاص کسی کا بھی مرے کام نہ آیا

آوارہ و بدنام ہوا قیس ہی آخر
لیلیٰ پہ کسی بات کا الزام نہ آیا

بیکسی پر نہ جلا میری کسی دوست کا دل
کوئی تربت پہ دیا بالنے والا نہ گیا

ہاتھوں سے میرے یار و مینا و جام لینا
بیہوش ہوں نشہ میں ٹک مجکو تھام لینا

رکھوں ہوں خصلت طاؤس آتشبار اے ہمدم
جہاں جاؤے قدم اپنا وہیں گلزار ہو پیدا

اب تو اُس بت سے ہم ہوئے ہیں جدا
دیکھیئے کب خدا ملا وے گا

عمر رفتہ نے پھر گذر نہ کیا
گئی ایسی کہ مُنہ ادھر نہ کیا

ہونا جو کچھ مرض کا تھا انجام ہو چکا
رخصت کرو طبیب کو یاں کام ہو چکا

ہے آپکا قیامت گلشن میں مسکرانا
لیتے ہو جی نکالے ہر ایک کلی کلی کا

کسی کا دل کوئی بیدرد گر ستاویگا
تو عاقبت میں بھی آرام وہ نپاویگا

جو توبہ کی ہے تو مجلس میں میکشوں کی نجا
کہ خوامخواہ پیالہ کوئی پلاوے گا

یہ کوہِ عشق تو فرہاد سے بھی اُٹھ نسکا
ذکا کی تاب ہے کیا جو اُسے اٹھاویگا

آنکھیں کھُلی رہی تھیں کسواسطے ذکا کی
کیا جانے مرتے دم تک تھا انتظار کسکا

حال یوسف کا سُن چکے ہم
بھائیوں سے نہ چاہ کیجیے گا

گل کر دے چراغ کو ذکا اب
گھر میں ترے آفتاب آیا

مانگا جو اُن سے دل تو وہ بولے کہ ای ذکا
لیتا ہے مال پھیر بھی کوئی دیا ہوا

روتا ہوں ای پیارے سو اسطے میں ہر دم
مٹجائے تیرے دل سے تا سب غبار دلکا

مت چھوڑیو تو ہرگز دل کا طواف اپنے
ہے تیرے حق میں غافل یہی مکہ اور مدینا

کوئی ٹھکانا مقرر نہ کوئی در اپنا
حیرت سے بنگیا ہو تصویر اب سراپا

جہاں ہے یار ہمارا وہیں ہے گھر اپنا
کوئی کچھ کہو ذکا کو چپکا سنا کریگا

خانۂ زندگی خراب گیا
مرد پیر سست سے ہو خیر کیا
سانولے کا لگے ہے خوش غصہ
شغل مینا و مے مدام رہا

کیا رہا لطف جب شباب گیا
پاؤں گیا ٹوٹ تو پھر سیر کیا
ساتھ ہے ترشی اور سلونے کا
جیتے جی ہمکو یہ ہی کام رہا

انداز عجب طرفہ ادا آن تماشا
نہ ہے طالع جسے یہ دولت دیدار ہو حاصل
کیا گیا عہد نوجوانی کا

ہے سر سے قدم تک تو میری جان تماشا
قدم پر یار جانی کے سر اپنا دھر کے سو جانا
اُٹھ گیا لطف زندگانی کا

اہل دنیا کو رہے ہے رات دن دنیا کی یاد
لکھوں تھا خط میں تجھے لیکے دل ربا کاغذ
گہ خیال زلف گہ یاد رخ گلفام کر
ہوا ہی ابر ہی گلگشت ہے اور سبز سبزہ ہی
ذکا قسمت پہ شاکر رہ نصیحت تجکو کرتا ہوں
موئے سفید نکلے بعد از شباب منہ پر

اسقدر فرصت کہاں ہی جو کرے عقبیٰ کی یاد
اُٹھا قلم سے یہ شعلہ کہ جل گیا کاغذ
یوں خیال یار میں اے دل سحر کر شام کر
سوال جام مے ساقی ہمارا آج رد مت کر
کسی کے جاہ و حشمت پر ارے ناداں حسد مت کر
دیتی ہے زندگانی دیکھو جواب منہ پر

اے ہمنشیں تو یار کا ذکر کمر نہ کر
شعلۂ شمع کا یہ دود نہیں جلوہ نما
گھر سے ٹک اپنے نکل شوخ ستمگر باہر
ہے لطف میکشی کا اُسی وقت ساقیا

بھولے ہوؤں کو راہ عدم کی خبر نکر
کھولے بیٹھی ہے لٹا اپنی فرنگن سر پر
منتظر بیٹھے ہیں عاشق ترے در پر باہر
بیٹھے ہوں جبکہ یار برابر کے آس پاس

نہیں خوشی کا یہاں اتو نام سو سو کوس
شہر دلی نہ کہو ہے یہ عزیز و فردوس

گیا وہ ساقی و مینا و جام سو سو کوس
پوچھتے کیا ہو عمارات و مکاں کی تعریف

سیر کرتا ہوں کبھی اسکی تو بیساختہ بس / منہ سے نکلے ہے مرے شاہجہاں کی تعریف

نکلے ہے اشک چشم سے میری ٹپک ٹپک / ساغر سے مے بہ گر گئی آخر چھلک چھلک

چشم ہیں سرمہ کی تحریر تو ظالم مت کھینچ / ہے قیامت تری اِس خنجر خونخوار کی نوک

آن نکلے ہے ادہر لالہ عذار ایک نہ ایک / سینہ کرجائے ہے داغوں سے فگار ایک نہ ایک

اُس بتِ شوخ کو دیکھا جو سحر وقت نماز / اہل اسلام کی نیت گئی یک بار بدل

کٹی رہتے ہوئے اک عمر باہم / حجاب اُس کا نہیں جاتا ہے تاہم

ہزار افسوس وہ بیگانہ نکلا / جسے سمجھے تھے اپنا آشنا ہم

نہ کیجے اسقدر بیگانگی آپ / کبھی تو تھے تمہارے آشنا ہم

خیال آتا نہیں اتنا بھی ہرگز / کہ آئے کیوں تھے اور کرتے ہیں کیا ہم

مے گلنار کا پیکر پیالہ / ذکا سب فکر دیتے ہیں بھلا ہم

زنہار مرے قتل سے پیارے نہ ڈرو تم / سر آگے تمہارے ہے جو چاہے سو کرو تم

جگر ٹکڑے ہے کیوں اسکا ہوئی ہے کیسلئے پانی / کھلا ہمپر نہ کچھ حال پریشانِ گل و شبنم

مریض عشق کو صحت اگر ہووے تو میں جانوں / کرے لاکھوں دوا لیکن اثر ہووے تو میں جانوں

رخِ تاباں پہ چھوڑو گیسوئے شبرنگ کو اپنے / قیامت تک پھرا ہے پیارے سحر ہووے تو میں جانوں

نہیں جام مے گلنار کو حاجت کچھ اے ساقی / تصور میں تری آنکھوں کے ہم مخمور رہتے ہیں

دل و جان سے معتقد ہیں اُسی کے / صنم کو ہم اپنا خدا جانتے ہیں

اِن بتوں سے تو ذکا دل نہ لگا کہتے ہیں / ہم ترے حق میں کہا مان بھلا کہتے ہیں

شہد و شکر سے وہ لبِ شیریں دو چند ہیں / اُنکی نہ بات پوچھ کہ ہونٹھ اپنے بند ہیں

کہتا ہے دیکھ سایہ مژگاں کو طفلِ اشک / خنجانے مجکو یہ لبِ دریا پسند ہیا

نہ آیا یار اور میں صبح تک گنتا رہا گھڑیاں / لگا دیں چشم دریا بار نے ساون کی بھی جھڑیاں

یہ بتانِ سنگدل ایکدم بھی کل پاویں نہیں / عاشقوں کو جب تلک اللہ کلیجا دیں نہیں

ارادہ گر کسی کے دلمیں ہووے سیرِ جنت کا
تو دیکھے اک نظر آکر جہاں آباد کی گلیاں

جو دھوئے دستِ حنائی وہ اپنے دریا پر
تو آگ لگ اُٹھے یکدست وہیں پانی میں

ذکا خیال ترا کیا کسی طرف آئے
لگا رہے ہے ترا جی تو یار جانی میں

دُنیا میں سبکو خاطرِ مہماں عزیز ہے
جاتا ہے دل سے عاشقِ شیدا کے غم کہاں

جامِ مے دے ساقیا یہ ابر و باراں پھر کہاں
ابر و باراں گر ہوا تو بزمِ یاراں پھر کہاں

بے گنہ ہرگز کسی کو قتل اے ظالم نہ کر
آدمی ہوتا ہے پیدا آہ ناداں پھر کہاں

خواب ہو جائیگا ملنا کر ہم آغوشی شتاب
ہو زلیخا دیکھئے یہ ماہِ کنعاں پھر کہاں

ہمنے کیا ہی دیکے دل اپنا سے سوال اک بوسہ کا
اتنے ہیں کیوں آپ خفا کچھ مفت نہیں خیرات نہیں

لختِ دِل یوں سرِ مژگاں پہ نظر آتے ہیں
جوں چراغاں ہوں دریا کے کنارے روشن

بیوفائی جو یہاں دیکھی رفیقوں سے ذکا
ہمسے مت پوچھ کہ وہ قابلِ اظہار نہیں

آگیا وہ دور کوئی فکر سے خالی نہیں
ہو گئی عنقا کہیں عالم میں خوشحالی نہیں

جلوہ گر وہ خوبرو ہوتا ہے گر بازار میں
رستے رہتے بند ہیں دو دو پہر بازار میں

بتوں کو جان و دل سے مانتے ہیں
خدا کو اپنے حاضر جانتے ہیں

روتے ہیں یاد کر کے ہم اُن دنوں کو پیارے
ڈالیں پھریں تھے کیسے ہم تم گلے میں باہیں

ڈرتا ہوں میں کہیں ترا پہنچا لچک نجائے
گجروں کو مت پہن تو گل اندام ہاتھ میں

کسکی دیکھی چشمِ مخمور اے ذکا
خود بخود آنے لگیں انگڑائیاں

بہم پیوستہ ہیں وہ ابروئے خمدار یوں اُسکے
لڑیں دو ترک جوں لیکر کہیں تلوار آپس میں

گرہ میں کیا ہے مری ہو مئے فرات کا کا سینہ
پڑے ہیں ایاغ و شیشے شراب کے گھر میں

گذارہ کیسے گھر میں ہو کسی انسان قابل کا
ذکا اب قدر دانو نکی ہوئیں برباد سرکاریں

شہر دہلی بھی اک تماشا ہے
آٹھ دن نو طرح کے میلے ہیں

جنبشِ ابرو سے اُسکے ہل گئی یکسر زمیں
جس طرح بھونچال سے کرنے لگے تھر تھر زمیں

غم کے ہاتھوں تنگ ہوں یارب جاؤں کہاں
آسماں تو دور ہے اور سخت ہے پتھر زمیں

نہیں رکھیں ہیں کدورت کسی سے اہلِ صفا
چھپاتے عیب ہیں سب کے ہنر کو دیکھتے ہیں

حاکم اس دور کے یہاں شناس ہیں دنی اور ظالم
مانگے بھیا جو کوئی داغ درم دیتے ہیں

دلکو لیجاتا ہے وہ آنکھوں میں کچھ رکھتا ہے سحر
دیکھکر حیراں ہوں یارو اس ہنر کو کیا کروں

اضطرابی سے نہیں اتنی خبر مانندِ موج
گر کوئی پوچھے چلے اُٹھکر کدہر کو کیا کہوں

یہ معجزۂ عشق ہے لاتی ہیں گل و شمع
ہنگام زیارت مرے مدفن پہ ہزاروں

جوابِ خط سے ہیں گذرا خبر تو لو یارو
گلی سے یار کی قاصد ابھی پھر آکہ نہیں

دیکھکر کیجیو ہمچشمی کا دعوی اُس سے
کہدو نرگس سے کہ آنکھوں کے لوائے ناخن

مدت میں لگی ہے آنکھ مری کھٹ کھٹ تو کر اے سنگ تراش
تعویذ نگھڑ تربت کا جا نیند ہمارے سوتے ہیں

تم اہلِ دل کی غفلت کا احوال نہ پوچھو کچھ ہمسے
بجتے بھی رہیں کانوں پہ سدا گھڑیال نقارے سوتے ہیں

یار کی استغنائی تو دیکھو ہم جو گئے ملنے کے لیئے
غصہ سے بولا یوں ہے کہدو گھر کو سدھارے سوتے ہیں

غم جس سے دلکا جائے مہیا وہ شئے کرو
موجود یعنی بزم میں مینا و مے کرو

جز شمع کے سر کاٹے پہ زندہ ہو دوبارہ
دیکھا نہ کسی کو کہ کوئی مر کے جیا ہو

رات وہ مطرب پسر گانے لگا جب دیس کو
یاد کر رونے لگے پردیسی اپنے دیس کو

دل نہیں چاہے ہے کرنے کو کسی سے اخلاص
ہر کوئی اپنی غرض کا ہمیں بندہ نظر آیا ہمکو

ہلے ہے ابروئے خمدار دیکھیئے کیا ہو
کہاں کہاں چلے تلوار دیکھیئے کیا ہو

ہر طرف خوبرو ہیں جلوہ نما
کب تلک دل کی پاسبانی ہو

کیوں نہو اسپہ اک جہاں عاشق
جبکہ یہ حسن اور جوانی ہو

ذکا

ذکا، پنڈت سرکشن ذکا، کشمیری خلفِ پنڈت دیارام ابن عدالتِ دیوانی فرخ آباد سنہ ۱۸۸۱ء کے قریب زندہ وسلامت موجود تھے۔ کلام بہم رسیدہ میں سے چند شعر درج ذیل ہیں ❊

ذرا دیکھ اے بتِ سفاک در پر شور و غوغا ہے
ترے کوچہ میں قاتل رقصِ بسمل کا تماشا ہے

بہانے سے ہمارے خون کے غش تجکو آئیگا
زر و مال جہاں کی کچھ ہوس باقی نہیں دلکو
نہایت سخت جاں ہوں نہیں نہایت سخت جاں ہیں
نہیں اس بت سا کوئی سنگدل سارے خدائی ہیں

اے قاتل تو کمسن ہے ابھی کیا تونے دیکھا ہے
فقط دیدار کی اس شوخ کی دل کو تمنا ہے
نہ ٹوٹے خنجر بُرّاں کہیں یہ مجکو خطرا ہے
ہوا عاشق تو کیوں اسکا ذکا کچھ تجکو سودا ہے

ذکا

ذکا منشی بخشش محمد باشندہ گورکھپور شروع میں جناب بقا کو کلام دکھایا کرتے تھے، پھر حضرت امیر مینائی کی خدمت میں آکر فیضیاب ہوئے اب فی الجملہ اس فن میں معقول مہارت پیدا کر لی ہے مضمون اور زبان دونوں کی طرف طبیعت کو لگاؤ ہے، اشعار بہم رسیدہ کا انتخاب ملاحظہ فرمایئے ؛

تعظیم ہمپہ فرض ہے قرآن پاک کی
دل لیکے دیکھتا بھی نہیں اب میری طرف
گھسوں گا سر در پردہ نشیں پر
نشاں ملتا نہیں لیکن ترا نام
کہے دیتی ہیں دزدیدہ نگاہیں

چومے جو ہمنے آپکے رخسار کیا ہوا
او مطلب آشنا وہ ترا پیار کیا ہوا
مٹادوں گا جو لکھا ہے جبیں پر
ازل سے نقش ہے وکے نگیں پر
گماں ہے دل چرانے کا تمہیں پر

پھر جاتے ہیں روز دزنک آکر
ہیں تاک میں دخترِ رز کی ساقی
دکھلا کے وہ زلف مجکو بولے
داغوں سے ہے لالہ زار یہ دل

ترساتے ہیں جھلکیاں دکھا کر
لیجا ہیں گے شیخ جی چڑھا کر
ان کالوں سے تو ذرا ڈرا کر
باور نہ ہو دیکھ لو تم آکر

ہیں وفا خلق میں گو سارے حسیں ہوتے ہیں
شیخ جی اچھا ہے میخانے میں جایا نہ کرو

پر تری طرح جفا کار نہیں ہوتے ہیں
بے ادب رند خرابات نشیں ہوتے ہیں

سمجھتا ہی نہیں کوئی یہ مضموں
عدو کے سامنے یوں ظلم مجھ پر

دہن کے باب میں کیا گفتگو ہو
عدو پر لطف میرے روبرو ہو

شبِ غم کی بلائیں دور ہو جائیں
کرم فرما جو تو اے ماہرو ہو

کہاں رنگِ حنا ای شوخ اتنا شوخ ہوتا ہے
مرے خونِ تمنّا کی ترے ہاتھوں میں لالی ہے

دل کو آنکھ اُسکی جو بیمار بنا دیتی ہے
آکے یادِ لبِ جاں بخش شفا دیتی ہے

اُسکے گیسو کی گھٹا یاد دلا دیتی ہے
اور رونا مرا برسات بڑھا دیتی ہے

طلبِ بوسہ پر اے یار تری ایک نہیں
سارے ارمانوں کو مٹی میں ملا دیتی ہے

لوگ کہتے ہیں جسے برقِ جمالِ معشوق
دل میں عاشق کے یہی آگ لگا دیتی ہے

زندہ زیرِ چرخ جب تک ہم رہے
موردِ جور و ستم ہر دم رہے

ہوں شہیدِ سُرخی رنگِ حنا
دستِ رنگیں سے مرا ماتم رہے

کیوں غش نہ آئے صورتِ موسیٰ ہمیں ذکا
اِک رشکِ برقِ طور کا جلوہ نظر میں ہے

ذکائی

ذکائی - محمد ہاشم علی رامپوری - رامپور کے مشاعرہ ۱۹۰۱ء کی غزل سے دو شعر نقل ہوتے ہیں

جو پوچھا کہاں کو چلے بن سنور کر
تو بولے کہیں کیا کہیں جا رہے ہیں

رقیبوں سے جوبن کو لٹوا رہے ہیں
مجھے دیکھنے تک کو ترسا رہے ہیں

ذکی

ذکی - نواب محمد جعفر علیخان ذکی مغفور پنجہزاری منصبدار دربار شاہ عالم شاہ موصوف - اور شجاع الدولہ صوبۂ اودھ کے ہمراہ بہار اور بنگالہ کی مہم ۱۱۷۶ھ میں شریک اور نظامت مرشد آباد کے اُمیدوار تھے، آخرش ناکام ۱۱۷۸ھ میں مرشد آباد میں راہی ملکِ بقا ہوئے کبھی کبھی فکرِ سخن بھی کیا کرتے تھے یہ اُنکے نتائج افکار کا خلاصہ ہے -

سُن کے احوال مرا ناصح مشفق نے ذکی
ہاتھ سے ہاتھ ملے حیف سے سینہ کوٹا

خاکساری پہ نہ کر موذی کی ہرگز اعتبار
جونک مٹی میں سلے تو بھی لہو پیتی رہے

عشق میں نسبت نہیں بلبل کو پروانہ کے ساتھ
وصل میں وہ جان دے یہ ہجر میں رُوتی رہے

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو
سوزنِ تدبیر گو ساری عمر سیتی رہے

ذکی

ذکی - نواب اسد الدولہ رستم الملک مرزا محمد ذکی خاں بہادر فیل جنگ عرف نواب بہادر

خلف اکبر ولیسر الدولہ دلاور الملک مرزا محمد علیخاں بہادر فیروز جنگ متخلص بہ حیدر متوطن نیشاپور - باشندۂ فیض آباد مقیم لکھنؤ پہلے اشرف علی فغاں پھر میر اوسط علی رشک، پھر منیر شکوہ آبادی کے شاگرد ہوئے، اِن استادوں کے فیض سخن سے صاحب دیوان ہو گئے یہ انکا کلام ہے -

کرتی شکم صاف پہ ہے آب رواں کی
بل کھائے بال آگ پہ رکھے اگر کوئی
اعمال بد نے مجکو نکالا بہشت سے

یا آپ کا گرمی سے پسینے میں ہے تر پیٹ
اُس روئے آتشیں پہ نہ کیوں پیچ کھائے زلف
دوزخ بھڑک اُٹھا مرے افعال زشت سے

اے زاہد وہیں سے ہمارا اسلام ہے
کوچہ میں اُس صنم کے بھی ملجائیگا وُہی
توڑونگا میں نہ خاطر پیر مغاں کبھی
اُٹھا نہ بار ضعف کا مجھ ناتواں سے
شکوہ تمھارا سنتے ہیں ہم ہر زبان سے
تیرے شہید ناز کو زندہ نہ کر سکیں

کعبہ کو کون جائے جوار کنشت سے
آدم کو جس خدا نے نکالا بہشت سے
بنوائو میکدہ مری تربت کی خشت سے
شرمندہ ایک خس کا نہیں ہیں جہان سے
آواز ایک آتی ہے سارے جہان سے
عیسیٰ اُتر کے آئیں اگر آسمان سے

ذکی

ذکی - شاعر خوش مذاق منشی مہدی علیخاں ذکی خلف شیخ کرامت علی - انکے بزرگ شیخ زادگان لکھنؤ سے تھے مگر انکا مولد و مسکن مراد آباد ہے - نواب محمد سعید خاں والی ریاست رامپور کے عہد میں برسوں وظیفہ خوار ریاست رہے پھر نواب غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں لکھنؤ چلے گئے، وہاں جا کر شیخ امام بخش ناسخ کی شاگردی اختیار کی اور نواب صاحب موصوف کی شان میں قصیدہ کہکر سنایا خلعت و انعام سے مالا مال ہوئے، پھر تھوڑے دنوں کے لئے دہلی آئے اُن دنوں نواب مصطفی خاں بہادر متخلص شیفتہ کے ہاں بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی آپ بھی اُس جلسہ میں شریک ہوکر مورد تحسین و آفرین ہوئے، مگر ان دنوں دلّی اپنے حال میں مبتلا تھی، یہاں سے بھی دل برداشتہ ہوکر سہارنپور پہنچے لیکن دل اُچاٹ رہا

حیدر آباد دکن چلے گئے وہاں دولت کے فرشتہ نے جھم ہار دیا تھا، اور دن رات چاندی سونے کی گنگا جمنا بہتی تھی، وہاں انکے کمال کی بھی قرار واقعی قدردانی ہوئی۔ یہ بھی اپنے فن میں اُستاد مسلم الثبوت تھے، نواب ناصر الدولہ نظام الملک بہادر والی ریاست کی مدح میں وہ وہ عمدہ قصائد کہہ کہکر پیش کئے جن میں خوب خوب صنعتیں تھیں، اِن کو سن کر اہلِ دربار کیا وہاں کے تمام رؤسا ادب کے ساتھ پیش آنے لگے اور نواب صاحب بہادر نے خلعت و انعام سے مالامال فرمایا، آخر کشش حب وطن نے پھر اپنی طرف کھینچا اور مراد آباد آگئے۔ چند روز بعد لکھنؤ پہنچکر قطب الدولہ کی وساطت سے واجد علیشاہ کی سرکار میں ملازم ہوئے اور ملک الشعرا کا خطاب پایا، چنانچہ اُنکی مُہر میں ملک الشعرا شیخ مہدی علیخاں ۱۲۶۵ھ کندہ تھا، غدر کے بعد وطن میں خانہ نشین تھے کہ نواب یوسف علیخاں نے اِنکے کمال کا شہرہ سُنکر اپنے دربار میں طلب کیا، چنانچہ یہ رامپور چلے گئے اور جب تک نواب ناظم زندہ رہے وہیں رہے۔ اُنکی وفات کے بعد وہاں سے دل اُکتا گیا اور ۱۲۸۱ھ میں انبالہ پہنچے دو برس کچھ مہینے وہاں قیام کو گذرے تھے کہ پیام اجل آگیا، ماہ ذیقعد ۱۲۸۳ھ میں قضا کی۔ انتخاب یادگار میں انکی تاریخ وفات ۱۲۸۱ھ درج ہے مگر غلط ہے، یہ صاحب سخن مورخ بے بدل۔ فاضل بے مثل شیریں سخن، ظریف اور زود فکر تھے، طرز سخن نہایت دلفریب اور پسندیدہ ہے، ایک رسالہ عروض و قوافی میں مسمّٰی بہ یادگیر ۱۲۶۵ھ میں مرتب کیا تھا، کلیات ذکی عرصہ ہوا منشی نولکشور نے اپنے مطبع سے شائع کیا تھا۔

صرف اب پردہ دری میں دلِ نالاں کس کا	دامن یار ہی چھوٹا تو گریباں کس کا
لے اُڑی انجمن ناز میں دل کس کی نگاہ	چوریاں کرنے لگے غمزۂ پنہاں کس کا
باڑھ پر غمزۂ خونریز کو رکھتے ہیں حریف	دیکھئے آج نکلجائے گا ارماں کس کا
ہُوا ہے آفتاب صبح شعلہ داغ پنہاں کا	بنا تار شعاعی تار تار اپنے گریباں کا
غبار قیس میں جان آگئی ٹھوکر سے لیلیٰ کی	اُڑا جاتا ہے جگنو بنکے ہر ذرہ بیاباں کا

کھلا کھلتے ہیں گل کے مدعا رخصت گلشن ہے
صدائے الفراق آئی جو ٹوٹا زخم کا ٹانکا

سمجھکر ساقی دریا دل ان پاؤں کے چھالوں کو
زباں سوکھی دکھاتا ہے ہر اک کانٹا بیاباں کا

بہار آئی ہے قاصد جی میں رہ رہ کر یہ آتا ہے
کہ جائے نامہ بھیجیں یار کو پرزہ گریباں کا

ق
نشہ نے شوق کے جو بد شرابی کا انہیں بخشا
کچھ ایسا ہوش بگڑا شب دلِ مشتاق جاناں کا

بلائیں شمع کی لیں اس رخِ تاباں کے دیکھے ہیں
لب ساقی سمجھ کر لے لیا بوسہ نمکداں کا

بگولے کی طرح اٹھتا ہوں میں صحرا نوردی کو
کیا ہے بے سر و پائی میں کیا پائے سفر پیدا

ذکی جوں شمع اپنی زندگی جلنے ہی کٹتی ہے
کیا ہے سوزِ دل کے واسطے ہمکو مگر پیدا

خون کا دریا جو تھا سینے میں اپنے موجزن
تیر کر نکلا خدنگِ ناز اُس سفاک کا

نازِ معشوقانہ کو زیبندہ ہے نشانِ حجاب
لن ترانی گو ہے جلوہ شاہدِ بیباک کا

کیا دکھاتا ہے بہار اب کے برس جوشِ جنوں
گل کھلے دیکھئے کیا چاک گریبانی کا

کشمکش گردشِ دوراں کی ہے دے بے کیا کیا
سخت مشکل ہے نباہ آہ تن آسانی کا

گر بگولے بھی اٹھے خاک سے تو خاک ہے لطف
زندگی میں ہے مزا بے سر و سامانی کا

حوریں جو آئیں جائے نکیرین قبر میں
کیا کیا مزا اٹھائیں سوال و جواب کا

بسمل تری نگہ کے تڑپتے نہیں کبھی
پانی بھی مانگتے ہیں تو خنجر کی آب کا

اے نامہ بر جو پڑھ سکے وہ خط ہو رہے خموش
زنہار تو سوال نکرنا جواب کا

کیونکر نہ خون ہو مری حسرت بھری نگاہ
آنکھوں میں کٹ گیا ہے زمانہ شباب کا

بے لطف زندگی کی بہاریں ہیں رنج میں
عیش و طرب کے ساتھ مزا ہے شباب کا

گذری فراقِ یار میں افسوس یہ بہار
دل پر رہیگا داغ شب ماہتاب کا

ہیں کافرانِ عشق حرم میں سیاہ مست
دل میں صنم بغل میں ہے شیشہ شراب کا

وحشت[1] ہے آشکار زلیخا کے حال سے
آنکھیں بیان کرتی ہیں افسانہ خواب کا

دام کے پھندے قفس کی تیلیاں توڑیں تو کیا
کاش رشتہ ٹوٹ جاتا الفتِ صیاد کا

[1] نوٹ گلشنِ بیخار میں یہ شعر میرزا کے شاگرد کے نام سے درج ہے —

مزے جہان کے اٹھائے یہ خاکساری میں
کہ بندگی میں تماشا کیا خدائی کا

قاصد کے ہوش گم تھے یہ طرفہ ماجرا تھا
کہتا تھا کچھ زبانی اور خط میں کچھ لکھا تھا

اِک بات پر تمہاری سو جی سے ہم تھے قربان
کچھ بات اب نہ پوچھو کیا جانیے وہ کیا تھا

شبِ وصل اپنی گذر گئی تو سحر کو اپنا یہ حال تھا
دل و دیدہ حیرت و غم میں تھے کہ یہ خواب تھا یہ خیال تھا

تا مرگ دردِ عشق نہ ہم سے جدا ہوا
زیرِ کفن بھی ہاتھ ہے دِل پر رکھا ہوا

بسے ہوئے تھے دلوں میں ہزار ہا نیرنگ
طلسمِ ہستی موہوم اک بہانہ ہوا

تو ہوا گرمِ سخن اور کھل گیا رازِ نہان
تو ہنسا اور غنچۂ تصویر گویا ہو گیا

کچھ اور ہے باقی ہوس کوہکن و قیس
یا دیکھ چکے کوہ و بیاباں کا تماشا

مہِ کنعاں کی زلیخا نے خریداری کی
عشق نے حُسن کو رسوا سرِ بازار کیا

گو مگو بات ہے کچھ کہہ نہیں سکتا قاصد
کہ نہ انکار کیا اُس نے نہ اقرار کیا

جب سامنے کبھی وہ پریزاد آ گیا
دیوانہ پن کبھی کا ہمیں یاد آ گیا

شمع گل ہونے لگی یارانِ محفل اٹھ چلے
ایک میں رونے کو تنہا انجمن میں رہ گیا

آج تو انداز باتوں کا تری کچھ اور ہے
پا گئے ہم بھی کہ ہے غیر و نکا سکھلایا ہوا

اِس آب و گِل میں اپنی تو اُلفت کا ہے خمیر
بیگانہ ہو نہ سبزہ بھی اپنے مزار کا

آثارِ صبح ہے کہ مرا حال دیکھ کر
ٹکڑے جگر ہوا ہے شبِ انتظار کا

ہمارے حال پہ لازم ہے رحم او صیاد
کہ پر شکستہ ہیں اور شوق ہے رہائی کا

سوچ میں تعبیر کے یوسف کو نیند آنے لگی
ماجرا خوابِ زلیخا کا عجب افسانہ تھا

جلوہ گر آنکھوں میں ہے شوخی نگاہِ یار کی
پتلیوں کا ناچ پریوں کا تماشا ہو گیا

زہر کھایا سبزہ رنگوں کی محبت میں غوں کی
صندلی رنگوں کی غم میں دردِ سر پیدا کیا

دم بدم ہوتی ہے تغیر یہاں صورتِ حال
رنگ ہر حال بدلتی ہے تری یادِ نیا

لے ہی چکا وہ جان و دل طاقت و تواں
کیوں آ گئے اب یہاں اُٹھے کیا کام رہ گیا

روشنی گر لبِ دریا ہو مرے جان پسند
ہم مژہ پر کریں اشکوں سے چراغان پیدا

دیوانہ اس گلی میں دلِ زار ہو گیا
سایہ پری کا سایۂ دیوار ہو گیا

ہنسی ہنسی میں کیا تمنے زخمِ دل تازہ
نمک چھڑکتے تو ایسا کہاں مزا ہوتا

بیخود جمالِ ساقیٔ سرشار نے کیا
کارِ شراب شربتِ دیدار نے کیا

ہوئے بیخود غمِ تنہائی سے
کھینچے کس سے ہمیں کیا یاد آیا

بے طرح دل کو عشق کا آزار ہو گیا
کسکی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا

لائقِ سزا کے کشتۂ دیدار ہو گیا
آنکھوں سے دیکھنے کا گنہگار ہو گیا

کیا عجب ہے گر وہ پھر زندہ ہوں اے عیسیٰ نفس
لائے تو اپنے شہیدوں کا جو مدفن زیرِ پا

نشہ کی حالت میں جھپکا دے کے شوخ نازنیں
لٹ جو اپنی زلف کی سمجھا وہ ناگن زیرِ پا

بوسہ لیتی ہے جو پاپوشِ نگاریں پاؤں کا
رشک سے کہتا ہے دل بنتا کہ دشمن زیرِ پا

یہ ادا قاتل کی قابل دیکھنے ہے وقتِ ذبح
ہاتھ ہے بسمل کی آنکھوں پر تو گردن زیرِ پا

غفلت میں کام دل ہمیں بے جستجو ملا
اپنی تلاش تھی کہ نصیبوں سے تو ملا

سب ہم صفیر قید سے چھوٹے بہار میں
اک میں اسیرِ الفتِ صیاد رہ گیا

صیاد نے خبر بھی نہ لی مرغِ دل کی حیف
آخر تڑپ تڑپ کے تہِ دام رہ گیا

اک برق سی چمک گئی نگہِ شعلہ فشاں میں
دیکھا جو بھبھوکا بدن اس رشکِ پری کا

کیا کہا ہمنے کہ جھڑکی کا سزاوار ہوا
بات کیا منہ سے نکالی کہ گنہگار ہوا

طرزِ سخن مرقعِ نیرنگ ہو گیا
کاغذ طلسم خانۂ ارژنگ ہو گیا

حسن کی سیر ہے منظور تو رکھیے ہر آن
آئینہ پیشِ نظر چشمِ تماشائی کا

بوسہ عارض کا لیا ہمنے بلائیں لیکر
کس تکلف سے ترے حسن کا صدقہ اترا

ہنسی کے لطف اٹھے جو غضب میں یار آیا
ملی جو بوسہ پہ گالی تو اور پیار آیا

چل بسے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گیا
جابجا الجھا ہوا کانٹوں میں داماں رہ گیا

تم کہو قصہ ہمارا بزمِ حسن و عشق میں
ہنستا ہے وہ کہ ہونٹوں پہ سُرخی ہے پان کی
جوہر کی قدر کُھلتی ہے معنی شناس سے
دل میں صبح شب وصل آگ لگا دیتا ہے
ہر سحر طرزِ شفق سے یہ عیاں ہے کہ مدام
آنکھوں میں اُسکی سرمۂ دنبالہ دار ہے
خیالِ یار میں ہے چشم تر بند
لالہ رویوں کا جگر غم سے مرے داغ ہوا
عاشق کی بیخودی سے تو بگڑا ہوا ہے کیا
ہوئے ساقی سے خجل واہ رے کم ظرفی دل
غش ہے نگاہ شوخیٔ انداز ناز پر
کشتۂ انداز سے آنکھیں پھرانا واہ وا
سبز پتوں سے شہیدانِ چمن کے زخم پر
پچھلے داغوں سے جگر پر ہیں نشان باقی ہنوز
ہم دیکھتے ہی رہ گئے اور صاف نظر میں
معنی کا لُطف کچھ نہیں صورت پرست کو
جنوں نے غل مچا کر خاک اُڑا کر
چُھپا ظلمت میں آبِ زندگانی
کُھلا ہستی کا پردہ جن کے دل پر
نپائے خستہ جاں مجھ سا جو ڈھونڈے
چوری سے بوسہ لیجئے پائے نگاہ کا

گل کہے روداد بلبل شمع پروانے کی بات
آتش لگی ہے خرمنِ برقِ یمن میں آج
فہم سخن ہے نسخۂ علم و ہنر کی شرح
چھوڑ دیتا ہے جو خورشید کی چنگاری چرخ
چشمِ خورشید کو سکھلائے ہے خونخواری چرخ
ہونے لگی نمود غزالِ ختن کی شاخ
پری شیشے کے اندر ہے نظر بند
تازہ گل باغ محبت میں کھِلا میرے بعد
اے مستِ ناز اپنی طرف تو خیال کر
بوسۂ لب کی طلب پہلے ہی پیمانے پر
جی لوٹتا ہے غمزۂ عاشق نواز پر
قہر ہے مکھڑا چُھپانا جان کر پہچان کر
مرہم زنگار کے پھاہے لگاتی ہے بہار
دیکھئے ابکے برس کیا گل کھِلاتی ہے بہار
دل لے ہی گیا وہ بتِ عیّار اُڑا کر
بلبُل نہو فریفتہ عطرِ گلاب پر
بیاباں رکھ لیا سر پر اُٹھا کر
دھڑی مِسّی کی ہونٹوں پر جما کر
وہ بیٹھے زندگی سے ہاتھ اُٹھا کر
فلک خورشید کی مشعل جلا کر
اِس رنگ سے کہ دزدِ حنا کو نہو خبر

پردے میں آنکھ لڑتی ہے اُس رشکِ حور سے
پر ڈر یہ ہے کہ شرم و حیا کو نہ ہو خبر

وہاں پھولوں کے بستر پہ ہیں کیا چین کی نیندیں
کانٹوں کا یہاں فرش ہے کروٹ کے برابر

منزلِ گہِ فنا کی خبر کس سے پوچھئے
جا کر وہاں پھرا نہ کوئی کاروان ہنوز

وصلِ محبوب میں ہو جاتا ہے آسان وصال
ناز و غمزے کے جو پاتے ہیں سہارے عاشق

کیونکر دلِ بیتاب پہ لگتا ہے نشانہ
ہیں سب قدر انداز ترے تیر کے مشاق

خوں ہو دلِ بیقرار کب تک
آنسو ہوں گلے کا ہار کب تک

عشق کی آگ سے بھڑکی دلِ بیتاب میں آگ
برقِ سوزاں سے لگی چشمۂ سیماب میں آگ
آب پاشی مژۂ تر کی نہ آئی کچھ کام
سوزِ فرقت سے جو بھڑکی دلِ بیتاب میں آگ

واقعی قابلِ سزا ہیں ہم
یعنی دیرینہ آشنا ہیں ہم
ای صنم یہ ستم خدا سے ڈر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

قافلے والو اک ذرا ٹھہرو
پھر کے دیکھو شکستہ پا ہیں ہم
عین غفلت ہے زیست شکلِ حباب
آنکھ کھولی تو بس ہوا ہیں ہم

تڑپتے رہے بلکہ مرتے رہے ہم
مگر دم محبت کا بھرتے رہے ہم
بہت زندگی کے مزے ہمنے لوٹے
بہت تجھپر ای جان مرتے رہے ہم
شب آئے نہیں قاتل کے جو دیر گذری
تجھے ای اجل یاد کرتے رہے ہم

نہیں تاب کہ دیکھوں جمالِ صنم مجھے خوبیٔ دیدۂ تر کی قسم
رخِ حسن کی جلوہ گری کی قسم غمِ عشق پردہ دری کی قسم
تجھے عارضِ رشکِ قمر کی قسم تجھے شعلۂ داغِ جگر کی قسم
تجھے شوخیٔ برقِ نظر کی قسم تجھے گرمیٔ جلوہ گری کی قسم
نہ کر اتنا ذکی دلِ زار کو خوں کہ یہ ذوقِ سخن ہے مذاقِ زباں
تری طرز سے آتی ہے بوئے جنوں مجھے تیری ہی بیجگری کی قسم

ہر چند گناہ گار ہیں ہم
رحمت کے اُمیدوار ہیں ہم
اے حشر خبر شتاب لینا
بیتاب تہِ مزار ہیں ہم
ہو خاک سے اپنی لالہ پیدا
خونیں جگر بہار ہیں ہم

بو ہے غنچہ میں نہاں یا ترے ہونٹوں پہ ہنسی
قید شیشے میں پری ہے کہ حیا آنکھوں میں

اب سبب کیا ہے کہ کانٹا سا کھٹکتا ہے ذکی
یہ وہی دل ہے کہ رہتا تھا سدا آنکھوں میں

کہا قضا نے کہ سرگرمِ انتظار ہوں میں
پیامِ حشر ہے مجھکو کہ بے قرار ہوں میں

چمن میں سبزۂ پامال گرچہ ہوں لیکن
نظر میں گل کی کھٹکتا یہ ہوں کہ خار نہیں

وہ آدمی ہی کیا جو نہ ہو درد آشنا
پتھر سے کم ہے دل میں شرر گر نہاں نہیں

درکار کیا ہے عاشق و معشوق میں تمیز
دو دل جو ایک ہیں تو دوئی درمیاں نہیں

وحدت ہے درمیاں تو پھر ای دل دوئی کہاں
شوقِ وصال ہے تو سمجھ لے کہ تو نہیں

درپیش ہے ہزار مصیبت امید سے
کچھ غم نہیں ہے دل کو جو کچھ آرزو نہیں

ہم لیکے دل بغل میں بزمِ صنم میں آئے
شیشہ چھپا کے لائے پریوں کی انجمن میں

کیوں یادِ زلفِ جاناں قیدی ہمیں بنایا
کیوں رشتۂ محبت باندھا ہمیں رسن میں

عرس مجنوں ہے کہ صحرا میں بگولے بن کر
وجد کرتے ہوئے مستوں کے غبار آتے ہیں

دیر سے کچھ خبر خاطرِ ناشاد نہیں
دل کہاں بھول اٹھا ہوں مجھے کچھ یاد نہیں

اس پتہ سے پوچھنا قاصد مکانِ یار کو
چاندنی کہتے ہیں جسکے سایۂ دیوار کو

کچھ سنو پوچھو تپشِ دل کا ہمارے احوال
ہے وہ عالم کہ قیامت بھی تماشائی ہو

آشنا سب کا ہے تو اور کسیکا بھی نہیں
کوئی کیا تجھپہ فدا اے بتِ ہرجائی ہو

تنگ ہوں تنگ سے اب دل میں یہ آتی ہے ترنگ
میں ہوں اور یار ہو اور عالمِ رسوائی ہو

قاتل کے ڈر سے بات بھی منہ سے نہ کہہ سکا
ہونٹوں پہ خوں ہوئی دلِ بسمل کی آرزو

لطفِ جاں بخش بھی ہے غمزۂ بیداد کیساتھ
مژدہ اے دل کہ مسیحا بھی ہے جلاد کے ساتھ

شرما کے، طپش کھا کے، خفا ہو کے، ہنس پڑے
پاؤں پہ میں گرا جو بدن پر لگا کے ہاتھ

منت مرے جل مرنے کی پوری ہوئی لیکن
تم شمع چڑھانے کو بھی مدفن پہ نہ آئے

برقِ طپش آہ سے پہنچے نہ کہیں آنچ
کہدو کہ قیامت مرے مدفن پہ نہ آئے

جوہر تھے مجھ میں سب ملکوتی خصال کے
انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

ماہتابی پر جو وہ خورشید رو ہے بے حجاب
دکھلائے ہے ہیں رنگ گلستاں نئے نئے
آغازِ عشق میں یہ مزا ہے کہ اے جنوں
آوارگی کی سیر ہے اور آمدِ بہار
ہنوئی لطفِ تصور میں یہاں تابِ سخن
خیالِ زلف میں کب دلکا داغ جلتا ہے

سے اپنے جامہ سے ہوئی جاتی ہے باہر چاندنی
پتے ہرے ہرے گل و ریحاں نئے نئے
دامن نئے نئے ہیں گریباں نئے نئے
سودا ہے تازہ تازہ بیاباں نئے نئے
ورنہ شکوے تو بہت ای غمِ تنہائی تجھے
کہیں بھی کالے کے آگے چراغ جلتا ہے

افسردہ اشک و آہ نے ایسا کیا مجھے
دلبستگی کسی سے مسافر کو کیا ضرور
شاید چلی ہے جنبشِ دامانِ یار سے
کہنا پیامبر کہ فراموش ہے کیا
گلدستہ بن کے آنکھوں سے گرتے ہیں لختِ دل
جب یہ سنا کہ پاؤں میں مہندی لگی ہو وہاں
ہمکو ملا کے خاک میں بھی تم ہوئے نہ صاف
دلِ چھاننے میں دیکھئے اب کسکی بن پڑے
اُس دم ہوا مقابلہ صبحِ اُمید کا
تاثیر داغِ عشق یہ دیکھو کہ بعدِ مرگ
بدلی اُٹھی ہے موجِ ہوائے بہار سے
طرزِ سخن سے رنگ ٹپکتا ہے اے ذکی
اِک ذرا تیغِ نگہ کا جو اشارا ہو جائے
یہ حسنِ سبز ہے زہر یلا اہلِ خستہ جانوں کو
دیکھو ذکی کہ اب وہ چرانے لگے نگاہ

جنگل کا شوق ہے نہ چمن کی ہوا مجھے
جب دل لگا تو رہ گئے جب دل اُٹھا چلے
آتی ہے بوئے ناز نسیمِ بہار سے
وعدہ بھی کچھ کیا تھا کسی بیقرار سے
یہ ہار گوندھے جاتے ہیں اشکوں کے تار سے
یہاں خوں ٹپک پڑا نگہِ انتظار سے
دل میں وہی غبار ہے اس خاکسار سے
پھولوں کے ہار اُلجھے تو میں زلفِ یار سے
آنکھیں سفید ہو گئیں جب انتظار سے
ہر ذرہ آفتاب ہے اپنے غبار سے
بجلی چمک رہی ہے فغانِ ہزار سے
گویا زبان دھوئی ہے خونِ ہزار سے
آپکا نام ہوا اور کام ہمارا ہو جائے
یہ زنگاری ڈوپٹہ اور تہر آسمانی ہے
آنکھوں کو جنکی دیکھ کے بیمار ہم ہوئے

یہ چمن کی خاک میں ہے اثر نمِ اشکِ بلبلِ زار سے
کہ جنوں کی لہر سی اٹھتی ہے رگِ گل میں خونِ ہزار سے

میری آنکھوں میں ہے وہ شوخ طرحدار پری
زلف ہے بالِ پری شعلۂ رخسار پری

نشۂ بادۂ گلرنگ سے دیکھا نیرنگ
انکھڑیاں شیشہ ہیں برقِ نگہِ یار پری

دامِ تحریر میں مضمونِ دل آرا ہے اسیر
یا خمِ زلفِ سخن میں ہے گرفتار پری

لکھنو جلوہ فروشوں سے پرستاں ہے ذکی
نظر آتا ہے ہر اک شاہدِ بازار پری

شعلہ خو یار کو دیکھا جو ادھر سے برہم
اور بھڑکانے لگے آگ لگانیوالے

ایک نشتر ہے کہ دیتا ہے رگِ جاں کو خراش
ایک کانٹا ہے کہ پہلو میں چبھوتا ہے کوئی

ہر ایک دیکھکر اسے کیوں بے قرار ہے
خورشیدِ حشر کیا کہیں تصویرِ یار ہے

پیری میں بھی مزا ہی میسر اگر ہو عیش
دل کو سرور ہو تو خزاں بھی بہار ہے

مطلعِ صبحِ قیامت ہے شبیہ زخمِ دل
آفتابِ صبحِ محشر داغ کی تصویر ہے

اے ذکی پوچھو نہ باعث گرمیٔ اشعار کا
سوزِ دل کا حال نوکِ شعلہ سے تحریر ہے

محشر نے آکے قبر میں تڑپا دیا مجھے
کسکی خرامِ ناز کا دھوکا ہوا مجھے

بیٹھکر گورِ غریباں سے جو یار اٹھتا ہے
اسکے دامن کے پکڑنیکو غبار اٹھتا ہے

پیشوائی کو شتاب آئے قیامت سے کہو
کہ جہاں سے کوئی بے صبر و قرار اٹھتا ہے

نجد میں ناقۂ لیلی جو کبھی گذرا تھا
اب تلک تربتِ مجنوں سے غبار اٹھتا ہے

مستی لبِ گلگوں پر تصویر نظر آئی
یاقوت میں نیلم کی تحریر نظر آئی

پیشِ نظر اس رخ کی تنویر نظر آئی
پروازِ تصور کی تصویر نظر آئی

جو دلوں کی لگاوٹیں ہو دیں ہم تو جفا سے چھٹنے نہ ستم سے چھٹے
ہوئے لاکھ طرح کے بگاڑ مگر نہ ہم ان سے چھٹے نہ وہ ہم سے چھٹے

کبھی کھنچ جبینِ ابروئے چشمِ صنم تو رہینگی نہ خواہشیں انکی ہم
دلِ برہمن الفتِ بت سے چھٹے دلِ شیخ ہوا حرم سے چھٹے

تنگ ہوں میں کشمکش سے تیری اے دستِ جنوں
دامنِ دلدار کا صدقہ گریباں چھوڑ دے

بنتی ہیں مٹی کی پریاں نور کی صورت یہاں
لکھنؤ دیکھے تو دیوانہ پرستاں چھوڑ دے

بیقراری سے ہوا خوب کہ ٹوٹے پر و بال
ابتو امید رہائی سے رہائی ہو گی

زمیں سے لالہ نکلتا ہی داغ کھائے ہوئے
بہارِ عشق کے ہیں یہ بھی گل کھلائے ہوئے

ذکی مرے دلِ وحشی کو مثلِ طائرِ رنگ
ہوائے طوق لیئے جاتی ہی اڑائے ہوئے

رات دیوانگی شمع بھی ہم دیکھ چکے
گریۂ و خندۂ جانسوز بھی ہم دیکھ چکے

جی یہی چاہتا ہی پھر بھی کہ دیکھا ہی کریں
لاکھ باری تجھے سر تا بقدم دیکھ چکے

پیری و عہدِ شباب آہ خرابی میں کٹے
شبِ غم دیکھ چکے صبحِ الم دیکھ چکے

اب تڑپنے کی تمنا ہی تہِ تیغِ نگاہ
خنجرِ غمزۂ دمساز کے دم دیکھ چکے

اب بھی ہو جاتا ہے پیمانِ وفا میں دھوکا
جھوٹے سو بار ترے قول و قسم دیکھ چکے

اب ہوس کیا ہی کہ آغوشِ تصور میں دبے
لب بلب سینہ بسینہ اسے ہم دیکھ چکے

دیکھیے داغ تو آہ و فغاں بھی سنئے
دل بھی دیکھو گے مرا تم کہ جگر دیکھ چکے

جو کوئی دن کو چلے شبکو ٹھہر جاتا ہے
قاصدِ عمرِ رواں آٹھ پہر جاتا ہے

میں تڑپتا ہوں پڑا نیم نگہ کا مشتاق
اے مری جان کے دشمن تو کدھر جاتا ہے

چشمِ جادو میں تری زہر ہے اور آبحیات
زندگی پاتا ہی کوئی کوئی مرجاتا ہے

ہنس ہنس کے زخمِ دل پہ چھڑکتے تو ہو نمک
پر یہاں تلک مزا ہی کہ باقی مزا رہے

زیبندہ ہی غرور بتِ مستِ ناز کو
اس شرط پر کہ حسن کا عالم سدا رہے

ق

جوہر کی قدر خاک نہو جب ترے حضور
پھر عاشقوں کی بات مری جان کیا رہے

ذرہ خاک کا سرقہ تو اڑ جاے ہاتھوں ہاتھ
مضمون خونِ دل کا پڑا پیش پا رہے

لگا ہے غمِ فراق کہے آرزوئے وصل
کیا کیا ہو دل لگی جو کہیں دل لگا رہے

ہے وہی عہد انتظار وہی
ہم وہی، تم وہی، قرار وہی

یہاں تو جز مشتِ خاک کچھ نہ رہا
یار کے دل میں ہے غبار وہی

ہو عکس جلوہ گر جو لبِ لعلِ یار کا
نہریں لہو کی جاری ہوں خنجر کی آب سے

رات میں آئیں نظر تارِ شعاعِ خورشید
زلفِ مشکیں میں جو وہ طرۂ زرتار اُلجھے

وقفہ ہماری خاک پہ اک دم ضرور تھا
کیا لے آئے، کیا کھڑے ہوئے، کیا ٹھہرے، کیا چلے

ہر رگِ مژگاں میں قطرے آنسوؤں کے ہیں مرے
دیکھے رونے میں کیا موتی پروتا ہے کوئی

ناصحا! کیوں منع کرتا ہے تو رونے سے مجھے
آہ ظالم کیا تری آنکھوں سے روتا ہے کوئی

ہر گل کو دلفگار جو دیکھے بہار میں
کیونکر نہ آہِ سرد نسیم و صبا بھرے

یہ کیا سبب کہ تلخ ترا اس لب سے بات ہے
شیریں زباں تو غیرتِ شاخِ نبات ہے

ہے سنگِ سیاہ کعبۂ حُسن
ابرو پہ جو اُس صنم کی تل ہے

لی چہرہ پہ آستین فانوس
پروانہ سے شمع کیا خجل ہے

معشوق چھپائے کیوں نہ مکھڑا
چوری سے نگہ کی منفعل ہے

دل ہم سے جدا رہا ہمیشہ
گویا وہ ضمیرِ منفصل ہے

ذکی حکیم سید عبدالاحد صاحب ولد حکیم میر خادم علی صاحب مرحوم اصل وطن انکا نورنگ آباد ضلع بلند شہر ہے مگر میر خادم علی صاحب مرحوم بوجہ قرابت قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ میں جا رہے تھے اور وہیں انتقال کیا، جناب ذکی اسم بامسمی شخص ہیں ذہانت اور ذکاوت بات بات میں ظاہر ہوتی ہے فن طب میں نہایت عمدہ دستگاہ رکھتے ہیں، علم مجلسی سے خوب واقف ہیں اور نہایت خوش تقریر ہیں، عرصہ دراز سے قصبہ کاسگنج ضلع ایٹہ میں مطب کرتے ہیں۔ ابتدائے عمر میں اکثر اور اب بھی کبھی کبھی کسی خاص فرمایش سے شعر و سخن کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔ ترتیب تذکرہ کے وقت جو اشعار انکے وصول ہوئے وہ درج ذیل ہیں چھپّن ستاون سال کی عمر ہے

شبِ فرقت میں رو رو کر خیالِ گلبدن ہوتا
پڑا ہے ہمکو موجِ اشک سے صحنِ چمن دھونا

کدورت دل کی مٹ جاتی ہے اشکوں کے بہانے سے
مری آنکھوں سے سیکھو دفترِ رنج و محن دھونا

یہ کس خورشید وش کی آمد آمد ہے کہ گلشن میں
ہوا دشوار شبنم کو گلوں کا پیرہن دھونا

عزیزو بعدِ مُردن مجکو نہلانا تو یوں کرنا ۔ مٹانا داغِ حسرت پہلے پھر سارا بدن دھونا
پھر گر کوچۂ قاتل سے مِل لینگے ذکی ورنہ ۔ ہماری زندگی سے ہاتھ لے اہلِ وطن دھونا

عاشق کو اک اشارہ میں گردش میں لا دیں ۔ آنکھیں تری نمونۂ لیل و نہار ہیں
سرگرمیٔ ہجومِ نظارہ تو دیکھ لیں ۔ مثلِ نقاب رخ پہ نگاہوں کے تار ہیں
کُشتے تمہارے دینگے لبِ گور سے جواب ۔ اتنا تو پوچھ آکے یہ کس کے مزار ہیں
نرگسی آنکھ نے مارا تری اے یار مجھے ۔ آپ سا کر لیا بیمار نے بیمار مجھے
تجھکو ہر روز گریبان کہاں سے لادوں ۔ اے جنوں اب تو میسر نہیں اک تار مجھے

خدا سے شکوۂ جورِ بتاں کیجے تو کیا کیجے ۔ شکایت گل کی پیشِ باغباں کیجے تو کیا کیجے
جفا جو، بے مُروّت، بیوفا، بے مہر، بے پروا ۔ ذکی یہ ہے شعارِ گلرخاں کیجے تو کیا کیجے

ذکی

ذکی ۔ منشی محمد کریم لکھنوی، آپ بہ سلسلۂ ملازمت ریاستِ بھوپال میں سنہ ۱۹۱۰ء میں برسرِ روزگار تھے اور منشی سراج میر خان سحر سے اصلاح لیتے تھے ۔

مجھے ضد ہے کہ وعدہ لیکے اُٹھوں ۔ وہاں تار اُسنے باندھا ہے نہیں کا
کیا اُس بت نے وعدہ بھی تو ہنس کر ۔ نکالا "ہاں" میں بھی پہلو "نہیں" کا

وابستہ دل ہے یُوں تری زلفِ رسا کے ساتھ ۔ اقبال جیسے سایۂ بالِ ہُما کے ساتھ
خوش ہیں جہاں میں جام و مےِ دلربا کے ساتھ ۔ روزِ جزا کی دیکھیں گے روزِ جزا کے ساتھ
دیکھے ادا و ناز و کرشمہ تو کھو گیا ۔ رو بیٹھے دل کو ہم تری محفل میں لاکے ساتھ
بسمل ہوا کوئی تو کوئی لوٹنے لگا ۔ تیغِ نظر چلی جو کسی کی ادا کے ساتھ
صیاد کی نگاہِ غضب اُس پہ جب پڑی ۔ بجلی بھی آسماں سے گری تلملا کے ساتھ
تم نے ہمارا حالِ محبت سُنا ذکی ۔ اب کیا وفا کرے کوئی اُس بیوفا کے ساتھ

ذکی

ذکی ۔ میرزا کبیر الدین گورگانی متخلص بہ ذکی سنہ ۱۸۸۲ و ۸۳ء میں جو دہلی میں مشاعرے ہوتے تھے اُن میں غزل خوانی کیا کرتے تھے شاید اپنے عزیز مرزا ارشد گورگانی سے اِس فن میں مستفید تھے

کل پرسوں کسی ہم تو ہیں حاضر ابھی صنم	خنجر نکالئے کہیں صاحب کمر سے آپ
عاشق تو میں ہوں یہ تو پکارا ہے اپلچی	بیفائدہ الجھتے ہیں کیوں نامہ بر سے آپ
آپ چہ روش ہیں آپکے غلماں بنینگے دوست	ہاں ہم بشر ہیں کیونکہ بنینگے بشر سے آپ
کیا میرے ذبح کرنے ہیں خنجر کی جستجو	کردیتے ہیں فیصلہ مرا ترچھی نظر سے آپ

ذکی

ذکی ۔ منشی اشفاق حسین صاحب قوم کنبوہ ساکن قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ محکمہ بندوبست میں ملازم اور ابتدائے عمر سے شعر و سخن کے شائق ہیں پچاس برس کے قریب عمر ہے پرانی طرز میں شعر کہتے ہیں، فارسی کا مذاق بھی رکھتے ہیں ترتیب تذکرہ کے وقت جو انکا کلام وصول ہوا اُس کا انتخاب لکھا جاتا ہے ۱۸۹۷ء میں بہ سلسلۂ ملازمت بدایوں میں تھے اور زیادہ حال معلوم نہیں ۔

سُنکر یہ بار بار تمہاری نہیں نہیں	ہاں کا بھی اعتبار اب اے نازنیں نہیں
چھوڑ آتے گر عدم میں تو رہتے تو چین سے	دنیا میں آئے کیوں دلِ مضطر لیے ہوئے
وحشت کا جوش پھر رہی مجھے کوہ و دشت میں	پھرتا ہے میرے بخت کا چکر لیئے ہوئے
کشتے تمہاری تیغ نظر کے تمھیں ضرور	جاوینگے پیش داورِ محشر لیئے ہوئے
ساقی تمہارے پہنچے کہاں سے کہاں ذکی	بیٹھے رہو تم اپنا مقدر لیئے ہوئے

ذلیق

ذلیق ۔ مولوی محمد نصر اللہ خان مدرس مدرسہ اسلامی عربی حسن پور ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

اجل تو بیٹھی ہے روزِ ازل سے تاکے مجھے	حیات رکھتی ہے لیکن بچا بچا کے مجھے
تمھارے دل کی تمنا بھی ہوگئی پوری	شبِ وصال وہ بولے گلے لگا کے مجھے
اُٹھاؤ ہاتھ مرے درد دل سے چارہ گرو!	خدا پہ چھوڑ دو اب واسطے خدا کے مجھے
دلِ حزیں سے مرے سختیاں نہیں اُٹھتیں	بتو! معاف کرو واسطے خدا کے مجھے

ذوق

ذوق ۔ الف خان ابنِ دلیر خان معروف بہ نعمت خان عالی نشان پسر بخشی اعظم نواب سعد اللہ خاں آپ اہلِ مروت، آشنا پرست، صاحبِ حوصلہ، خوش سلیقہ، خوش تلاش، خوش فکر تھے ۔ اگرچہ

مشق کم تھی مگر ذہن رسا اور فکر بجا رکھتے تھے، قدرت اللہ شوق کہتے ہیں مجھ پر اُنکا حقِ نمک بدرجۂ غایت ہے۔ الغرض شاہ عالم ثانی کے آخر عہد میں ایک خوش باش، خوش گذران رئیس تھے۔ اور علم و ہنر کے قدر دان۔ یہ اُنکا کلام ہے۔

لگی ہے آخرش جا کر یہ ظالم تیرے قدموں سے
چلا آتا ہو نہ کچھ اس خاک دامنگیر پر تیرا

اگر میری طرح سیماب دل مارے تو میں جانوں
ہوس ناز بیجا ہے اب اِس اکسیر پر تیرا

جب سے ان ماہ وشوں سے یہ مری آنکھ لگی
شیوا پکڑا ہے سدا چشم نے بیداری کا

کچھ ستم سا جو ستم ہو تو میں تقریر کروں
ہائے کیجے بیاں تیری ستم کی صورت

ہائے شب پوچھے تھا وہ مجھ سے کس انداز سے راز
کہہ سکا ایک نہ میں خطرۂ غماز سے راز

پہنچا ہے جب سے گوشۂ دستار پر ترے
ہے کچھ بلند عرش بریں سے دماغِ گل

لختِ دل اشک سے اب رہتے ہیں تہِ پانی میں
گرچہ آتش نہیں آتی ہے نظر پانی میں

عکس ابرو کا تری دیکھ کے مثل شمشیر
موج دریا کی ہوئی زیر و زبر پانی میں

خدا ہی جانے کہ طفلی میں کیا بلا ہوگا
مجھے تو مار گئی یہ ادا جوانی کی

برنگ چہرۂ شبنم نت مری اوقات کٹتی ہے
جو سر گرداں پھروں دن کو تو رونے رات کٹتی ہے

اہل چمن کو کس کی گلشن میں جستجو ہے
ہر سرو جو کھڑا واں جھانکے ہر ایک سو ہے

ملے کیا کیا جواہر عشق کے ہمکو خزینہ سے
جھڑے ہیں داغ اور گل کھائے سینہ پر نگینے سے

کہاں وہ دن کہاں وہ دل کہاں ہے تیرا وہ عالم
سفر کر آئے ہیں مدت میں لگجا اب تو سینے سے

جواب خط کو کب لکھتا ہے جسنے پڑھتے ہی نامہ
مرا نام ہی تراشا ایک قلم کے سفینہ سے

نکلتے ہیں ستارے دن کو بھی خورشید کے آگے
ہوئی یہ بات اب روشن ترے منہ کے پسینے سے

دُر گوشِ خوباں تو ہے آفتِ جان
پر اُس کانِ خوبی کا بالا بلا ہے

پری، یا حور، یا غلماں، کہ نورِ حق تعالیٰ ہے
کہ چپ رہنے کی جا ہے اُسکا عالم ہی نرالا ہے

بلا، آفت، غضب، قہرِ خدا وہ قد بالا ہے
فلک نے بیکسوں کیواسطے یہ فتنہ پالا ہے

نیا انداز، نئی طرزیں، نیا جوبن، نئی باتیں بلا کنٹھا ستم یہ ہے غضب چمپہ کلی تس پر	الٰہی چشم بد دور ہوش ابھی اُسنے سنبھالا ہے گلے میں دھگدگی آفت پڑی سینہ پہ مالا ہے
شب فتنہ میں اپنے درد کی بات سُن سن کے لگا وہ کہنے ہاں ہاں	میں نے جو سُنائی نا گہانی آگے بھی سُنی تھی یہ کہانی

ذوق

ذوق عندلیب شکرستان فصاحت و طوطی چمنستان بلاغت ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم دہلوی ولد شیخ محمد رمضان ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ کو پیدا ہوئے، اِنکے خاندان کے لوگ اب بھی دہلی میں جراحی کرتے ہیں، اسکے علاوہ کچھ قطعات تاریخ وفات سے بھی یہ بات ثابت ہے، نیز یہ امر کہ کسی ہمعصر تذکرہ نویس مثل شیفتہ، آزردہ، نساخ۔ صابر، محسن، منشی کریم الدین، کسی نے ولدیت کا اشارہ تک نہیں کیا جو غالباً عمداً معلوم ہوتا ہے مگر مولوی محمد حسین آزاد اُستاد پرستی کی ترنگ میں شیخ محمد رمضان کو سپاہی زادہ بتاتے ہیں، اُنکا بیان ہے کہ اُنکی زبانی تقریریں تاریخی معلومات سے لبریز ہوتی تھیں، وہ دلی میں کابلی دروازے کے قریب رہتے تھے اور نواب لطف علیخاں نے اُنھیں معتبر سمجھ کر اپنے حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ اُنکے گھر کے پاس رہتے تھے، محلے کے اکثر لڑکے اُنھیں سے پڑھتے تھے، اِنھیں بھی وہیں بٹھا دیا۔ حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے، شوق تخلص کرتے تھے۔ شیخ مرحوم کو اُنکی صحبت میں بہت شعر یاد ہو گئے، نظم کے پڑھنے اور سننے میں دلکو روحانی لذت ہوتی تھی۔ شیخ مرحوم کا قول تھا کہ میں ہمیشہ اشعار پڑھا کرتا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے، اِسی زمانے کا ایک مصرع ہے ؎ مزا انگور کا ہے رنگترے میں، یہ فقرہ آجتک دہلی میں میوہ فروشوں کی زبان پر ہے۔ ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حسن اتفاق تھا کہ ایک حمد میں ایک نعت میں، اِس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مبارک مہم کو خود اِس طرح سمجھ کر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو دوسرا نعت میں، جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس قدرتی اتفاق کو مبارک

فال سمجھوں، مگر ان دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی اُس مزہ کو کبھی نہیں بھولا۔ غرضکہ شیخ مرحوم اسی عالم میں کچھ کچھ کہتے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔ اسی محلے میں میر کاظم حسین نام ایک اِن ہی کے ہم سبق تھے اور نواب سید رضی خاں وکیل سلطانی کے بھانجے بیقرار تخلص کرتے تھے، اور حافظ غلام رسول سے اصلاح لیتے تھے، ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سُنائی، شیخ مرحوم نے پُوچھا یہ غزل کب کہی، خوب گرم شعر نکالے ہیں، اُنھوں نے کہا کہ ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے، شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور اُنکے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے۔

کچھ دنوں بعد غزلوں کی اصلاح میں بے توجہی اور علی الخصوص منیر خلف شاہ صاحب کے کلام میں انھیں مضامین کے بندھنے سے شاہ نصیر سے بگاڑ ہو گیا۔ اِنکی طبیعت بھی قادر الکلامی کا سارٹیفکٹ حاصل کر چکی تھی رُو در رُو مشاعروں میں مقابلہ ہونے لگا۔ اور اصلاح کا سلسلہ بند ہو گیا۔ ان کی قدرتی طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں اثر برقی کی طرح دوڑی اور کلام کا چرچا بڑھا۔ غزلیں ارباب نشاط کی زبان سے نکل کر کوچہ و بازار میں رنگ اُڑانے لگیں۔ اکبر شاہ بادشاہ تھے اُنھیں تو شعر سے رغبت نہ تھی۔ مرزا ابو ظفر ولیعہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر کے شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملکِ شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اِس لیئے دربار شاہی میں جو کہنہ مشق شاعر تھے مثلاً شاہ اللہ خان فراق، میر غالب علیخاں سید، عبدالرحمٰن خان احسان، برہان الدین خاں زار، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم اور اُنکے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خان عشق، میاں شکیبا شاگرد میر تقی مرحوم۔ میر عظیم بیگ شاگرد سودا، میر قمر الدین منّت اور اُنکے بیٹے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب شاعر وہیں آکر جمع ہوتے اور اپنا اپنا کلام سناتے تھے، میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے مصاحب تھے اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے، شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اِس جلسے میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوتِ فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ اُس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا، چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگے، رفتہ رفتہ انکی قادر الکلامی نے

سکہ بٹھایا اور کچھ اسباب ایسے فراہم ہوئے کہ مرزا کاظم حسین بیقرار جو مرزا ولی عہد کی غزل شاہ نصیر کے دکن چلے جانے کے باعث دیکھا کرتے تھے الفنسٹن صاحب کے میر منشی ہو کر چلے گئے اور میرزا ابوظفر اُن کے شاگرد ہو گئے، ابتداءً سرکار ولیعہدی سے شیخ مرحوم کا مشاہرہ چار روپیہ ہوا مقرر ہوا۔ مولنا آزاد نے جوش عقیدتمندی میں آب حیات میں یہ ذکر بھی کر دیا ہے کہ نواب الٰہی بخش خان معروف جو شاہ نصیر کے پرانے شاگرد اور اس وقت ۶۲ سال سے زائد کی عمر تھی اُنہوں نے حضرت ذوق کو جو بمشکل اٹھارہ برس کے تھے اپنا اُستاد بنایا اور اپنے دونوں دیوان درستی کے لیئے دیئے۔ اس واقعہ کی تکذیب نواب ضیاءالدین احمد خان نیر و رخشان اور نواب احمد سعید خان صاحب طالب نے خود مولانا آزاد سے مباحثہ کر کے بہ براہین قاطع کر دی تھی، مگر افسوس کہ مولانا نے اقرار کر لینے کے باوصف طبع ثانی میں اس بیان کی تردید نہ کی بلکہ جب کئی برس بعد دیوان ذوق خود شائع کیا تو اُس میں فخریہ اس عبارت کو نقل کر دیا۔

اگلے سال شیخ مرحوم نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں سنایا کہ جسکے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدایع صرف کئے تھے اس قصیدہ پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی عمر بقول حضرت آزاد اُنیس ۱۹ برس کی تھی، ان ایام میں میر کلو حقیر حضرت ذوق کے بڑے ممد و معاون رہے۔ ۳۶ برس کی عمر میں آپنے جملہ منہیات سے توبہ کر لی تھی اور اسکی تاریخ یہ کہی ع "اے ذوق بگوسہ بار توبہ"

مرزا ابوظفر بادشاہ ہوئے تو اُنہوں نے یہ قصیدہ پہلے گزرانا۔

روکش ترے رُخ سے ہو کیا نور سحر رنگ شفق	ہے ذرہ تیرا پر تو نورِ سحر رنگ شفق

اِس قصیدہ کی فصاحت اور پرواز تخیل و شوکتِ الفاظ و نزاکتِ خیال قابلِ داد ہے۔ اگرچہ مرزا ابوظفر ہمیشہ الفیں دل سے عزیز رکھتے اور دلی رازوں کے لیئے مخزنِ اعتبار سمجھتے تھے مگر ولیعہدی میں مرزا مغل بیگ مختار تھے، جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کا موقعہ آیا تو اُستاد ذوق کے لیئے یہ ہوا کہ چار روپیہ مہینے سے پانچ روپیہ ہو گئے پانچ سے سات روپے

ہو گئے۔ جب ظفر بادشاہ ہوئے اور میرزا مغل بیگ وزیر، تو وزیر شاہی کا سارا کنبہ قلعہ میں بھر گیا مگر اُستادِ شاہی کا صرف تیس روپیہ مہینا مقرر رہا۔ فطرتی طور پر ذوق بہت متین و مہذب اور منکسر مزاج تھے اِس لیئے انھوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کے لیئے کچھ نہ کہا۔ اور نامساعدت تقدیر سے اِس رتبۂ جلیلہ اُستادی پر مشرف ہونے کے باوصف کبھی خوشحالی یا امیرانہ زندگی بسر کرنے کے وسائل میسر نہ ہوئے۔ اُنکی عادت تھی کہ فکر سخن میں ٹہلا کرتے تھے اور اسی حالت میں شعر بھی کہتے جاتے تھے، چنانچہ اُن دنوں میں جب کوئی عالی مضمون چستی اور درستی کے ساتھ موزوں ہوتا تو اُسکے سرور میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھرتے۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

چند روز کے بعد مرزا مغل بیگ کی ترکی تمام ہو گئی، نواب حامد علیخان مرحوم مختار ہوئے تب اُستادِ شاہی کا سو روپیہ مہینا مقرر ہوا۔ ہمیشہ عیدوں اور نوروزوں کے جشنوں میں قصیدے پڑھتے تھے اور خلعت سے اعزاز پاتے تھے۔ آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی اور انھوں نے ایک قصیدۂ غرا کہہ کر پیش کیا تو خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام میں مِلا۔ پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہکر گزرانا جس کا مطلع ہے

شب کو میں اپنے سرِ بستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

حضرت ذوق کا سانولا رنگ تھا متوسط اندام اور چہرہ چیچک کے داغوں سے پُر تھا آنکھیں تیز اور روشن تھیں اور آواز بلند اور خوش آیند جس سے مشاعرے میں رنگ تاثیر دوبالا ہو جاتا تھا۔ اپنی غزل کسیکو پڑھنے کے لیئے ہرگز نہ دیتے تھے، ابتدائے عمر میں شیخ مرحوم نے معمولی درسی تعلیم پاکر شعر گوئی کی طرف توجہ کر دی تھی مگر پھر رفتہ رفتہ مشاعروں کی معرکہ آرائیوں اور حریفوں کے اعتراضوں نے انھیں تکمیلِ علوم اور سیرِ کتب کی طرف متوجہ کیا اور فطری شوق کی مدد سے قلیل عرصہ میں وہ ایک جید فاضل ہو گئے اور معلومات کا دائرہ وسیع کر لیا جس کا قدرتی سامان یہ ہوا کہ راجہ صاحب رام جو مختارِ املاک شاہِ اودھ تھے اُسکے بیٹے کے لیئے ایک فاضل کامل مولوی

عبد الرزاق نامی استاد مقرر ہوئے۔ اتفاقاً ایک دن یہ بھی مولوی صاحب کے ساتھ چلے گئے چونکہ ان کی تیزی طبع کا شہرہ ہوگیا تھا راجہ صاحب رام نے اِن سے کہا کہ میاں ابراہیم تم ہمیشہ درس میں شریک رہو، چنانچہ اس بہانہ سے اِنکی تحصیل علمی بھی تکمیل ہوگئی، مولوی محمد حسین صاحب آزاد کہتے ہیں کہ "شیخ مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے سات سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے اور انکا خلاصہ کیا، اساتذہ کی تصنیفات ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی صدہا کتابیں گویا اُنکی زبان پر تھیں مگر مجھے اِس کا تعجب نہیں۔ اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر اُنھیں ازبر تھے تو مجھے حیرت نہیں۔ گفتگو کے وقت جس ترانے سے وہ شعر سند میں دیتے تھے مجھے اِس کا بھی خیال نہیں کیونکہ جس فن کو وہ لیئے بیٹھے تھے یہ سب اُسکے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مورخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہیں خصوصاً تصوف میں ایک عالم خاص تھا۔ رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے، خواب کی تعبیر میں اُنھیں خدا نے ایک ملکۂ راسخہ دیا تھا اور لُطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے، علم طب کو خوب تحصیل کیا۔ مگر کام نہ کیا۔ خوف آتا کہ ایسا نہ ہو بے پروائی سے کسی کا خون ہو جائے۔ کچھ دنوں تک موسیقی کا بھی شوق رہا مگر پھر اس سے دِل برداشتہ ہو گئے"

مرزا جواں بخت کی شادی کے موقعہ پر استادِ شاہی نے وہ مشہور سہرا پیش کیا جس کا جواب مرزا غالب نے بہ تحریک نواب زینت محل بیگم تحریر کیا۔ سہرے کی ایجاد کا فخر اس حساب سے حضرت ذوق کا حق ہے یہ دونوں سہرے اپنی نوعیت اور تازگی مضمون و خیال کے اعتبار سے اپنا جواب آپ ہیں، مثنوی جالسوز بھی تصنیف کی تھی۔ لوگوں کو تعجب ہوگا کہ اتنا بڑا شاعر جو رات دن اسی شغل میں رہتا ہو اور اُس کا دیوان اتنا مختصر اسکے متعلق پروفیسر آزاد لکھتے ہیں کہ "اس کا بیان ایک مصیبت کا افسانہ ہے، خود شیخ مرحوم فرماتے تھے کہ بچپن میں جبکہ پندرہ سولہ برس کی عمر تھی ہم نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا اور اُسے بڑے شوق سے لکھا تھا۔ پھر زمانے نے فرصت نہ دی۔ جو غزل ہوتی جُدا کاغذ پر لکھی جاتی اِسی طرح طاق میں رکھ دیتے کہ فرصت میں نظر ثانی کرینگے۔ جب طاق بھر گیا

مسودے تکیے کے غلاف میں بھرے اور گھر میں دیکر کہدیا کہ احتیاط سے رکھنا، کبھی مٹکے میں کبھی تھلیاں میں
بھرے اور گھر میں بھجوا دیئے کہ ضائع نہو۔ اِس طرح بہت سے تھیلے اور مٹکے تھلیاں بھر گئے
تھے۔ وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں سب
ذخیرہ نکالا محنت نے اُسکے انتخاب میں پسینہ کی جگہ لہو بہایا۔ کیونکہ بچپن سے لیکر دمِ واپسیں تک
کا کلام انھیں میں تھا، چنانچہ اول اُنکی غزلیں اور قصائد انتخاب کرلیئے، یہ کام کئی مہینہ میں
ختم ہوا۔ پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اِس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے
شروع کیا مگر باطمینان کیا، مجھے کیا معلوم تھا کہ اِس طرح یکایک زمانہ کا ورق اُلٹ جائیگا۔ عالم
تہ و بالا ہوجائیگا۔ دفعتہً ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نرہا۔ چنانچہ خلیفہ محمد اسمٰعیل اُنکے
فرزند جسمانی کے ساتھ اُنکے فرزندانِ روحانی بھی دنیا سے رحلت کرگئے" مندرجۂ بالا حال بہ تغیر
مناسب تذکرہ آبِ حیات سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ جو کچھ کلام اِس وقت چھپا ہوا ملک میں موجود ہی
یہ اُس پُرگو اُستاد کے تمام وکمال کلام کا عشر عشیر بھی نہیں ہی۔ اِسکی تدوین وترتیب کی حقیقت یہ ہی
کہ غدر کے بعد جب دِلی دوبارہ آباد ہوئی اور کسیقدر اطمینان ہوا تو اُستادِ مرحوم کے تلامذہ رشید
مولانا ظہیر، حضرت انور، اور حافظ ویراں نے جمع ہوکر مشورہ کیا کہ اگر اِس وقت اُستادِ مرحوم
کا کلام جمع نہوا تو پھر کوئی نام لینے والا بھی نرہیگا۔ غرض حافظ ویراں جو شاگرد ہونے کے علاوہ
ہر وقت کے رفیق اور ہمنشین تھے اُنھوں نے اپنے حافظہ سے کلام لکھوانا شروع کیا اور مولانا ظہیر
اور انور نے اُسکی کتابت کی اور اِدھر اُدھر جہاں کہیں سے اشعار فراہم ہوسکے مہیا کرکے
۱۸۶۰ء میں دیوان جو آجکل رائج ہے چھاپکر شائع کردیا۔ اُستاد ذوق کی محاورہ بندی مضمون
آفرینی، کلام کی پختگی، صحتِ زبان، سلاستِ بیان، شہرت محتاجِ بیان نہیں، ہر ایک مذاقِ
سخن کا لذت یاب اِس مزے سے واقف ہی اُسکے کلام میں جو زبان کے چٹخارے تھے
اُسکا اثر پڑھنے والوں کے دلوں میں موجود ہے۔ خاقانی ہند کے شاگردوں میں۔ شاہ ظفر
حافظ ویران، مولوی محمد حسین آزاد، ظہیر، انور، مجیر اور سب سے زیادہ فصیح الملک مرزا داغ مرحوم اشہر

زمانہ ہوئے، ذوق اگرچہ نازک خیالی اور مضمون بندی میں غالب اور حکیم مومن خاں کے رتبہ کو نہیں پہنچے مگر انکی خداداد ذہانت اور ہمہ دانی نے اِس کمی کو جیسا کہ چاہیئے پورا کر دکھایا۔ اسی وجہ سے مشاعروں میں جب غزل ہم طرح پڑھتے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مذکور الصدر نامور شعرا سے پست رہے ہیں، ابتدا میں سودا کا رنگ اختیار کیا پھر شاہ نصیر اور جرأت کی طرز پر کہنے لگے حتّٰی کہ کثرتِ مشق سے اپنا رنگ پیدا کر لیا جس میں محاورے کے نظم کرنے کا اسلوب صحتِ الفاظ وزبان چستیٔ بندش، فصاحت شگفتگی مضمون اور حسن ادائے بیان بدرجہ اتم موجود ہیں، انھیں خوبیوں کی بدولت یہ ہر طرح اپنے بلند پایہ ہمعصروں کی ٹکر تھے اور بعض وصفوں میں اُن سے افضل۔ ایک خاص وصف جن سے اِنکی اُستادی مسلّم ہوتی ہے یہ تھا کہ اکثر پامال مضامین اِس خوبی سے اور ایسے الفاظ میں باندھتے تھے کہ اپنی جدت طرازی سے نئے خیال کا لطف اُس میں پیدا کرتے تھے، روزمرہ نہایت بے تکلفی اور صفائی سے برتتے تھے۔ سنگلاخ زمینوں میں اپنے اُستاد شاہ نصیر کی تحریک سے خوب خوب زور طبع دکھایا۔ قصیدے بھی بڑی شان اور آن وبان کے کہے اور اپنی مسلم الثبوت اُستادی کا سکہ تمام معاصرین کے دلوں پر بٹھا دیا سوائے میر ممنون کے اُنکے معاصرین یا متقدمین میں سے کسی نے اِس زور اور شان وشوکت کے قصائد نہیں کہے، نساخ۔ گارسن ڈی ٹیسی، شیفتہ، صہبائی۔ آزردہ، جیسے منصف مزاج باکمالوں نے انھیں فن شعر کا بادشاہ اور قادر الکلام اُستاد تسلیم کیا ہے۔ فن شعر سے ازلی مناسبت قسامِ ازل نے دی تھی اور رات دن سوائے فکرِ شعر کے کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا شاہ ظفر کی رضاجوئی عقیدت کے درجے پر پہنچی ہوئی تھی۔ جسقدر کمال کا درجہ بلند ہوا اُسی قدر پندار کو پست اور خاکساری کو بلند تر کیا۔ اور اسی میں خوش تھے، قناعت وسادگی مزاج کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ متعدد مکانات اُنکی املاک میں تھے مگر خود یہ ایک تنگ وتاریک مکان میں عمر بھر رہا کیے۔ جسکی انگنائی اسقدر مختصر تھی کہ بمشکل ایک چارپائی اُس میں بچھتی تھی دوطرفہ اتنی جگہ رہتی تھی کہ ایک آدمی بدقت چل سکے، کھرّی چارپائی پر رات دن بیٹھے رہتے تھے اور مطالع اور فکر

شعر میں اپنا وقت صرف کرتے تھے، گرمی، جاڑا، برسات، تینوں موسم اس حالت میں بسر کر دیتے تھے، کسی میلے ٹھیلے، عید، تہوار سے انھیں سروکار نہ تھا جہاں اول روز بیٹھے وہیں سے مر کر اُٹھے، اِنکے اکثر اشعار قبولِ عام کی سند پاکر آجکل خواص و عوام کی زبانوں پہ جاری اور دلوں میں جاگزین ہیں۔ شبانہ روز شاگردوں کے کلام کی اصلاح اور دقائق و رموز سخن کی تعلیم کے لیے وقف تھا، آخر عمر میں اکثر بیمار رہتے تھے، آخر ماہِ صفر ۱۲۷۱ھ میں مرض اسہال اور ضعف نے غلبہ کیا اور شب چہار شنبہ آخری کو عالم بقا کا رخ کیا، دوسرے روز جنازہ بڑے تزک و احتشام سے اُٹھا۔ خواجہ باقی باللہ کے قرب میں دفن کیا۔ بادشاہ کی تاریخ لوحِ مزار پر کندہ ہے۔ بادشاہ نے غم اُستاد سے اُس روز جشن موقوف کیا۔ اور اگرچہ دابِ سلطانی کے خلاف تھا قطعۂ تاریخ زبانِ الہام ترجمان سے ارشاد کیا اور بار بار مرحوم کے حقوق جان نثاری کو یاد کرکے افسوس فرماتے رہے

شب چار شنبہ بماہِ صفر	بہ حکم خداوند جان داد ذوق
ظفر روئے اُردو بنا حق زغم	خراشید و فرمود اُستادِ ذوق

تخمیناً چار سو تاریخیں اِنکے انتقال کی کہی گئیں جن میں نظم "واقعۂ تعب خیز" مصنفہ عبدالکریم سوز خلف الرشید حضرت صہبائی بہت مشہور ہوئی۔ اب دیوانِ مطبوعہ کا انتخاب ملاحظہ ہو ٭

پنجۂ جب مول وہ بانکا جواں لینے لگا	موت کے جی میں مزے یہ پنجاں لینے لگا
مجھکو ہر شب ہجر کی ہونے لگی جوں روزِ حشر	مجھ سے یہ کس دن کے بدلے آسمان لینے لگا
تیر چٹکی میں لیا اُسنے سپئے جانِ عدو	شوق کیا کیا میرے دلمیں چٹکیاں لینے لگا

ہاتھ تو ہلکا پڑا اتھا یار کی شمشیر کا	زخم پر تہمت سے میری کارگر اچھا ہوا
ذوق کے مرنے کی سن کر پہلے تو کچھ رک گئے	پھر کہا تو یہ کہا منہ پھیر کر "اچھا ہوا"
پانی طبیب دے ہے ہمیں کیا بجھا ہُوا	ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہُوا
جیتا ہمیں صلا نظر اپنا نہیں آتا	گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا
نا ذکر تری بزم میں کس کا نہیں آتا	پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں ای ذوق وگرنہ
ہر فن میں ہوں مَیں طاق مجھے کیا نہیں آتا

آنکھیں مری تلووں سے وہ ملجائے تو اچھا
ہے حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا

کب لباسِ دُنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر
جامۂ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا

آدمیت اور شے ہی علم ہے کچھ اور چیز
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

سبکو دیکھا اُس سے اور اُسکو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

بل بے گدازِ عشق کہ خوں ہوکے دل کے ساتھ
سینے سے تیرے تیر کا پیکان بہ گیا

تھا ذوق پہلے دہلی میں پنجاب کا سا حُسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہ گیا

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہمسے گنہ گاروں کا

محتسب گرچہ دل آزار ہے میخواروں کا
دیتجے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا

اتنا تو شور و فغاں ہو کہ چمن میں بلبل
خرمنِ گُل کی جگہ ڈھیر ہوا انگاروں کا

چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسےٰ
ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا

لختِ دل اور اشک تر دونوں بہم، دونوں جُدا
ہیں رواں دو ہمسفر، دونوں بہم دونوں جُدا

وصل کی شب نکہت و گل کی طرح ہم اور وُہ
رہتے ہیں باہم دگر، دونوں بہم، دونوں جُدا

پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق
نامرد، مرد، مرد جواں مرد ہو گیا

کریں جُدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوق
کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جُدا

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گرداب بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب کے مرنے سے ہے جینا سہارے کا

کہتے ہیں ذوق آج جہاں سے گذر گیا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اُسکو گر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نکرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ مَیں اُف نہیں کرتا

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے ہے وہ جو تکلف نہیں کرتا

کل اُس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

تو ہماری زندگی پر زندگی کی کیا اُمید
تو ہماری جان لیکن کیا بھروسہ جان کا

چشم و نگہ کو تیری بدنام کیوں کریگا
مرگ و قضا کو تیرا عاشق نہ سے مریگا

عبث جاں منتظر ہونٹوں پہ ہے وہ شوخ کب آیا
اگر چہ لب کو بھی آیا تو ہم جانیں گے اب آیا

لگائی زلف کو شانے نے جب اُنگلی پکارا دل
یہ گستاخی بھلا رہ تو سہی لے بے ادب آیا

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے اِن دنوں صیاد کا

واہ کیا مرہم زخمِ دلِ بیتاب بنا
آب سے نیشترِ تیز کے تیزاب بنا

تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ
اپنا آئینہ مرا دیدۂ پُر آب بنا

محفل میں شورِ قلقلِ مینائے مُل ہُوا
لا ساقیا پیالہ کہ توبہ کا قُل ہوا

آہا تو خفا آنا جانا تو رو لا جانا
آتا ہے تو کیا آنا، جاتا ہے تو کیا جانا

کہے ہے خنجرِ قاتل سے یہ گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا

کیوں لائے و النے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈ کر
دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا

موت نے کر دیا ناچار و گرنہ انساں
ہے وُہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

مسجد میں اُسنے مجکو آنکھیں دکھا کے مارا
کافر کی دیکھ شوخی گھر میں خدا کے مارا

ہزار دم میں اُسے یاد تُونے دیکھا ذوق
گیا وہ غیر کے گھر مجکو ٹال کر کیسا

شکر پردے ہی میں اُس بُت کو خدا نے رکھا
آج ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

کر کے بسمل مجھے کس ناز سے کہتا ہے وہ شوخ
دیکھ تر کیجیو نہ خوں سے کہیں داماں میرا

رکھتے تھے جو کشورِ کسریٰ و قیصر زیر پا
ہے اُنھیں کا آج سر تاجِ افسر زیرِ پا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

ہنگامہ گرم ہستیٔ ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

نالہ اس زور سے کیوں میرا دہائی دیتا
اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے
جبتک نہیں آتا اُسے غصہ نہیں آتا

ہمنے اُن سے دوستی کی، وہ ہیں کرتے دشمنی
دیکھو کیا سوچا تھا ہمنے اور وہاں کیا ہو گیا

تری چشم فسوں گر نے کہاں سیکھا تھا یہ جادو
کیا ہے اک نگہ میں اے پری تسخیر دل میرا

اُنسے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں ہونا اچھا
وہ جو کچھ کہویں تو تم بھی کہے جانا اچھا

تم نے دشمن ہی جو اپنا ہمیں جانا اچھا
یارِ ناداں سے تو ہی دشمن دانا اچھا

یہاں تو دم ہیں نہیں دم اور وہ لئے تیغ دودم
کہتے ہیں دیکھو نہیں دم کا چرانا اچھا

آگ ہے دل میں، درد جگر میں، آنکھ میں آنسو لب پہ فغاں
عشق نے آنکے ذوق ہمارا دیکھو تو یہ حال کیا

ترے ہاتھوں کوئی آوارہ اگر دوں نہ ٹھیریگا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھیروں نہ ٹھیریگا

وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی
اگر ہاتھ آئیگا گنجینۂ قاروں نہ ٹھیرے گا

کعبہ کے دیوار و در سے نور کے جلوے اٹھیں
گر پڑے سایہ مرے میخانہ کی دیوار کا

دُنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دین گیا
وہ مل گیا تو جانئے کچھ بھی نہیں گیا

آخر گِل اپنی خاکِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مجنوں اِس سیاہ خیمۂ لیلیٰ کے گرد پھر
ای خوش نصیب تجکو طواف حرم نصیب

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج
کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

ریشِ سفیدِ شیخ میں ہے ظلمتِ فریب
اِس مکر چاندنی میں نکر نا گمانِ صبح

تھی زلف تیری سنبل صحن چمن کی شاخ
قطروں سے پر عرق کے بنی یاسمن کی شاخ

بد خصلتوں کو کرتا ہے بالا نشیں فلک
اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

ماتھے پہ ترے چمکے ہے جھومر کا پڑا چاند
تھا وعدہ چڑھے چاند کا لا بوسہ چڑھا چاند

مُہر وہ کرتا ہے نامہ پہ مجھے آتا ہے رشک
ہائے یوں چھوٹے لعاب اُسکے دہن کا کاغذ

نکتہ نہیں حرفِ دل نشیں تھا، دہن کی تنگی سے تنگ ہو کر

نکل کے رستہ سے چشم قتاں کے دل میں بیٹھا خدنگ ہوکر

وہ چشم مخمور اک نظر سے، چبھوئے لاکھوں جو نشتر سے

تو ہو رواں ہر رگِ جگر سے، لہو مئے لالہ رنگ ہو کر

نکل گئے تھے تم جیسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر — چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک — لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

دل تو لگتے ہی لگیگا حوریانِ عدن سے — باغِ ہستی سے چلا ہوں ہائے پریاں چھوڑ کر

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن — کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

کہا پتنگ سے نے یہ دار شمع پر چڑھ کر — عجب مزا ہے جو مریئے کسی کے سر چڑھ کر

ذبح کرنے کو مرے پوچھتے کیا ہو تکبیر — تم چھری پھیر بھی دو نام خدا کا لیکر

لے گیا دل کون میرا ذوق کس کا نام لوں — سامنے آجائے تو شاید بتا دوں دیکھ کر

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر — پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

وہ کہے کون ہے قربان مری چتون پر — میں کہوں میں تو کہے "میں کے چھری گردن پر"

ہوں سرد ہو بچا نہ دوبارہ حلال کر — میں اور دم چراؤنگا یہ تو خیال کر

پوچھا ابھی چلے ہیں کو لٹنے کعبہ کو اہلِ درد — ملکِ فنا ہی جائیں ذرا دل سنبھال کر

تصویر انکی حضرتِ دل کھینچ لائے گر — رکھ دینگے ہم بھی پاؤں پہ آنکھیں نکال کر

قاتل ہے کس مزے سے نمک پاشِ زخمِ دل — بسمل ذرا تڑپ کے نمک تو حلال کر

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہو تو آن کے پاس — بیوفا وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

ہیں تو ایسی جھجک پہ فدا ہوں کہ کان کو — شب کیا چٹا لیا مرے موئے دہن کے پاس

صفحۂ دہر پہ یک دل نہ ہوا ایک سے ایک — دو لکھے دو حرف ہیں وہ بھی ہیں جدا ایک سے ایک

ہم انکی چال سے پہچان لینگے انکو برقع میں — ہزار اپنے کو وہ ہم سے چھپائیں سر سے پاؤں تک

مرا دل یک، دوں اس خوش ادا کی کس ادا کو میں — کہیں وہاں تو ادائیں ہی ادائیں سر سے پاؤں تک

بنایا اسلئے اس خاک کے پُتلے کو تھا انسان | کہ اسکو درد کا پُتلا بنائیں سر سے پاؤں تک
سو ٹکڑے ہیں ایڑی کے بزنگِ گُلِ صد برگ | کیا دشت نوردی میں کترتا ہے جنوں گُل
ہے روشنئ خانۂ دل - سوزِ محبت | زاہد تو بتا شمع حرم کیونکہ کروں گُل

بزنگِ غنچۂ پیکان و غنچۂ تصویر | نہ دیکھا اپنا شگفتہ کسی بہار میں دل
کٹ سکا صیدِ محبت کا نہ قاتل سے گلا | اُسنے پتھر سے یہ رگڑا کہ ہُوا چاقو گرم

ہاں تأمل دمِ ناوک فگنی خوب نہیں | ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں
یہ نہیں شیشۂ مے، ہے کسی میخوار کا دل | محتسب دیکھ نکر دل شکنی، خوب نہیں

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے دل | باہم لڑا کے شیشۂ و ساغر کو توڑ دوں
احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا | کشتی خدا پہ چھوڑ کے لنگر کو توڑ دوں
پھر اُس مژہ کی یاد کرے ہے تو دلمیں ذوقؔ | نشتر چبھو کے ہیں سر نشتر کو توڑ دوں
گو اضطراب دل کو بیاں کرتے ہم نہیں | پر جو نگاہ ہے رگِ بسمل سے کم نہیں
دیتا ہے دورِ چرخ کسے فرصتِ نشاط | ہو جسکے پاس جام وہ اب جم سے کم نہیں
مشکل ہے میرے عہدِ محبت کا ٹوٹنا | اے بیوفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں
رُکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں | کہ بُو فساد کی آتی ہے بند پانی میں
کہانیاں ہیں حکایاتِ خضر و آبِ بقا | بقا کا ذکر ہے کیا اِس جہانِ فانی میں
وفورِ اشک اگر سر باوج ہو اپنا | فلک بزنگِ گُلِ نیلوفر ہو پانی میں
لگاتے ہمتِ گریہ میں دل جلوں کو ترے | یہ ہیں وہی جو لگاتے ہیں آگ پانی میں
مزا ہے تیغِ محبت کے زخم کھانے کا | کرے جو صرفہ نہ قاتل نمک فشانی میں
ہفتاد و دو طریق حسد کے عدد ہیں | اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں
وہ ایک دم کہ جس میں میسّر ہو وصلِ یار | بہتر سمجھتے ہم اُسے عمرِ ابد سے ہیں
خورشید وار دیکھتے ہیں سبکو ایک آنکھ | روشن ضمیر ملتے ہر اک نیک و بد سے ہیں
وہ مست ہوں کہ رکھتے قدح کش تمنّا | بنیادِ میکدہ مری خشتِ لحد سے ہیں

ہوجاتا دِل ہمہ بیٹھ کے خود گلرخوں میں گُل
تاثیر باغِ خلد ہے تاثیر باغِ حسن

گئی یاروں سے وہ اگلی ملاقاتو نکی سب رسمیں
پڑا جس دن سے دل بس میں ترے اور دیکھے ہم بیں

مجھے ہو کس طرح قول و قسم کا اعتبار اُنکے
ہزاروں دیجکے وہ قول لاکھوں کھاچکے قسمیں

ستی و نا آشنائی وحشت و دیوانگی
یا تری آنکھوں نیں دیکھی یا ترے دیوانے ہیں

اِس گلستانِ جہاں میں کیا گُلِ عشرت نہیں
سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں

کھا کے زخمِ تیغِ قاتل جو بجا لائے نہ شکر
کوئی بھی اُس سے زیادہ کافرِ نعمت نہیں

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

پھر مجھے لے چلا اُدھر دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

واعظا! چھوڑ ذکرِ جنت و حور
کر شراب و کباب کی باتیں

سُنتے ہیں اُن کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کِس مزے سے عتاب کی باتیں

ہم اپنے جذبۂ دِل کے اثر کو دیکھتے ہیں
وہ پہلے بزم میں دیکھیں کدھر دیکھتے ہیں

مے مِلا کر ساقیانِ سامری فن آب میں
کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

دیکھنا آبی ڈوپٹہ مُنہ پر اُسکے وقت خواب
بُرج آبی میں ہے مہ - یا مہرِ روشن آب میں

کہتے تھے آنے کو خاطر سے ہماری پرسوں
ہُوئی برسوں نہ ہوئی پر وہ تمھاری پرسوں

جیتے ہی جی کیا ملکِ فنا میں سا تھ بشر کے جھگڑے ہیں
مرکے اِدھر سے جبکہ چھُٹے تو جاکے اُدھر کے جھگڑے ہیں

کیسا مؤمن، کیسا کافر کون ہے صوفی - کیسا رند؟
سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے یہ شر کے جھگڑے ہیں

ایک ایک جور و ستم پر اُنکے سو سو داغ دل ہیں گواہ
ہم جو اُس سے جھگڑتے ہیں، حق ثابت کرکے جھگڑے ہیں

غم کہتا ہے دشمن ہوں میں جلوۂ جاناں کہتا ہے میں

کسکو نکالوں کسکو رکھوں یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں
بحر ہیں موتی پانی پانی، لعل کا دِل خوں پتھر ہیں
دیکھو لب و دنداں سے تمھارے لعل و گہر کے جھگڑے ہیں
حضرتِ دل کا دیکھنا عالم ہاتھ اُٹھائے دُنیا سے
پاؤں پسارے بیٹھے ہیں اور سر پہ سفر کے جھگڑے ہیں
ذوقؔ مرتب کیونکہ ہو دیواں، شکوۂ فرصت کس سے کریں
باندھے گلے ہیں ہم نے اپنے، آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

چشمِ گریاں نے اگر کی اس برس برسات خوب
سبز ہو جائیں گی سب میری قفس کی تیلیاں

جس جگہ بیٹھے ہیں، بادیدۂ نم اُٹھے ہیں
آج کس شخص کا مُنہ دیکھ کے ہم اُٹھے ہیں

سینہ و دل پہ مرے زخمِ جگر ہنستے ہیں
ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن مضطراب ہیں
وہاں ایک خامشی تری سب کے جواب ہیں

جو ہے سو پہلے میرے اُٹھانیکی فکر ہیں
محفل میں اُسکی ہیں کوئی جو سر کا رنگ ہو لیں

نہیں تدبیر کچھ بنتی پڑے سر کو پٹکتے ہیں
نہ دِل چھوڑے ہے اُسکو اور نہ ہم دل چھوڑ سکتے ہیں

مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے میں
بیوفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لیجانے میں

ہیں دہن غنچوں کے وا کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
شاید اُس کو دیکھکر صلِ علیٰ کہنے کو ہیں

قطعہ

ہائے کل سب آشنا تیرے مریضِ عشق کے
تھے علاجِ ضعفِ دِل و ضعفِ تن کی فکر ہیں

آج گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں باچشمِ پُرآب
گاہ تدبیرِ لحد ہیں گہ کفن کی فکر ہیں

زاہدِ گمراہ کے مَیں کس طرح ہمراہ ہوں
وہ کہے "اللہ ہو" اور مَیں کہوں "اللہ ہوں"

کبھی کرتا ہوں فغاں اور کبھی ضبط فغاں
نہیں معلوم وہ خوش اِس میں ہے یا کہ اُس میں ہے

خضر ساقی ہو تو میں جام نہ لوں گر جانوں
کہ نہیں جام میں مے آب بقا ہے اس میں

اُس جفا کیش کے نامے کو پڑھوں کیا قاصد
جو کہ قسمت میں لکھا تھا وہ لکھا ہے اس میں

جا پڑا پانوں پہ قاتل کی تڑپ کر کشتہ
سرد ہونے پہ بھی گرمیٔ وفا ہے اس میں

دین کیا ہی بلکہ دیجئے ایمان بھی نہیں
زاہد یہ بت خدا کی قسم ایسے شخص ہیں

خانقاہ میں بھی وہی ہے جو خرابات میں ہی
فرق پر یہ ہی یہاں منہ پہ ہی اور واں دل میں

ایک پتھر پوجنے کو شیخ جی کعبے گئے
ذوق ہر بت قابل بوسہ ہی یاں بتخانے میں

یہ طوق اس واسطے چھوٹا ہوا قمری کی گردن میں
کہ تھا بلبل کی قسمت کا پڑا قمری کی گردن میں

باعث رشک ہوا عشق ہمارا ہم کو
تجھپہ بے دیکھے ہے غش جسنے کہ دیکھا ہمکو

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہمکو
آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہمکو

کس بلندی پہ دیا عشق نے پہنچا ہمکو
کہ فلک آیا نظر خال سے چھوٹا ہمکو

ہم تبرک ہوئے اب کرلے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لیئے آبلۂ پا ہمکو

کرتے جوں کو نہیں ہم تو سخن میں سبقت
پر وہ کچھ ہم سے سنے گا جو کہے گا ہمکو

کھانے پینے کی قسم کھائی ہی تجھ بن ہمنے
ورنہ تھا زہر تو ہر طرح گوارا ہمکو

اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا
وہ نصیب اسکو ہوئی جو تھی تمنا ہمکو

اک حلاوت ہی عداوت میں بھی اس ظالم کی
کہ اگر زہر بھی دیتا ہے تو میٹھا ہمکو

سنگدل تین دن اب گور میں بھی بھاری ہیں
ہے سوم میں جو ترے آنیکا دھوکا ہمکو

دیکھا آخر کہ نہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپنے چھیڑا ہمکو

اور ہمدم تو کہاں ہو نہ ہوا حضرت دل
درد اب ہم کو تمھارا ہی تمھارا ہمکو

موت ہی سے کچھ علاج درد فرقت ہو تو ہو
غسل میت ہی ہمارا غسل صحت ہو تو ہو

آتش فرقت میں پروانہ سا کیڑا اجل مرے
آدمی سے کیا نہو لیکن محبت ہو تو ہو

رند خراب حال کو زاہد نچھیڑ تو
تجکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے اس ہاتھ میں زلف مشکبو ہو
پھر زلف رہے وہ دست موسیٰ جس میں اخگر آتش ہو

اک خون کا دریا جذب کیا ہی خاک کوئے قاتل نے
ہاں دفن کو ایسے کشتوں کے ایسی ہی زمین دلکش ہو

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

نفس کی آمد و شد ہے نمازِ اہل حیات
جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو

رہائی قتل پر موقوف ہو گر ہم اسیروں کی
روانی تیغ کی پابستۂ زنجیر جوہر ہو

ترے بیمار کو گر اپنے جینے کی تمنا ہو
فلک پر سُنکے ہنستے ہنستے شادیٔ مرگ عیسیٰ ہو

دیکھا دمِ نزع دلآرام کو
عید ہوئی ہو ذوق ولے شام کو

عبث تم اپنا رکاوٹ سے مُنہ بناتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مُسکراتے ہو

ہوش و خرد گئے نگہِ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے بات اپنی سو دیوانہ پن کے ساتھ

افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لُطف
لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ

تو جان ہے جہاں کی اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

چھوڑا نہ دل میں صبر، نہ آرام، نہ شکیب
تیر نگہ نے صاف کیا گھر کے گھر پہ ہاتھ

ترے کوچے کو وہ بیمارِ غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

مجھے آتا ہے رشک اُس رندِ مے آشام پر ساقی
نہ جو دع ما کدر جانے نہ جو خُذ ما صفا سمجھے

حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا
حساب دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے

ساقیا ہوں نہ صبوحی کے جو عادت والے
شور محشر سے بھی چونکیں نہ ترے متوالے

کس مرض کی ہیں دوا یہ لب جاں بخش ترے
جاں بلب ہیں ترے آزار محبت والے

نہیں جز شمع مجاور مرے بالینِ مزار
نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدر وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

ہم نے اُس بت کو جو دیکھا ہے نہیں کہہ سکتے
کہ مبادا کہیں سُن پائیں شریعت والے

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُنکا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

ہائے رے حسرتِ دیدار میری ہائے کو
لکھتے ہیں ہائے دوچشمی سے کتابت والے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اسنے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

خوب رو کا شکایتوں سے مجھے — تو نے مارا غنایتوں سے مجھے
واجب القتل اُس نے ٹھہرایا — آیتوں سے روایتوں سے مجھے

کل جہاں سے کہ اُٹھا لائے تھے احباب مجھے — لیچلا آج وہیں پھر دلِ بیتاب مجھے
مَیں نہ تڑپا جو دمِ ذبح تو یہ باعث تھا — کہ رہا مدِ نظر عشق کا آداب مجھے
ورنہ وہ شوخ کہ جو گل سے بھی نازک ہو سوا — لیوے اِس طرح سے زانو کے تلے داب مجھے
قسمت اُس بت سے جا لڑی اپنی — دیکھو احمق خدا سے لڑتی ہے
دیکھو اُس چشمِ مست کی خوبی — جب کسی پارسا سے اڑتی ہے

کوئی ہی کافر کوئی مسلمان جدا ہر اک کی ہی راہ ایماں — جو اسکے نزدیک رہبری ہی وہ اسکے نزدیک رہزنی ہی
زمیں پہ نورِ قمر کی گرمی ہیں صاف اظہار روشنی ہی — کہ جو ہیں روشن ضمیر اُنکو فروغ اُنکی فروتنی ہے
غمِ جدائی ہیں تیری ظالم کہوں ہیں کیا مجھپہ کیا بنی ہے — جگر گدازی ہی، سینہ کاوی ہی، دلخراشی ہی، جانکنی ہے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے — مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
یقیں ہے صبحِ قیامت کو بھی صبوحی کش — اُٹھیں گے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے

مزے یہ دل کے لیئے تھے نہ تھے زباں کیلیئے — سو ہمنے دِل ہیں مزے سوزشِ نہاں کے لیئے
بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو — زباں نہ دل کے لیئے ہی نہ دل زباں کے لیئے
چلے ہیں دیر کو مدت ہیں خانقاہ سے ہم — شکستِ توبہ لیئے ارمغاں مغاں کے لیئے
دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لیئے — سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لیئے
وہ مول لیتے ہیں جب دام کوئی نئی تلوار — مجھی پہ پہلے لگاتے ہیں امتحاں کے لیئے
مثال یہ ہے مرا جب تلک کہ دم ہیں دم — فغاں ہے میرے لیئے اور ہیں فغاں کیلیئے
جو پاسِ مہر و محبت کہیں یہیں بکتا — تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لیئے
بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزوِ ضعیف — اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لیئے

جو دل قمار خانہ ہیں بت سے لگا چکے — وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

کیا لیچلے گلی سے تری ہم کہ جوں نسیم
آئے تھے سر پہ خاک اڑانے اڑا چلے

لیجائیں تیرے کشتہ کو جنت میں بھی اگر
پھر پھر کے تیرے گھر کی طرف دیکھتا چلے

لیتے ہی دل جو عاشق دلسوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

یہ ذوق مے پرست ہو یا ہے صنم پرست
کچھ ہے بلا سے لیک محبت پرست ہے

الفت کا نشہ جب کوئی مر جائے تو جائے
یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم جانکر
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہمسے سیکھ جائے

زخمی ہیں ہوا ہوں تری دزدیدہ نظر سے
جانیکا نہیں چور مرے زخم جگر سے

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

گاہ ہجوم یاس میں ہے دل گاہ ہجوم حسرت میں
ہے یہ مرد سپاہی ہمیشہ پھرتا لشکر لشکر ہے

ہاتھ اُٹھاؤ عشق کے بیمار سے
کوئی بچتا بھی ہے اِس آزار سے

صاف اک ابر شفق آلودہ ہے
زلف اُسکی سرخیٔ رخسار سے

لبریز صد نشاط برنگِ ہلالِ عید
سینہ میں میرے ناخنِ غم کی خراش ہے

تمکو کچھ یاد بھی ہیں پہلے وہ الفت کے مزے
بے مزہ ہونیکے لُطف اور شکایت کے مزے

دیکھ کر اُسکو گیا عالم حیرت میں جو میں
لیک میں کیا کہوں اُس عالم حیرت کے مزے

بے محبت نہیں ای ذوق شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں ای ذوق محبت کے مزے

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اُف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

کیوں غنچہ پریشاں نہ ہو ہوتے ہی شگفتہ
اِس باغ میں ہونا ہی دلِ شاد غضب ہے

وہ کونسا غم ہے کہ جو دنیا میں نہیں ہے
اور اس پہ بھی دلکش یہ غم آباد غضب ہے

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ در توبہ باز ہے

اُڑائے خوب گلچھرّے نکل مجنوں نے زنداں سے
کہ ہر سو گلفشانی ہی شرارِ سنگِ طفلاں سے

شرارے متصل نکلے یہانتک سنگِ طفلاں سے
کہ چمکے ہی سرِ مجنوں پہ بجلی سنگِ باراں سے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنسکر گذار یا اِسے رو کر گذار دے

اِس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہی
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

پئیں مے آشکارا کسکی ہمکو ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سُنے
ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

وشاہو کالی نے جبکی دلکو تو وہ حسنوں کے اثر سے کھیلی
وہاں کاکُل کا تیری مارا نہ مُنہ سے بولی نہ سر سے کھیلی

دردِ دل سے لوٹتا ہوں کسکو میرا درد ہے
ہوں ہیں لفظِ درد جس پہلو سے اُلٹو درد ہے

کھُلتا نہیں دل بند ہی رہتا ہے ہمیشہ
کیا جانے کہ آجائے ہی تو اسمیں کدھر سے

یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنیکی خبر دیتی ہے

یوں نگہ نکلی ہے چشمِ یار سے
مست جیسے خانۂ خمّار سے

تم دو گھڑی کو آؤ تو ہیں لب پہ جان کو
ٹھیرا رکھوں کہ اور بھی یاں دو گھڑی رہی

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعویٰ تجھپر
بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مکر جائیں گے

لائی حیات آئے قضا لیچلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے
ہنستے ہیں مگر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

ہم متناعدو اپنا کسیکو نہیں پاتے
تم پاتے ہو ہمکو تو چھری کو نہیں پاتے

جا کے اکبار نہ پھرنا تھا جہاں سے ہمکو
بیقراری ہے کہ سو بار لئے پھرتی ہے

دم کو ہمارے سینے میں اک دم نہیں قرار
یہ وہ غریب ہی کہ مسافر وطن میں ہے

ہمارے سینہ میں وہ آہِ آتشیں ہے ذوق
جو برق دیکھے تو فی النار والسقر ہو جائے

راتوں کو نہ ہو حق کر اے شیخ مناجاتی
سوتے ہوئے چونکیں گے رندانِ خراباتی

بیقراری کا سبب ہر کام کی اُمید ہے
نا اُمیدی ہو تو پھر آرام کی اُمید ہے

شبِ ہجراں بسر نہیں ہوتی
نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی

ہوس ہے کعبہ کی کیوں شیخ بتخانے سے گھر ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے

مری طاعت سے اب تو معصیت بھی عار کرتی ہے
مری توبہ پہ توبہ توبہ استغفار کرتی ہے

باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی
کالا کرے گا منہ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی

مرچیں سی لگ رہی ہیں زخمِ جگر کو میرے
مصروفِ چارہ دیکھا کیا چارہ گر کو میرے

نہ پوچھو کہ دل شاد ہے یا حزیں ہے
نہیں یہ بھی معلوم ہے یا نہیں ہے

گل تو کھل کھلکر بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

لاشے کو پھینک دیجئے میرے کہ دفن کیجے
مردہ بدستِ زندہ جو چاہیے سو کیجئے

ق اے ذوق بس نہ آپ کو صوفی جتائیے
معلوم ہے حقیقتِ ہو حق جناب کی

نکلے ہو میکدے سے ابھی منہ چھپا کے تم
دابے ہوئے بغل میں صراحی شراب کی

ق تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق
ہے برا وہ ہی کہ جو تجکو برا جانتا ہے

اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے
کیوں برا کہنے سے تو اسکے برا مانتا ہے

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے

ذوقا

ذوقا۔ ذوقا شاہ بنارسی مجذوب تھے غدر سے پیشتر شرف الدین احمد کے پاس میرٹھ میں رہا کرتے تھے عرصہ ہوا انتقال کر گئے۔

نے بام کی ہیں زیب نہ زینت کسی در کے
ہم باٹ کے روڑے ہیں اِدھر کے نہ اُدھر کے

قدر تم نے صاحب نجانی ہماری
گئی رائگاں جانفشانی ہماری

ذوقی

ذوقی۔ شاہ ذوقی درویش خانہ بدوش شعر دردمندانہ کہتے اور صاحبِ تصوف و اخلاق برگزیدہ تھے اٹھارھویں صدی کے وسط میں حیات تھے، یہ چند شعر اُنکے ہیں۔

اُس کا شکوہ نہ گاہ کیجئے گا
جس طرح ہو نباہ کیجئے گا

اپنی یہ چاہ اسکی وہ صورت
اے عزیزاں نگاہ کیجیے گا
اُسکے دیوانہ پن کے عالم کو
دیکھ کر واہ واہ کیجیے گا
اپنے ذوقی کے گھر میں مشفقِ من
گہ کرم گاہ گاہ کیجیے گا

ہے ہاتھ کماں اُسکے اب تیر ہے اور میں ہوں
تدبیر ہے لاحاصل تقدیر ہے اور میں ہوں
ہر شب وہ کماں ابرو کہتا ہے سرِ مجلس
کل صبح کو میداں میں نخچیر ہے اور میں ہوں
رکھ ہاتھ وہ قبضہ پر برہم ہو لگا کہنے
اب تو ہے ترا سر ہے شمشیر ہے اور میں ہوں
یوں ریختہ کہنے کو عالم میں ہزاروں ہیں
بدنام پر اے ذوقی اک میر ہے اور میں ہوں

جلد آ مل جو تجھکو آنا ہے
ورنہ کوئی دم میں دم روانہ ہے
تمکو ڈھونڈے کہاں کوئی ذوقی
نہ ترا ٹھور نے ٹھکانا ہے

ترے کوچے میں ہم بھی آج لے تلوار بیٹھیں گے
رقیب روسیہ کو بید سے ٹرک ہی مار بیٹھیں گے
جو غیروں کو تم اپنے مُنہ لگاؤگے تو بولیں گے
نہیں تو شکل نے خاموش ہو لاچار بیٹھیں گے
یہ ذوقی بھی ترے غصہ سے ڈرنیکا نہیں ہرگز
اُٹھاؤگے جو در سے جا پس دیوار بیٹھیں گے

عشق میں نہ سیم نہ زر چاہیئے
آہ میں کچھ اپنی اثر چاہیئے
ذوقی آوارہ ترے قتل کو
خاص کوئی تیغ و تبر چاہیئے

ذوقی۔ سید عبدالواحد خلف سید اشرف درگاہی بلگرامی، ولادت اُنکی ۲۹ ربیع الاول ۱۱۱۷ھ بمقام بلگرام واقع ہوئی۔ مولوی سید محمد مؤلف تذکرہ تبصرۃ الناظرین خلف الصدق علامہ بے عدیل میر عبدالجلیل بلگرامی لکھتے ہیں کہ سید ذوقی خوش طبع اور شیریں زبان تھے طبیعت برجستہ رکھتے تھے۔ فارسی شعر خوب کہتے تھے اور تخلص اپنا واحد کرتے تھے آپنے اوایک دیوان ابو اسحاق اطعمہ ولایتی کے مذاق میں لکھا ہے (ابو اسحاق ایک ولایتی شاعر ہے جس نے اپنے اشعار میں کھانوں کا بہت تذکرہ کیا ہے، یہ اُنھیں کا شعر مشہور رہے ؎

پس از سی سال بر اسحاق شد تحقیق این معنی
کہ بورانی ست بادنجان و بادنجان بورانی

سید ذوقی نے بھی شیرینی کے ذکر سے اپنے کلام میں حلاوت پیدا کی اور دیوان کا نام شکرستانِ خیال رکھا، وہ دیوان چھپ بھی گیا ہے دو چار شعر اُس میں سے ضیافتِ ناظرین کے لیئے لکھے جاتے ہیں ؎

ببیں ببوسئے چپاتی بدیدۂ انصاف	کہ بے وصالِ شکر حالتِ نزاراں چیست
غرض زموسم برسات اولہ بندی است	وگرنہ ایں ہمہ تمہیدِ ابر و باراں چیست

در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست	اہمال در تناولِ فرنی چرا کنید
مزعفر بادیدم بر خوانِ نعمت	مُربا گر بود نورٌ علےٰ نور

غرض اِس طرز میں کہتے کہتے اُردو کی طرف بھی عنانِ توجہ مبذول کی، اِن دنوں ریختہ غزل سرائی کی ابتدا تھی، خانِ آرزو، آبرو وغیرہ کا زمانہ تھا۔ جناب ذوقی خود صاحبِ منصب تھے، اور قصبۂ راہون ضلع لدھیانہ میں حاکم تھے، اُنھیں ایام میں زمینداروں سے کسی معاملہ میں تکرار ہوگئی اور ۱۱۳۴ھ میں مارے گئے، یہ اُن کا اُردو کلام ہے۔

عشق کا دل پر ستم اچھا ہوا	مر گیا بیمارِ غم اچھا ہوا
بہ نہوگا یہ دو لے سے ای طبیب	جب کیا اُسنے کرم اچھا ہوا
زور ہی آباد تھا دل کا نگر	کر گیا تاراج غم اچھا ہوا

ذہین

ذہین - حافظ محمد اسمٰعیل خان ذہین دہلوی نبیرۂ حافظ محمد داؤد خاں مرحوم داروغۂ نذر و نیاز حضرت بہادر شاہ ثانی (جن کا ذکر داؤد تخلص کے تحت میں آچکا ہے) شاگرد حافظ غلام دستگیر مبین، بڑے وجیہ اور شکیل جوان تھے مگر صحبتِ بد نے ایسا خراب کیا کہ چند ہی روز میں اپنے دادا کی ہزار ہا روپیہ کی املاک برباد کر کے تباہ و خستہ ہوگئے، بیگم صاحبہ بھوپال کی سرکار سے کچھ وظیفہ ملتا ہے اُس سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ بازار چاوڑی میں جو وسیع دیوانخانہ اب نواب دوجانہ کی ملکیت ہی اُنکے دادا کا تعمیر کردہ ہے۔

نام اُس صنم کا دل سے بھلایا نجائیگا	ہے نقش کالحجر یہ مٹایا نہ جائے گا

شعلہ ہوں برق کا جو مجھے چھیڑے وہ جلے
ہستی کا نقش میری مٹایا نجائے گا
عشاق صدمہ ہائے قیامت اٹھائینگے
جب تک فلک زمیں پہ گرایا نجائے گا

ذہین

ذہین۔ حافظ مولوی حکیم نور الحسن صاحب کیرت پور نہٹور ضلع بجنور کے سادات رضوی سے آپکے والدِ ماجد مولانا محمد ظہور الحسن صاحب مشہور اور بے مثال فضلا میں تھے، آپ پیدایش کے پانچویں سال نابینا ہو گئے تھے پھر بھی قرآن مجید حفظ کرلیا۔ کتب درسیہ کی تکمیل کے بعد علم طب حکیم مولوی رحیم اللہ صاحب بجنوری سے حاصل کیا۔ عربی۔ فارسی، اُردو، تینوں زبانوں میں نظم و نثر تحریر فرماتے ہیں، کلام بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہے اُن کا بیان ہے کہ کئی برس اخبار کے اڈیٹر بھی رہے ہیں۔

فتنے پس پس گئے دب دب گئے محشر کیا کیا
فتنۂ قامت جو مرے گھر سے خراماں نکلا
آبلے پھوٹ کے روئے مری تنہائی پر
کفِ پا سے جو کوئی خارِ مغیلاں نکلا
بعد مردن وہ عیادت کے لیئے آتے ہیں
جان نکلی ہوئی آئی میرا ارماں نکلا
ترے فراق میں دریا بھی قتل کرتا ہے
دکھائی موجِ صبا نے حباب میں تلوار

فتنہ زا ہے تری دزدیدہ نگاہی کیسی
لاتی ہے مملکتِ دِل پہ تباہی کیسی
مجھ سیہ بخت کا جب نام لکھا دفتر میں
پھیلی تقدیر کے دفتر میں سیاہی کیسی
حسرت و یاس و الم ساتھ چلے قبر میں بھی
دیکھنا میرے رفیقوں نے نباہی کیسی
کیا اسی رات سے ہے صبح قیامت کی نمود
شب فرقت میں ہے اللہ سیاہی کیسی
سیر نارِ لن ترانی آج موسیٰ دیکھیے
طُور پر جو کل نہ دیکھا تھا وہ جلوہ دیکھیے
میرا رونا دیکھیے اور اُنکا ہنسنا دیکھیے
مینہ برسنا دیکھیے بجلی کا گرنا دیکھیے
جائی دم بدم لیتے ہیں وہ آنکھوں نکوں مل کے
اشارہ ہے مری جانب کہ آؤ سو رہیں چل کے
دل و جان و دین و ایماں اک ادا میں چھین لیتا ہے
کوئی دیکھے کرشمے اُس بتِ کافر کی چھل بل کے

ذہین

ذہین۔ نواب مرزا کاظم علیخاں صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ آپ انگریزی، عربی، ناگری وغیرہ

ہیں کامل دخل رکھتے ہیں۔ ۲۶ - ۲۷ برس کی عمر ہے، نواب مرزا باقر علیخاں صاحب بہادر دام اقبالہم نواب صاحب شیش محل کے منجھلے صاحبزادے ہیں۔ آپنے ایک مثنوی بھی تصنیف فرمائی ہے ۱۸۹۸ء میں ولایت تشریف لیگئے وہاں سے جون ۱۹۰۱ء میں بیرسٹری پاس کرکے تشریف لائے، آپ کو پولیٹیکل معاملات میں نہایت دلچسپی ہے، راقم تذکرہ کے محب بے ریا ہیں، بارہا ہنگام قیام دہلی اور لکھنؤ میں صحبتیں رہیں۔ خلیق، زندہ دل، متواضع، امیرزادے ہیں۔ کچھ کلام آپنے عنایت فرمایا اُس کا انتخاب حاضر ہے +

دیا دل ذہین اُس ستمگر کو اپنا
کہا ہائے تم نے نہ مانا کسی کا

تیرے ہی در کے ہیں گدا، مالِ جہاں کا ذکر کیا
اور تو کچھ نہیں رہا، نذر کو تیری لائیں کیا

نزع میں آئے ہیں عیادت کو
اے قضا تو ذرا توقف کر

میں تو حرم میں زاہدا راہ بھٹک کے آگیا
بہرِ خدا نہ جی جلا، یاں ہے کہاں دوئی دل

چشم و رُخ و دہانِ یار، سب کریں دل طلب ہزار
ایک تھا کر دیا نثار، اتنے کہاں سے لائیں دل

ترس کھاتا تو کیسا رقصِ بسمل کی ہوں تعریفیں
خدا شاہد بڑا ہی ظلم یہ صیاد کرتے ہیں

ہے وقتِ نزع میرا آرہی ہے آخری ہچکی
ذرا تو اے قضا تھم جا وہ مجھکو یاد کرتے ہیں

مسیحا ہو اگر آؤ کہو تم میری میت پر
نہیں کہدو کہ سب کچھ یوں ہی ہم ارشاد کرتے ہیں

بے سبب کب فلک کو گردش ہے
میری تقدیر اس میں شامل ہے

دِل نہیں، پوچھتے ہو کیا یارو
میرے پہلو میں مرغِ بسمل ہے

کوہکن! کیوں؟ وہی ہوا آخر
ہم نہ کہتے تھے چاہ مشکل ہے

رات کا حال جھوٹ کہتا ہوں
آنکھ مجھ سے ملائیے تو سہی

کیا ذہین پھر کسی پہ دل آیا
چپ ہیں کیوں کچھ بتائیے تو سہی

میں تو ہندو نہ تھا مسلماں تھا
بت کو سجدہ کرا دیا کس نے

تڑپتا ہوں میں اک مدت سے دختِ رز کی خواہش میں
پلا دے آج تو للہ مجھکو یار تھوڑی سی

اِک تو کرنا ظلم اُس پر پوچھنا کیا حال ہے	اب نہ مُنہ کھلوایئے سرکار رہنے دیجئے

مثنوی

خط کو پڑھتا ہوں گو میں سو سو بار	سیر ہوتی نہیں طبیعت یار
کل بھی شادی کی دھوم دھام جہاں	صفِ ماتم بچھی ہے آج وہاں
مُنہ جو ڈھک کر کبھی نہ سوتے تھے	تنگ گوشے میں گور کے ہیں پڑے
کل جہاں تھا بہار کا جوبن	آج بادِ خزاں کا ہے مسکن
اب نہ شیریں ہے اور نہ ہے فرہاد	اب نہ وہ باغ ہے نہ ہے شداد
ہے کہاں قیس اور کہاں لیلیٰ	قبر تک کا پتہ نہیں لگتا
موت کے آگے کیا بشر کی چلے	پیر و پیغمبر اس سے جب نہ بچے

ذہین

ذہین ۔ مولوی سید واجد علی لکھنوی شاگرد محمد مصطفےٰ خورشید لکھنوی مرحوم ۔ یہ چند شعر اُن کے ملاحظہ ہوں ۔

نہ سنگدل کوئی تم سا ملا زمانے میں	ہزار دیکھے جفا پیشہ بھی ستمگر بھی
خدا بچائے یونہیں روز قتل کرتے تھے	کمر میں آج تو شمشیر بھی ہے خنجر بھی
اِس ایک تیر نظر نے کئے ہیں دو بسمل	جگر کے ساتھ تڑپتا ہے قلبِ مضطر بھی

ذہین

ذہین منشی سید غلام مصطفےٰ مخزن اور ادیب وغیرہ رسالوں میں اُنکی نظمیں شائع ہوتی ہیں عموماً اخلاقی مضامین نظم کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ حق شاعری ادا کر دیتے ہیں، الفاظ صاف وشستہ و تراکیب دلنشیں اور مناسب موقع، مسلسل نظمیں جن میں قوتِ فکر کا پورا امتحان ہوتا ہے اکثر بہت اچھی لکھتے ہیں، ایک نظم موسومہ "شعور" قابلِ دید ہے، معرفت اور تصوف کے رنگ میں اکثر طبع آزمائی کرتے ہیں اور فرائض انسانی وطرز معاشرت وتمدن وغیرہ کے مسائل پر بھی اُنکی متعدد نظمیں ہیں، ۳۵، ۳۶ برس کی عمر اور یہ کلام کا انتخاب ہے۔

عہد قیصری

جسے تو چاہے عزت دے جسے تو چاہے ذلت دے	کسیکی فہم میں کب راز یہ آتا ہے قدرت کا

سبب امن واماں کا عہدِ شاہِ عدل گستر ہے
زمانہ جارج پنجم کا ہے آرام وراحت کا

سبب آرام وراحت کا عدالت ہے کہ سلطاں کو
اسی کی ہی ضرورت ہے یہی شیوہ حکومت کا

رعایا پر رعایت کی نظر ہے شاہ پر واجب
اطاعت شاہ کی کرنا فریضہ ہے رعیت کا

عدالت ہی ہے تالیفِ قلوبِ خلق کا باعث
عدالت ہی سبب ہے حق تعالیٰ کی عنایت کا

سمجھنا حق کو حق ناحق کو ناحق سخت مشکل ہے
اہم ہے کام سب کاموں میں انصاف وعدالت کا

زمانہ جارجِ پنجم کا کیا اچھا زمانہ ہے
کہ باعث امن عالم کا ہے دورِ اس کی حکومت کا

مرقعے ہمنے شاہانِ سلف کے غور سے دیکھے
نظر آتا نہیں قیصر کوئی اس شان وشوکت کا

ہوتے ہیں اپنے مقاصد میں وہ اکثر کامیاب
نامرادی میں بھی ہوتے ہیں جو ہمت آشنا

طالبِ دنیا پریشاں حال رہتے ہیں مدام
ہیں بڑے آرام وآسایش میں عزلت آشنا

انسان

او بشر او خاک کے پتلے تجھے اتنا غرور
تیرے ہمجنس اور پھر تو ہی رہے ان سے نفور

نشۂ زر نشۂ رز کی طرح کیوں چڑھ گیا
ہو گئی الٹی سمجھ کیوں؟ کیا ہوا تیرا شعور

تجھسے ہیں محروم سائل سہکے ذلت کا بھی غم
مفلسوں کو کب سمجھتا ہے تو او منعم! غیور

اے بشر تجھ پر نہ ہوتا فضل اگر اللہ کا
تجھکو کب ملتی یہ عزت، یہ شرافت، یہ شعور

کر خدا کا شکر کیا تھا کیا سے کیا تو ہو گیا
جو ہو کرنا آج کر لے کل تو ہے روزِ نشور

ہو کے انسان پھر کرے تو ہی جفا انسان پر
کیا یہی ہے آدمیت کا شعار اے بے شعور

زمانہ سازی

نکالا کرتے ہیں جو لوگ مکر و زور سے کام
سمجھنے لگتے ہیں وہ آپ کو زمانہ ساز

کچھ ایسے کاذب ومکار و چلتے پرزے ہیں
کہ خیر و شر کو بنا لیتے ہیں نشیب وفراز

سمجھتے ہیں وہ یہ معنے زمانہ سازی کے
کہیں رہینِ تملق کہیں بنیں غماز

برائیوں پہ عمل کر کے پھر یہ کہتے ہیں
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

جو ایسے لوگ ہیں وہ سرخرو نہیں ہوتے
برا ہوا انکا جو کرتے ہیں اس برائی پہ ناز

مصیبتوں میں جو رہتے ہیں صابر وشاکر
وہی ہیں قابلِ تکریم ولائقِ اعزاز

لالہ کو بے ثباتی؟ عالم کا داغ ہے
گُل کی طرح گذاریئے یاں نبھے زندگی

یوں دیکھنے کو باغ میں خنداں ہے چندروز
باغِ جہاں میں صحبتِ یاراں ہے چندروز

جیسا ظاہر ویسا باطن اسکا ہو کیونکر یقیں
دیکھکر صورت کو ہو ظاہر کسیکے دلکا حال
بعض مکار اپنا ظاہر گو بنا لیتے ہیں خوب
آزمانے پر مگر ہوتا ہے ظاہر اُسکا حال
ظاہری اخلاق پر لوگوں کے کیا ہو اعتبار
ایسی لذت ہی نہوتے ہیں کہ ہو جنمیں نہیں
بُعدِ فرقت گر نہو تو لطفِ قربت میں نہیں
پاس جو ہو دولت اُسکی قدر کم کرتے ہیں ہم
ہے یہی باعث وطن میں قدر جو ہوتی نہیں
ہمکو اچھی ہی نظر آتی ہے ہر شے دُور سے

....

ہو نہ جبتک امتحانِ ظاہر و باطن ہمیں
ہو نہ جبتک اُسکی سیرت کا ہمیں علم و یقیں
اور کُھلتا ہے بمشکل ہو جو انکے دلنشیں
جعلساز اُنسے زیادہ کوئی دنیا میں نہیں
ہو نہ باطن کی بھی جبتک آزمایش ای ذہین
لطف جو دوری میں ہے قربت میں آتا ہے کہیں
اور عسرت گر نہو تو لطف عشرت میں نہیں
دُور جو ہو یاد اُسکی ہر گھڑی کرتے ہیں ہم
کوئی ہم میں سے نکلتا ہے جو فردِ بہتریں
ہے جو پنہاں شاد ہم ہوتے ہیں ذکرِ حور سے

سب ہیں فانی کیا زمیں کیا آسماں کچھ بھی نہیں
آہ سے مظلوم کی ڈر ظالمِ نخوت پرست
ظاہری احسان سے جب ممنون کرنا ہے غرض

فنا

اِک خدا کو ہے بقا دونوں جہاں کچھ بھی نہیں
سامنے جسکے زمین و آسماں کچھ بھی نہیں
مہربانی یہ تو لے نامہرباں کچھ بھی نہیں

جہاں میں ہے یہ دلیلِ شرافتِ انساں
گزارے عمرِ دوروزہ وہ نیک نامی سے

اُمیدِ خیر پہ مبنی ہو عادتِ انساں
یہی ہے باعثِ آرام و راحتِ انساں

ہو جو چھوٹا تم سے اُسپر چاہیئے لطف و کرم
جو بُری ہی بات نفرت اُس سے ہو جائیگی خود

جو بڑا تم سے ہے خاطر اُسکی اور عزت کرو
نیک کاموں ہی کی تا مقدور تم عادت کرو

کرتی ہے عیب و ہنر کو آشکارا گفتگو
غور پہلے کرتے ہیں بعد اُسکے دانا گفتگو

جوہر انساں کا ہے آئینہ گویا گفتگو
تا نہ آفت میں پھنسائے بے محابا گفتگو

جب چٹکتی ہے کلی تو صاف آتی ہے صدا
عرضِ مطلب میں رکھو ہر جا خیالِ اختصار
اے خرد ور دل بدست آور کہ حج اکبر است
چاہیئے تمکو مخاطب کے مراتب کا لحاظ
جس سے کچھ جائے مخاطب ہے وہ بیجا گفتگو

ہے گلِ راحت خموشی اور ایذا گفتگو
بارِ خاطر بارہا ہوتی ہے بیجا گفتگو
جس سے دلکو رنج پہنچے وہ بھی ہے کیا گفتگو
سوچ لے پہلے سے کرنا چاہیئے کیا گفتگو
جو نہ کھینچے دلکو سامع کے تو وہ کیا گفتگو

زندگانی کا زمانے میں بھروسا کیا ہے
پاک نیت ہے تو سب کام سنور جائیں گے
اشرف الخلق ہو کچھ پاس بھی ہے عزت کا
منعمو! بیع و شرئی سمجھے ہو احسان کو تم
حق نے پیدا کیا طاعت کے لیئے انساں کو
سخت دشوار ہے انسان کی پہچان ذہینؔ

جز فنا ہونے کے انساں میں رکھا کیا ہے
تم خطاوار نہیں تو تمھیں کھٹکا کیا ہے
کام کیا کرتے ہو تم اور تمھیں زیبا کیا ہے
نہیں منظور جو شہرت تو یہ چرچا کیا ہے
جو نہ طاعت کرے خالق کی وہ بندا کیا ہے
دوست کہتے ہیں کسے آپنے سمجھا کیا ہے

بھلائی کیئے جا شرافت یہی ہے
نکوئی میں کر نام شہرت یہی ہے
وہ کوشش ہی کیا ہے جو اپنے لیئے ہو
کسی سے نہ مکر و دغا کر جہاں میں
تکر دشمنی دوستی کی ہے جس سے
جو اعلیٰ ہو اپنے کو سمجھے وہ ادنےٰ
ہر چیز کو فنا ہے یارب تجھے بقا ہے
احساں میں جب غرض ہو احسان ہی وہ کیا ہے
گر ہو نہ آدمیت وہ آدمی ہی کیا ہے
چشم کرم بشر سے؟ ذلت کا سامنا ہے

اطاعت یہی اور طاعت یہی ہے
بھلائی کے کر کام راحت یہی ہے
تو غیروں کے کام آ کہ ہمت یہی ہے
یہی آبرو و پاس عزت یہی ہے
یہی ہے مروت محبت یہی ہے
یہی خاکساری شرافت یہی ہے
تو مالکِ حقیقی دنیا جہان کا ہے
کیوں نام کی ہے خواہش کس کا نشاں رہا ہے
جو بیکسوں کو پوچھے کیا اسکا پوچھنا ہے
اللہ سے طلب کر جو تجھکو مانگنا ہے

[illegible]

ردیف رائے مہملہ

راجہ

راجہ۔ راجہ راج کشن مغفور رئیس کلکتہ، آپکے والدِ مرحوم مہاراجہ نبا کشن بہادر جو کلائو کے دیوان اور اپنے وقت کے مقتدر اور معزز امرا کے سرتاج تھے، مرزا جان طپش دہلوی سے تلمذ تھا۔ نساخ اور مولنٰنا حبیب الرحمٰن کا بیان ہے کہ انکا ایک ضخیم دیوان اُردو میں تھا، مگر جس تذکرہ کو دیکھا اُس میں صرف ایک ہی شعر نظر سے گزرا، انکے بیٹے راجہ انوپ کشن بہادر بھی شعر کہتے تھے اور کنور تخلص کرتے تھے۔

گرشب کو نہ تم پاس مرے آؤگے صاحب | تو مجکو سحر تک نہ یہاں پاؤگے صاحب

راجہ

راجہ۔ راجہ بہادر نام خلف راجہ شتاب رائے صوبہ دار پٹنہ عظیم آباد۔

یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے | ہم اُن تلک نہ پہنچے وہ ہم تلک نہ پہنچے

راجہ

راجہ۔ بلاس رائے پسر دیوان بانسرائے۔ شوق لکھتے ہیں کہ صاحب اقتدار عالی ہمت از شاگردان حسن علی شوقؔ طبیعت مناسب اور موزوں پائی تھی۔ یہ اُنکا کلام ہے۔

اِس واسطے کسی کی نہ تجکو نظر لگے | انجم بنے سپند بنا مجمر آفتاب
سُنکر ترے جمال کو اب ڈھونڈتا پھرا | لیکر سحر سے شام تلک گھر گھر آفتاب
یہانتک ہی تیرے چہر یکا آب لیں سے ارشک | آتش میں جل کے ہوگیا جوں اخگر آفتاب

راجہ

راجہ۔ رئیس باتمکین مہاراجہ بلوان سنگہ بہادر راجہ خلف ارشد مہاراجہ چیت سنگہ تاریخ میں انکا حال اس طرح درج ہے کہ جب راجہ چیت سنگہ کے والد راجہ بلونت سنگہ نے وفات پائی نواب شجاع الدولہ نے تمام عہدناموں کے برخلاف چاہا کہ علاقہ بنارس پر اپنا دخل کرلیں لیکن سرکار انگلشیہ نے قدیم شرائط کی پابندی بلحوظِ خاطر رکھکر راجہ چیت سنگھ کو مسندِ موروثی پر متمکن کردیا۔ راجہ موصوف حسب قرارداد سابقہ سالانہ زرِ خراج معینہ ادا کرتے رہے لیکن ۱۷۷۸ء میں سرکار انگریزی نے کچھ فوج کمکی طلب کی اور اخذِ زر بھی کرنا چاہا

راجہ نے ان امور کو اپنی مقدور سے خارج پاکر عذر کئے جو مسموع نہ ہوئے اور وارن ہیٹنگز گورنر جنرل خود اس معاملہ کے تصفیہ کے لیے بنارس آئے اور راجہ کی گرفتاری کا قصد کیا۔ اِس امر سے تہلکۂ عظیم مچ گیا اور چارو ناچار جانبین سے فوج کشی کی نوبت آئی آخر الامر والیٔ بنارس مہاراجہ چیت سنگھ نے ۱۷۸۱ء میں شکست پاکر گوالیار کو پناہ گاہ مقرر کیا تو عالیجاہ نے طریقۂ مہمانداری کا مسلوک کر کے پانچ لاکھ سالانہ کی جاگیر علیحدہ کر دی۔ بعد وفات مہاراجہ چیت سنگھ مہاراجہ بلوان سنگھ چالیس سال تک آگرہ میں تشریف فرما رہے، نظیر اور مرزا حاتم علی مہر کے شاگرد تھے بڑے قادر الکلام، مشاق، ذکی اور طباع سخنور تھے تلاشِ مضامین نو کی طرف میل خاص تھا اور اُسکے ساتھ ہی زبان کی صفائی کا اسقدر خیال تھا کہ کیا مجال کہ اسلوب بیان میں ذرا بھی دقت یا اُلجھاؤ پیدا ہو، مشکل زمینوں میں خوب خوب شعر نکالتے تھے شاعروں کے بڑے قدردان تھے ہمیشہ دولتخانے پر مشاعرے ہوا کرتے تھے اور شعرا سے ہر طرح سے مسلوک ہوتے تھے قوم کے ترکما برہمن تھے اُنکے مورثِ اعلیٰ راجہ منسارام کو محمد شاہ نے پندرہ لاکھ سالانہ خراج پر علاقہ جات جونپور۔ غازیپور، بنارس کا صوبہ دیا تھا، سرکار انگلشیہ سے دو ہزار روپیہ ماہوار پنشن مقرر تھی، ۱۷۹۰ء سال پیدایش تھا۔ صاحب دیوان مسمّٰی بہ گل ریاض مطبوعہ عظیم الاخبار پریس آگرہ ۱۲۷۰ھ تھے، ایک کتاب موسوم بہ چتر چندر کا بھی اِن سے یادگار ہے، دیوان نہیں ملا، البتہ تلاش سے بیس پچیس غزلیں ہم پہنچیں اُنکا انتخاب حاضر ہے اُنکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف و مشکل زمینوں میں کس قابلیت اور ذہانت سے فکر کیا ہے، اِنکی قادر الکلامی اور مشاقی قابلِ داد تھی۔ کیوں نہو استعداد علمی کے علاوہ ذہانت اور خوش فکری خداداد تھی۔ انتخاب کلام سے لطف اُٹھائیے ؛

تو ہے وہ گل کہ نام ترا باغ دہر میں	دو دو پہر وظیفۂ مرغ سحر ہوا
خانۂ دل میں خدا و خلِ بتوں کا نکلا	کعبہ ہم سمجھے تھے جسکو وہ کلیسا نکلا
صاف قاتل سے ہُوں اتنا کہ یقین ہے دمِ قتل	میرے خوں کا بھی نہو تیغ پہ دھبہ پیدا

کالا ہے ماہتاب کہ گورا ہے ماہتاب	پردہ نشیں سے پوچھیں گے کیسا ہے ماہتاب
یہ پیر چرخ خادم دیرینہ ہے ترا	دست فلک میں پھول کا پنکھا ہے ماہتاب
حسرت سے قیس دیکھتا ہے چاند کیطرف	کیا نقش پائے ناقۂ لیلیٰ ہے ماہتاب

آنچ تھی تلوار کی برق غضب	ہوگیا کشتہ ترا قاتل کباب
آیا وہ مہ کھینچ تو سیخ شمع پر	ہوگئے پروانے سر محفل کباب

کیا سوتی ہے لیلیٰ تو پڑی خواب لحد میں	روتا ہے کھڑا قیس بچارا سر تربت
اے قیس تری جاں کی نہیں خیر نہیں خیر	خالی ہے کھڑا ناقۂ لیلیٰ سر تربت

حلال کرتا ہے کسکو ہلال شام کیوقت	فلک پہ خون ہے کچھ لال لال شام کیوقت
نصیب اعدا نہ ہو سایۂ پری سر پر	چمن میں پھرتے ہو تم کھولے بال شام کیوقت
خیال زلف میں راجہ تنگ کے مرتا ہوں	تو ایسی باتیں نہ منہ سے نکال شام کیوقت
مطیع خوبوں کی خلق پائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت	صنم بھی کرنے لگے خدائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
جنہیں تھا دعوائے میرزائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت	نصیب ہے اب برہنہ پائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
صنم کدے سے کسے تھی فرصت حرم میں آنا ہے اتفاقاً	غضب ہے ہم اور پارسائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
شروع کی میں نے چھیڑ اسنے تو مجھسے تیوری چڑھا کے بولے	تو ہمسے کرتا ہے ہاتھا پائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
مری تو قسمت میں گالیاں ہیں رقیب کو ہو نصیب بوسہ	مجھے تو سم ہے وہ مسّے مٹھائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت
فقط مجھی کو نہیں ہے الفت مطیع شاہ وگدا ہیں راجہ	صنم بھی کرنے لگے خدائی خدا کی قدرت خدا کی قدرت

کعبہ نہ گئے دیر سے تکفیر کے باعث	اللہ کو بھولے بت بے پیر کے باعث
بے یار کوئی کام ہو ممکن نہیں ناصح	جی لگ گیا فرہاد کا تصویر کے باعث
روشنی داغ جدائی کی فقط کافی ہے	ڈھیر مجنوں کا نہیں شمع لگن کا محتاج
آبلہ گنبد مرقد ہے کفن دامن دشت	نہ تو میں طالب تربت نہ کفن کا محتاج
عرق آلودہ رخ یار کو لے راجہ دیکھ	گل جنت نہیں یہ نہر لبن کا محتاج

جیتے جی حال تو پوچھا نہ بیمارِ عشق کا
ہونٹوں پہ جان شوقِ شہادت سے آگئی
گردش لکھی ہی سر میں تو چکر ہی پاؤں میں

اُٹھتی ہے نعش اب تو ذری چل کسی طرح
قاتل دکھا دے مجکو تو مقتل کسی طرح
اِک قصہ برزمیں ہی تو اک داستانِ چرخ

عاشق کا رنگ زرد ہے پوشاکِ یار زرد
کیسا خیالِ ہجر شبِ وصل آگیا
عاشق کا رنگ زرد نہ ہو کیونکہ ہجر میں

پھولی بسنت باغ میں آئی بہار زرد
یا سرخ تھا میں یا کہ ہوا ایکبار زرد
کردینی ہے خزاں شجر و برگ و بار زرد

کچھ مزا دیگی جو بوسہ کی حلاوت لب پر
حالتِ نزع میں ہے قند کی حکایت لب پر
ضعف کیسا ہی یہ کیسی ہی نقاہت مجھ کو
عزم بوسہ کا تصور میں اگر میں نے کیا
عشوہ و ناز اس انداز کا دیکھا نہ سُنا
دل پہ صدمہ ہو کہ ہو جاں پہ اذیت راجہ

جاں دمِ مرگ رہیگی کئی ساعت لب پر
دم نکلنے نے مچائی ہی قیامت لب پر
نالہ دل سے نہیں آتا ہی سلامت لب پر
پڑ گیا نیل ہوئی ختم نزاکت لب پر
شوخی آنکھوں میں ہی ظاہر ہی شرارت لب پر
آنے پائے نہ مگر حرفِ شکایت لب پر

اے آئینہ رُو جھانک کے غرفہ سے ذرا دیکھ
قاتل سے کہیں کیا دلِ افگار کا احوال

ایک خلق کھڑی نقش بدیوار ہے باہر
ہر وقت وہاں میاں سے تلوار ہے باہر

کہتے ہیں جسکو دخترِ رز میری جان ہے
ہوتے ہوں تلخ اب لبِ شیریں کے بوسے سے
اے راجہ باغباں نے صیاد سے کہا

دِل کا گمان ہے مجھے بوتل کی ڈاٹ پر
جتنے ہی دل کو پہلے لگایا تھا چاٹ پر
قمری کا سر اُڑا دے عنادل کی کاٹ پر

صرفِ بالش نہ ہوئے بلبل گلزار کے پر
وہ سیہ بخت ہوں روشن ہو اگر شمعِ مزار
شش جہت میں ہی یہی ظلم عنادل کے نصیب
اب کبوتر کو مرے طاقت پرواز نہیں

کچھ بھی کام آئے نہ اس طائرِ بےکار کے پر
جمع پروانے ہوں گُل کردیں اُسے مار کے پر
دو کے پر باندھے گئے کترے گئے چار کے پر
گر پڑا چونچ سے خط ڈال دیئے ہار کے پر

شیخ ناراض ہو ہم سے کہ برہمن روٹھے
ہونگے پابند نہ ہم سبحۂ و زنار کے پر

موتی پہ گماں ہوتا ہی سبزے کا ہر اک کو
ہے عکسِ خطِ سبز سے سبزے کا گہر سبز

میں ابرِ تنک کا کبھی احسان نہ لونگا
کر دے گا سرے صحرا کو تو اے دیدۂ تر سبز

اِک جھاڑ زمرد کا بنا سرو چراغاں
داغِ تنِ سم خوردہ ہوا راجہ یہ سر سبز

مانی اُس نے منگائی ہے تصویر
کھینچ دے جائے جسمِ لاغر خط

اُسکی صورت تو جا کے دیکھے گا
میں نہ دوں گا تجھے کبوتر خط

بعد مُردن بھی کُھلی رہ گئیں آنکھیں میری
تھا مری چشم کو ازبس ترے دیدار کا حظ

ہم تو حیران رہیں صورت کو تری پردہ نشیں
آئینہ روز اُٹھائے ترے رخسار کا حظ

میر و سودا و حزیں، آتش و ناسخ ہوتے
روبرو اُنکے تمہارا جو ترے اشعار کا حظ

معلوم نہیں ہاتھ کریگا وہ کدھر صاف
تلوار ملی جاتی ہے ہوتی ہے سپر صاف

مرغانِ قفس کو نہ تو دانا ہے نہ پانی
صیاد گذرتے ہیں انھیں آٹھ پہر صاف

یہ کسکو ڈھونڈتی پھرتی ہی اضطراب میں برق
گِھرے زمیں گِھرے گردوں گِھرے سحاب میں برق

کسی کے نورِ رُخِ مہروش پہ عاشق ہے
یہ گرتی پڑتی جو پھرتی ہی اضطراب میں برق

اے قضا اور دے دو چار قدم کی مہلت
مجھ تنِ زار سے ہے کوچۂ جاناں نزدیک

ضعف سا ضعف ہی اب چاک نہیں ہو سکتا
دستِ وحشت سے ہی ہر چند گریباں نزدیک

چشمِ بد دُور تری آنکھوں سے نسبت کیا ہی
چل دکھا دوں میں ہرن یاں ہی بیاباں نزدیک

مرنے کا تو کچھ غم نہیں پر غم ہے یہ راجہ
مہمان ہے درد جگری اور کوئی دم

آستانِ یار پر ہم جبہہ سائی کرتے ہیں
دیکھیں کیا ہوتا ہے قسمت آزمائی کرتے ہیں

کوئی مرتا ہے کوئی جیتا ہے اُنکے حکم سے
اللہ اللہ آجکل بت بھی خدائی کرتے ہیں

شر بڑھے گا روٹھتے ہیں راجہ صاحب خیر ہی
آپ معشوقوں سے بھی اب بیزاری کرتے ہیں

کیا جانے کہاں قافلہ ہمسفراں ہے
یارانِ عدم کی نہیں آتی ہے خبر کچھ

شاید کہ بہار آئی جو مرغانِ گرفتار ÷ منقار سے اُڑنے کے لیے کرتے ہیں پر صاف

شعر چوٹی کے سنکے کہتا ہے
میں نے دشمن بغل میں پالا تھا
میرے پیچھے بلا پڑی کیسی
آہ اِس دل نے کی دغا کیسی
سُرخ ہاتھوں کو کر چکے خوں سے
اور پھر چاہیئے حنا کیسی
مٹ گئی شکل نقشِ پا کیسی
پس گئی چال پر خنا کیسی

اقلیم کبھی زیرِ نگیں رہتی تھی راجہ
اب حرف بھی غالب ہیں نگیں پر زرہی گے
دستِ مشتاق نے زلفوں کو بنایا افعی
صاف پیدا کفِ موسیٰ کا اثر ہاتھ میں ہے
دانتوں پر موتی تصدق کرکے جانی بھیجئے
جاں بلب ہوں ابتو آبِ زندگانی بھیجئے
کشتۂ ابرو کو کیجے دفن بیت اللہ میں
قیدیٔ گیسو کو صاحب کالے پانی بھیجئے
ہنستے ہی ہنستے یقیں ہے مجکو شادی مرگ ہو
آپ اگر اپنا دو پٹہ زعفرانی بھیجئے
ہیں بے خبر ایسے کہ خبر ہم نہیں رکھتے
دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے
جس جا پہ گرے تھک کے وہی گھر ہے ہمارا
دیوانے ہیں، سودائی ہیں، گھر ہم نہیں رکھتے
کیا تمپہ تصدق کریں کیا نذر دیں تمکو
دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے
کس تاک پہ آتا ہے تو اے دردِ محبت
دل ہم نہیں رکھتے ہیں جگر ہم نہیں رکھتے
رولائے روئے لیلیٰ جان کردو ڑا عبث مجنوں
بھلا کب چاند مہتاب راجہ ہاتھ آتی ہے

زلف کی یاد حکایت آئی
اور شب بڑھ گئی آفت آئی

وہ پیام یار لایا اسنے کھولی فالِ نیک
پائے قاصد چومئے اور دستِ عامل چومئے

یہ سچ ہے کہ تلوار کی ہوتی ہی بڑی آنچ
کیا قہر ہے تیغ نگہِ یار کی گرمی
بت اگر سنگدل ہے اے راجہ
کرلے باتوں میں اسکو تو پانی
دوستو ارشک کے ہم خوب معانی سمجھے
سایۂ یار کو بھی دشمنِ جانی سمجھے
نامہ لکھے کوئی کیا، کیا کوئی قاصد بھیجے
وہ نہ خط سمجھے نہ پیغام زبانی سمجھے
سُن کے افسانۂ حالِ دلِ مضطر بولا
قصہ خواں دُور ہو چل تیری کہانی سمجھے

راجہ

راجہ- مہاراجہ سر دگبجے سنگھ صاحب بہادر کے، سی- ایس- آئی- والیئے ریاست بلرامپور و تلسی پور اودھ آپ قوم کے جوار راجپوتوں میں سے تھے، اور انکے بزرگ گجرات چپانیر سے اودھ آنکر یہاں کے علاقہ جات کے بزور شمشیر مالک ہوئے، تاج الدین غوری کے وقت میں سرکار شاہی سے اِنکے بزرگوں کو بہرائچ کا علاقہ واسطے آبادی و کاشت کے انتظام، خراج پر عنایت ہوا، یہاں اکونہ کا قصبہ انہوں نے آباد کیا اور ریاست کی بنیاد ڈالی- راجہ جے نراین سنگھ برادر سر راجہ صاحب کے وقت تک ۱۸ راجہ یکے بعد دیگرے مسند نشین ہوئے- آبائی زمینداری پر مسند نشینی کے وقت مہاراجہ صاحب عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی- اترولہ کے تعلقہ دار راجہ محمد خاں نے ان پر فوجکشی کا ارادہ کیا تو یہ خود اُسپر جا چڑھے اور اُسکی گڑھی کو لوٹ لیا، سمت ۱۸۹۷ میں راجہ درشن سنگھ شاہ اودھ کی طرف سے ناظم مقرر ہوئے اُنہیں مہاراجہ سے پرخاش تھی، انھوں نے انکے نائب گجادر سنگھ سے بذریعۂ تہدید بلرامپور خالی کرالیا مہاراجہ اُن ایام میں اپنی شادی کرنے بالسنی گئے ہوئے تھے، یہ سنکر بہت مغموم ہوئے اور نیپال چلے گئے، وہاں مہاراجہ جنگ بہادر نے بہت مدارات سے رکھا اور امداد کا وعدہ کیا رزیڈنٹ نیپال کی تحریک پر شاہ اودھ نے درشن سنگھ کو معزول کردیا اور مہاراجہ پھر اپنے علاقہ پر قابض ہوگئے، سمت ۱۹۰۵ میں ملتی پور کے راجہ دگراج سنگھ کو اُسکے بیٹے دگ نراین سنگھ نے معزول کردیا، واجد علیشاہ کے حکم سے مہاراجہ نے اُمکی امداد کرکے دگراج سنگھ کو پھر قبضہ دلادیا اور اپنا حق مقررہ معہ ایک گانو کے لے لیا- اِسی طرح سے مختلف معرکوں میں مہاراجہ نے اپنی بہادری اور اولوالعزمی کے جوہر دکھائے- ۱۸۵۶ء میں سرکار اودھ پر انگریزی تسلط ہوگیا انہوں نے فوراً چارلس ونگ فیلڈ کمشنر بھرائچ کے پاس حاضر ہوکر علاقہ بلرامپور کی قبولیت داخل کردی اور اپنی حسن خدمات سے صاحب کو از حد رضامند رکھا- تھوڑے دن بعد جب غدر ہوا، مہاراجہ حسب الطلب پانچسو سوار لیکر کمشنر کی امداد کو گئے اور قریباً سو انگریزی خاتون اور بچوں کو اپنی زیر حفاظت رکھکر سرکاری علاقہ میں بھیجدیا، اور قلعۂ پٹوہان کا قبضہ

بھی کرلیا، ۱۸۵۸ء میں جب سرکار نے دوبارہ گونڈا فتح کیا، مہاراجہ افسروں سے ملے اور چونکہ
تلسی پور اور بانسی کے راجہ باغی ہو گئے تھے اُن کا علاقہ بھی بطورِ انعامِ خیر خواہی حاصل کیا
اور لکھنؤ کے ۱۸۵۹ء کے دربار میں اول نمبر کی کرسی پائی، سات ہزار کا خلعت اور مہاراجہ بہادر
کا خطاب عطا ہوا، اور اختیارات دیوانی و کلکٹری بھی عطا ہوئے، برٹش انڈین ایسوسی ایشن
(انجمن تعلقہ دارانِ اودھ لکھنؤ) کے روزِ اجلاس سے آخر زمانۂ حیات تک وائس پریسیڈنٹ رہے
اور جملہ مہمات ملکی و انتظامی میں حکّام وقت کے معتمد علیہ و ممتاز مشیر سمجھے جاتے تھے خود مختار
والیانِ ملک سے بھی اچھے مراسم قائم کیے، وائسرائے کی کونسل کی ممبری کا اعزاز بھی عنایت
ہوا الغرض اودھ کے تعلقہ داروں میں اپنی دوراندیشی، حزم و احتیاط، نکتہ رسی، قابلیت، حسنِ
انتظام کی بدولت سربرآوردہ رکن تھے، علوم و فنون کے بھی بڑے قدر دان تھے، چنانچہ لکھنؤ
کی سلطنت کے مٹنے کے بعد اکثر پرانے رئیسوں کی خاندانوں کی پرورش اور باکمال لوگوں کی
غور و پرداخت آپکی سرکار سے ہوتی رہی، اپنے حسنِ انتظام سے علاقہ کا بندوبست بھی بہت
اچھا کیا اور اس میں معقول اضافہ کرتے رہے۔ اُردو شعر و سخن کی طرف بھی توجہ تھی اور صاحبِ
دیوان تھے منشی جواہر سنگھ جوہر شاگرد خواجہ وزیر سے جو آپکے مصاحب تھے تلمذ تھا، شکار
کا بیحد شوق تھا، اُنکی قدر اندازی اور دلیری کے بڑے بڑے انگریز معترف تھے، تمام اوقات
فرصت اس مشغلے میں صرف فرماتے تھے، بلرامپور جو ایک گاؤں تھا انکے حسن انتظام سے
ایک شاندار قصبہ بن گیا، اسی طرح اپنے علاقہ میں جا بجا چاہات، تالاب، پُل اور سرائے بنوا کر
اولوالعزمی کے ثبوت کے علاوہ علاقہ کو آباد اور رعایا کو خوش کیا، ۱۸۸۲ء میں مہاراجہ نے
(جن کا صلبی فرزند انکی حیات ہی میں قضا کر گیا تھا) لاولد انتقال کیا اور دو مہارانیاں بیوہ
وارث چھوڑیں جن میں سے مہارانی خورد نے حسب وصیت مہاراجہ مرحوم مہاراجہ صاحب حال
کو متبنّٰی بنالیا اور مہاراجہ کی ریاست کو برقرار رکھا۔ احسن التواریخ اور چند اور کتابیں بلرامپور کے
متعلق آپکی زیر سرپرستی شائع ہو چکی ہیں، موزونی طبع کے اقتضا سے شعر کی طرف بھی کبھی کبھی

توجہ ہو جاتی تھی اور کثرتِ اشغال اور عدیم الفرصتی کے دیکھتے یہ امر کچھ کم باعثِ حیرت نہیں ہے کہ آپکے اشعار اسقدر صاف شستہ فصیح و بلیغ ہیں، کلام بہم رسیدہ کا انتخاب حاضر ہے۔

تیری صورت دیکھکر لیلیٰ کو آئیگا حجاب
تیری صورت دیکھ کے مجنوں بہت شرمائیگا

گئے وہ دن کہ حسینوں کو پیار کرتے تھے
نہ ولولے رہے اپنے نہ وہ شباب رہا

خم کھلے شیشے کھلے ہی میکدہ کا در کھلا
غنچوں ہم پر نہ مضمونِ خطِ ساغر کھلا

خوابِ مخمل جن گل اندا موں کو فرش خار تھا
موت نے تربت میں انکو خاک بستر کر دیا

گیا صحبت میں جب سے مفسدوں کی
مزاج اصلاح پر آیا نہ اُس کا

اے صبا ہے کسی عارض کا انہیں بھی سودا
باغ میں ہوتے ہیں گل چاک گریباں پیدا

اللہ غنی حسن پہ کسدر رہے ہے مغرور
وہ اپنا کبھی پاؤں زمیں پر نہیں رکھتا

راجہ بھلا ہے دزدِ حنائی کا کیا قصور
دل اپنا اپنے ہاتھ سے خود ہمنے کھو دیا

حسن سے عشق نہ ہو جسکو وہ انسان کیسا
منکر قدرتِ حق صاحب ایمان کیسا

عشق میں تیرے ہوا ہے اے صنم
ایک مذہب کافر و دیندار کا

رنج و غم دلکو مرے دیتے ہو یہ تو سمجھو
ہمنے کس ناز و نعم سے اسے پالا ہوگا

ہم جو گھر اُسکے گئے جانے شب تاریک میں
شعلۂ دل آگے آگے مثلِ مشعل ہو گیا

مجھے بھی ہر گھڑی کی بد مزاجی خوش نہیں آتی
کہونگا پھر جو میں کچھ طبع نازک پر گراں ہوگا

اپنی نظر بھی اکثر انسان کو لگی ہے
آئینہ میں نہ دیکھو منہ بار بار اپنا

جیسی کہو گے ہمکو ایسی سنو گے ہمسے
کب چپ رہیگا وہ جو حاضر جواب ہوگا

دیکھ کر لیلیٰ کو یہ خوش ہو کے مجنوں نے کہا
دو گھڑی دم سے ترے جنگل میں منگل ہو گیا

نام مشہور ہوا رشکِ مسیحا راجہ
پر انھیں فکرِ علاجِ دلِ بیمار ہے کب

محتسب لوٹیں گے ساتھ اُسکے کئی کاسۂ سر
سُن لے رندوں پہ بہت کچھ ہی حقِ جامِ شراب

کیا تلون ہے مزاجِ یار میں
شام کو اقرار تو انکار صبح

انساں چلے وہ چال کہ جو ہو جہاں پسند — مہماں سے ہو وہ کام جو ہو میزباں پسند

دِل بیچنے کھڑے ہیں ترے گھر کی راہ پر — ارزاں ہے مول لے جو اسے اک نگاہ پر

ہے نمود سبزۂ خط عارضِ جاناں کے پاس — آئے خضر تشنہ لب یا چشمۂ حیوان کے پاس

کس طرح ہم ہوں اُس بروئے خمدار سے خوش — جو دلاور ہیں سدا رہتے ہیں تلوار سے خوش

آپ ہی آپ کچھ اغیار جلے مرتے ہیں — خود بخود داب جو ہو آپ کو ہم سے اخلاص

روشنی ہے عاشقوں کے دم سے باغِ دہر میں — بلبلوں کو اے گلو سمجھو گلستاں میں چراغ

پامال آج وہ ہیں جو کل تک نہال تھے — کِھلتا نیا ہے روز تری انجمن میں گُل

یاد آئی جو اُسکی جنت میں
بال کھوے ہیں کتنے چوٹی کے

حور کو دھیان میں نہ لائینگے ہم
کیا پریشان دن گذرتے ہیں

صغرسن میں پہنو پھولوں کے نہ ہار
تم ابھی ایجانِ من خود پھول ہو

یار کے پاس اُڑکے چلا جائے گا نامہ
ابتو خود سیکھ گیا کار پیمبر نامہ

بے یار کیا بیان ہو تقریر خواب کی
یُوسف سے چلکے پُوچھئے تعبیر خواب کی

راحت۔ مرزا محمود بیگ خلفِ مرزا احمد بیگ سپاہی پیشہ تھے۔ آبا و اجداد کا اصلی وطن روم تھا مگر دلّی میں رہتے تھے، غدر سے پیشتر فوجی ملازمت ترک کرکے خانہ نشین اور علائق سے دست بردار ہوگئے تھے، فنِ سخن میں مومن خان دہلوی سے تلمّذ تھا۔ ایک مثنوی موسوم بہ دہشت عدل اور ایک واسوخت علاوہ غزلیات کے اِن سے یادگار ہیں، یہ اُنکے پاکیزہ اور صاف شستہ کلام کا انتخاب ہے۔

کچھ جان ہی آتی ہے مریجان میں قاتل
پانی ترے خنجر میں ہے کیا آب بقا کا

کِھلایا مجھے غم پلایا مجھے خون
ہوا جب میں ناکام مہماں تمھارا

غیروں سے جو اشارے محفل میں ہیں تمھارے — سمجھیں وہ یا نہ سمجھیں پر یہ غلام سمجھا

صبر و قرار تاب و تواں رفتہ رفتہ سب — آجائیں گے کہیں سے دلِ فتنہ گر ملا

اشک آنکھوں سے نکلکر زیر مژگاں تھم گیا
ہم سے وہ بھی چھٹے اور یہ دلِ شیدا چھوٹا

لے گیا رات کو باتوں میں لگا کر اُن کو
اجل پہلے آوے کہ وہ پہلے آویں

روئے قاتل سے خجالت کیوں نہو روز جزا
آنکھیں بھر آئیں مہر سے اُس رشک ماہ کی

قاتل تو ایک بوسہ مجھے دے کے قتل کر
دم نکلے سایہ میں کیونکر تھا مسافر دور کا

یاد کس کس کو کریں خیر جو چھوٹا چھوٹا
کیونکہ قائل نہوں راحت تری تقریر کے ہم

بھی راہ مدت سے ہم دیکھتے ہیں
ساتھ میرے ایک عالم ہولیا فریاد کو

سینے پہ رکھ کے ہاتھ جو اک میں نے آہ کی
لازم ہے کچھ تو دیجئے دیت بے گناہ کی

راحت

راحت منشی بشیر محمد خاں صاحب دِلّی کے رہنے والے اور حکیم ثناءاللہ خان صاحب کے پڑوتے ہیں ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے دادا حکیم محمد علیخاں صاحب کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی اور اُنھیں سے فن سخن میں اصلاح لینے لگے۔ کچھ دنوں ریاستہائے جودھپورا اور بانسواڑہ میں تبقریب ملازمت بسراوقات کی۔ اب ریاستِ اودیپور میں انسپکٹر کسٹم ہیں۔ آپکی طبیعت میں تاریخی واقعات کے نظم کرنے کا شوق خداداد ہے اور اس صنف میں معقول دسترس بہم پہنچائی ہے، کئی مثنویاں آپکی تصنیف کردہ ہیں جن میں ایک موسومہ "ورشا دیانہ سخن" ۱۹۰۸ء میں مہاراجہ سردار سنگھ بہادر والئے جودھپور کی تقریب کتخدائی پر تصنیف کی تھی۔ ایک اور ضخیم مثنوی بھی آپ نے لکھی ہے جس میں اُنیس ہزار اشعار ہیں اور ابتدائے آفرینش سے خاندانِ لودہی تک کے حکمرانوں کے واقعات نظم ہیں، مثنوی ہذا کا نام "شاہنامہ جدید" ہے اِسکے پانچ حصے ہیں۔ غزنیں نامہ، غوری نامہ، خلجی نامہ، تغلق نامہ، لودہی نامہ، آپنے اِس مثنوی میں قدیم راجگان ہند کے طرز حکومت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور رزم و بزم کے واقعات اور مسلمان حملہ آوروں سے ہندو راجاؤں کی معرکہ آرائیوں کو بوضاحت قلم بند کیا ہے۔ آجکل سلطنتِ مغلیہ اور زمانہ موجودہ کی تاریخ کہہ رہے ہیں۔ چونکہ آپکی طبیعت کو وقائع نگاری سے مناسبت خاص

ہے اس وجہ سے کسی اور صنف شاعری میں طبع آزمائی نہیں کرتے۔ انتخاب کلام حسب ذیل ہے

مہاراج پرتھوی راج اور سلطان شہاب الدین غوری کی پہلی معرکہ آرائی نہر سرستی پر

لگی چلنے باہم چھری اور کٹار
ہوئے سرتنوں پہ ہزاروں نثار

پٹھانوں سے خنجر چلی سن سے تیغ
ہزاروں ہی کشتہ ہوئے بیدریغ

جواں زخم پر زخم کھانے لگے
شجاعت کے جوہر دکھانے لگے

کسی نے رنگے خون میں اپنے ہاتھ
عدم کو گیا کوئی آقا کے ساتھ

زمیں پر تھا کشتوں کا پشتہ بندھا
ہر اک سمت تھا خون کا دریا بہا

بدلنے لگا جب لڑائی کا طور
کیا اپنے لشکر پہ راجہ نے غور

یکایک بڑھی ہاتھیوں کی وہ صف
جواں نکلے پیچھے سے نیزہ بکف

وہ تھے قوم کے سب کے سب راجپوت
وہ بانکے ولاور بہادر سپوت

گرے فوجِ شہ پر وہ سب ایکبار
ہوئے قلب تیروں سے انکے فگار

کمانوں نے گوشہ لیے اپنے موڑ
دیا تیروں نے اپنے ترکش کو چھوڑ

جو افغاں تھے فوراً وہ پیچھے ہٹے
اُدھر خلجیوں نے بھی گھونگٹ لئے

لڑائی کا جب یہ ہوا بندوبست
ہوئی فتح سے شاہ کی پھر شکست

شکستہ ہوا میمنہ میسرہ
ہوا قلب کی فوج کا فیصلہ

لڑائی سے تیروں کی عاری ہوئے
نمک خوار سارے فراری ہوئے

نہ مطلق ہوا شاہِ غزنیں ملول
نکھرا ایسا تھا جیسے کانٹوں میں پھول

نظر کھانڈے راؤ کی اُس پر پڑی
سپہدار کی آنکھ اُس سے لڑی

سپہدار نے بھی بجراُت تمام
کیا رستمی کا وہاں پر یہ کام

دیا ہاتھی کے منہ پہ نیزہ لگا
حریفوں کو دی اپنی جراُت دکھا

کیا کھانڈے راؤ نے پھر اُس پہ وار
تو شانہ نشانہ بنا ایک بار

نہایت ہی سخت اسکو پہنچا گزند
جھکا اپنے گھوڑے پہ وہ ارجمند
مدد غیب سے اُسکی فوراً ہوئی
یکا یک غلام آن پہنچا کوئی
لیا اپنے مالک کو فوراً سنبھال
کسی پہ نہ ہر گز کھلا اس کا حال
سپہدار کا پھر نہ پایا نشاں
نہ آیا نظر کوئی غیر از جواں

جس باغ میں مہاراجہ سردار سنگھ صاحب بہادر جودھپور کی برات اُتاری گئی تھی اُس باغ کی تعریف

مقام اِک جداگانہ ہے شہر سے
ہسیلی کی باڑی سے موسوم ہے
تمام اُس کا سبزہ ہے زیر نظر
کھڑے جھومتے جابجا ہیں شجر
نئے رنگ کا ہے وہاں کا چمن
کہیں پر ہے نسرین کہیں نسترن
نمودار ہیں صاف قدرت کے کھیل
کہیں ہے چنبیلی کہیں رائے بیل
گلاب اور گیندے کی رونق ہے خاص
چمن میں ہے حاصل انھیں اختصاص
نمودار نرگس کا ہے امتیاز
عیاں چشم ہے اُسکی واں نیمباز
صحن میں نمایاں ہے حوضِ کلاں
وہ ایسا ہے جیسے کہ دریا رواں
لگے اُس میں فوارے ہیں بیشمار
نئے طور کے ہیں وہاں آبشار
غرض ایسا ہے پُر فضا وہ مقام
ہوا دولہا کا اِس جگہ پر قیام

راحت

راحت سیّد عابد حسین بریلوی ۱۸۲۰ء میں زندہ تھے اِس سے زیادہ کچھ حال معلوم نہ ہوا، یہ چند شعر اُنکے ہیں۔

حشر کے دن یہ کہونگا میں خدا سے پہلے
شکل محبوب دکھا اپنی لقا سے پہلے
پہلے مُنہ چوم لوں میں گا لیا دو بیا پیچھے
چاہیئے جرم کا اثبات سزا سے پہلے
عارض حور کی تعریف نہ کر لے واعظ
کر مقابل مرے گل کے کفِ پا سے پہلے

راحت

راحت لالہ بھگونت رائے راحت ولد منشی دیندیال رئیس قصبۂ کاکوری نواح لکھنؤ آپ کو حضرت آغا حسن امانت لکھنوی سے تلمذ تھا اور فن سخن میں اچھی مہارت حاصل تھی

صاحب علم و فضل و نازک خیال و طبیعت دار شخص تھے، آپنے مثنوی زہرہ و بہرام" اور مثنوی "گلدمن" لکھی جو اب کمیاب ہیں۔ بصد تلاش ایک مثنوی "سوزِ عاشقانہ" دستیاب ہوئی۔ جس کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے واجد علیشاہ کے زمانہ سلطنت میں حیات تھے بعد غدر انتقال کیا ❖

مظہرِ عشق یا خدا ہو دل — مصدرِ صدمۂ جفا ہو دل
کوچۂ عشق کا ہو رسوائی — روئے زیبا کا ہو تماشائی
گل پہ گل روز سینکڑوں کھائے — بےکلی سے ذرا نہ گھبرائے
لاکھ زخمی ہو خنجرِ غم سے — سیکڑوں کوس بھاگے مرہم سے
سیجے ہر دم لہو سے خاروں کو — خار دیتا رہے ہزاروں کو
گل پہ گل کھا کے مایۂ غم ہو — بسترِ شاخِ نخلِ ماتم ہو
زخم اُس کا ہو رفو برسوں — اور ٹپکا کرے لہو برسوں
بس رہے غم کی آرزو برسوں — عیش کی ہو نہ جستجو برسوں
قبلۂ رُخ کے روبرو برسوں — چشمِ تر سے کرے وضو برسوں
بدلے رونے کی پھر نہ خُو برسوں — پائی اشکوں سے آبرو برسوں
مثلِ گل روئے زخم خنداں ہو — سوزشِ عشق سے نمک داں ہو
تڑپے اِس طرح خاک پر مضطر — طعن کی جا ہو رقصِ بسمل پر
روز ٹھنڈا ہو تیرِ مژگاں سے — ہوئے سیراب آبِ پیکاں سے
آبِ شمشیر سے بجھائی پیاس — چاہ سے غرقِ خوں ہوئے بے وسواس
بیٹھے بیٹھے خدنگِ مژگاں کھائے — تو وہ خاک شوق سے بن جائے
شمعِ رخسار کا خیال رہے — غم سے پروانۂ جمال رہے
زلفِ خمدار کا خیال رہے — غم سے پروانۂ جمال رہے

بحرِ الفت میں آشنا ہو کر
کشتیِ درد کا بنے لنگر

مثلِ غواص بیدھڑک ہو کر
جی پہ کھیلے وہ اپنے آٹھ پہر

اسقدر عشق میں فنا ہو جائے
اپنے خالق کا آشنا ہو جائے

دامنِ دشت میں اڑائے خاک
بیکلی سے کرے گریباں چاک

آبلوں سے نقش اپنا جمائے
ہر سرِ خار سے پتا ملجائے

غم سے ہر داغ لالہ زار رہے
درد و حرماں سے دردوزار رہے

جوش پیدا ہو اس قدر غم کا
گلِ سوسن ہو باغِ ماتم کا

زلفِ خوباں ہو پاؤں کی زنجیر
حلقۂ طوق ہو گریباں گیر

چشم سے اسقدر ہو خوں افشاں
رشکِ گلزار ہو تنِ عریاں

وہ ترقی پہ زورِ سودا ہو
جسکے نالے میں شورِ دریا ہو

وہ مزہ کوہ و دشت کا پائے
رشکِ فرہاد و قیس بن جائے

عاشقِ رنگِ عارضِ گل ہو
گلشنِ درد و غم کا بلبل ہو

عشقِ زہرہ جبیں ہو دامن گیر
مثلِ ہاروت چاہ میں ہو اسیر

سروِ قد پر فدا ہو سو بار
مثلِ قمری کرے نہ طوق سے عار

اشک برسائے چشمِ گریاں سے
برق چمکائے آہِ سوزاں سے

آتشِ عشق سے جلے ہمہ تن
خرمنِ ننگ پر ہو شعلہ فگن

فخر سمجھے سدا ملامت کو
کھو دے سرمایۂ ندامت کو

شکلِ دولاب چرخ سی بنجائے
درِ جاناں پہ روز چکر کھائے

ایسا سوزِ دروں سے ہو بیتاب
غم سے بنجائے ماہیِ بے آب

کوئے دلدار کو حرم سمجھے
جائے سجدہ درِ صنم سمجھے

اُسکے کوچے میں جب گذر ہو جائے
صاف مرمر کے خاکِ در ہو جائے

شمع ساں ہو فدائے بیداری
اشک سوتے میں بھی رہیں جاری
ہو نمک پاش زخم پر ہر دم
پر نہ دکھلائے صورتِ مرہم
سر میں ہر دم جنوں کا جوش رہے
دشمنِ صبر و عقل و ہوش رہے
ہر گھڑی صیدِ چشمِ یار رہے
چنگلِ باز کا شکار رہے
الغرض عشق ہو ترا یارب
اپنا سودائی تو بنا یارب
طاقتِ زورِ عشق دل پر دے
بے پر و بال ہوں مجھے پر دے
جبتلک اپنے تن میں جان رہے
راتدن بس ترا ہی دھیان رہے
دل میں اس لطف سے سما جائے
جس طرف دیکھوں تو نظر آئے
پی کے مے ساغرِ محبت سے
مست ہو جاؤں جامِ وحدت سے
عاشقِ زار اب ترا ہوں میں
ترے کوچے کا بس گدا ہوں میں
رائگاں کر نہ میری محنت کو
ذوق دے اپنے غم سے راحت کو

راحت

راحت۔ دہلی کے ایک نامعلوم ریختی گو تھے، کچھ منتخب کلام درج تذکرہ کیا جاتا ہے۔

جب سے وہ بانکا سجیلا دل کو ہے بھایا ہوا
انگ لگتا ہی نہیں گوئیاں مرا کھایا ہوا
میں اپنی ایڑی چوٹی پہ صدقہ کروں اسے
یہ مردوا انگوڑا تو لٹھ ہے گنوار کا
روگی تم تو وہ آجائیگا بیٹا پھر ابھی
تم جو چپکی ہو رہی ہو آکے ہتوا پھر گیا

دودھ لینے کا ارادہ تھا جو وڑایا تھا ہاتھ
نوچ لی انگیا مری دیکھو موئے بندر کی بات
جورو بیٹی ماں بہن کا کچھ نہیں کرتے خیال
گھر میں آکر صاف کہدیتے ہو تم باہر کی بات
گونگی بہری کب تلک لوگو بنی بیٹھی رہوں
نند کی باتیں سنوں ہے ہے کہیں دیور کی بات
پوتی پوتوں والی ہو کر لال جوڑا پہنوں میں
مجکو تو بچی یہ بڈھا چوچلا آتا نہیں

کھلا تو پوتا ، ہوئی پوری آرزو تیری
دوگانا لعل سا بیٹا جنی بہو تیری
لحاظ آیا کسی کا نہ تجکو عصمت جان
غلام سے گئی پکڑی جنم میں تھو تیری

راحت

راحت - سیّد عابد حسین صاحب بریلوی ۱۸۷۰ء میں زندہ تھے اس سے زیادہ کچھ حال معلوم نہوا یہ چند شعر انکے ہیں -

حشر کے دن یہ کہونگا میں خدا سے پہلے
شکل محبوب دکھا اپنی لقا سے پہلے

پہلے مُنہ چوم لوں ہیں گا لیاں دینا پیچھے
چاہیئے جرم کا اثبات سزا سے پہلے

عارضِ حور کی تعریف نکر اسے واعظ
کر مقابل مرے گل کے کفِ پا سے پہلے

راحت

راحت - محمد نثار علی صاحب رامپوری آجکل کے شعرا میں ہیں، تلمذ کا حال معلوم نہوا کہ کس سے ہے - یہ کلام ہے -

کہتے ہیں جسکو محشر وہ دن بھی آرہا ہے
بیداد کرنے والے کیا تو سُنا رہا ہے

رنج والم مصیبت دردِ فراق، الفت
وہ کیا جئے جو اتنے صدمے اُٹھا رہا ہے

میں نے ہی اُنکو چاہا دنیا سے کیا نرالا
مجھپر ہی یہ ستم کیوں ای چرخ ڈھا رہا ہے

ناز و نیاز دونوں کی لطف دیرہے ہیں
وہ تیغ اُٹھا رہا ہے یہ سر جھکا رہا ہے

ویران ہوگئے ہیں ان روزوں دیر و کعبہ
جو ہے وہ انکے در پر چکّر لگا رہا ہے

راحت

راحت - محمد رئیس الدین خان، حضرت فیروز شاہ خاں فیروز رامپوری سے مشورۂ سخن کرتے ہیں ۱۸۹۸ء میں جوان تھے -

اُدھر سے محتسب جب آج پھر احتساب اُٹھے
تماشا ہوا دھر سے رند بھی پیکر شراب اُٹھے

بھلا دُنیا میں کیا ندکو رہا اب اُسکے اُٹھنے کا
جو اُٹھے بھی ترا مقتول تو روز حساب اُٹھے

کوئی تدبیر ایسی ہو کہ وہ خلوت میں کُھل کھیلے
ادھر دل سے حجاب اُٹھے اُدھر رُخ سے نقاب اُٹھے

راحم

راحم - منشی شیخ رحیم بخش راحم تاجر باوقار و رئیس شہر کانپور وطن آبائی لکھنؤ ہے، مگر اب مدت سے کانپور مسکن ہے انکا کارخانہ تجارت اسباب چرمی مشہور دیار و امصار ہے، اوائل عمر سے فن سخن کا ذوق رہا ہے منشی سیّد آغا علی شمس شاگرد ملک الشعرا قاضی محمد صادق خان سے تلمذ اختیار کیا، صاحب دیوان مطبوعہ ہیں شعرا کانپور میں چھپے ہیں موزونی طبع اور خوش زبانی کلام سے آشکار ہے، انتخاب دیوان ہدیہ ناظرین ہے -

اے مسیحا ہو بُرا اِس حسرتِ دیدار کا
دم لبوں پر آگیا آخر ترے بیمار کا

کبتک اے قاتل نہ نکلے گی تمنا قتل کی
حشر تک دامن نچھوڑوں گا تری تلوار کا

خشک کامانِ شہادت کے گلے ہوجائیں تر
پانی اے قاتل جو مِل جائے تری تلوار کا

ق

ترے مجروح کو شبِ مہ میں
ذوقِ جامِ شراب نے مارا

چاندنی گو ہے مہلکِ زخمی
پر مجھے آفتاب نے مارا

مُنہ اگر چوم لیا کیجئے عفوِ تقصیر
جُرم ہوتے نہیں دنیا میں بشر سے کیا کیا

طفلِ اشک آنکھ میں میری ہے کبھی دامن میں
ناز کرتا ہے پسر اپنے پدر سے کیا کیا

بیکسی روئی سرِ تربت مجاورِ غم ہوا
دُھوم سے اُسکے شہیدِ ناز کا ماتم ہوا

اُس کا حامی ہو ساقیٔ کوثر
مجھکو دے جو بجائے آب شراب

شرم تھی آنکھ میں پردے سے نکلتے کیونکر
نہی شرم نزاکت سہی چلتے کیونکر

نہ نزاکت سہی مہندی وہ لگائے ہونگے
آگے تلووں سے دلِ زار کو ملتے کیونکر

نہی مہندی کسی غیر سے وعدہ ہوگا
صادق القول ہیں عدے کو بدلتے کیونکر

نہی وعدہ لٹیں شانوں پہ لٹکی ہونگی
بوجھ اُٹھا کر جو وہ چلتے تو سنبھلتے کیونکر

نہ کھُلی لٹ سہی گیسو کو بناتے ہونگے
کنگھی چوٹی کے وہ پیچوں سے نکلتے کیونکر

لو فرضنا کہ نکلتے بھی تو دانائی سے
مونگ چھاتی پہ رقیبوں کی وہ دلتے کیونکر

ساغر و شیشے کو کیوں توڑتا ہے عہد شکن
توڑنا ہے جو تجھے تو دلِ اغیار کو توڑ

بجھائیں تشنگانِ دشتِ اُلفت پیاس مقتل میں
سبیل اک فی سبیل اللہ رکھدی آب خنجر کی

راز

راز ۔ مرزا حاجی راز گورگانی دہلوی۔ مرزا رمضانی کے بیٹے اور مرزا صابر کے شاگرد تھے نظام الدین اولیا کی درگاہ کے قریب رہتے تھے۔ کئی برس ہوئے انتقال کر گئے۔

پھر دلِ سودائی کو اُس زلف کا سودا ہوا
بیٹھے بٹھلائے یہ کیسا دردِ سر پیدا ہوا

اب تو میری طرح بےچین وہ رہنے لگے
یہ ہمارے آہ و نالہ کا اثر پیدا ہوا

کوچۂ و بازار ہیں جن کے سبب رسوا ہُوا
پھر اُسی غارتگرِ دل پر یہ دل شیدا ہُوا

جان و دل دونوں فدا کر دیتے اُس پر ہمنے
اِس طرح کوئی سہے گا نہ جفا میرے بعد

میرے ہی دم تلک آباد رہے گا گلشن
کو بکو خاک اُڑائے گی صبا میرے بعد

راز

راز۔ عالیجناب صاحبزادہ محمد عبید اللہ خاں صاحب بہادر فیروز جنگ، سی، ایس، آئی فیلو پنجاب یونیورسٹی تخلص بہ راز خلف نواب وزیرالدولہ مرحوم والی ٹونک ایس پریسیڈنٹ کونسل و مدار المہام ریاست ٹونک، نواب ابراہیم علیخاں بہادر والی حال ٹونک کے عم بزرگوار تھے جنگِ کابل ۱۸۷۹ء میں جبکہ ان کی صرف تیئیس[۲۳] برس کی عمر تھی صاحبزادہ موصوف نے سرکار انگلشیہ کی نمایاں خدمات کی تھیں۔ جس کے صلہ میں خلعتِ فاخرہ و خطاب دولت انگلشیہ نے عطا کیئے، صاحبزادہ موصوف غالباً فنِ شعر میں منشی سلیمان خان اسدؔ لکھنوی سے مشورہ کرتے تھے۔ نواب صاحب کی اپنی ذاتی جاگیر اُنیس[۱۹] ہزار سالانہ کی تھی علاوہ ازیں آٹھ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ ریاست سے ملتا تھا۔ سر نیویل چیمبرلین کی سفارت کے ہمراہ ۱۸۷۸ء میں کابل گئے واپسی پر ریاست کی طرف سے افتخار الامرا فخر الملک فیروز جنگ کے خطاب سے مفتخر ہوئے۔ ستمبر ۱۹۰۰ء میں انتقال فرمایا۔ تا دمِ رحلت وزارت کے عہدے پر فائز رہے پچاس برس سے کچھ کم عمر پائی۔

جو دوست تھے دلی وہ سب اغیار بن گئے
بہکانے والے آپکے سب یار بن گئے

روئے جو ہم تصوّرِ دندانِ یار میں
آنسو کے قطرے موتیوں کے ہار بن گئے

بیٹھے بٹھائے رنج اُٹھائے ستم سہے
دِل دیکے تم کو مفت گنہگار بن گئے

چتون وہاں پھری کہ یہاں دل ہوا دو نیم
ابرو وہ میرے واسطے تلوار بن گئے

مجھسے کس روز ہوئی آپکی چتون سیدھی
کس دن انداز ادھر کج نظری کے نہ رہے

یا کلیم ایک ہی جلوہ نے یہ ہیبت چھائی
دِل میں پھر حوصلے باقی ارنی کے نہ رہے

آبِ خنجر نے ترے پیاس بجھائی دمِ نزع
شاکی او ترک ہم اب تشنہ لبی کے نہ رہے

راز

راز۔ عالیجناب نواب مرزا عباس علیخان بہادر راز عرف نواب سلطان صاحب خلف نواب محمد رضا خان عرف نواب شمشاد الدولہ بہادر رئیس لکھنؤ شاگرد حضرت جلال لکھنوی۔ کلام میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں موزوں طبع بیشک ہیں سو برس ہوئے انتقال کیا۔

تجھے بھی کچھ خبر او بے خبر ہے
کہ کیا کیا تیرے چرچے ہیں جہاں میں

خدایا خیر ہو دل آج میرا
لیے جاتا ہے پھر کوئے بتاں میں

نظر ملتے ہی پہلو میں نہ تھا دل
غضب کا سحر ہے چشمِ بتاں میں

وفا کے نقش بھی دل سے مٹائے دیتے ہیں
مجھے وہ یاد سے اپنی بھلائے دیتے ہیں

میں باز آیا نصیحت سے آپ کی ناصح
مرا تو آپ کلیجہ پکائے دیتے ہیں

خیال اُنکا کروں یا گناہ کو دیکھوں
لبوں سے وہ مرے ساغر ملائے دیتے ہیں

جسکو تلووں سے تو نے مل ڈالا
تھی اُسی دل میں آرزو تیری

یوں کیا ایک بے گناہ کو قتل
مچ گئی دھوم چار سُو تیری

راز

راز۔ سید فیاض احمد راز سب انسپکٹر پولیس کھیڑی، منشی طفیل احمد کے بیٹے اور ریاض خیرآبادی کے حقیقی بھائی خیرآباد کے قدیم باشندے اور منشی امیر مینائی کے تلامذہ میں ہیں ۱۸۶۰ء سالِ ولادت ہے، آدمی ذہین اور خوش فکر ہیں۔ یہ کلام کا انتخاب ہے۔

تم جو اُٹھے جگر میں ٹیس اُٹھی
درد بھی اُٹھ کھڑا ہوا دل کا

دلِ عاشق میں ناز سے آؤ
لطف خلوت میں آئے محفل کا

سخت جانی یہ تھی کہ مان گئی
تیغ لوہا تمہارے بسمل کا

کوچۂ دشمن میں دل اے دلربا جاتا رہا
ہاتھ سے میرے تمہارا آشنا جاتا رہا

خونِ دشمن کی ملی مہندی نہ تو نے ہاتھ میں
بعد میرے کیا تجھے شوقِ حنا جاتا رہا

طور پر پہنچو دہوئے موسیٰ تو کیا ای برقِ طور
دیکھنے والوں کا اُسکے حوصلہ جاتا رہا

ہے آج شب وصلِ عدو اس کی سحر ہو
راضی ہوں نہ ہو میری شبِ غم کی سحر آج

یہ کس کے کوچے سے پامال ہو کے اٹھی ہے
کہ چھا رہی ہے مری خاک آسماں ہو کر

اُلجھائے ہوئے چلتے ہیں دل لفِ سا ہیں
ہم لوگ لگاتے ہیں گرہ موج ہوا ہیں
چیخے تو بہت زور سے کعبے میں موذن
پر اُسنے نکلتا رہا ناقوس صدا ہیں
اُٹھ چلنے کو جوبن نے اُنھیں اور اُبھارا
آئی جو جوانی تو بھرے اور ہوا ہیں
کس پیار سے کس شوق سے سو بار بلایا
اے راز نہ آیا اثر آغوش دعا ہیں

سب ندیہا فلکِ پیر مرے دشمن کو
تھوڑی تھوڑی رہے ہر رنج میں شرکت میری

تیغ نظر سے پھولوں کے ٹکڑے اڑا دیئے
لڑوا گئے چمن میں مجھے عندلیب سے
اظہارِ دردِ دل پہ کہا مسکرا کے یہ
کہدینگے جا کے حال تمھارا طبیب سے
جلوہ کسی کی برقِ تجلی کا اے کلیم
دیکھا ہے تمنے دور سے ہیں نے قریب سے
حضرتِ دل مچلے ہیں جنکے لیئے
کچھ کریں وہ بھی علاج انکے لیئے
شیخ جی! تقوی جوانی میں ہو کیا
ہے تقدس آپکے سِن کے لیئے
مرغوب کسی بُت کو ہے فریاد کسیکی
محبوب کسی دل کو ہے بیداد کسیکی
تو بھی کوئی معشوق ہے شوخی و ادا میں
بجھ میں بھی ہے خو بو دلِ ناشاد کسیکی

راز منشی امتیاز احمد خاں صاحب عرف پیارے خاں رامپوری، ریاستِ رامپور وطن ہے اور وہیں رہتے ہیں۔ آپکا عرف بہت مشہور رہے، آپ پہلے میاں احمد علی صاحب رسا سے تلمذ رکھتے تھے، پھر منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ آپ مدتوں منشی صاحب مرحوم کے رفیق و ہم صحبت رہے اور مشاعروں میں ساتھ شریک ہوئے ہیں آپنے جسقدر اپنے اُستاد سے فیض حاصل کیا ہے چند خاص تلامذہ کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں ہوا، آپکے کلام کا رنگ امیر مینائی کے کلام سے بہت ملتا ہے اور چستی بندش اور شوکتِ الفاظ بہت ہی ہمیشہ مضمون لکھتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں۔ آجکل ٹھیکہ داری دیہات کا شغل ہے۔ کسی خاص وجہ سے آپنے پانچ چھ سال سے شاعری کی طرف توجہ کم کردی

ہے۔ کبھی شاذ ونادر شعر کہہ لیتے ہیں، ہاں اپنے تلامذہ کو برابر اصلاح دیتے ہیں۔ آپ مشاعرہ میں کبھی شریک نہیں ہوتے اور اپنے کلام کی شہرت سے بہت بچتے ہیں، آپنے کلام کے جمع کرنے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی، جس دوست یا شاگرد کے ہاتھ لگا وہ لیگیا، بڑی کوشش سے جسقدر ہاتھ لگا اُس کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے۔

ہوا ازل میں جو تقسیم حسن اعضا کو
تری کمر کے بھی حصہ میں بال بھر آیا

خیال میں بھی جو آئی ہو شکل عاشق کی
جھجک کے کہتے ہیں تو کون ہے کدھر آیا

خبر بتو نکی جو لایا ہزاروں سجدے کیئے
صنم کدے سے خدا ہو کے نامہ بر آیا

نکل کے شانہ کی گلیوں سے جب چلا گیسو
اُلٹ کے شانے پہ دل میں مرے اُتر آیا

یہ کون حشر میں فریاد کرنے آتا ہے
پکارتی ہے خموشی ارے کدھر آیا

قصور عشق درم قتل بخشواتا ہے
لٹک کے سر مرا قاتل کے پاؤں پر آیا

ہوائے شوق میں دونوں تھے تیز رو لیکن
تمھارے کوچے میں پہلے قدم سے سر آیا

اُٹھے جو بزم سے در پر لگا لیا بستر
کہ راز دل سے نکل کر زبان پر آیا

ضیائے رُخ نے چڑھائی ہے نور کی چادر
مرادیں مانگنے یہ کون قبر پر آیا

ہوئی جو راہِ خودی طے تو یار تک پہنچے
بڑھے جو آپ سے آگے تو اُن کا گھر آیا

باہیں گلے میں ڈال کے منہ چوم ہی لیا
فرمایئے وہ آپ کا انکار کیا ہوا

رولا کر مجکو وہ سبے درد بولا
ہنسی کی بات کا شکوہ نکرنا

وہ منت سے ترا محشر میں کہنا
ترے صدقے مجھے رسوا نکرنا

محبت راز کی تم دل میں رکھنا
کبھی اِس راز کو افشا نہ کرنا

اے عشق قبر حسرتِ مردہ کی یوں بنا
چھوٹا سا آبلہ ہو دل بیقرار کا

لڑے جو اُن سے نظر ضبط آہ کر لینا
کلیجہ تھام کے نیچی نگاہ کر لینا

بُرے ہیں ہم تو پھر اچھے کہاں جائیں
بُروں سے بھی ہے مناسب نباہ کر لینا

پرانی رسم ہے زاہد نچھوڑنا اسکو
ارے بہشت میں بھی کچھ گناہ کرلینا

عصا بھی چاہیئے بیمار کے سہارے کو
اٹھے جو آنکھ تو نیچی نگاہ کرلینا

وہ دل میں آتے ہیں اے چشم خاک آلودہ
بہا کے اشک طرب صاف راہ کرلینا

کسی کا آنکھ چرانا وہ چھپ کے غیروں سے
وہ مجھکو دیکھ کے نیچی نگاہ کرلینا

سلام

عباس کو وغا کی لڑائی بھی تماشہ
پانی میں نظر آتے تھے خنجر تہِ خنجر

بلبل کیطرح مست تھا قاتل بھی مہک سے
حضرت کا گلا تھا کہ گل تر تہِ خنجر

ڈوبے جو لہو میں شہ دیں شمر پکارا
مریخ بنا مہر منور تہِ خنجر

حضرت کا گلا موج تھا دریائے کرم کی
فوارۂ رحمت ہوا آکر تہِ خنجر

اے رازؔ ہے یوں مصرع روشن تہِ مصرع
جس طرح چمکتا ہوا خنجر تہِ خنجر

لپٹے تھے ایک روز کسی کی کمر سے ہم
ابتک چھپے ہوئے ہیں خود اپنی نظر سے ہم

دب دب گئے ہیں ضعف میں بار نگاہ سے
کٹ کٹ گئے ہیں جنبشِ تیغ نظر سے ہم

آکر شب وصال اجل کیا بنائیگی
چھپ جائینگے لپٹ کے تمھاری کمر سے ہم

حسرت نہ تھے رقیب کے دل کی گرہ نہ تھے
حیراں ہیں کیوں نکالے گئے انکے گھر سے ہم

گیسو نہ تھا جو سر پہ چڑھایا رقیب کو
آنسو نہ تھے جو گر پڑے انکی نظر سے ہم

وہ وہ سنائی ہیں کہ بہت ہی کرے گا یاد
اے رازؔ آج خوب ہی دشمن پہ برسے ہم

ستم میں بھی تو پہلو انکی زینت کے نکلتے ہیں
ہمارے خوں شدہ دلکو حسیں تلووں سے ملتے ہیں

سہارے سے کسی کے ناتواں رستے میں چلتے ہیں
عصا تھامے مژہ کا آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں

شگافِ سینہ، سوراخِ جگر، چاکِ دلِ عاشق
محبت کی گلی سے سیکڑوں رستے نکلتے ہیں

تمھاری مانگ کے عاشق ہیں شیخ و برہمن دونوں
یہ وہ رستہ ہے جس میں دوست دشمن ملکے چلتے ہیں

یہ کس بدمست کی ہی پیشوائی کون آتا ہے
کہ اٹھا ابر نکلی شیشے سے مے جام چلتے ہیں

کھٹک آج آنسونکی دے رہی ہے یہ خبر مجھکو
چبھے تھے دلمیں جو کانٹے وہ آنکھوں سے نکلتے ہیں

پڑی پھر دستِ نازک پر مصیبت کنگھی چوٹی کی
وہ کیا چھپائے ہیں مہندی چھڑا کر ہاتھ ملتے ہیں

وہ بولے کیا ہی جلکر وصل کی شب جب اچھیڑا
الٰہی ٹوٹ جائیں ہاتھ ظالم کیسے چلتے ہیں

کوئی حسرت نہیں نکلی کوئی ارماں نہیں نکلا
محبت میں حسینوں کی فقط آنسو نکلتے ہیں

ہیں اس الفت کے صدقے ہوں ہیں اس نفس کے قربان
جگر ہو راز کی دل ہیں مگر صورت سے جلتے ہیں

انکار وصل جان ہی لیکر رہیگا آج
ابکے "نہیں" زباں پر آئی کہ ہم نہیں

آئینے میں انکے آپ ہی ہیں ہم نہیں رہے
جب وہ نہ تھے تو ہم تھے جو وہ ہیں تو ہم نہیں

اب کیا کروگے آکے وہ جھگڑا ہی مٹ گیا
جو کبھی ڈھونڈتی تھیں تھکیں انمیں ہم نہیں

ہے اپنے بعد بھی وہی رنگ انکی بزم کا
جلسے وہی ہیں لوگ وہی ایک ہم نہیں

عکس رخِ نگار ہے جام شراب میں
یا آفتاب ہے قدح آفتاب میں۔

جب کہا "جان ہو قربان" تو جلکر بولے
"جاں تو ہم ہیں تمھاری نہیں قربان کرو"

یہ جو منہ پھیرے ہوئے نزع الگ بیٹھے ہیں
انسے کہدے کوئی وہ مشکل مری آسان کرو

صدقے ساقی چشم مے آشام کے
ایک دو گھونٹ اِس چھلکتے جام کے

راز کو سب دل میں دیتے ہیں جگہ
آپ کیوں دشمن ہیں میرے نام کے

چاہنے والے کی ہر ایک تمنا ہے بھلی
آپ پورا جسے کردیں وہ سوال اچھا ہے

لاکھ جانیں مری قرباں ہوں اس رٹنے پر
آپ آنسو نہ بہائیں مرا حال اچھا ہے

وہ عجب در ہے کہ مانگے نہیں عزت جاتی
اپنے اللہ سے ہر ایک سوال اچھا ہے

بٹھایا ہے کس کسکو پہلو میں انکے
اٹھاتا ہے حشر آسمان کیسے کیسے

برا ہو ترا گردشِ آسمانی
کہ وہ پھر گئے پھر یہاں آتے آتے

دم واپسیں منتظر ہوں کسیکا
تھکیں اس لئے ہچکیاں آتے آتے

قتل کرکے میرے قاتل کو پشیمانی ہوئی
نیچی نظریں کہہ رہی ہیں سخت نادانی ہوئی

شغلِ مے نے رنگ و روغن شیخ کا چمکا دیا
لوگ سمجھے ذکر حق سے شکل نورانی ہوئی

اُن کو آنکھوں میں جو رکھا ہے تو نظریں لوٹا ہیں
ایسے للچائے ہوؤں سے بھی نگہبانی ہوئی

بے سبب اُس در پہ اپنی جبہہ فرسائی نہ تھی
مٹ گیا قسمت کا لکھا صاف پیشانی ہوئی

دشت سے جاتا ہوں گھر کو کچھ تو تحفہ چاہیئے
خاک تھوڑی سی گرہ میں باندھ لوں چھانی ہوئی

ہوش میں آیا دلِ بے خود تو وحشت بڑھ گئی
ڈوب کر کشتی مری اُچھلی تو طوفانی ہوئی

دل جگر دونوں کو غم اُس دوست کا چٹ کر گیا
خانہ ویرانی ہوئی اچھی یہ مہمانی ہوئی

رو رہا ہوں دوستوں کی سرد مہری دیکھکر
جسقدر گاڑھی چھنی تھی اُتنی ہی پانی ہوئی

اللہ اللہ آپ کی زلفِ پریشاں کا اثر
میں نے گر سر کی قسم کھائی پریشانی ہوئی

کھنچ گئے دل سب کے کچھ ایسی کھنچی تصویر یار
صدقے خاموشی ہوئی قربان حیرانی ہوئی

راز نے کیا کہدیا چپکے سے اُنکے کان میں
اُٹھ گئے شرما کے کچھ ایسی پشیمانی ہوئی

جمی جس دن سے آکر خانۂ دل میں نہیں نکلی
کسی پردہ نشیں کی یاد بھی پردہ نشیں نکلی

راز

راز۔ منشی محمد حسین خاں راز جلال آبادی شاگرد حضرت احسان شاہجہاں پوری باوجود تلاش حال نہ ملا۔ یہ غزلوں کا خلاصہ ہے۔

ہمیں وہ خانۂ صیاد میں ملا آرام
خیال دل میں نہ آیا کبھی رہائی کا

تمنا اُن کی بر آئے الٰہی
بلا سے جان جائے عاشقی میں

فصلِ بہار میں تو اسیروں کو چھوڑ دے
صیاد تیرے دل میں ترحم ذرا نہیں

کرو تم گرفتار زنجیرِ گیسو
کہ ہم وحشیوں کی سلاسل یہی ہے

دیوانہ ہوا جاتا ہے مجنوں کی طرح دل
پہنچی کسی صاحبِ محمل کے لیئے ہے

راز

راز۔ جناب شیخ عنایت اللہ صاحب سکندر آبادی تلمیذ حضرت خورشید سکندر آبادی۔ رسالہ "ید بیضا" میں چند غزلیں نظر سے گذریں اُن کا انتخاب ضبط تحریر میں آیا۔

اذیت پاک باطن کو نہیں ہوتی ہے دشمن سے
کہ دامانِ نگہ کسدن ہے اُلجھا خارِ مژگاں میں

غضب ہے راز اتنی بات پر تم جان دیتے ہو
کہ بہرِ فاتحہ وہ آئیں گے گورِ غریباں میں

بہت دیکھا مگر اے بیوفا تجھسا نہیں دیکھا
یہ سچ ہے رازؔ تم کو اس بت بدخو سے الفت ہے

حسینوں میں حسیں کوئی جوانوں میں جواں کوئی
بھلا بے وجہ کھاتا ہے کسی کی گالیاں کوئی

راز

رازؔ۔ حکیم محمد باقر صاحب لکھنوی شاگرد جناب رشیدؔ لکھنوی۔ بار بار احباب لکھنؤ سے ان کے حالات دریافت کئے اور خود انکو بھی رشیدؔ صاحب کی معرفت خط بھیجے مگر کوئی جواب نہ ملا۔ لاچار صرف کلام منتخب پر اکتفا کیا جاتا ہے، ذکی، طبّاع اور خوش کلام سخنور معلوم ہوتے ہیں اور اُستاد کے فیضانِ صحبت کا اثر بھی کلام سے پیدا ہے۔

کافی ہے یہ کہ آپ پہ دل مبتلا ہوا
دلبر جو ہاتھ آپنے رکھا تو کیا ہوا

اُٹھ اُٹھ کے خفتگانِ زمیں دیکھنے لگے
یارب یہ کیسی آگ بھی دل میں کہ روزِ حشر

ہو دل کا حال چہرے کی زردی سے آشکار
جو چپ ہوگی زبانِ تیغ محشر میں تو کیا ہوگا

تغافل کی کوئی حد ہے لحد پر فاتحہ پڑھنے
الٰہی خیر ہو کیوں خود بخود دل منہ کو آتا ہے

کہوں اے شمع کس سے قصۂ سوزِ دروں اپنا
یہ بہار خار بنکر تری آنکھ میں کھٹکتی

کشتگانِ نرگسِ مخمور کو ہنگامِ حشر
وقتِ پیمان وفا اتنا بھی اُسنے کہدیا

تیرِ جاناں جبکہ کھٹکا دلمیں مجھسے بولی تڑپ

اب کیا بتائیں آپ سے ہم اور کیا ہوا
پہلے سے اور دردِ محبت سوا ہوا

کس کے خرامِ ناز سے محشر بپا ہوا
نکلا مزار سے مرا لاشہ جلا ہوا

لے رازؔ دردِ عشق چھپایا تو کیا ہوا
پکاریگا شفق بن کر لہو قاتل کے داماں کا

وہ کب آئے نشاں جب مٹ گیا گورِ غریباں کا
بندھا ہے ہچکیوں کا تار گھبراتا ہے دم میرا

نہیں جز بیکسی کوئی انیسِ شامِ غم میرا
جو ہماری طرح نرگس تجھے انتظار ہوتا

فرشِ خوابِ مرگ سے اُٹھنا گراں ہو جائیگا
دل سلامت ہے تو اک دن امتحاں ہو جائیگا

اب علاجِ شدتِ دردِ نہاں ہو جائیگا

کہیں سودائیانِ عشق بھی پابند ہوتے ہیں
الٰہی کیوں مرے دلمیں خلش رہ رہ کے ہوتی ہے

بچھائے لاکھ کوئی سلسلہ زلفِ پریشاں کا
ملا ہو خارِ حسرت میں مزہ کیا تیرِ جاناں کا

لہ امیر مینائی کے مشہور مطلع سے مضمون لڑ گیا ہے۔

چمن میں ایک جنوں بے ساختہ گل کو ہنسی آئی
کوئی ٹانکا جو ٹوٹا بخیہ چاک گریباں کا

پس مردن چڑھائے بیکسی نے پھول حسرت کے
بندھا تار بت پہ سہرا تار اشک شمع گریاں کا

دل و جاں کو چڑ کا کل میں ہم اے راز کھو بیٹھے
لٹا تاریک شب میں قافلہ امید و ارماں کا

خیر ہے یہ آپ کیوں گھبرا گئے ہنگام حشر
ہاتھ میں مجنوں کے لیلی کا گریباں دیکھکر

کیا کریں کیونکر بچیں مینا و مے سے ناصحو
ٹوٹ ہی جاتی ہے توبہ بزم رنداں دیکھکر

ایک سے دو دن تھے یہ اپنی زندگی کی کائنات
صبح محشر ہنسنے دیکھی شام ہجراں دیکھکر

شہر سے گھبرا کے نکلا تھا کہ آفت آ گئی
پاؤں پھیلانے لگی وحشت بیاباں دیکھکر

بات کیا ہے کوئی پوچھے تو مسیحا سے ذرا
رو دیئے ہیں رخ بیمار ہجراں دیکھکر

غضب ہی جان لے لیتے ہیں یہ بت دلربا ہو کر
الٰہی دی یہ قدرت تو نے بندوں کو خدا ہو کر

یہ کیا آخر ہوا ناکام کیوں شرما کے جاتے ہو
بڑے دعوے سے تم تو آئے تھے تیغ آزما ہو کر

ہوتی امید لیکن بعد مردن روح عاشق کو
کیا مسرور یاس نے رونق بزم عزا ہو کر

بس اس امید پر عاشق تمہارے مر مٹے آخر
کہ شاید ہو کبھی اپنی رسائی خاک پا ہو کر

وہ بت اور اے دل پسیجے کسی سے
یہ ہم ہیں کہ پتھر کو پگھلا رہے ہیں

عدم کے جانیوالو اک ذرا دم بھر ٹھہر جاؤ
کہ ہم بھی ساتھ چلنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں

بہت کچھ دل میں لیکر آئے تھے لیکن کہیں کیونکر
کوئی اپنا نہیں محفل میں سب اغیار بیٹھے ہیں

پوچھا جو میں نے دل کا پتہ کچھ بتائیے
بولے مجھے خبر نہیں ہوگا یہیں کہیں

اے نیند ایک چشم زدن کو تو آ کبھی
شاید کہ آئے خواب میں وہ نازنیں کہیں

دل سے چلے ہیں اشک بجھانے کے واسطے
سوز جگر سے آگ لگی بالیقیں کہیں

چلا جب خاک اڑانے تیرا سودائی بیاباں کو
پکاری روح مجنوں چاک کر وحشی گریباں کو

پس مردن وہ کب آئے لحد پر فاتحہ پڑھنے
فلک جب بے نشاں بھی کر چکا گور غریباں کو

نہ جنت سے غرض اے راز مطلب ہے نہ دوزخ سے
یہ کس کافر کے پیچھے چھوڑ بیٹھے دین و ایماں کو

منہ آئے دیکھنے کو، آپ ہئے جنازے پر
وہ دل جلا ہوں چھری پھیریئے جو گردن پے

نیاز مند کی کوئی تو آرزو نکلے
کٹیں رگیں تو عوض خوں کے دھواں نکلے

پان کھا کر جو کوئی آتا ہے
کس سے پوچھے کوئی حقیقتِ عشق
چل بسا اب ترا مریضِ فراق

خون ہنس ہنس کے وہ رُلاتا ہے
دیکھئے جس کو اپنی گاتا ہے
اور دم بھر وم آتا جاتا ہے

نشۂ مے سے نہ تھے ہوش بجا بھول گئے
میرا افسانہ انھیں اور تو سب یاد رہا
میری قسمت! میری تقدیر! امقدر میرا!

رات کی بات بھی کچھ یاد ہے یا بھول گئے
حرف مطلب پہ جب آئے تو کہا بھول گئے
دل کے دیتے ہی وہ سب عہد وفا بھول گئے

یہ جو افسوسناک حالت ہے
کھینچکر تیغ وہ یہ کہتے ہیں

حضرت عشق کی بدولت ہے
کون آمادۂ شہادت ہے

دیکھے نالوں سے انکو چڑ ہیں
اک ذرا سا سوال حسرت ہے

شور ہنگامۂ قیامت ہے
اور نہ کچھ عرض نہ حاجت ہے

راز۔ جناب علی احمد صاحب راز سکندرہ حال باوجود کوشش نما طبیعت کا رنگ کلام سے ظاہر ہے

آنکھیں تو گئیں ہائے مگر دیدۂ دل ہیں
آندھی کی ہوا برق کا دم دیکھ چکے ہیں
وہ چور ہے نخوت ہیں کسے چھیڑ رہے ہو
اے راز ضعیفی ہے مگر جی کو نہ ہارو

باقی ہے وہی حسرتِ دیدار کسیکی
آگے نہ بڑھی عمر سے رفتار کسیکی
مانے گا نہ مستِ مئے پندار کسیکی
دیکھ آئیں چلو گرمیٔ بازار کسیکی

راسخ۔ سخن سنج باکمال شیخ غلام علی صاحب راسخ عظیم آبادی، شاگرد رشید ملک الشعرا میر تقی میر دہلوی، نامور شعرائے سلف میں سے گذرے ہیں، صاحب دیوان تھے اور اپنے وقت کے استادوں میں شمار کیئے جانے تھے، بزرگوں کا وطن شاہجہاں آباد تھا۔ لیکن انکی ولادت پٹنہ عظیم آباد میں ہوئی، ابتدائے مشق میں میر وسودا کے ہمعصر، شاہ گھسیٹا عشق کے شاگرد میرزا محمد علی فدوی اور میرزا شرر کو غزلیں دکھائیں لیکن خدائے سخن میر تقی میر سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے بعد اس امر کا اعلان پسند نہ کیا اور تادم اخیر

میر صاحب مغفور کی عقیدتمندی کا دم بھرتے رہے جسکا نیازمندانہ اعتراف انکی غزلیات کے متعدد مقطعوں سے ہوتا ہے، میر صاحب موصوف کی خدمت میں پہلی مرتبہ شرف باریابی حاصل کرنے کا حال بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ مشہور رہے کہ جب شیخ صاحب دلّی میں وارد ہوئے اور میر صاحب کے اشتیاق ملاقات میں اُنکے درِ دولت تک پہنچے تو باریابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ کیونکہ میر صاحب جس طرح سخنوری میں بیعدیل تھے اسی طرح نازک دماغی اور تنگ مزاجی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے پھر شیخ صاحب جیسے گمنام مسافر کی رسائی انکے حضور تک کیونکر ممکن تھی، آخر جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو شیخ صاحب نے یہ شعر بہ تقریب حصولِ ملاقات ایک ماما کے ہاتھ لکھکر ارسالِ خدمت کیا۔

خاک ہوں پر تو تیا ہوں چشمِ مہر و ماہ کا	آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبارِ راہ کا

میر صاحب ہزار مغرور اور مستغنی المزاج آدمی تھے مگر کمال اور اہلِ کمال کے قدر دان تھے۔ بیتیابانہ باہر نکل آئے، ڈیوڑھی میں بوریہ کا فرش بچھایا گیا اور دونوں باکمال ایک جا ہوئے۔ راسخ مرحوم نے اپنا دیوان بنظرِ اصلاح پیش کیا۔ میر صاحب نے جابجا سے دیکھکر فرمایا "بھئی تم جیسے بوجھے آدمی ہو تمھیں اصلاح کی کیا ضرورت"، شیخ صاحب نے اصرار کیا کہ کچھ تو دستِ مبارک سے بناکر عزت افزائی فرمایئے۔ صاحبِ "نوائے وطن" لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے دستِ خاص سے اس شعر کو "سو مرتے دم اُن کا ذکر جب آیا زبان پر؛ نیند آگئی ہمیں تب اِسی داستان پر" یوں اصلاح فرمائی ؎

تا خوابِ مرگ ذکر تھا اُن کا زبان پر	نیند آگئی ہمیں تو اسی داستان پر

اور اپنا دیوان عنایت کرکے کہا کہ "یہی تمہاری اصلاح کیا کرے گا"

حضرت راسخ ۱۱۶۲ھ میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ایک یہ بھی روایت ہے کہ موضع "سائین" جو پٹنہ سے دس کوس کے فاصلہ پر ہے آپکا مولد ہے۔ ۱۲۲۱ھ تک مختلف مقامات مثلاً کلکتہ غازیپور، لکھنؤ اور دہلی کی سیاحت میں مصروف رہے، آخر کار ۱۲۲۲ھ میں اپنے وطنِ مالوف

کی طرف مراجعت کی، اُس زمانہ میں پٹنہ مرجعِ اربابِ کمال تھا اور شاعری کا تمام امیرزادوں اور رئیس زادوں میں رات دن چرچہ تھا، ایسی پُرلطف صحبت پاکر یہیں کے ہوگئے، اور عمر کا بقیہ حصّہ یہیں گذرا۔ آپ میانہ قد، گندمی رنگ، آزاد طبیعت انسان تھے عظیم آباد و پٹنہ کے اکثر مشاعروں میں شریک ہوکر دادِ سخن دیتے رہے، بزمِ سخن میں دوزانو بیٹھے رہتے تھے اور جب شعرا غزلیں پڑھتے تھے تو یہ آنکھیں بند کئے جھوما کرتے تھے، اپنی غزل پڑھتے وقت آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دو چار ہی شعر پڑھکر رک جاتے تھے۔ بیشتر کلام تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جس سے آپکے صوفی المشرب ہونے کا پتہ چلتا ہے، بعہد پیرانہ سالی ۷۶ برس کی عمر پاکر ۲۲ جمادی الآخر ۱۲۳۸ھ میں واصل بحق ہوئے اور محلہ لودی کٹرہ عظیم آباد میں دفن ہوئے ۱۳۱۱ھ میں انکا کلیات خیر المطابع عظیم آباد سے چھپکر شائع ہوا ہے۔ ۶، ۷ مثنویاں بھی ان سے یادگار ہیں، جملہ اصناف سخن میں دسترس تھی۔ مثنویوں کی وہی زبان ہے جو میر کی ہے۔ فصاحت و شیریں زبانی مضمون کی پاکیزگی و سلاست بیان انکی شاعری کا خاص جوہر ہیں اور زبان اور مضمون کی متانت دوش بدوش ہے، حضرت راسخ بڑے آزاد مزاج تھے مرتے دم تک کرایہ کے مکان میں رہے، موسیقی سے کچھ لگاؤ تھا، چنانچہ سنا ہے کہ جبتک سُروں سے دل گداز نہ ہوجاتا شعر گوئی کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے، یہ بھی سنا ہے کہ جب مہین کُرتہ پہنے ہوتے تو اِنکے قلب کی تڑپ لوگوں کو محسوس ہوتی۔ مشاعرہ میں غزلخوانی کے وقت شاعر کی تعریف کرنا خلاف ادب مشاعرہ سمجھتے تھے، البتہ بعد اختتام صحبت کلمات تحسین و آفرین ادا کرنے میں دریغ نفرماتے اولیاءاللہ کے مزاروں سے بھی بڑی عقیدت تھی اور اکثر گھنٹوں ایسے مقامات پر اپنا کلام پڑھا کرتے تھے، کلام کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے۔

رُخِ زیبا دیا گل کو، دلِ بے صبر بلبل کو
نہالِ حسن کو کس کس روش بخشی ہے زیبایش
مدعا عالم سے اپنا ہی فقط دیدار تھا

اسے خنداں کیا پیدا اُسے نالاں کیا پیدا
چمن میں عشقبازی کے گلِ حرماں کیا پیدا
دید کو اپنی یہ آئینہ اُسے درکار تھا

دل سے لگ گئے کیوں ٹرہا نوای طلبگارِ وصال
پھر اُدھر ہی جا وہی گھر جلوہ گاہِ یار تھا

کفر بھی اک شان جلوہ کی اُسی دلبر کی ہے
شیخ کیوں تو برہمن سے برسرِ انکار تھا

کب دیت خواہ اپنا راسخ اپنے قاتل سے ہُوا
وہ تو دستِ و تیغِ قاتل ہی کا جانبدار تھا

شوق کی باتوں کا کس نامہ میں اظہار نہ تھا
ہمنے کب خط اُنھیں لکھا کہ وہ طومار نہ تھا

دُکھ سے ہے ترک جو نظارۂ دلدار کیا
آہ پرہیز نے دُونا ہمیں بیمار کیا

برسوں رہا ہے صدمہ کشِ رشک آہ دِل
یہ سنجر ہے کچھ آب زدہ کچھ جلا ہُوا

ہوا دیوانہ ہر فرزانہ تیرا
بہت فرزانہ ہے دیوانہ تیرا

دل ضمنی ہوا جو شکست آشنا ہوا
یہ شیشہ ٹوٹنے سے جواہر بہا ہُوا

مت پوچھیئے مجھ سے حال میرا
حیرت زدہ کیا بیاں کرے گا

شاگرد ہیں ہم میر سے استاد کے راسخ
استادوں کا استاد ہے استاد ہمارا

جاں جسم پہ اب گراں ہے اے غم
کتنا مجھے ناتواں کرے گا

آتا ہے نظر کچھ اور رنگ آہ
کیا دیدۂ خونفشاں کرے گا

غافل تو بھی تو رفتنی ہے
کبتک غمِ رفتگاں کرے گا

ہے بندگی آزادی میں ایجاد ہمارا
کرتے ہیں ادب مردمِ آزاد ہمارا

دل کی قیمت شکستگی سے بڑھی
قلب تھا کامل العیار ہوا

معمورِ طرب رکھے دل دوست نے دشمن کے
آنکھوں کو محبتوں کی آنسو سے بھر رکھا

عقل والوں کے نہ آیا پیچ میں راسخ کبھو
یہ بھی اُسکی ذی شعوری تھی کہ سودائی رہا

پیشتر تم تھے جہاں اب سببِ تسکین ہے
اِس مکاں کے درو دیوار کو دیکھا کرنا

اپنے دیوانوں کا سرخیل بنایا مجکو
ہُوا پر اُنھیں منظور تماشا کرنا

متصل دل کو اضطراب رہا
جان پر تجھ بن اک عذاب رہا

بے حجابی کے بعد بھی مجھ سے
اسکو اک طور کا حجاب رہا

وے تھے خواہاں مری خرابی کے
میں اِسی واسطے خراب رہا

ڈوبے ہوئے ہیں ہم شراب عنبر کے ساتھ
راسخ اپنا جگر کباب رہا

راسخ کو ہے میر سے تلمذ
یہ فیض ہے اُنکی تربیت کا

دشمنی در پردہ کی ای وائے تمنے کیا کیا
آپ تو پردے میں بیٹھے اور ہمیں رسوا کیا

کب میرا خریدار ہو موجد وہ جفا کا
بندہ تو ہوں ہر عیب سے مجھ میں وفا کا

سونپا ہوا داغ اُنکا تازہ ہی سدا رکھا
ہمنے اِس امانت کو چھاتی سے لگا رکھا

ملیں حضرتِ راسخ ہمسے اگر توبہ پوچھینگے اُنکی جناب میں ہم
کہو قبلۂ و کعبۂ وہ کیسا تھا گل بھیں کا نٹا سا جسکی ہوا نے کیا

قطعہ

علائق سے آزادگی تھی میسّر
جنوں جن دنوں اپنا زنجیر پا تھا

نہ تھی فکر پوشش کی دیوانگی میں
اِس اندیشہ کو میں نے تہ کر رکھا تھا

نہ بالیں کی خواہش نہ بستر کی حسرت
نہ پروا کُلہ کی نہ فکرِ قبا تھا

فقط گرد کی تہ تھی پیراہن تن
نہ کچھ پاس اپنے کچھ اسکے سوا تھا

کیا ہائے کیا تو نے ای ہوشیاری
لباس اپنے تن پر وہی خوشنما تھا

حیا کے پردے میں مارا ہے ایک عالم کو
شہید میں تو ہوں اُن شرمگیں نگاہوں کا

گذرے جو وہ خیال میں تو نازکی سے ہائے
یہ رنگ ہو کہ پھول ہو جیسے مَلا ہُوا

ہو ضبطِ آب ٹوٹے ہوئے ظرف میں کہاں
دِل چاک ہو گیا ہی جو آنسو رواں ہے اب

راسخ اِس عہد میں متاعِ وفا
کیمیا کی طرح سے ہے نایاب

صورت ہمارے حال کی بگڑی سی دیکھ کر
قاصد نے اُنکے آپکی دلسے بنائی بات

زندہ ہے نام میر راسخ سے
کوئی ہے شاعروں میں ایسا آج

کہاں کا دام فقط ہے تری نظر صیّاد
جو چاہے صید ہوں ہم دیکھ ٹک ادھر صیاد

جفا یار کی گر ہو مخصوص میری
تو ہرگز نہ شاکی ہو شکرِ جفا کر

فلک تجھ سے خواہانِ شاہی نہیں ہم
ہمیں کوچۂ یار کا تو گدا کر

شہر آشوب

کب خذف ریزۂ بیقدر کو سب کہتے تھے لعل
پوتھ کو پوتھ سمجھتے تھے گہر کو گوہر

قطعہ

دیکھتے سر پہ کمینے کے اگر زر کا تاج — کفش پا پے بھی ٹہرتا تھا نظر میں کمتر

خاک آلودہ نظر اہلِ ہنر گر آتا — اُسکو دیتے تھے بتوقیر جگہ آنکھوں پر

کیا زمانہ تھا کہ تھی اہلِ لیاقت کی قدر — سنگ گوہر سے نہو سکتا تھا ہرگز ہمسر

وضعداروں سے تُنک وضع دبے رہتے تھے — دخل کیا سفلہ چلے محترموں سے بڑھکر

وہ نسق ہی نہیں بالعکس ہے اس کا اب تو — بے ہنر خوش ہیں خراب اور ذلیل اہلِ ہنر

ننگ ہیں وے جو حقیقت میں صفِ پائیں کے — بزم میں صدر نشیں ہوتے ہیں جاکر اکثر

قابلِ صدر نشینی ہیں مجالس میں جو لوگ — سخت مشکل سے ہے تا صفِ نعال اُنکا گذر

چغد اور بوم نے پایا ہے ہما کا رتبہ — زاغ کے آگے ہے طوطی یوہیں اک مشتِ پر

اس زمانے کے بھی کیا مرتبہ داں ہیں امیر — فہم کا اُنکی بھلا وصف نہ کیجے کیونکر

قفلباں کے تئیں دیں بخش کہ تا نامی ہوں — ہے سلیماں کی انگشت کا گر انگشتر

کوئی محتاج جو سائل ہو تو ہوں چیں بجبیں — دیکے دشنام کہیں اسکو نکالو باہر

بوعلی سامنے گر آکے سلام اُنکو کرے — سرسری سے ہوں اُسے دیکھ کے کچھ دست بسر

آوے ملنے کو اگر کوئی سفاہت پیشہ — تا درِ خانہ اُسے لانیکو جاویں اُٹھ کر

سُنکے ان باتوں کو مجھ سے لگا کہنے وہ دوست — جو کہا تو نے نہیں فرق ہے اس میں یکسر

چشمِ قرباں کی مانند ہوں حیراں ہمہ تن — دل ہوں مفلس کا پریشاں ہوں میں سر تا سر

ربط کچھ بالش و بستر سے بھی باقی نہیں اب — سوؤں ہوں اوڑھ کے مہتاب کی شب کو چادر

آہ صدموں سے غموں کے ہوں ز خود رفتہ سدا — محوِ اندوہ ہوں ایسا کہ نہیں اپنی خبر

ہے نشۂ طرفہ مرے سر میں کہ پیتا ہوں میں — ہر سحر اُٹھ کے مئے خونِ جگر کا ساغر

کثرتِ غم سے دل از بسکہ ہے ویران و خراب — کیا کہوں گذرا ہے اس پر سے گویا لشکر

داغ پر داغ ہیں سینہ میں ستاروں کی طرح — آسماں غم کا غرض ٹوٹ پڑا ہے مجھ پر

عموماً کاش محوِ جلوہ فرمائی نہوتے تم — جگہ دل میں مرے کرتے جو ہرجائی نہوتے تم

تمھاری التفاتِ خاص ہی وجہ جنوں تھی یاں
تماشا ہم نہ بنتے گر تماشائی نہ ہوتے تم

نہ پہنچے حیف دل تک اے مقیمانِ درِ کعبہ
جو یاں آتے تو واں محوِ جبیں سائی نہ ہوتے تم

جہاں سے ہے تجبہ رغا تمہیں گر ہوتی بینائی
تو اے اہلِ جہاں اسکے تمنائی نہ ہوتے تم

جز داغ ہے کیا دلِ حزیں میں
لالہ ہی اُگے ہے اِس زمیں میں

گالی میں بھی اُنکی جو مزا ہے
کب ہے وہ حلاوت انگبیں میں

اب اور لگا ہوئے ایجاد گلستاں میں
راتوں کو لگا رہنے صیاد گلستاں میں

کافی ہے لے ابر ہائے دیدہ میری چشم تر
دامن آگے تم سمندر کے نہ پھیلایا کرو

آغوش کے بھی جا لگیں ہماری کہیں نصیب
کیا ہو کبھو جو لگ کے گلے سو رہا کرو

ملتا ہوں اُنکے حسرتِ پابوس میں جو ہاتھ
کہتے ہیں بیٹھے ہاتھ تم اپنے ملا کرو

راسخ علاقہ دل کا نہ ہو دلبروں کے ساتھ
تم اہلِ دل ہو حق میں مرے یہ دعا کرو

گردوں نے طرفہ قلبِ درد آشنا دیا ہے
یعنی ہمیں یہ شیشہ ٹوٹا ہوا دیا ہے

کتنی گراں بہا ہے پاؤں کی تنگ ٹھوکر
قیمت میں اُسکی سر کو ہمنے جھکا دیا ہے

کبتک غبار ہمسے جی میں رکھوگے صاحب
ان نے تو خاک ہی میں ہمکو ملا دیا ہے

سنتے نغمے ہوش افزا جلوہ کو ہم تمھارے
سو ہمکو تو دوانا ان نے بنا دیا ہے

آہ عالم کی ہم اس وضع سے حیران ہوئے
دشت یاں شہر ہوئے شہر بیابان ہوئے

کیوں نہ وے مدعیٔ معرفتِ حق ہووے
جو شناسندۂ ماہیتِ انسان ہوئے

دم ہیں آزاد کیا قید سے ہستی کی ہمیں
تیغِ قاتل کے تو ہم بندہ احسان ہوئے

عبث اُس سے بیٹھے ہو دل لگا چلو راسخ اب کہیں یاں سے تم
روش اُن عزیزوں کی خوب تھی جو دل اس چمن سے اُٹھا گئے

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنی آنسو صبحِ پیری کا ستارا ہے

قطعہ

شرفِ میکدہ بیاں کیا ہو
یہاں کے رند افضلِ زمانہ ہوئے

غم شریفِ حرم کو یہ ہے کہ حیف
نہ گدائے شرابخانہ ہوئے

وقت چلنے کے علاقوں کی خلش تا نہ رہے
اسلیئے جی کو ہر اک شے سے اُٹھایا ہمنے

خواہشیں جمع تھیں دل میں سو کیا اُنکو وداع
کوچ سے آگے ہی سامان لُٹایا ہمنے

مثنوی

اے عشق امام ہے تو میرا
دیں ہے اسلام ہے تو میرا

تُو جاں ہے جسم ناتواں میں
ہوئے جو نہ تُو تو پھر کہاں ہیں

ہے اک کفنی سوز عفرانی
اشکوں کا ہے رنگ ارغوانی

کپڑوں کے نہ بند میں رہا میں
اِس قید سے ہوگیا رہا میں

پوشش سے تو میں نے ہاتھ اُٹھایا
عریانی کو پیرہن بنایا

جب سے ہوئی تجھ سے آشنائی
بیگانگی سب کہ مجھکو بھائی

ہے طرفہ مزا تیری جفا کا
جی جانتا ہے مری وفا کا

تُو حاکم کشورِ وفا ہے
محکومِ شہاں ترا گدا ہے

تھے وے جو بہت لطیف و رعنا
چھنوائی اُنھیں سے خاکِ صحرا

آتش دی دلوں کو آہ تو نے
گھر لاکھوں کیئے سیاہ تو نے

شعلے سینوں سے گہہ اُٹھائے
گاہے جگر آب کر بہائے

شاہوں کی تباہی تو نے چاہی
کشکول بنائے تاجِ شاہی

وارفتۂ کفر تجھ سے دیندار
تسبیحیں بنائیں تو نے زنار

سجادوں سے خلوتی اُٹھائے
صحرا میں برہنہ پا پھرائے

درہم ہوا دہر تیرے ہاتھوں
برہم ہوئے شہر تیرے ہاتھوں

پانی میں بھی آگ تو لگا دے
گرمی تری دشت کو جلادے

تو عقل کے ہوش کھو سکے ہے
جو چاہے سو تجھسے ہو سکے ہے

تجھ سے ہوا دستِ کفر بالا
تو چاہے اگر تو دختِ ترسا

دیں چھین لے سارے زاہدوں کا
عمامہ اُتارے زاہدوں کا

راسخ

راسخ - نواب ظفریاب خان راسخ مقیم لکھنؤ خلف مُلّا میاں حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں والی کھیٹر کی اولاد میں اور صاحبِ دیوان تھے ۱۲۵۸ھ میں انتقال کیا، نواب منصور خان مہر سے تلمذ رکھتے تھے، فنِ شعر سے عشق تھا۔ شبانہ روز یہی مشغلہ رہتا تھا، خواجہ آتش اور شیخ ناسخ کے ہمعصر تھے اور اپنی کثرتِ مشق کے باعث عزّ و وقار کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ طرزِ سخن میں ناسخ کے مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی تلاش سے کچھ کلام ہاتھ آیا اُس کا انتخاب حاضر کیا جاتا ہے۔

منزلِ مقصود کا پایا سراغ
خضر میرے پاؤں کا چکّر ہوا

گو مگو اُس شوخ کا اقرار ہے بھی اور نہیں
میرے ملنے سے اُسے انکار ہے بھی اور نہیں

لاغری سے ضعف ایسا ہے کہ مثلِ عکسِ خس
بسترِ غم پر ترا بیمار ہے بھی اور نہیں

چین بے دیکھے نہیں اور دید سے جاتی ہے جان
وہ تجلّی قابلِ دیدار ہے بھی اور نہیں

خامشی سے دل جلے کہنے سے جلتی ہے زبان
حال اپنا قابلِ اظہار ہے بھی اور نہیں

گہہ اُٹھا لیتا ہے گہہ سینہ پہ رکھتا ہے وہ ہاتھ
سانس لینا اب ہمیں دشوار ہے بھی اور نہیں

اُس آبِ حیات سے جُدا ہوں
مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں

دکھایا صانعِ قدرت نے اب تیرے کفِ پا کو
سُنا کرتے تھے ہم اعجازِ روشن دستِ بیضا کو

دلِ بے آرزو کون و مکاں کا ہے تماشائی
رکھا خالی ازل سے ہم نے آغوشِ تمنّا کو

تیور چڑھا کے رہ گئے تم کیوں اُٹھا کے ہاتھ
چھوٹتا ہے نیمچہ تو لگاؤ بڑھا کے ہاتھ

دریائے حسن اور بھی دو ہاتھ بڑھ گیا
انگڑائی اُس نے نشہ میں لی جو اُٹھا کے ہاتھ

مفتونِ صنم یہ دل دیوانہ ہوا ہے
یہاں کعبہ نثارِ درِ میخانہ ہوا ہے

دیکھنے نکلا جو وہ خورشید منظر چاندنی
دُھوپ سے بھی ہے چمک میں آج بڑھ کر چاندنی

اب اندھیرے اور اُجالے پھرتے ہیں وہ دربدر
دھوپ دکھلاتا پدر جن کو، نہ مادر چاندنی

خیالِ زلفِ پیچاں شامِ غربت کی سیاہی ہے
تصورِ روئے تاباں کا خیالِ صبح گاہی ہے

دلِ وحشی کو ہے خارِ غمِ ہجراں سے آسایش	علاجِ خونِ خاسد رنگ آخر نوکِ نشتر ہے
عبورِ بحرِ آفت خیزِ ہستی ہے بخیر و ہیں	شکیلد وشی تعلق سے مری کشتی کا لنگر ہے
لے دیدۂ گریاں ہو کہاں دل کی صفائی	روشن نفساں رہتے ہیں ہر وقت وضو سے

راسخ

راسخ - میاں عنایت محمد خاں آراسخ، خلف عادل شاہ خاں باشندۂ رامپور ۱۲۵۹ھ میں نواب غوث محمد خاں رئیس بھوپال کی نواسی نصیر بیگم سے عقد ہو جانے کے باعث بھوپال میں سکونت اختیار کی۔ فنِ سخن میں شیخ احمد علی رسا سے تلمذ تھا، چند غزلیں منیر شکوہ آبادی کو بھی دکھائی تھیں، انکی تالیف سے ایک رسالہ واجب العمل مطبع نظامی میں چھپ چکا ہے۔ شاہجہاں بیگم صاحبہ بھوپال کی قدر دانی سے بزمرۂ اخوان الریاست وظیفہ خوار ہیں ۱۳۰۷ھ میں سینتیس برس کی عمر تھی، یہ کلام کا رنگ ہے۔

سرِ تسلیم خم ہر کافر و دیندار رکھتا ہے	بڑھا طاقِ حرم سے رُتبہ کیا محرابِ ابرو کا
حرم کی پردہ پلکیں ہیں شریف کعبہ مردم ہیں	دکھایا آنکھ نے اُس بُت کی رُتبہ طاقِ ابرو کا

راسخ

راسخ منشی سعادت علی خان دہلوی تربیت یافتہ حکیم مومن خان۔ نیک طینت، خلیق اور طباع نوجوان تھے اور غدر سے پہلے زندہ و سلامت تھے۔ یہ دو شعر انکے طبعزاد ہیں۔

ہوں تو آنکھوں میں پر نہیں یہ خبر	سُرمہ ہوں، یا غبار ہوں، کیا ہوں
ہیں بنائے جہاں سہی لیکن	جبکہ ناپائدار ہوں کیا ہوں

راسخ

راسخ۔ شاعرِ باکمال سخنورِ عدیم المثال مولانا عبد الرحمن آراسخ دہلوی الملقب بہ خلاق المعانی خلف مولوی محمد حسین صاحب فقیر بانیٔ مدرسۂ حسینیہ دہلی۔ فقیر استاد ذوق کے شاگرد اور صاحبِ دیوان نعتیہ تھے جو چھپ گیا ہے۔ حضرت آراسخ قصبۂ بنت نواحِ پانی پت کے رہنے والے تھے مگر جناب آراسخ کی عمر کا بڑا حصہ دہلی ہی میں گذرا اور یہیں تعلیم و تربیت پاکر بڑے ہوئے اوائلِ عمر سے مطالعہ اور کتاب بینی کا شوق بیحد تھا۔ ابتدائے شباب میں "افضل الاخبار، ہمیان پنچ دہلی پنچ۔ چلتا پرزہ، و خیر خواہ عالم" کے برسوں ایڈیٹر رہے۔ اِنکی ظرافت پسند طبیعت کے

بہت سے نمونے ان پرچوں میں موجود ہیں، کملائے دلّی سے مختلف علوم وفنون میں سبق لیکر ایسی
استعداد پیدا کرلی کہ خود ایک زبردست اور جید عالم سمجھے جانے لگے، وعظ بالخصوص بہت
اچھا کہتے تھے۔ فقہ، معقول، منقول، اور کتب حدیث پر کامل عبور تھا، مثنوی مولانا روم کی
جو شرح مرحوم نے لکھی وہ صوفیائے کرام میں بڑی وقعت اور عظمت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے
اور در حقیقت انکی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ یہی ہے۔ اوائل مشق سخن میں مرزا ارشد، سیف الحق
ادیب، پنڈت جواہر ناتھ ساقی وغیرہم کے ہم مشق اور ہم صحبت رہے، اور اپنی میانہ روی
خوش مذاقی۔ اور صلح کل پولیسی سے علمی صحبتوں میں امتیازی نظر سے دیکھے گئے، میدان مناظرہ
میں کئی بار مولانا شوکت میرٹھی وغیرہ سے مباحثہ ہوا، مرحوم کے دو دیوان تھے جس میں سے
دوسرا ہنوز غیر مطبوعہ انکی بیوی کے پاس موجود ہے، دیوان اول مرآۃ الخیال جو ۱۳۱۳ھ میں چھپا
شوخی زبان، مضمون، بلندی فکر، جدت خیال، تازگی مضمون کا ایک قابل قدر آئینہ ہے۔
۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۷ء تک کامل ۴۲ برس دہلی میں استاد مانے جاتے رہے، ساٹھ ستر تلامذہ
بھی تھے جس میں بابو ونانک پرشاد طالب بنارسی مقیم بمبئی۔ چندی پرشاد شیدا، پیارے لال
رونق دہلوی بڑے با عقیدت تلامذہ اور قابل ذکر ہیں۔ دہلی کے مشاعروں کے رکن سمجھے جاتے
تھے۔ حضرت داغ مرحوم نے انکے اکثر اشعار کی داد دی اور متعدد موقعوں پر دہلی کے نوآموز شعراء
کو تحریک کی کہ راسخ کی دہلی میں موجودگی میں غزل انہیں کو دکھاؤ۔ دہلی سے باہر شاعری کی
شہرت کی ابتدا رسالہ "زبان" جاری کرنے کے بعد ہوئی اور تلامذہ کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ دوسرے
دیوان پر مولانا کو خاص طور پر ناز تھا کیونکہ یہ اُنکے پختہ غور وفکر اور قادر الکلامی کا نتیجہ تھا۔ اُس کی
غزلوں کے اکثر اشعار نہایت پھڑکتے ہوئے تھے، اسقدر شہرت اور ناموری حاصل کرلینے کے
بعد یہ حیرت انگیز بات ہے کہ مولانا نے وفات سے چار سال پیشتر عاشقانہ شاعری سے توبہ
کرکے درس وتدریس اور وعظ کو اپنا مشغلہ بنا لیا مگر تلامذہ کی اصلاح کا سلسلہ بدستور جاری تھا
توبہ کے بعد سے تا دم مرگ مولانا نے عشقیہ شعر نہیں کہا۔ آغا شاعر نے حق ہم وطنی و دوستی

مصرعِ تاریخ وفات "ہائے راسخ فردِ کامل کم ہوا" کہہ کر ادا کیا، بعارضۂ بواسیر ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء کو بعمر ۴۴ سال انتقال فرمایا۔ تین بیٹیاں صغرسن اپنی یادگار چھوڑیں۔

کہہ دو بسمل سے کہ اک ہاتھ جگر پر رکھّے	اور اک ہاتھ سے تھامے رہے دامن اُن کا
قاتل دہانِ زخم سے آتی ہے یہ صدا	بیرحم ایک ہاتھ میں قصّہ تمام تھا
کیا چھپاتے ہو ڈھل گیا جوبن	وہ جو چوری کا مال تھا نہ رہا
دلِ عاشق میں داغ ہے کسکا	کعبہ میں یہ چراغ ہے کسکا
ملا کے لائے تھے زمزم میں مُنہ چھپے لیکن	جنابِ شیخ کی قسمت ہی میں ثواب نہ تھا
جینا ہے خضر بتوں پہ مرنا	مرنے میں ہے لطف زندگانی کا
الٰہی حور ہو حصّہ کسی سید سے مسلماں کا	ہمیں وہ چاہیئے معشوق جو بانکے سے ہو بانکا
کسی میکش کو دیجئے تختۂ انگور کی خدمت	جنابِ شیخ ٹھیکہ لے چکے ہیں باغِ رضواں کا
لہو بھی چار چُلّو بڑھ گیا مشقِ ستم ہو کر	ترے چہرے پہ قاتل رنگ ہے خونِ شہیداں کا
ملا لو قیس سے فرہاد سے مری تصویر	یہ حال کس کا ہوا ہے یہ حال کسکا تھا
مرنیوالوں کا الٰہی کہیں پردہ ڈھک جائے	دھجّیاں ہو کے پڑے لاش پہ دامن انکا
دل سے یادِ دوستاں جاتی نہیں	بارہا سمجھا چکا ہوں بارہا
فکر تھا ہوتی ہے کیونکر مفت کی یار حلال	قاضی صاحب کے سبب یہ مسئلہ حل ہو گیا
رکھدیا گلشن میں بلبل کا قفس	مرحبا صیاد کیا کہنا ترا
کچھ دکھاتا ہے کچھ چھپاتا ہے	شعبدہ ہے یہ اُنکے آنچل کا
سرِ حشر چھپتے پھروگے کہاں	دلِ زار منہ پہ مچل جائے گا
قیامت ڈھائی مجھپر حشر توڑا اُس ستمگر نے	عدو کو قبر پر لایا ستم ٹوٹا غضب آیا
ہمنے جان و دل کے حصّے کر دیئے	وہ خدا کی ۔ یہ تمھارے نام کا
پی بھی لے ناصحِ نادان مری خاطر سے	یُوں سمجھ جسنے پلائی وہ گنہگار رہا

اپنے جنوں کا آپ ہی کرتے ہیں ہم علاج
کچھ تم بھی بوسے لیتے ہو چلا کوڑیوں کے مول

تعویذ دھو کے پیتے ہیں مجنوں کی گور کا
نیلام کر رہا ہوں دلِ ناامید کا

اپنے بیگانے ہیں، بیگانے ہیں اپنے راسخ
وہ یگانہ ہوں میں۔ اپنوں کا نہ بیگانوں کا

تیری دشنام کے مزے ہے ہے
ٹھوکریں مارتے ہیں نعش پہ وہ

منہ میں تیری زبان ہے گویا
پسِ کشتن بھی جان ہے گویا

خشک و تر کو تری چاہت نے سکھایا کیا کیا
مفت بکتا نہیں فردوسِ بریں محشر میں
حوروں کے واسطے مرتا ہوں میں کیا فرمایا
ہم بھی ہیں، تم بھی ہو، محشر بھی ہے، اللہ بھی ہے

ڈوبنا مچھلیوں نے شمع نے جلنا جانا
ہاتھ خالی نئے بازار میں کیسا جانا
کچھ نہ سمجھا جو مجھے مردہ دل ایسا جانا
بڑے سچے ہو تو کل معرکہ میں آ جانا

رس کس نے لیا تری مسی کا
صدقہ ہے یہ غیر کی خوشی کا
گلشن میں مسی ملی جو تو نے
ہے چھوٹی سی عمر میں قیامت
پرچھائیں سے ڈر کے ہٹتے ہیں وہ

نیلم کا ہے رنگ پھیکا پھیکا
جلنا ہے مری لحد پہ گھی کا
دم گھٹنے لگا کلی کلی کا
فتنہ ہے وہ چودھویں صدی کا
سایہ نہ ہو یہ کسی پری کا

پہلو میں ہے لگا تیر قاتل
یہ یار ملا ہے دل لگی کا
راسخ کی خبر وہ سن کے بولے
حوروں نہیں تھا دھیان جنتی کا

ترے جھوٹے وعدوں سے ہوں نیم بسمل۔ تڑپنے کو ہے جاں پھڑکنے کو ہے دل

مگر تجھکو شاباش بے رحم قاتل۔ نہ کچھ اس سے مطلب نہ کچھ اُس سے مطلب

کوچۂ زلف میں پھر دل ہے ڈھٹی دینے کو
تو فندقیں لگائے ہیں دس ٹکڑے دل کروں
آنسو ذرا تھمے تھے کہ آنکھیں اُبل پڑیں
یہی جنوں ہے تو دیکھ لینا رہیں گے مر کر بھی دشت پیما

بوسے لے دیکھے بلا کو کہیں ٹالو جھٹ پٹ
ایک ایک کو اُتاروں تری پور پور پر
ڈوبیں گی کشتیاں لبِ دریائے شور پر
نکال پھینکے گی قبر ہمکو ہماری وحشت سے تنگ ہو کر

چوڑیاں سبز تیرے ہاتھوں میں
شاخِ طوبےٰ رہی ہری ہو کر

نکتہ گیری کے سبب نکتہ نوازی کے طفیل
خُلد سے شیخ ہے دوزخ سے ہے کافر باہر

بھوں چڑھی، غصہ چڑھا، تیور چڑھے
یہ چڑھائی! عاشقِ دلگیر پر؟

قاتل اوچھے وار پر ہے منفعل
زخم منہ آنے لگے شمشیر پر

تم لڑے مجھ سے کہ قسمت لڑ گئی
مر مٹا میں خوبیِ تقریر پر

بل کی بینے لگیں زلفیں ترے رخساروں پر
سانپ کے منہ میں کبھی ہوں کبھی انگاروں پر

چشم و ابرو کے شہیدوں کی ولادت ہے نیاز
تیر کے ٹکڑوں پہ ٹوٹی ہوئی تلواروں پر

لڑکھڑاتے ہیں قدم زُہد کے اے پیرِ مغان
توبہ اب ٹوٹ کے گرنے کو ہے میخواروں پر

رندوں پیو پلاؤ کہ آئی ہے صبحِ عید
توبہ کو پھینکدو سرِ بازار توڑ کر

آ بتکدہ میں زاہدِ مغرور ایک دن
زنارِ کبر اور بُتِ پندار توڑ کر

دم نہیں، جان نہیں، حال نہیں، تاب نہیں
درد پہلو سے اُٹھے لیجے سہارا کس پر

تُربتِ حضرتِ راسخ پہ چڑھائے تیور
تمنے غصہ بھی اُتارا تو اُتارا کس پر

زاہد خیالِ حور ہے ملکر خدا سے بھی
ناحق شناس فکرِ مکافات اتو چھوڑ

مر کے بھی ہیں ترے بسمل تشنہ کام
مانگتے ہیں تیغ کا پانی ہنوز

پھرتی رہیں گی دِلّی کی گلیاں نگاہ میں
راسخ بہشت میں بھی رہونگا وطن کے پاس

میرے جنازے پر یہ لبِ گور نے کہا
مر مر کے پہنچا ہے یہ مسافر وطن کے پاس

دل میں ہزار تیر جگر میں ہزار زخم
راسخ یہ خارزار ہے میرے چمن کے پاس

میں مسلماں ہوں فرض ہے بوسہ
مصحفِ لاجواب ہے عارض

نہ اُٹھا آپ سے خنجر اُٹھوں دنیا سے میں کیونکر
مجھے ناطاقتی تم کو نزاکت ہو گئی مانع

لگائی بھی ستمگر تیغ جھوٹے ہاتھ سے تو نے
عدو کو خلد سے جھوٹی شہادت ہو گئی مانع

کئے شباب میں جتنے گناہ عفو ہوئے
سُنا ہے میں نے جوانی ہے خواب میں داخل

پلائے پیاسوں کو اے تیغِ یار دو دو گھونٹ
کہ ہے سبیل لگانی ثواب میں داخل

نہیں ہیں جن کے معاصی شمار کے قابل
وہی ہیں رحمتِ پروردگار کے قابل

واعظ سے سن چکے ہیں قیامت کی پیاس ہم
بوتل بغل میں لینگے کفن میں گلاس ہم

قاتل نمک چھڑک کے تماشا تو دیکھ لے
کہتے ہیں زخم دل کہ نہیں ناسپاس ہم

سبو سے کام ہے بوتل سے کام جام سے کام
وہ رند ہم ہیں کہ رکھتے ہیں اپنے کام سے کام

قطعہ

کہتا ہے یہ ہند لاکھ کھا کر قسمیں
گوروں میں ہے قتلِ بے گنہ کی رسمیں

سنتا ہی نہیں کوئی فغانِ درویش
سچ ہے کہ نہ ہو کوئی کسی کے بس میں

گرہ دل کی کھلے یارب صفِ محشر برآتی ہو
وہ بت پلّے سے پلہ باندھ کر نکلے قیامت میں

نظر آتی ہے آئینہ میں اُنکی شانِ یکتائی
ملا دیتے ہیں صورت دیکھنے والے کی صورت میں

راسخ اِس سینے میں اللہ کا دیا ہے سب کچھ
آگ ہر داغ میں ہے داغ ہیں ہر سو دل میں

کروٹیں سینکڑوں لیں سینکڑوں پہلو بدلے
چین سے درد نہ بیٹھا کسی پہلو دل میں

پرتو فگن ہے عارضِ ساقی شراب میں
دو آفتاب ڈوبے ہیں اک آفتاب میں

گذری سیاہ کاری میں یارب تمام عمر
آدھی شباب میں کٹی آدھی خضاب میں

مجھ سے گناہ گار کو دوزخ میں ڈال کر
دوزخ کو ڈال رکھا ہے ناحق عذاب میں

راسخ اُمید عفو یہ کہتی ہے بار بار
دھوئے گئے گناہ ہمارے شراب میں

راسخ کی فاقہ مستی سے اللہ کی پناہ
کھاتا ہے سوکھے ٹکڑے بھگو کر شراب میں

میرے سینے میں نہیں یار کے خنجر میں نہیں
دم بھی کیا چیز ہے دم بھر میں ہے دم بھر میں نہیں

عشق تجھ سے زلفِ پرخم کیا کریں
چھیڑ کر برہم کو برہم کیا کریں

قیامت کی ہے برپا آئینہ میں عکس کاکل نے
بلائیں لینے جاتے ہیں پریشاں ہوتے جاتے ہیں

تپِ غم سے سنبھلنے کا نہیں اے چارہ گر راسخ
سنبھلنا جسکو سمجھا ہے سنبھالے ہیں سنبھالے ہیں

نوجوانی ہے نئے تم ہو نرالا جوبن
بالا بالا نہ اُڑا لے کوئی بالا جوبن

چولی مسکی ہے گریبان پھٹا پڑتا ہے
ہوش تو تم نے سنبھالا نہ سنبھالا جوبن
دیکھنا ہوتی ہیں غیروں کی نگاہیں رہزن
لٹ نجائے کہیں یہ ناز کا پالا جوبن
ٹکڑے ہو جائینگے گر آئیگی میخواروں میں
کام توبہ کا نہیں ایسے گنہگاروں میں

راسخ تفت جگر بوئے کباب آنے لگی
خوش بیاں تجھ سے بہت آتش بیاں گنتی کے ہیں

وہی راسخ تو ہیں کل تک جو تبخانے کے درباں تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے ویں نپاہو ہیں

مبارک بادہ خواروں کو کہ دن ساون کے آتے ہیں
ہوا بدلی ہے بادل ریش قاضی بنکے آتے ہیں

میرے مرنے کا وہ ماتم کیا کریں
مرنے والا مر گیا غم کیا کریں

کام پھرنے سے ہے تمھیں گھر گھر
شام دیکھو نہ دوپہر دیکھو

ادھر حوروں کا دعوی ہو ادھر تیرا تقاضا ہو
تماشا ہے شہید ناز پر جنت میں جھگڑا ہو

خدا چاہے تو آئینگے عبث کہتے ہو وعدوں پر
ہمیں معلوم ہے صاحب خدا چاہے نہ تم چاہو

تمنا ہے پڑے بھرپور سر پر ہاتھ قاتل کا
الٰہی جو مری تقدیر کا لکھا ہے پورا ہو

بحر وحدت نے دیا رتبۂ قلزم مجکو
مجھ میں گم تمکو کیا تم میں کیا گم مجھکو

حیرت حسن تجلی نے کیا گم مجھکو
صف محشر میں عبث ڈھونڈتے ہو تم مجھکو

کاش پنہاں رہیں دونوں کی نظر سے دشمن
میں ہی ہیں تمکو دکھائی دوں تمھیں تم مجھکو

بیتاب دلکو قول کے چھلّے سے باندھ لو
مٹھی میں گر نہ رہ سکے پلّے میں باندھ لو

دنیا نہیں یہ حشر ہے رہجاؤگے الگ
تم پلہ کھینچکر مرے پلّے سے باندھ لو

نزع میں جب حال راسخ غیر ہو
یا الٰہی خاتمہ بالخیر ہو

الٰہی ابکے ساون میں اگر برسے نمک برسے
ہمارے زخم پھیلائے ہوئے بیٹھے ہیں منہ کو

پھیر لو بوسے لب گلفام کے
غیر کے جھوٹے مرے کس کام کے

حشر کے دن سکۂ خون شہید
بیٹھ جائے گا وہ پٹہ تھام کے

سیکھ لے ہمسے کچھ آداب تلاوت واعظ
یا صنم لب پہ رہے ہاتھ میں قرآن رہے

سلامت نہیں رہتی توبہ کسی کی ؏	حسینوں سے صاحب سلامت بُری ہے
جام ٹوٹے ترے سر پر تو بلا سے واعظ	میکدہ سے تری توبہ تو سلامت آئی
کس سے وعدہ ہے مری جان کہاں جاتا ہے	تیرے صدقے ترے قربان کہاں جاتا ہے
کوچۂ زلف سے روکا ہے یہ کہکر دل کو	بیٹھ کمبخت، کہا مان، کہاں جاتا ہے
خُم کے خُم پی کے بھی ہنسے تو نہ دیکھا زاہد	کس طرح جاتا ہے ایمان کہاں جاتا ہے
تیر سینے میں چبھو کر یہ کہا قاتل نے	رستہ نکلا ہے تری جان نکلنے کے لئے
تُو نے دیکھی ہے اک پری واعظ؟	شیشے میں لال لال ہوتی ہے
نیّتِ شب حرام ہے زاہد	دن کو پی لے حلال ہوتی ہے
حسرت کے یہ معنی ہیں کہ مر کر بھی نہ نکلے	امید اُسے کہتے ہیں جو ہرگز نہ بر آئے
وہ ہاتھ مجھے چاہیئے وحشت ترے قرباں	جو ہاتھ گریباں سے چلے تا جگر آئے
الٰہی ہم گنہگاروں کا محشر ہو الگ سب سے	قیامت ہے یہ رسوائی سر بازار کیسی ہے
خنجرِ یار سلامت رہے دم خم تیرا	تو نے میعادِ قضا نا متناہی کر دی
مہر کی آنکھ سے اُس چہرہ کی یکتائی پر	حسن خط نے خطِ طغرا میں گواہی کر دی
ہوں شہیدِ خطِ لب میرے کفن کی رنگت	آسماں نے کبھی خونی کبھی کاہی کر دی
غیر بنکر کبھی پہنچا کبھی قاصد بنکر	میری صورت تری چاہت نے جو چاہی کر دی
اِدھر تو آنکھ ملاؤ کہاں گذاری رات	تمھاری نیچی نگہ سے ہے انفعال مجھے
ہمیں کو تم سکھاتے ہو ہمیں کو	ہمیں سے سیکھ کر چالیں ہمیں سے
بشر کو چاہیئے پاسِ دلِ بشر رکھے	کسی کا ہو کے رہے یا کسیکو کر رکھے
بتانِ شعلہ رو سے گرمِ محفل ہم بھی رکھتے تھے	کبھی تھی جان ہم میں بھی کبھی دل ہم بھی رکھتے تھے
بوسہ مانگا تو بولے وہ راسخ	شامت آئی ہے موت آئی ہے
قتل کسکو کر دیا ظالم کہ چہرے پر ترے	چار چلو خون ہے اور دو دو انگل نور ہے

عاشقی جو دین میں شراب ایسی کیوں کہیں جب سے حق غیر و قتال ہوتی ہے

راشد

راشد۔ مرزا بختاور شاہ راشد ابن مرزا خدابخش گورگانی، سادہ کاری، کارچوبی، سوزنی کا کام اپنے ہاتھ سے خوب بناتے تھے۔ چھالیا کی انگوٹھی۔ چھلے، ڈبیاں وغیرہ بڑی صنعت سے بنا کر تیار کیا کرتے تھے، موزونی طبع کی بدولت کبھی کبھی مشاعروں کی طرحوں پر طبع آزمائی کر لیتے تھے ۱۹۰۱ء میں قریب ۵۰ برس کے سن میں انتقال کیا۔

وہ حال پوچھتے ہیں بتلائے کون یارب
کم گوئی نے بھلایا یہاں ربط ہی سخن کا

جو عاشق ہو گیا تیرا کسی کا ہو نہیں سکتا
اگرچہ حورِ جنت ہو پہ شیدا ہو نہیں سکتا

جسے زندہ کیا عیسیٰ نے وہ قدرت کا مارا تھا
جسے مارا بتوں تم نے وہ زندہ ہو نہیں سکتا

حسیں لاکھوں ہیں دنیا کے ہزاروں ماہوش دیکھے
تمہارا سا کسی کا حسنِ زیبا ہو نہیں سکتا

جو بندہ ہے وہ بندہ ہے جو مولا ہے وہ مولا ہے
سبھی کچھ ہو گیا بندہ پہ مولا ہو نہیں سکتا

بھلا اس بے وفا کے وعدہ پر اتنا یقیں راشد
جو پورا کرنا بھی چاہے تو پورا ہو نہیں سکتا

کتنے ہی وعدے کیے لیکن نہ آئے ایکدن
کیونکہ جانوں ہے یہ مستحکم ترا اقرار خوب

اور اگر سچ ہے پئے تسکین دل کچھ تو بتا
تیرے تو اقرار میں بھی ہے بھرا انکار خوب

راضی

راضی دیوان جانی بہاری لال جی مرحوم، آپ ذات کے ناگر برہمن اور آگرہ کے قدیم رئیس تھے آگرہ کالج میں تعلیم پائی تھی اور فارسی انگریزی کے علاوہ عربی سے بھی ماہر تھے، پہلے اعظم گڈھ کے مدرسہ میں ماسٹر رہے پھر آٹھ برس بنارس کے مدرسہ میں پڑھاتے رہے وہاں سے ۱۸۶۶ء میں پلٹن منبر ۶۲ میں میر منشی ہو کر سات برس تک بنگالہ، ڈھاکہ، کلکتہ، الہ آباد، اٹاوہ میں رہے بعد میں ریاست بھرتپور میں وکیل رزیڈنسی راجپوتانہ مقرر ہوئے، پھر مہاراجہ سجن سنگھ بہادر والئ میواڑ کے کئی برس اتالیق رہے۔ اکثر جلیل القدر حکام اردو فارسی میں انکے شاگرد تھے۔ مرزا غالب مرحوم کے دوست قلبی تھے، آخر عمر میں کچھ کے دیوان ہو گئے تھے، ان کا دیوان ۱۲۸ صفحوں پر مطبع دربار کچھ واقع بھاؤ نگر میں ۱۲۷۷ھ میں چھپا تھا۔ علاوہ ازیں گلستان بوستان انوار سہیلی کا اردو نظم میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ بڑے ذکی، فہیم، ذو علم بزرگوار تھے، شادی

نہیں کی تھی، پیرانہ سالی میں بہتر برس ہوئے انتقال کیا، اِنکی زود گوئی اور پُر گوئی قابلِ تعریف تھی- اکثر زمینوں میں چو غزلہ کہتے تھے، تلاشِ مضمون اور الفاظ اچھی تھی- حکام کی تعریف میں قصائد بھی اچھے اچھے کہے ہیں- جن سے اُنکی قابلیت مسلّم ہے، اخلاقی مضامین نظم کرنے کا شوق تھا باایں ہمہ بعض مقامات پر فحش کے قریب پہنچ جاتے ہیں- دیوان کا انتخاب ملاحظہ ہو-

کروں شکوہ میں کیا اُس شوخ کی نامہربانی کا — دمِ رخصت دیا مجھکو نہ اک چھلا نشانی کا
یہاں تک اب ہوا ہے زور مجھپر ناتوانی کا — کہ تن کو جان اور جاں کو ہے تن موجب گرانی کا

رُو نما گلزار میں وہ غیرتِ گل ہو گیا — ہر چراغِ گل ہوائے رشک سے گُل ہو گیا
جس سے جیتے جی بنایا تھا مگر گھر نے ترے — شکر ہے اُس سے جنازہ کا تجمل ہو گیا
دیکھا راضی ورا نا تیر عکسِ گلعذار — تیل ہیچ اُسنے دیکھا روغنِ گُل ہو گیا
رُخِ تاباں سے اُسکے کیا ہے نسبت مہرِ تاباں کو — شعاعِ مہر سے بہتر ہے عالم اُسکی چلمن کا

اثر اچھوں کے دل میں کر نہیں سکتی بُری صحبت — نہیں ہوتا تاثر من میں جیسے سانپ کے پھن کا
جدا ہمسے وہ رہسکتا ہے پر ہم رہ نہیں سکتے — ہمارا عشق جاناں سے ہے جیسے جان سے تن کا
کوئی مارا ہوا تیروں کا بچ جائے تو بچ جائے — مگر بچتا نہیں تاکا ہوا اس ترچھی چتون کا
وہ سجدہ پیشِ بُت کرتا ہے یہ محراب کے آگے — خدا ہرجا ہے قضیہ ہے عبث شیخ و برہمن کا

جستجو سے گر کوئی پیغامبر پیدا کیا — رشکِ دیدارِ صنم نے دل میں ڈر پیدا کیا
کیوں نہ اچھوں کو بُرے گھیرے رہیں اللہ نے — خاروں میں گل پتھروں میں سیم و زر پیدا کیا
نہ دوا فائدہ کرتی ہے کسیکی نہ دُعا — چشمِ بیمار نے کیسا مجھے بیمار کیا
کافور ہے گورا گال اُس کا — فلفل ہے سیاہ خال اُس کا
کب بستر گل پہ آتی ہے نیند — گل تکیہ نہ ہو جو گال اُس کا
امتحاں کر خوشی سے خنجر کا — بار ہے دوش پر مرے سر کا
دل بھی دشمن ہوا اُس دشمنِ جاں کی خاطر — ہم جسے سمجھے تھے اپنا وہ بھی اپنا نہ ہوا

چھپاتی ہے بدی سیرت کی وہ صورت / مکاں سے عیب چھپتا ہے مکیں کا

سو بوسہ دوگے ہوکے جو ناخوش تو کچھ نہیں / اک بوسہ لاکھ بوسے ہیں دوگے جو پیار کا

دیکھنا ترچھی نگہ سے اُس بتِ بے پیر کا / کام کرتا ہے دلِ عشاق پر شمشیر کا

آتشیں رُخ کو عرق میں وہ نہاں رکھتے ہیں / دیکھئے آب میں آتش کو عیاں رکھتے ہیں

مشرک ہیں کہیں جو مجکو مشرک / ہیں ایک صنم کو مانتا ہوں

تُو چاہ نچاہ مجکو ہیں تو / جی جان سے تجکو چاہتا ہوں

یکساں ہے مجکو یاد رُخ و زلفِ یار کی / اپنی نظر میں شام و سحر دونوں ایک ہیں

رہی تلاش بنارس میں کو بکو مجکو / ملا نہ کوئی وفادار خوب رُو مجکو

ضرور نکلے گی میرے مزار پر نرگس / کہ دیدِ یار کی از بس ہے آرزو مجکو

ہجر جاناں میں لہو پیتا ہوں غم کھاتا ہوں / نہ غمِ آب ہے مجکو نہ غمِ ناں مجکو

گردشیں میں نے اُٹھائی ہیں تری آنکھوں کی / کیا ڈرائیگی بھلا گردشِ گیہاں مجکو

مارنا منظور ہے گر عاشقِ دلگیر کو / چھوڑ ابرو کی کماں سے اس مژہ کے تیر کو

پست ہمت روتے رہتے ہیں سدا تقدیر کو / صاحب ہمت ہمیشہ کرتے ہیں تدبیر کو

غیر ممکن ہے کہ ہوویں صاف صورت نرم دل / سخت رکھتا ہے بایں نور و صفا دل آئینہ

اُس رخِ صاف و لبِ گلگوں کا گر پڑجائے عکس / ہے یقیں گل طوطیا چاہیں عنادل آئینہ

اب رحم نکر قتل میں زخمی جو کیا ہے / تکلیف ہی بسمل کو ترحم ہیں زیادہ

زلف و رخ کا دھیان جب آیا مجھے / رات دن آئے نظر یکجا مجھے

کیوں دکھایا کرتے ہو چاہِ ذقن / چاہتے ہو چاہ میں ڈالا مجھے

مست رہتا ہوں خیالِ چشمِ یار / رات دن ہے ساغرِ صہبا مجھے

اُس پری چہرہ نے سایہ ڈال کر / کرلیا ہے اپنا دیوانہ مجھے

تجکو لاثانی کہا ہے اے پری / دیکھکر آئینہ مت شرما مجھے

مفت رسوا ہیں چاہ میں تیری
کچھ نہ ٹھیرے نگاہ میں تیری

کوئی چڑھتا نہیں ہے آنکھوں میں
ہے جو صورت نگاہ میں تیری

کھینچ لیتا ہے دل کو آنکھوں میں
ہے وہ جذبہ نگاہ میں تیری

نکر دیر سیراب کرنے میں قاتل
ترے آب خنجر کا پیاسا گلا ہے

بُرائی سے اچھوں کو ہوتی ہے نفرت
تو اچھا ہے پھر کیوں ترا دل بُرا ہے

ہماری خرابی کا باعث عزیزو
یہ حسن و جوانی یہ ناز و ادا ہے

وہ ہے حال خورشید کا اُس کے آگے
جو خورشید کے سامنے ماہ کا ہے

پردہ جو رخ سے دور مرا دلربا کرے
ہر ذرہ مہر بن کے قیامت بپا کرے

بیوفاؤں سے دوستی کر کے
کیوں دلا مفت خوار ہوتا ہے

سیلِ اشک اپنا اگر یوں ہی رواں ہے کچھ دنوں
ایک دن کاخِ فلک تم دیکھنا مسمار ہے

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اگر سچ ہے یہ بات
تو مرا محبوب مجھ سے کس لیے بیزار ہے

کتاب سے مجھے اُلفت ہے اِس لیے راضی
نہیں کتاب سا کوئی رفیقِ تنہائی

خط نے اس کے رخ کو قرآں کے برابر کر دیا
ورنہ اس قرآن کو حاجت نہ تھی تفسیر کی

ہمارا دل تو وہیں رہتا ہے جہاں دلبر
یہ جسمِ زار اگرچہ پڑا کہیں پہ رہے

دوبارہ پیر جواں ہووے دیکھ کر جسکو
فریفتہ جو رہے ایسے نازنیں پہ رہے

جیا ہے ترے عشق میں جو موا ہے
مُوا ہے ترے عشق میں جو جیا ہے

مشکل ہے زندگی ترے بیمارِ عشق کی
چاہے کوئی دعا کرے چاہے دوا کرے

ہے وصل میں موجود مگر ہجر میں غائب
دل سا بھی جہاں میں کوئی خودکام نہیں ہے

آرام سے جاہل کی گذرتی ہے ہمیشہ
عاقل کو یہاں ایک دم آرام نہیں ہے

شیخ جی آپ کی نصیحت سے
عشق اور اُستوار ہوتا ہے

ماہ سے یار کو نہ دو نسبت
ماہ تو داغدار ہوتا ہے

بھول جاتا ہے آپ کو کم اصل
حسن تسخیر سے نہیں خالی

کچھ بھی گر اقتدار ہوتا ہے
عشق بے اختیار ہوتا ہے

راضی

رضیؔ منشی یعقوب خان آپ کو خواجہ وزیر لکھنوی سے تلمذ تھا۔ قاضی محمد خلیل صاحب کی بیاض سے ایک شعر نقل ہوا ؛

جو سر ترے قدموں پہ مر بیجاں نہیں رکھتے
کچھ اور ہی بلا رکھتے ہیں وہ سر نہیں رکھتے

راضی

رضیؔ۔ مولوی خلیل الدین احمد رضیؔ صدیقی مقیم تلہر اودہ، حضرت احسان شاہجہانپوری کے شاگردوں میں نامور ہیں اور مولوی نذیر الدین احمد صاحب کے بیٹے ہیں چالیس بیالیس برس کا سن ہے، شعر صاف اور اچھا کہتے ہیں، یہ انکے کلام کا انتخاب ہے ؛

کیا کیا لگاوٹیں جگر و دل نے کیں مگر
کہتے تھے سب ہی حشر کی منزل بہت کڑی

ناوک فگن کا رخ نہ ادھر سے ادھر ہوا
دیکھا تو آنکھ مونڈتے ہی یہ طے سفر ہوا

عرصۂ حشر میں دیوانہ ترا کیا آیا
پاؤں کس شوق سے نرگس نے لیے آنکھوں پر

اہل محشر کے لئے ایک تماشا آیا
سیر گلزار کو جب وہ گل رعنا آیا

ایسی رچتی کہ کبھی رنگ نہ زائل ہوتا
ماہ و خورشید کو جب طاقت نظارہ نہیں

تیری مہندی میں مرا خون جو شامل ہوتا
تاب پھر کسکی تھی جو تجھ سے مقابل ہوتا

اللہ رے ظلم دوست کہ لاکھوں ستائے دل
ہمسے بھی تو کہو کہ محبت کے جرم پر

پھر بھی یہ فکر ہے کہ کوئی ہاتھ آئے دل
تجویز کی ہے کونسی تم نے سزائے دل

جتنی حیا تھی وصل کی شب ہمنے لوٹ لی
نرگس میں کب وہ بات جو ہے چشم یار میں

اب جھینپنے کی وہ نگہ شرمگیں نہیں
آنکھیں وہی ہیں چوٹ کریں جو ہزار میں

میں بھی ہوں بیقرار مرا دل بھی بیقرار
دو بیقرار دفن نہوں اک مزار میں

تماشا کیجئے کس کس کا دی سراپا ناز
ہائے چالیں یہ تمہاری یہ تمہارے انداز

پکارتی ہے ادا ایک ایک ادھر دیکھو
دل میں تو آؤ نظر کو نہ خبر ہونے دو

ای دل یہ کمر کی جستجو ہے	یا سیرِ عدم کی آرزو ہے	مٹ جائیگی تجھپہ آرزو ہے	کھو جائیگی اپنی جستجو ہے

کیوں ذبح میں سختیاں یہ قاتل — پتھر تو نہیں مرا گلو ہے
دم ہجر میں کیوں نہیں نکلتا — یہ بھی کوئی دلکی آرزو ہے
سب نذر ہے تیری اے غمِ یار — جتنا مرے جسم میں لہو ہے

وہ کہتے ہیں چہ خوش تیرے لئے گھر چھوڑ دیں اپنا — سکھاتا ہے ہمیں ای خانماں برباد یہ کیسی
اسی منہ سے مسلمانی کا دم بھرتے ہو کیا کہنا — خدا کی یاد میں آضنی بتوں کی یاد یہ کیسی؟

راغب

راغب ۔ مرزا سبحان قلی بیگ ایران اصلی وطن اور دہلی جائے پیدائش تھی، یہیں تعلیم اور تربیت پاکر شاہ عالم ثانی کے زمانے میں جوان ہوئے، سعادت یار خان رنگین کے بے تکلف یار اور اُنھیں کے شاگرد تھے، اور باوصف اسکے کہ انشاء اللہ خاں و رنگین محب یکرنگ تھے انکے اور سید انشا کے ہمیشہ مناظرے ہوا کئے اور نوبت ہجو تک پہنچی ۔ چند شعر ملے درج ہوئے ۔

ہوتا ہے تازہ آہ سے ہر دم جو داغِ دل — روشن ہے بادِ گرم سے اپنا چراغِ دل
ای شامِ غربت آہ کدہر ڈھونڈیے اسے — پایا نہ ہمنے زلف میں بھی کچھ سراغِ دل

منہ دوپٹے میں چھپایا اُسنے — دل کو پردے میں لبھایا اُسنے

رشکِ چمن جو اُٹھ گیا، آج ہمارے پاس سے — اپنے برنگِ گل یہاں، اُڑ گئے کچھ حواس سے

راغب

راغب ۔ حافظ یار خان خلف الصدق نواب ذوالفقار خان ابن حافظ الملک حافظ رحمت خان نصیر جنگ، جوان وجیہہ صاحب حوصلہ، مجمع قابلیت، صاحب علم و فن، خوشنویس، انشا پرداز، کبھی کبھی شعر فارسی اور ریختہ میں کہہ لیتے تھے ۔ یہ چند شعر اُنکے کلام سے تذکرہ قدرت اللہ شوق سے منتخب ہوئے ۔

بسانِ شانہ گر کوئی کرے سو ٹکڑے اپنا دل — وہ جانے مو بمو احوال اُس زلفِ پریشاں کا

کل مجھے دیکھکر مرا گل رو — اپنی مجلس میں کیا ہی لال ہوا

میں تو اُسکے عشق میں ہر لحظہ دکھ پاتا رہا — اور وہ بیدرد اک بوسہ پہ ترساتا رہا

مجھے محفل میں اپنی گر بٹھاؤ گے تو کیا ہوگا	گھڑی دو چار اگر مکھڑا دکھاؤ گے تو کیا ہوگا
نہ ہوگا فرق کچھ صاحب تمہاری قدر و عزت میں	کسی رُوٹھے کو اپنے گر مناؤ گے تو کیا ہوگا

ہم ہوں اور تم ہو اور شب مہتاب	ہو گزک اور شراب خواری ہو
وہ ہو اور ناز و غمزہ و عشوہ	میں ہوں اور درد و آہ و زاری ہو
غیر سے چاہ جب تمہاری ہو	دیکھئے شکل کیا ہماری ہو

کیا تم سے کہوں میں نے دیا دل تمہیں کیسے	الفت سے، مروت سے، محبت سے، نہ ایسے

راغب

راغب منشی احمد حسین شاہجہاں آبادی برادر زادہ حافظ محمد بخش عرف حافظ ممو، ترتیب تذکرہ مرزا صابر کے ایام میں جوان خوش فکر تھے، اور تیز طبعی اور خوش اخلاقی کے باعث اپنے اقران میں ممتاز۔ طبیعت کی روانی کا نمونہ اشعار ذیل ہیں۔

چھٹ گئے آرام سے راحت کا سامان ہوگیا	بڑھتے بڑھتے درد دل آخر کو درماں ہوگیا
یارب اسے تو چین دے مجھکو نہ دے نہ دے	جلتا ہے میرے حال پہ دل غمگسار کا
کیا فہم ہے وہ اپنی شکایت سمجھتے ہیں	شکوہ اگر کروں روش روزگار کا
آوے بھی وہ اگر تو نہ آوے اسے یقین	کیا حال ہوگیا دل اُمیدوار کا
اس کو ہے کیا صبا نے جہاں سے اٹھا دیا	چھوڑا نہ ایک ذرہ ہمارے غبار کا
ترغیب خلد اور مجھے راغب خدا سے ڈر	کیا کم ہے لطف خلد سے کچھ کوئے یار کا
میں نے کہا سر کٹتے ہیں کیا کیا نہ ملے لطف	کہنے لگے لے آؤ اگر ہے کوئی سر اور

راغب

راغب۔ جناب محمد عثمان خاں صاحب برہانپوری شاگرد مولانا فقیر الدین صاحب چشتی برہانپوری، حالات معلوم نہ ہو سکے، یہ کلام ہے

ازل سے عاشق صادق ہوں میں تو کوئے جاناں کا	سمائے گا مری نظروں میں کیا گلزار رضواں کا
مہ کنعاں کے پلہ سے گراں نکلا بہت پلہ	جو تولا حسن میزان نظر میں حسن جاناں کا
لیا بوسہ جو میں نے تو حیات جاوداں پائی	ہوا گویا دہان یار چشمہ آب حیواں کا

تری دریا دلی مشہور ہے عالم میں اے ساقی	مجھے تھوڑی سی مے مل جائے صدقہ تیری دوکان کا
سفر در پیش ہے ملکِ عدم کا	کمر کی جستجو ہے اور میں ہوں

کوئے صنم کی دیکھ لی جس روز سے بہار	باغِ بہشت گر گیا اپنی نگاہ سے
جادو بھرا ہوا ہے عجب چشمِ یار میں	دل سینکڑوں کے چھین لیئے اک نگاہ سے
دونوں جہاں میں اُس کا ٹھکانا کہاں رہا	تو نے جسے گرا دیا اپنی نگاہ سے
دیکھا ہے جب سے عارضِ تابانِ یار کو	خورشید و ماہ گر گئے اپنی نگاہ سے
خواب میں آ کے ذرا شکل دکھائے کوئی	میری سوتی ہوئی تقدیر جگائے کوئی
ہو کے بے پردہ اگر بام پہ آئے کوئی	جلوۂ حسن سے پھر تاب لائے کوئی
دیکھکر آئینہ کس ناز سے فرماتے ہیں	میں بھی دیکھوں تو مرے سامنے آئے کوئی
اپنے گیسو کی درازی کا اگر دعویٰ ہے	میرے طولِ شبِ فرقت سے ملائے کوئی

نجانے کیا شبِ غم بیقراری	یہی کہتا ہے درد اُٹھکر جگر سے
کیئے دیتا ہے مرغِ دل کو بسمل	کسی کا دیکھنا ترچھی نظر سے
وہی دشمن ہوا راغب تمہارا	جسے دیکھا محبت کی نظر سے

ایک نیا شعبدہ قاتل کا عیاں ہوتا ہے	دہنِ زخم میں تیر آ کے زباں ہوتا ہے
رُخِ پُر نور سے کس طرح جدا ہوں زلفیں	کب الگ شعلۂ آتش سے دھواں ہوتا ہے

راغب

راغب منشی محمد یعقوب بخش ساکن بدایوں، دور موجودہ کے کہنے والوں میں ہیں رسالہ نیرنگ رامپور سے کلام منتخب ہو کر نقل ہوا، بریلی کے مشاعرے میں انھیں دیکھا تھا۔ کلام درج ذیل ہے:-

کس درجہ ہوش مجھسے بیگانہ ہو گیا ہے	دیوانگی پہ اپنی دیوانہ ہو گیا ہے
دیوانوں کا تمہارے کچھ ہے عجب عالم	دیکھا جسے انھوں نے دیوانہ ہو گیا ہے
ساقی کی یاد میں جب بھر آئے اشک میگوں	آنکھوں کا ہر پیالہ میخانہ ہو گیا ہے

تیر نظر کی قیمت کیا دوں اُسے الٰہی — یہ نقدِ جان و دل تو بیعانہ ہو گیا ہی

دل پلک مارنے میں سینہ سے باہر آیا — یہ کشش تجھ میں ہے ای جنبشِ مژگاں کیسی
ہائے مسجد ہے یہ میخانہ نہیں اے واعظ — کیا بتاؤں تجھے ہے توبۂ رنداں کیسی
دلِ سوزاں تجھے کس شمع شبستاں کی ہے یاد — تجھ میں لَو ہے یہ چراغِ تہِ داماں کیسی
التجا یار کی پھر کیوں ہو جو قابو میں ہو دل — وہ جو بس میں ہو خوشامد تری درباں کیسی
تری صورت سے یوں ظاہر ترے صانع کا جلوہ ہے — کہ جس نے تجکو دیکھا ہے خدا کو اُسنے دیکھا ہے
مری چپ سے زمانہ بھر میں رازِ عشق افشا ہے — خموشی ترجمانِ آرزو و شرحِ تمنا ہے
ترے خارِ مژہ سے ربط اب تو جیتے جی کا ہے — کہ ان کانٹوں سے دامن جامۂ ہستی کا اُلجھا ہے

رافت شاہ رؤف احمد رافت خلف شعور احمد شیخ احمد سرہندی کی اولاد میں۔ اور جرأت کے شاگرد تھے فارسی و ریختہ دیوان اور مثنوی یوسف زلیخا ان سے یادگار ہیں سنہ ۱۲۴۷ھ میں بعمر پینسٹھ برس راہِ کعبہ میں وفات پائی، شعر گوئی میں مشاق تھے اور بڑے زبردست عالم تھے، رامپور میں پیدا ہوئے لیکن کئی مرتبہ دہلی آکر برسوں یہاں رہے خاندانِ شاہ غلام علی صاحبؒ بیعت کر لی تھی

رقیبوں سے ہل ہل کے وہ نازنیں — مجھے خاک و خوں میں ملانے لگا

ہوئے جو چاہت کے اپنے چرچے تو رشک بھر آئے چشم تر میں — کنارہ کش تجھ سے ہوں بیٹھا وہ اپنے گھر میں میں اپنے گھر میں
یہ کہکے مژگاں کے آہ یارب بھرے ہیں تیر ہماری بر میں — کہ شکلِ غربال پڑ گئے ہیں ہزاروں روزن دل و جگر میں
وصل کی شب ہی ہی گھڑیاں کیسی بے آئین بجیں — تب آیا وہ راحتِ جاں جب تین پہر پر تین بجیں
ادا و انداز ناز و عشوہ جو کچھ ہے اُس شوخِ فتنہ گر میں — نہ وہ پری میں نہ حور میں ہے نہ ہے وہ غلمان نہ بشر میں
لگا نہ جراح اسپہ مرہم کہ داغ جاوے تو جائیں مرہم — یہ کہتے ہیں سوختہ جگر ہم چراغ اُجڑے ہوئے نگر میں
جس نے بالوں میں ترے عطر بسا دیکھا ہی — اُس پہ آئی ہے بلا ہمنے بسا دیکھا ہے
ترا مجنوں ہوں ای پیارے اگر تو رشکِ لیلیٰ ہے — گیا جنگل کو تھا وہ میں نے بھی صحرا کی ٹھانی ہے

رافت

رافت۔ مولوی محمد عبد الرؤف خان رازؔ باشندۂ اندور، ۱۹۰۶ء میں موجودہ والیہ بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم کے بچوں کے اتالیق تھے، اور انھیں ایام میں سرکار عالیہ کے پرائیویٹ سکرٹری کے خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ کچھ عرصہ ریاستِ اندور میں بھی ملازم رہے، حضرتِ داغؔ سے شعر و سخن میں مشورہ کرتے تھے۔ پھر کچھ عرصہ پیسہ اخبار لاہور کے سب اڈیٹر رہے، اب معلوم نہیں کہاں ہیں، یہ چند شعر اُن کے نتائجِ افکار سے درج کئے جاتے ہیں۔

ہم جس جگہ کھڑے ہیں وہیں کے وہیں تو ہیں — اُٹھتا بھی ہے جو پاؤں تو پیچھے ہٹا ہوا

ق

ہمسے ہماری قوم کا کیا کام بن پڑا — کیا فرض اپنے ملک کا ہمسے ادا ہوا

بغض و حسد کا حال یہ ہے جل مرے وہیں — دیکھا کسی کا باغ جو پھولا پھلا ہوا

یاں بھائی ڈوب جائے جو آنکھوں کے سامنے — دیکھا کرے گا بھائی تماشا کھڑا ہوا

کس توقع پر سُنائیں حالِ دل — پھر وہی کہدوگے تم "ہم کیا کریں"

وہ سمجھتے ہیں اسے بھی اک ہنسی — رو کے ہم اے چشمِ پُرنم کیا کریں

ایک تو ظلم کرو اور پشیماں بھی نہ ہو — اور پھر اُس پہ یہ طرّہ کوئی نالاں بھی نہ ہو

خود نہیں مجھ سے طلب کرتے وہ یہ چاہتے ہیں — دل کا دل ہاتھ لگے اور کچھ احساں بھی نہ ہو

آفتیں سارے جہاں میں ہیں ہمارے دم سے — ہم زمانے میں نہ ہوں تو شبِ ہجراں بھی نہ ہو

لیچلے چھین کے دل آئے تھے مہماں بنکر — آپکی طرح کسی کا کوئی مہماں بھی نہ ہو

یا خدا اسلئے وہ کہتے ہیں ڈرانا کیا ہے — تو سہی حشر میں تیرا کوئی پُرساں بھی نہ ہو

تو بتاتا ہی نہیں یا کہ وہ سچ مان گئے — نامہ بر سچ تو بتا ہم ترے قربان گئے

میری دعوت پہ وہ فرماتے ہیں لو اور سنو — تمنے دیکھا ہی کبھی ہم کہیں مہمان گئے

بھلے اور بُرے پر نہیں حصر کچھ — طبیعت تو ہے آگئی آگئی

یہ میری جبیں پر عرق آگیا — یہ میری ہی تو آنکھ شرما گئی

تمھیں واسطہ بھلا غیر سے	سراپا مجھی پر تو یہ چھا گئی
نہ بگڑو بہت اب بناوٹ سے تم	وہ ہونٹوں پہ دیکھو ہنسی آ گئی
تو اے شیخ یاروں سے اُلجھا اگر	سمجھ لے کہ شامت تری آ گئی
اَور کے وصل سے ظالم تری حسرت اچھی	لاکھ آرام سے اک تیری مصیبت اچھی
جب گیا میں درِ دولت پہ یہی فرمایا	اِن سے کہدو کہ نہیں آج طبیعت اچھی

رافت

رافت منشی محمد عبد الغنی خان حیدر آبادی سکن شاگرد جناب فصیح الملک داغ دہلوی۔ یہ چند شعر انکے نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں۔

بعد میرے قاصدِ خانہ خراب آیا تو کیا	کامیاب آیا تو کیا نا کامیاب آیا تو کیا
گھر خدا کا ہے نہیں اس میں اجارہ شیخ کا	کوئی مسجد میں اگر پیکے شراب آیا تو کیا
اب چھین کے پی جاتے ہیں رندانِ خرابات	ہاں ساقیٔ بدمست انھیں سر پہ چڑھا اور
آئے تھے جب ہم تو خالی ہاتھ آئے تھے یہاں	جب یہاں سے ہم چلے تو داغِ حسرت لے چلے
برابر لگی آگ دونوں طرف سے	اگر ہے تو سوزِ محبت تو ہی ہے

راقب

راقب منشی امام الدین نام راقب تخلص اپریل ۱۸۷۳ء میں قصور ضلع لاہور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی والد ماجد کا نام شیخ امر بخش صاحب تھا۔ تعلیم معمولی ہوئی مگر حصول شاعری و زباندانی کے شوق میں اکثر دہلی و آگرہ میں رہے۔ ۱۸۹۴ء میں اپنا کلام حضرت تسنیم بھرتپوری کو دکھایا، بعدہٗ فصیح الملک بہادر نے خود مزین با اصلاح کیا۔ قصائد وغیرہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں، مہاراجہ فرید کوٹ کے دربار میں کئی سال سے قصیدہ پیش کرتے ہیں اور اس ریاست سے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہے۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

گھر کیا سینے میں غم نے تو ہوئی جاں رخصت	میزباں جانتے تھے ہم جسے مہماں نکلا

لوگ کہتے تھے کہ راقب تو فرشتہ خو ہی	وہ تو دلدادۂ اندازِ حسیناں نکلا
دونوں طرف سے جان بڑی ہی عذاب ہیں	قابو میں دلربا ہے نہ دل اختیار کا
جھک گئیں انکی نگاہیں شرم سے صبحِ وصال	کچھ تو تھیں کچھ اور بھی بیمار آنکھیں ہوگئیں
یہ ستم دیکھو کہ کہتے ہیں مجھے	انکو کیوں بوسے ندوں جنکے لیئے
سب بجا، سب سچ، کہ مَیں بدنام ہوں	یہ تو فرماؤ ہوا کن کے لیئے
ایک کے دس دس بتانے وہ لگے	ہائے کیوں بوسے نہ گن گن کے لیئے
خیال ہٹتے ہٹتے ہٹے گا کسی کی الفت کا	مرض یہ گھٹتے گھٹتے گھٹے گا بہت پرانا ہے
چھپایا تیرے رخساروں کو بڑھکر تیرے بالوں نے	غضب ہے توڑ ڈالا مورچہ گوروں کا کالوں نے
لے لیا ہے دل تو لیلے جان بھی	مہربانی بھی ترا احسان بھی
اِن لبوں سے ایکدن نکلی نہ ہاں	وہ گل لالہ ہیں نافرماں بھی
مرگیا تو مٹیں سب حسرتیں	میزباں بھی لٹ گیا مہماں بھی
سامنے بیٹھکے دلکو جو چرائے کوئی	ایسی چوری کا پتہ خاک لگائے کوئی
وہ تو روٹھے ہی تھے لو موت بھی آنیسے رہی	اِس برے وقت میں کس کسکو منائے کوئی

راقم

راقم۔ لالہ بندرابن صاحب راقم دہلوی۔ اِنکے سلسلۂ شاگردی کی نسبت تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے، اکثر ان کو مرزا رفیع سودا کا اور بعض مرزا مظہر کا شاگرد بتاتے ہیں۔ مگر مرزا مظہر کی شاگردی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اوائل مشق میں انھوں نے میر صاحب سے ضرور صلاح لی تھی جس کی بابت خود میر تقی میر اپنے تذکرہ میں اشارہ کرتے ہیں کہ "بندرابن راقم از شاہجہاں آباد است مشق سخن از مرزا رفیع میکند، قبل ازین با فقیر نیز مشورت شعر می کرد" میر صاحب کی تحریر کی تائید قدرت اللہ خاں نے بھی اپنے تذکرہ میں کی ہے راقم، فنِ سخن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور شعر خوب کہتے تھے، چنانچہ میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں انکی رسائی طبع کا بدین الفاظ اعتراف کیا ہے "بندرابن راقم بسیار پست قد

ولیکن بلند فکرست" انکا اندازِ کلام خود اِس بات کا شاہد ہے، انتخاب ملاحظہ ہو ؀

نامے کا میرے اُس سے لیکر جواب پھرنا
پروا سطے خدا کے قاصد شتاب پھرنا

اک وہ بھی دن تھے راقم جو تھا ہمیں میسّر
گلشن میں ساتھ اُسکے پیتے شراب پھرنا

کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے
اُڑا دیتے ہیں اُسکی بات ہنس کر

اے عشق مجھے تو اس طرح مار
تا یار کہے کہ "ہائے عاشق"

قطعہ

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں
کہنے کی ہی یہ بات کہ "مقدور ہی نہیں"

کہنا تھا کون یہ کہ خوشی ہی جہاں کے بیچ
اسبات کا تو یاں کہیں مذکور ہی نہیں

ای باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض
مجھسے قسم سے چھیڑوں اگر برگ و بر کہیں

اتنا میں چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب
آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھکر کہیں

قطعہ

مری بد شرابیوں سے کریں توبہ میگساراں
زہے وہ عمل کہ ہووے سببِ نجاتِ یاراں

سُنا کن سے نے حال میرا کہ جوں ابر وہ نہ رویا
رکھے ہے مگر یہ قصہ اثرِ دعائے باراں

یہانتک قبول خاطر کیجے تری جفا کو
تا سب کہیں کہ راقم رحمت تری وفا کو

مژگاں سے دل بچے تو ٹکڑے کرے ہی ابرو
یہ کہہ کے میں نے اُس سے جب اپنی دادچاہی

کہنے لگا کہ ترکش جسدم کہ ہووے خالی
تلوار گر نہ کھینچے پھر کیا کرے سپاہی

راقم

راقم۔ خلیفہ غلام محمد راقم دہلوی۔ لکھنؤ جانے سے پیشتر حکیم قدرت اللہ خان قاسم سے عربی فارسی کی انشا پردازی کے سبق لیئے تھے اور شاعری میں بھی ان ہی شاگرد تھے، علم نجوم میں بھی تھے اور طب میں دخل تھا۔ خوشنویسی میں فرد تھے، فارسی شعر کا بیشتر اور اُردو کا کمتر شوق تھا۔

فرقت میں تری جو مر گئے ہم
عشاق میں نام کر گئے ہم

بس عاشقی کر چکے میر جاں
غصہ سے ترے جو ڈر گئے ہم

ہاتھ میں اُسکے کچھ تو چمکے ہے
تیغ ہے یا کٹار ہے کیا ہے

جب میں نے کہا تمنے ملاقات اُڑا دی
تو اُسنے ہنسی میں یہ مری بات اُڑا دی

سنئے دیر میں کچھ ہے نہ حرم میں کچھ ہے	رباعی	نے ہستی میں کچھ ہے نہ عدم میں کچھ ہے
دنیا ہے طلسمات عجائب راقم		دم میں کچھ ہے اور اک دم میں کچھ ہے

راقم

راقم۔ مظفر علی راقم خلف شیخ رستم علی متوطن چار کلیانہ سنہ ۱۲۷۱ھ میں ستر برس کی عمر تھی غدر کے دوران میں انتقال کیا مولانا عبد الباقی مغفور سے زبان فارسی اور فن سخن کی اصلاح کی تھی فارسی شعر بھی کہتے تھے ذیل یہ کلام کا نمونہ ہے۔

غیر تدبیر نہیں ہیں بتِ عیار کے کار	دم نہیں دیتے ہیں اور ہوتے ہیں اغیار کے یار
تیغ مت کھینچ میاں ہاتھ کو پہنچے نہ ضرر	تیر مژگاں ہے خود آرا دل بیمار کی مار
آفریں دست جنوں تجھکو کہ دم کے دم میں	کر دیئے خوب مرے جامہ و دستار کے تار
اِک جہاں قتل کیا جنبشِ ابرو نے تری	کیا ستم دیکھئے دکھلائیں گے تلوار کے وار
آج صحرا میں ہے دیدۂ تر سے دریا	وار کے وار رہے اور رہے پار کے پار

راقم

راقم۔ خواجہ قمر الدین خان خلفِ اکبر خواجہ بدر الدین خان عرف خواجہ امان مترجم بوستان خیال، حضرت غالب دہلوی مرحوم کے رشتہ میں بھتیجے ہوتے تھے، مدة العمر خاندانی اعزاز کے لحاظ سے گورمنٹ انگلشیہ کے پنشن خوار رہے اور ریاستِ جیپور سے بھی مہاراجہ رام سنگھ جی کے وقت سے روزینہ دار تھے اور دہلی چھوڑ کر وہیں جا رہے تھے، فن سخن کا موروثی مذاق تھا اور بڑے مشاق اور پُر گو سخنور تھے۔ جوانی میں بڑے وجیہ، شکیل، جامہ زیب شخص تھے حضرت غالب، مؤمن، نیر، آزردہ، سالک، شیفتہ، ظہیر، کی صحبتیں دیکھے ہوئے تھے دیوان موسوم بہ "نغمۂ اردو" سنہ ۱۸۹۸ء میں چھپا تھا جس کا نسخہ عطیۂ مصنف راقم کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے، درجہ دوم کے شعرا میں اعلیٰ پایہ رکھتے تھے مضمون آفریں طبیعت پائی تھی۔ زبان و بیان میں سلاست اور بندش میں چستی، ترکیب کی استواری انکے اشعار کا خاص جوہر ہیں، ستر برس سے زیادہ عمر پا کر چھ سات برس ہوئے انتقال کیا۔

شق ہو گیا ہے سینہ جفاؤں سے یار کی	اب رازِ عشق ہم سے چھپایا نجائیگا

رہنے دو زخم دل کو امانت ہے یار کی | احسان چارہ ساز اٹھایا نہ جائیگا

کس دل سے کہتے ہو کہ تجھے خاک میں ملائیں | تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائیگا

قدرت سے نقشہ قد دلدار بن گیا | اللہ سے بھی اب تو بنایا نہ جائے گا

کس کی بیتابیٔ دل حال پریشاں کیسکا | تم چھری پھیر بھی دو چارۂ درماں کیسکا

مجکو وہ یاد کرے ہوش کی بنوا قاصد | جسکے لب پر نہ کبھی نام خدا کا آیا

آنکھ میں سحر ہے کافر کی کہ اسکے گھر میں | جو تماشے کو گیا بن کے تماشا آیا

آجاؤ پھرتے چلتے کبھی غمکدہ میں تم | آنکھوں سے ہم بھی دیکھ لیں آنا بہار کا

لکھ دیتا وصل یار جو میرے نصیب میں | کیا اس میں کچھ بگڑتا تھا پروردگار کا

کیا پوچھتے ہو حال کبھی دل میں بیٹھکر | آنکھوں سے دیکھو لطف مرے انتظار کا

آئے تھے اگر ملنے دم بھر تو ٹھہرے ہوتے | کچھ میری سنی ہوتی کچھ آپ کہا ہوتا

محشر کی عقوبت کا اندیشہ نہیں ہمکو | وہ ہو لیا یاں ہمپر جو روز جزا ہوتا

پوچھا ہی مزاج آپنے آہا مرے دل کا | قدرت میں کھلا آج نصیبا مرے دلکا

کیا بہار عمر اپنی کیا نشاط زندگی | جب مدار زندگانی حسرتوں پر رہگیا

پروانہ چیز کیا ہے فدا شمع پر ہوا | مرنا تمھیں دکھائیں گے جینا اگر ہوا

وہ تو مہماں تھے رہتے نہیں آخر جاتے | تجکو بدنام مگر وقت سحر ہونا تھا

آنے دو محتسب شہر اگر آہی گیا | اب تو لب پر قدح آتش تر آہی گیا

وہ ایسے دل میں آگئے میں بیخبر رہا | دیدار جو نظارہ سوے رہگذر رہا

ہم ہیں اور کشمکش مشکل دشوار میں دل | عشق کا لطف بھی آساں ہمیں حاصل نہوا

طور پر جلوہ ہوا موسی کو جس تنویر کا | تھا وہ اک سرمایہ اپنی آہ آتش گیر کا

عین شب وصال تھا ساماں فراق کا | کچھ شام ہی سے عالم صبح نشور تھا

واعظ کے روکے رکتے ہیں ہمسے حریف مے | جنت میں جا پئیں نکلے یاں اگر شراب

لوگ ایسا نہ ہو سمجھیں کچھ اَور
دیکھکر مجھکو نہ شرمائیں آپ

کبتک لئے پھرے گی مجھے جستجوئے دوست
کبتک کنوئیں جھکائیگی آرزوئے دوست

قیس و فرہاد کی شہرت ہو خدا کی قدرت
حوصلہ عشق کا کس کس نے کیا میرے بعد

اے دِل گلہ کی یار سے اب گفتگو نکر
آزردہ اور خاطرِ آزردہ خو نہ کر

کعبہ ہو صنم خانہ ہو تفریق سی کیا بحث
سر ہمکو جھکانا درِ جانانہ سمجھکر

جان مٹھی میں دھری ہے کوئی تمکو دیدے
جھوٹے وعدوں پہ غلط آپکے اقراروں پر

کبھی سایہ میں کھڑا ہوں تو سرک جاتا ہے
یار کے کوچے میں دیکھے در و دیوار کے ناز

گھر بھی اپنا نہ ہوا خانۂ دلدار کے پاس
باتیں سُنتے ہی کبھی بیٹھ کے دیوار کے پاس

ہم تو اک بٹھا دینگے شبِ وعدہ نظر کی
آنکھوں پہ بٹھا کے اُنھیں لے آئینگے گھر تک

ناخن بڑھے ہوئے ہیں اگر چارہ گر نہیں
کر لینگے اچھے زخم جگر اس دوا سے ہم

کیوں ہمکو کوئی پوچھے تعلق نہیں جسے
اچھے ہیں یا بُرے ہیں کسی کی بلا سے ہم

اے نالہ ہائے ہجر تمھیں جانتا ہوں میں
جب بجھ گئے ہو آگ لگا کر رہے ہو تم

جس بزم میں گئے ہیں ہنسا کر اُٹھے ہیں ہم
جب تم سے بات کی ہے رُلا کر رہے ہو تم

کل کون جئے کون مرے کسکو بھروسا
ملجاؤ بس اب وعدۂ فردا نکرو تم

اللہ رے لاغری کہ تن آسانیوں میں ہم
اتنے گھُلے کہ مل گئے روحانیوں میں ہم

وہ پلا مجکو سقدر جو مقدر میں نہیں
محفلِ یار میں ہوں گردشِ ساغر میں نہیں

کسی سے دِل لگانا ہے تو سودا اسکو کہتے ہیں
مرض بیٹھے بٹھائے مول لینا اسکو کہتے ہیں

جب ان ناکامیوں پر منحصر ہے زندگی اپنی
خدایا مرگ کیا ہوگی جو جینا اسکو کہتے ہیں

جفا کر لو، ستا لو، دیکھنا محشر کے میداں میں
کہ دامن ہاتھ میں کسکے ہے کسکا مُنہ گریباں میں

میں وہ ناکامِ ازل ہوں کاتبِ تقدیر نے
مجھ سے پُوچھا کیا لکھوں میں نے کہا کچھ بھی نہیں

جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہے چلو خانۂ خمار نہیں

دیکھا ہوا ہی اپنا وہ باغ نعیم خلد
جز انبساط خاطر ارباب دیں نہیں

زاہد نجات کے لیئے طاعت نہیں ضرور
کچھ بندگی ہی ذریعۂ عفو خطا نہیں

مفت ملجائے تو کعبہ میں پئیں یہ واعظ
یاں حریف مے و میخانہ بنے بیٹھے ہیں

کہتے ہیں دینے کو وہ دیکھئے کیا دیتے ہیں
وہ بھی یاں دیتے ہیں یا روز جزا دیتے ہیں

کیا دھرا ہے نرگس بیمار میں
مستیاں ہیں اور چشم یار میں

حسن وہ حسن جسے دیکھنے کی تاب نہیں
جلوہ وہ جلوہ کہ چھپتا پس جلباب نہیں

دہر میں عیش کے سامان ہیں مہیا سب کچھ
ایک تم جلوہ گر عالم اسباب نہیں

کیا سبک ہو گئے عریانی تن سے مر کر
دوش پر جاتے ہیں اور زحمت احباب نہیں

ہنگام بے حجابی یہ شمع بھی بجھا دو
رہنے نپائے کوئی بیگانہ انجمن میں

تیر نظر سے تیری دونوں چھدے پڑے ہیں
دیوانہ رہگذر میں فرزانہ انجمن میں

ہوئی اب یہ حالت ہر دل بیتاب و مضطر میں
کہ گل پر رقص شبنم جلوۂ خورشید انور میں

لب غیر آج تھا ساغر پہ دور آتش تر میں
کہ موج مے گریزاں ہے لب ساغر سے ساغر میں

نہیں معلوم کس کس کا لہو خنجر نے چاٹا ہے
کہ ہر جوہر برنگ گل ہی موج آب خنجر میں

تقاضا حسن کے کہتے ہیں یہ صورت ہی بلا کی
کوئی منہ پہلے بنوا لے بلائے پھر ہمیں گھر میں

ہمیں نسبت ہی صہبا سے کہ ہم ہیں نسل آدم میں
ہمارا حصہ ہے راقم شراب حوض کوثر میں

زبانی مرنیوالے سینکڑوں عیار ہوتے ہیں
محبت کرنے والے لاکھ میں دو چار ہوتے ہیں

قیامت ہی زلیخا اور یوسف کی خریداری
غضب ہے حسن کے سودے سر بازار ہوتے ہیں

دعائے وصل وہ مانگے کہ جسکے ہاتھ خالی ہوں
مرے ہاتھوں میں دامان خیال یار ہوتے ہیں

خوب نکلے جستجوئے یار میں
خار دامن میں ہیں دامن خار میں

ہم تو اپنی حسرتوں کو ایک دن
دفن کر آئیں گے کوئے یار میں

کچھ ایسی بن گئی تصویر اسکے دست قدرت سے
رہا حیراں بنا کر آپ صورت آفریں برسوں

اُمید وصل کی رکھیں اور آپ سے رکھیں
گویا کہ عمرِ خضر کی ہم آرزو کریں

تم سے نہ کہیں حال تو پھر کس سے کہیں ہم
یا اُسکو بتا دو کوئی تم سے جو سوا ہو

وفاداروں میں ملتے ہو۔ کھاؤ کچھ وفا کر کے
اسی بیگانہ داری پر کہیں ہم - با وفا تم ہو

تمھارے گھر سے ہم نکلے خدا کے گھر سے تم نکلے
تمھیں ایمان سے کہدو کہ کافر ہم ہیں یا تم ہو

مقصد تمھارے ہاتھ ہے قسمت خدا کے ہاتھ
ہم کچھ خدا سے ہو وہ تمھاری زباں سے ہو

[illegible]

کیا ہوگا مسیحا سے کسی اور کو لاؤ
جس سے کہ علاجِ دلِ بیمار کیا ہو

وہ کام نہیں یاں کہ بنے چارہ گروں سے
وہ درد نہیں یاں کہ مسیحا سے دوا ہو

[illegible]

خوشامد سے بگاڑا آپ ہم نے اُسکی عادت کو
بنایا اپنا دشمن خود جتا کر منہ سے اُلفت کو

کہتے ہیں آنے کو وہ آئیں نہ آئیں دیکھیے
شوق میں کب تک ہمیں رستہ دکھائیں دیکھیے

کام تدبیر نہ تاثیرِ دعا کرتی ہے
وہی ہوتا ہے جو تقدیرِ خدا کرتی ہے

آہ کو سمجھے تھے تسکیں کی دوا کرتی ہے
کیسی تسکیں مری حالت کو سوا کرتی ہے

ایک دن وصل ہوا تھا یہ قیامت آئی
آج تک بیتی ہے بدلے شبِ ہجراں ہمسے

غیروں رات وہاں رہتے ہیں اب لُطف گیا
کل چھٹا آج چھٹا کوچۂ جاناں ہمسے

ایک دن رسم و رہِ غیر میں جائیگی ضرور
آبروِ عشق کی، شرم آپکی غیرت میری

یادگاروں میں اسد کی ہے یہ بندہ راقم
کیا ہوا بزمِ سخن میں نہیں شہرت میری

جاتے ہیں گلہ کرنے گلہ کر نہیں سکتے
چلتے نہیں لب شوخیٔ گفتار کے آگے

تاثیر تو ہے میری نگاہوں میں بھی لیکن
چلتی نہیں اُس شوخ فسونکار کے آگے

حسینوں سے نکر اُلفت دلِ ناشاد کہتے تھے
لہو رلوائیں گے کافر ستم ایجاد کہتے تھے

کس کا جواب نامہ مگر پارہ ہائے خط
اُڑتے ہوا پہ دیکھنا دو چار آئیں گے

نازِ دلدار بھی نہیں اُٹھتا
ناتوانی سے ناتوانی ہے

ہاں کلک کوئی زمزمۂ دلستاں رہے
اندازِ دلفریبیٔ اہلِ زباں رہے

تھم ہجوم ناامیدی! اب جواب آنیکو ہے
مژدہ تسکیں اپنے قاصد کامیاب آنیکو ہے

لذتِ قتل کہاں بُرشِ صمصام میں ہے
عشرتِ مرگ تو کچھ عشوۂ اصنام میں ہے

ایسی ہوگی نہ کسیکی شبِ غم کی صورت
صبحِ محشر میں نہ ہوگا وہ مری شام میں ہے

خوب کٹتی ہے شبِ ہجر کہ بے کار نہیں
دل کسی یاد میں ہے نالہ کسی کام میں ہے

یاں بہار آئی ہے ساقی ابھی آرام میں ہے
آنکھ ساغر پہ ہے دل بادۂ گلفام میں ہے

بار کیا صحبتِ یارانِ مے آشام میں ہے
بیقراری سے جو شب بھر دلِ ناکام میں ہے

وعدۂ یار وفا ہوگا نہ گھبرائے دل
وہ بھی دن ہوگا اگر گردشِ ایام میں ہے

عاشقی کھیل نہیں خاک نہ سمجھے راقم
رخصت جان بھی آغاز کے انجام میں ہے

کہتے ہو کہ ہم غیر سے ملتے نہیں حاشا
کہدوگے قسم کھاکے یہ اغیار کے آگے

"جو کسی سے نہیں ملتے" کہتے تھے تم تو
یہ کیا کر رہے ہو، یہ کیا ہو رہا ہے

حقیقت مری آپ کیا پوچھتے ہیں
مقدر کا پورا لکھا ہو رہا ہے

جانتا ہوں کہ اسے دیکھ کے دم جاتا ہے
پھر اسے دیکھنے جاتا ہوں یہ سودا کیا ہے

تیر سینے میں نہیں، پھانس کلیجے میں نہیں
پھر خلش کیسی ہے، یہ دل میں کھٹکتا کیا ہے

تم رہو غیر رہے، تم کو مبارک عشرت
ہم چلے جائیں گے محفل سے ہمارا کیا ہے

اللہ رے خوئے شوخ الٹ کر نقاب آپ
لینا صبا کا نام بگڑ کر عتاب سے

ساماں نئے نئے ہوں شبِ وصلِ یار میں
مے ابر سے برستی ہو جام آفتاب سے

عیش کی رات مقدر سے اگر ہوتی ہے
بات کرنے نہیں پاتے کہ سحر ہوتی ہے

حسنِ زیبا لاکھ نظروں سے چھپاتے جایئے
اور کھلتا جائے گا جتنا چھپاتے جایئے

تجھسے ملنے کو وہ آتے ہیں کھلے تیرے نصیب
مژدہ ہو اے دلِ بیمار قیامت آئی

اس کو اغماض کہ پیکاں کو نہ ضائع کیجے
یاں جگر تشنۂ بیداد نشانی مانگے

ہائے راقم نہ رہے حضرتِ غالب سر پر
قدر فرزند کی ہوتی ہے پدر کے ہوتے

برسوں گذر گئے یہی سنتے کہ آؤ گے
وعدوں کی انتہا ہے نہ حد انتظار کی

وصل ہویا اور ساماں کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور
آرزوئے عاشق دلگیر کچھ کہتی تو ہے

رات سے مضطرب ہے دلِ راقم
دیکھیے آیا یہ بے قرار کسے

ڈھونڈھا کئے جہاں میں کوئی باوفا ملے
جتنے ملے ہیں وہ غرض آشنا ملے

مقتل میں آج آؤ چھری سے گلا ملے
اُلفت کا امتحاں ہو جفا سے وفا ملے

اِک ہم ہیں بے نصیب کہ دشنام بھی نہیں
اک وہ ہیں جنکو بوسہ بغیر التجا ملے

ہونیکو ہے شاید کوئی سامان خدا ساز
جو شام سے ہی اور ہی رونق ہے گھر کی

واعظ ڈرا نہ تو ہمیں روز حساب سے
کر لینگے توبہ مرنے سے پہلے شراب سے

خضر کو دیجے یارب عمر کی کیوں رائگاں تو نے
کسی عاشق کو دی ہوتی یہ عمر جاوداں تو نے

رام پرشا

رام پرشاد۔ منشی رام پرشاد کائستھ سکسینہ لکھنوی داروغہ سرکار نواب سر محسن الدولہ بہادر نواسہ حضرت غازی الدین حیدر و داماد حضرت محمد علیشاہ۔ بڑے طبّاع، صاحب لیاقت و سلیقہ شعار اہلکار تھے۔ اِنکے آقا کا اعتمادِ کلّی اِن پر تھا۔ اور جُملہ انتظام انھیں کے ہاتھ میں تھا، حسین آباد کے امام باڑے کا بھی (چونکہ نواب صاحب اُسکے متولّی تھے) تمام نظم و نسق سالہا سال اِنکے ہی ہاتھ میں رہا۔ اور تمام متعلّقین اُنکی نیک نیتی اور حسنِ سلوک کے مدّاح رہے ۲۵ برس کے قریب ہوئے انتقال کیا ؛

ہائے اِس جہان سے ہاتھ خالی گھر چلے
بارِ عصیاں مفت ہمنے اپنے سر پر دھر چلے

غور کر کے خوب دیکھا کوئی بھی اپنا نہیں
خوابِ غفلت میں عبث ہم عمر ضائع کر چلے

گو کہ ہوتا ہے وہی لکھا ہے جو تقدیر میں
ہر بشر کو چاہیئے کچھ کام اچھے کر چلے

رام پرشاد اُن کو جنت میں پلا جامِ طہور
تشنہ لب جویاں سے بہرِ ساقیِ کوثر چلے

راوی

راوی۔ صاحب علی خلف منشی اکرام علی ساکن قصبۂ نادون متصل بلگرام۔ مرزا مہدی کوثر کے صاحبِ دیوان شاگرد اور وقتِ ترتیب تذکرہ سراپا سخن زندہ تھے۔

کیونکر نہ باندھوں کھا کے بہ حسنِ جگر کمر
مانی سے کھنچ سکے تری تصویر کس طرح
یہ جوشِ گریہ یادِ کمر میں ہے اندنوں
بد زیب یہ ردیف ہے راوی نہ فکر کر

ملکِ عدم کو باندھ گئے ہمسفر کمر
ہوش و حواس ہوگئے گم دیکھ کر کمر
رویا میں جس جگہ ہوا پانی کمر کمر
ایسے ہی باندھ لائینگے اہلِ ہنر کمر

ربط

ربط منشی دیبی پرشاد خلف منشی موہن لال کایستھ بھٹناگر، عدالتِ دیوانی ضلع مرادآباد میں ۱۸۸۸ء میں پیشکار رہتے اور ملک الشعرا شیخ مہدی علی خان ذکی کے ارشد تلامذہ میں گنے جاتے تھے انکے بھائی منشی کنہیالال بھی شاعر تھے اور ضبط تخلص کرتے تھے۔ تذکرہ شعرائے ہنود سے کچھ کلام انتخاب کیا گیا، بڑے ذکی، فہیم، اور طباع نکتہ سنج تھے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ٭

اجل بھی تو نہیں آتی بُرا ہو سخت جانی کا
یہی ہیں لذتیں تو ہجر یقیں کیا کیا نہ رویئنگے
بہیں وہ نشتر لگیں ہر عضو کو زدیدہ تکتے ہیں
اُٹھا کر آنکھ بھی حوروں کو جنت میں نہ دیکھینگے
نہ پوچھ اے ربط حالِ دل غضب میں جان آئی ہے

الم کبتک اُٹھائیں یار کی نامہربانی کا
اگر یاد آئیگا پیری میں عالم نوجوانی کا
ہوا ہے عشق اُنکو آپ اپنی نوجوانی کا
رہا دھڑکا جو ایسا ہی کسی کی بدگمانی کا
بُرا ہو عشق کا یارب بھلا ہو نوجوانی کا

رباعی

ہر طرح سے آپ تو ستائیں کیا خوب
دیں گالیاں آپ ہم ہنسی میں ٹالیں
ہم شکوہ زبان پر نہ لائیں کیا خوب
اور آپ ہنسی میں روٹھ جائیں کیا خوب

جو مصرع ایک ہی عشوہ تو غمزہ ایک مصرع ہے
جہاں ہے وہ قصیدہ پڑھنا میں حمدِ باری کا
مشابہ ہے مگر اس میں کہاں ہی یہ دل آویزی
ادا و عشوہ، ناز و غمزہ ہیں یہ چار رکن اسکے
اُسی کے ہیں یہ سب نقش و نگار اے ربط کھول آنکھیں

تمہاری شانِ محبوبی عجب دلچسپ مطلع ہے
ازل مطلع ہے جس کا اور ابد جس کا کہ مقطع ہے
ثریا کیا ہے جو کچھ آپ کا جھومر مرصع ہے
قدِ موزونِ جاناں بھی عجب برجستہ مصرع ہے
مصوّر ہے وہ ممدوحِ زماں عالم مرقع ہے

ربط

ربط نواب مظفر علیخان صاحب برادر و تلمیذ حضرت حسان الہند نواب رضوان علی خان رضوان

رئیس مرادآباد انکے بزرگ بڑے صاحب جاہ وثروت تھے، انقلاب زمانہ سے وہ حالت نہیں رہی پھر بھی آسودگی سے بسر اوقات کرتے ہیں، رات دن شعروسخن کا مشغلہ رہتا ہے۔ معمر آدمی ہیں کلام کا انتخاب حاضر ہے۔

مُرادوں کے دن ہیں جوانی کی راتیں
اُمنگوں پہ آیا ہے جوبن کسیکا

لاکھ قرباں کریں ہم تجھ پہ دل و جاں اپنا
تُو نہ ہوگا کبھی غارتگرِ ایماں اپنا

یہ تری زلف پہ وارینگے وہ چہرہ پہ ترے
لائے ہیں نذر کو دل گبر و مسلماں اپنا

رو رو کے یاد آتے ہیں دندانِ یار آج
ہے صبح سے بندھا ہوا اشکوں کا تار آج

لائی شمیم گیسوئے جاناں مگر صبا
کیوں کوڑیوں کے مول ہے مشکِ تتار آج

ہنس ہنس کے وار تیغ کے قاتل نے جو کیئے
زخموں کی بدھی بن گئی پھولوں کا ہار آج

اُٹھا نقاب تو خورشید حشر کا چمکا
جو بکھری زلف تو آئی بلا مرے سر پر

بہار آئی جنوں خیز ہے چمن کی ہوا
رگوں نے کر لیا گھر اپنا نوکِ نشتر پر

ہوا نہ رتبہ شہادت کا ہمکو ربط نصیب
گلا اُٹھا کے رکھا بار بار خنجر پر

لگا دیں آگ تیرے دل میں ظالم
دکھا دیں آہِ سوزاں کا اثر ہم

چمک کر داغِ اُلفت ہیں یہ کہتے
چراغِ طور ہیں شمس و قمر ہم

وہ بلبل ہوں رہا ہوں میں پسند باغباں برسوں
نہالِ عیش پر اپنا رہا ہے آشیاں برسوں

کسی پہلو نہ نکلا میں ترے زندانِ اُلفت سے
لیئے قیدِ محبت نے نہ کیا کیا امتحاں برسوں

صبا نے خاک اُڑائی جستجو میں تیری مدت تک
پھرا برباد موجِ بوئے گل کا کارواں برسوں

چین آتا ہی نہیں دم بھر فراقِ یار میں
کب تلک تڑپا کروں میں یا الٰہی کیا کروں

حلقۂ گیسوئے پُرخم سے رہائی نہ ہوئی
پیچ پر پیچ دیئے زلفِ دوتا نے ہمکو

ربط طاقت تھی رسائی کی ہمیں تا ملکوت
پھینکا اسفل کی طرف مکر و ریا نے ہمکو

اُن پر نظر کرے گی نہ رحمت الٰہ کی
کچھ واعظوں نے قدر نہ جانی گناہ کی

غل ہے کہ ہاتھ ہاتھ کو آتا نہیں نظر　　محشر میں دھوم ہی مرے روزِ سیاہ کی
سب بیگناہ رحمتِ غفار دیکھکر　　حسرت سے شکل تکتے ہیں اہلِ گناہ کی

زمیں چکر میں آتی آسماں زیر و زبر ہوتے　　ہمارے نالہائے دل جو کچھ بھی با اثر ہوتے
ہدف تیرِ ستمگر کے جو دونوں دل جگر ہوتے　　ہجوم شوق کے ساماں ادھر ہوتے اُدھر ہوتے

ترکِ مے سے کیا بُری گت ہو گئی　　توبہ کیا کی ہمنے آفت ہو گئی
جو اضطراب ملیں جو سوزش جگر میں ہے　　سیماب موج میں ہے نہ برق و شرر میں ہے
یوں مفت بہ شوخی نہیں پائی ہے حنا نے　　سینچا ہے اسے مدتوں خونِ شہدا نے
یہ عشق وہ ظالم ہے کہ اللہ بچائے　　برباد کیئے اسنے گھرانے کے گھرانے
چھپ جاؤ گے کیا غیر کے پہلو میں ہاں بھی　　سُنلی کبھی عاشق کی جو محشر میں خدا نے
یا ہمنے سکھائے تھے انھیں حسن کے انداز　　یا ہمکو پڑے ناز حسینوں کے اُٹھانے
لو تیر و کماں ہاتھ میں دل یہ ہے جگر یہ　　ہاں دیکھیں تو تم کیسے اُڑاتے ہو نشانے
ہے کچھ تو جو بلبل سے چٹکنے لگے سب گل　　کیا پھونکدیا کان میں غنچوں کے صبا نے
ابرِ نیساں کی طرح ہجر میں رُلواتی ہے　　یاد تیری دلِ مضطر سے کہیں جاتی ہے
شوخیِ خامۂ بہزاد بھی چکراتی ہے　　رنگ بنکر تری تصویر اُڑی جاتی ہے
جب اُلٹ جاتا ہے گیسو رخِ نورانی سے　　شبِ تاریک میں بجلی سی چمک جاتی ہے

ربط۔ شیخ امام الدین ساکن قصبہ کانٹ ضلع شاہجہانپور۔ کریم بخش فرقت سے سنہ ۱۸۹۴ء سے اصلاح لیتے تھے اُس زمانہ کا کلام پیامِ عاشق سے نقل ہوا۔　　ربط

دہانِ زخم کو یہ آرزو ہے اے سفاک　　نمک چھڑک کے تڑپ کا مزا چکھا دینا
نہ پھر جڑے گا جو ٹوٹا ہمارا شیشۂ دل　　کہیں نظر سے نہ اے سنگدل گرا دینا
سُنا ہے فتنۂ محشر ہے آپکی رفتار　　یہ آرزو ہے کہ چلکر ذرا دکھا دینا
نکلجائے ترا دم ہچکیوں میں مدعا یہ ہے　　اِسی باعث سے تو اے ربط انکو یاد آیا ہے

رحم

رحم - راجہ نیم چند - حیدر آباد دکن کے منصبدار اور باوقار رئیس ہیں، شعر وسخن کا بھی گاہ گاہ مشغلہ ہوجاتا ہے عمر ۳۵ سال کے قریب ہے، بارہا کلام اور حال کے لیئے لکھا مگر جواب نہ آیا ؞

تم نہ سننا کبھی ہیں درد انگیز	دلِ اُمیدوار کی باتیں
ہے لگاوٹ کا یہ نرالا ڈھنگ	ظلم کے ساتھ پیار کی باتیں
اِسی واسطے ناصحا دل بنا ہے	خطا کیا ہوئی گر کسیکو دیا ہے

رحمٰن

رحمٰن - محمد عبد الرحمن خان مرحوم رحمٰن تخلص ۸ر جون ۱۸۵۷ء کو فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس تک تعلیم پائی سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں پہلے منصرم ججی خفیفہ ڈیرہ دون ہوئے پھر ۱۹۰۵ء میں ڈیرہ دون سے بعہدۂ مترجم ججی فرخ آباد کو تبادلہ ہوا۔ اور یہاں بعارضۂ تپ دق ۱۴ ستمبر ۱۹۰۶ء کو انتقال فرمایا۔ ناول نویس بھی تھے، حکام نے خوش ہوکر آپکے لئے تحصیلداری کی سفارش کی مگر حیات نے وفا نہ کی۔ فن بنوٹ کے کامل اُستاد تھے، فقیروں سے خاص ارادت تھی ایک کتاب وظائفِ رحمانی لکھی تھی جس میں عملیات وغیرہ درج ہیں۔ اخبار ونکی نامہ نگاری بھی کی آپکے دو صاحبزادے بھی موجود ہیں ایک جدت اور دوسرے فطرت تخلص کرتے ہیں۔ اُنھوں نے آپکی چند غزلیات بھیجیں جن کا انتخاب درجِ ذیل ہے۔

ماہ کامل سے جبیں کو ترے اچھا دیکھا	رشکِ خورشید منور رُخِ زیبا دیکھا
رات کے آنیکو کہتا ہوں تو وہ کہتے ہیں	شب کو خورشید کہیں تمنے نکلتے دیکھا
بارِ احسان سے جرّاح کے چھوٹا صد شکر	دلِ مجروح میں ناسور رہا خوب ہوا
کسیکی نوکِ مژہ کے نشتر لگے ہوئے ہیں ہزاروں پر	بہا ہے حسرت کا خون ہوکر میں غرق خنجر کی آب میں ہوں
یا الٰہی وہ رہے فرمانروائے ملکِ حُسن	کشورِ دل کی ہمارے جس سے ویرانی ہوئی
دست بستہ جب کہا کچھ عرض کرنا ہے حضور	ہنسکے بولے کیا کہوگے بات ہی جانی ہوئی
مسّی محرم۔ بند ٹوٹے نیلگوں رخسار ہیں	غیر کے گھر آپ کی کیا خوب مہمانی ہوئی
بہ گیا آنکھوں کا سرمہ لاکھا ہونٹوں سے اُڑا	آئینہ دیکھا تو سخت اُنکو پشیمانی ہوئی

رات کی باتوں کا جب اُن سے کیا کچھ تذکرہ
اُٹھ گئے شرما کے کچھ ایسی پشیمانی ہوئی

باغ میں پھول سے رخسار دکھا کے تم نے
گل و بلبل کا کیا خون لڑا کے تم نے

آنکھوں میں سُرمہ کا دنبالہ غضب ڈھاتا ہے
پر لگائے ہیں نئے تیر قضا کے تم نے

اچپلاہٹ میں ہی سیکھ گئے اہل شباب
ڈھنگ سیکھے نئے شوخی میں حیا کے تم نے

یاد آئی ہے تھیں گرمیٔ صحبت کس کی
کس لئے کھول دیئے بند قبا کے تم نے

کاٹ دی شاخ طرب مرغ دل سے میرے
لُطف دیکھے نہ ذرا نشو و نما کے تم نے

دیکھئے جسکو وہ پڑھتا ہے تمھارا کلمہ
کیا سکھایا ہے یہ بندوں کو خدا کے تم نے

رحمٰن

رحمٰن۔ منشی ضیاء الرحمن شاگرد معجز بریلوی۔ قاضی محمد خلیل صاحب کے مشاعرے کی غزل سے چند شعر درج ہیں * جوان آدمی ہیں اور یہ کلام ہے ۔

جسے کہتے ہو تیر آہ دنیا سے نرالا ہے
یہ جسکے دل سے نکلا ہے اُسی کے دلمیں بیٹھا ہے

نہ جاؤ اُسکی بالیں سے کوئی حسرت نہ رہ جائے
تمھارے سامنے ہی دم نکل جائے تو اچھا ہے

بُرا تم جسکو کہتے ہو وہ اچھا ہو نہیں سکتا
جسے کہتے ہو تم اچھا بُرا بھی ہو تو اچھا ہے

رحمت

رحمت۔ رحمت علی رحمت قرابتدار و شاگرد امام بخش صہبائی۔ مثنوی نالۂ بلبل۔ حدائقہ رحمت و مثنوی شکایتِ فلک، اِن سے یادگار ہیں۔ فارسی شعر بھی کہتے تھے۔ کتب درسیہ و رسائل عروض کو بہت تحقیق و تدقیق سے پڑھا تھا۔ عرصہ ہوا انتقال کیا۔ یہ چند شعر اُنکے طبعزاد ہیں۔

دِل ہے بیتاب بہت شوخیٔ جاناں کی قسم
ہدفِ تیر ہے جاں کاوشِ مژگاں کی قسم

طعنے اب تک ہیں کہ رُخ کی مرے کیا قدر تھیں
میں نے اک روز کہیں کھائی تھی قرآں کی قسم

تھا غمزہ تیز مے سے ہُوا اور تیز تر
بُرش میں تیغ کی ہے بہت دخل آپ کو

رحمت یہ عمر اور ورع خیر ہے تجھے
بٹّا تو کیوں لگائے ہے عہدِ شباب کو

ابر بہار کی سی مجھے چشم تر ملے
جوں برقِ مضطرب مجھے یارب جگر ملے

تیرا ہی کچھ یہ طور نرالا جہان سے ہے
ورنہ یہ رسم ہے کہ بشر سے بشر ملے

رحمت

رحمت پنڈت گنگا پرشاد ولد پنڈت موتی لال کشمیری لکھنوی شاگرد حضرت امانت سنہ ۱۲۶۹ھ میں بروقت ترتیب تذکرہ سراپا سخن انکا عالم شباب تھا عرصہ ہوا قضا کرگئے۔ کلام ملاحظہ ہو:-

ہم رند کس طرح نہ دعا دیں اُٹھا کے ہاتھ
دیتا ہے جام پینے کو ساقی بڑھا کے ہاتھ

ملتا ہوں غم سے ہیں کفِ افسوس راہ میں
چلتے ہیں ساتھ غیر کے جب وہ ملا کے ہاتھ

اے غیرتِ مسیح ترا عشق لے گا جان
ہے موت میری اِس مرضِ لادوا کے ہاتھ

رحمت خوشی سے پاؤں نہ پھیلاؤں کس طرح
دیکھوں گلے میں اپنے جو اُس مہ لقا کے ہاتھ

رحمت

رحمت حکیم حافظ محمد رحمت اللہ رحمت باشندۂ بنارس اوائل مشق میں برسوں خلیل الدین حسن طاہر بنارسی سے اصلاح لیتے رہے پھر جب سنہ ۱۸۹۸ء میں حضرت داغ حضور نظام کے ہمراہ بنارس گئے اُنکی خدمت میں حاضر ہوکر شرف تلمذ حاصل کیا۔ بڑے پُرگو کہنے والے ہیں کچھ تلامذہ بھی کرلیے ہیں، دیوانِ غیر مطبوعہ تیار ہے، شعر گوئی میں اچھی مہارت ہے۔ صفائی مضمون اور زبان کا خیال رکھتے ہیں، بندش بھی چست ہے، تعقید سے بھی احتراز کرتے ہیں الغرض بدرجہ اوسط تمام خوبیاں انکے کلام میں موجود ہیں۔

ہے اہلِ حشر کو بھی قصد کیا لُبھانے کا
کیا جو وعدہ قیامت میں مُنہ دکھانیکا

ایک ہی جلوہ میں غش کھا کے گرے تم رحمت
کونسی بات یہ تھی دل کو سنبھالا ہوتا

میرے پہلو سے وہ اُٹھ کر چلدیئے
اور کیا بتیائی دِل سے مِلا

ہائے اب دِل کھو کے پچھتاتا ہوں میں
کیوں کسی زہرہ شمائل سے مِلا

ہو نہو اس میں بھی کوئی چال ہے
وہ نہ جانے ہم سے کس دل سے ملا

لیکے آئے داغِ حسرت دل میں ہم
خوب تمغہ اُن کی محفل سے مِلا

دوست دشمن کو پرکھیئے تو سہی
کون کس دل کون کس دل سے مِلا

حق کا مِلنا تو بہت آسان ہے
آدمی البتّہ مشکل سے مِلا

جان کردوں اُنکے قدموں پر فدا
جب وہ سمجھیں گے کہ یہ دل سے مِلا

تو نہیں ملتا جو مجھ سے کیا ہوا
نیر تو تیرا مرے دل سے ملا

بے وفا مشہور عالم میں ہوئے
بس یہ ہمت کو عہد باطل سے ملا

اب ہے رحمت ہاتھ دل پر کس لیے
اور آنکھیں شوخ قاتل سے ملا

تیغ کھنچکر رہ گئی خنجر نکل کر رہگیا
آج قاتل مجھ پہ کیوں تیور بدل کر رہگیا

دل سے کہتے تھے نہ کر ضبط فغاں مانا نہیں
آپ اپنی آگ میں کمبخت جل کر رہگیا

سچ بتا اے شمع محفل کس لیے روتی ہے تو
یہ پڑی ہے راکھ کس کی کون جل کر رہگیا

جب اٹھائی یار نے روئے منور سے نقاب
کوئی غش کھا کر گرا کوئی سنبھل کر رہگیا

پا گیا اچھی جگہ لیتا نہیں جانے کا نام
دل مرا مٹھی میں اس بت کی مچل کر رہگیا

وحشت دل! مجھے گھر جانے دے
اے جنوں چھوڑ دے داماں میرا

کیا کہوں دل کے عوض کیا یہ صنم دیتے ہیں
رنج دیتے ہیں، الم دیتے ہیں غم دیتے ہیں

ہوا ہے دامن دل پرزے پرزے
کسی سے چاک یہ کیونکر سیئے جائیں

تری تصویر گر دیکھیں تو ہو وہ بیخودی طاری
نہ آئیں ہوش میں حوران فردوس بریں برسوں

وقت زینت چھیڑنے پر میرے ہو ہو کر خفا
ہائے یہ کہنا کہ کیا بال سلجھانے بھی دو

دل جگر مائل ہیں دونوں اسکی چشم مست پر
لطف ہی میکش بھی دو ہیں اور میخانے بھی دو

حیا کیا کام ہے خلوت میں تیرا
ترا اس وقت میں آنا ستم ہے

عجب حال ہے اس دل مضطرب کا
یہی رہنما ہے یہی راہ زن بھی

قیامت کے اے بت ہیں انداز تیرے
فدا جن پہ ہیں شیخ بھی برہمن بھی

موسم گل ہے یہ حسرت ہے مجھے اے ساقی
توبہ توڑوں ترے ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

یقیں تیری باتوں کا کیونکر نہ کیجے
کہ برسوں سے وعدہ وفا ہو رہا ہے

بے طرح آج تم سنورتے ہو
ہیں ارادے کہاں کے جلانے کے

درد سینے میں لب پہ آہ و فغاں
یہ نتیجے ہیں دل لگانے کے

بتاؤ تو مہری یا مدعی کی
جو دل سے دوست نے بھی دشمنی کی
زمانے کے ہوئے ارمان پورے
کہو تو کیا یہی لازم تھا تمکو
وہ مہر وفاتحہ پڑھنے جو آیا
عدو سے حالِ دل خود کہہ رہا ہوں
سنبھالے دلکو اپنے خاک ناصح
کہو تو کیوں سہے یہ بنا سنورنا
خدا کی یاد بھی کچھ کرلو رحمت
عدو کے نام سے انکو پیام بھیجا ہے

بتو تمکو بھی اُلفت ہے کسی کی
کوئی اُمید رکھے کیا کسی کی
مگر نکلی نہ حسرت میرے جی کی
ہمارے دشمنوں سے دوستی کی
چڑھی مرقد پہ چادر چاندنی کی
برسی ہوتی ہے حالت بیخودی کی
طبیعت ہو جو بے قابو کسی کی
مریجاں جان لوگے کیا کسی کی
بہت تم نے بتوں کی بندگی کی
جو لگ گئے تو مزا ہوگا دل لگی ہوگی

یہاں کے مرنے والے بھی فرماتے ہیں جینے کا
محشر کا نمونہ وہ بتِ ہوش ربا ہے
یعنی تو ہر اک شخص کی جاں اسکی ادا ہے

کہیں فردوس سے بڑھکر زمینِ کوئے قاتل ہے
انداز قیامت کے ہیں قیامت کی ادا ہے
بدنام مگر مفت زمانے میں قضا ہے

رحمت محمد رحمت اللہ خلف حافظ محمد عبد اللہ خاص بلند شہر کے متوسط الحال باشندوں میں سے ہیں عمر تقریبًا ۲۸ سال ہے مذاقِ شعر اگرچہ جدید ہے مگر دو چار سال ہی کی کثرتِ مشق نے قریبًا پرگو کردیا ہے منشی سید محمد ناظر حسین صاحب ناظر سکندر آبادی ملازم ریاست ٹونک کے شاگرد ہیں اور مدرسۂ اسلامیہ بلند شہر میں مدرس ہیں۔ کلام درج تذکرہ ہے +

جو آئی تیرے آنیسے وہی رونق تھی محفل کی
ستمگر مجھ سے لیکر کیوں اسے پامال کرڈالا
دلِ ناشاد کی میرے نہ سمجھی قدر کچھ تم نے
اک لفظِ کن نے کی ہی معمور بزمِ عشرت

اُڑا جو تیرے جانے سے وہی تو رنگِ محفل تھا
بڑے نازوں کا پروردہ یہ مجھ ناشاد کا دل تھا
یہ گلدستہ نظر کے سامنے رکھنے کے قابل تھا
دو حرف سے ہے ظاہر سب کچھ کمال تیرا

سبزۂ خط ہو چلا آغاز کیوں حیراں ہو تم
پیٹھنے والا ہے اب ہالے کے اندر آفتاب

اِسکے سایہ سے بچا نا چور ہے لے باغبان
صاف اُڑا لیجائے گا رنگِ گُلِ تر آفتاب

ہو کے کاہیدہ ہنے اندوہ سے شکلِ ہلال
یار کے بدلے ہوئے تیور جو دیکھے آفتاب

ہوش و حواس کیا ہوئے عشاق سے نہ پوچھ
بیخود ہوئے ہیں جلوۂ دیدار دیکھکر

دلمیں کھٹک رہا ہے سرِ خارِ آرزو
اسکو نکال دیجئے بہت بیقرار ہوں

کہا جب آپ ابتو آفتِ جاں ہوتے جاتے ہیں
تو فوراً ہنسکے فرمایا کہ ہاں ہاں ہوتے جاتے ہیں

غضب کرتے ہو تم اُبھرا ہوا جوبن دکھاتے ہو
دلِ رحمت میں پیدا اور ارماں ہوتے جاتے ہیں

جوبن اُبھر کے کہتا ہے اُنکا شباب میں
تم لاکھ رکھو میں نہ رہوں گا حجاب میں

کرتے ہو آج شیخ جی ہمکو نصیحتیں
کیا کیا کیا نہ ہوگا تمھیں نے شباب میں

جہاں میں رسمِ سحر اُس آنکھ کے کاجل سے نکلیگی
یہ عالمگیر ظلمت نور کی مشعل سے نکلیگی

یوں چاند سے تو بڑھکے ہیں یوں اُس سے سوا ہے
اُس میں کوئی انداز نہیں تجھ میں ادا ہے

اقرار یہ تم وصل کا کرتے تو ہو لیکن
مانع نہ ہو وہ شرم سے بھی پوچھ لیا ہے

جب اُن سے کہا لینے دو زلفوں کی بلائیں
کس ناز سے بولے کوئی دیوانہ ہوا ہے

کیا پوچھتے ہو عشق میں مشہور ہے رحمت
ہاں جان بھی دیدیگا وہ۔ دل دے ہی دیا ہے

رحمت

رحمت تخلص نام تاریخی ظفر علی مشہور محمد رحمت اللہ خلف شیخ عبداللہ خان نقشہ نویس میرٹھ اصلی وطن ابتدائی تعلیم و تربیت دلّی میں پائی۔ عربی فارسی بقدر ضرورت مولوی شاہ محمد عبدالحکیم صاحب صدیقی المتخلص بہ جوشؔ حکیم سے پڑھیں اور انھیں سے فن شعر میں تلمذ حاصل کیا شعر میں روزمرّہ کے دلی جذبہ کا مطلب بآسانی ادا کر لیتے ہیں پہلے میونسپل بورڈ غازی آباد میں کلرک تھے فی الحال ایکاؤنٹنٹ آفس میرٹھ میں ہیڈ کلرک ہیں انتخاب کلام یہ ہے۔

اِدھر پہلو سے وہ اُٹھا اُدھر پہلو میں درد اُٹھا
جفا پیشہ جسے سمجھے تھے وہ آرامِ جاں نکلا

ہوا گھٹ گھٹ کے دلمیں خون ارمان و تمنّا کا
نتیجہ تجھ سے گر نکلا تو یہ ضبطِ فغاں نکلا

دن کو رو رو کے روز شام کیا
کام کا پر نہ کوئی کام کیا

حیف دو روزہ زندگی کے لئے
ہمنے کیا کیا نہ اہتمام کیا

یہ تو کہئے کہ آپنے رحمت
کچھ وہاں کا بھی انتظام کیا

ستارا اوج پہ ہی بخت ہے رسا دل کا
کہ آج پوچھتا ہے حال بے وفا دل کا

نہ مجھسے ملتے نہ سہتے اذیتیں شب و روز
بُرا کیا جو کہا ہمنے کر دیا دل کا

وہ آئے بھی تو خفا بیٹھے بھی تو چین بجبیں
بہار میں بھی نہ غنچہ مرا کھِلا دل کا

یہ کیا خبر تھی کہ ہو جائے گا وہ بد ظن اور
بُرا کیا جو کہا اُس سے ماجرا دل کا

خدا جانے وہاں پر ہے وہ کیا سامان دلچسپی
کہ آتا ہی نہیں واپس گیا شہر خموشاں کا

کون کہتا ہے کہ وہ دل لیگیا دل لے گیا
دل تو ہے پہلو میں پر کیا جانے کیا جاتا رہا

عشق میں اُس چشم میگوں کے بہت بہکے تھے ہم
تُرش رو جب وہ ہوا سارا نشہ جاتا رہا

خوب ہم روئے اپنی مستی پر | قہقہہ سنکے رات بلبل کا
بیفائدہ کرتا ہے یہ تعریف جنا کی | واعظ نے بھی کچھ جہاں نہیں دیکھا

سب سے موافقت کریں اپنا یہ فرض عین ہے
لائے کسی کو رو برو دور زمان کو کیا غرض

آپکو جب مٹا دیا جیتے ہی جی۔ تو بعدِ مرگ
سنگ لحد لگائیں کیوں نام و نشاں کو کیا غرض

یار کے بزم عیش میں بار ملے۔ تو کس لیئے
چھوڑ کے سنگِ آستاں جائیں جناں کو کیا غرض

جبکہ بہارِ باغِ عمر رہگذرِ فنا میں ہو
نکلے چلے تباؤ کیوں باد خزاں کو کیا غرض

جہاں کی عارضی راحت کا کھل گیا عقدہ
ہنسی کے ساتھ جو آنسو بھر آئے آنکھوں میں

دردِ مرضِ عشق جو ٹلجائے تو جانیں
یہ پھانس کلیجے سے نکلجائے تو جانیں

دشوار ہے اُس زلف کے پھندے سے نکلنا
سر سے یہ بلا اپنے جو ٹلجائے تو جانیں

کر فصلِ بہاری میں کرم اتنا تو صیاد
لٹکا دے قفس ہی کو مرے صحنِ چمن میں

دونوں میں ایک نور کا پرتو ہے جلوہ گر
اپنے حساب ذرّہ ہو یا آفتاب ہو

مقتل میں تشنہ کام شہادت ہوں شوق سے
قاتل پلا دے گر ترے خنجر میں آب ہو

کہاں سے لاؤں لتنے دِل خدایا	ادا ہر ایک اُسکی دلستاں ہے
بگڑنے کا سبب پوچھا تو بولے	ہمیں چاہا یہ کچھ تھوڑی خطا کی
ایک ہی پردہ سرکے اُٹھنے سے ہوئے بیخود کلیم	سامنے بے پردہ وہ آئے تو کیا ہونے لگے

رحمت

رحمت منشی محمد رحمت اللہ رحمۃ اللہ برادر خورد میر نادر علی برترؔ غازی پوری شاگرد رشید حضرت ظہیرؔ دہلوی، حالات باوجود کوشش نہیں ملے مجبوراً صرف کلام درج کر دیا گیا ✣

آئے ہیں دن شباب کے رحمت کیواسطے	اِسکو اُٹھا رکھو نہ قیامت کیواسطے
جنت سے کیا غرض ہمیں کوچہ ہیں آپکے	دو گز زمین مل گئی تربت کیواسطے
گل شمع کے اُدھر ہیں اِدھر داغ دِل مرے	اچھی بہار آئی ہی تربت کیواسطے
پورا ہوا نہ وعدہ فردا کسی طرح	کیا کیا دِلائے اُنکو قیامت کیواسطے
بولے وہ عرضِ حال پہ جھنجھلا کے اِسطرح	نہ کر رکھو اسے تو قیامت کیواسطے
یارب بتوں کو رحم بھی دینا ضرور تھا	سیرت بھی ہونی چاہیئے صورت کیواسطے
رحمت کسی کے نقشِ قدم کو نہ چھوڑنا	تعویذ کوئی چاہیئے تربت کیواسطے

رحمت

رحمت - مولوی رحمت علی صاحب فرسٹ اورنیٹل ٹیچر مدرسۂ سرکاری ڈیرہ غازیخان دَور موجودہ کے شاعر اور بڑے زود فکر اور پُرگو ہیں ابتدائی چند غزلیں حضرتِ داغؔ مرحوم کو دکھائی تھیں مگر ہنوز مشقِ سخن پختگی کو نہ پہونچی تھی کہ اُنکا انتقال ہو گیا - اُس وقت سے بطور خود کہتے ہیں زیادہ تر طرز جدید میں طبع آزمائی کرتے ہیں، کلام رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے چالیس پچاس برس کا سن ہے، ایک ضخیم مثنوی موسومہ "وفائے رحمت" بطور تاریخ ہندوستان و انگلستان جشن تاجپوشی کی تہنیت میں شائع کرا چکے ہیں اُس سے اِنکی کثرتِ مشق کا اندازہ ہو سکتا ہے شعر کا مذاق بھی بُرا نہیں - جو کلام ہم پہنچا اُس کا انتخاب درج ذیل ہے -

ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستان ہمارا	کہنے کی بات ہی یہ ہے یہ کہاں ہمارا
رہتے ہیں اُوس میں یوں پردیس میں ہیں گویا	ہے یہ زمیں ہماری نے آسمان ہمارا

جو زندگی میں اپنی آیا نہ کام یارو! — کیا قبر پر وہ ہوگا پھر نوحہ خواں ہمارا
ہوتی مغائرت کم جو اک زبان ہوتی — شاید بنے وسیلہ اُردو زباں ہمارا
ہم جان جانتے ہیں تم غیر جانتے ہو — حالانکہ جانتا ہے تم کو جہاں ہمارا

قطعہ

ایک کے ہیں تو ایک ہو جائیں — ایک ہی کے جہاں ہیں دونوں
نہ سہی رشتہ یہ تو رشتہ ہے — ایک گھر میہمان ہیں دونوں
رستے دو ہیں الگ مکینوں کے — اک گلی میں مکان ہیں دونوں
وہ ہمارے نہ اُنکے ہم گویا — بیکسی کے نشان ہیں دونوں
کر کے باہم لڑائیاں جھگڑے — ہوگئے ناتواں ہیں دونوں
پیس ڈالیں گے پاٹ چکی کے — یہ زمیں آسمان ہیں دونوں
گو رہیں دور راز تو اک ہو — جیسے دل اور زباں ہیں دونوں
آئیں آپس میں فیصلہ کر لیں — مفت کیوں دیتے جاں ہیں دونوں
مل کے ہم دونوں یک جاں ہوں اگر — پھر تو اپنے جہان ہیں دونوں

رحمتی

رحمتی۔ کنور سکھراج بہادر رئیس اعظم و میونسپل کمشنر عظیم آباد و پٹنہ۔ کنور صاحب موصوف کنور ہیرالال صاحب ضمیر مرحوم خلف الصدق راجہ پیارے لال اُلفتی دہلوی کے فرزند رشید تھے شعر و سخن سے طبیعت کو لگاؤ تھا آپنے سنہ ۱۸۷۰-۸ء متعدد مشاعرہ پٹنہ میں کیئے۔ ذی مروت صاحب اخلاق اور لیبق رئیس تھے اور شعراء کے بڑے قدر دان تھے، اُردو و فارسی دونوں زبانوں میں مشق سخن کرتے تھے۔ کنور صاحب موصوف کے دادا راجہ پیارے لال جو قوم کے کایستھ تھے شاہ عالم ثانی کے عہد میں دہلی چھوڑ کر عظیم آباد میں قیام پذیر ہوئے تھے، عرصہ ہوا انتقال کر گئے، اِنکے کلام کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

جب آپ ہی کو پاس نہیں رسم و راہ کا — کیا فائدہ جو ہو بھی ارادہ نباہ کا
جب سلسلہ جنباں یہ تری زلف سیاہ ہو — عاشق ترا کس طرح نہ زنجیر بپا ہو

دکھا کر وہ گئے ہیں جیسے اپنی زلفِ شبگوں کو
بلائیں آرہی ہیں میرے سر پر دیکھتے جاؤ

کرنے کے لیئے دعائے قاتل
زخموں کا کھلا دہن ہمیشہ

رحیم - مرزا رحیم بیگ رحیم شاہ جہان آبادی الاصل ولد میرزا امیر بیگ، سردھنے میں رہتے تھے۔ حکیم بوعلی خاں کے طب میں اور محمد بخش ناداں کے شعر و سخن میں شاگرد تھے پہلے شرر تخلص تھا۔ ۱۲۷۰ ہجری میں حسب فرمایش حکیم احسن اللہ خاں قصص الانبیا کو نظم کیا تھا ۱۲۷۷ھ ابیں حیات تھے شعر و سخن کا مذاق شستہ تھا فارسی شعر بھی خوب کہتے تھے - چند غزلوں کا انتخاب درج ذیل ہے

دو دل ہیں کس کسکو کہ اک جان کے خواہاں ہیں بہت
غم جُدا، فکر جُدا، درد جُدا، یار جُدا

خدا جانے کہ وقتِ ذبح کیا اندازِ قاتل تھا
کہ نعرہ ہے لب ہر زخم سے اللہ اکبر کا

جو لکھتا ہوں بیاں اپنے دلِ بیتاب و مضطر کا
تڑپتا ہے ہر تارِ نبضِ عاشق تارِ مسطر کا

بل بے گرمی آبلوں کی آب کیا تیزاب تھا
پاؤں پڑتے ہی مرا خارِ بیاباں جل گیا

کہنے ہی کی بات ہے کہنے دو لائے تو کوئی
مجھسا عاشق دیکھکر، معشوق تم سا دیکھکر

پسِ مردن بھی ہم بار ندامت لیچلے سر پر
کہ اُڑ کے خون کے چھینٹے پڑے دامانِ قاتل پر

ابتک تو ہجر میں ہیں فقط تن پہ کھائے گل
تقدیر دیکھیں آگے کو کیا کیا کھلائے گل

ایک سینہ ہے روکے کس کسکو
تبر کو، تیغ کو، کہ خنجر، کو

رحیم - محمد عبد الرحیم خاں رحیم باشندہ پٹنہ حضرت داغ دہلوی سے اصلاح لیتے تھے اور پندرہ سولہ سال ہوئے اجمیر کے آڈٹ آفس میں اکونٹنٹ تھے۔ اُسکے بعد کا کچھ حال معلوم نہ ہوا۔

پڑ گیا شاید کچھ اُس پر میری قسمت کا اثر
ہے دگرگوں رنگ ہر دم عالمِ ایجاد کا

آج پھر وعدہ کیا ہے وصل کا کل کیطرح
دیکھیئے اللہ مالک اب ہے اُنکی یاد کا

شاعری کو فخر حاصل ہے جنابِ داغ سے
مدعی پڑھنے لگے کلمہ مرے اُستاد کا

اُنکو جب مجھ سے کچھ نہیں مطلب
پھر وہ کیوں امتحان لیتے ہیں

اُنکا اک کھیل ہے اعجازِ مسیحا کیسا
بات کی بات میں مُردے کو جلا دیتے ہیں

نیک بندے ہیں خدا کے آپ تو ۔۔۔ شیخ صاحب آپ کی کیا بات ہے

جگر پہ تیر لگانا جتا جتا کے مجھے ۔۔۔ ستم کے کرتے ہیں آپ ہیں کچھ جفا کے مجھے

تمام عمر اُٹھاؤں نہ میں جبین نیاز ۔۔۔ ملیں نشان اگر تیرے نقش پا کے مجھے

نہیں بیوجہ وہ مجھ سے کھنچے ہیں ۔۔۔ عدو نے کچھ نہ کچھ اُن سے جڑی ہے

رحیم

رحیم منشی بھگوخان خلف بہاری خان رئیس [illegible] ضلع فتح گڑھ ۱۸۸۶ء میں قصبۂ قنوج سے انھوں نے ایک شعر و سخن کا گلدستہ پیام عاشق نامی جاری کیا جس میں گرد و نواح کے شعرا کے علاوہ کبھی کبھی اُساتذہ کا کلام بھی درج ہوتا تھا عطر کا کارخانہ بھی اُنکے ساتھ تھا۔ دس بارہ برس جاری رہکر وہ رسالہ بند ہوگیا طبیعت دار شخص تھے زیادہ حال معلوم نہ ہوسکا۔ کلام یہ ہے

اگر پاکباز آئینہ ہے تو کیا ہے ۔۔۔ ترے پاس مطلب ہی کیا ہے کسی کا

تم اپنے ہاتھوں سے بدنام خود ہی ہوتے ہو ۔۔۔ یہ کیا کہ نام مرا اُن کے سر جھکا دینا

ہماری موت کو بھی ہائے نیند سمجھے ہیں ۔۔۔ وہ بھولے پن سے یہ بولے اسے جگا دینا

لال غصہ میں جو اب ہے رخ جاناں کب تھا ۔۔۔ چاند تھا چودھویں کا مہر درخشاں کب تھا

آتے آتے رہگیا وہ مہ جبیں بالائے بام ۔۔۔ کیا چمک کر رہگیا اختر مری تقدیر کا

ایک بوسہ کا ہوں طالب لف کا ہوں شیفتہ ۔۔۔ سمجھے اب مطلب مری اُلجھی ہوئی تقریر کا

دل بہلنے کا نہیں حوران جنت میں رحیم ۔۔۔ مرگئے پر بھی تصور ہے بت بے پیر کا

نگہ پھیرو نہ اُلفت کو بڑھا کر ۔۔۔ گلا کاٹو نہ یوں ملکر کسی کا

ایک کروٹ بھی نہ بدلی صبح تک اللہ ری نیند ۔۔۔ آپ کا سونا مگر میرا مقدر ہوگیا

ضعف سے جان بھی اپنی ہو گرانبار مجھے ۔۔۔ بوجھ ہے سینکڑوں من کا بدن زار مجھے

آنکھ کمبخت سے ڈر رہتا ہے ہر بار مجھے ۔۔۔ کہیں رسوا نکرے حسرت دیدار مجھے

تو مری جان ہے اور جان ہے ہر اک کو عزیز ۔۔۔ کوسنا اب نہ خبردار خبردار مجھے

جب کہا میں نے اُٹھائے نہیں جاتے ہیں ستم ۔۔۔ بولے جھنجھلا کے تو پھر کرتے ہو کیوں پیار مجھے

وہ مجھ سے کہتے ہیں غصہ میں جان جائے تری	میں کہہ رہا ہوں مگر جان تو ہے تو میری
روٹھ کر چل تو دیئے ہیں مگر اب حال یہ ہے	راہ تکتے ہیں کہ پھر ہم کو بلائے کوئی

رحیم

رحیم منشی رحیم بخش ٹھیکہ دار انار کلی لاہور۔ آپ کو حضرت بیان و یزدانی رئیس میرٹھ کے فیض صحبت سے شعر و سخن کا شوق ہوا، اور انھیں کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ۱۸۹۵ء میں لاہور کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ کلام کا خلاصہ ہے۔

پروانہ میرے جلنے کی اُس شمع رو نے کی	کیا موم دل تھی شمع دل اُس کا پگھل گیا
گلزار آگ کیسے ہوئی تھی خلیل پر	دل اپنا کیسے آتشِ ہجراں سے جل گیا
بہارستانِ داغِ دل ہے موسم تیر باراں کا	گلِ داغِ جگر پھر کھل رہا ہے غنچہ پیکاں کا
نہ سیکھا ڈھنگ اب تک نالہائے گرم کا میرے	سبق گو میں نے بلبل کو دیا برسوں گلستاں کا
ہوں وہ عاصی کہ ہے فیض ایک جہاں پر اپنا	ابر رحمت ہوا دامن جو ہوا تر اپنا
گو ترے عشق میں غارت ہوا برباد ہوا	نہ ہوا پر نہ ہوا دل میں ترے گھر اپنا
خوف ہے گرمیٔ خورشید قیامت کا کسے	تیرے دیوار کے سایہ میں ہے بستر اپنا
زندگی بھر جہاں میں ہے بشر کی ایسی	بلبلا پانی میں جس طرح اُٹھا بیٹھ گیا
پھول نقشِ پا ہوئے جب وہ خراماں ہو گیا	جس روش پر وہ چلا رستہ گلستاں ہو گیا
داغِ دل گل بن گئے سینہ گلستاں ہو گیا	شاخ ناوک ہو گیا اور غنچہ پیکاں ہو گیا
مر گئے ہیں ہم خیالِ دیدۂ مخمور میں	چاہیئے تربت ہماری سایۂ انگور میں
ایک موسیٰ تھا وہاں یاں سینکڑوں غش ہو گئے	ہے تفاوت شمع رُو میں اور چراغِ طور میں
ہیں ہوں یا زاہد ہو دونوں ایک ہی سے ہیں تباہ	ہیں فراقِ یار میں اور وہ فراقِ حور میں

رحیم

رحیم۔ مولوی سید محمد عبد الرحیم شاہ خلفِ مولوی سید حبیب اللہ شاہ نام کنچھپورہ وطن بہ تقضائے شوق طبعی صاحبِ دیوان اور کلام میں جا بجا مذاقِ سلیم کی جھلک پائی جاتی ہے، چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

رتبہ اپنا اب زمیں پر آسماں سے کم نہیں
دل میں نقش کھنچ گیا ہے چاند سی تصویر کا

شبِ ہجراں کو موت آئے تو روزِ وصل پیدا ہو
الم نکلے تو رستہ ہو خوشی کے دل میں آنیکا

بام پر ہمنے رُخِ یار کا جلوہ دیکھا
سحر آنکھوں کا نگاہوں کا کرشمہ دیکھا

چشم تر، خاک بسر، چاک گریباں دل زار
عشق کا ہم نے یہ دنیا میں نتیجہ دیکھا

اب ڈھٹائی سے مکرنے کا نتیجہ کیا ہے
دلکو مٹھی میں چھپا رکھا ہے دیکھا دیکھا

وصل کی شب میں ترقی ہوئی ارمانونکی
حوصلے بڑھ گئے جب یار کو تنہا دیکھا

افسوس کہ بالیں پہ اجل آ ہی پکاری
آیا نہ عیادت کو مگر یار ہمارا

کل تلک داغ کلیجہ پہ نظر آتا تھا
آج اُس داغ میں ناسور ہوا خوب ہوا

مجھ مریضِ عشق کو تو نے اگر اچھا کیا
نام تیرا بھی مسیحائے زماں ہو جائیگا

ترکھوں تاجِ شاہی سر پہ ہیں اُسکے مقابل میں
اگر مجکو میسر آئے تکیہ اُسکے زانو کا

سر سے عدو کے رشک کے شعلے نکل گئے
مہندی لگا کے پاؤں میں نکلے جو گھر سے آپ

فرقتِ یار میں مرجائیں گلا کاٹ کے ہم
ملک الموت کا دیکھا کریں رستہ کبتک

آنکھ کا لگنا بُرا ہوتا ہے دیکھا تو نے
اب بھلا رات کو تم رہتے ہو بیدار کہ نو

رخشان

رخشان۔ عالیجناب نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر مرحوم جاگیردار ریاستِ لوہارو خلف اصغر فخر الدولہ نواب احمد بخش خان والی ریاستِ فیروز پور۔ نواب احمد بخش خان نے اپنے حین حیات بڑے لڑکے شمس الدین احمد خاں کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا اور پرگنہ لوہارو جو مہاراجہ الور نے بطور انعام دیا تھا اپنے چھوٹے صاحبزادوں امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان کو بطور مددِ معاش دیدیا تھا۔ چند سال بعد نواب شمس الدین احمد خان کی حرکاتِ زبوں کے باعث ریاستِ فیروز پور ضبط سرکار ہوئی مگر ریاستِ لوہارو بحال رہی نواب صاحب ممدوح نواب اسد اللہ خاں غالب سے علاوہ قرابت قریبہ کے سلسلۂ تلمذ رکھتے اور اُنکے خلیفہ اول تھے۔ انتظامِ ریاست شروع سے نواب امین الدین خاں کے سپرد رہا اور

اُنکی وفات کے بعد اُنکے بلند نام صاحبزادے نواب علاؤالدین خان مسند نشین ہوئے اور نواب ضیاء الدین خان صرف جاگیردار نسلاً بعد نسلٍ تصور کیے گئے، نواب صاحب بدیکور رؤسا شاہجہاں آباد میں نہایت ذی اقتدار اور با رسوخ تھے۔ انکی اعلیٰ خاندانی ذاتی شرافت اور علم و فضل کیوجہ سے حکام وقت اِن پر خاص توجہ مبذول فرماتے تھے نواب صاحب اعلیٰ درجے کے سخن سنج اور سخن فہم اور تاریخی معلومات کا سرچشمہ مانے جاتے تھے۔ اور بڑے غیور اور پابند وضع رئیس تھے۔ بلوۂ غدر کے بعد انکی ذات والا صفات دہلی میں غنیمت سمجھی جاتی تھی، چنانچہ جو شخص کسی فن کا ماہر یا کامل دہلی آتا تھا تو آپکے فیض صحبت سے ضرور مستفید ہوتا تھا، علم تاریخ سے نہایت ذوق رکھتے تھے چنانچہ جس وقت الیٹ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے اپنی ضخیم تاریخ ہند مرتب کی تو فراہمی حالات و تواریخ قدیم میں نواب صاحب نے بڑی امداد کی، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں گاہ گاہ فکر سخن فرماتے تھے، اُردو میں رخشاں اور فارسی میں نیّر تخلص کرتے تھے ۱۳۰۳ھ میں انتقال فرمایا اور درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح واقعۂ مہرولی میں دفن ہوئے تاریخ وفات مولوی رضی الدین خان دہلوی نے جو سالۂ حضرت امیر پنجہ کش خوشنویس میں ایک بے بدل خوشنویس تھے صوری و معنوی تاریخ کہی ہے اور بیشل مادہ ہے جس پر مصرع مولانا حالی نے لگائے ہیں وہو ہذا

چون ضیاء الدین احمد خان کشید	رخت از دنیا سوئے دار السلام
گفت ہاتف با رضی سالِ وفات	روز شنبہ سیزدہ شہر صیام ۱۳۰۲

حضرت نیّر رخشاں کا کلام متانت سے پُر۔ عالمانہ مذاق سے معمور ہے اپنے اُستاد والاقدر کے تلمیذ رشید تھے، چنانچہ کلام میں بھی اُنھیں کی طرز کا اتباع ہے اِنکی اور اِنکے خاندان کی زبان دہلی میں مستند مانی جاتی ہے۔ پاکیزہ اور نازک خیالات کی بندش خاص انھیں کا حصہ ہے کاش نواب احمد سعید خان صاحب طالب کہ خود بھی اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اپنے والدِ مغفور کا کلام چھپوا دیں تاکہ نواب صاحب مرحوم کی پُرفیض زندگی کی دوامی یادگار

رہجلائے، آپکے بڑے صاحبزادے نواب شہاب الدین احمد خاں کا انتقال آپکی حیات ہی میں ہو گیا تھا اُنکے بیٹے جناب سائل دورِ موجودہ کے مشہور کہنے والوں میں ہیں۔

ممنوں نہیں ہے برق و سموم و شرار کا　　رکھا ہے حکم جلنے میں عاشق چنار کا

جب اپنے شغل سے دلِ خونیں نہ باز آئے　　پھر کیا گناہ دیدۂ خونابہ بار کا

آنکھوں میں بوالہوس کی کھٹکتا ہوں مثلِ خار　　احسان ہے یہ مجھپہ مرے جسمِ زار کا

سر پیٹے، سینہ کوٹے، کہ افسوس میں ملے　　عاشق کو ہاتھ چاہئیں ناچار چار چار

زہے سربلندی شہیدِ وفا کی　　کہ اِس در پہ سر ہو چڑھانے کے قابل

جب چاہو آؤ دل میں کہ ہے آپکا مکان　　یہاں خوفِ شحنہ و خطرِ پاسباں نہیں

گر انتہا نہیں ستم و جورِ یار کی　　شوقِ زیادہ جو کو مرے بھی گراں نہیں

حیرت میں ہوں کہ نوکِ مژہ نیشتر مثال　　کھبتی ہے گر جگر میں تو کیوں خونچکاں نہیں

ہے دوست صدق دشمن و دشمن دروغ دوست　　کیا رشک صلح جس میں صفا درمیاں نہیں

نکلے آنکھوں سے وہیں جذب ہوئے دامن میں　　بجز اشکوں کے کوئی گوہرِ نایاب نہیں

جتنے ہو نغمہ سرا اُتنے ہی خونریز بھی ہو　　چھیڑ نشتر کی چلی جائے جو مضراب نہیں

کعبے کو دیر سے چلے سنکر شراب میں　　مستوں کو کیا تمیز عذاب و ثواب میں

دار القضا کہاں رہی میخانہ بن گیا　　ہیں مست جمع محکمۂ احتساب میں

پیری بہ مفلسی میں نہ لو نام مے کہ اب　　لطف ارتکاب میں نہ اجر اجتناب میں

پیکے گرنے کا ہے خیال ہمیں　　ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر　　گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

تیرے غصے نے ایک دم میں کیا　　مُردۂ صد ہزارہ سال ہمیں

دل میں مضمر ہیں سعئے باقی　　کسی صورت نہیں زوال ہمیں

طالع بد سے نیرِ رخشاں　　اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

کیا پہنچے تو فرشتہ کا جس جا گذر نہ ہو
بیت الصنم ہے شیخ خدا کا یہ گھر نہ ہو

چل کر خرامِ ناز سے برپا کرے وہ حشر
گر با زمیں کا اُسے خوف و خطر نہ ہو

رخشاں جو آتے آتے ابھی رک گئے ہیں اشک
آنکھوں میں آ گیا کوئی لختِ جگر نہ ہو

کر کے نوید ہمیں قتل سے پہلے پھیر
خون رُلوا چکے کیا خون کا دعویٰ کیجے

بعد اک عمر جو آئے تو خجل ہوں کیونکر
آنکھیں پتھرائی ہوئی اُنکی تو پا کیجے

ہے تصور مرا اُس خاطرِ نازک پہ گراں
جتنا ہو اپنے کو ہر غم سے گھلایا کیجے

نقش بر سنگ ہے وہ دھیان اپنا تمہارے دلبر
خوش ہوں مِٹنے کا نہیں لاکھ منایا کیجے

بوالہوس اور بھی مرنے کی کرینگے خواہش
لیکے گل قبر پہ رخشاں کی نہ آیا کیجے

چاک پھر مرا گریباں ہے
دل کا محضر میرا گریباں ہے

لاغری ہیں بریدہ ناخن سے
مختصر تر میرا گریباں ہے

رات سینہ سے سینہ کس کا ملا
کہ معطر میرا گریباں ہے

سینہ کا چاک کرنا سکھلایا
میرا رہبر مرا گریباں ہے

رخشاں — **رخشاں** منشی خیرات علی خاں رخشاں باشندۂ فرخ آباد ۱۳۶۹ھ میں تذکرہ سراپا سخن کی ترتیب کیوقت حیات تھے، غالباً منیر شکوہ آبادی سے تلمذ تھا۔

گروش ہیں ایسے آگئے مجھ بیوطن کے پاؤں
پھرنے سے باز رہگئے چرخِ کہن کے پاؤں

عکسِ شفق ہے پائے بلوریں میں اے پری
حِنا ری لگی نہیں ہیں عقیقِ یمن کے پاؤں

کیونکر اُٹھائیں رنگِ حنا کے وہ بار کو
نازک زیادہ گل سے ہیں اُس گلبدن کے پاؤں

ہے بعد مرگ بھی رہی رخشاں کو بے کلی
اندر کفن کے ہاتھ ہیں باہر کفن کے پاؤں

رخشان — **رخشان** ۔ محمد عزیز الدین صاحب رخشان آپ قاضی محمد حسام الدین آزردہ ساکن قدیم قصبہ جیور ضلع بلند شہر کی اولاد میں سے ہیں۔ کارخانۂ تجارتِ نیل کی بدولت قاضی محمد رفیع الدین انکے جدِ امجد نے خاصا نام پایا سنہ ۱۸۸۲ع سال پیدایش ہے، اپنے ماموں حکیم منشی فضل احمد

کے زیرِ تربیت رہکر فارسی انگریزی شروع کی، فارسی کی تحصیل تو معمولی تکمیل کو پہنچ گئی۔ پندرہ برس کی عمر میں اُردو میں مڈل پاس کر کے آپ نے شعر و سخن کا شوق کیا اس زمانے میں ارمغان نام ایک گلدستہ حضرت احسان شاہجہاں پوری کے زیرِ اہتمام نکلتا تھا چنانچہ آپ حضرت احسان شاہجہانپوری کے شاگرد ہوگئے پہلے رسوا تخلص تھا پھر بہ تجویزِ استاد رخشاں تبدیل کر لیا۔ ۱۹۱۰ء میں عدالت ججی گوالیار میں مولانا مقصود حسن حیرت کے نائب تھے پندرہ بیس غزلوں کا جو رسالہ کی نقلیں مندرجہ ذیل خلاصہ ہے۔

لے لیا جو بوسہ میں نے بندہ پرور کیا ہوا
پیار میں لب رکھ دیئے پیارے لبوں پر کیا ہوا

پہلے جس پر اک نظر پڑتی تھی ہوتا تھا نثار
وہ کرشمہ تیرا اے چشمِ فسونگر کیا ہوا

حضرتِ موسیٰ نے غش کھایا تھا جسکو دیکھکر
اے صنم وہ جلوۂ روئے منوّر کیا ہوا

یہ مریضِ عشق سے کہنا کسی کا وقتِ نزع
زندگی کیوں ہو رہی ہے تمکو دوبھر کیا ہوا

لیکے دل جب آپنے عشاق کو بوسے دیئے
آپ کا احسان پھر کھیئے کسی پر کیا ہوا

دیکھ لی اپنے سے بڑھکر مہ کنعاں کی شبیہ
اب حسینوں میں کبھی نام نہ لینا اپنا

اے شہِ حسن فقیروں کو بھی خیرات ملے
دیدے اک بوسۂ رخسار ہی صدقہ اپنا

تمنے خوش ہوکے دیا تھا تو لیا تھا ہمنے
دیکھے ناخوش ہو تو اب پھیر لو بوسہ اپنا

قیامت کو دکھاؤنگا اثر جب سوزِ پنہاں کا
جہنم کو جلا دیگا شرارہ آہِ سوزاں کا

خیال آتا نہیں یاربّ وفائے عہد و پیماں کا
بُت کافر پہ سایہ پڑ گیا کس نامسلماں کا

عبادت میں بھی رہتا ہے تصوّر حور و غلماں کا
خدا ہی ہو نگہباں شیخ تیرے دین و ایماں کا

خموش اے واعظِ ناداں یہاں جنت ہے نظروں میں
تصوّر نے مرے کھینچا ہی نقشہ بزمِ جاناں کا

عزیز الدین ہوں رخشاں تخلص ہے وطن جیور
سخن گوئی میں ہوں شاگرد حسانِ سخنداں کا

کوئی دنیا میں نہیں ہے اس سے بڑھ کر خوش نصیب
اُس پہ سایہ سے بھی لینے والے ہو جس کی یاد ہو

رزاق

رزاق۔ حاجی محمد عبدالرزاق خان مرحوم خلف اسحٰق خان، خاندان حافظ الملک رحمت خان سے تھے، دیوان گلشن نعت اِنکی تصنیف سے شائع ہو چکا ہے ۱۸۸۲ء میں انتقال کیا

لیاقتِ علمی خاصی تھی۔ خوشنویسی سے بسر اوقات کرتے تھے یہ چند شعر نعتیہ کلام سے منتخب ہوئے

اُس ذات کو آتا نہ اگر جوشِ محبت — ظاہر ہے کہ ہوتا نہ ظہور ارض وسما کا
آدم کو جو سجدہ نہ کیا حکمِ خدا سے — ابلیس ہوا کبر سے پابند بلا کا
رزاق سے رزاق کی ہر دم ہے تمنا — کر مجکو سلامی نہ کسی شاہ و گدا کا

رزم

رزم۔ مہاراج بینی مادہو قنوجیہ متوطن بیج راجپور۔ زخمی کاکوروی کے تلمذ سے بہرہ ور ہیں۔ پیام عاشق ۱۳۰۸ھ سے یہ چند شعر منتخب ہوئے۔

آئینہ کو دیکھا نگہِ غور سے ہم نے — صاف اُس سے زیادہ ترا زانو نظر آیا
ہیں شمع منور کہوں اِسکو تو بجا ہے — سانچے میں ڈھلا یار کا بازو نظر آیا
اے رزم ہیں سمجھا کہ ہے تقدیر کا کچھ بل — برہم جو مجھے یار کا گیسو نظر آیا

رزم

رزم۔ سید محمد حنیف رضوی بلگرامی، آپ کو اوائل سن شعور سے شاعری کا شوق ہے حضرت محمد بلگرامی کے خرمنِ فیض سے بہرہ ور ہیں۔ کلام بہم رسیدہ کا انتخاب یہ ہے۔

جور و ستم کا کیوں نکروں شکوہ کیا سبب — کچھ آپکا اجارہ ہے میری زبان پر
تڑپا رہے ہو کس لیئے بیمار ہجر کو — یہ ظلم کیا روا ہے کسی ناتواں پر
بدلی گھری ہوئی ہے شرابی ڈٹے ہیں خوب — میلا ہے آج پیرِ مغاں کی دُکان پر
دامن میں توڑ توڑ کے پھولوں کو بھر لیا — بلبل کا صبر بھی نہ پڑا باغباں پر

رزم

رزم۔ صاحبزادہ محمد محمود علی خان نائب تحصیلدار رامپور۔ جناب بزم اکبرآبادی سے مشورہ سخن کرتے ہیں ۱۸۹۹ء میں زندہ و سلامت موجود تھے۔

غیر سے لکھوا کے بھیجا ہے میرے خط کا جواب — کیا کہوں اے ہمدمو لکھا مری تقدیر کا
یہ مزا یہ لطف دنیا کی کسی شے میں نہیں — کیوں نہ کھائیں شوق سے عشاق پھل شمشیر کا
صبح ہوتے ہی چلے آئے جگر تھامے حضور — یہ اثر ہے عاشقوں کے نالۂ شبگیر کا
پھر ترحم کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ مجھے — ہے چمکنے کو ستارہ رزم کی تقدیر کا

ہر ایک بات کا میری اُنکو یقین تھا	نہ تھے مجھ سے یوں بدگماں اول اول

رزم

رزم - شیخ خورشید حسن قدوائی لکھنوی، باوجود تلاش حالات میسر نہ ہوئے۔ چند شعر پیش کش ہیں ۔

کیا گلہ گردہ آشنا نہ ہوا	اپنی قسمت ہیں جو نہ تھا نہ ہوا
اسی حیلہ سے ہوتی پا بوسی	وائے تقدیر ہیں حنا نہ ہوا
نہ سہی وصل دید تو ہوتے	یہ بھی اے بخت نارسا نہ ہوا
تم جو کہتے ہو ہیں ہوا بدنام	کیا مرا ذکر جابجا نہ ہوا

رسا

رسا - مرزا کریم الدین رسا گورگانی شاگرد حافظ غلام رسول شوق پرانے سخن سنج تھے، اسّی برس کی عمر پاکر غدر سے پیشتر انتقال کیا انکے بڑے صاحبزادے میرزا رحیم الدین حیا بڑے نامی شاعر گذرے ہیں انکا مفصل ذکر جلد دوم ہیں چھپ چکا ہے، رسا صاحب دیوان تھے مگر کلام غدر کی لوٹ کی نذر ہوا۔ یہ چند شعر ملے درج کیئے جاتے ہیں ؎

بیوفاؤں سے اے رسا تمنے	سچ کہو دل لگا کے کیا پایا
پریشاں حالونکی جب قدر جانو	جو اس طرح ہو دل پریشاں تمہارا

دل و دین و قرار و ہوش تک تو دیدیا تم کو	سوا اُسکے وہ کیا تھا اور جو ہمنے چھپا رکھا
تم کہو دل لیکے دکھلاؤں نہ اپنی شکل ہیں	ہم کہیں دیکھا کریں صورت تمھاری رات دن

باز آ ستا تو ہمکو بہت عشوہ گر نہیں	کرتا کسی پہ ظلم کوئی اسقدر نہیں

رسا

رسا - سرآمد اذکیا میر احمد علی رسا ابن میر امام الدین رامپوری شاگرد رشید علی بخش بیمار۔ انکے بزرگ رامپور میں ملتان سے آئے تھے، خوش فکر، رنگین طبع وارستہ مزاج شخص تھے ۱۸۵۶ء میں ۶۵ سال کی عمر تھی، لیاقت علمی بہت اچھی تھی اور مدام مشغلہ سخن رہتا تھا مگر وارستگی مزاج کے باعث کلام کے فراہم کرنے کی نوبت نہ آئی ورنہ کافی ذخیرہ چھوڑا تھا کلام ہیں متانت اور پختگی بندش کے علاوہ اُستادانہ رنگ کی جھلک موجود

مولٰنا عبد العلی مدراسی فروغ تخلص انکے رشید شاگرد تھے بالآخر ۲۰ شوال ۱۲۹۲ھ میں بمقام لکھنؤ سفرِ آخرت اختیار کیا ؎

تاریخ او نوشت فروغ از سرِ الم	احمد علی چہ صاحبِ فضل و کمال بود

منشی محمد امیر اللہ صاحب تسلیم مرحوم نے لجواب عریضہ ۷ محرم ۱۳۰۹ھ سالِ وفات تحریر فرمایا تھا رامپور میں انکے بیسیوں شاگرد تھے۔ صاحبزادے اوج تخلص کرتے ہیں۔

ہائے نیچی وہ شرمگیں آنکھیں	اور حیرت سے دیکھنا میرا
رنگ لائیگی درازی خدنگِ ناز کی	دلِ جگر کا، اور جگر دل کا عدو ہوجائیگا
کوئی شکل بھر لنکیں دلِ بد گماں نکلتی	مجھے بات کا کسیکی اگر اعتبار ہوتا
کبھی فرشِ راہ دل ہی کبھی سوئے در ہیں آنکھیں	نہ وہ مجھ سے وعدہ کرتے نہ یہ انتظار ہوتا
قسمت اُس کانِ ملاحت سے جُدا کرتی ہے	کون اب زخمِ جگر پر نمک افشاں ہوگا
رہگئی شرم فرشتوں کے اُٹھائے نہ اُٹھا	یہ گرانبار میرا نامۂ اعمال ہُوا
ارمانِ وصل دل سے نکلنا محال ہے	آنسو نہیں کہ دیدۂ تر سے نکل گیا
سُنینگے وہ مقرر میرے دردِ دل کا افسانہ	جگر تھامے ہوئے بیٹھے ہیں اہلِ انجمن اپنا
مِلا یا خاک میں تُو نے سپہر خانہ خراب	وہ دل مرا جو تمنائے یار کا گھر تھا
کیوں اس عتاب کا میں سزاوار ہوگیا	کیا تیری بندگی سے گنہگار ہوگیا
المدد اے نگاہِ ہوش ربا	جوش ہے شکوۂ تغافل کا
نہ تھا وہ میں کہ مجھے تابِ نازِ بیجا ہو	یہ کیا ہوا کہ ترا میں نیازمند ہوا
بہارِ عشق میں چہرے سے اُڑگئی رنگت	یہ فصلِ گل میں نیا موسمِ خزاں دیکھا
وہ ہوئے رخصت سحر آئی قیامت انکے ساتھ	صُور کا نالہ ہوا اللہ اکبر کا جواب
بہکے ہوئے کلام ہیں مرتا ہوں غم سے میں	آتی نہیں خیال میں پیغامبر کی بات
نہ انتظار کی تکلیف پُوچھئے مجھ سے	گذر گئی جو گذرنی تھی جانِ مضطر پر

پوچھتے ہیں مجھ سے جب احباب رو دیتا ہوں میں
کیا کہوں اُن سے گذر اس انجمن میں کیوں نہیں

ملتی خبر نہیں دلِ خانہ خراب کی
پوچھیں نشاں کس سے کہاں جستجو کریں

یارب یہ دل، یہ جوشِ ہوس خاک میں ملے
کبتک ہر ایک بات کی ہم آرزو کریں

تیر نگاہِ یار سے دونوں کو عشق ہے
دل سامنے کریں کہ جگر رو برو کریں

ہائے گھبرا کے وہ خلوت میں کسیکا کہنا
لیکے آئے ہو رسا آج کہاں تم مجکو

گزری کسی کے دل میں جہاں وہ نگاہِ ناز
پہنچی وہیں اجل بھی برابر لگی ہوئی

کھلا ہے اے رسا بابِ اجابت
مگر فرصت نہیں مجھکو دعا کی

فسردہ دل چمنِ روزگار میں آئے
خزاں کو ساتھ لیئے ہم بہار میں آئے

اُف اُف سے سوزِ عشق یہ آتش فشانیاں
اک آگ سی جہاں میں ہے گھر گھر لگی ہوئی

شکستِ رنگ پہ اپنے نثار ہوتا ہوں
یہ میرے پاس نشانی ہے اُنکی محفل کی

اِس لیئے اُس کا تصور بھی نہیں کرسکتا
وہ پریشاں نہ کہیں خاطرِ برہم میں رہے

رسا — رسا قاضی عوض علی باشندۂ مارہرہ مرزا حاتم علی مہر کے شاگرد ہیں یہ چند شعر اُنکی یادگار ہیں۔

جاں نثار آپکے دم آپکا بھرنیوالے
شکوۂ رنج و مصیبت نہیں کرنیوالے

لاکھ سکھلائیں اُنھیں ہم روشِ مہر و وفا
وہ قدم بھی نہیں اِس راہ میں دھرنیوالے

دق ہو وصل ہو غمِ اُلفت ہو شبِ فرقت ہو
ڈھونڈ لیتے ہیں بہانہ کوئی مرنیوالے

رسا — رسا حکیم عبداللہ خان صاحب دہلوی۔ غدر سے پہلے دہلی میں زندہ تھے یہ دو شعر اُنکے ہیں

ہے دیدہ فرشِ راہ کہ آتا ہے کوئی بُت
دلکو ہے انتظار کہ ہوں پائمال کب

اطلاق ہے شراب کا دونوں پہ زاہدا!
یہ ہے اگر حرام تو وہ ہے حلال کب

رسا — رسا۔ صاحبزادۂ محمد ابراہیم شاہ رسا خاندان ٹیپو سلطان میسور سے تھے اور کلکتہ میں رہتے تھے مولوی سیّد علی حیدر، حیدر سے تلمذ تھا ۱۲۸۰ھ میں ۳۰ برس کی عمر تھی کلام کا رنگ اشعار ذیل سے ظاہر ہے۔

تمکو ہے ناز اپنی صورت پر
شکر کرنا پڑا اسے مجھے الٹا

ہمکو ہے ناز اپنی اُلفت پر
وہ بگڑنے لگے شکایت پر

رسا

ناصحا رونے سے آزردہ رہا تو میرے
الفتِ نرگسِ فتاں کا تماشا دیکھو

دیکے تسکین نہ پونچھے کبھی آنسو میرے
دشتِ وحشت میں قدمبوس ہیں آہو میرے

رسا- میر عابد حسین خلف اصغر جناب میر وزیر علی صبا لکھنوی، آپ کو حضرت بقا لکھنوی سے تلمذ ہے جو جناب صبا کے خلف اکبر اور انکے برادر بزرگ ہیں، حالات کے لیئے بارہا لکھنو لکھا مگر کچھ جواب بجز سکوت نہ ملا- اشعار ذیل انکے ہیں؛

تو نے جسے ظالم نگہ قہر سے تاکا
حیراں ہوا ششدر رہا بیتاب ہوا وہ

فی الفور نشانہ وہ ہوا تیر قضا کا
تمنے جسے دیکھا جسے جھانکا جسے تاکا

رسا

ہوتے صفت آئینہ حیراں دم زینت
واقف ہیں جہانمیں جو قناعت کے مزے سے

انداز اگر دیکھتے تم اپنی ادا کا
بس بھیک کا کاسہ ہے اُسے ہاتھ دعا کا

رسا- نواب مرزا شبیر علیخاں لکھنوی، آپ لکھنو کے ایک موقر خاندان کے رکن تھے اور نواب بندہ علیخاں زیبا مرحوم سے تلمذ تھا- شوخ اور چلبلی طبیعت پائی تھی- استعداد علمی کے ساتھ ساتھ شعر کا مذاق بھی اچھا تھا، مشاقی اور پختہ کلامی بھی تھی- تین چار برس کا عرصہ ہوا بطریق سیر بمقام پورنیہ بنگال گئے ہوئے تھے وہاں کسی دشمن نے بضرب گولی انکا کام تمام کردیا- ۵۰ برس کے قریب عمر پائی، دو صاحبزادے یادگار چھوڑے مگر باوجود بارہ مرتبہ استفسار حال کرنے کے مفصل حالات نہ ملے- اب کلام ملاحظہ ہو-

جفائیں کرکے تنہا کس لیئے بدنام ہوتے ہو
مکر جانا، نہ تم اقرار ہی کرنا قیامت میں

ستم کرنے لگے جب آسماں تم بھی ستا لینا
ہماری موت کا جب ذکر آئے سر جھکا لینا

مشکل کہیں خدا سے بتونکی تھی بندگی
ایجان حسن و عشق کا سارا فتور تھا

دیکھا جو بتکدہ کو حرم سے بھی دور تھا
میرا قصور تھا نہ تمہارا قصور تھا

جو ہو گئی معاف وہ غیروں کی تھی خطا
بخشا گیا نہ جو وہ ہمارا قصور تھا

مشہور ہے جو عشق وہ تھا میرا انکسار
کہتے ہیں جسکو حسن تمہارا غرور تھا

او بت اعدا سے کیا شکوۂ بیداد کریں
جی میں آتا ہے تجھی سے تری فریاد کریں

راہ اسواسطے رکھتے ہیں عداوت سے
ایک گر ظلم کرے ایک سے فریاد کریں

دشمنی غیر کی رکھنے کو تو رکھیں دل میں
یہ ہو کیونکر کہ اُسی سے تجھے پھر یاد کریں

نہ ہوگا خلد میں جا کر شباب کا احساں
یہ بات خوب ہی مرنے میں نوجواں کے لیئے

جو دل دکھاؤ تو آہیں بھی ہمکو کرنے دو
ستم کرو تو اجازت بھی دو فغاں کے لیئے

نہ آئی گھر مرے کیا جانے کیا سمجھ کے قضا
یہاں تو جان بھی حاضر ہے میہماں کے لیے

دیکھئے دیکھئے پھر آپ چلے جاتے ہیں
اب نہ رکھیے گا مرے دل سے سنبھلنے کیلئے

وہ بھی کم سن ہیں ابھی دل بھی ہو میرا ناداں
ایک سے ایک زیادہ ہے مچلنے کے لیئے

جفائیں کیں جو مجھے طالب وفا دیکھا
وفائیں کیں جو مجھے خوگر جفا سمجھے

عداوت جو مجھ زار سے آگئی
فلک نے مٹایا زمیں کھا گئی

ملانا تھا دونوں کو اک عمر سے
وہ ابتک نہ آئے اجل آگئی

یہ کیوں نا امیدی سے بدلی امید
الٰہی مرے دل میں کیا آگئی

مرے پھول اچھی طرح ہو گئے
کسی کو سوم میں ہنسی آگئی

دیگا تڑپ تڑپ کے دل مضطرب خبر
مجھسے چھپا چھپا کے نہ مہمان جائیے

غیروں کے منہ سے ہی کبھی آپ آئیے کہیں
اُنکا ہے ہم اُٹھائینگے احسان جائیے

میرے تو قتل میں بھی بر آئے گی آرزو
کہنا رقیب ہی کا کہیں مان جائیے

ہم عاشقوں کے خون کا ڈر ناہیں آپکو
محشر میں اس طرح نہ پریشان جائیے

جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں بت زمانے میں
فلک بھی مفت میں بدنام ہے مقدر بھی

کہتا ہے دل کہ کچھ تو ہو تسکین ہجر میں ٭ جھوٹے ہی اُسکے وعدہ کو سچ جان جائیے

رسا منشی رحیم بخش رسا دہلوی مترجم نظارۂ مقیم گورکھپور چند شعر نتائج افکار سے درج ہیں ۔

رسا

بخت کوتاہ ہے بنتا نہیں کچھ کام رسا	گو کہ ہے فکر رسا ذہن رسا، نام رسا
محفل میں انکی آج ہے آفت کا اہتمام	وہ آپ کر رہے ہیں قیامت کا اہتمام
بجلیاں دیکھنے والوں پہ گراتے آئے	تم جدہر آئے اُدھر آگ لگاتے آئے
ہزار اُن سے محبت کا میں کروں اظہار	وہ میری بات کا لیکن نہیں یقیں کرتے
وصل کی شب دیکھنا دشمن کی باتوں کا اثر	بات بھی وہ کی جو دشمن کی تھی سکھلائی ہوئی

رسا

رسا منشی غلام محی الدین شاگرد ڈاکٹر احمد حسین خاں مائل۔ دکن کے خوش مذاق لوگوں میں ہیں، اشعار ملاحظہ ہوں ؛

دکن کی جان ہندوستان کا دل	نظام الملک آصف جاہ عادل
تڑپ کر یار کو تڑپائے گا دل	شرارت میں ہی بجلی سے سوا دل
اک آفت تھی بلا تھی روگ تھا دل	بہت اچھا ہوا جاتا رہا دل
مزا رگ رگ میں دردِ عشق کا ہے	کہ ہر ہر عضو میرا بن گیا دل
مزا جب ہی کہ یوں کایا پلٹ ہو	مرا تجکو ملے تجکو میرا دل
نظر تو مل گئی لیکن ہے جب لطف	کہ ڈلسے بھی ملے یوں ہی ترا دل

رسا

رسا۔ محمد وجیہ الدین خان باشندۂ حیدر آباد دکن خلف بہار الدین خان ۱۸۸۶ء میں چوبیس پچیس برس کا سن تھا اُس وقت سے برابر شعر و سخن کا مشغلہ ہے، علمی استعداد اور معلومات اچھی ہیں۔ ذکی اور قابل شخص ہیں طبیعت شوخ او ربچپن پائی ہے اور اسکی جھلک کلام میں بھی صاف مترشح ہے، صفائی روزمرہ، چستی بندش، اسلوب بیان اچھا ہے، ہر شعر میں مضمون پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دکن کے موجودہ شعراء میں سب طرح اچھے ہیں اور اپنے اُستاد ڈاکٹر مائل کے ارشد تلامذہ میں انکا شمار ہے، اکثر رسالوں میں انکا کلام نظر سے گذرا۔ کچھ اشعار ضیافت طبع شایقین کے لیے درج کیے جاتے ہیں ؛

وقتِ آرایش نظر پڑتے ہی مضطر ہو گیا	خود تڑپ کر عکس آئینہ سے باہر ہو گیا

دل جگر داغدار کرتے ہیں
سینے کو لالہ زار کرتے ہیں
آئینہ دیکھ کر بہت کم سن
عکس کو اپنے پیار کرتے ہیں

چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر تمھاری یاد میں
تیری ہی شوخی کے ہیں انداز تیری یاد میں

بوسے لے لے کر لبِ زخمِ جگر نے لے لیا
تھا مزہ جو کچھ زبانِ خنجرِ جلاد میں

اللہ رے ضعف یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو
روؤں تو میری آنکھ سے آنسو رواں نہ ہو

مہماں جو آکے سینے میں پیکانِ یار ہو
صدقہ ہو دل، جگر ہو فدا جاں نثار ہو

پہلے تو دل کو لیتے ہیں نیچی نگاہ سے
پھر پوچھتے ہیں کس لئے تم بیقرار ہو

انگڑائیاں وہ لیتے ہیں تن تن کے بار بار
کیونکر نہ جوشِ حسرتِ بوس و کنار ہو

دل کشمکش ہے مرا اگر تم ستم ایجاد ہو
ہاں ستم پر ہو ستم، بیداد پر بیداد ہو

ہاتھ میں تصویر تیری جیب میں تیری مثال
آنکھ میں تیرا تصور دل میں تیری یاد ہو

دل میں گر شیخ و برہمن کے نہ تیری یاد ہو
کیوں اذاں کا شوق ہو ناقوس کی فریاد ہو

پائے ساقی پر گرائے نشۂ صہبائے عشق
میکدے میں حسن کے یوں مست کی افتاد ہو

دولتِ دیدار تم کو مل گئی کیا اے رسا
آج خوش خوش ہو بہت بشاش ہو دلشاد ہو

کوئے دلبر میں نہ جانا چاہیے
دل کے کہنے میں نہ آنا چاہیے
وقت یہ تیوری چڑھانے کا نہیں
پھول مرقد پر چڑھانا چاہیے
دیکھنا ہے صورتِ دلبر اگر
دل کو آئینہ بنانا چاہیے

مری جاں کیا کہوں فرقت میں نالہ کیوں نکلتا ہے
خیال اکثر ترا سینہ میں دل چٹکی سے ملتا ہے

ترا خنجر بھی تیری طرح ہے مجھ سے خفا قاتل
گلے سے جب لگا لیتا ہوں میں رک رک کے چلتا ہے

اگر پیرِ مغاں کا یہ نہیں اعجاز اے ساقی
تو میخانے میں ساغر کیا سبب بے پاؤں چلتا ہے

جگہ تیری شراکت اے دلِ پروانہ کیوں کرتا
سمجھ ناداں پرائی آگ میں کوئی بھی جلتا ہے

کڑی ہے عشق کی منزل سمجھ کر رکھ قدم اے دل
کہ اس رستہ میں رہرو ٹھوکریں کھا کر سنبھلتا ہے

کرتے ہیں کبھی ہم جو دعا ہاتھ اٹھا کر	وہ کہتے ہیں منظورِ خدا اور ہی کچھ ہے
وہ تاب کہاں صاعقۂ طور میں موسیٰ	برقِ نگہ ہوش رُبا اور ہی کچھ ہے
مرنے کو مرے جان کے غش دیتے ہیں چھپٹے	سمجھے ہوئے کچھ ہیں وہ ہوا اور ہی کچھ ہے
مرنے جو لگا آکے وہ بولے سرِ بالیں	کہتے ہیں جسے شرطِ وفا اور ہی کچھ ہے
کچھ اور ہی شکوا تھا ملے تھے جو سرِ شام	اب صبحِ شبِ وصل گلا اور ہی کچھ ہے
عشق کا داغ مرے خانۂ دل کا ہے چراغ	روشن اس شمع سے ہے بزمِ محبت انکی
چٹکیاں لیتے ہیں وہ نیچی نظر سے دل میں	شرم کے پردے میں رہتی ہے شرارت انکی
کیوں گلِ داغِ عشق ہو نہ عزیز	آتی ہے اس چمن سے بو تیری

رسا۔ میر علی احمد رسا شاگرد میر علی اوسط رشک جہاں تک تحقیق ہوا رامپور کے رہنے والے تھے

رسا

جگر ہے خشک تو ہے چشم ابرِ تر کی طرح	ہمارا ظاہر و باطن ہے بحر و بر کی طرح
کس آب و تاب کی ناف و کمر تمہاری ہے	کوئی گہر ہے کوئی رشتۂ گہر کی طرح
گلے وہ عید کو آکر ملے خفا بھی ہوئے	بڑھا گھٹا میں ابھی چاند میں قمر کی طرح
یہ کیسے بدر ہو دم بھر کو آئے گھر میرے	اڑھائی دن تو رہو ایکجا قمر کی طرح
عیاں نہاں تم اے یار دوست دشمن سے	صفا ہو شیشہ میں پتھر میں ہو شرر کی طرح
تمہارے جھانکنے سے دل کبھی نہیں بھرتا	سمائے دیدۂ روزن میں ہو نظر کی طرح
وہ باتیں چھانٹتے ہیں پاتا ہو نہیں نشوونما	رسا عداوتِ احباب ہے تبر کی طرح

رسا

رسا بلبل شاخسارِ معانی عندلیب گلشن خوش بیانی منشی حیات بخش رسا مصطفےٰ آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں استعداد علمی نہیں رکھتے مگر ذہانت و طباعی نے اس کمی کو جیسا کہ چاہیے پورا کردیا ہے کلام میں انتہائی شوخی اور معاملہ بندی کا پیرایہ ہے ۴۲-۴۰ سال کی عمر ہے۔ حضرت داغ کی وفات کے بعد سے انکے کلام میں پختگی اور رنگینی کی ایک خاص شان پیدا ہوگئی ہے اور اب مشہور کہنے والوں میں انکا شمار ہے، بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دہلی کے مشاعرے میں

اِن سے ملاقات ہوئی تھی، اکثر علیل رہتے ہیں، فالج کی وجہ سے چلنے پھرنے سے قدرے معذور بھی ہیں اور ہاتھ میں رعشہ بھی ہے مگر طبیعت کی شوخی کلام میں رنگ دیئے ہی جاتی ہے پڑھنے کا انداز بہت اچھا اور دلکش ہے، عاشقانہ مضامین بہت اچھے اسلوب سے باندھتے ہیں بندش چست اور روزمرہ بہت صاف ہے، مشاق بھی اعلیٰ درجے کے ہیں اور فی البدیہہ بھی خوب کہتے ہیں، نواب فصیح الملک داغ مرحوم کے تلامذہ میں حضرت بیخود دہلوی اور سائل کے ہم پلہ ہیں۔ اکثر اشعار حضرت داغ کے رنگ میں ایسے ملتے ہیں کہ اُن پر حضرت داغ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ افسوس کہ نظر ثانی تذکرہ کے ایام میں انتقال کر گئے۔ ۸۴ھ۔ ۹۴ برس کی عمر پائی۔ کلام ملاحظہ ہو:-

اُنکی خدمت میں رسا بھی ہوگا — کبھی یوں حکم خدا بھی ہوگا
مجھ پہ جو تو نے ستم ڈھایا ہے — کہیں دنیا میں ہوا بھی ہوگا
آپ سا کوئی نہیں دنیا میں — آپنے یہ تو سنا ہی ہوگا
راز اُلفت کا چھپانے ہو عبث — یہ چھپائے سے چھپا بھی ہوگا
صبر والوں کا بھی دن آئیگا — ایک دن روزِ جزا بھی ہوگا
محفلِ شعر میں ہو آئیں چلو! — آج سننے میں رسا بھی ہوگا

ساقی جو دیئے جائے یہ کہکر کہ پیئے جا — تو میں بھی پیئے جاؤں یہ کہکر کہ دیئے جا
جانے کی جو ضد ہے تو مجھے زہر دیئے جا — اتنا تو کہا مان لے اتنا تو کیئے جا
کچھ اور نکر مجھ پہ جفائیں تو کیئے جا — کچھ اور نہ لے میری دعائیں تو لیئے جا
گستاخ نہ ہو وصل میں اے دست تمنا — کچھ دیر ابھی اُنکی بلائیں تو لیئے جا
کہتا ہے کسی شوخ کا مجھ سے یہ لڑکپن — ارمان کیئے جا ابھی ارمان کیئے جا
کیا لذتِ تعزیر نے مجبور کیا ہے — آتا ہے یہی جی میں کہ تقصیر کیئے جا
کمبخت رسا تیری رسائی نہیں ممکن — تو خوب سا اس نام کو بدنام کیئے جا
آہ ہوتی مرے لب پر نہ یہ نالا ہوتا — ایک بھی تو نے جو ارمان نکالا ہوتا

ہو گئے ضد سے مری سینکڑوں تیرے عاشق
یوں نہ ہوتا تو کوئی چاہنے والا ہوتا ؟
کیا سنبھالو گے کسی کے دلِ بیتاب کو تم
اپنے اُبھرے ہوئے جوبن کو سنبھالا ہوتا
اپنی محفل سے مجھے تم نے نکالا تو کیا
کوئی ارمان مرے دل کا نکالا ہوتا

شکر ہے دیکھے انھیں دل کوئی جھگڑا نہوا ۔ میرا تیرا نہوا، اپنا پرایا نہ ہوا
خواب میں بھی تو نظر بھر کے نہ دیکھا انکو ۔ یہ بھی آدابِ محبت کو گوارا نہ ہوا
غیر نے بات تو کی بات تو پوچھی میری ۔ خیر سے تم کو تو اتنا بھی سلیقہ نہوا
محوِ حیرت ہیں تو دونوں ہیں تری محفل میں ۔ ہمسے پردا ہوا آئینہ سے پردا نہوا
انکی یہ خوبیٔ اخلاق کہ وعدہ تو کیا ۔ میری یہ شومیٔ تقدیر کہ ایفا نہوا
ہمسے ای پیرِ مغاں عظمتِ میخانہ نہ پوچھ ۔ تو سلامت ہے تو کعبہ ہے یہ میخواروں کا
نگۂ یاس سے ہر ایک کا منہ تکتے ہیں ۔ حال دیکھا نہیں جاتا ترے بیماروں کا
اسکو جنت بھی عطا ہو تو جہنم سمجھے ۔ جسپہ سایہ ہے ترے کوچہ کی دیواروں کا
حشر کے روز بھی اپنا نہیں کوئی افسوس ۔ کیا ٹھکانا ہے رسا اُنکے طرفداروں کا
آیا نہ رحم سُنکے بھی تجھکو ماجرائے دل ۔ پہلو میں تیرے دل ہے کہ پتھر بجائے دل
حیران ہو کے رہ گئے وصفِ عدو سے ہم ۔ تصویر بن گئے ہیں تری گفتگو سے ہم
تو قتل گر کرے تو مریں آبرو سے ہم ۔ ہوں تجھسے سرخرو جو نہائیں لہو سے ہم
ساقی ہمارے صبر کی ہے شرم تیرے ہاتھ ۔ بیٹھے ہیں دور ساغر و جام و سبو سے ہم
جب ڈھونڈنے پہ آئے تو کعبہ ہے کتنی دور ۔ کیوں تھک کے بیٹھ جائیں تری جستجو سے ہم
انکو جفا سے کام ہے ہمکو وفا سے کام ۔ لاچار اپنی خو سے ہیں وہ اپنی خو سے ہم
مایوس ہو کے وصل سے اُس بت کے ای رسا ۔ کرتے ہیں التجائے سفارش عدو سے ہم
ایکدل ناز تھا جسپر وہ کیا نذرِ بتاں ۔ ہائے اب کس کا سہارا ہے جو فریاد کریں
مجھسے دیکھا نہیں جاتا کہ ستم ہو اُسپر ۔ میرے آگے وہ مرے دل پہ نہ بیداد کریں

ہم بتائیں کسکو ہمدم کیا کریں
ہمسے برگشتہ ہے عالم کیا کریں

وہ بھی تنگ آئے ہیں اپنے حسن سے
مر رہا ہے ایک عالم کیا کریں

آگ لگ جاتی ہے موئی چارہ گر
زخم دل پر رکھکے مرہم کیا کریں

مری فریاد پر انجان بنکر مسکراتے ہیں
قیامت ہیں وہ اس انداز سے جھوٹا بناتے ہیں

قیامت سے نہیں کچھ کم خرامِ ناز بھی اُن کا
قدم لیتے ہوئے آتے ہیں فتنے جب وہ آتے ہیں

کدورت مرنیوالے سے نہیں رکھتا ہے کوئی بھی
مری ہستی مٹاکر کیوں وہ تربت کو مٹاتے ہیں

گھڑی بھر کے لیئے تو اپنے دلکو میں تسلّی دوں
ذرا اے بیخودی دم لے تصور میں وہ آتے ہیں

نہ کیونکر رشک آئے ہمکو اُن لوگوں کی قسمت پر
وہاں جنکی رسائی ہے وہاں جو آتے جاتے ہیں

نخوت بھی ان بتوں کی عجب دلپسند ہے
اُتنا ہی پیار آتا ہے جتنا غرور ہو

کوچہ تمھارا چھوڑکے جنت میں جائیں کیوں
تم ہو تو کیا کسیکو تمنائے حور ہو

جی چاہا جدھر چھوڑ دیا تیرِ ادا کو
چٹکی میں اُڑائے ہوئے پھرتے ہیں قضا کو

سجدوں کا بھی موقعہ نہ رہا اہلِ وفا کو
پھر پھر کے مٹاتے ہیں وہ نقشِ کفِ پا کو

یوں ہمنے چھپائی ہے ترے وصل کی حسرت
جس طرح چھپاتا ہے خطاوار خطا کو

اب چھوڑ رسا عشقِ بتاں دیکھ کہا مان
کمبخت تجھے منہ بھی دکھانا ہے خدا کو

کہتے ہیں لاکھ بار تصور میں آئیں ہم
کوئی ہمارا دل سے طلبگار بھی تو ہو

پھر عیادت آئے وہ میری تو یہ کہا
دیکھیں کسی کو کیا کوئی بیمار بھی تو ہو

اشک سے یارب مرے طوفان برپا کیوں نہ ہو
قطرۂ ناچیز تو چاہے تو دریا کیوں نہ ہو

شام ہی سے وصل کی شب کا سویرا کیوں نہ ہو
آپ جس گھر میں ہوں اُس گھر میں اُجالا کیوں نہ ہو

دلکی خواہش پر ہمارا اُن کا جھگڑا کیوں نہ ہو
جب انھیں پیارا ہے دل پھر ہمکو پیارا کیوں نہ ہو

دن ہے کم اور داستانِ غم ہماری ہے بہت
روزِ محشر اپنے جی میں تھوڑا تھوڑا کیوں نہ ہو

نیچی نظروں سے نہ دیکھو سرِ محشر دیکھو
دادخواہوں کی طرف آنکھ اُٹھاکر دیکھو

ہو کے شمشیر بکف سیر گھڑی بھر دیکھو
دیکھو انکی ادا تیغ کے جوہر دیکھو

سنگدل تم تھے تو دل تم سے لگانا ہی نہ تھا
پڑ گئے ہائے مری عقل پہ پتھر دیکھو

جی میں پچھتاؤ گے برباد اگر مجھکو کیا
ڈھونڈتا پھرنا پڑے چاہنے والا نہ میسر دیکھو

وعدۂ حشر ہے پھر وہ بھی زمانے بھر سے
کوئی دامن نہ پکڑ لے سرِ محشر دیکھو

انکو دشمن سے جو الفت ہے تو پروا نکرو
اے رسا تم بھی کسی اور پہ مر کر دیکھو

رخ سے پردہ نہ اٹھا دیکھ پڑا رہنے دے
اے پری ہوش زمانے کے بجا رہنے دے

تیر کھینچا ہے تو پیکاں بتِ سفاک نہ کھینچ
اسکو تو میرے کلیجے سے لگا رہنے دے

دل کو پامال نہ کر روح کو بے چین نہ کر
ایسی بیداد نہ کر ایسی جفا رہنے دے

اُن تک تو رسائی نہیں کہنے کو رسا ہے
کمبخت نے یہ نام بھی بدنام کیا ہے

ہو شکوۂ بیداد اور رسا کی ہے یہ طاقت؟
یہ اُس سے مری جان نہوگا نہ ہوا ہے

عدو کے گھر نہیں آتی بلائے ناگہاں کوئی
وہاں کیا یا الٰہی دوسرا ہے آسماں کوئی

ستانے کا نتیجہ اُس ستمگر کو بھی ملجائے
ملے اس آسماں کو بھی الٰہی آسماں کوئی

نہ تھے بیداد گر تم کس طرح ہم حشر میں کہدیں
عدالت ہے یہاں کیونکر ملائے ہاں میں ہاں کوئی

کسی کا دل چرا لو تم تو یہ کیسی قیامت ہے
تمہارے بھولے پن پر کر نہیں سکتا گماں کوئی

ذرا دیکھے تو ہے جاں نثار انکی وفاداری
ذرا خنجر تو لے لیتے تو بیٹھے امتحاں کوئی

مجھے دشمن سے ملنے کا کسی سے ہو بھی رونا
کہیں رسوا نہ ہو جائے نصیبِ دشمناں کوئی

رسا کی داستانِ غم کا سننا کوئی آساں ہے
سنا دیجے لیئے نوکر تو رکھ لو قصہ خواں کوئی

نصیحت اپنی رہنے دے رہِ الفت میں اے ناصح
پڑی ہے تجکو سمجھانے کی اپنا دم نکلتا ہے

دو قدم چلکے دکھا دو تو قیامت کا مزا
حشر سے پہلے ہی اک محشر بپا ہونے لگے

حشر میں بولے انھیں دیکھ کے مرنیوالے
وہ چلے آتے ہیں دل لیکے مکرنیوالے

وہ عالی ظرف ہے یا ہم ہیں کھلجائیگا دم بھر میں
ہمیں زاہد پلا دیجے ہمارے ساتھ پی دیکھے

مری تصویر لیکر ہاتھ میں کس ناز سے بولے
خدا سمجھے جو بری نیت سے گر ہمکو کوئی دیکھے

الٰہی کس کی آمد ہے سرِ بالیں دمِ آخر
یہ کس کی پیشوائی کو مری جانِ حزیں نکلی

ساقی ترے کرم سے کیا لطف آ رہا ہے
کوئی تو پی رہا ہے کوئی پلا رہا ہے

آئینہ خود نمائی انکو سکھا رہا ہے
کیا ظلم کر رہا ہے کیا قہر ڈھا رہا ہے

چوری گیا گیا دل لیکن غضب تو یہ ہے
دل کا چرانیوالا آنکھیں چرا رہا ہے

آنسو بہا رہا ہے وہ سوزِ دل پہ میرے
خود ہی لگا کے ظالم خود ہی بجھا رہا ہے

انکو تو ہمنے چاہا وہ یوں ستا رہے ہیں
اے چرخِ کینہ پرور تو کیوں ستا رہا ہے

کوچے میں دشمنوں کے ہم اور سجدہ کرتے
نقشِ قدم کسی کا سر کو جھکا رہا ہے

آزردہ غیر سے ہیں لپٹا ہو غیض بلا ہے
روٹھے ہیں وہ کسی سے کوئی منا رہا ہے

آئے تھے سننے کہنے لگے ستم کا قصہ
اِس کا علاج کیا ہے اب پیار آ رہا ہے

یہ کم سنی یہ باتیں یہ سادگی یہ گھاتیں
کوئی سکھانیوالا اُن کو سکھا رہا ہے

کوچے میں اِن بتوں کے آنے دیا نہ شاید
سنتے ہیں اب رسا بھی کعبہ کو جا رہا ہے

یہ دیکھا ہی بری قسمت کا رونا لوگ روتے ہیں
مجھے تقدیر روتی ہے مری تقدیر ایسی ہے

بلا سے غیر کے در پر کرینگے ہم جبیں سائی
اگر مرضی تری اے کاتبِ تقدیر اچھی ہے

عجب حیرت میں ڈالا ہے اس اندازِ خموشی نے
کیا تصویر ہمکو بھی تری تصویر ایسی ہے

بوقتِ ذبح قاتل کا بڑھایا دل یہ کہہ کہکر
کہ تو قاتل ہے ایسا اور تری شمشیر ایسی ہے

کیسی ادا کر گئی بھا گئی
غضب آ گیا اک بلا آ گئی

خزاں چل بسی فصلِ گل آ گئی
چلو میکشو وہ گھٹا چھا گئی

لذت سے اپنی جان پہ کھیلے ہوئے ہیں ہم
یہ سر جدا ہے جسم سے یا تم رقیب سے

وفا کرتے ہیں ہم پھر بھی ہمیں تم سے ندامت ہے
اِسے کہتے ہیں ہم الفت بندہ پرور یہ محبت ہے

کسی دن دیکھیو تیرے ہی قدموں پر یہ سر ہوگا
جو قاتل ہم سلامت ہیں جو قاتل تو سلامت ہے

سو بار صدقہ ہوکے یہی چاہتا ہے جی
سو بار اور آپکے قربان جائیے

بسبب تعلقہ حسن کے عرضِ تمنا پہ یہ کہا
بس ہو گیا دماغ پریشان جائیے

آپ سے حورِ جناں بھی مات ہے
روز و شب فرقت کے دونوں ہیں بلا

آپکی کیا بات ہے کیا بات ہے
رات دن سے دن سے بدتر رات ہے

انداز دلفریب ہیں شوخی بلا کی ہے
جسپر مٹا اُسی نے مٹایا غریب کو

ہر بات لاجواب مرے دلربا کی ہے
تقدیر ہی خراب دلِ مبتلا کی ہے

یہ حال اب تو ہے ترے بیمارِ ہجر کا
یارب جو تو بھی اُن کا طرفدار ہوگیا

کہتے ہیں چاؤگر بھی کہ مرضی خدا کی ہے
ہم اور کسکو اور محشر بنائیں گے

ہیں دم میں دم تو راہ پہ لاوینگے ہم سجھے
زاہد جو تجھ سے اُلجھے کسی روز مے پرست

زندہ رہے تو دل ہیں ترے گھر بنائیں گے
ظرفِ وضو کو توڑ کے ساغر بنائیں گے

ہاتھ ملتا ہوں کہ کیوں حشر میں کی تھی فریاد
آگیا ہجر میں کوئی تو ذرا دل ٹھیرا

آنکھ نیچی ہے نظر مجلو پشیمانی ہے
پھر وہی میں ہوں وہی میری پریشانی ہے

جب تجھے سامنے میرے تو پریشانی تھی
اب جو وہ سامنے آئے ہیں تو حیرانی ہے

عاشق کو تیرے لاکھ کوئی رہنما ملے
تم مجھ سے آملے کبھی دشمن سے جاملے

تیرا پتہ ملا ہے نہ تیرا پتہ ملے
جب یہ مزاج ہے تو کوئی ملنے کیا ملے

جب دَیر میں یہ دیکھا کہ اپنا گذر نہیں
زاہد ہے تو ہی بندۂ اللہ ہم نہیں ؟

کعبے کے جانیوالوں میں مجبور جاملے
کوئی حدیث ہے کہ بجتی کو خدا ملے

دیکھو رسا چلے تو ہو تم توبہ توڑنے
در پر نہ میکدے کے کوئی پارسا ملے

بے بات وہاں ظلم ہے بے جرم سزا ہے
پرائے دل کا ستانا روا ہے کب تمکو

ایسے سے نباہے بھی تو کیا کوئی نباہے
یہ کس حدیث میں آیا ہے کس کتاب میں ہے

مجھے کچھ اور بھی کمبخت کے سوا کہیئے
ہمیشہ کی ہے دربار پر جبیں سائی

کہ یہ تو لفظ ازل سے مرے خطاب میں ہے
یہ بندگی بھی الٰہی کسی حساب میں ہے

یہیں جو فیصلہ کرنا ہے ہمسے فیصلہ کرلو
قیامت پر نہ رہنے دو قیامت پھر قیامت ہے

آنے کو نظر ہیں مری سو فتنہ گر آئے
تجھسا نظر آیا ہے نہ تجھسا نظر آئے

کرتا ہوں دعائیں تو یہ آتی ہیں ندائیں
تو ہو کسی قابل تو دعائیں اثر آئے

کرتا ہے وہی دل میں رسا کے جو ٹھنی ہے
سمجھانیکو سمجھاتے ہیں سب اپنے پرائے

ترے بیمار میں کہنے کو جانِ زار باقی ہے
نہونے کے برابر نبض میں رفتار باقی ہے

رکھیں گے غیر دردِ محبت کو دل میں کیا
یہ تو رسا کے دل میں رسا کے جگر میں ہے

بدلی اُدھر نظر تو ادھر بھی بدل گئی
اُنکی ہماری آنکھوں ہی آنکھوں میں چل گئی

مجرم سے اور پرسشِ اعمال حشر میں
کیونکر کہوں کہ شانِ کریمی بدل گئی

دونوں کو سوزِ عشق نے آخر کیا تمام
پروانہ پہلے جل گیا پھر شمع جل گئی

پہلے تو اُسنے دل کو مرے چاک کر دیا
پھر کہا یا کہ جا تری حسرت نکل گئی

دو گھڑی کے لیئے انسان کو خواب آتا ہے
بند ہو جاتی ہیں آنکھیں جو شباب آتا ہے

محبت یہ ہے آدابِ محبت نام اس کا ہے
کہ لب تک لا نہیں سکتا ہوں جو دل میں تمنا ہے

نہ پھرنا اپنے وعدوں سے سمجھ کر حشر کو اپنا
وہاں کا اور عالم ہے وہاں کی اور دنیا ہے

ترے اقرار سے دلکی جلن میں پڑ گئی ٹھنڈک
ترا حرفِ تسلی مرہم داغ تمنا ہے

نوشتہ میری قسمت کا کہاں سے اُسکے ہاتھ آیا
کہ جو کچھ خط میں لکھا ہے مری قسمت کا لکھا ہے

تمھیں جو مانگنا ہو اے رسا اللہ سے مانگو
بڑی سرکار ہے اُسکی بڑا وہ دینے والا ہے

گیا ہے بن سنور کر غیر کے گھر میہماں کوئی
اب ایسے میں نہیں آتی بلائے ناگہاں کوئی

وہ دم بھر کو سہی لیکن تسلی ہو تو جائے گی
وہ جھوٹی ہی سہی لیکن کرے تو مجھسے ہاں کوئی

کریں اقرار وہ پورا ابھی باور نہیں آتا
ہم ایسے ہیں ہمارے حال پر ہو مہرباں کوئی

حالِ دل کہنے میں کیسے وہ خفا ہونے لگے
عرضِ مطلب پر نہیں معلوم کیا ہونے لگے

عشق کا چرچا کہیں ہے حسن کا چرچا کہیں
تذکرے میرے تمہارے جابجا ہونے لگے

خط لکھا تھا میں نے میرے نامہ بر کی کیا خطا
اُسپہ کیوں بگڑے وہ اُسپر کیوں خفا ہونے لگے

مجھ سے لاغر کی شب غم کیا کہوں کیونکر کٹی
جو شکن بستر پہ تھی تلوار ہوکر رہ گئی

غیر کا مذکور بھی کوئی پیام وصل تھا
کس ادا سے نیچی نگاہِ یار ہوکر رہ گئی

اے رسا کبھی رہی سب داد خواہی حشر میں
جب وہاں نیچی نگاہِ یار ہوکر رہ گئی

پی کے کرلیتا ہوں توبہ جب سے یہ دستور ہے
دل بھی روشن ہے مرا منہ پر بھی میرے نور ہے

غیر سے ملنے کے شکوہ پر قیامت ڈھا گیا
اُنکا یہ کہنا کہ دل سے آدمی مجبور ہے

میں سوالِ وصل کرکے اس ادا پر مٹ گیا
ہنسکے فرمایا کہ یہ درخواست نامنظور ہے

حشر میں اللہ سے فریاد اُن کے ظلم کی
اے رسا یہ بات تو شرط وفا سے دور ہے

دل میں کسیکو رکھو دل میں رہو کسی کے
سیکھو ابھی طریقے کچھ روز دلبری کے

فرقت میں اشکِ حسرت ہم کیا بہا رہے ہیں
تقدیر رو رہی ہے پڑے ہیں بیکسی کے

آئے اگر قیامت تو دھجیاں اُڑا دیں
پھرتے ہیں جستجو میں فتنے تری گلی کے

دیکر مجھے تسلّی بے چین کر رہے ہو
ہنستے ہو وعدہ کرکے قربان اس ہنسی کے

یہ حضرت رسا بھی دیوانے ہوگئے ہیں
چکّر لگا رہے ہیں اک شوخ کی گلی کے

عدو سے اُسنے اگر کچھ ملال ہو جائے
رسا کی پھر تو نہ پوچھو نہال ہو جائے

بڑی ہی دھوم سے دعوت ہو پھر تو زاہد کی
یہ مے جو چار گھڑی کو حلال ہو جائے

ہجوم حشر میں کیا ہے جسے حالت ہو بیاں دلکی
بھری محفل میں کیونکر کوئی کہدے داستاں دلکی

وہ مجھ سے اُسنے آن بن ہی سہی شکوہ نہیں اسکا
مگر شامت ہی پھری اور اُنکے درمیاں دلکی

سنایا حالِ دل اُنکو تو یوں منہ پھیر کر بولے
کسی نے منہ لگایا چھیڑ بیٹھے داستاں دلکی

فرصت ملے تو آنکھ ملے مجھ غریب سے
آئینہ دور ہو کہیں اُنکے قریب سے

بیٹھیں وہ اُسکے سوگ میں اور میرے سامنے
اللہ موت دے مجھے پہلے رقیب سے

محشر میں اُسنے شرم سے نیچی نگاہ کی
ترکی تمام کی مری فریاد و آہ کی

ہم تو بہار بھر شراب کو ساقی ترس گئے
یہ دن بہار کے یونہی ابکے برس گئے

کر دے رہا کہ سیرِ چمن کو ترس گئے / صیاد تیرے صدقے اسیرِ قفس گئے

اٹھتے کہاں ہیں نقشِ قدم کی طرح سے ہم / اب تیرے ہو رہے ترے کوچہ میں بس گئے

مدت ہوئی ہے خانہ خرابی سے اور ہم / سمجھا وطن اسی کو جہاں رات بس گئے

نقشِ قدم نے آپ کے مجبور کر دیا / ہم کوچۂ رقیب میں کیا اپنے بس گئے

دیکھوں نہ آنکھ اٹھا کے بھی حورِ بہشت کو / ایسے کسی کے جلوے اِن آنکھوں میں بس گئے

کنجِ قفس میں رہنے کی عادت سی پڑ گئی / آزاد ہو کے بھی نہ اسیرِ قفس گئے

رسا کو دل میں رکھتے ہیں رسا کے جاننے والے / وفا کی قدر کرتے ہیں وفا کے جاننے والے

یہ وہ کافر ہیں بت ایمان اپنے لے ہی آتے ہیں / خدا کو ماننے والے خدا کو جاننے والے

وفا کی آزمایش کا سلیقہ تو ذرا سیکھو / بنو تو آشنا، نا آشنا کے جاننے والے

ترا کوچہ ہے ظالم اور مریضانِ محبت ہیں / کہاں جاتے ہیں اِس دار الشفا کے جاننے والے

کیا ذکرِ وفا میں نے تو یوں منہ پھیر کر بولے / زمانے سے مٹے رسمِ وفا کے جاننے والے

بتوں کے جاننے والے خدا کو جان جاتے ہیں / بتوں کو جانتے ہیں کیا خدا کے جاننے والے

خدا کا جاننا بس تھا تو کیوں دنیا میں آئے تھے / خدا کے پاس ہی رہتے خدا کے جاننے والے

رسا کو سب نے سمجھایا مگر سمجھا نہ کچھ ظالم / ہوئے مجبور اس مردِ خدا کے جاننے والے

ہوا ہے زرد مرجھان پھول سا چہرہ / عدو سے ملکے یہ کیا اپنا حال کر بیٹھے

رسا

رسا۔ سید احمد حسین رسا لکھنوی، جگت پور ضلع رائے بریلی میں سنہ ۱۹۰۱ء میں قیام تھا، حالات باوجود تلاش بہم نہ پہنچے، اشعار ملاحظہ ہوں۔

تمھاری چال کا مارا تمھارے ناز کا کشتہ / مسیحا کے جلانے سے بھی اچھا ہو نہیں سکتا

ستا لو جتنا جی چاہے زباں سے اُف نہ نکلیگی / مرے منہ سے کبھی شکوہ تمھارا ہو نہیں سکتا

دمِ رحلت وہ آئیں یا نہ آئیں سب برابر ہے / کسی صورت سے اب بیمار اچھا ہو نہیں سکتا

رسا

رسا۔ جناب سید ابو الحسن صاحب خلفِ راجہ میر محمد حسین صاحب شاگرد جناب ہنر ۱۸۸۶ء

ہیں حیات تھے اِس سے زیادہ حال معلوم نہ ہوا۔ چند اشعار درج ہیں۔

تڑپتا ہے سسکتا ہے تمھاری آشنائی میں
نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے دلِ مضطر جدائی میں

مَیں روتا ہوں جو نام اُس بت کا لیکر تو وہ کہتا ہے
رسا رسوا کرو گے تم ہمیں ساری خدائی میں

شوقِ دیدار میں بس موت کا چلتا ہی نہیں
دم مری آنکھوں میں اٹکا ہے نکلتا ہی نہیں

کس طرح ضبط کروں دل نہو جب قابو میں
یہ تو کمبخت سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہیں

دعوتِ ناوکِ دلدار کروں خاک رسا
دل سے اک خون کا قطرہ تو نکلتا ہی نہیں

رسا۔ سید محمد سمعیل باشندہ گیا، انکا بیان ہے کہ انکے بزرگ ہمدان سے آئے تھے، نئی طرز میں اکثر طبع آزمائی کرتے ہیں رسالوں میں انکا کلام بھی اکثر چھپتا رہتا ہے، زبان اور مضمون دونوں کا خیال رکھتے ہیں طبیعت کا رنگ ملاحظہ ہو۔

وہ فصد کر رہے ہیں اگر لالہ زار کا
آ ہیں کھلا ہے باغ دلِ داغدار کا

زلفیں ہیں یہ گھٹا ہیں چھائی ہے باغ پر
مُوباف کھُل گیا ہے عروسِ بہار کا

ناصح خیالِ توبہ ہے لیکن مَیں کیا کروں
مجبور ہوں کہ ہے ابھی موسم بہار کا

ہل چل یہ میکدے میں نہیں آج بے سبب
تقوی ہے ٹوٹتا کسی پرہیزگار کا

اپنے حنائی ہاتھوں کی مٹھی کو کھولدے
کچھ کچھ پتا چلا ہے دلِ بے قرار کا

تختے کھلے ہوئے نہیں پھولوں کے باغ میں
جوبن نکھر رہا ہے عروسِ بہار کا

کس چشمِ سرمگیں کا ہیں کشتہ ہوں اے رسا
آہو طواف کرتے ہیں میرے مزار کا

کیا دھُواں دھار گھٹا اُٹھی ہے میخانے سے
ساقیا نور کا منہ برسے گا پیمانے سے

حلق پر تیغ دو دم رکھ کے بھی پھیری نہ گئی
کیا بلا تجکو ستمگر مرے تڑپانے سے

رہے ہر حال میں تقدیر پہ شاکر انسان
سب بنے کام بگڑ جاتے ہیں گھبرانے سے

قتل کے بعد ہے یہ حسرت و افسوس عبث
جی نہ اٹھونگا میں ظالم ترے پچھتانے سے

حمد خالق میں عندلیبِ قلم
حمد گلفشاں ہے زہے نصیبِ قلم

غنچے دیتے ہیں یوں چٹک کے صدا	وحدہٗ لاشریک ہے وہ خدا
پھول بوٹوں میں رنگ قدرت کا	پتا پتا گواہ صنعت کا
کوئی سمجھا نہ آجتک یہ راز	سرو قمری میں کیوں ہے راز و نیاز
کرتی ہے نالۂ و بکا بلبل	گل تر پر ہے کیوں فدا بلبل
کیسے کیسے حسین کیئے پیدا	نازنیں مہ جبیں کیئے پیدا
باغ عالم کو زیب و زینت دی	لوٹ ہوجائیں دل وہ صورت دی
دیکھکر جلوہ اُس کی قدرت کا	ہے فرشتوں میں شور صلِ علیٰ
حمد کرتے ہیں اُسکی جن و بشر	اُسکے اوصاف ہیں زبانوں پر
ایسی آنکھیں کہاں سے لائیں ہم	اُسکی قدرت کو دیکھ پائیں ہم
ذاتِ باری کو کوئی کیا جانے	آپ اپنے کو وہ خدا جانے

رسا منشی سید شاہ عبدالعزیز بہاری شاگرد مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی ۱۸۹۳ء سے مشق سخن کرتے ہیں اور اپنے اُستاد کے تلامذہ میں ممتاز ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہشت میں بھی نہ چھوٹے گی مےکشی مجھ سے	وہاں بھی ہاتھ میں بوتل شراب کی ہوگی
کلیم کو جو جھلک طور پر دکھائی دی	نقاب چہرے سے اُس شوخ کے ہٹی ہوگی
تمھارے حسن میں بےشک زوال آئیگا	ہمارے عشق میں ہرگز نہ کچھ کمی ہوگی

رسا۔ مرزا غلام مصطفےٰ صاحب مددگار ناظم اُمور مذہبی ریاستِ حیدرآباد دکن، پہلے شاید رسوا تخلص تھا اور مہاراجہ پیشکار مدارالمہام کی سرکار میں ملازم تھے، حضرت داغ کے دکھنی تلامذہ میں صاف اور اچھا کہنے والوں میں ہیں، حالات کے لیئے متواتر خط بھیجے مگر جواب نہ ملا۔ مجبوراً اندراجِ کلام پر اکتفا کیا گیا۔

قسمت پر اپنی ناز کرے سبزہ زار ہند	آتا ہے پایہ تخت میں پھر تاجدار ہند
دلّی میں مثلِ رحمتِ باری ہے جلوس	لندن سے آرہا ہے شہ کامگار ہند

قائمقام سارے زمانے کے جمع ہیں
آتے ہیں سب رئیسِ عقیدت شعارِ ہند

وہ روشنی ہے شہر میں راتوں کو آجکل
جسکی ضیا سے ایک ہیں لیل و نہارِ ہند

شاہنشہا ورود سے تیرے کچھ اور ہے ......
تزئینِ ہند و رونقِ ہند و بہارِ ہند

پہلے سے شانِ ہند کی کچھ کم نہیں مگر
آنے سے تیرے اور بڑھا افتخارِ ہند

جس شان سے سواریٔ اقدس رواں ہوئی
تاریخ میں رہیگی یہ اِک یادگارِ ہند

شاہا جلو میں تیرے رسالوں کے وہ پرے
ایک ایک جن میں رستم و اسفندیارِ ہند

جاندار بن کے چلتی ہے روزِ وغا شہا
قبضے میں تیرے تیغِ جواہر نگارِ ہند

قطعہ

تھی خانہ جنگیوں سے نہ فرصت کسے کبھی
کب تھا کسی زمانے میں یہ اقتدارِ ہند

کیا چین سے گذرتی ہے تیرے زمانے میں
اے شہریارِ لندن و اے تاجدارِ ہند

بے انتظامیوں کا نہیں دخل اب کہیں
سنجیدگی سے چلتے ہیں سب کاروبارِ ہند

اب ایک ہی ہے مشرق و مغرب کا بادشاہ
کیونکر نہ دونوں میں بڑھے اعتبارِ ہند

زندہ کیا حضور نے اکبر کے نام کو
کیوں خلق آپ کو نہ کہے افتخارِ ہند

وہ جو رسا ہے بندۂ دیرینۂ نظام
دیتا ہے یوں دعا تجھے اے تاجدارِ ہند

فرخندہ و مبارک و مسعود و سازوار
دربار ہو یہ اے شہِ عالی تبارِ ہند

پھولے پھلے زمانہ میں گلزارِ خسروی
گل پھول تا کھلائے چمن میں بہارِ ہند

آباد و شاد اسپررو اپرس رہیں
ہو جاں نثارِ شاہ ہر اک جاں نثارِ ہند

جتنے رئیس ہند میں سب پر ترا یہ لطف
سب مانتے ہیں تجھکو کہ ہے تاجدارِ ہند

آصف سے اتحاد کا محکم ہو رابطہ
ہے وہ رفیقِ دولتِ عظمت مدارِ ہند

رستم

رستمؔ منشی رستم علیخان رستمؔ، الہ آباد کے باشندے اور ۱۸۹۷ء میں مرزاپور میں مقیم تھے رسالۂ پیامِ عاشق سے کلام نقل ہوا۔

کٹ گئی عمر مگر تو نہ کٹی کاٹے سے
طول کس درجہ ترا اے شبِ ہجراں دیکھا

اُن نرگسی آنکھوں کے تصور میں ہوں بیمار / نیند آنکھوں میں آتی نہیں اک دم شبِ فرقت
درپیش عدم کا ہے سفر ساتھ چھٹا آج / لے تجھ سے بھی رخصت ہوئے ایامِ شبِ فرقت
سب چھوٹ گئے اپنے بچھوڑا مجھے رستم / تا عمر رہی ہے مری ہمدم شبِ فرقت

رُسوا

رُسوا۔ لالہ آفتاب رائے رُسوا جوہری ساکن شاہجہاں آباد عہدِ اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶-۳۷ء) دائم الخمر اور بازاروں میں غزلیں پڑھتے پھرا کرتے تھے، مرتے وقت وصیت کی کہ شراب میں غسل دینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یہانتک، کہ کپڑوں پر بھی شراب چھڑکی گئی مگر روایت ہے کہ جنازہ اُٹھاتے وقت کسی کو بھی شراب کی بو نہ آئی، یہ کلام بہم رسیدہ کا خلاصہ ہے، ؎

رُسوا ہوا، خراب ہوا اور بدر ہوا / اِس عاشقی کے پنتھ میں جس کا گذر ہوا

مست ہو کر گر پڑے ہیں ہر طرف دیوار و در / ابرِ رحمت ہے برستا یا برستی ہے شراب
قفس سے چھٹ گئے ہم اور چمن میں جائے نہیں / اُڑیں تو پر نہیں رکھتے چلیں تو پائے نہیں
رُسوا بھی اِس زمانے میں مجنوں سے کم نہیں / کوئی جا نہیں زمیں پہ کہ اشکوں سے نم نہیں
وصل میں بیخود رہے اور ہجر میں بیتاب ہو / اِس دیوانے دلکو رسوا کس طرح سمجھائیے

رُسوا

رُسوا۔ شیخ محمد عبد الحمید رُسوا ابن شیخ امداد علی متوطنِ غازیپور مقیم آگرہ چند فارسی غزلیں مرزا نوشہ غالب کو دکھائیں تھیں۔ اُردو میں مرزا مہر سے اصلاح لی تھی۔ سنہ ۱۸۴۱ء میں پیدا ہوئے تھے اِسکے سوا اور کچھ حال دستیاب نہوسکا۔ کلام حاضر ہے۔

اگر دلِ مومنوں کے زاہد وا عرشِ خدا ٹھیرے / بتوں نے جب اُنھیں چھینا تو پھر تبلاؤ کیا ٹھیرے
کہا میں نے ذرا ٹھیرو تو دل لے دلربا ٹھیرے / کہا اُس گیسوؤں والے نے اب کسکی بلا ٹھیرے
دلِ مضطر ہمارا سینۂ سوزاں میں کیا ٹھیرے / کہاں سیماب و آتش دونوں باہم ایکجا ٹھیرے
لبِ جاں بخش کی تیری ہوئی کشتی جو اے قاتل / عجب کیا ہے جو اُنکی خاک بھی خاکِ شفا ٹھیرے

رُسوا

رُسوا۔ صاحبِ طبع رسا منشی کفایت علی رُسوا اکبرآبادی، قاضی سیّد محمد ہاشم علی مغفور کے خلفِ اصغر ہیں، بمقام آگرہ پیدا ہوئے، انکا خاندانی سلسلہ سیّد علی ہمدانی سے ملتا ہے

مولوی سید گلزار علی اور مولوی محمد بشیر سے تحصیل عربی فارسی کی فن سخن میں شروع میں مرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبرآبادی سے تلمذ اختیار کیا اور اُنھیں کے ارشاد کی تعمیل میں شہیل تخلص کیا، لیکن چونکہ طبائع و مذاقِ سخن میں اختلاف تھا کچھ دنوں بعد نواب فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے تلمذ سے بہرہ یاب ہوئے، شوخی فکر اور طبیعت کا چلبلاپن کلام سے ظاہر ہے سنہ ۱۸۹۰ء میں گوالیار جاکر ملازم سرکار سیندھیہ ہوئے اب عدالتِ دیوانی ضلع سکرواری میں اہلمد ہیں سن شریف قریب چالیس بیالیس سال کے ہے، طبیعت کا چوچلا مفصلۂ ذیل اشعار سے ظاہر ہے ؎

یہ کلیجہ ہے میرا، دل ہے میرا، دم ہے میرا
آپ کے تیر کو پہلو سے نکلنے نہ دیا

غم و یا رنج دیا، داغ دیا، درد دیا،
اُسنے سب کچھ دیا ارمان نکلنے نہ دیا

تیری خاطر سے رقیبوں کا بھی اپنے شکوہ
دل میں آیا تو سہی منہ سے نکلنے نہ دیا

ملے جو قسمت سے ایسا موقعہ تو لطف آئیگا زندگی کا
مزا تو جب ہے کہ وصل میں ہو زبان کسی کی دہن کسی کا

ملے تجھے قسمت سے وصل کی شب مذاق کیسا یہ مجکو سوجھا
بگڑ گئے وہ شکایتوں سے نتیجہ نکلا یہ دل لگی کا

سوال ہوگا تو اور ہی کچھ جواب دینگے وہ اور ہی کچھ
مزا تو آئیگا حشر کے دن ہماری اُنکی چلی کٹی کا

یہ نا ملال ہوگا ذرا اُنھیں انفعال ہوگا
وہ چھپ کے نکلے عدو کے گھر سے یہی تو ہے وقت بندگی کا

گلے سے اپنے لگاؤ اُنکو شکایتوں سے حصول رُ سوا
لگا ہی قسمت سے ہاتھ یہ دن نہیں ہے موقعہ چلی کٹی کا

کون کرتا ہے الٰہی یہ شرارت مجھ سے
خط پہ خط مجھکو جو گمنام چلے آتے ہیں

یہ جلانیکا نیا ڈھنگ کیا ہے ایجاد
غیر کے خط بھی مرے نام چلے آتے ہیں

کون سنتا ہے ہماری کہ کریں داد طلب
ہائے محشر سے بھی ناکام چلے آتے ہیں

ہم تجھے قتل کرینگے سرِ محشر آکر
ابتو نوٹس یہ مرے نام چلے آتے ہیں

آنکھوں آنکھوں میں اشارہ ہے کہ لو اپنے دل
پردے پردے میں وہ مطلب کی سُنا دیتے ہیں

حضرت درد کو آنا ہے تکلف کیسا
آپ جب اُٹھتے ہیں تو مجکو بٹھا دیتے ہیں

کیا صلہ ہمکو ملیگا یہ زباں سے کہدو
ہم نشانِ دلِ گم گشتہ بتا دیتے ہیں

اپنا دل دیجئے گنہگار نے کیا کہنا ؟
عاشقوں کو وہ سزا روزِ جزا دیتے ہیں

کھو دیا جسنے ہمیں دونوں جہاں سے رسوا
ہم تو اس کو سنے والے کو دعا دیتے ہیں

کسی کے روئے انور کا تصور رہو تو ایسا ہو
ہٹائے سے نہ ہٹتا ہو مٹائے سے نہ مٹتا ہو

مزا اس آمد و شد کا قیامت تک رہے باقی
مٹے حسرت اگر کوئی تو پھر ارمان پیدا ہو

دل یہ خالی نہیں رہتا کبھی ارمانوں سے
روز گھر اپنا بھرا رہتا ہے مہمانوں سے

یہ نیا حکم ہے قائل ہوں تری شوخی کا
نہ تو اپنوں سے ملوں اور نہ بیگانوں سے

پھر امنگوں کا ظہور اس دلِ ناشاد میں ہے
کچھ ترا رحم بھی شامل تیری بیداد میں ہے

نارسائی ہمیں سُنواتی ہے باتیں کیا کیا
یہی دھبّہ تو بڑا دامنِ فریاد میں ہے

مجھ سے ناخوش ہو جو تم ہیں بھی خفا ہوں جتنے
ایک سے ایک بھلا عالمِ ایجاد میں ہے

دربدر ڈھونڈھنے سے فائدہ، حاصلِ مطلب
یار کا گھر تو ہمارے دلِ ناشاد میں ہے

وہ اگر ظلم بھی کرتے ہیں تو ہے عہدِ وفا
یاں گذارش بھی تو داخل مری فریاد میں ہے

آپ بےمثل ہیں یکتا ہیں مگر یہ کہیئے ؛
کوئی رُسوا سا بھی اِس عالمِ ایجاد میں ہے

رُسوا

رُسوا — سیّد محمد اصغر رُسوا خلف میر وزیر علی اخگر مرحوم لکھنوی، حضرت رشید لکھنوی کے باعقیدت تلامذہ میں ہیں، خوش فکر شیریں کلام شاعر ہیں، بندش اور مضمون دونوں کا لحاظ رکھتے ہیں، یہ کلام کا نمونہ ہے ؛

ہمنشینوں سے چھپا کر تجھیں چاہیں کیونکر
چھپ سکینگی یہ محبت کی نگاہیں کیونکر

سر سے ٹلتی ہیں حسینوں کی بلائیں کیونکر
یا خدا ہوتی ہیں مقبول دعائیں کیونکر

مجھ سے کیا پوچھتے ہو ناز و کرشمہ کیا ہے
قتل کی اپنے بتا دوں تجھیں راہیں کیونکر

وصل کی رات ہے پہلے یہ بتا دو مجھکو
تم کسی بات پہ رُوٹھو تو منائیں کیونکر

نہ سہی عشق۔ مروّت بھی ہے آخر کوئی شے
رسم بڑھجائے کسی سے تو گھٹائیں کیونکر

کرتے ہیں زندہ جاوید مجھے کاٹ کے سر — آب شمشیر نہیں آب بقا دیتے ہیں

عبث کھٹکا ہے چشمِ باغباں میں — کہ اب کیا تھا ہمارے آشیاں میں

قتل کا مانع ہیں اے قاتل نہیں — پر ابھی یہ ہاتھ اس قابل نہیں

دیکھتا ہوں گو قصور ہیں سے تجھے — چاہیئے جو لطف وہ حاصل نہیں

کام کیا مجھ دل شکستہ کا وہاں — شمع کشتہ لائق محفل نہیں

باغ عالم میں جو سونگھا پھول پائی تیری بو — ہر ورق گل کا مزین تھا تری تصویر سے

برہمی زلف سے سب رازِ سربستہ کھلا — مدعا پایا تیری الجھی ہوئی تقریر سے

ابھی تلاشِ رہِ میکدہ میں بیٹھے واعظ — تم اس گھڑی ہمیں گویا کہ خضرِ راہ ملے

ہنسی میں بھی ہو بسر کدورت لیا ہو بوسہ جب بے اجازت — مٹی ہو تقدیر کی یہ صورت ہنسا ہنسا کر رلا رہا ہے

نقط لہو کا تھا ایک قطرہ بہا وہ آنکھوں کی راہ سارا — وبال ہے ہو جو دل ہمارا تو تمہیں ایجان کیا رہا ہے

چھپایا رازِ محبت اپنا کہ پی گیا آنسوؤں کا دریا — یہ رنگِ رخ کو کہو کروں کیا یہ درد دل کا بتا رہا ہے

کچھ عبث آفت میں جانِ عاشقِ دلگیر ہے — ضعف دامنگیر ہے وحشت گریباں گیر ہے

یہ سمجھ کر مجھ سے منہ پھیرے ہوئے بیٹھے ہیں وہ — زخمِ دل کے واسطے سوزن نگہ کا تیر ہے

ہے گمان تسکین کا ہی ظلم کی بس انتہا — اس پہ پچھتاتا ہے قاتل دل میں میرے تیر ہے

بیخودی شوقِ جوابِ خط میں دیکھے تو کوئی — ایک ہی مطلب ہے لیکن سو جگہ تحریر ہے

یاں دم آنکھوں میں ہے اور واں یہ گذرتی ہے خبر — آنکھ بیمار نے اب کھولی ہے حال اچھا ہے

یہ کہہ کے آج وہ بہت بڑھا گیا میری — تری وفا سے پشیماں ہوئی جفا میری

رُسوا

رُسوا منشی سید باقر حسین صاحب لکھنوی ملازم میونسپل کمیٹی لکھنو۔ داغ دہلوی کی شاگردی کا دم بھرتے ہیں اور حسن آدمی ہیں، یہ انکا کلام ہے۔

پری ہو، حور ہو، یا آدمی ہو — تلاش خوبرو ہے اور ہمیں ہوں

کیوں نہ پروانہ ہو دل شمع حجابِ یار کا — ہے فروغِ عشق عاشق کے لئے پیغام عشق

وہ بات بات پہ تیغِ ستم دکھاتے ہیں ہٹا دے بیچ سے مشتاق کی دیوار آئینہ	قضا کا سامنا ہے پر قضا نہیں آتی تماشائے فروغِ حسن سیرت دیکھنے والے
صدمۂ ہجر سے جو لگی ہوئی ہے حالت کہا جو میں نے کہ مانگو تو دل ہیں نذر کروں	کس طرح چہرے کے پہلو کو دکھائے کوئی تو بنیسکے بولے ہیں التجا نہیں آتی

رسوا

رُسوا پنڈت گنگا پرشاد صاحب تذکرہ ہنود سے کلام لیا گیا۔ ملاحظہ ہو:

اے پری کوچے سے تیرے کیوں قدم اٹھتا نہیں تھے مجھے ہنگامۂ محشر پہ کیا کیا اعتراض	پڑ گیا مجھ پر بھی کیا سایہ تری دیوار کا جب تلک دیکھا نہ تھا عالم تری رفتار کا

رُسوا

رُسوا منشی سید اولاد حسین بریلوی از سادات نومحلہ، آپ ریاستِ جیپور کی کونسل عالیہ میں وکالت کرتے تھے، پھر ناظم بھی ہو گئے تھے ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا، بڑے نکتہ فہم نکتہ رس سخن سنج تھے، لیاقت علمی بہت اچھی تھی، شعر کا شوق بہت کم تھا مگر جب کہتے تھے تو خوب کہتے تھے، فی البدیہہ شعر کہنے کی اچھی مہارت تھی، قاضی محمد خلیل صاحب کی زبانی چند اشعار سُنے وہ درج کیے گئے:

بہار چھا گئی آنکھوں میں جب سرور آیا شراب چھوڑ کے نیت ہوئی ہے ڈانوا ڈول ہماری آنکھ کی اللہ رے مستیاں بے مے لوگ کہتے ہیں کہ عالم میں بہار آئی ہے اک جہاں کشتۂ اندازِ خود آرائی ہے ہم اتنی زیست میں تنگ آ گئے ہیں حضرتِ خضر ہمیں یہ شرم کہ رسوا ہاں نہ ترکِ محبت ہے وہی فغاں ہے، وہی آہ ہے، وہی نالہ	شراب پینے سے کافر کے منہ پہ نور آیا یہ کیسی توبہ کہ ایمان میں فتور آیا کسی حسیں پہ نگہ جب پڑی سرور آیا دیکھتے ہم جو گذرتے سوئے زنداں ہو کر آپ جو چاہیں کریں آپ کی بن آئی ہے کہاں سے لاتے جگر عمرِ جاوداں کے لیے کھینچے گئے خود غرض تھے چار دن کی آشنائی تھی خدا کے فضل سے اپنا جو حال تھا سو ہے

رُسوا

رُسوا۔ مولانا فیض احمد صاحب بدایونی، بار بار حالات کے لیے لکھا گیا، مگر باوجود اقراروں کے

کچھ اطلاع نہ ملی، مکرمی و محبّی قاضی محمد خلیل صاحب کی بیاض سے کلام نقل ہوا۔

تبخانوں میں دے پھر اذانیں	قطعہ	ناقوس بھی کعبہ میں بجایا
لیکن نہ کسی نے یوں بھی پوچھا		بے وقت یہ راگ کس نے گایا
تم جسے چاہو چڑھالو سر پر		ورنہ یوں دوش پہ کاکل ٹھیرے
کوئلیں بولیں پپیہے کوکے		روز و شب شیشہ سے قلقل ٹھیرے
بد دماغی ہے فقط میرے ساتھ		کان کی بات مری غل ٹھیرے
ہم جو چپ ہوں تو سٹری کہلائیں		شیخ چپ ہوں تو توکل ٹھیرے
محفل میں اسکی دور کھڑے ہیں دبے ہم		ہیں اسکے منتظر کہ اشارہ کرے کوئی
کرتا ہوں دیر اسلیئے دینے میں جان کے		مجکو پسند ہے کہ تقاضا کرے کوئی
کہتے ہیں جسنے چھوڑی خودی وہ خدا ہوا		درگذرے ہم خدائی سے کنارہ کرے کوئی

رسوا

رسوا۔ جناب مرزا ہادی حسن صاحب رسوا، حاجی مرزا ولی جان بیگ کے بیٹے بریلی کے باشندے اور حضرت اسیر کے شاگرد ہیں، آپنے جو تقریظ خمخانۂ جاوید پر لکھی ہے وہ جلد دوم کے آخر میں درج ہے۔ کلام کا نمونہ حاضر ہے

نظر آتی ہے جور چرخ سے ویرانی عالم	کھلی آنکھیں نظارہ کرتے ہیں خواب پریشاں کا
روتے ہیں اپنے حال شکستہ پہ صبح تک	منہ ڈھانکتے ہیں دامن چاک سحر سے ہم
آنکھوں سے دل میں کھینچتے ہیں عکس روئے یار	فوٹو کا کام لیتے ہیں تار نظر سے ہم
رخ میری سمت اور نظر لطف غیر پر	اپنی نظر میں گر گئے انکی نظر سے ہم
رہا راز محبت سوز پنہاں میں نہاں برسوں	کیئے اسرار دل رنگ پریدہ نے عیاں برسوں
کسیکی پردہ پوشی دل سے منظور نظر رکھی	رہا طفل سرشک آغوش مژگاں میں نہاں برسوں
سوال وصل پر وہ بن گئے تصویر خاموشی	رہا رنگ حیا چشم مروت میں نہاں برسوں
بنا یہ جسم خاکی مرکب جاں مدتوں رسوا	چلی ریگ رواں ہی کشتی عمر رواں برسوں

بہار آئی الٰہی خیر ہو دستار زاہد کی ❊ کہ وحشی مائلِ چاکِ گریباں ہوتے جاتے ہیں
یقیں ہے کوئی دم میں حشر برپا ہونیوالا ہے ❊ کہ خورشیدِ قیامت داغِ ہجراں ہوتے جاتے ہیں
جنوں نے زور پکڑا آمدِ فصلِ بہاری ہے ❊ گل و بلبل بہم دست و گریباں ہوتے جاتے ہیں
جگر سے داغِ حسرت مٹتے جاتے ہیں شبِ وعدہ ❊ نئے گلدستے زیبِ طاقِ نسیاں ہوتے جاتے ہیں

رُسوا

رُسوا منشی سید افضال حسین شاگرد احسان شاہجہانپوری، آجکل کے شعرا میں انکا شمار ہے قاضی خلیل کے مشاعرہ کی غزل میں سے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

دلِ مجرم محبت کا کیے جاتا ہے اقرار ❊ بیخوف بھی مجرم کوئی ایسا نہیں ہوتا
جھپکے گی برق طور سے کیا عاشقوں کی آنکھ ❊ اِس میں تجلیاں ہیں تری جلوہ گاہ کی
زبانِ غیر کی تاثیر دیدے نطق میں یارب ❊ کسی کے سامنے اب قصدِ اظہارِ تمنا ہے
ہوا سنگِ جفا سے چور لیکن اُف نکی دِل نے ❊ ندی آواز جسنے ٹوٹکر بھی یہ وہ شیشا ہے
مری آنکھوں سے دِل میں بے تکلف تم چلے آؤ ❊ کوئی تمکو نہ دیکھے گا کہ یہ پردہ کا رستا ہے

رسوا

رُسوا۔ بابو ہر کشنداس رسوا، کلرک سدرن پنجاب ریلوے مقیم دہلی شاگرد آغا شاعر قزلباش دہلوی

ساقیا مجکو وہ مخمور دکھادے آنکھیں ❊ ہُوں ندیدہ مئے گلرنگ کے پیمانوں کا
تد توں ہو نہ سکا جب تری ابرو کا جواب ❊ ٹھوکریں کھائیں ہلالِ سُم توسن ہو کر
نیچی نظروں سے ہوئے جاتے ہیں بسمل لاکھوں ❊ حشر برپا ہو اگر آنکھ اُٹھائے کوئی
یاد آتا ہے شبِ وصل کسی کا کہنا ❊ ہاتھ ٹوٹیں جو ہمیں ہاتھ لگائے کوئی
کردیا پامال اِس صورت سے رُسوا کا مزار ❊ ٹھوکروں پر ٹھوکریں آتے ہوئے جاتے ہوئے

رسوا

رُسوا منشی شیخ محمد وحید باشندۂ ضلع سارن محرر سررشتۂ رجسٹری تحصیل بانس گاؤں۔ بیس برس سے مشق سخن کرتے ہیں اور جناب وسیم خیر آبادی کے تلامذہ میں داخل ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں ❊

ملی کیا اسکے ہاتھوں میں حنائے خونِ بسمل ہے ❊ قیامت آج جوبن پر عروسِ تیغِ قاتل ہے

ذرا دیکھو تو بیرحمی نہ دیکھا مڑ کے قاتل نے	کہ مقتل میں تڑپتا خاک پر کس طرح بسمل ہے
غریق عشق ہیں ہمکو نہیں ہے خضر کی حاجت	ہمارا رہنما دل ہے ہمارا پیشوا دل ہے
وہ کشتہ ہوں کہ مجکو مار کر ظالم پشیماں ہیں	کٹا جاتا ہے خنجر پانی پانی میرا قاتل ہے

رشک

رشک محقق علم شعر زائر کربلائے معلّی میر علی اوسط رشک مرحوم خلف میر سلیمان باشندۂ فیض آباد مقیم لکھنؤ شاگرد رشید امام الشعرا شیخ امام بخش ناسخ مرحوم، آخر عمر میں کربلائے معلّی میں سکونت اختیار کی تھی، علم زبان کے زبردست محقق اور ایک ضخیم ومبسوط لغت اردو کے مؤلف تھے لیکن افسوس ہے کہ وہ لغت شائع نہیں ہوا، جناب رشک اپنے زمانے کے مشاہیر شعرائے لکھنؤ میں شمار ہوتے تھے اور انکے شاگرد بھی بکثرت تھے، تاریخ گوئی میں اچھا ملکہ حاصل تھا انکے دو دیوان مسمّی بہ نظم مبارک ونظم گرامی غدر سے پیشتر چھپے تھے اب کمیاب ہیں، بڑے پرگو اور زود فکر کہنے والے تھے مگر رعایت لفظی اور ضلع جگت کے دام میں اسیر، لکھنؤ کے اساتذہ میں انکا شمار ہے مگر بیشتر حصّہ اشعار کا خشک کلامی اور بد مذاقی کے عیوب سے پاک نہیں کہا جاسکتا دور از قیاس تشبیہ واستعارہ برتنے کے شوقین اور اصلی مفہوم شاعری سے بے خبر تھے اس لئے اکثر مضامین حد درجہ مبتذل باندھ جاتے تھے تاہم بعض بعض جگہ انکی زور مشق اور استعداد کامل سے اچھے شعر بھی نکل جاتے تھے، طبیعت کا رنگ ظاہر کرنے کے لئے کچھ اشعار انکے خاص رنگ کے بھی درج انتخاب کر دیئے ہیں گو ہمارے مذاق کے خلاف ہیں، انکے تلامذہ میں منیر شکوہ آبادی رتبۂ استادی رکھتے تھے، حضرت رشک نے ۱۲۸۴ھ میں بعمر ۷۰ سال انتقال فرمایا۔

دیکھئے اللہ کی یہ قدرتیں	سنگ سے بت بت سے خدا ہو گیا
یوں بھی نہ پوچھا کبھی صیّاد نے	کون رہا، کون رہا ہو گیا

غمزہ نہ اٹھ سکا دل شیدا اٹھا لیا	کس چیز کو اٹھانے گئے کیا اٹھا لیا
کاہیدگی جسم اگر یونہی رہے گی	ہمکو بھی ہمارا تن لاغر نہ ملے گا
یا ساتھ ترے سوئینگے یا قبر میں جاکر	مدفن تو ملے گا جو ترا گھر نہ ملے گا

بوسہ ہمیں دیتا ہی تو دے دونوں لبوں کا
یوں تو مزۂ قندِ مکرر نہ ملے گا

جس رات نقاب اُس مہِ کامل نے اُلٹ دی
تاروں کو نشانِ مہِ انور نہ ملے گا

ایکدن کام ہی آجاتا ہے کھوٹا پیسہ
داغ سینے کا چراغِ شبِ ہجران ہوگا

پتھر کسیکا دل ہے کسیکا دلِ آئینہ
ششدر رہوں کارخانۂ پروردگار کا

جن دنوں آشوبِ عالم حسنِ چشمِ یار تھا
جسکو دیکھا نرگسِ بیمار کا بیمار تھا

دن کو کیونکر بے نقاب آتا وہ رشکِ ماہتاب
پردۂ شب سے جسے اکثر حجاب آیا کیا

بے ثباتی بحرِ دنیا کی کھلی جس روز سے
ہر فلک چشمِ تصور میں حباب آیا کیا

سیب کا پوست ہے وہ جلدِ ذقن
جلدِ پستاں انار کا چھلکا

قیس کو تھا حجاب ہم نہ ہوئے
کہ اُٹھا دیتے پردہ محمل کا

آتشِ عشق نے مجھے فکر سے پاک کر دیا
صورتِ نخلِ شعلہ ہوں غم نہیں برگ و بار کا

دیکھا جو چشمِ غور سے دونوں کا حال ایک ہی
گردشِ چشمِ یار کا گردشِ روزگار کا

اِس سے دلوں کو چین ہے اُس سے ہے شورشِ جہان
یار ہیں، آفتاب ہیں، فرق ہی نور و نار کا

رہا دنیا میں جبتک ہیں خیالِ زلفِ جاناں تھا
زمانہ زندگی کا مو بمو خوابِ پریشان تھا

جلایا باغ ایسا آتشِ رخسارِ جاناں نے
کہ ہر گل داغ تھا جو سرو تھا سروِ چراغاں تھا

اے عشق تیری بندہ نوازی کا ہوں غلام
محمود کو غلام بنایا ایاز کا

اللہ رے موسمِ بہاری
اُگتے ہے فلک سے تا زمیں سبز

فرشِ نفیسِ خاک ہے، سبزہ اگر نہیں
کنجِ لحد میں چین کرینگے جو گھر نہیں

اقرار کا یقین، نہ انکار کا یقین
تیری زبان پہ ہے ادھر ہاں اُدھر نہیں

تو ہی جیسا اِس خم و چم کا کوئی گلرو نہیں
یہ خمِ ابرو نہیں یہ حلقۂ گیسو نہیں

پھیر لاتا جا کے میدانِ عدم سے کتنی بار
توسنِ عمرِ رواں پر کیا کروں قابو نہیں

بحرِ دنیا کی نہایت کا نہیں تھل بیڑا
کشتیِ عمر جدھر جائے اُدھر جانے دو

آہیں بھر لوں گا تو کچھ بات سنائی دیگی
ناصحو پہلے یہ آندھی تو ٹھہر جانے دو

وہ بے نصیب ہوں جو کروں قصدِ میکشی
خونِ جگر شراب بنے دل کباب ہو

جو جو عذابِ وحشتِ جنوں ہمنے جھیلے ہیں
ان سب کا روحِ قیس کو یارب ثواب ہو

سر کھا گئے یک ایک کے نصیحت سے مرے دوست
طعنے ہیں جنوں میں مجھے پتھر سے زیادہ

کعبہ کی راہ لی درِ دلدار چھوڑ کر
پایا اسی سے حاجیوں کو سال بھر تباہ

انکا مزاج غیر جو آکر بدل گئے
کچھ کہہ کے وہ زبان برابر بدل گئے

جو شے تو حاتم سے طے ہے ندے تو قاروں ہو
طرح طرح سے زمانے میں نام ہوتا ہے

ذرا سے رنج میں ہمکو حلال کرتے ہو
اسی سے کہتے ہیں غصہ حرام ہوتا ہے

کھول کر زلف کہا اژدرِ موسیٰ کیا ہے
ہاتھ چمکا کے وہ بولے یدِ بیضا کیا ہے

راستہ صبح تک اے رشکِ قمر دیکھیں گے
آج ہم شام سے آہوں کا اثر دیکھیں گے

اک بتِ بدگماں سے ملنے پر
سارے عالم کی بدگمانی ہے

شبِ ہجراں سحر ہوئی تو کیا
کسے امید زندگانی ہے

اب تو باتیں بھی ہوگئیں موقوف
ارنی ہے نہ لن ترانی ہے

کہیں زلفوں سے دل آنکھیں نہ لے لیں
اندھیری رات میں چوروں کا ڈر ہے

پورا ہوتا ہے چاند ایک ہی رات
ماہِ عارض ہمیشہ کامل ہے

چپکے سنتا ہوں بات ناصح کی
کہ خموشی جوابِ جاہل ہے

بے دلیل اسکو ہمنے پہچانا
عقل ناقص ہے فہم کامل ہے

کیا ہی جسم آدمی کو جلد کھا جاتا ہے غم
دشمنی ایسی نہیں دیمک کو جرمِ چوب سے

چار دن چین سے کھا سرد ہوا کے جھونکے
گھات میں لگ رہے ہیں بادِ فنا کے جھونکے

گرمیاں اور نئی اس بتِ کافر کی یہ ہیں
ٹھنڈی آہوں کو سمجھتا ہے ہوا کے جھونکے

ابر ہے، باغ ہے، دریا ہے، وہ گلفام نہیں
آج برباد ہوئے سرد ہوا کے جھونکے

ہجر میں آتی ہی برسات پڑا جلتا ہوں
اے خدا اجاڑ میں جائیں یہ ہوا کے جھونکے

جُنبش جو مژہ کو ہوئی برہم ہوئیں زلفیں
یہ سانپ سمجھ جاتے ہیں بچھو کے اشارے

فصلِ گُل آئی بہارِ توبہ سطے ہو جائیگی
رِیشِ زاہد پنبۂ مینائے مے ہو جائیگی

شوق اگر یوں ہی رہا آوازِ مطرب کا مجھے
آہ جو منہ سے نکل جائیگی سَے ہو جائیگی

کہاں یہ لطف چیتے نے اگر پائی کمر پتلی
تمھارے ہونٹ پتلے انگلیاں پتلی کمر پتلی

تجھے تشبیہ حیوانوں سے کیوں انسان دیتے ہیں
نہ وحشت چشمِ آہو میں نہ چیتے کی کمر پتلی

فقط تجھ میں عناصر نے عجب ترکیب پائی ہے
بدن شفاف شانے گول قد موزوں کمر پتلی

اچھی رفل کی گولی کا ہے توڑ نِل میں بھی
مژگانِ یار میں ہے اگر لاگ تیر کی

مژگانِ چشمِ تر کا یہ عالم ہے ہجر میں
پھبتی ہے مو بمو رگ ابرِ مطیر کی

ہم عشق سے بیتاب ہیں تم حسن سے مغرور
تقصیر ہماری ہے نہ تقصیر تمھاری

صبح و مہ و خورشید ہوں یا شمع شب افروز
کس کس میں نمایاں نہیں تنویر تمھاری

پھر نہ ٹھیریںگی چمن میں بلبلیں
جس دن سے گلگوں قبا دیکھا تجھے

کہاں سے لایئے کارِ ثواب کی فرصت
غمِ فراقِ بتاں سے عذاب رہتا ہے

وہ بادہ کش جو جلائے جگر جلانے دو
کہ اتفاق شراب و کباب رہتا ہے

آیئے! جب مزاج میں آئے
خانۂ دِل حضور کا گھر ہے

چھیڑ اُسنے یہ ہنگام ملاقات نکالی
جس بات میں رنجش ہو وہی بات نکالی

ای رشک رقیبوں سے ملاقات نکالی
نظارۂ جاناں کی عجب گھات نکالی

تعظیم کے حیلے سے اُٹھایوں کہ نہ بیٹھا
ہم گھر میں گئے تو یہ مدارات نکالی

بے وصل جو روتا ہوں تو ہو کر متبسم
فرماتے ہیں بے فصل کی برسات نکالی

شرمندہ ہے رُخِ گُل تر روئے یار سے
شبنم کا وہم ہے عرقِ انفعال سے

یہ خونِ دل پیا کہ ہوئی زندگی حرام
جبتک جیا کئے یہی ہمکو حلال ہے

ہم بادہ خوار جانتے ہیں ایک مسئلہ
زاہد جسے حرام کہے وہ حلال ہے

دل مرا کعبہ ہے تو ایمان ہے
اے پری میں جسم ہوں تو جان ہے

تو نے رکھی سان پر تلوار اگر
شہر کو سُن لیجیو حُسن سان ہے

تن جوشِ خوں سے لال ہے دل داغدار ہے
سودائیان فصلِ جنوں پر بہار ہے

تیر نگاہِ یار کا پلّا نہ پوچھیے
دیکھا تو نسرِ طائرِ گردوں شکار ہے

رگِ جاں میں چبھیں گے آج دن بھر تیر یا نشتر
وہ دورِ یادِ مژگاں ہے خیالِ روئے جاناں ہے

وہاں پلکوں کی جنبش ہے یہاں کانٹے کھٹکتے ہیں
یہاں حال پریشاں ہے وہاں زلفِ پریشاں ہے

فصلِ گل آئی نہ اُٹھیے خانۂ خمار سے
الحذر زہد و ورع سے توبہ استغفار سے

خونِ خم پیتا ہے کھاتا ہے بطِ مے کے کباب
محتسب کے ہوش اُڑتے ہیں ترے میخوار سے

چھوڑیے تُکّل لڑانا اب طلوعِ حسن ہے
کاٹیے تیغ مہِ نو ابروئے خمدار سے

بعدِ مردن خاک کا انبار یا لوحِ مزار
اے اجل اسکے سوا کیا خاک پتھر چاہیے

جادۂ راہِ عدم کو شرطِ کامل ہے وجود
خانہ بربادی کو بھی پہلے کہیں گھر چاہیے

بھیج پیغام اے صنم اک آدمی مختار کر
ہے اگر دعویٰ خدائی کا پیمبر چاہیے

بات بطنِ صدف سے خوب ہاتھ آتی ہیں
لطف یہ ہے ہاتھ خالی دل تونگر چاہیے

روح شبہائے جدائی میں فنا ہو جائیگی
یادِ زلفِ عنبر افشاں اژدہا ہو جائیگی

حسن آئینہ بھویں ہونگی یہ تلواروں سے تیز
زلف سمجھے ہو جسے کالی بلا ہو جائیگی

ہونگے مرغانِ فلک پرواز تک تیر سے شکار
جنبشِ موجِ ہوا زنجیر پا ہو جائیگی

وہ سیہ کار زمانہ ہوں کہ میرے عکس سے
آرسی خورشیدِ محشر کی توا ہو جائیگی

بے قربِ یار خواہشِ ہستی بعید ہے
جینا مضر ہے ہجر میں مرنا مفید ہے

کوچۂ قاتل وہ جنت ہے جہاں ہیں یک قلم
خون کی نہریں سپر پھول پھل تلوار کے

صورت اگر یہی ہے وفورِ حجاب کی
اے ماہ چہرہ کیا تجھے حاجت نقاب کی

آیا ہوں کعبہ میں رہِ میخانہ بھول کر
یعنی خطا سے راہ چلا ہوں ثواب کی

شیشوں کو محتسب نے جو توڑا تو کیا ہوا
دلہائے میکشاں میں جگہ ہے شراب کی

روزِ سیاہِ دہر سمجھ رنگِ عارضی
دو چار روز رہتی ہے رنگت خضاب کی

ہوں اسیرانِ بلا میں وہ گنہگار قدیم
کبھی کھلتا نہیں دیکھا درِ زنداں جس نے

جرمِ سفاک نہیں خون مرا اس پر ہے
تیر کھینچا مرے دل سے مع پیکاں جس نے

نہ دیکھ چشمِ حقارت سے ای حباب مجھے
ثباتِ عمر پہ آتا ہے خود حجاب مجھے

ادا ادا میں نمک زخم پر چھڑکتا ہے
جو بات بات میں کرتا ہے وہ کباب مجھے

میں ایک بات میں رکھتا ہوں لاکھ دل میں جواب
وہ ایک بات میں کرتا ہے لاجواب مجھے

ہو عرش پر تو آپ کو زیرِ زمیں سے گنے
ہر دم کو آدمی نفسِ واپسیں سے گنے

سینے کے داغ وہ ہو کے میں گنواؤں رات بھر
تارے خدا کرے وہ بتِ مہ جبیں سے گنے

گنتے ہیں اے کریم ترے عفوِ بے حساب
اپنے گناہ ہم نے کسی دن نہیں گنے

اٹھ گئے ہم سفرِ عنفواں سے پہلے
چمن اپنا ہوا پامال خزاں سے پہلے

آدمی وہ ہے جو انجام نہ بھولے اپنا
گور کی فکر ہو تعمیرِ مکاں سے پہلے

ہیں قد و عارضِ جاناں کی شبیہیں اے رشک
باغ میں سرو و گل آئے ہیں کہاں سے پہلے

ہم سیہ بختوں کا سولی پر چڑھانا اور ہے
دارِ عیسیٰ اور ہے زلفِ چلیپا اور ہے

ایک موسیٰ غش ہوئے تھے اس سے لاکھوں مر گئے
جلوۂ حق اور ہے تیرا جھمکڑا اور ہے

دردِ سر نغمۂ بلبل سے سوا ہوتا ہے
دم مرا بادِ بہاری سے ہوا ہوتا ہے

یہ ہے تحقیق کہ تقلید سے کیا ہوتا ہے
پوجنے سے کہیں پتھر بھی خدا ہوتا ہے

ایک دن عید کا دنیا میں تو غم کا عشرہ
رنج آرام سے وہ چند سوا ہوتا ہے

نہ گدگدائیے اتنا کہ آدمی رو دے
ہنسا ہنسا کے رلانے کو کون کہتا ہے

اگر رقیب کے پیچے میں وہ نہیں ای رشک
تو پھر پتنگ اڑانے کو کون کہتا ہے

حقیقی کو مجازی کر دیا بے امتیازی نے
تماشے کے دکھائے کھیل مجکو عشقبازی نے

بڑھایا اوج عجز عاشقان و کبر معشوقاں
ہماری ناز برداری نے اُنکی بے نیازی نے

محبت ہمنے چھوڑی جب بڑھی تکرار آپس میں
کیا کوتاہ سب جھگڑا زبانوں کی درازی نے

رشک

رشک - جناب بابو گنگا پرشاد صاحب بلند شہری، ہیں بائیس برس ہوئے حیات تھے اور گاہ گاہ فکرِ سخن بھی کر لیا کرتے تھے۔

جب سے اُن کو گالیوں کی خو پڑی
ہمکو بھی سُننے کی عادت ہو گئی

شب آپکی بسر ہوئی کل کسکے گھر میں ہے
چہرہ اُداس دیکھتا ہوں درد سر میں ہے

رشک

رشک - مولوی حفیظ اللہ خان رشک سابق ہیڈ مولوی اسکول تال ریاستِ جاورہ آب وکیل ہو گئے ہیں حضرت فصیح الملک مرزا داغ کے پرانے شاگرد ہیں، خوش کلام، شیرین زبان تیز طبع شخص ہیں، اُستاد کے رنگ میں کہنے کا بہت شوق ہے، پچاس برس کے قریب عمر ہے زبان صاف اور مذاق شستہ و سلیم ہے۔

مری نگاہوں سے پوچھ اپنے حُسن کا عالم
کہ سادگی میں بھی اپنی تو وضعدار رہا

خدا دکھائے نہ پھر وہ گھڑی جُدائی کی
نہ پوچھیے جو ان آنکھوں کو انتظار رہا

اے شوخ دل بھی تیری طبیعت سے کم نہیں
رہتا نہیں کبھی کسی پہلو قرار پر

مجکو ستم کی بھی نہیں اُمید آپ سے
سینے سے دل نکالدوں کس اعتبار پر

لیے جاتا ہے مجکو شوق اُڑائے راہِ اُلفت میں
ہوا سے بھی ہوں آگے دو قدم اس ناتوانی پہ

پامال ہو یا ٹھوکریں کھا کھا کے سنبھل جائے
دل ڈالدیا اب تو تری راہِ گذر میں

نازاں تم اپنے حُسن پہ مجکو یہ ناز ہے
چھانٹا تمھیں کو میری نگہ نے ہزار میں

سُناتا ہوں جو حالِ دل تو جھنجلا کر وہ کہتے ہیں
مرے جاتے ہو کیوں جلدی ہے کیا سُن لینگے فرصت میں

مقدر کا نوشتہ جبہہ سائی سے کہیں مٹتا
عذابِ ہجر کیوں ٹلتا کہ یہ تھا میری قسمت میں

مجھے کچھ دین و دنیا کی خبر مطلق نہیں سچ ہے
چھُٹے کونین کے غم سے پھنسے جو دامِ اُلفت میں

جلایا دل، جگر پھونکا، لگائی آگ سینہ میں
قیامت کی ہے گرمی سوزشِ داغِ محبت میں

کیا نیا ہوگے محبت بس اجی بیٹھے رہو
دیکھ لی چشمِ مروت بس اجی بیٹھے رہو

قرب کیسا دور کی صاحب سلامت بھی نہیں
ہے اسی کا نام الفت بس اجی بیٹھے رہو

دل کی حالت پوچھنے پر ہو گئے اتنے خفا
یہ بھی تھی کوئی شکایت بس اجی بیٹھے رہو

غیر کی تعظیم ہو وہ بھی ہمارے سامنے
خوب کی قدرِ محبت بس اجی بیٹھے رہو

مجھ سے جو وعدہ کئے جائیں عدو سے ہوں وفا
سُن چکا ہوں حقیقت بس اجی بیٹھے رہو

رشک نے دیکھے ہیں تم سے سیکڑوں محشر خرام
کیا اُٹھاؤ گے قیامت بس اجی بیٹھے رہو

اچھا لڑا نصیب کہ ملتے ہی آنکھ کے
ظالم نے برچھیوں پہ وہیں دھر لیا مجھے

منزل ہے دور گھات میں بیٹھے ہیں راہزن
پہنچا دے ساتھ خیر کے میرا خدا اب مجھے

اللہ رے تیری شانِ کریمی کہ بے طلب
لائق نہ تھا میں جسکے وہ تُو نے دیا مجھے

ہے مانعِ دیدار ترے حسن کا جلوہ
پردہ ہے عجب طالبِ دیدار کے آگے

میں نے جو کہا کیجئے کچھ دل کا مداوا
کہنے لگے رکھ دو مری تلوار کے آگے

کہتے ہیں رشکِ زار کا اب غیر حال ہے
ہونٹوں پہ دم ہے آنکھ اُٹھانی محال ہے

اِک دم نہ یہ ہوا دلِ مہجور سے الگ
تم سے رفیق بڑھ کے تمہارا خیال ہے

محشر میں بن گئے وہ مرے دل کے مدعی
گویا انھیں کی چیز انھیں کا یہ مال ہے

دل کا مزاج تیری طبیعت سے کم نہیں
گر یہ مچل گیا تو سنبھلنا محال ہے

اے رشک بزمِ یار کہاں مدعی کہاں
کس وہم میں پڑے ہو تمھیں کیا خیال ہے

کیوں نہ ملتا درہم داغِ جگر
مستحق ہم تھے اِسی انعام کے

مر گیا کیوں نہیں اب سینہ زخمی سے بسمل کے
کوئی ارمان باقی رہ گیا کیا دل میں قاتل کے

ہمیں وہ بُت ہمارا حضرتِ زاہد مبارک ہو
کریں گے گلشنِ فردوس میں کیا حور سے ملکے

لبوں کو دوں لگا ہوں کو نذر میں یہ ہو نہیں سکتا
ذرا خنجر عنایت کیجئے ٹکڑے کروں دل کے

ابھی تو دم بہت باقی ہے قاتل تیرے بسمل میں	یہ کیوں رک رک کے چلتی ہے تری تلوار کیسی ہے

رشک

رشک۔ جناب علی اوسط صاحب فتحپوری از بانده نبیرہ سید لطف حسین داغ مرحوم جو حضرت ناسخ لکھنوی کے شاگردوں میں تھے، پیام یار ۱۸۹۳ء سے کلام نقل ہوا۔

مری آہ و زاری نجائیگی خالی	کریگی ترے دل میں گھر دیکھ لینا
نہیں سہل کچھ دعوئ عشق کرنا	ذرا اسکے لائق جگر دیکھ لینا
تری یاد میں سب ستمگار باتیں	وہ دلدوز طعنے دل آزار باتیں
تری مست آنکھوں نے ہنگام مستی	وہ کیں جیسے کرتے ہیں ہشیار باتیں
نہیں ضعف سے تاب گفتار باقی	کرے تجھسے کیا تیرا بیمار باتیں
مار ڈالا جلا جلا کے مجھے	ظلم کی یار انتہا بھی ہے
جب کہا تم پہ جان دیدوں گا	بولے ایسا کہیں ہوا بھی ہے
رشک حال دل حزیں اپنا	تم نے اُس شوخ سے کہا بھی ہے
تیغ ابرو سے کیوں نہ قتل کیا	یہ شکایت رہیگی قاتل سے
محبت میں کوئی فنا ہو رہا ہے	کوئی محو ناز و ادا ہو رہا ہے
جو کرتا ہوں نالے تو کہتے ہیں ہنسکر	بتاؤ تو اے رشک کیا ہو رہا ہے
غم دنیا و دیں سے ہوگئی کیسی سبکدوشی	لگی دلکی ہماری آب خنجر سے بجھی اچھی
حواسوں میں خلل ہے ناصح ناداں کو بکنے دو	نہ سمجھے جو اچھی ہے نہ سمجھے ہے بری اچھی
جہاں تک کھائیے اسکو کبھی سیری نہیں ہوتی	ترا غم اے ستمگر اسقدر لذت فزا کیوں ہے
رقیب روسیہ کا کام ہے کیا کوئے جاناں میں	نکالو اسکو شیطاں ہے یہ جنت میں گھسا کیوں ہے
سبب پوچھو نہ ہمسے انکی رنجشہائے بیجا کا	جفائیں کل سے کہتی ہیں ہمیں تو چاہتا کیوں ہے
سوال وصل سنکر کس لئے گردن جھکاتے ہو	ذرا سی بات ہے لو مان لو شرم و حیا کیوں ہے

رشک

رشک۔ عالیجناب مستغنی الالقاب ناصر الملک مخلص الدولہ مستعد جنگ امیر الامرا فرزند

والیٔ ریاست رامپور ہز ہائینس نواب سر حامد علیخان بہادر جی۔سی۔آئی۔ای
ایڈیکانگ شہنشاہ معظم قیصر ہند۔ والیٔ رامپور۔آپکے والد نواب مشتاق علیخان نواب کلب علیخان
مرحوم کے دوسرے صاحبزادے تھے آپکی ولادت ۳۱ اگست ۱۸۷۵ء میں ہوئی اور صغر سنی میں ۲۱
فروری ۱۸۸۹ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد مسند نشین ہوئے۔نواب صاحب کے اجداد آخر سترھویں
صدی میں سرحدی علاقہ سے وارد ہندوستان ہوئے اور کچھ عرصہ لشکر شاہی میں خدمات کرنیکے بعد
بدایوں کے متصل انھیں ایک علاقہ بطور جاگیر ملا علی محمد خان نے بارہ کے سیدوں کے برخلاف محاربات
میں بڑی ناموری حاصل کی اور نوابی کا خطاب پایا۔احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے ایام میں علی محمد خان
نے اپنی قوت بہت بڑھالی اور رفتہ رفتہ روہیلکھنڈ کا کثیر حصہ اُنکے قبضہ و تصرف میں آیا۔اُنکی وفات
کے وقت چونکہ اُنکے فرزند شہنشاہ دہلی کے دربار میں بطور یرغمال نظر بند تھے اس لیئے علاقہ کا
انتظام انکے چچا حافظ رحمت خان کی سپردگی میں رہا جب دربار دہلی نے اُنھیں رہا کردیا تو کچھ باہمی
تنازعات کے بعد علاقہ جملہ رشتہ داروں میں تقسیم ہوگیا۔چنانچہ چھوٹے بیٹے نواب فیض اللہ خان کو
رامپور کٹہر کی جاگیر ملی جسکی آمدنی اُس زمانے میں چھ لاکھ کے قریب تھی۔مرہٹوں نے جب اُنکے
علاقہ پر فوجکشی کی تو انھیں نواب شجاع الدولہ سے امداد طلب کرنی پڑی۔چنانچہ ۴۰ لاکھ روپیہ کی
ادائگی کے اقرار پر مرہٹوں نے علاقہ خالی کردیا،چونکہ نواب شجاع الدولہ کو حسب وعدہ یہ رقم ادا نہیں
کی گئی اُنھوں نے ایصال زر کے لیئے علاقہ پر جبراً قبضہ کرلیا۔اس ہنگامہ میں نواب حافظ رحمت خان مقتول
ہوئے ۱۷۸۳ء میں پندرہ لاکھ روپیہ ادا کرنے پر نواب فیض اللہ خان رامپور کے مستقل نواب مقرر
ہوئے۔بیس برس بعد جب انھوں نے انتقال کیا تو انکے چھوٹے بیٹے غلام محمد خان نے اپنے بڑے
بھائی محمد علیخان کو قتل کرڈالا اور ریاست پر قبضہ کرلیا لیکن نواب وزیر نے انکو شکست دیکر نواب محمد علیخان
کے خردسال بیٹے احمد علیخان کے حقوق تسلیم کرکے مسند نشین کردیا ۱۸۰۱ء میں نواب سعادت علیخان نے یہ
تمام علاقہ سرکار انگریزی کے سپرد کردیا اور نواب احمد علیخان ظل حمایت سرکار برطانیہ میں آگئے نواب
احمد علیخان کے لاولد وفات پاجانے کے باعث نواب محمد سعید خان اُنکے چچازاد بھائی جو اس زمانہ میں

دہلی میں ڈپٹی کلکٹر تھے حقدار ریاست تسلیم کئے گئے۔ اور انکی وفات کے بعد ۱۸۵۵ء میں نواب حال کے پردادا نواب سر یوسف علیخان مسند آبائی پر متمکن ہوئے۔ فساد غدر میں سرکار انگریزی کی خیر خواہی کے صلہ میں انھیں ایک وسیع علاقہ ایکسو پچاس مواضعات کا بطور انعام مرحمت ہوا۔ نواب کو بڑے صلح کل، نیک نفس، شریف پرور، عادل اور فیاض حکمران تھے اور مرزا غالب مرحوم کے بڑے عزیز شاگرد تھے، اور خود بھی فن سخن کے زبردست ماہر تھے انکے دیوان کے ملاحظہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مرزا غالب سے انھیں کسقدر عقیدت تھی اور انکے فیض تعلیم کا کسقدر اثر انکے اشعار سے ٹپکتا ہی۔ نواب یوسف علیخان نے ۱۸۶۵ء میں بعالم شباب انتقال کیا اور نواب کلب علیخان انکے جانشین ہوئے جنھوں نے ۱۸۸۷ء میں بائیس برس نہایت ناموری سے حکومت کرکے رحلت فرمائی۔ نواب صاحب حال کو جون ۱۸۹۶ء میں اختیارات حکومت عطا ہوئے، آپ یورپ، امریکہ۔ جاپان کی سیر اپنی نابالغی میں فرما چکے تھے، انگریزی و فارسی زبانوں میں آپکو معقول دستگاہ حاصل ہے تفنن طبع کے طور پر گاہ گاہ شعر و سخن کی طرف بھی چند سال سے توجہ فرمانے لگے ہیں، اور منشی امیر مینائی کے بڑے صاحبزادے منشی محمد احمد صاحب قمر و صبر آپکی اُستادی سے مشرف ہیں، ہز ہائنس کی شادی نواب صاحب جاورہ کی ہمشیرہ سے ہوئی ہے افواج انگریزی میں نواب صاحب کو آنریری کرنل کا اعزاز حاصل ہے اور جی۔ سی۔ آئی۔ ای کا بھی خطاب ملا ہے۔

ہے کہنے کو تو میں حال دل زار کہوں گا
پر کہنے سے کیا فائدہ بیکار کہونگا

کچھ سبزہ کے آثار ہیں چہرہ پہ تمھارے
اب پھول سے رخسار کو گلزار کہونگا

خود مرنے لگا تم پہ یہ جو چاہو سزا دو
ہے دل کی خطا اسکو گنہگار کہونگا

شوخی سے کہیں آپ چھپائیں مرے دلکو
ہیں آپ کی زلفوں کا گرفتار کہونگا

دم بھر میں جو بیمار کو کردیتی ہیں اچھا
ان نرگسی آنکھوں کو میں بیمار کہونگا

مجبور ہوں ایسیں جو وہ بگڑینگے تو بگڑیں
مطلب کی ہے جو بات اُسے سو بار کہونگا

دنیا میں جو تم یوسف ثانی ہو تو اچھا
اس دل کو تمھارا میں خریدار کہونگا

کونین میں جب کوئی کڑی رشک پہ آئی
میں آپ سے یا حیدر کرار کہونگا

[illegible]

جو ہو قاتل کبھی وہ دوست اپنا ہو نہیں سکتا
وہ بت جلاد ہے ہرگز مسیحا ہو نہیں سکتا

خدا کا گھر تھا دل اسمیں محبت اب بتوں کی ہے
غلط کہتے ہیں سب کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا

کہی جب بات مطلب کی تو وہ کہنے لگے ہنسکر
کہ سب کچھ اور ممکن ہے پر ایسا ہو نہیں سکتا

شفا کیسی؟ دوا کیسی یہ سب بیکار باتیں ہیں
محبت کا جو ہے بیمار اچھا ہو نہیں سکتا

تمہارے عشق میں کیسی محبت رشک نے جھیلی
مگر تم سے ذرا سا کام اس کا ہو نہیں سکتا

حسینوں میں تھے انتخاب اول اول
غضب تھا تمہارا شباب اول اول

ترے ننھے ہاتھوں کے قربان ساقی
پلائی تھی جن سے شراب اول اول

ہوئے ظلم سہنے کے الفت میں خوگر
بہت تھا ہمیں اضطراب اول اول

وہ بچپن وہ بیباکیاں اب کہاں ہیں
نہ تھا انکو ہمسے حجاب اول اول

وہ ترچھی نظر، اور بانکی وہ چتون
ادا تھی ہر اک لاجواب اول اول

سلامت رہے میکدہ تیرا ساقی
ملی جس سے ہمکو شراب اول اول

بتاؤ تو کیوں ہو گئی ہم سے نفرت
ہمارا تھا عاشق خطاب اول اول

حسینوں سے ملنے کا لپکا برا ہے
اسی سے ہوئے ہم خراب اول اول

محبت وہ کرنے لگے آخر آخر
جنھیں تھا بہت اجتناب اول اول

ابھی ابتدا ہے مگر رشک سنتے
کہی ہے غزل لاجواب اول اول

کیا کیا ستم کئے ہیں سرخی نے لب کی تیرے
یہ خون عاشقوں کے سب ایک پان پر ہیں

کیسا ہے دل لگانا پوچھے تو کوئی ہم سے
جتنے مزے اٹھائے اب تک زبان پر ہیں

بچپن ہوا ہے رخصت، آتی ہے اب جوانی
رنگت نکھر رہی ہے جوبن اٹھان پر ہیں

آنکھیں تری غضب ہیں، تیری بھویں ستم ہیں
دو نیمچے ہیں گویا اور دونوں سان پر ہیں

جتنے اٹھائے صدمے الفت میں رشک سہنے
مشہور ہیں وہ قصے سب کی زبان پر ہیں

حیا سے سرنگوں وہ ہو گئے جب وصل پر پوچھا
خطا ہمسے ہوئی ہی کیا، بتاؤ تو خفا کیوں ہو

دل بیمار ہے بیمار اُن بیمار آنکھوں کا / بھلا اسکی دوا کیا ہو، بھلا اسکو شفا کیوں ہو
آنکھیں تری دیکھ کر پی ہے محبت کی مے / عشق کا ہم کو خمار دیکھئے کب تک رہے
دل آیا تو پھر آیا، اِس آنے کو کیا کہیئے / بے موت اجل آئی مرجانے کو کیا کہیئے
زخمِ دلِ بسمل پر کیوں شیشے نمک چھڑکا / مارا تو اُسے مارا، تڑپانے کو کیا کہیئے
بتخانہ تو بتخانہ تھا، کعبہ بھی ہے بُت خانہ / اب کعبہ کو کیا کہیئے، بتخانے کو کیا کہیئے
کیا چیز ہے اُلفت بھی دل جس سے سُلگتا ہے / اِس آگ کو کیا کہیے، جلجانے کو کیا کہیئے
آنکھوں سے تری ساقی آنکھوں میں خمار آیا / بے مے کے یہ مستی ہے، میخانے کو کیا کہیئے
کچھ جوشِ جنوں ہے پھر، کیا فصلِ بہار آئی / وحشت کی ہیں سب باتیں دیوانے کو کیا کہیئے
اے رشک مصیبت میں، کوئی بھی نہیں اپنا / اپنا نہیں جب اپنا، بیگانے کو کیا کہیئے

رشکی

رشکی - راجہ کندن لال رشکی مخاطب بہ منشی الملوک غدر کے بعد تک زندہ تھے اور مرزا حاتم علی مہر کے دوستوں میں تھے اور شاید تلمذ بھی اُنھیں سے تھا کلام کا انتخاب درج ہے

ہمارے حق میں وہ کیا کچھ کہا نہیں کرتے / ہم اپنے کانوں سے کیا کچھ سُنا نہیں کرتے
نہیں ہے یار سے سرگوشی اتنی بھی زلف / پری رخوں کے بہت سر چڑھا نہیں کرتے
کسی بہانے سے کوئے صنم میں جا کر ہم / جو بیٹھتے ہیں تو پہروں اُٹھا نہیں کرتے
گلہ یہ ہے کہ رقیبوں سے ربط ہے اُسکو / ہم اور جور و جفا کا گلہ نہیں کرتے
کیا جو چاک گریباں عجب ہے کیا ناصح / کہ جوشِ عشق میں دیوانے کیا نہیں کرتے
نہیں ہے وصل مقدر تو کیا کریں ورنہ / ہم اُنکے ملنے کی تدبیر کیا نہیں کرتے
تم اہلِ دل ہو بتاؤ تو اے میاں رشکی / یہ چال دیکھ کے کب دل لیا نہیں کرتے

رشکی

رشکی - عالیجناب معلی القاب آنریبل نواب محمد علیخاں صاحب مغفور متخلص بہ رشکی، آپ نواب مصطفیٰ خان صاحب شیفتہ و حسرتی کے خلف اکبر اور دہلی کے ایک قدیم اور معزز خاندان کے رکن تھے ۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء سال ولادت تھا، آپ نے رئیس زادوں کی طرح گھر پر اپنے

والد ماجد کے زیر سایہ فارسی عربی کی تحصیل کی اور کچھ دنوں مفتی صدر الدین خان آزردہ سے عربی کی درسیہ کتابیں بھی پڑھیں تیس سال کی عمر میں زمانہ کی ضروریات کا لحاظ کرکے انگریزی کی طرف بھی توجہ کی اور اس زبان میں بھی فی الجملہ مہارت حاصل کر لی، مولٰنا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی زیر نگرانی شیفتہ مرحوم برسوں اِنکے اتالیق رہے اور آخر وقت تک رشکی مرحوم کے اُنسے نہایت اخلاص مندانہ اور خوشگوار تعلقات قائم رہے، شیفتہ مرحوم کی وفات کے بعد آپ اُنکی جاگیر اور املاک واقعۂ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے وارث اور قابض ہوئے اور اپنی ذاتی لیاقت اور وجاہت سے سرکاری حکام میں اچھا رسوخ پیدا کیا چنانچہ پرگنہ بلند شہر میں مجسٹریٹی کے اختیارات انھیں حاصل تھے۔ ۱۸۹۰ء میں صوبہ متحدہ کیجانب سے آپ ویسرائے کی کونسل کے منجانب سرکار ممبر نامزد ہوئے اور ۱۸۹۵ء میں سرکار انگلشیہ سے خطاب خان بہادری اور نوابی اُنھیں عطا کیئے گئے، اُسی سال میں کونسل آف ریجنسی رامپور کے رونیو ممبر مقرر ہوئے اور دو برس تک اِس عہدہ کے فرائض عمدگی سے انجام دیتے رہے شعر و سخن کے گہوارہ میں پرورش پائی تھی یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس فن سے وابستگی نہ ہو۔ اگرچہ شیفتہ کی مسلم الثبوت اُستادی کا درجہ انھیں حاصل نہ ہوا تاہم انھوں نے انکی شہرت کمال کو خوب سنبھالے رکھا اور اس میں بلند مرتبہ حاصل کیا، اساتذۂ ایران کے کلام کے دلدادہ تھے اور اُردو میں مرزا غالب اور مومن کا رنگ مطبوع طبع تھا۔ اِسی وجہ سے اُنکے کلام میں آخر الذکر دونوں اُستادوں کے اثر کا پرتو صاف جھلکتا ہے، بہت پختہ مشق اور سلیم المذاق سخن سنج تھے متانت کے ساتھ شوخی دست گریبان ہے ترکیب بندش اور انداز بیان میں دلپذیری اور دلکشی کے علاوہ اُستادانہ رنگ موجود ہے راقم تذکرہ کے والد مغفور سے رشکی کے دوستانہ تعلقات تھے اور اسی وجہ سے راقم تذکرہ کی التجا پر اُنھوں نے ۱۸۹۷ء میں اپنے کلام کا خلاصہ جس میں پانچسو اشعار کے قریب درج ہیں عنایت فرمایا تھا جس کا انتخاب اب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے مرحوم اپنے ضلع کے رؤسا میں اپنی صائب الرائی، نیک نیتی، سادگی اور ایمانداری کیوجہ سے ہر دلعزیز تھے مرحوم نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، چنانچہ اُنکے چھوٹے بھائی نواب محمد اسحٰق خان اِنکے

بعد وارث ہوئے، زندہ دلی، مروت، اخلاق، منکسر مزاجی، الغرض اُن تمام صفات سے جو پرانے رئیسوں کے زیور سمجھے جاتے تھے موصوف تھے اور اساتذۂ سلف کی ایک عمدہ یادگار تھے، خاندانی تعلقات کے باعث اکثر دہلی آتے رہتے تھے، انجام کار ۲۰ مئی ۱۸۹۹ء کو عارضۂ ورم و دست میں عازمِ ملکِ جاودانی ہوئے اور شبِ عاشورہ کو اپنے والد کی قبر کے پہلو میں احاطۂ شاہ نظام الدین اولیا میں پیوند زمین ہوئے، مولانا حالی نے اُنکی وفات پر فارسی میں ایک قطعۂ تاریخ لکھا تھا جس سے اُنکے دلی خلوص اور رنج کا اظہار ہوتا ہے "بخشش بارِ حق" ۱۳۱۷ھ مادۂ تاریخ وفات ہے ۔ افسوس کہ مولانا حالی نے بھی ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو انتقال فرمایا ۔

گلشن میں کوئی دید کے قابل نہیں رہا ۔۔۔ وہ در دخیز شورِ عنادل نہیں رہا
سینے سے ہائے یاس نے سب کچھ مٹا دیا ۔۔۔ جس دل میں درد تھا مرے وہ دل نہیں رہا
تکلیف جاں گسل تھی بہت گرچہ نزع کی ۔۔۔ پر میں تمھاری یاد سے غافل نہیں رہا
ہمسر کو دیکھتے ہی خود آرائی چھوڑ دی ۔۔۔ کیوں آئینہ تمھارے مقابل نہیں رہا
قاتل کو دیکھنا ہی پڑا مر کے بار بار ۔۔۔ کچھ بے اثر تو نالۂ بسمل نہیں رہا
مجنوں طبیعتوں کا فقط راہبر ہے شوق ۔۔۔ گرچہ سراغِ ناقہ و محمل نہیں رہا
بے اجر وہ شہید ہے جو قتل گاہ میں ۔۔۔ ہر لحظہ محوِ صورتِ قاتل نہیں رہا
رشکی کی آپ چل کے زیارت تو کیجئے ۔۔۔ یہ ہے غلط کہ اب کوئی کامل نہیں رہا

اثر صحبتِ غیر کا ہو گیا ۔۔۔ کہ پھر سست عہدِ وفا ہو گیا
مرا عقدۂ بخت کھلتا نہیں ۔۔۔ ترا یہ بھی بندِ قبا ہو گیا
تری بزم میں جمع ہیں خاص و عام ۔۔۔ اگر میں بھی آیا تو کیا ہو گیا
نشیمن ہے اُسکا ترے دام میں ۔۔۔ قفس سے ترے جو رہا ہو گیا
مری بے خطائی ہوئی جلوہ گر ۔۔۔ کہ ایسے کا ناوک خطا ہو گیا
وہ آئے تھے میری بھی چوری سے رات ۔۔۔ مرا چونک پڑنا بلا ہو گیا

ٹپکنے لگے جس سے بیگانگی
حقیقت میں وہ آشنا ہو گیا

حسینوں کو ہو رشک اور کیوں نہ ہو
کہ رشکی غلام آپ کا ہو گیا

بے وفا تجھ سے کیا نہیں ہوتا
ایک وعدہ وفا نہیں ہوتا

قیس کی دھوم مچ رہی ہے مگر
عشق اس سے سوا نہیں ہوتا

ہم وہ گم کردہ راہ ہیں کہ کبھی
خضر بھی رہنما نہیں ہوتا

شائبہ جور کا نہو جبتک
لطف میں کچھ مزا نہیں ہوتا

غیر پر وہ نگہ پڑی ہی نہیں
تیر اُن کا خطا نہیں ہوتا۔

قتل میں میرے کیا تامل ہے
عشق میں خوں بہا نہیں ہوتا

چھیڑ دیتے ہیں اُنکو ہم بھی کبھی
گرچہ کچھ مدعا نہیں ہوتا

ایک رشکی ہمیں نہیں ہوتے
ورنہ واں اور کیا نہیں ہوتا

آنکھیں ملانیمیں ہے عبث تم کو احتراز
آنکھیں ہیں دل نہیں کہ ملایا نجائیگا

گر ایکبار رخ سے نقاب اُسکے اُٹھ گیا
پھر رازِ دل کسی سے چھپایا نجائیگا

نبضیں چھٹی ہیں آنکھوں میں دم ہے لبوں پہ جان
آؤ کہ کوئی دم میں بلایا نجائے گا

اغماض بے سبب تو کسیکو نہیں پسند
روٹھو نہ تم کہ ہم سے منایا نجائے گا

رنگِ شکستہ واسطۂ عرضِ حال ہے
گو مجھسے حرفِ شوق سنایا نجائیگا

کیا کیا بتا کے ہم نے سنایا رقیب کو
مضمون تیرے نامۂ الفت طراز کا

کب ٹوٹتی ہے توبہ ہماری شراب سے
لیکن ہے ڈر تری مژۂ نیم باز کا

ہیں عشق کی تمام یہ نیرنگ سازیاں
مطلب ہے ایک اصل میں ناز و نیاز کا

رشکی ہے عید جاتے ہیں سب عیدگاہ کو
حضرت بھی چل کے پڑھ لیں دوگانہ نماز کا

اسقدر خوف ہوا تمکو مرے جاں کسکا
یہ نہ سوچے کہ ہے نالہ شرر افشاں کسکا

خاکساری کی اُٹھائے ہوئے ہیں جو لذت
وہ دو عالم بھی نہ لیں تختِ سلیماں کسکا

چارہ گر فکرِ علاجِ دلِ وحشی ہے غلط
کوچہ یار ہی چھوٹا تو گلستاں کس کا

مانعِ مرگ ہوا اور مصیبت دیکھو
تھا تصور مرے دل میں شبِ ہجراں کس کا

ہمنے پایا ہے تفرج کہ دلمیں سب کچھ
شوقِ سرگشتگی وحشت و بیاباں کس کا

لطفِ شرابِ ناب سے زاہد جو دور تھا
اس کا دماغ محوِ شرابِ طہور تھا

کچھ خانۂ رقیب بھی ایسا نہ تھا قریب
دولت سرا سے کلبۂ احزان جو دور تھا

بیوجہ انتظار اگر فرض تھا ہمیں
بے وعدہ آپ کو بھی تو آنا ضرور تھا

مجھ سے نہ کچھ بگاڑ نہ اعدا سے آشتی
ایسا کچھ اپنے حسن پہ اُن کو غرور تھا

شکوے ہمارے سارے غلط ہی سہی مگر
لو تم ہی اب بتاؤ کہ کس کا قصور تھا

رشکی کی وضع ہمکو نہایت ہی تھی پسند
اربابِ عشق میں وہ نہایت غیور تھا

رنجش کا گرچہ کوئی سبب درمیاں نہ تھا
لیکن وہ آپ صلح کریں یہ گماں نہ تھا

مانگی تھی اُسنے جان تو غیروں پہ آ بنی
حالانکہ اک ہنسی بھی فقط امتحاں نہ تھا

اک محشرِ خیال دلِ تنگ تھا کہ کیوں
در پر تمھارے رات کوئی پاسباں نہ تھا

کہتے ہیں لوگ جانستاں ہیں آپ
کیونکہ پھر اک جہاں کی جاں ہیں آپ

دَیر میں ہے پتہ نہ کعبے میں
پر جہاں دیکھئے وہاں ہیں آپ

مشورے کل تو ہم سے ہوتے تھے
آج اعدا کے میزباں ہیں آپ

لائقِ قتل میں ہی ٹھیرا ہوں
سچ تو یہ ہے کہ قدرداں ہیں آپ

اُسکو بھی رام کر لیا رشکی
کس قیامت کے خوش بیاں ہیں آپ

کون پھر بادیہ پیما ہو خضر کی صورت
جب وطن ہی میں میسر ہو سفر کی صورت

ہر قدم پر ترے آنکھیں ہی نہیں بچھی ہیں
دل بھی جاتا ہے ترے ساتھ نظر کی صورت

دل میں گاہک کے کوئی چیز جو چبھ جاتی ہے
پھر نہیں سوجھتی کچھ نفع ضرر کی صورت

گریہ بے سود ہے جسنے نہ اٹھایا طوفان * ہے عبث آہ ہو جس میں اثر کی صورت

کیا کہا بیخودی میں اُس بت سے
گئی برسوں کی دینداری آج

شب کسی سے ہوئے ہو ہم آغوش
شوخیاں وہ نہیں تمھاری آج

خاک میری ہے اُنکے دامن پر
آئی کام اپنی خاکساری آج

شمع نے رشکِ روئے روشن سے
جل کے کاٹی ہے رات ساری آج

وہ منانے کو آتے ہیں رشکی
نبھ نہیں سکتی وضعداری آج

لطف ظاہر کر دیا درد نہانی دیکھکر
رحم نے پائی ہے قوت ناتوانی دیکھکر

جو کہ ملتی ہو ہماری سرگذشتِ عشق سے
قصہ خواں کہتا وہاں ایسی کہانی دیکھکر

تجھسے گو ملتا نہیں داغِ غمِ ہجران تو ہی
شکر ہے جیتے تو ہیں تیری نشانی دیکھکر

اب بلائے آسمانی بھی بھلی لگنے لگی
آپکے سر پر دوپٹہ آسمانی دیکھکر

اُس رمیدہ وحش کو کیا حالِ دلِ محزوں لکھیں
جو خفا ہو ربطِ الفاظ و معانی دیکھکر

ہی دگرگوں ابتدائے عشق میں رشکی کا حال
رحم آتا ہی مجھے اُسکی جوانی دیکھکر

کوئی بتائے کہ کیا ہی نقاب میں داخل
اگر نہیں مہِ انور سحاب میں داخل

محلِ شکوہ نہ مجکو رہا نہ اعدا کو
کہ شوخیاں ہیں تمھاری حجاب میں داخل

دہانِ زخم مرے تشنہ لب ہیں دیر نکر
کہ آبِ تیغ بھی قاتل ہی آب میں داخل

ہمارے قتل کو اعدا ثواب کہتے ہیں
خدا کرے کہ تمھیں ہو ثواب میں داخل

کچھ ایسے سوئے کہ گویا ہوئی ہی صورتِ یار
ہمارے طالعِ خفتہ کے خواب میں داخل

مآلِ کار ہو جو کچھ مگر خوشی یہ ہے
کہ میرا نام بھی ہی انتخاب میں داخل

ہو جائیں بے خطر ستمِ آسماں سے ہم
تاثیر ایسی آہ میں لائیں کہاں سے ہم

سیکھی ہیں اُسنے چرخ سے گر کج ادائیاں
طرزِ فسوں اُڑائینگے چشمِ بتاں سے ہم

نکلے نہ آپ قابوئے اغیار سے اگر
پھر کام لینگے نالۂ آتش فشاں سے ہم

ٹپکا جو ایک اشک بھی دشمن کی آنکھ سے
دریا بہائیں گے مژۂ خونچکاں سے ہم

رشکی ترا بیان یہ جادو ہے یا فسوں
بے چین ہو گئے ہیں تری داستاں سے ہم

قطعہ

وہ جفا کر کے نہیں ہوتے خجل — یہاں گلہ کرنے سے شرماتے ہیں ہم
یا کبھی خود عشق میں تھے مبتلا — یا اب اِس قصہ سے گھبراتے ہیں ہم
یا کبھی ہم آپ تھے محتاج پند — آج یار رشک کو سمجھاتے ہیں ہم

اہلِ دل سے نہ کبھی آپ سنیں گے نالہ — چاک دل میں ہے مگر چاک گریباں میں نہیں
ہجر میں ہمنے تصور سے لیا ہے وہ کام — حسرت اب کوئی بھی باقی دلِ نالاں میں نہیں
غیر کو بھی ہے سرِ دشت نوردی شاید — وہ مزا اب خلش خارِ مغیلاں میں نہیں
عشق رشک کا زمانے سے جدا ہے گویا — بندۂ بت ہی مگر فرق کچھ ایماں میں نہیں

کہیں لیجاؤ لیکن آرہونگا کوئے جاناں میں — قفس سے جب چھٹیگی آئیگی بلبل گلستاں میں
نہ سلجھے گی تمھاری اور دشمن کی قیامت تک — اگر اُلجھا ہمارا دل تمھاری زلفِ پیچاں میں
مرے دستِ جنوں کو باز رکھا خوب حکمت سے — رفوگر نے تری تصویر رکھی چاکِ گریباں میں
شکوہ کوئے جاناں جب نظر آئیگی اے رشک — نصیبوں سے جو جا پہنچے کبھی تم باغ رضواں میں

بدلی فروغِ برق کی مانع نہو سکی — حسنِ نظر فروز ہے ظاہر نقاب میں
آئے تو اُنسے حال کچھ اپنا نہ کہہ سکا — کیا جانے ہو گیا مجھے کیا اضطراب میں
ہوکر خفا عدو سے مٹائی نہ امتیاز — تخصیص کی اُمید ہی مجھکو عتاب میں
مے پی نہیں کہ مست ہوئے بادہ کش تمام — ساقی کے رخ کا عکس پڑا جب شراب میں
ہی قیدِ اختلافِ صور سے جسے نجات — دریا کو دیکھتا ہے وہ موج و حباب میں

اِس عنایت کے بھی قابل یہ گنہگار نہیں — سینکڑوں خون کیا کرتے ہو دو چار نہیں
مجکو اور غیر کو ہے لطف کا انکے دھوکا — ورنہ انکو تو کسی سے بھی سروکار نہیں
یار کے قول کی تکذیب سزاوار نہیں — ورنہ ظاہر میں محبت کے کچھ آثار نہیں
جو سماجت سے ہوا کام وہ ناکامی ہے — آپ آئیں تو عنایت نہیں اصرار نہیں

مسیحائی کا تیری شور ہو جائے — اگر پھیرے ترا بیمار گردن

یہ منصبِ بلند ملا جسکو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں
ہمارا تم کو فکرِ امتحان ہو
ستم ہے ہم کہاں ہیں تم کہاں ہو
محبت اسکی بھی غالب کہ کھل جائے
اگر ظاہر مرا دردِ نہاں ہو
تم سے گلہ نہیں ہے ہمارا قصور ہے
اوپر اٹھائیے نگہِ شرمسار کو
ہم پہلوئے رقیب ہیں وہ دیکھتا ہے آج
رشکی تمھارے جذبۂ بے اختیار کو
مزا الفت کا جانِ زار سے پوچھ
یہ نکتہ واقفِ اسرار سے پوچھ
ہمارے عشق کا چارہ جاکے ہمدم
شمیم کاکل دلدار سے پوچھ
مرے پامال ہونے کی حقیقت
خود اپنی شوخیٔ رفتار سے پوچھ
ہمارا دردِ دل کچھ ہمسے سن لے
کچھ اپنی نرگسِ بیمار سے پوچھ
تو اپنی قدر اے کانِ ملاحت
ہمارے سینۂ افگار سے پوچھ
بھلا رشکی کو قدرِ فصلِ گل کیا
یہ کیفیت کسی میخوار سے پوچھ

وہ روشنی جو آپکے رخ کی نقاب ہے
کہتے ہیں اس سے نور رُبا آفتاب ہے
لب ہائے زخم میرے بہت تشنہ کام ہیں
دیکھیں تو کسقدر ترے خنجر میں آب ہے
وقتِ وفائے وعدۂ دشمن اگر نہیں
پھر تیری بات بات میں کیوں اضطراب ہے
رشکی کلام کیا ترے حسنِ کلام میں
دیوانِ عشق میں ورقِ انتخاب ہے

تم نے سوئے غیر کیا نظر کی
کچھ کم ہے خلش مرے جگر کی
ملتی نہیں آج ہمسے کیوں آنکھ
کس شغل میں تم نے شب بسر کی
کچھ گریہ اٹھائے موجِ طوفان
کچھ چھیڑ ہو آہ میں اثر کی
کیا اس نے دیا جواب یارب
مہمل سی ہے بات نامہ بر کی
کہتے ہیں جسے امید موہوم
تصویر وہ ہے تری کمر کی
اس شوخ نے کی مری عیادت
کچھ رہ گئی بات چارہ گر کی

بیتابیٔ دل نے تیرے رشکی
اُلفت کی کہاں کہاں خبر کی

غصہ آتا ہے پیار آتا ہے
غیر کے گھر سے یار آتا ہے

مے پلانی اگر نہیں منظور
ابر کیوں بار بار آتا ہے

اب بھی ملجاؤ گر نہ پھر ملیں
رفتہ رفتہ غبار آتا ہے

کچھ نہ پوچھو وہ ماجرا جب یار
یاد بے اختیار آتا ہے

نہیں معلوم گل میں کیا نہاں ہے
جو بلبل اسقدر گرم فغاں ہے

مرا احوال سنکر سب تکلف
کہا کیا سچ یہ ساری داستاں ہے

مگر دیکھا نہیں اہل زمیں کو
کواکب پر جو نازِ آسماں ہے

وعدوں پہ ٹالتے ہی رہے عمر بھر مجھے
آخر فرشتہ جانتے ہو یا بشر مجھے

مانا کہ قصد غیر کے گھر کا نہ تھا مگر
رستے سے اُلٹے پھر گئے کیوں دیکھکر مجھے

ہر چند دل سے اُسکو بھلاتا رہا مگر
یاد آگیا کسی نہ کسی بات پر مجھے

ایسی کہانیاں کہیں رشکی نے درد خیز
کمبخت نے نہ سونے دیا رات بھر مجھے

کوئی واقف ہو کیا دردِ نہاں سے
قلم قاصر زباں عاجز بیاں سے

کیا کیا سحر تمنے آج رشکی
عدو کا شکوہ اور اُنکی زباں سے

دیا ہے پنجۂ غم نے ہزار بار فشار
دلِ حزیں میں ہے لیکن ہنوز تو باقی

ہمارا جرم محبت ہے ایسی دے تعزیر
رہے نہ کوئی ترے دل میں آرزو باقی

ساقی بزم غیر آپ بنے
ہمکو خونِ جگر پیئے ہی بنی

وہ جو شرما گئے تو اُنکی خطا
اپنے ذمہ ہمیں لیئے ہی بنی

تھے جو ساقی کے ناز توبہ شکن
رات رشکی کو بھی پیئے ہی بنی

یہ رشک ہے کہ نہ دیکھیں ہماری آنکھیں بھی
تمھیں رکھا ہے تصور میں بھی چھپائے ہوئے

ہزار رنگ بدلتا ہے دم میں تو لے دل
مگر کسی کے یہ انداز ہیں اُڑائے ہوئے

رضائے یار میں جو جاں بحق ہوا رشکی
فرشتے دوش پہ نعش اُسکی ہیں اُٹھائے ہوئے

نمایاں ہے گر سرگرانی تمھاری
تو در پردہ ہے مہربانی تمھاری

جئیں اور بھی گو دمِ واپسیں ہے / سنائے کوئی گر کہانی تمہاری
تمہاری محبت کا ہے نقش دل میں / یہ کافی ہے ہمکو نشانی تمہاری

اُلفت اک آگ ہے اور آگ پہ اے چارہ گرو / کہیں سیماب بھی ٹھیرا ہے جو یہ دل ٹھیرے

آہِ صباح و نالۂ شبگیر کر چکے / کرنی تھی جو وصال کی تدبیر کر چکے
وہاں بات کے جواب میں بھی ہے مضایقہ / خط کا مرے جواب وہ تحریر کر چکے
اُنکو ہوا ہے شکوۂ بیداد سے ملال / کیا پیش جائے عذر کہ تقصیر کر چکے
مسجد میں آکے اور ہی عالم دکھلیئے / بتخانے کو تو عالمِ تصویر کر چکے
تدبیر کب بتانے کو احباب آئے ہیں / جب کام ہم حوالۂ تقدیر کر چکے
آیا خیال بے گنہی کا اُنھیں تو کب / جسوقت وہ مجھے تہِ شمشیر کر چکے
رشکی وہ خود ملیں تو ملیں ورنہ اُنسے ہم / کرنی تھی جو وصال کی تدبیر کر چکے

خدا اُس نرگسِ سحر آفریں سے / کہ جو فتنہ ہے اُٹھتا ہے وہیں سے
وہ باتیں جو کہ تھیں اُن سے چھپانی / غضب ہے کر رہا ہوں میں کہیں سے
سنائے جوشِ وحشت میں عدو کو / ہوئے تھے مشورے جو ہمنشیں سے
رہےگا حشر تک زندہ جسے تم / کروگے قتل دستِ نازنیں سے
بتوں میں کیا نہیں وحدت کا جلوہ / بتادے کوئی ہمکو اہلِ دیں سے
ہزاروں مہر و اُلفت کی ادائیں / سمجھ لیتے ہیں ہم تیری نہیں سے
وہ پھرنا کو بہ کو رشکی کہاں ہے / ہوئے ہیں آپ بھی اب تو ہمیں سے
نہیں ہیں سب یہ برتاؤ اُسکے / مگر کچھ لاگ ہے رشکی ہمیں سے

(از بیاض [illegible] قلمی)

پایا قصور غیر کا مجکو سزا ہوئی / ایسی تو ایکبار نہیں بار ہا ہوئی
تم بھی کہوگے آہ گر اپنی رسا ہوئی / وہ چرخ کیا ہوا وہ زمیں آج کیا ہوئی
پوچھو ہمیں سے عشق کے بیمار کا علاج / آخر کو موت سے ہوئی جو کچھ شفا ہوئی

رشید

رشید - قاضی کبیر حسن صاحب متوطن مچھلی شہر جس زمانہ میں مرزا قادر بخش صاحب بہادر صابر دہلوی دہلی سے بنارس جاکر مقیم ہوئے یہ آنکے خرمن فیض سے بہرہ ور ہوئے۔ یہ واقعہ ۱۸۵۷ء کے قریب کا ہے عرصہ ہوا انتقال کر گئے ؂

ہوں ننگ بن کے مہر سپہر کمال کا	یعنی عروج اپنا ہے مطلع زوال کا
شاداب آب گریہ سے ہے گلشن مراد	پانی سبب ہے تازگی ہر نہال کا
یہ زخم یادگار ہے اس تیغ ناز کا	سمجھا تا ہے یہ مجکو خیال اندمال کا

رشید

رشید - سخنور یکتا مرثیہ گو بے ہمتا جناب سید محمد مصطفےٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشید لکھنوی، آپ سید احمد مرزا صابر مرحوم کے صاحبزادے ہیں جو میر انیس کے داماد تھے گویا جناب رشید میر انیس مرحوم کے نواسے ہیں، جناب رشید کے ددھیالی خاندان میں سید حسین مرزا صاحب عشق بڑے نامور مرثیہ گو تھے جو انکے والد کے چچا تھے، اسی طرح جناب تعشق مرحوم جو شعرائے لکھنو میں غزل گوئی میں لاجواب اور بے مثل کہے جا سکتے ہیں جناب رشید کے دوسرے چچا تھے، جناب رشید نے حضرت عشق اور تعشق سے جملہ نکات فن شاعری اور مرثیہ گوئی سبقاً سبقاً حاصل کیئے، اگرچہ آپ کو فطرتی طور پر اس امر کا بڑا ناز ہے کہ ہیں حضرت انیس کا نواسہ اور انکی زبان اور کمال کے ورثہ کا حقدار ہوں مگر انکے کلام میں بجائے انیس کے رنگ کے جناب عشق اور حضرت تعشق کی تقلید، عقیدت اور پیروی کا زیادہ اثر نمایاں ہے، مرثیہ گوئی کی مشق کرنے سے پیشتر بھی جناب رشید بحیثیت ایک غزل گو کے لکھنو میں خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے، جناب عشق اور تعشق کی وفات کے بعد انھیں حصول شہرت کے زیادہ موقعہ ملے اور مرثیہ گوئی میں اپنے خاندان میں امتیازی رکن خیال کیئے جانے لگے، مرثیہ میں بھی بہار یہ رنگ برتتے ہیں اور لوگ بھی اسے پسند کرتے ہیں تحقیق الفاظ اور صحت روایات کا بھی حتی الوسع خیال رکھتے ہیں، پندرہ برس سے نواب بہرام الدولہ بہادر رئیس حیدر آباد دکن کے ہاں محرم کی مجلسوں میں جو ۱۲ سے ۱۴ محرم تک

نہایت تزک وشان کے ساتھ منعقد ہوتی ہیں آپ طلب کیئے جاتے ہیں اور بعد اختتام مجالس عموماً پندرہ سو روپیہ آپ کو نذرانہ ملتا ہے، سفیر ایران متعینہ کلکتہ کے ہاں بھی گاہ گاہ ربیع الاول میں آپ تازہ تصنیف مرثیہ پڑھنے کے لیئے بلائے جاتے ہیں، خاص لکھنؤ میں بھی اکثر جلسوں میں آپکا کلام سُنا جاتا ہے خصوصاً آنوجی کی مسجد میں ہر سال ایک نیا مرثیہ پڑھتے ہیں حضرت کی پیدایش ابتدائے جلوس واجد علیشاہ میں ہوئی تھی اور اب ۷۸ سال کی عمر ہے، نہایت دُبلے اور کمزور شخص ہیں، انکسار اور تواضع میں شاعرانہ مبالغہ کو بہت کام فرماتے ہیں۔ گفتگو بہت تکلف سے کرتے ہیں الغرض قدیم لکھنؤ کے مصنوعات اور تکلفات کی زندہ یادگار ہیں اپنی امتیازی حیثیت کو ہر وقت نظر میں رکھتے ہیں، تلامذہ بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ سوزِ عشق، حسرت کے مضامین اچھے پیرایہ میں اکثر اِنکے کلام میں ملتے ہیں، زبان بہت صاف اور شستہ برتتے ہیں جو انکا خاندانی ورثہ ہے، بعض بعض اشعار ایسے صاف و اعلیٰ درجہ کے کہہ جاتے ہیں کہ جن سے اِنکا کمالِ سخن مُسلم ہوتا ہے، کم و بیش پچاس غزلوں کا انتخاب درج ذیل ہے جس سے اِنکے رنگ طبیعت کا پُورا پورا اندازہ ہو سکتا ہے،

کہتے ہیں شبنم وگُل عالم نیرنگ کا حال	کوئی ہنستا ہوا نکلا۔ کوئی گریاں نکلا
قیس کا دستِ تمنا کس قدر چالاک تھا	محمل لیلیٰ کا پردہ سو جگہ سے چاک تھا
آج داغوں کے گلوں نے رشک جنت کر دیا	کل یہی دل تھا کہ اک صحرائے وحشتناک تھا
مہربانی سے شریک اب تو ذرا ہو جانا	دفن ہولے مرا لاشہ تو خفا ہو جانا
کہے دیتے ہیں زیادہ نہ ستاؤ ہمکو	دیکھو اچھا نہیں ہے دل کا بُرا ہو جانا
دِل جو پہلو سے جُدا ہے تو عجب کیا اِسکا	دیکھنا قبر میں اعضا کا جُدا ہو جانا
ہمت عبد ہے معبود کی ہمت سے بلند	ہم جو مانگیں گے کہیں اُس سے سوا ملجائیگا

رباعی

کیوں کُنج لحد کے متصل جاؤں گا	کہنے کے لیئے مطلب دل جاؤنگا
پیری سے بنونگا منکسر اے رشید	جُھکتے جُھکتے زمیں سے ملجاؤنگا

عجیب حال تھا جب مبتلائے الفت تھے
کہ دل پہ جبر بھی کرنے کا اختیار نہ تھا

کیا تھا گو تری تیغ نگہ نے صد پارہ
مگر ذرا بھی مرے دل کو انتشار نہ تھا

پس مردن رہائی کا ہے غم ولہائے نالاں کو
وفاداروں کی روحیں روتی ہیں دریا کے زنداں پر

اجل کئے تو ہوا احسان اس بیمار ہجراں پر
نشاں جسکی لحد کا ہے زمین کوئے جاناں پر

زلیخا حال کی اپنے خبر دیتی تھی یوسف کو
کہ جب کی آہ گھر میں برق چمکی آ کے زنداں پر

گھٹے جاتے تھے ہم چھوٹے جو تھے دن شام سے پڑے
نہیں معلوم کیونکر رات گذری اہل زنداں پر

لے سوز عشق خوب بڑھایا وقار دل
ہر آبلہ ہے آج سر اعتبار دل

دونوں سے خوب شاد کیا ہمکو اے رشید
سو جان سے جگر کے تصدق نثار دل

دیدہ ہائے زخم خوں روتے ہیں میرے حال پر
تیغ کیسی سنگدل ہے چشم جوہر نم نہیں

اے شب غم صبح ہو جائے گی یا آئیگی موت
فیصلہ دم بھر میں ہے یا تو نہیں یا ہم نہیں

رواں عدم کو ترے جاں نثار ہوتے ہیں
دیار چھوڑتے ہیں بے دیار ہوتے ہیں

یہ طاقت ہو تمھارے ناتواں ہیں
جو تڑپے حشر آ جائے جہاں میں

سلام

ہنس ہنس کے کہہ رہا ہے جلاتا نواب ہے
ظالم یہ میرا دل ہے چراغ حرم نہیں

اُسنے زمانہ دیکھ کے سیکھا ہے شور و شر
تم کمسنی میں فتنۂ محشر سے کم نہیں

نکل آئیں ہیں سو جبیں کوثر و تسنیم سے باہر
خبر پہنچی ہے پیاسے حضرت شبیر آتے ہیں

گرے ہیں رن میں اکبر دوڑے ہیں ہر سمت سے اعدا
مٹانے کو رسول اللہ کی تصویر آتے ہیں

غرور اب کیا بڑھیگا خم ہوئے اس درجہ پیری سے
ہم اپنے سر کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر لگاتے ہیں

رباعی

سو رنج ہیں روز کم سے کم کھاتا ہوں
جو کوئی نہ کھا سکے وہ غم کھاتا ہوں

پیری کیطرف دیکھ کے آتی ہے شرم
جب اپنی جوانی کی قسم کھاتا ہوں

رباعی

پیری سے رہا نہ کوئی چارا ہمکو
قوت کا قوی کے تھا سہارا ہمکو

تنہا موت آ کے کیا بنا لیتی رشید
پیری نے شریک ہو کے مارا ہمکو

آپ کو شک ہے کہاں ٹوٹے تھے تارے رات کو
دمبدم آنسو ٹپکتے تھے ہمارے رات کو

کیں وہ بعدِ وصل باتیں بڑھ گیا پھر شوقِ وصل
ہیں وہی نکلے تھے جو ارمان سارے رات کو

اُلفتِ رُخ میں ہے وحشت یادِ گیسو میں بکا
دن کو صحرا میں ہیں دریا کے کنارے رات کو

دل جگر لینے پھر آئے صبح کو کہتے ہوئے
رہ گئے بستر پہ وہ موتی ہمارے رات کو

آپنے پوچھا نہ جان و دل جگر نے لی خبر
درد فرقت میں نہ کس کسکو پکارے رات کو

ڈھونڈتے پھرتے ہیں دل کو صبح سے آج ای رشید
دلربا تھا ایک پہلو میں ہمارے رات کو

فرماتے ہیں نہ عشق کا دعویٰ کرے کوئی
کیا فائدہ ہے کیوں ہمیں رسوا کرے کوئی

مجنوں نے راہِ عشق میں چومے مرے قدم
اُلفت میں اتنی بات تو پیدا کرے کوئی

مار ڈالیگی مجھے یہ خوش بیانی آپکی
موت کا پیغام آئیگا زبانی آپ کی

زندگی کہتے ہیں کسکو موت کسکا نام ہے
مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی

آپسے ملکر گلے راحت سے آجاتی ہے نیند
سبزۂ خوابیدہ ہے پوشاک دھانی آپکی

مجھسے دن بھر دل کہا کرتا ہے قصہ آپکا
رات بھر میں اس سے کہتا ہوں کہانی آپکی

بڑھ چکا قد بھی عروجِ حسن کی حد ہو چکی
اب تو قابل دیکھنے کے ہے جوانی آپکی

تم نے ہمسے ایسی باتیں کیں کہ رسوائی ہوئی
پھول سے چہرہ کی رنگت ہے جو سونلائی ہوئی

صاف گویا آتشِ رخ سے دھواں اٹھنے کو ہے
لو طبیعت ہاتھ سے جاتی رہی آئی ہوئی

بڑھ گئی زینت جو آئینہ مقابل آگیا
اِس دوئی سے اور دونی آنکی یکتائی ہوئی

قبر تک تو آگیا میں دوست تھے ساتھ ای رشید
کس طرح اب وہ نہ یاد آئے کہ تنہائی ہوئی

عطا حیاتِ ابد بھی ہو کاٹ گردن بھی
شریکِ آبِ خضر میں ہو آبِ آہن بھی

ہماری زندگی و موت کے ہو تم رونق
چراغِ بزم بھی ہو اور چراغِ مدفن بھی

دکھایا سیل کا انداز آبِ پیکاں نے
شکست خانۂ دل بھی ہے خانۂ تن بھی

کھلا جو ٹانکے لگانے میں حالِ زخمِ جگر
تو رو دی خون کے اشکوں سے چشمِ سوزن بھی

عندلیبوں کی اسیری کا زمانہ آیا
بیوفا کہکے پکارا دمِ آخر تونے

آج پھر جانبِ گلشن قفس و دام چلے
وائے تقدیر کہ ہم لیکے یہ الزام چلے

شراب پیتے ہیں میخوار تیرے تا رمضان
نہ تھا یہ وِلکا دھڑکنا ہی کوئی امرِ عظیم

شروع کرتے ہیں شوّال کے مہینے سے
صدائے ماتم ابھی آرہی تھی سینے سے

دکھائی دینگے عجائب تمام اے زاہد
بڑھیگا نشۂ عرفان شراب پینے سے

نقاب اُلٹی تھی کیا اے مہرِ طلعت روئے روشن سے
لگی ہیں شمع کو دھوپ آئی تھی تیر در کے روزن سے

انھیں تسکین دینے جاؤ جاتے ہو جو گلشن سے
برنگِ خار گل لپٹے ہوئے آتے ہیں دامن سے

خس و خاشاک اُڑا جلکر ہوا سے گرم آہوں کی
ہزاروں بجلیاں پیدا ہوئیں میرے نشیمن سے

بہار آئی قفس میں بلبلوں کے دِل دھڑکتے ہیں
کہ غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی ہے گلشن سے

بہت شبنم سے دھویا پر گلابی رہ گئی رنگت
کسی صورت نہ چھوٹا خونِ بلبل گل کے دامن سے

زیادہ صرف ہوگا آج پانی تیغ قاتل کا
شہیدانِ وفا کو غسل ہوگا آب آہن سے

رشید احباب میرا امتحاں بیکار کرتے ہیں
کہا سو مرتبہ واقف نہیں ہیں شعر کے فن سے

خاکِ حسرت لیگئے ولہائے ویران لیگئے
آپکے دیوانے ساتھ اپنے بیاباں لیگئے

لاکھ تدبیروں سے میرے دِل کی خاطر جمع کی
خوب سمجھا کے وہ گیسوئے پریشاں لیگئے

سیئے جاتے ہیں کفن آپکے دیوانوں کے
چاک دامن کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے

وصلتِ شمع کی شب بھر تو رہی سر میں ہوا
صبح کو بزم میں پر اُڑتے رہیں پروانوں کے

دِل جگر پڑھتے ہیں کلمہ ترا املاکِ تن میں
ساری بستی میں یہ دو گھر ہیں مسلمانوں کے

قہر کی آج چلی تیغ نگاہِ ساقی
چور شیشے ہوئے ٹکڑے ہے پیمانوں کے

ناامیدی نہ ہو کیوں آس نہ کیونکر ٹوٹے
ٹوٹ جائے دلِ میخوار جو ساغر ٹوٹے

خود رہا ہوگئے یوں تڑپے اسیرِ زندان
زلزلہ آگیا، دیواریں گریں، در ٹوٹے

آپ کہتے ہیں کرو ترک محبت میری
رشتۂ اُلفت کا بتا دیجئے کیونکر ٹوٹے

سلام

رحم دل تم ہو تو عشاق پر کیونکر ہو ظلم
تم تو نازک ہو دل ان لوگوں کے کیونکر ٹوٹے

گو ہے ماہِ رمضان و ہدے دہن کا بوسہ
کچھ نہیں خوف جو روزہ لبِ کوثر ٹوٹے

ہے عرق ماتھے پہ سر خم منہ پہ زلفوں کی نقاب
ہے عیاں رفتار سے آتے ہیں شرماتے ہوئے

فتنۂ محشر صدا دیتا ہے جب چلتے ہیں آپ
ہم بھی آتے ہیں جلو میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے

کھچکے دم آیا لبوں تک روح گھبرانے لگی
سچ بتاؤ کیا اشارہ کر گئے جاتے ہوئے

اپنی اپنی جا ہر اک مغرور ہے اے شاہِ حسن
لاکھ بل کھاتے ہیں گیسو تا کمر آئے ہوئے

جس طرح زخمی ہوا ہے دِل مجھے معلوم ہے
میں نے دیکھا خود نگہ کے تیر کو آتے ہوئے

کرتے ہیں جمع اشک ہمارے ملائکہ
حوروں کے کان کے لئے گوہر بنائینگے

شہ دامنِ رضائے خدا کو یہ دینگے طول
اپنا کفن مزار کی چادر بنائیں گے

عقدے الفت کے سب اے رشکِ قمر کھولدیئے
سینہ یوں چاک کیا داغِ جگر کھولدیئے

آنکھیں کھولے ہوئے سب دیکھ رہے ہیں تجکو
دیکھے جانے کو یہ عشاق نے در کھولدیئے

امتحان حسرتِ پرواز کا منظور ہوا
ذبح کر کے مجھے صیاد نے پر کھولدیئے

شرم آئیگی مجھے لوگ سمجھ جائیں گے
ہمنے گیسو مرے لاشے پہ اگر کھولدیئے

ہے مسافر نواز تیغ تری
ہمکو رخصت کیا گلے ملکے

ایک ظالم نے کسیکو آج زخمی کر دیا
یہ نہیں معلوم کس کا دِل ہے کس کا تیر ہے

کرتے ہیں تن کے قفس خالی نئی تدبیر سے
مرغِ جان اڑتے ہیں پر لیکر تمہارے تیر سے

کشتۂ لاغر کو اپنے دفن کر دیجے فقط
غسلِ میت ہو چکا آبِ دمِ شمشیر سے

آپ لیجائیں انھیں یا اسکے ٹکڑے جوڑ دیں
میری خاطر جمع ہو جائے کسی تدبیر سے

روح جبتک جسم میں ہے خارِ غم کی ہے کھٹک
دِل سے یہ کانٹا جو نکلے گا تو نوکِ تیر سے

رباعی

نزع میں رشکِ مسیحا کا خیال اچھا ہے
گو برا وقت ہے لیکن مرا حال اچھا ہے
بالوں کی سیاہی آہ ہیہات گئی
کہتے ہیں جوانی جسے وہ رات گئی

پیری نے زبان کی فصاحت کھو دی		تو صبح ہوئی، رات گئی، بات گئی
طفلی نہ رہی، کہ تھی وہ جانے والی	رباعی	کیا رہتی، جوانی تھی مٹانے والی
پیری کو رشید بس غنیمت سمجھو		اب فصل نہیں ہے کوئی آنے والی

آج معلوم ہوئے دل کے خیالات مجھے		تم سے حال اپنا کہا کرنے نہ دی بات مجھے
یاد ایام کہ تھا دل کے تڑپنے میں مزا		لطف دیتے تھے ستم آپکے دن رات مجھے
قبر میں سب سے زیادہ ہے یہ ایجاں تکلیف		تم سے جاتی رہی امید ملاقات مجھے
آستانے پہ ترے آکے یہ رتبہ پایا		کہ نظر آتے ہیں جنت کے مکانات مجھے
عشق میں کر کے فقیری بھی نہ کچھ ہاتھ آیا		نہ حسینوں سے ملی عشق کی خیرات مجھے
طالب دید سے یوں بیخبری کرتے ہیں		آپ سویا کئے آنکھوں میں کٹی رات مجھے
زیر خنجر کہتے تھے شہ اب بلا لطف حیات	سلام	یوں بسر ہو گر تو عمر جاودانی چاہیئے
جب صدا آتی ہے کیا دیکار رہی کہتے ہیں شاہ		بس ترے بندے کو تیری مہربانی چاہیئے
کیا کریں کیونکر چھپائیں تشنگی شاہ غیور		ہونٹوں کی خشکی کہے دیتی ہے پانی چاہیئے

ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا	رباعیات	کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا
کہتا ہوں جو میں کہ تھی جوانی میری		پیری کہتی ہے خواب دیکھا ہوگا
پیری میں غم راہ جناں کیونکر لیں	ایضاً	منزل پہ ٹھہر کے دم ذرا دم بھر لیں
لیٹے ہیں لحد میں اے فرشتو نہ اٹھاؤ		چلتے ہیں ذرا کمر تو سیدھی کر لیں
ہر چند بہت ملول و دلگیر ہوں میں	ایضاً	کیا فائدہ کیوں بیاں کروں پیر ہوں میں
دیکھو مجھے پوچھنے سے کیا حاصل ہے		پیری وہ ہے کہ جسکی تصویر ہوں میں
پیری نے حواس ہوش سب کھوئے ہیں	ایضاً	کب عہد جوانی کے لئے روئے ہیں
ہشیار شباب میں تھے پیری میں ہیں غش		شب بھر جاگے تھے صبح کو سوتے ہیں
ساعت معلوم اجل کے آنیکی نہیں	ایضاً	پھر بھی کچھ فکر یہاں سے جانیکی نہیں

پیری یہ نہیں بارِ گنہ سے خم ہوں
اب مجھکو مجال سر اٹھانیکی نہیں

ایضاً

پیری میں غم و ملال کب اٹھتے ہیں
ہوتا ہے قلق بیٹھ کے جب اٹھتے ہیں
جھکتا تھا جوانی میں گراں بہر رکوع
گھٹنوں پہ ہاتھ رکھکے اب اٹھتے ہیں

ایضاً

دنیا کے نہ رنج و درد و غم کو دیکھو
کس حال میں مبتلا ہیں عالم کو دیکھو
پیری کا تماشا ہو اگر مدِ نظر
یارانِ شباب آؤ ہمکو دیکھو

ایضاً

افسوس جوانی کی نہ کچھ غور ہوئی
ہوتی تھی جو کیفیت بہر طور ہوئی
دانتوں نے کیا قصد جدا ہونے کا
آنکھوں کی بھی اب ہمسے نظر دور ہوئی

ایضاً

کب کوئی بلا گئی ہے بیانی سے رکی
یک لحظہ نہ موت زندگانی سے رکی
پیری ہی کا نام گو ضعیفی ہے مگر
پر ایسی قوی ہے نہ جوانی سے رکی

مرے لہو کو ہوس ہے کہ اڑکے جا پہنچوں
ہوائے شوق میں اڑتا ہے انکا دامن بھی
تیرے بیمار تک آنے نہیں پاتا کوئی
بیکسی دور سے کہہ دیتی ہے حال اچھا ہے
ذبح میں بھی کی گئیں ہم پر بہت سی تہمتیں
سینکڑوں طوفان اٹھے آب دمِ شمشیر سے
وقتِ آخر مری آواز جو سنی رحم آیا
اسکی قدرت ہے اب آہوں کا رسا ہو جانا
نزع میں ہیں پاؤں میرے کوئے جاناں کی طرف
چاہتا ہوں وہاں پہنچ جاؤں کسی تدبیر سے

رشید

رشید۔ جناب مولوی رشید احمد صاحب رامپوری مولوی فاضل پاس ہیں رامپور کے مدرسہ میں تکمیلِ علم کرکے حضرت خلیل حسن صاحب خلیل کے فنِ سخن میں شاگرد ہوئے۔ بہر برس کے قریب عمر ہے استعداد عالمانہ ہے اور فن سے واقف ہیں کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

شبِ وصل اپنے شادیِ مرگ ہونے سے کھلا عقدہ
جسے ہم جان سمجھے تھے وہ تھی دلدار کی حسرت
ابھی ہو جائے مثلِ گل شگفتہ بات ہی کیا ہے
ذرا تم پوچھ لو ہنسکر دلِ بیمار کی حسرت
ترا خنجر ہو گردن پر ترا پیکاں ہو سینے میں
یہ ارمان مضطرب دل کا وہ جانِ زار کی حسرت
پیامِ قتل نے بھی روح سی اک پھونکدی تن میں
رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے تیغِ یار کی حسرت

یارب کسی کا حشر نہیں ہو جائے سامنا
آئے ہیں اتنی دُور بڑی آرزو سے ہم

ساقی ترے بغیر ہے یہ میکدہ کا حال
ہم سے خفا ہے جام خفا ہیں سبو سے ہم

جلنا پڑیگا یوں یہ خبر کیا تھی اے رشید
دل کیوں لگائے بیٹھے تھے آتش شعلہ رو سے ہم

کیا پُوچھتے ہو دردِ محبت کی لذّتیں
اس رنج کو خوشی سے بدلتا نہیں ہوں میں

ہاں ہاں ضرور آؤ گے مجکو یقین ہے
کیوں بار بار کہتے ہو جھوٹا نہیں ہوں میں

جب کہا میں نے کہ میں غیر کو مرتے دیکھوں
جل کے وہ بولے کہ تم خود ہی نہ مرکر دیکھو

تم نے دنیا کے تماشے تو بہت دیکھے ہیں
کوئی دم سیر مرے دل میں بھی رہکر دیکھو

بدنام فلک تم سے زیادہ تو نہیں ہے
ہے وہ بھی ستمگر مگر اتنا تو نہیں ہے

اِک طور ہے کیا جلوہ ہر اک شے میں ہے اُسکا
موسیٰ سا کوئی دیکھنے والا تو نہیں ہے

محفلِ میں رشید آیا تو کیا آپ کا بگڑا
چُپ بیٹھا ہے کچھ آپ سے کہتا تو نہیں ہے

نام آجاتا ہے جانیکا تو ہل جاتا ہے دل
تم چلے جاؤ تو کیا جانے مرے دل پہ بنے

نہ دیکھیں ہم انھیں، دل نہیں مانتا
یہ مانا کہ ہیں دیکھے بھالے ہوئے

بتوں کی بُرائی رشید اسقدر
بڑے آپ اللہ والے ہوئے

رشید

رشید، مولوی حافظ رشید الرحمن نقشبندی، مولٰنا احسان علی خان احسان رامپوری کے تلامذہ سے ہیں اور دورِ موجودہ کے موزوں طبع کہنے والے ہیں چند شعر درج کئے جاتے ہیں

وہی ہے پاؤں جو ہو حلقۂ زنجیر کے قابل
وہی سر ہے جو ہو قاتل تری شمشیر کے قابل

جو شوق صید بازی ہو اِدھر آئے شکار افگن
ہمارا طائرِ دل ہے ترے نخچیر کے قابل

وہ ظالم کشتۂ حسرت کا لاشہ دیکھکر بولا
پھراؤ کوبکو اسکو کہ ہے تشہیر کے قابل

دل چیز کیا ہے پائیں اشارہ تو جان تک
قرباں ہزار بار کریں آپ پر سے ہم

بام پر پھر خدا ابتو دکھا دے جلوہ
ہم تری راہ سرِ راہ گذر دیکھتے ہیں

رضا

رضا حمید الدین چاندپوری خلف حکیم مولوی کلو، تذکرہ شرف الدین احمد میرٹھی میں انکے

یہ دو شعر درج ہیں ❊

آہ کیا دن تھے کہ ہم ساتھ ترے ای گلرو قطعہ	دو قدم صحن خیاباں میں چلے بیٹھ گئے
اب یہ حالت ہے کہیں چھپکے ترے کوچہ میں	ہیں گنہگار جو دیوار تلے بیٹھ گئے

رضا

رضا مرزا جیون شاگرد فخر الشعرا امیر ممنون غدر سے پہلے قضا کر گئے،

تمہارے وصف دنداں میں یہ ہیں شعر بنتے ہیں	کہ گویا رشتہ مضمون میں موتی پڑتے ہیں
غیر سے گرم اختلاط ہے وہ	ہم بھی سنتے ہیں اور جلتے ہیں
کون سے وحشی کی اسکو اسقدر ہے یاد آہ	سنگ سے اب تک بھرا جو دامن کہسار ہے

رضا

رضا مرزا محمد رضا متوطن بلدہ لکھنو. انکو مرزا رفیع السودا سے تلمذ تھا، زیادہ حال معلوم نہ ہوا ایک غزل اور چند شعر بمشکل دستیاب ہوئے درج کیئے جاتے ہیں۔

سمجھتے ہو تم خوب غیروں سے ملنا	کیئے پر بہت اپنے پچتایئے گا
لائی ہے بہار ابکے برس اسقدر آتش	ہے جائے شگوفہ کے ہر اک شاخ پر آتش
یہ سوز نہانی ہے مرے سینے میں کس کا	جلتا ہے جگر پر نہیں آتی نظر آتش
وہ سوختہ جاں ہوں کہ تپ آہ سے جسکے	سلگائے کو لیتا ہے ہمیشہ سقر آتش
مینا کے چڑھے سینے میں کیونکر نہ پھپھولا	ہے بادہ گلگوں کی نپٹ تیز تر آتش
دوزخ کا بھی کچھ خوف رضا ہمکو نہیں ہے	کرتی ہے دم سرد سے میرے حذر آتش
یارب یہ آرزو میری پاؤں میں گل نجائے	جبتک کہ یار آوے یہاں دم نکل نجائے
کس کس کا جور و ناز اٹھایا کرے یہ دل	چھوڑے اگر مژہ کبھی آنکھوں کا بل نجائے
شام ہجراں گر نہ بیتابی کرے دل کیا کرے	دم بدم ہوتی ہے آفت سر پہ نازل کیا کرے

رضا

رضا میر محمد رضا برادرزادہ میر تقی ایک غزل انکی ایک پرانے تذکرہ میں نظر سے گذری جو خوشگوئی پر دلالت کرتی ہے زیادہ حال نہیں معلوم ہوا وہ شعر یہ ہیں۔

تم جو کہتے ہو مت نظر تو لگا	تمکو میری نظر لگی سے لگے

شمع جو تو نہ ہو سوتے ہیں گھر میں	پھر وہ تاریک گھر لگے نہ لگے

رضا

رضا میرزا علی رضا، عاشق مزاج، جنوں صفت، از خود رفتہ بزرگ تھے، اگرچہ خود شاعری کے اظہار سے گریز کرتے تھے مگر شعر اچھا کہتے تھے، تذکرۂ گلشن بیخار ۱۸۳۱ء میں بھی دو شعر انکے درج ہیں اور ظفری نویس انھیں لکھا ہے، مولوی شرف الدین میرٹھی نے میر رضا علی نام اور لکھنو وطن درج کیا ہے

رہا عالم یہ شب اپنا کہ اس بن دل جو گھبرایا	کبھی تکیے سے سر ٹپکا کبھی پتھر سے ٹکرایا
جس دل کو قلق سے نئے آہ گھیرا ہوگا	آنکھوں میں پھر اسکے اک اندھیرا ہوگا
کیوں گرد سے اپنے کو بچاتا ہے رضا	اس خاک میں آخر کو بسیرا ہوگا
ہدف ناز جو کل سینہ کا صندوق ہوا	تیر جو دل میں لگا سو لب معشوق ہوا
جو اکبار ہیں دیکھنے تجھکو پاؤں	بلائیں بھی لیلوں تصدق بھی جاؤں
مت پوچھو رضا کا کچھ حال غم تنہائی	اک دل تھا سو کھو بیٹھا اک سر ہی سو سودائی
کبھی سکے آکے خفا ہوئے جو گئے تو جا کے بلالیا	کبھی لیٹے لیٹے مچل گئے کبھی بیٹھے بیٹھے بگڑ گئے
ستم زمانے سے مجھپہ دن جو سے ایکبار یہ پڑ گئے	وہ جو آشنا تھے سو مر گئے وہ جو دوست تھے سو بچھڑ گئے

رضا

رضا رامپور کے رہنے والے کوئی خوش کلام شخص تھے اور ۱۸۴۷ء کے قریب زندہ تھے،

اب کوئی لحظہ میں مجنوں پہ بلا آتی ہے	جرس ناقۂ لیلیٰ کی صدا آتی ہے

رضا

رضا مولوی غلام رضا لکھنوی۔ قاضی محمد خلیل صاحب کی بیاض سے ایک شعر نقل ہوا۔

لو مبارک ہو رضا کا مٹ گیا نام و نشان	تم بھی رسوائی سے چھوٹے غیر بھی بے غم ہوا

رضا

رضا مولوی محمد برکت اللہ، آپ لکھنوی ہونے کے علاوہ علمائے فرنگی محل سے مستفید ہیں اوائل مشق سخن میں مولوی انعام اللہ انعام لکھنوی سے تلمذ اختیار کیا پھر جب مشق بڑھی تو حضرت امیر مینائی کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے تلمذ تہ کیا، عربی فارسی کی استعداد عالمانہ ہے اور ان دونوں زبانوں میں بہت سی کتابیں اور رسالے مختلف مضامین پر آپکی

تصنیف سے شائع ہو چکی ہیں، اب مشق سخن کو بائیس چوبیس برس کا عرصہ ہو گیا ہے۔ راجہ اشفاق علیخان تعلقہ دار محمدی ضلع کھیری انکے شاگرد اور قدردان ہیں، انھوں نے آپکا دیوان بھی سال گذشتہ میں شائع کرا دیا ہے، جس کا ایک نسخہ راقم تذکرہ کو بھی عنایت کیا شعر خاصہ کہتے ہیں اور پُرگو بھی معلوم ہوتے ہیں۔ زبان بھی بری نہیں مضمون کیطرف ذرا توجہ کم ہے

ذرا آسان ہو جاتی مصیبت بس یہ مقصد تھا
نہ گئے پاس تو گیا نزع میں نکلا نہ دم میرا

یارب دعا ہے تجھ سے کہ روزِ وصال ہی
ٹکڑا ملا دے کوئی شبِ انتظار کا

آگے آگے تری رحمت کے فرشتے ہونگے
ٹھاٹھ ہو گا سرِ محشر یہ گنہگاروں کا

تارے گننا کبھی، کبھی رونا
رات دن ہے یہ مشغلہ دل کا

کیسے بے چین نہ ہو بعد فنا دل میرا
بیٹھا روتا ہی سرہانے مرے قاتل میرا

کفر و ایماں میں ہیں یہ جھگڑے بکھیڑے کس لئے
ایک ہی ہوتا ہے ڈورا سبحہ و زنار کا

ہوائے آہ مجنوں لاکھ لائے آندھیاں لیکن
نہ ہو گا فاش پردہ حشر تک لیلیٰ کے محمل کا

مسیحا نے کہا ہر ایک سے یہ دیکھکر مجکو
خدا پر چھوڑ دو اسکو یہ اچھا ہو نہیں سکتا

جو اُس شوخ سے پوچھا نشانِ مسکن کا
بتا دیا مجھے اُس نے مکان دشمن کا

کعبہ و بتخانہ کوئی بھی خدا کا گھر نہیں
مفت کا جھگڑا ہی شیخ و برہمن میں دیکھنا

خدا بھی ہے اُسی بُت کا طرفدار
عبث ہے حشر میں فریاد کرنا

قُم باذنی سے کیا زندہ مجھے
لاش پر وہ معجزہ دکھلا گیا

ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے صیاد کے رضا
دیکھا جو اُسنے باغ میں خالی قفس پڑا

کل جو وعدے پہ نہ آپ آئیے گا
مجکو زندہ بھی پھر نہ پائیے گا

کیا کروں یارب سرِ محشر یہ کہتا ہو وہ بُت
مجکو شرمندہ نکر تو ہوکے خواہاں داد کا

ہاتھ رکھکر مرے سینے پہ وہ فرماتے ہیں
ہم بھی دیکھیں کہ تڑپتا ہے ترا دل کیونکر

کر رخصت انکو ہنسکے ولا صبح وصل تو
رونے کیواسطے تو پڑا ہے تمام روز

ابکے بہار میں ہے عجب جوش میکشی
زاہد کو بھی ہے خانۂ خمار کی تلاش

رونا بھی ہوں تو چھپکے ہیں گوشہ میں راتکو
رسوائی کا ہے اسکی مجھے اسقدر لحاظ

وہ کھڑے ہیں سامنے گردن جھکائے حشر میں
کھولنا اب کیوں نہ ہو مجکو لب اظہار شاق

بوسہ جو مانگا لب کا تو منہ پھیر کر کہا
کرتے نہیں ہیں بات کسی لالچی سے ہم

جو اُنکے در پہ جا کر ہم کبھی فریاد کرتے ہیں
تو ہنسکر کہتے ہیں پوچھو تو کسکو یاد کرتے ہیں

اسیر زلف ہو کر یوں بسر ہم عمر کرتے ہیں
کہ پوری جیسے قیدی قید کی میعاد کرتے ہیں

بھٹکتے پھرتے ہو ہر سو اکیلے دار فانی میں
خضر کیا لطف ہے ایسی حیاتِ جاودانی میں

نہ نیند آتی ہے راتوں کو نہ سکھ سے دن گذرتے ہیں
تمہارے چاہنے والے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

دھرا ہے سامنے آئینہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں
عجب صورت ہے انکی جبکو وہ خود پیار کرتے ہیں

رضا ہیں محو ایسے یاد میں ہم اُس پریرو کے
نہیں معلوم کسکو دل دیا ہے کس پہ مرتے ہیں

کسی کے سوز اُلفت سے جگر دل ایسے جلتے ہیں
کہ سانس آتی نہیں منہ سے مرے شعلے نکلتے ہیں

ملنے کو آتے ہیں اپنے اور بیگانے سبھی
عید کا دن ہے گلے لگجاؤ شرماتے ہو کیوں

یہ بھی اک ادنیٰ اثر ہے جھوٹے وعدوں کا حضور
آپ کا اقرارِ وصل اور وہ مجھے باور نہ ہو

کریم اپنی کریمی کی شان دکھلا دے
وہ دے مجھے کہ کبھی حاجت سوال نہ ہو

کسیکی تیغ کا ہے یادگار زخم جگر
الٰہی حشر تلک اس کا اندمال نہ ہو

جاتے ہیں خالی ہاتھ جہانِ خراب سے
بے توشگی ہی توشہ ہمارے سفر میں ہے

پہلے ہی سنتا تھا دیوانوں کو اے گیسو نگر
دیکھکر زنداں میں اب ہنستے ہیں زندانی مجھے

بنے گا سینۂ پرغم نمونہ رنج و راحت کا
وہ دلبر ہاتھ رکھینگے جگر سے تیر کھینچیں گے

کسی کا خون کرنے سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا
بھلا یہ بھی کوئی ضد ہے جگر سے تیر کھینچیں گے

مرا دل لے لیا باتیں بنا کے
کہاں جاتے ہو اب یہ گل کھلا کے

وعدہ پہ نہ آنے کا سبب پوچھا تو بولے
کیا یاد دلایا تھا مجھے آکے کسی نے

دلِ ہجر میں کس طرح سے بہلے گا بتاؤ
مانا کہ ہم نالہ و فریاد کریں گے

ہمدم ہوا کشتہ ہوں تیغِ ابروئے مخمور کا
خندۂ زخم جگر بھی خندۂ مستانہ ہے

وعظ کی محفل میں مے پیکر ابھی آتے ہیں ہم
واعظا دو قدم پر سامنے میخانہ ہے

آج گلچیں نے قدم باغ میں کیا رکھا ہے
شور بلبل نے قیامت کا مچا رکھا ہے

پاس آتے دیکھکر مجکو کہا اُس شوخ نے
آپ کو کہنا جو ہو سو کچھ مجھسے کہیے دور سے

مرنا جینا نیک و بد کا جب نہیں ہو اختیار
کیوں گنا ہونگی ہو پُرسش بندۂ مجبور سے

بجلیاں بنکر پلٹ آتے ہیں آہ ہونکے شرر
لُطف کو پوچھو ان مصائب کے دلِ رنجور سے

محتسب میرا و رمینوشی غلط بالکل غلط
مست ہوں نظارۂ چشم بتِ مخمور سے

بوسہ لیا ہے اُس بُتِ یکتا کے خال کا
اللہ بخشدے گا وہ بخشندہ نواز ہے

تیرے تقوی کا میں اسوقت ہوں قائل ای شیخ
وہ صنم پاس ہو اور تجکو خدا یاد رہے

یہ پوچھتا ہے نزع میں وہ عیسیٰ زمان
ابتو ہم آگئے کہو جینے کی آس ہے

رضا مولوی قاضی عنایت رضا خلف شیخ غلام موسیٰ ساکن قصبۂ بدایوں سے تلمذ تھا۔ قوتِ حافظہ کا یہ حال تھا کہ ہزار ہا شعر از بر تھے، یہ اُن کا منتخب کلام ہے۔

کلام دونوں کے ہیں مخالف کرے وہ قاتل بھی گر کسی کا کہنا
زبانِ خنجر کہے ہے بس بس گلو کہے ہے کبھی نہ کرنا

اگر ہو یاروں سے تم مخالف موافق اغیار کے نہ رہنا
نکرنی ہو گر ہماری خاطر رقیب کی بھی خوشی نکرنا

مونس ہے مرا کوئی نہ ہمدم شبِ فرقت
ہاں ساتھ جو دیتا ہے تو اک غم شبِ فرقت

کیا کہیے کہ کیوں جیتے رہے ہم شبِ فرقت
تھا پیشِ نظر وصل کا عالم شبِ فرقت

ہوں جو رہی پہ خوش کہ اُسے یاد تو رہا
اُس شوخ سے تھی مجکو امید ستم کہاں

گیا ہوں آپ سے میں کس کی میزبانی میں
الٰہی دل میں ہیں مہمان کون آکے ہوئے

رضا جناب شیخ رضا عباس صاحب خلف شیخ علی عباس صاحب وکیل شاگرد جناب عاشق لکھنوی ۱۲۸۷ھ میں لکھنؤ کے رسالہ نغمۂ بہار میں انکی غزلیں چھپا کرتی تھیں چند شعر منتخب ہوئے

رند مشرب ہوں میں پابند نہیں مذہب کا — آج میخانہ میں ہوں کعبہ میں کل جاؤں گا
کیوں شہید ناز کے غم میں ملے حسرت سے ہاتھ — دستِ نازک سے ترے رنگِ حنا جاتا رہا
جھیل ڈالیں سختیاں روزِ فراقِ یار کی — اب قیامت کا بھی دل سے دغدغا جاتا رہا
منتوں سے ایک بوسہ پر ہوا راضی وہ شوخ — سب وہ برسوں کا گلا شکوا رضا جاتا رہا
اِس قدر شوقِ اسیری تھا دلِ ناشاد میں — دام سے چھوٹے پھر آیا خانۂ صیاد میں
رنگ اور بہار اور رضا اور ہی کچھ ہے — اِن روزوں گلستاں کی ہوا اور ہی کچھ ہے
مر کے ملجاتی ہے دنیا کے بکھیڑوں سے نجات — پاؤں پھیلائے ہوئے سوتے ہیں سونیوالے
کھلی آنکھ جب قبر میں ہم یہ سمجھے — مُسافر کو راحت کی منزل یہی ہے

رضا۔ مرزا رضا حسین بیگ صاحب رضا بریلوی خلف مرزا فدا حسین بیگ تپش[۳۰] برس اُدھر بریلی کے مشاعروں میں غزلخوانی کیا کرتے تھے اور حضرت حکیم نیاز احمد خان ہوش کے تلمذ سے بہرہ یاب تھے، طب میں بھی دخل تھا بیس برس ہوئے انتقال کیا ۵۴ برس کی عمر پائی

پھینکدو نگاہیں تجھے چیر کے پہلو میں دل — شکوۂ جورِ بتاں کچھ جو زباں پر آیا
کچھ عجب دیکھی کشاکش عشق کے بازار میں — موت بھی آتی نہیں عاشق کو ہجرِ یار میں
فاتحہ پڑھنے جو آئے قبر پر وہ سیمتن — خاک ہو جاتا نہ کیوں حق میں مرے اکسیر ہو
صاحبِ حیرت ہیں دنیا کے حوادث سے پرے — قید کب دامِ قفس میں طائرِ تصویر ہو
ماند کردے چاندنی کے کھیت کو اُسکی چمک — جس مرقعہ میں تمھاری چاند سی تصویر ہو
دورِ گردوں سے گلا ہمکو نہ شکوا یار سے — اے رضا راضی ہیں ہم جو خواہش تقدیر ہو
قسم لو، قول لو، بوسہ نلو نگار زلف کا ہیں — معاف بہرِ خدا اب مری خطا ہو جائے
وصالِ یار میسر ہو کس طرح مجھکو — نہ جاذب دل میں ہے تاثیر کچھ نہ آہ میں ہے
خطا ہمسے کیا سیمبر ہو گئی — جو اب تیری ٹیڑھی نظر ہو گئی
مُرادِ دلی کیوں بر آتی نہیں — مری آہ کیا بے اثر ہو گئی

سفیدی سے بالوں کی عقدہ کھلا — کہ عمرِ دوروزہ بسر ہوگئی
ٹھکانا نہ تو ہم نصیبوں کا پوچھ — جہاں شب کو بیٹھے سحر ہوگئی
پلٹ کر نہ پائے گا زندہ مجھے — جو تاخیر اے نامہ بر ہوگئی
شیخی بے فائدہ ہے بلبل کی — چند روزہ بہار ہے گل کی
کر نہ پامال گل کو بادِ خزاں — جان جاتی رہے گی بلبل کی

رضا

رضا مبین الرضا خان بدایونی، قمر الحسن قمر بدایونی سے تلمذ ہے، جوان آدمی ہیں، حال باوجود تلاش نہ ملا اشعار ملاحظہ ہوں ؎

صبا سے ہیں کہنے کو تھا حالِ دل — وہ سننے سے پہلے ہوا ہوگئی
عجب کیا اگر دل کی چوری کھلی — گرہ زلفِ جاناں کی وا ہوگئی
بُرائی بھلائی محبت کی کیا — جو ہونی تھی وہ اے رضا ہوگئی

رضا

رضا جناب داروغہ مرزا رضا حسین صاحب تلمیذ حضرت حکیم مرحوم لکھنوی زمانہ حال کے شعرا میں ہیں حالات باوجود تلاش نہ ملے ؎

کیے ہیں آپ نے قابو میں لاکھ دل کیونکر — جب ایک اپنی طبیعت پہ اختیار نہ تھا
پیادہ حشر میں سر کو جھکائے کیوں آئے — جو خون آپ کے سر پر مرا سوار نہ تھا
وہ خود بخود مرے گھر بے بلائے کیوں آئے — مری طرح سے جو دل اُنکا بیقرار نہ تھا
میں کس اُمید پہ کرتا معاملہ دل کا — مجھے جب اُنکا اُنھیں میرا اعتبار نہ تھا

رضا

رضا میرزا نظیر حسین رضا، باشندہ عظیم آباد، میر حامد حسین نگہت کے شاگرد ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے

رہتا ہے اک زمانے سے گردش میں رات دن — جویا یہ پیرِ چرخ ہے کس رشکِ ماہ کا
ہاتھوں سے دل سنبھال رہے ہو یہ حال ہے — دیکھا اثر غریب کی فریاد و آہ کا
چارہ گر کو ہے عذر مجھ زار سے — الاماں اس عشق کے آزار سے
خاک کر ڈالا اُسے جس پر گری — الاماں برقِ نگاہِ یار سے

رضا

رضا نواب محمد رضا خان رضا خلف نواب حسین دوست خاں بہادر شہرت رئیس و جاگیردار اول کنڈہ صوبہ مدراس نبیرہ نواب شمس الدولہ مبارز جنگ معروف بہ چند اصاحب والی ملک کرناٹک ۱۲۵۵ھ سال ولادت ہے عمر پچاس سال کے قریب ہوگی حضرت سلامت علی دبیر سے تلمذ رہا ہے۔ مرثیہ، غزل، قصیدہ، رباعی، جملہ اصناف سخن میں دخل حاصل ہے چند شعر ملے وہ درج کئے جاتے ہیں۔

رباعی

دوست دشمن، عدو یگانہ ہوا
ہم اسی بیوفا پہ مرتے ہیں
دنیا میں دبیرِ سخن آرا نہ رہا
دنیا رہی باقی تو رضا ہمکو کیا

کس قدر منقلب زمانہ ہوا
جس کا وعدہ کبھی وفا نہ ہوا
اوجِ فلکِ نظم کا تارا نہ رہا
افسوس ہے استاد ہمارا نہ رہا

اب سنّ سے بڑھی عمر چلی فصل شباب
یہ شیخ و برہمن ہیں کیسے الٰہی
بایں سجدہ و جبّہ زنار و ناقوس
تجھے دیکھوں کیونکر ہے ضد بن کا جمع

بس ہو چکا پاتراب باندھو اسباب
یہ کیا بت پرستی یہ کیا دینداری
ہماں ذوق نفس و ہماں بادہ خواری
خفی تو ہیں مظاہر، تو نوری میں ناری

رضا

رضا منشی شیخ رضا حسین خلف شیخ مہدی علی نبیرۂ شیخ مہدی علی عرف راجہ میاں متوطن لکھنؤ کتب درسیہ مولوی ہادی علی رشک وغیرہ اساتذہ سے پڑھیں، فن سخن میں حضرت امیر مرحوم سے تلمذ رہا ۱۸۸۶ء میں حیدرآباد دکن میں وکالت کرتے تھے اور پینتیس برس کی عمر تھی یادگار ضیغم سے کلام منتخب ہو کر درج تذکرہ کیا گیا۔

رہی گرمی نہ باقی نام کو خورشیدِ محشر میں
خیالِ عارضِ جاناں نہیں اس دیدۂ تر میں
عجب ہنگام میں میخانۂ ہستی میں ہم آئے
وفائے وعدۂ دیدار میں ہے خوفِ محرومی

قیامت کی تری تھی میکشوں کے دہنِ تر میں
حریرِ شعلہ کا پیوند ہے پانی کی چادر میں
نہ میخانہ میں ساقی ہے نہ مے باقی ہے ساغر میں
کدھر ڈھونڈیں کدھر جائیں بڑا مجمع ہے محشر میں

رضا

رضا مرزا نظیر الدین گورگانی دہلی، صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا کے صاحبزادے ہیں جو شاہزادگان دہلی میں نامور استاد فن گذرے ہیں، اپنے والد کی وفات کیوقت سے سرکار رامپور کے وظیفہ خوار ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔ ۴۰ برس کے قریب سن ہے شاعری کا شوق بھی ورثہ آبائی ہے۔ کلام ملاحظہ ہو

گلچیں کو تو غرض ہے پھولوں کے توڑنے سے — بلبل پہ یہ ستم ہیں یا باغباں پہ ہیں
وہ داستان فرقت سنکر یہ کہہ رہے ہیں — دن رات جھوٹے قصے تیری زبان پہ ہیں

دشمنی کرنیکا پھل دشمن کو خود ملجائے گا — آئینوالا ایک دن اُسکے لیئے مشکل کا ہے
ہم کہیں تو کیا کہیں کوئی سُنے تو کیا سُنے — کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا جو مطلب دل کا ہے
کیا کہوں میں عشق میں جو مصیبت جان پر — کیا بتاؤں میں جو بیتابی سے عالم دل کا ہے

رضا

رضا منشی علی رضا سیتاپوری شاگرد میر تحمل حسین محمد آبادی

ایک بوسہ لب شیریں کا کوئی بات نہ تھی — گالیاں مفت میں دیں تمنے ترشرو ہو کر
وصل میں اُس مہ خوبی سے منور تھا جو گھر — اب برستی ہے اُداسی اُسی کاشانے سے
آپکے حسن نے کیا خوب درانداز کی کی — گل ہے بلبل سے جدا شمع ہے پروانے سے

رضا

رضا سید علی رضا رامپوری۔ آجکل کے کہنے والوں میں ہیں، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اک آپکی بدولت سو صدمے جان پر ہیں — غم کے پہاڑ ٹوٹے مجھ ناتواں پر ہیں
میری وفا کے قصے مشہور ہیں جہاں میں — تیری جفا کے چرچے سبکی زبان پر ہیں
وہ پیاری پیاری صورت ہر دل میں بس رہی ہے — وہ بھولی بھولی باتیں سبکی زبان پر ہیں
مجھے ڈر ہے شب فرقت میں کہیں اے گردوں — تو نہ اُلٹ جائے مرے نالۂ شبگیر کے ساتھ

رضا

رضا مولوی محمد رضا صدیقی شاگرد صمیم علی شاہ صاحب صمیم بلند شہری، آپ الہ آباد کے باشندے اور خاندان صدیقیہ چشتیہ سے بیعت ہیں، موجودہ زمانہ کی طرز میں بھی کہتے ہیں اور عاشقانہ رنگ میں بھی۔ علی گڈھ میں اکثر سکونت رہتی ہے بندش چست اور زبان صاف ہے

اُڑتا ہے آسماں تک سر سے دھواں ہمارا — چھونکے نہ ہمکو اک دن سوزِ فغاں ہمارا

حسرت نے راحتوں کی توقع مٹا کے چھوڑی
شمع سحر کی صورت آخر ہے دور اپنا

ہے مدعی جہاں میں ہرنا تواں ہمارا
بزم جہاں میں بجڑا گویا سماں ہمارا

یہ بہار افزا لہو کس خندۂ بسمل کا ہے
ہے یہ مرگ نامرادی یا کہ شادی مرگ ہے

دامن گلزار دامن خنجر قاتل کا ہے
سر ہے میرا اور زانو حمد ل قاتل کا ہے

یا الٰہی درد فرقت اک گھڑی بھر کو بجائے
اے اجل تو آنیوالی تھی تو پہلے کیوں نہ آئی

بس یہی تو اک سہارا عاشق بیدل کا ہے
اب تو جو احسان ہے وہ خنجر قاتل کا ہے

رضا - محمد موسیٰ رضا باشندۂ چھپرا۔ آپ کو جناب فہیم گورکھپوری سے تلمذ ہے بارہ چودہ برس سے مشق سخن کرتے ہیں اور خاصہ کہہ بھی لیتے ہیں۔

عدو کے غم میں مُرجھائے ہوئے سے پھول ہیں گویا
اثر جذب محبت میں الٰہی ہو تو اتنا ہو

ذرا دیکھو تو آئینہ میں رنگت اپنے گالوں کی
کہ حالت آکے خود پوچھیں وہ اپنے خستہ جانوں کی

تڑپ کر جان دیتے ہیں مریض عشق فرقت میں
خدا ہی کو مٹانا تھا ہمیں انکی محبت میں

گھڑی بھر دیکھ جاؤ آکے صورت مرنیوالوں کی
شکایت آسماں کی ہے نہ ہمکو انکی چالوں کی

دکھایا جذب الفت نے پس مُردن اثر اپنا
کہ تربت پر نظر آتی ہیں شکلیں خوش جمالوں کی

رضوان - نواب محمد واجد علی خان صاحب بہادر رضوان ٹھکاری والہ ولد نجابت علیخان بہادر خلف ارشد نواب سید محمد خان بہادر غضنفر جنگ باون ہزاری فرمانروائے فرخ آباد بڑے خوش رو اور خوش کلام امیر تھے، اہل کمال کی نہایت قدردانی فرماتے تھے، علماء فضلاء غریب وغربا فقیر و شعرا کی بہت خاطرداری کرتے تھے، نیکوکاری میں مصروف رہنا اپنا خاص شیوہ قرار دیا تھا، نثر و نظم اردو فارسی دونوں خوب لکھتے تھے، تحریر و تقریر کی طرز نرالی تھی طبیعت بہت عالی پائی تھی۔ کلام معجز نظام منشی سید سمٰعیل حسین منیر کو دکھاتے تھے ۱۲۹۰ھ میں انتقال فرمایا۔ منیر مرحوم کو بھی انکے مرنے کا بہت قلق ہوا و قطعات تاریخ انکے غم فراق میں انکے کلیات میں موجود ہیں، کلام بہم رسیدہ کا انتخاب حاضر ہے۔

میری بغل سے وہ گل رخسار نکل گیا
دل پکڑے پھر رہا ہوں کلیجہ نکل گیا
کیوں ہو رہے ہو شرم کی گھڑی شب وصال
انگیا مسک گئی کہ دوپٹہ نکل گیا

ہم قتل ہو کے بھی نہ جدا ہونگے یار سے
بات اپنے سر کے ساتھ ہی ہمرنگ زن کیساتھ
صندل میں رنگیں آپ کہ پھولوں میں بسائیں
بو عطر محبت کی دو لائی نہیں دیتی
بے جان سیئے چھوڑ چکی شام جدائی
گھٹتی ہوئی یہ شام دکھائی نہیں دیتی
لے نیند کہاں رہتی ہے مجکو یہ بتلاوے
آنکھوں کو تری شکل دکھائی نہیں دیتی

رضوان

رضوان سخنور خوش فکر سید شمشاد علی بیگ رضوان کہین برادر مرزا قربان علی بیگ سالک حیدر آبادی مولد دہلی مسکن مرزا نوشہ غالب کے بڑے عزیز شاگرد تھے سبقاً سبقاً مرزا صاحب سے انھوں نے فارسی پڑھی بلکہ خود مرزا صاحب کا کلام ان سے پڑھا تھا۔ نواب احمد سعید خان طالب اور منشی بہاری لال مشتاق کے ہم صحبت و ہم مشق تھے شطرنج بہت کھیلتے تھے دو تین چھوٹے چھوٹے رسالے مثلاً "بساط فرنگستان" انکی تالیف سے یادگار ہیں، بڑے ملنسار حلیم، خوش طبع، خلیق، خوش فکر نوجوان تھے، چندے الور میں وکیل اور ڈپٹی مجسٹریٹ رہے تھے ۱۲۹۳ھ میں انتقال کیا، ۴۰ برس کی عمر پائی، حضرت سالک کو انکی وفات سے سخت صدمہ پہنچا۔ مندرجۂ ذیل اشعار انکے نتائج فکر سے ہیں جن سے متانت اور پختہ کلامی کی شان ہویدا ہے، طبیعت وقت پسند پائی تھی اور نازک خیالی کی طرف میلان خاطر تھا۔ بلند پروازی اور رسائی فکر کی بدولت اپنے ہمسروں میں ممتاز تھے ؛

اپنی نظروں میں وہاں کی ہی تجلی کہ جہاں
شعلۂ طور کو بھی حکم ہے موسائی کا

کیا خاک کوئی پائے مزا اعتدال کا
الٹا ہے ایک کھیل تغیر خیال کا
نظارگی ہوں اسکے رخ پُر جلال کا
پروانہ چراغ ہوں بزم خیال کا
اشیار میں پہلے کبھی وہ حیرت فزا رہا
کیا پوچھنا ہے اسکے فروغ جمال کا
گھیرا ہے جس غبار الم نے جہان کو
وہ ایک ذرہ ہے مرے گرد ملال کا

دُنیا کے اعتبار سے حاتم سخی سہی
ورنہ یہ سب ظہور ہے اُسکے نوال کا

گم کردگانِ راہ کو ہو نقشِ پا دلیل
ملجائے گر نشان ترے پائمال کا

آئینہ دارِ ذات ہے آئینۂ صفات
ہے ذرہ ذرہ آئینہ اُسکے جمال کا

شیریں ہو کیا جواب ترا گو خلاف ہے
مُنہ بند کر دیا ہے مکرّر سوال کا

دیتے ہیں بے طلب مئے مقصد بقدرِ ظرف
شرمندہ اے کلیم ہوا کیوں سوال کا

پیتا ہوں بادہ اوک سے تا خُو پڑی رہے
کوثر پہ جامِ زر نہ پیالہ سفال کا

جب وعدۂ وصال کی میعاد ہی نہیں
کیجے حساب کس لیئے پھر ماہ و سال کا

آسودگانِ خاک نہ چونک اٹھیں پھر کہیں
آہستہ ذکر چاہیئے اُس بُت کی چال کا

میری شبِ وصال قیامت نہیں اگر
کیوں منحصر ہے حشر پہ ہونا وصال کا

حسن لیتے ہیں عجب نہیں آجائیں راہ پر
جمتا چلا ہے رنگ ہمارے مقال کا

صحرا ہی اور ہیں ہوں مرا سر ہے اور کوہ
کیا پوچھتے ہو حال مجھ آشفتہ حال کا

رضوان خدا کو مان یہ ظاہر پرستیاں
کمبخت کچھ بھی خوف ہے تجھکو مآل کا

وہ تو آئے ہیں دکھانے اثرِ غم مجکو
اور آتا ہے مسیحا پہ تبسّم مجکو

غم سے بدلی ہے یہ صورت کہ نہ پہچانوگی
تیری اُلفت نے کیا دیر میں یوں گم مجکو

جسنے کھایا تھا وہ پاداش کو پہنچا یارب
کیوں لبھاتی ہے مرے خواہشِ گندم مجکو

حُسنِ اشیا کے تماشے میں ہوں محوِ وحدت
علتِ توحید ہوئی کثرتِ مردم مجکو

نظر آتی نہیں چپ بیٹھ کے بھی تجھسے نجات
اب تو ناصح نہیں یارائے تکلم مجکو

پاؤں پھیلا کے جہاں سوؤں وہاں نیند آجائے
دامنِ دشت ہے یا بسترِ قاقم مجکو

جب سماتا ہے تصور میں وہ پہلا نقشا
نظر آجاتے ہو کعبہ میں بھی تو تم مجکو

کیوں سنوں تیری کہ سُننے نہیں دیتا ہی خمار
شیخ سمجھائے تو دے پہلے کوئی خم مجکو

ناتوانوں کے نصیبوں میں کہاں ہیں جنّات
لے اُڑی ساتھ مرے گردِ نسیم مجکو

کیا لطفِ زندگی دلِ غم مبتلا کے ساتھ
سیر جہاں کو آئے بھی تو کس بلا کے ساتھ

گر جاؤ گے نظر سے جو ٹوٹی وفا کی آس
جانے بھی دو کہ ضد نہیں اچھی وفا کے ساتھ

یا رب ستم کے بدلے وہ بت بھی ملا تو کیا
ہو کوئی شب بھی عیش کی روزِ جزا کے ساتھ

آنے سے تیرے تا ہو ہمسایہ کو خبر
کرتے ہیں نالہ ہم تری آوازِ پا کے ساتھ

میں خوش ہوں ضعف سے کہ رسائی کی ہے امید
شاید گذر ہو کوئے صنم میں ہوا کے ساتھ

کیا معتقد مسیح کے ہوں دم ہی دم ہے وہاں
سب کا علاج فرض نہیں اک دوا کے ساتھ

ہو یہ گرہ نہ ناخنِ تدبیر سے بھی وا
وابستہ میرے کام ہیں بندِ قبا کے ساتھ

شرمِ ستمگری سے بن آتا نہیں انھیں
انداز لطف کا دلِ غم آشنا کے ساتھ

بیتابیاں نہ کیونکہ ہوں آئینہ دار راز
شوخی غضب ہے اسکی نگاہِ حیا کے ساتھ

ہم پاسِ وضع سے رہے ناکام بیشتر
نازک دماغیاں بھی ہیں یاں التجا کے ساتھ

رہنے دو نزع میں کہ انھیں مرگ کی ہے آس
مر جاؤنگا مسیح، دمِ جانفزا کے ساتھ

ہم مر گئے خوشی میں وہ یاں آئے اس طرح
یہ ظلم کس سے کہیئے کہ مارا وفا کے ساتھ

گویا دِ حق میں ہوں مگر آتی ہے جان ہی
اب بھی بتانِ شوخ کی آوازِ پا کے ساتھ

رضواں وہی ہوا کہ جو کچھ تھا خیال میں
کیوں بحث کیجے داورِ روزِ جزا کے ساتھ

عشق کا نام دوسرا کیا ہے
مرضِ موت کے سوا کیا ہے

کہہ چکے آپ سن چکے ہم پھر
کہتے ہو کیجئے ماجرا کیا ہے

لٹ چکے مٹ چکے پھرائی گردوں
ہم پہ اور جور کر رہا کیا ہے

خود تماشا ہے خود تماشائی
کون جانے وہ خود نما کیا ہے

میں تو موسیٰ نہیں کہ ہوں محروم
جلوہ پردے میں ای خدا کیا ہے

آہ کو اپنی کیا کروں ضائع
چرخ کیا چرخ کی بنا کیا ہے

دل لگا ایسے بھولے سے رضواں
جو سمجھتا نہیں ادا کیا ہے

حسن حیرت نہیں تو پھر کیا ہے؟ | اُسکی قدرت نہیں تو پھر کیا ہے
چشم جادو ہے اور بلا ہے نگاہ | غمزہ آفت نہیں تو پھر کیا ہے
گر بہارِ ظہور حسنِ ظہور | عین وحدت نہیں تو پھر کیا ہے
عشق بے جذبہ وکشش بیکار | دِل میں اُلفت نہیں تو پھر کیا ہے
تیز کرتا ہے دشنہ کو دمِ قتل | یہ مروت نہیں تو پھر کیا ہے
کوئی اُس کوچے سے نہیں پھرتا | ہاں وہ جنّت نہیں تو پھر کیا ہے
اُسکی رفتارِ فتنہ زا رضوان | گر قیامت نہیں تو پھر کیا ہے

شہرِ دہلی کو اگر رہنا کا دل کیجیئے فرض | حضرتِ قلعہ کو ٹھیرائیے جانِ دہلی
گر نہوں ہم تو سو بازار میں گرمی کیونکر | ہم ہی تھے جنسِ گراں ازدوکانِ دہلی
دست یغمائے فلک سے نہ رہا کچھ باقی | ہاں مگر واسطے نالے کے زبانِ دہلی
ہے عدم کی سمجھے منظور خدایا رونق | کہ اُٹھایا اُنھیں جو لوگ تھے جانِ دہلی
انتہا گم شدگی کی ہے عدم ہو جانا | ہے نہ پایا نہ عدم میں بھی نشانِ دہلی

رضوان جناب ابو المظفر مولا بخش صاحب باشندۂ آرہ شاگرد جناب آتشخ مرحوم شاگرد رشید نساخ مرحوم، جناب رضوان نے ابتدا میں کئی سال جناب مولوی حافظ عبد الحمید حمید سے اصلاح لی پھر آتشخ کے شاگرد ہوئے جس زمانہ میں حضرت داغ کلکتہ گئے ہیں آپ بھی اُن مشاعروں میں شریک ہوئے تھے پرانے مشاق ہیں، ۵۰ برس سے زیادہ عمر ہے یہ کلام ہے

شمع رویوں کو ہمارے دلکی کو پروانہ تھی | دل ہمارا عشق میں اُنکے مگر پروانہ تھا
دیر سے رضوان کہو کعبہ کا کرتا عزم کیا | کعبہ جسکو کہتے ہیں وہ بھی تو اک بتخانہ تھا
ملا دیا جو اسے خاک و خوں میں خوب کیا | یہی سزا تھی دلِ بیقرار کے قابل
شبِ وصال ہے کیا پیشکش کروں اُسکی | کہ جانِ زار نہیں نذر یار کے قابل

کیوں جاں دے کسی کے لیئے کوئی کیوں مرے | دنیا میں جب کسیکا کوئی آشنا نہیں

ہمصفیرو! فصلِ گل فرقت میں خوش آتی نہیں
زمزمہ سنجی عنادل کی مجھے بھاتی نہیں

یہ سوالِ وصل کا اُسنے دیا مجکو جواب
یاد رکھو مجکو ایسی دل لگی بھاتی نہیں

تھی شبِ وصلت وہ جس میں صبح تک سوتے نہ تھے
ہے شبِ فرقت یہ جس میں موت تک آتی نہیں

نامہ بر دیتا نہیں کیوں مجکو پیغامِ قضا
وہ نہیں آتے نہ آئیں موت کیوں آتی نہیں

خونِ شہیدِ ناز بھی لو رائگان گیا
مقتل سے وہ چلے گئے دامن سنبھال کے

تسکیں دہی کے حیلے سے سینہ پہ رکھکے ہاتھ
باتوں میں لے گیا وہ مرا دل نکال کے

کیوں نہ دل عاشق کا صرفِ نالۂ پیہم رہے
غیر جب دن رات اُسکا مونس و ہمدم رہے

راہ لے اپنی تجھے کیا کام ہمسے اے خضر
غم تجھے کیا دُور منزل سے ہے تو ہم رہے

جنابِ شیخ بھی چپکے سے پی لیں
وہ مہ پیکر اگر دے جام بھر کے

مٹادونگا نشاں تک سنگِ در کے
اُٹھونگا اب تو تیرے در سے مر کے

نہ نکلی ہیں نہ نکلیں گی کبھی دل سے کسی عنواں
تمنائیں، مُرادیں، آرزوئیں، حسرتیں دلکی

رہیں وہ میری آنکھوں میں یہی حسرت ہے آنکھونکو
وہ ہوں رونق فزا دل میں یہی ہے آرزو دلکی

نرالے ڈھنگ ہیں دنیا سے اُس شوخِ ستمگر کے
پشیماں جور سے کیا ہو وہ نازاں ہو ستم کر کے

تڑپتے ہیں گلی میں بیوفا کی سینکڑوں زخمی
چھُری کے، تیر کے، تلوار کے، برچھی کے، خنجر کے

کہا کیوں سنگدل اُنکو شبِ وصلت پشیماں ہوں
نہیں کچھ بولتے مُنہ سے بنے بیٹھے ہیں پتھر کے

بھرے سو جام خالی کرچکے اغیار اے ساقی
رہے ہم منتظر محفل میں تیرے ایک ساغر کے

نہیں کہتے ہوئے بدنام ہم خود مار کر اُنکو
یہ کہتے ہیں ہمیں رسوا کیا عشاق نے مر کے

پھریں آوارہ ہم برسوں رہیں وہ بزمِ دشمن میں
یہ گردش ہے ستارونکی کرشمے ہیں مقدر کے

وہ آتے ہیں مگر یہ یاد رکھنا حضرتِ رضوان
ہماری ہی شکایت وہ کرینگے دیکھنا ہمسے

میں ہوں وہ کشتۂ سوزِ فراقِ شعلہ رخاں
زمین جل گئی تربت بنی جہاں میری

نہ وہ شباب نہ وہ دل نہ جوشِ مستی
وہ پیشتر کی اُمنگیں گئیں کہاں میری

رہا حشر میں بھی وہ محشر خرام	قیامت سے بھی چوٹ چلتی رہی

رضوان

رضوان - عالیجناب نواب رضوان علیخان صاحب رئیس اعظم مراد آباد عرف محمود اختر۔ آپ عضد الدولہ نواب محمد عظمت اللہ خان دلیر جنگ ناظم صوبہ روہیلکھنڈ زمان شاہی کے خاندان سے ہیں، عربی فارسی کی تعلیم رئیس زادوں کی طرح گھر پہ ہوئی اور آپکو فی الجملہ علوم متداولہ میں مہارتِ تام حاصل ہے، نعتیہ کلام کہنے کا عرصہ سے شوق ہے اور عاشقانہ شعر کی طرف توجہ کم ہے، اِس صنفِ خاص میں آپکا کلام قابل ستایش ہے، اور حضرت امیر نواب فصیح الملک مرزا داغ اور حضرت جلال و محسن جیسے استادانِ مسلم الثبوت نے آپکی مشاقی اور خوش فکری کی داد دی ہے۔ آپ کا بیان ہے کہ مرزا غالب مرحوم سے زمانِ قیام رامپور میں آپکو نسبتِ تلمذ حاصل ہوئی تھی، نہایت پُر گو اور مشاق سخنور ہیں اور اس صنف شعر گوئی میں صدہا باذاق شاعر آپ سے فیضیاب ہیں، پچاس ساٹھ جزو کے دو دیوان اور متعدد و مختلف نظمیں آپکی تصنیف سے موجود ہیں جب حج کو گئے تو قصیدہ کے صلہ میں حاکم مکہ خالد پاشا نے آپ کو حسان الہند کا خطاب دیا تھا۔ آپکی عمر ۶۶ سال کی ہے آپکا کلیات موسوم بہ "تصویر خوبی" چھپ گیا ہے، بہار احمد آبادی آپکے تلامذہ میں نامور ہیں ۔

شب کو یاد آتا ہے جب وہ مہِ انور اپنا	چاندنی میں میں بچھا لیتا ہوں بستر اپنا
لیگیا کون اِسے آئینہ سمجھکر اپنا	آج پہلو میں نہیں ہے دلِ مضطر اپنا
حسرتِ دید میں ہم پھرتے ہیں آنکھوں کیطرح	دو نگاہوں کا الٹ پھیر ہے چکر اپنا

اگر ہو جائے شیوہ ترکِ لذاتِ جہاں تیرا	نہ چھوڑے زندگی بھر ساتھ عیشِ جاوداں تیرا

آپ بوسے دیئے گئے ہوتے	ایک دن سب حساب ہو جاتا
شمع پروانہ بن کے اُڑ جاتی	تو اگر بے نقاب ہو جاتا

زلف کو میں نے چھوا ہو تو مجھے سانپ ڈسیں	خود بخود تم ہوئے جاتے ہو مرے سر کیونکر
اُنکی تصویر سے بھی میری تسلّی نہ ہوئی	اب میں بہلاؤں تجھے اے دلِ مضطر کیونکر

جائے بل ابروئے پرخم سے نکلکر کیونکر
تیغ سے ہوگا جدا تیغ کا جوہر کیونکر

خواب میں دیکھتا ہوں چاند سے رخسار کا رنگ
خوب چمکا ہے مرے طالعِ بیدار کا رنگ

آنکھ سے چہرہ سے باتوں سے عیاں ہوتا ہے
چھپ نہیں سکتا ہے ساقی کبھی میخوار کا رنگ

بیگناہوں کے لہو میں جو نہا کر نکلی
کسقدر شوخ ہے قاتل تری تلوار کا رنگ

ہجرِ جاناں میں نہیں پہلا سا رونا رضوان
اب گلابی ہے مرے دیدۂ خونبار کا رنگ

دِل ہے یا کوئی مرقع ہے پریزادوں کا
سینکڑوں بت سے مرے دل میں حسیں رہتے ہیں

ہو کوئی بات تو کچھ اُس کا تدارک کیجے
خود بخود وہ تو عبث چیں بجبیں رہتے ہیں

کب داغ یہ دل پر شبِ ہجراں میں لگے ہیں
نایاب کنول انجمنِ جاں میں لگے ہیں

کب داغِ محبت دِلِ حیراں میں لگے ہیں
آئینے جلوخانۂ جاناں میں لگے ہیں

مسند نشیں ہیں آگے مرے بوریا نشیں
کیا سربلندیاں ہیں مرے اِنکسار میں

آنسو ٹپک کے آنکھ سے افسوس تھم گئے
ابرِ بہار کھُل کے نہ برسا بہار میں

جا کے بیٹھا نہ کرے بُت تو مسلمانوں میں
تیری اُلفت خلل انداز ہے ایمانوں میں

ساقیا جلد پلا مے کہ بڑی دیر سے مست
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں میخانوں میں

عید کا دن ہے گلے ملکے چھُری پھیر بھی دو
جوشِ تکبیرِ شہادت کا ہے قربانوں میں

سبزۂ خط میں ہے اُنکے لبِ لعلیں کی نمود
پھول لالہ کا کھلا ہے یہ ہرے دہانوں میں

پردہ اُٹھتا ہے کسی کے رخِ نورانی سے
برق چمکے تو سہی شمس و قمر دیکھیں تو

ہیں مستحقِ رحمتِ حق اہلِ معصیت
ہر بے گنہ سے کہدو گنہگار بھی تو ہو

زلفیں ہٹیں تو وہ رخِ تاباں نظر پڑے
اِن بادلوں سے چاند نمودار بھی تو ہو

وہ معنی ہوں کہ مضمونِ فنا ہے زندگی میری
وہ مطلب ہوں کہ ہستی سے ہے بہتر نیستی میری

ابھی فرشِ زمیں پر تھا ابھی عرشِ بریں پر ہوں
کہاں سے لے اُڑی مجھکو کہاں تک بیخودی میری

ذقن ہے چاہ تِل ہے ڈول رسّی زلفِ پیچاں ہے
جو پانی کھینچ سکے تو کھینچ لے تشنہ لبی میری

سحر بیانِ داغ کہتی ہے جادو بیاں مجھے
خط میں لکھا امیر نے ہے نکتہ داں مجھے

دانا ہوں وہ نہ پہنچے گا کچھ بھی زیاں مجھے
چکّی بھی بن کے پیسیں جو ہفت آسماں مجھے

سب مے لٹا دوں ساقیٔ کوثر کے نام پر
ساقی بنائے اپنا جو پیرِ مغاں مجھے

سب بہاریں باغ کی دم میں فنا ہو جائینگی
جب ہوا باندھیں گی آہیں بلبلِ ناشاد کی

ایکدن بھی تجھکو رحم آیا نہ اے صیّاد حیف
گو اسیرانِ قفس نے مدتوں فریاد کی

تکلیف روا رکھو نہ پر کاہ کسیکی
ہاں تیغے نہ چھوائے کہیں آہ کسیکی

پلکیں جو نظر پڑ گئیں ناگاہ کسیکی
برماتی ہوئی دل کو چلی آہ کسیکی

نوکر بھی مجھے رکھکے نہ بوسے دیئے تمنے
ہے بند کئی ماہ سے تنخواہ کسیکی

عشاق کو اتنا نہ ستا اے بتِ ظالم
فریاد نہ سن لے کہیں اللہ کسیکی

چہرہ سے آپ پردہ جو سرکا کے رہگئے
حامل تڑپ کے عرشِ معلّی کے رہگئے

کھل گیا زخمِ جگر پھر کھل گیا
بخیہ گر بخیہ پہ بخیہ چاہئیے

بوتل مئے مضموں کی جسوقت بھری نکلی
مستانِ معانی میں غل تھا کہ پری نکلی

جب خنجرِ غم کھا کر آہِ سحری نکلی
زخموں میں لدی نکلی داغوں میں بھری نکلی

پروانوں نے جب چھیڑا اُس رخ پہ فدا ہوکر
روتی ہوئی محفل سے شمعِ سحری نکلی

جنت میں جو گانے کو رضواں کی غزل لائیں
غلماں میں پڑا یہ غل حوروں میں پری نکلی

رضی

رضیؔ ۔ سیف الدولہ سید رضی خان بہادر صلابت جنگ امیر دربار اکبر شاہ ثانی۔ ذوق مرحوم کے والد انکی سرکار میں ملازم تھے، سرکار کمپنی بہادر کی طرف سے دربار شاہی میں وکیل تھے اور ایکہزار روپیہ ماہوار مشاہرہ پاتے تھے سنہ ۱۲۵ھ میں انتقال کیا شعر و سخن سے بھی مانوس تھے یہ انکا کلام ہے ۔

مرے قتل کرنے میں وہ فائدے ہیں
میرا کام ہوگا ترا نام ہوگا

سوئے پلنگ پر واں وہ تو خوشی کی دھن میں
یاں ہمنے رات کاٹی ساری کڑھن جلن میں

بن عشق آدمی کی ذرا شان ہی نہیں
جسکو نہووے عشق وہ انسان ہی نہیں

دیکھ ٹک شمع کو عاشق کے ستانیوالے	اس طرح جلتے ہیں اوروں کو جلانیوالے
رضی سے صنم کیوں برا مانتا ہے	یہ تیرا ہے بندہ خدا جانتا ہے

رضی

رضی - قاضی محمد حسین رضی مرحوم باشندہ نارنول علاقہ ریاست پٹیالہ، آپ نظامت شیخاواٹی جے پور کے قصبہ سنگھانہ میں شعبان ۱۲۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور ایام شباب میں مولانا سلیم الدین صاحب تسلیم نارنولی سے جو بڑے مشہور شاعر اور ادیب گذرے ہیں اصلاح لینی شروع کی، انکے انتقال کے بعد کچھ روز انکے بھائی مولوی سلطان الدین مبین سے بھی مشورہ لیتے رہے محرم ۱۳۲۴ھ میں ۶۲ برس کی عمر پاکر انتقال کیا، کامل بیالیس برس ریاست جیپور میں مختلف خدمات پر مامور رہے آخر عمر میں محکمہ اپیل میں اہلمد خزانہ تھے، بہت پرگو اور زود فکر شاعر تھے۔ دو تین گھنٹہ مشق سخن التزام کے ساتھ مدۃ العمر کرتے رہے، نعت اور سلام کہنے کا آخر عمر میں زیادہ شوق ہو گیا تھا۔ ایک عاشقانہ اور نعتیہ دیوان اور ایک مجموعۂ سلام اور چند مثنویاں انکے بیٹے قاضی ممتاز حسین مدرس جیپور چاندپول سکول کے پاس انکی تالیف سے موجود ہیں، مولانا حسرت موہانی نے ایک انتخاب سلام ہار ابھی حال میں بطور ضمیمہ اردوئے معلیٰ شائع کر دیا ہے اُس میں سے بھی چند شعر درج کئے جاتے ہیں، انکی شیریں زبانی اور خوش کلامی اور چستی ترکیب و بندش ہر شعر سے ظاہر ہے۔ عاشقانہ اور نعتیہ دونوں طرح کا کلام ملاحظہ ہو۔

از سلام

نہ سمجھی کوفیوں نے ہائے کچھ تقریر اُس شہ کی	جو تفسیر و مفسر تھا کتاب آسمانی کا
کیا ہی بند کیوں آل عبا پر آب و دانہ کو	یہ کیا برتاؤ ہے ای میزبانو میزبانی کا
اب و جد جسکے ہوں مختار و مالک حوض کوثر کے	ملے اُسکو نہ مرتے دم تلک قطرہ بھی پانی کا
زہرا کا دل دکھے کہ رسالت مآب کا	زندہ رہے مگر نہ پسر بوتراب کا
بکھرے ہوئے ہیں کان رسالت کے سب گہر	کیوں طشت زر بنے نہ بیابان کربلا
آباد یہ ہوا ہے اُجڑ کر نبی کا گھر	اللہ رے نصیب بیابان کربلا

گردوں کو رشک ہی تو بجا ہی عجب نہیں — پُر ہے نجوم عرش سے دامانِ کربلا
سینچا ہے باغباں نے شہیدوں کے خون سے — اللہ رے بہارِ گلستانِ کربلا
مٹ گیا جب ہر جوانِ آلِ محمد کا نشان — تب ہوا روشن رضی نام و نشانِ کربلا

عاشقانہ

میں ہوں آشفتہ بیاں میری زباں ہے نہ سہی — زلف سے پوچھ لیں حال اپنے پریشانوں کا
جس طرح فرض ہے مومن پہ طوافِ کعبہ — یوں ہی عشاق پہ ہے طوافِ صنم خانوں کا
اک جگہ کا نہیں پابند جو ڈھونڈے سے ملے — تیرا وحشی تو بگولہ ہے بیابانوں کا
صبحدم کچھ بھی نہ تھا بزم میں جز شمع خموش — ہاں مگر ڈھیر تھا ایک سوختہ پروانوں کا
حسرت سے کی نظر سوئے گردوں امام نے — اصغر کو گود میں ہدفِ تیر دیکھ کر

بتوں نے اک حرم دیگر خدا کو — عجم سے لے لیا ہندوستاں تک
شبِ غم ہمدمو وہ ذکر چھیڑو — سحر ہو جائے ختم داستاں تک
ہیں اُنکے ساتھ ہوں ہمرنگ سایہ — وہ مجھ سے دور بھاگیں گے کہاں تک

سلام [illegible]

شہ پڑھتے تھے رجز کہ امامِ زماں ہیں ہم — مقبولِ بارگاہ خدائے جہاں ہیں ہم
ایمان و کفر کا ساہے ہم تم میں تفرقہ — ایذا رساں جو تم ہو تو راحت رساں ہیں ہم
تم سر بسر ہو آتشِ دوزخ کے سوختہ — صحنِ ریاضِ خلد کے سروِ رواں ہیں ہم
شبیر صبر و شکر میں یکتا ہیں فرد ہیں — حضرت کا ایک دل ہے مگر لاکھ درد ہیں
شور تھا فوجِ عدو میں جاں نثارِ حسین — تیر سے ڈرتے نہیں آب دمِ شمشیر ہیں

شبیر اور بیعتِ فاسق غلط غلط — ممکن نہیں کہ نور سما جائے نار میں
مجبور ہوں مشیتِ پروردگار سے — دونوں جہاں ہیں ورنہ مرے اختیار میں

رضی رخصت نہ تھی اہلِ حرم کو آہ و زاری کی — جو روئیں بھی تو روئیں بیبیاں آہستہ آہستہ
ہوا جب قتل سب لشکر تو شہ کو جانبِ مقتل — اجل لیکر چلی دامن کشاں آہستہ آہستہ

حریصِ حکومت نہیں ابنِ حیدر — حسن کر چکے ترک حبِ حکمرانی

سلام اُس پہ جو سبطِ مصطفیٰ ہے ابنِ حیدر ہے — شکیبِ جانِ زہرا قوتِ بازوئے شبر ہے
کہیں نیزوں کے پھل ہیں اور کہیں آبِ دمِ خنجر — اِسی کا نام کیا حامیٔ آلِ پیمبر ہے

مسلماں ستاتے ہیں آلِ نبی کو — یہ حقِ رسالت ادا ہو رہا ہے
یہ کیا سرِّ قدرت ہے یا وصفِ ذات — امام آج بے دست و پا ہو رہا ہے
فلک ٹوٹ پڑتا نہیں کیوں زمیں پر — سرِ شاہ تن سے جدا ہو رہا ہے

اے مجرئی شبیر سے بڑھکر کوئی کیا دے — ممکن نہیں نشان بھرے گھر کو لٹا دے
ٹھانی تھی کہ دے نہر کو اعدا سے سو لے لی — اللہ رے عباسِ دلاور کے ارادے

اب کوئی دم میں فراقِ جسم و جاں ہونیکو ہے — شاہ کا حق سے وصالِ جاوداں ہونیکو ہے
دفن ہونیکو ہیں مقتل میں ستارے عرش کے — اب زمینِ کربلا بھی آسماں ہونیکو ہے
خشک ہوجائے فراتِ کوفہ کیا بہتا ہے تو — شہ کے سوکھے حلق پر خنجر رواں ہونیکو ہے

عاشقانہ

رخِ زیبا ترا دلکش قدِ رعنا تیرا دلجو — بایں خوبی تری نا آشنایانہ ادا کیوں ہے

بے گناہی نے ہماری بھی وہ بدلے تیور — ایک تلوار بھی قاتل سے لگائی نہ گئی
اُنکے آنے کی دمِ نزع مرے یاروں سے — کوئی جھوٹی سی خبر بھی تو اڑائی نہ گئی
بن گیا میرے مقدر سے رگِ گل ہر خار — دشت میں بھی خلشِ آبلہ پائی نہ گئی
وہ بات کہہ رہے ہو کہ جس کا نہ سر نہ پاؤں — کسکی زبان شکوہ طرازِ جفا ہوئی
تدبیرِ چارہ گر نہ ہوئی کوئی کارگر — آخر مریضِ عشق کو مرکر شفا ہوئی
ایکدن بھی تو نہ نکلی حسرتِ عیش و نشاط — رفتہ رفتہ صرفِ غم ساری جوانی ہوگئی
اب تو خوش ہو چل مجھے دل اور جگر دونوں سے — لے ترے مطلب کی اے سوزِ نہانی ہوگئی
خیر تمنائے اجل اب نہیں خواہش کوئی — جب سے امیدِ شفائے دلِ بیمار گئی
کیا برا ہے اثرِ مشقِ تغافل دیکھا — آپ بدنام ہوئے جانِ طلبگار گئی
سہتا ہوں اس غرض سے ستم ہائے ناروا — اُس بیوفا کے گھر میں بنانا ہے گھر مجھے

دل میں مرے رہے کہ جگر میں کہیں رہے
جز شوق کسکو ساتھ رکھوں راہِ عشق میں
یہ کسکی چشمِ مست کی گردش کا ہے اثر
ناطاقتی میں بارِ گراں تھا ہمیں سو ہم
قیامت اوّلِ شامِ بلا ہے
نہیں چھپتا چھپائے رنگِ وحشت

جاں سے عزیز تر ہے وہ تیر نظر مجھے
ایسا کہاں ملیگا کوئی ہمسفر مجھے
تقویٰ پرست میکش و مینوش ہوگئے
سر نذر یار کرکے سبکدوش ہوگئے
شبِ غم کی سحر لاؤں کہاں سے
ٹپک جاتا ہے اندازِ بیاں سے

رضی

رضی - سید غلام شبیر صاحب الہ آبادی منصرم توشہ خانہ رامپور (۱۸۸۱ء) شاگرد رشید جناب شیخ مہدی علیخاں ذکی مرحوم، بقول گلکدۂ ریاض مراد آباد وطن تھا، انکی ایک غزل جو درج ذیل ہے بہت مشہور ہے اور اکثر جگہ گائی بھی جاتی ہے اپنی خوش فکری اور شیریں کلامی کی بدولت ہمعصروں میں ممتاز تھے، اب غالباً خانہ نشین ہیں۔

شور پیدا کیا خموشی نے
کٹ گئی ہائے رات باتوں میں

ضبط بھی اختیار کا نہ رہا
وقت اظہارِ مدعا نہ رہا

جب خدنگِ نازہی دل میں نہ میرے رہ سکا
لے نگاہِ شوق آخر کب تلک یہ حسرتیں
یاد میں یارانِ ہم مشرب کی آنسو گر پڑے
مرنے کے دن میں مُرلیوں پہ ہیں وہ آہ ہوئے
جو پاس بھی مرے بیٹھے تو کسمسائے ہوئے
کسی کا ہائے وہ راتوں کو چھپ کے یوں آنا
نگاہِ ناز سے بیساختہ نہ دیکھا کر
ہیں ایک ہم کہ ترستے ہیں اُنکی صورت کو
رضی شباب جو کھو یا گیا ہے پیری میں

تیغ کیا ٹھیرے گی مجھ سینہ سپر کے سامنے
لا گلِ حسنِ صنم دامن میں بھر کے سامنے
ساقیِٔ گلرو جو لایا جام بھر کے سامنے
اُڑائے پھرتا ہے جوبن پری بنائے ہوئے
بدن چُرائے ہوئے اور کچھ چھپائے ہوئے
چھرے چڑھائے ہوئے پائنچے اُٹھائے ہوئے
انھیں اداؤں کے ظالم ہیں ہم ستائے ہوئے
ہیں ایک وہ کہ گلے ہیں انھیں لگائے ہوئے
ہم اسکو ڈھونڈتے پھرتے ہیں سر جھکائے ہوئے

رضی

رضیؔ - ڈاکٹر زیرک حسین باشندۂ امروہہ خلف و شاگرد ناطق الملک مؤمن حسین صفیؔ کئی سال ہوئے بھٹنڈہ میں افسر شفاخانہ تھے اُنکے والد جناب صفیؔ بڑے مشاق اور زود فکر شاعر تھے اوائل عمر میں اکثر آگرہ میں قیام رہا۔ ذہین اور طبیعت دار شخص ہیں کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو

غش کسکو آیا کون جلا کوہ طور سے
موسیٰ کہو تو کچھ سرِ کہسار کیا ہوا

دولت جو ہاتھ آئے تو دل بھی کھُلا رہے
مٹھی رہی جو بند تو زردار کیا ہوا

واعظ خدا کو بھی تو میں بھولا ہوا نہیں
بُت یاد ہیں اگر تو گنہگار کیا ہوا

یوسف کو میرے لئے نہ لیا دیکے نقدِ دل
آئے جو غیر بن کے خریدار کیا ہوا

اِسی لئے مری شمعِ حیات گُل کی تھی
کبھی چراغ بھی روشن مزار پر نہ کیا

صفیں لٹ گئیں گردش سے چشم کی ساقی
نگاہِ مست نے کس کس کو بے خبر نہ کیا

جسنے تلوا بھی ترا اے مہِ تاباں دیکھا
چاہ سے پھر نہ رُخِ یوسفِ کنعاں دیکھا

فتنہ بیدار ہوا کیجئے موقوف خرام
آپ کی چال نہیں حشر کا ساماں دیکھا

کہتے ہیں خیر ہو یارب سرِ سودائی کی
خواب میں گیسوئے مشکوں کو پریشاں دیکھا

بیخودی شرط ہے جب تو اُنھیں پائے کوئی
آپ آئینہ اگر آپ سے جائے کوئی

توبہ کرلی ہے تو کیا توڑ نہیں سکتے ہم
اب بھی پی جائیں خوشی سے جو پلائے کوئی

دیتی ہے عاشق و معشوق کی رنجش بھی مزا
کوئی رُوٹھا ہوا بیٹھا ہو منائے کوئی

اپنے دل پر وہ ذرا ہاتھ تو رکھکر دیکھے
اے رضیؔ دل جو دُکھاتا ہے پرائے کوئی

یہ جورِ باغباں دیکھو کہ جس پر آشیانہ تھا
وہی ڈالی مرا دل توڑنے کو توڑ ڈالی ہے

رضی

رضیؔ - سید رضی حیدر رضیؔ - دور موجودہ کے کہنے والے ہیں ایک غزل کے چند شعر رسالۂ مخزن سے درج کیئے جاتے ہیں۔

زیبا ہے رُخِ یار پہ دامن حجاب کا
گویا ہے آفتاب پہ دامن سحاب کا

مستانہ چشم جوشِ جوانی دکھا گئی
نشہ چھپا نہ بادۂ حسنِ شباب کا

رہنے نہ دینگی شوخیاں اُنکی نگاہ کی
حیراں ہوں مجھ سے کیوں وہ خفا ہوگئے رضی

آنکھوں میں اب گذر نہیں ممکن حجاب کا
غصہ کی کوئی وجہ نہ باعث عتاب کا

رعایت

رعایت - سید رعایت علی رعایت لکھنوی خلف امانت علی امانت لکھنوی و برادر حضرت فصاحت لکھنوی، عرصہ ہوا انتقال کر گئے۔

باندھی ہے کیا ہمارے دلِ سرد نے ہوا
گردوں پہ دل فرشتوں کے لہرائے جاتے ہیں

بوسہ ہنوز مصحفِ رُخ کا نہیں لیا
قرآن کی وہ جھوٹی قسم کھائے جاتے ہیں

بنتی ہیں بیڑیاں ترے دیوانے کے لئے
حدّاد ڈھونڈ ڈھونڈ کے بلوائے جاتے ہیں

یارب کمر بتوں کی بچانا دمِ خرام
ہر ہر قدم پہ ناز سے بل کھائے جاتے ہیں

رعب

رعب شیخ حکیم محمد حنیف علی رعب قریشی انصاری باشندۂ شاہ آباد آپکی کنیت ابوالصواب ہے حضرت جلال لکھنوی مرحوم سے فیض سخن پہنچا ہے، چند غزلوں کا انتخاب درج تذکرہ کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ ہر طرح کے مضامین نظم کرتے ہیں فی الجملہ مہارت ہے ؎

حل ہوا صبح قیامت سے یہ عقدہ ورنہ
کسکو باور تھا شبِ غم کا سحر ہو جانا

جگر اُٹھے کہ ترے کوچہ میں گذریں ہر روز
یاد ہمکو تو ہے اکدن وہ گذر ہو جانا

سُنتے ہیں کعبہ کی تعریف تو یاد آتا ہے
وہ صنم خانہ سے اللہ کا گھر ہو جانا

کسکے جلوے کا ہوں یارب محو دید
کس کا آئینہ ہے حیرانی مری

جو دل لگاتے ہیں دیتے ہیں جان آخر کار
اس ابتدا کی یہی انتہا نکلتی ہے

یہ کہہ رہی ہے تری چشم شوخ خلوت میں
کہ آنیوالی ہے شوخی حیا نکلتی ہے

نشاں اثر کا سر عرش تک نہیں چلتا
جو ڈھونڈ ئیے تو ہماری دعا نکلتی ہے

وہ ٹل بھی جائے یہ جاتی ہے جان ہی لیکر
قضا سے بڑھکے کسی کی ادا نکلتی ہے

جزو جزوِ تن نمونہ اضطرابِ دل کا ہے
شوق میرا حوصلہ گویا لبِ قاتل کا ہے

لذتِ ایذا سے ہی کیا کیا خجل پاسِ ادب
لیجئے قاتل کو شکوہ شوخیِ بسمل کا ہے

شوخیاں بیتاب ہیں اک جلوۂ مستور کی	ٹوٹنا بہتر طلسمِ ہستیٔ باطل کا ہے
خلش نے اسکی ربطِ اتنا بڑھایا اے تغافل خو	کہ دلکو عشق ہے اب تجھ سے بڑھکر تیرے پیکاں سے
سخنور سیکھ لیں اوبت سخن گوئی سخندانی	تری چشمِ سخنگو سے مری طبعِ سخنداں سے
ترا اقرار بھی رکھتا ہے اک انکار کا پہلو	نہیں سے ہے جو کچھ مطلب ہی مقصود ہے ہاں سے
نمازِ عیدِ قربان۔ رُخ بسوئے کعبۂ ابرو	وضوئے طفلِ دل کر پہلے آبِ چشمِ گریاں سے
سوالِ بوسہ اے رعب اور وہ بھی یوں سرِ محفل	نکلوائیگی اک دن ناصبوری بزمِ جاناں سے

رعب

رعب منشی محمد علیخان خلف قلندر بخش خان مرحوم ساکن حیدرآباد دکن، آپ کو میرزا ضیا دہلوی گورگانی سے تلمذ حاصل ہے۔ یہ کلام کا نمونہ ہے۔

مستحقِ رحمتِ حق کا تُو نہیں اے زاہد	ایک دھبہ بھی تو مے کا ترے دامن پہ نہیں
حسرتیں خواب ہوئیں ہو گئے ارمان خیال	آس کیا یاس بھی انکو دلِ ویراں میں نہیں
حور و غلماں میں ہیں جو وصف وہ سب تجھ میں ہیں	تجھ میں جو بات ہے وہ حوروں میں غلماں میں نہیں
میری وحشت کے لیئے چاہیئے وسعت ایسی	کہیں دنیا میں نہیں حشر کے میداں میں نہیں

رعد

رعد منشی محمد عابد علی بلگرامی مدرس دوم مدرسہ حیدر گڈھ اودھ سنہ ۱۸۷۴ء منشی غلام حسین قدر بلگرامی کے تلامذہ میں سے تھے۔

جس کا دل چاہیں پھنسا لیویں انھیں فن ہے یاد	جانتے سارے زمانے کے ہیں منتر گیسو
جو بھی حال رہا اِنکے اُسی کچے پن کا	دل کو لیجائیں گے یہ صاف اُڑا کر گیسو
روز و شب ایک جگہ جسنے نہ دیکھے ہوں کبھی	دیکھئے جاکے وہ اب رُخ کے برابر گیسو
صحبتِ یار میں تعظیم و ادب سیکھ گئے	سر سے کھلتے ہیں تو گرتے ہیں قدم پر گیسو

رعد

رعد منشی حب لال صاحب نام، رعد تخلص، قوم سے کایستھ سریواستو ہیں اصل وطن تو موضع ہنڈیا ضلع الہ آباد ہے مگر چونکہ آپکے والد منشی گنیش پرشاد زمیندار نے انکو صرف چار برس کا چھوڑکر انتقال کیا اس لیئے منشی مادھو پرشاد انکے چچا اور رائے بہادر منشی اندی پرشاد

ممبر کونسل گوالیار نے جو پھوپا تھے انھیں اپنے کنارِ شفقت میں لیا اور پرورش و تربیت کرتے رہے اس لیئے تعلیم کا زمانہ زیادہ تر فتح پور ہسوہ میں گذرا ۱۸۹۵ء میں امتحان وکالت پاس کر کے بھنڈ میں وکالت شروع کی۔ اب تقریباً ۳۰ برس کی عمر ہے اور ریاست گوالیار کی طرف سے خاص بھنڈ میں ۱۹۰۸ء سے آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ ضروری تعلیم سے فارغ ہیں شعر و سخن کا مذاق سلیم ہے، طبیعت میں جدت پسندی اور بندش شعر میں صفائی ہے اگرچہ کثرتِ مشاغل زیادہ گوئی کے مانع ہیں مگر جو کچھ کہتے ہیں بہت سلجھا اور عیوب سے پاک ہوتا ہے، اگر حضرت داغ کی زندگی وفا کرتی تو بلاشک انھیں ترقی کے وسائل زیادہ میسر ہوتے تاہم انکی صفائی زبان، مہارت روزمرہ، اور رسائی فکر، نفاست و چستی بندش قابل ستایش ہیں ۱۹۰۲ء میں حضرت داغ سے تلمذ اختیار کیا۔ اُنکے انتقال کے بعد منشی حیات بخش رسا سے مشورہ کرنا شروع کیا، دیوان تقریباً ردیف الف تک مکمل و زیر ترتیب ہے۔ انتخاب کلام نذر ناظرین ہے۔

مزہ تھا زندگی کا گر مسرت سے جئے ہوتے	یہ کیا جینا ہے مر مر کے جئے جب نیمجاں ہو کر
مژہ نے اور نگاہِ ناز نے دل پر ستم ڈھایا	وہ خنجر بنکے چلتی ہے وہ چبھتی ہے سناں ہو کر
بلا کی دلفریبی ہے نگاہِ ناز میں انکی	اشارہ پاتے ہی دل چل دیا کیا شادماں ہو کر
یہ کیا معلوم تھا حسرت نہ نکلے گی نہ نکلے گی	یہ سمجھے تھے کہ دل میں آئی ہے یہ میہماں ہو کر
مرے جاتے ہو کیوں اے رعد آتا ہے وہ دن بھی	کہ انکو تم لگاؤ گے گلے سے شادماں ہو کر

پھر ہے یہ کہنا کہ نہیں ہم سا کہیں اور	لو دیکھ لو ہے دل میں تمہارا سا حسیں اور
دل پھیر دے لیکر یہ کرے کوئی یقیں اور	چالیں نگہ ناز کرے جا کے کہیں اور
رکھتے ہیں دل و جاں تجھے دل و جاں کے وہ جاناں	یہ کہتے ہیں وہ اِنکے اگر ہیں تو ہیں اور
تم چیز ہی کچھ اور ہو اک حسن پہ کیا ہے	ایسے تو زمانہ میں ہزاروں ہیں حسیں اور
بن ٹھن کے وہ بگڑے ہیں نئی ضد کوئی دیکھے	مچلے ہیں کہ آئینہ میں ہے ہم سا حسیں اور
جلوہ ترا کچھ ناز نہیں دل میں جو چھپ جائے	تو رہ گئے یہاں کھل گیا اے پردہ نشیں اور

جلوہ رخِ انور کا دکھا دو دمِ آخر
کچھ دیر کی مہمان ہے یہ جانِ حزیں اور

حسرت ہی مرے سامنے بیٹھی ہیں کچھ دیر
ارمان دمِ نزع سوا اسکے نہیں اور

دیوانہ کے منہ حضرتِ ناصح نہ لگیں آپ
کیا فائدہ دو چار اگر اُٹھتے کہیں اور

وہ شکر کو سمجھے ہیں گلہ وائے مقدر
میں نے تو کہا اور ہُوا ذہن نشیں اور

دلبر کی جگہ درد رہا کرتا ہے دل میں
گھر اور کا تھا ہائے ہوا اُسمیں مکیں اور

کھا کھا کے قسم وصل کا اقرار کرو لاکھ
اندازِ سخن مجکو دلاتا ہے یقیں اور

کیا بات ہے اُس کوچۂ دلدار کی اے رعد
ہے آب ہوا اور وہاں کی ہے زمیں اور

چاہنے والے کو اپنے تم بھی چاہو کوئی ہو
قدر کے قابل ہے جو دل سے فدا ہو کوئی ہو

میں وہ بیخود ہوں نہیں مجکو کسی سے واسطہ
دوست دشمن آشنا نا آشنا ہو کوئی ہو

وائے تنہائی یہ حسرت ہے کہ آجائے کوئی
وہ نہیں تو کوئی آفت ہو بلا ہو کوئی ہو

بحث کچھ اپنے پرائے سے نہیں اے ہمنشیں
کام آئے وقت پر درد آشنا ہو کوئی ہو

دل جب اپنا ہی نہیں تو کوئی لیجائے اسے
ناز ہو، چتون ہو، شوخی ہو ادا ہو کوئی ہو

منہ میں بھر آتا ہے پانی جامِ مے کو دیکھکر
شیخ ہو یا متقی ہو۔ پارسا ہو کوئی ہو

یوں ہی رہا جو ربط ترے سنگِ در کے ساتھ
مٹ جائیگا نوشتۂ تقدیر سر کے ساتھ

دل تھام کر میں بیٹھ گیا اُسکی بزم میں
دیکھا تھا اُسنے ہائے مجھے کس نظر کے ساتھ

ویران کردیا مرے دل کو مٹا دیا
یوں دشمنی کرے نہ کوئی اپنے گھر کے ساتھ

اُٹھتے ہی خوابِ ناز سے وہ آگئے میرے گھر
لپٹا ہوا اثر تھا دعائے سحر کے ساتھ

دل لے گیا جہاں نہ گذر تھا خیال کا
پہنچے ہیں ہم کہاں سے کہاں راہبر کے ساتھ

دل میں رکاوٹیں ہیں تو ظاہر میں اختلاط
ایک ایک عیب اُنکا ہے سو سو ہنر کے ساتھ

اے رعد بھولتا نہیں مجکو دمِ سحر
پھر پھر کے اُنکا دیکھنا وہ چشمِ تر کے ساتھ

بڑھ گئی جب خوب حیرانی میری
مٹ گئی ساری پریشانی مری

جلوۂ جاناں کی دکھی ہے جھلک — یہ پتہ دیتی ہے حیرانی مری
ڈھونڈتی ہے اُسکے رازِ کُنہ کو — کسقدر رہے عقل دیوانی مری
ناصحا مجکو خدا پر چھوڑ دے — تُو مجھے کرنے دے من مانی مری
کیا سوالِ وصل پر اُمید ہو — بات تم نے کونسی مانی مری
یا نکالو دل کو پہلو سے مرے — یا مٹا دو یہ پریشانی مری
یہ نہ تھا معلوم ہے وہ بے وفا — دیدیا دل وائے نادانی مری

آپ سے جب آشنائی ہوگئی — دین و دنیا سے رہائی ہوگئی
کون میری سی کہے گا حشر میں — اُس طرف ساری خدائی ہوگئی
آئینہ سے چار آنکھیں جب ہوئیں — اُنکی آپس میں لڑائی ہوگئی
جب عنایت کی نظر اُنکی ہوئی — مہرباں مجھپر خدائی ہوگئی
ظلم اتنا کیوں کیا جو روزِ حشر — مدعی ساری خدائی ہوگئی
مجھسے کیا مشکلیں مری دشوار یاں — غیب سے مشکل کشائی ہوگئی
اُنکو اب پردہ دری کا ہے خیال — کیوں مرے دل میں صفائی ہوگئی
آگئیں اُن میں لگاوٹ بازیاں — چتونوں میں دلربائی ہوگئی
رعد سے بولے وہ ہنسکر وصل میں — تیری ظاہر پارسائی ہوگئی

نہ پوچھیں میرے ہمدم کیفیت میری مصیبت کی — شبِ غم کی گھڑی ایک ایک گذری ہے قیامت کی
الٰہی خیر کرنا آج پھر لی دل نے وحشت کی — نگاہِ شوق نے کسکی خدا جانے عنایت کی
بہت پچھتائے ہم اُس فتنہ گر سے کیوں محبت کی — یہ کیا بیٹھے بٹھائے جان پر برپا قیامت کی
ترا وہ دیکھ لینا شرمگیں چتوں سے ڈرکر — مرے دلمیں تڑپ ہو ہو کے رہجانا قیامت کی
نگاہِ ناز نے چپکے سے آکر دل میں چٹکی لی — تمھاری آنکھ نے پھر دیکھ لو مجھ سے شرارت کی
دل آیا بھی تو کس ظالم پہ اپنا ہائے دل آیا — محبت بھی جو کی تو کس ستمگر سے محبت کی

نظر آئینہ رو پر پڑتے ہی وہ بے خودی چھائی
سراپا محو ہو کر بن گیا تصویر حسرت کی

دل آیا بھی تو کس ظالم پہ اپنا ہائے دل آیا
محبت بھی جو کی تو کس ستمگر سے محبت کی

کرم اسکا ستم سے بڑھ کے دشمن جان کا نکلا
مجھے رہ رہ کے تڑپاتی ہیں باتیں وہ محبت کی

چھپایا تو بہت تھا رعد نے راز محبت کو
نہیں چھپتی نہیں چھپتی نظر لیکن محبت کی

جو باہر میان سے قاتل تری شمشیر ہو جاتی
قضا دانتوں میں انگلی داب کر تصویر ہو جاتی

کچھ ایسی چارہ گر میرے لیئے تدبیر ہو جاتی
کسیکی خاکپا ملتے تو وہ اکسیر ہو جاتی

کیا کیا جائے لب تک آکے تو تھم تھم گیا ورنہ
فلک تک دھوم تیری نالۂ شبگیر ہو جاتی

ٹھنے رہتے تمھیں ہوتے تمھیں کس سے حیا آتی
تمھیں تو دیکھ کر سب انجمن تصویر ہو جاتی

اثر اتنا تو ہوتا آہ میں اے داور محشر
لپٹکر حشر میں اس بت کی دامنگیر ہو جاتی

بھلے کو حضرت ناصح نہ آئے سامنے میرے
ضرور انکی مری باہم دم تقریر ہو جاتی

ہم اٹھتے بھی تو کیا اٹھتے ترے کوچے سے اے ظالم
ہماری ناتوانی پاؤں کی زنجیر ہو جاتی

ہمیں ہم تھے اگر تم دیکھ لیتے ناز سے ہمکو
گھڑی بھر میں ہماری کیا سے کیا توقیر ہو جاتی

تجھے کیا اس سے نامہ بر وہانتک تو گیا ہوتا
اگر آئی گئی ہوتی مری تحریر ہو جاتی

وہ روٹھے آج کیوں ہیں کیوں نہیں ملتے منالیتے
مجھے معلوم بھی تو کچھ میری تقصیر ہو جاتی

پلٹنی تھی پلٹ جاتی جو پھرنی تھی تو پھر جاتی
طبیعت بھی کسیکی کیا مری تقدیر ہو جاتی

رعد

رعد مولوی محمد صدیق حسن خان جونپوری، رسالہ العصر سنہ ۱۳ء سے کلام نقل ہوا قدیم وجدید دونوں طرزوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں طبیعت میں درد اور زبان پر خاصی قدرت ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؛

سنا ہے مشورے یہ ہو رہے ہیں باغبانوں میں
لگا دو آگ اب کے بلبلوں کے آشیانوں میں

جناب شیخ فرمائینگے کچھ باتیں قیامت کی
کہو رندوں سے بیٹھیں انگلیاں دیکے کانوں میں

چارۂ درد محبت نہیں درکار مجھے
چھوڑ دیں حال پہ میرے مرے غمخوار مجھے

یاد آئے ہیں جو وہ ابروئے خمدار مجھے — آج ہر چیز نظر آتی ہے تلوار مجھے
میں دکھاتا ہوں جو اُنکو دلِ پُر داغ اپنا — وہ دکھاتے ہیں بہارِ گلِ خسار مجھے
دِل تو کیا چیز ہے میں جان بھی دیدوں تمکو — تم بتاؤ تو سہی اپنا خریدار مجھے
بُت پرستی میں ہوا مجکو یہ تبہ حاصِل — برہمن بھیجتے ہیں تحفۂ زنّار مجھے
اُسنے پوچھا جو مرا نام تو میں نے یہ کہا — لوگ کہتے ہیں محبت کا گنہگار مجھے
وہ دن اچھے تھے وہ اچھا تھا زمانہ ای رعد — جس زمانے میں نہ تھا عشق کا آزار مجھے

ناشنیدہ (۱) (فیشن)

اے حسر تو خدارا مجکو نہ اب سناؤ — لِلّٰہ اے اُمنگو دل میں مرے نہ آؤ
بہرِ خدا نہ چھیڑو بیوہ ہوں رحم کھاؤ — بس بس سنگار کی اب ترغیب مت دلاؤ
اُترا ہوا سا چہرہ کیا آرسی میں دیکھوں — مغموم شکل اپنی میں کس خوشی سے دیکھوں
ہمجولیوں میں جاتے آتی ہے شرم مجکو — ساتھ اُنکے گیت گاتے آتی ہے شرم مجکو
ہنسکر اُنھیں ہنساتے آتی ہے شرم مجکو — اب گُلکو گدگداتے آتی ہے شرم مجکو
کاشانۂ الم میں اِک گوشہ گیر ہوں میں — کُنجِ قفس میں گویا مرغِ اسیر ہوں میں

رعد

رعد۔ حکیم میر نادر علی رعد مقیمِ حیدرآباد دکن نبیرۂ حضرت شہید دہلوی مرحوم۔ شاہ نصیر کا دیوان انھوں نے چھپوا دیا ہے اور فنِ تاریخ میں کتاب موسوم بہ گنجینۂ خیال خوب لکھی ہے

پیشِ نظر ہے چہرہ جو اُس بے نقاب کا — اے بخت جانتا ہوں کہ عالم ہے خواب کا
ایسا نہ ہو کہ دُور رہو یہ تشنۂ ازل — ساقی پلا دے پھر کوئی ساغر شراب کا

رعنا

رعنا۔ سید محمد حمید الدین باشندۂ رائے بریلی و سررشتہ دار نظامت حال صدر ریاست ٹونک، بیس برس ہوئے جس زمانہ میں حضرت ظہیر دکن نہیں گئے تھے اور ابھی ٹونک میں ملازم تھے آپنے اُن سے اصلاح لینی شروع کی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

دعویِ ضبطِ محبت تھا تو کیوں فریاد کی — اے دلِ بیتاب سب محنت مری برباد کی
چارہ گر رگ رگ میں ہے یاں کاوشِ خارِ الم — کس کا درماں کیا ضرورت نشترِ فصاد کی

کونسا رشکِ چمن زیب چمن ہے ان دنوں	گل کی شاکی بلبلیں ہیں قمریاں شمشاد کی

رعنا

رعنا منشی عاشق حسین صاحب لکھنوی، مشہور ناولسٹ اور ایک شوخ طبع سخنور تھے بہت سے ناولِ آپکی تصنیف سے شائع ہو چکے ہیں، عرصہ ہوا ایک رسالہ شعر و سخن موسوم بہ "گلدستہ رعنا" نکالا تھا جو دو برس بعد بند ہو گیا۔ کئی برس ہوئے انتقال کر گئے، اُن کا کلام یہ ہے۔

تھامے ہوئے کلیجے کو آئے ہوئے طلب	کیوں پھر کہو گے آہ میں تیری اثر نہیں
پہلو میں آکے بیٹھے تھے اتنا تو ہوش ہے	دل کب دے لیگئے مجھے مطلق خبر نہیں

رعنا

رعنا منشی عبدالغفار دہلوی تلمیذ حضرت حسین

بیوفا، نا آشنا، بیباک، بدخو، خود غرض	اور بھی کہہ لو مجھے جو کچھ تمہارے دل میں ہے
عشق کی چوٹیں ہیں کھائے ہوئے برسوں ہوئے	گو نہیں ہے درد وہ لیکن کسک کچھ دل میں ہے

ٹالا نہ تو نے غیر کا ظالم کہا کبھی	منظور ہو ہماری بھی تو التجا کبھی
یہ جان لو کہ ہاتھ اُٹھانے کی دیر ہے	خالی گئی نہ جائیگی اپنی دعا کبھی
جیتے رہے ہیں ہجر میں ہم اس امید پر	ایسا بھی کیا ہے آن ہی لینگے کہا کبھی
پھر اسکی "نہیں" کا لطف دکھا دینگے آپکو	سُن لی اگر خدا نے ہماری دعا کبھی

رعنا

رعنا سید محمد ہاشم رعنا دہلوی منصبدار حیدرآباد دکن جوان آدمی ہیں سنہ ۱۹۰۹ء میں آپنے آغا شاعر دہلوی سے تلمذ اختیار کیا، اسی زمانے کا یہ کلام ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اُستاد کی زبان اور رنگ کی تقلید میں اچھی دستگاہ حاصل کر لی تھی، غزل میں بعض بعض شعر تو نہایت اچھا اور بلند پایہ کا نکل آتا ہے۔ اب اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ بولیاں کھلی ہیں تری تیغ زنی ہیں	جوبن پہ ہیں سب خون کے دھبے کفنی ہیں
رہتا ہے سدا وصل میں بھی ہجر کا دھڑکا	کیا یار رہے جو ساتھ ہے بگڑی میں بنی ہیں
تیری دُہائیاں ہیں گئے ہم جہاں کہیں	ناقوس کی صدا کہیں بانگِ اذاں کہیں
قاصد سمجھیو اُسکا نہیں ہے مکاں کہیں	اُٹھکر زمین پاؤں پکڑلے جہاں کہیں

اِک چیز ہے کہ دل میں کھٹکتی ہے بار بار
محشر میں بھی تڑپتی ہیں نظروں کی بجلیاں

پس مردن انھیں مرقد پہ آہِ نارسا لائی
نوید وصل ہی لائی نہ پیغامِ قضا لائی

وہ سب بدمستیاں تھیں زر کی اب ہے نہ پیتے ہیں
بہکتے ہیں در و دیوار کیا خوشبو ہے پھولوں کی

اب اس سے بڑھ کے آخر کیا کشش ہوگی مضامیں کی
قدم رکھتا کہیں ہوں اور پڑتا ہے کہیں رعنا

میں بگولا بن کے کوئے یار میں پھرتا رہا
دیکھ تو قمری ذرا سروِ لبِ جو کی بہار

بارِ عصیاں سر پہ، جانا دور ہے نادیدہ راہ

سوفار کا پتہ نہ نشانِ سناں کہیں
بجلی نہ بیٹھیں تھک کے تری شوخیاں کہیں

یہ آپ پہنچے تو کیا کھنچے یہ اب اُلٹی تو کیا لائی
دعائے بے اثر کیا لے کے پلٹی اور کیا لائی

ہماری مفلسی خود راہ پر ہمکو لگا لائی
نسیمِ صبح گلدستے کے گلدستے اُڑا لائی

زمیں تک طبعِ موزوں آسمانوں کو جھکا لائی
نگاہِ لطفِ ساقی وہ ہی ساغر میں چھلکا لائی

لاکھ تُو نے لے صبا مٹی مری برباد کی
موج کی ہیں بیڑیاں قسمت میں اس آزاد کی

منزلیں کھوٹی نہ ہوں رعنا عدم آباد کی

رعنا

رعنا منشی سید نور احمد لکھنوی، کلیم لکھنوی کے بھائی اور ۱۸۹۳ء میں بھوپال میں ملازم تھے۔ مدتوں وہیں رہے حضرت تسلیم سے کچھ دنوں اصلاح لینے کے بعد اُنکے استاد بھائی راز رامپوری کے شاگرد ہوگئے۔ چند غزلوں کا انتخاب حاضر ہے۔

حاصل ہے وصل میں بھی مزا انتظار کا
اندھا بنا دیا مجھے شوقِ تلاش نے

کیسی تڑپ کہاں کی چمک کسکی بجلیاں
حسرت کی شکل پھرتی ہے آنکھوں کے سامنے

رکھا ہوا ہے سینہ پہ خط اُنکا دیر سے

پھروں مزاج ہی نہیں ملتا ہے یار کا
دشمن سے پوچھتا ہوں پتہ کوئے یار کا

یہ بھی ہے ایک رنگ دلِ بیقرار کا
پہلو جو سوچتا ہوں کوئی وصلِ یار کا

تعویذ بن گیا ہے دلِ بے قرار کا

پکڑے گئے ہیں پیتے ہوئے مے جناب شیخ
میلا لگا ہے پیرِ مغاں کی دکان پر

کیا بانکپن کسی کا سمائے نگاہ میں
ہم تو مٹے ہوئے ہیں تری آن بان پر

کہتے ہیں وہ کہ جان تو ہم ہیں رقیب کی
خدا کی شان کہ جھوٹے بھی یہ کہیں ہم سے

کیوں یہ کہا کہ صبح پڑے جس کی جان پر
تمہاری بات نہیں اعتبار کے قابل

تری رفتار کی شوخی جو دیکھی
غضب ہے دل جلے اور جسم ہو سرد

قیامت گر گئی میری نظر سے
کہ باہر برف اندر آگ برسے

ہنس ہنس کے کوئی آج مجھے کوس رہا ہے
ہمدردی کی امید ہے کیوں ہجر میں دل سے

پڑ جائے اثر اس کا عدو پر تو مزا ہے
دشمن بھی کسی کا کہیں غمخوار ہوا ہے

نہ قہقہے نہ تبسم نہ یہ ہنسی ہوگی
دل آپ کا کہیں آیا تو دل لگی ہوگی

رغمی

رغمی۔ ناظم و ناثر کہن سال نکتہ رس بے نظیر مولوی عظیم اللہ رغمی سیدپوری شاگرد رشید شیخ ناسخ لکھنوی غازیپور زمانیہ کے رؤسا میں سے تھے انکے والد شیخ امان اللہ طوفان ناسخ مرحوم کے دلی دوست و رفیق تھے یہ خود بڑے مشاق اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے، اوائل سن تمیز میں الہ آباد اور لکھنو جا کر تحصیل علم کی، اسّی برس سے زیادہ عمر پا کر چار پانچ سال ہوئے انتقال کیا شیخ ناسخ کے حالات شمس العلماء آزاد کو آپ ہی کی وساطت سے دستیاب ہوئے تھے، ایام ضعیفی میں بھی برابر مشغلہ سخن کو نباہے جاتے تھے۔ رغمی تخلص سے آپکی شاعری کا ابتدائی سال نکلتا ہے۔ بڑے جہاں دیدہ، قابل، طباع، خلیق بزرگ تھے، بڑی دقت سے چند غزلیں ہاتھ آئیں انکا انتخاب درج تذکرہ کیا جاتا ہے۔

نرگس کی طرح مجکو نہ صحت ہوئی نصیب
ساغر کی مے کی شیشہ کی حاجت نہیں ہوئی

میں عشق چشم یار میں بیمار ہی رہا
میں عشق چشم یار سے سرشار ہی رہا

ہاتھ مہندی سے ترا غیرت مرجاں ہوتا
ہاتھ میں تیرے اگر خنجر بُراں ہوتا

پاؤں میں خون خدنگ شہیداں ہوتا
عید قرباں کا سماں آج مری جاں ہوتا

جب بنا کر زلف مشکیں اپنی وہ نکھرائیں گے
قتل وہ کرتے تو ہیں لیکن بہت پچھتائیں گے

سو بلا عاشق کے سر پر آسماں سے لائیں گے
عاشق جانباز ایسا پھر کہاں سے لائیں گے

لاکھ جانیں ہوں مری اُسکی کھٹک پر صدقے	خارِ مژگاں کو مرے دل میں چھپا رہنے دے
خونِ عشاق نہ کر ہاتھ دکھا کر قاتل	شوخی اتنی نہ کرے رنگِ حنا رہنے دے
وصل کی رات ہے ہنس بول ذرا گھونگٹ کھول	اب تو زعمی سے نہ کر شرم و حیا رہنے دے
جلوے دکھلا دو اپنے قامت کے	لوگ مشتاق ہیں قیامت کے
بزم میں بیٹھے مجھ سے وہ مل کے	آج ارمان نکلے ہیں دل کے
بنکے آئے عروس تیغ اُن کی	خوب ارمان نکلیں گے دل کے
مشتعل ادبیئے امین ہے فراست میری	طبع ہے طور تجلی ہے ہدایت میری
لطفِ معنی سے ہویدا ہے لطافت میری	بندشِ لفظ سے ظاہر ہے نزاکت میری
آئینہ دیکھ کر وہ کہتے ہیں	ہم تو عاشق ہیں ایسی صورت کے
عیش ہو ویگا تلخ شیریں کا	کوہکن کا نہ وہ فسانہ سنے
ہے یہی آرزوئے دل میری	ایک شب وہ مرا فسانہ سنے
حُسن اور عشق و محبت کا تقاضا ہے یہی	ہم فراموش ہوں اور غیر ہمیں یاد رہے
دُنیا میں رہے ساتھ و لیکن پس مردن	چھوڑ آئے ہمیں قبر میں سب اپنے پرائے
ناسخ کے تلمذ سے مجھے فخر ہے زعمی	پھر وہ ہر ہیں ویسے نہ سخنور نظر آئے
چلتی ہے رُک رُک کے گردن پر جو شرمائی ہوئی	چال ہے یہ تیغ کو قاتل کی سکھلائی ہوئی

رفاقت

رفاقت مرزا امکین دہلوی نام اور شیخ قلندر بخش جرأت کے تلامذہ خوش فکر میں انکا شمار تھا۔ ۲۰ برس کی عمر عین عالم شباب میں اپنے احباب و اعزا کو داغِ مفارقت دیکر عالم جاودانی کو سدھارے۔ اُنکی خوش فکری کا نمونہ یہ چند شعر حاضر ہیں۔

وہاں کیونکہ رہیے کہ منادی جہاں یہ ہو	زانو پہ سر کو دھر کے نہ بیٹھا کرے کوئی
برسوں کی ایک دن میں رفاقت کو چھوڑ دے	کیا ایسی زندگی کا بھروسا کرے کوئی
کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی	گر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

اے فرشِ گل پہ غیر کو بٹھاؤ نہ اپنے پاس	منظور ہے کہ خاک پہ سویا کرے کوئی

رفاقت

رفاقت - شیخ بہادر حسین صاحب شاگرد میر آغا حسن امانت غدر کے بارہ سال بعد اِنتقال کیا۔ لکھنؤ وطن تھا، حالات کے لیئے بہت تلاش کی دستیاب نہوئے نہ کچھ زیادہ کلام ملا

نہیں تم کو جب ہم صنم دیکھتے ہیں	تن اپنے میں دم دم کا دم دیکھتے ہیں
طاقت نہیں ہے پھر نکلی ہیہات پاؤں میں	پہلو سے اپنے یار مجھے تو اُٹھا نہیں
تقدیر میں لکھا تھا سوا ہی جانِ من ہوا	قسمت سے ہے گلہ ہمیں تم سے گِلا نہیں
ہرگز کسی سے دِل نہ رفاقت لگائیو	بحرِ جہاں میں دیکھ چکے آشنا نہیں

رفعت

رفعت - لالہ رام دلدرا، آپ کو مرزا رحیم الدین حیا دہلوی سے تلمذ تھا۔ تذکرہ قاصی خلیل سے کلام نقل ہوا۔ غدر کے بعد انتقال کر گئے۔

زندگی خضر و مسیحا کی نہ کیونکر ہوتی	روگ اُلفت کا نہ تھا عشق کا آزار نہ تھا
آفت ہے گو کہ فتنۂ روزِ جزا مگر	کیا سر اُٹھائیگا تری ٹھوکر کے سامنے

رفعت

رفعت نواب مہدی حسن خان رفعت لکھنوی عرف منو صاحب نواب محمد سعید خان لکھنوی کے خلف متبنی اور وارث ہیں حضرت جلال لکھنوی کے قدیم تلامذہ میں صاحبِ دیوان اور ہر طرح ممتاز ہیں ۱۲۸۵ھ سالِ ولادت ہے، صاحبِ دیوان ہیں، کہیں کہیں استاد کے کلام کا پرتو اِنکے کلام میں نظر آجاتا ہے۔

بلبلیں ضبط تھیں تنکے خاک اُڑاتی تھی صبا	جسکو دیکھا باغِ عالم میں ترا دیوانہ تھا
کیا چیز حسن بھی ہے عجب انقلاب ہے	محمود دل کو دیکھے غلامِ ایاز تھا
بچیگا یا نہ بچے گا مریضِ عشق مسیح	خدا کیواسطے کچھ تو جواب دیتا جا
سینے سے سینہ یار نے آکر لگا دیا	سوزِ جگر کو دل کی لگی کو بجھا دیا
یارب بھلا ہو اُس مرے غفلت شعار کا	جو لے گیا قرارِ دلِ بے قرار کا
بیتاب جو ہیں حضرتِ دل جائینگے پھر کیا؟	رُوٹھے ہوئے کو اپنے منا لائینگے پھر کیا

ہوا ہجر نہ اُٹھا پردۂ محمل جو لیلیٰ نے
جو مجنوں دیکھ لیتا اور بھی دیوانہ ہو جاتا

پرواز ہوئی روح جو بلبل کے بدن سے
پھر قید بھی صیاد کی باقی نہ قفس تھا

میں جو کہتا ہوں کہ ظالم ہو بڑے تم بخدا
ہنس کے کہتے ہیں بھلا

کون معشوق زمانے میں دل آزار نہیں
ہم بھی کرتے ہیں جفا

تفرقہ تو نے جو اے چرخ نہ ڈالا ہوتا
کیوں خفا مجھ سے مرا رُوٹھنے والا ہوتا

زانو پہ اُسکے سر ہو نکلجائے اپنا دم
جو دیکھے وہ کہے کہ ہے اِس کا بھی کیا نصیب

قیامت چال، قد محشر، ستم عشوہ، نگہ خنجر
جوانی ظلم کرتی ہے شباب اُنکا ہی جوبن پر

دل میں یاں چُٹکی خیالِ بوسہ لے
نیل پڑ جائے وہاں رخسار پر

نکلے ادھر تو جان اُدھر بخشدے وہ جُرم
بس ہے یہی کسی کے گنہگار کی ہوس

جو نہ تڑپے ہجر میں بسمل نہیں
درد جس دل میں نہ ہو وہ دل نہیں

صراحی مے کی دستِ پارسا میں
بڑا اندھیر ہے کالی گھٹا میں

شرم کے پردے میں ہنسے دو نگاہِ شوخ کو
یہ سمجھ لو جاکے آنکھوں سے حیا آتی نہیں

ہر ادا پر مرنیوالوں سے اشارے کر گئے
دیکھتے ہیں آج کس کی قضا آتی نہیں

چشمِ تر دیتی ہے پانی اُسے میری لیکن
نخلِ اُمید کبھی پھولتا پھلتا ہی نہیں

مسیحا ایک تم کہنے پہ اپنے ناز کرتے ہیں
یہاں ٹھوکر سے یہ بُت سینکڑوں اعجاز کرتے ہیں

اگر سُن لیں تری رفتار کی آہٹ قیامت کو
تڑپ کر زندہ ہو جائیں ابھی مردے مزاروں میں

دل یہ کہتا ہے چلو پاس مسیحا کے چلو
ضبط کہتا ہے ابھی دردِ جگر ہونے دو

آئینگے میری لاش اٹھانے کو وہ ضرور
کچھ وعدۂ وصال نہیں جو وفا ہو

ناراض ہو وہ بُت تو منا لونگا پھر بھی میں
مجھ سے مگر خفا کہیں میرا خدا نہ ہو

جوشِ خوں کا ماجرا کہتا ہے اسکو لے جنوں
ڈھونڈتی ہے رگ زبانِ نشترِ فصاد کو

وہ مشکل کونسی ہے جو دل کو قرار ہو
یا موت آئے یا مرے پہلو میں یار ہو

مرے پہلو سے اُٹھ کے میری جان جاتے تو ہو لیکن
بھلا یہ تو کہو کچھ دل کو بھی سمجھائے جاتے ہو

مر کے زندہ ہو گئے عاشق خدا کی شان ہے
آ گئی صبح قیامت بھی شبِ ہجراں کے ساتھ

کوئی کشتۂ حسرت اُٹھ بھی گیا
اب آئے ہو تم ہاتھ ملتے ہوئے

جلے دل کا پھوٹا کوئی آبلہ
جو آنسو نکلتے ہیں جلتے ہوئے

ترا کشتہ تڑپا کیا دیر تک
ترا دل جو دیکھا بہلتے ہوئے

پیو مستو! گھٹا چھائی ہے پانی خوب برسے گا
گنہگاروں پہ اسکی آج رحمت ہونیوالی ہے

آنکھیں دکھا کے اے مرے عیسیٰ چلے گئے
اچھے جو ہو چلے تھے وہ بیمار رہ گئے

جاں نکلنی ہے دیکھ جاؤ تمہیں دم اٹکا ہے اب
پھیرتے ہو آنکھ ناحق اک نظر کیواسطے

بلبل نہ بجھا آنسوؤں سے آتشِ گل کو
کیا پھونکنے کو خانۂ صیاد نہیں ہے

جان تک کام جو آتی تو نہ ہوتا کچھ عذر
دل ہے کیا چیز جو ہم آپ سے پیار کرتے

پوچھ کیا ناتوانِ فرقت کا
آپ لاشہ اُٹھائیے تو سہی

قتل ہو جاؤنگا میں خود صاحب
آپ بیڑا اُٹھائیے تو سہی

دل لگی جانیئے نہ عشق مرا
دل کسی سے لگائیے تو سہی

نہ وہ دل رہا نہ وہ آنکھ ہی وہ نگاہِ لطف کدھر گئی
یہ بتائیے تو مجھے ذرا کدھر آپکی وہ نظر گئی

دی صدا دل نے وہ پہلو سے مرے جب اُٹھے
میں بھی تیار ہوں ساتھ آپکے چلنے کے لیئے

نکلتے دیکھتے ہو دم تمھارا دل بہلتا ہے
بھلا ہو سخت جانی کا مرا ارمان نکلتا ہے

کس سے دوں حسن کو تیرے تشبیہ
ایک یوسف ہے وہ بازاری ہے

روگ نرگس کا نہیں جانے کا
اُلفتِ چشم کی بیماری ہے

رفعت

رفعت سخنورِ خوش فکر شاہزادہ مرزا پیارے رفعت گورگانی سنہ ۱۲۴۱ھ میں پیدا ہوئے اوائل عمر میں حافظ عبدالرحمٰن خان احسان سے اصلاح لی تھی، بعد میں حضرت صہبائی سے تلمذ اختیار کیا، بڑے نامور اور خوش فکر شاعر تھے، اشعار انکے نہایت

شیریں اور عمدہ ہوتے ہیں، صاحبِ دیوان تھے، غدر کے بعد الور سے جو شاہزادے گرفتار ہو کر آئے اُن میں یہ بھی تھے نشانۂ تفنگِ اجل ہوئے، کلام ملاحظہ ہو:

ہم خوش تھے کہ محشر میں تو دیکھینگے وہ دیدار　　لیکن یہ قیامت ہے کہ محشر ہی نہیں ہوتا
کس منہ سے کروں دل کی شکایت کہ برا ہے　　تجھ سے تو جدا وہ کبھی دم بھر ہی نہیں ہوتا
ہو جبرا بیتابی دل کا کہ اُسکے ہاتھ سے　　رازِ پنہاں ایک عالم پر نمایاں ہو گیا
یا الٰہی درد کس پردہ نشیں کا تھا کہ شب　　دل میں اُٹھ اُٹھ کے مرے دل ہی میں پنہاں ہو گیا
مژہ کو چھیڑے تو مدّت ہوئی پہ یہ ابتک　　چُبھے ہے خار سا سینہ کے درمیاں کیسا

خدا نہ کردہ کرے نالہ گر ترا عاشق　　تو پھر زمین یہ کیسی یہ آسمان کیسا
کچھ آنکھ کا گیا نہ گیا کچھ خیال کا　　مارا گیا دل اور یہی بے قصور تھا
رحم اُس کا ہو کہ نالہ کا اثر ہو کچھ ہو　　تیغ میں یار سے وہ لینے کو خبر آہی گیا
تھا ہدف غیر پر اپنا جو مقدّر تھا درست　　غلط انداز سے وہ تیر ادھر آہی گیا

تری گلی میں ہوئے خاک بھی تو کیا حاصل　　ترا ہے ڈھب وہی دامن اُٹھا کے آنیکا
ہیں ایک وہ بھی کہ اُن سے ہے تمکو ناز و نیاز　　اور ایک ہم ہیں کہ منہ تکتے ہیں زمانے کا
شبِ وصال میں دیتا ہے لطف کیا کیا کچھ　　ہر ایک بات پہ عالم یہ منہ بنانے کا
کم ہو گئی شاید بُت و بتخانہ کی اُلفت　　کچھ ان دنوں آتا ہے جو وہ رہے ہے خدا یاد
بیٹھ اے تیرِ ستمگر تو دلِ زار کے پاس　　بیٹھتے یار ہیں دنیا میں سدا یار کے پاس
ہائے پانی بھی چُوانے کو نہ آیا دمِ مرگ　　کوئی جز گریۂ حسرت ترے بیمار کے پاس
تجکو لینی ہے تو لے ورنہ اجل لینی ہے　　جان جو کچھ کہ ہے باقی ترے بیمار کے پاس
آتشِ عشق سے جل جل کے بنا ہوں سرمہ　　کوئی دن کو تری آنکھوں میں آ جاتا ہوں
لب ہیں جاں بخش یہ کیسے کہ میں اُنکی خاطر　　اپنے جینے سے ہی مایوس ہوا جاتا ہوں

پونچھے اشک اُسنے گمانِ غیر میں　　مر گئے ہم اُسنے ہی احسان میں

جان جل کو دینگے اب جھگڑے کے ساتھ
تو ہے جو دیا ہیں تجھے ایک آن ہیں

بدنامی مجکو تیری بدولت ہوئی تو ہو
عزت سمجھتا ہوں مجھے ذلت ہوئی تو ہو

اب اُن میں ظلم کرنے کی عادت نہیں رہی
جب ہم میں سانس لینے کی طاقت نہیں رہی

ناصح بھی کرنے چاک گریبان کو لگے
باقی جب اُن کو جائے نصیحت نہیں رہی

پہلے ہی وہ لکھے ہے کہ میں تو ہوں بیوفا
تحریر میں بھی جائے شکایت نہیں رہی

رفعت

رفعت تخلص محمد منیر الدین نام شیر گھاٹی ضلع گیا وطن خلف مولوی سید فضل حسن آزاد مرحوم و برادرزادہ سیّد غلام حسین فریاد شاگرد نسیم دہلوی، فارسی عربی کی خاص استعداد تھی، عجز و انکسار آپ کا شیوہ تھا، شاعری کی ابتدا تھی اور خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی سے تلمذ تھا کہ بتیس سال کی عمر میں بعارضۂ طاعون ۱۳۱۹ھ میں انتقال کیا انکے ایک عزیز نے سوڈیڑھ سو شعر بھیجے جن کا انتخاب درج ذیل ہے۔

فراقِ یار میں بے چین ہو کر
پہنچ جاتے ہیں نالے آسماں تک

مئے گلگوں چڑھانا خوب رندو!
یہی پہنچائے گی حورِ جناں تک

کسی پہلو نہیں ہے چین رفعت
اُٹھاؤں صدمۂ فرقت کہاں تک

یہ نہ پوچھو کہ غذا عاشق بسمل کی ہے کیا
لختِ دل کھاتے ہیں اور خون پیا کرتے ہیں

وعدۂ وصل انھیں یاد دلائیں کیونکر
ایسی باتوں کو ذرا کم وہ سنا کرتے ہیں

اِن بتوں کو نہیں محشر کی خبر اے رفعت
ظلم اللہ کے بندوں پہ کیا کرتے ہیں

یہ ترا حسنِ خداداد ہے مشہور جہاں
شور یوسف کا فقط مصر کے بازار میں ہے

ترا عاشق تجھے بھولا کہاں ہے
ترا ہی نام تو وردِ زباں ہے

مجھے امید جینے کی کہاں ہے
لبوں پر یار کی فرقت میں جاں ہے

فلک کا جب یہ عالم کو گماں ہے
ہمارے داغِ دل کا وہ دھواں ہے

اگر صورت دکھائی ہو تو آؤ!
کہ اب بسمل تمھارا نیم جاں ہے

اِدھر آؤ تو دیکھیں لب تمھارے ۔۔۔ کسی کا خون ہے یا رنگِ پاں ہے
نہ پوچھو ماجرائے یار ہم سے ۔۔۔ کبھی ناخوش کبھی وہ مہرباں ہے
بسر کیونکر کریں ہم اس چمن میں ۔۔۔ جہاں دشمن ہمارا باغباں ہے

سہا کرتا ہے خالی ان دنوں پہلو مرا دل سے ۔۔۔ نکل جاتی ہے اس ناقہ کی لیلی اپنے محمل سے
ملیں گے پھر نہ ایسے لوگ یہ صحبت غنیمت ہے ۔۔۔ کہا مانو بچاؤ شیخ جی رندوں کی محفل سے
لگائی تیغ بھی منہ پھیر کر سفاک نے مجھ پر ۔۔۔ نہ نکلی حیف وقتِ قتل بھی حسرت مرے دل سے
اثر ہے بعد مرنے کے یہ باقی چشمِ گریاں کا ۔۔۔ ٹپک پڑتا ہے جو ساغر بناتے ہیں مری گل سے
بٹھایا بیٹھکر پہلو میں ہمکو یار نے رفعت ۔۔۔ اٹھایا اٹھ کے اپنے سامنے غیروں کو محفل سے

رفعت

رفعت سید عنایت احمد رفعت خلف حضرت فطرت موہانی - چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کھیل سمجھے تھے دل لگی دل کی ۔۔۔ قدر جانی نہ تھی ابھی دل کی
جلوۂ یار کیا قیامت تھا ۔۔۔ روز افزوں ہے بیکلی دل کی
شور دیدار تھا بہت لیکن ۔۔۔ بیخودی سے نکل سکی دل کی
جوشِ حسرت نے کر دیا مجبور ۔۔۔ کچھ نہ ہم کہہ سکے لگی دل کی
ہو کے مغلوبِ خرمی رفعت ۔۔۔ کچھ عجب کیفیت ہوئی دل کی

رفعت

رفعت منشی محمد داؤد صاحب خوجہ متوطن بمبئی حضرت امیر مینائی مغفور کو کلام دکھلایا ہے اردو کا مادری زبان ہونیکے باوصف اچھا مذاق ہے اور شعر بھی خاصہ کہہ لیتے ہیں:

تذکرہ لکھے کوئی زلف کے دیوانوں کا ۔۔۔ کاش شیرازہ بندھے یونہیں پریشانوں کا
عہد میں اس بتِ سفاک عدوئے دیں کے ۔۔۔ خون ارزاں ہے خدا سے بھی مسلمانوں کا
مانتا حسن کو بے مثل ترے اے کافر ۔۔۔ ہندوؤں کا ہے دھرم دین مسلمانوں کا
شور بختی اسے کہتے ہیں کہ ہو کر زخمی ۔۔۔ دیکھنے پائے نہ ہم منہ بھی نمکدانوں کا
آئینہ دیکھ کے منہ پھیر لیا کیوں صاحب ۔۔۔ اس میں نقشہ تو نہیں آپکے حیرانوں کا

رنگِ حدت جما تصور سے
ہوتے رہتے ہیں پھروں رازونیاز

میری صورت ہے ہو بہو تیری
رکھ کے تصویر روبرو تیری

دل سے بھی داغِ دل ہیں مجکو عزیز
آتی ہے اِن گلوں سے بُو تیری

اشکِ خجلت کی قدر کرے دِل
کر رہے ہیں یہ شست وشو تیری

قتل ہونے پر دوبارہ قتل کا ارمان ہے
ذبح اِس انداز سے تونے کیا قاتل مجھے

رفعت

رفعت منشی سرفراز علیخان باشندہ بریلی، پہلے جناب رحمت بنارسی سے اصلاح لیتے تھے جب کچھ استعداد حاصل ہوگئی تو حضرت داغ مرحوم کی خدمت میں آئے، خوش فکر موزوں طبع، شوخ خیال ہیں، زبان سے خاصہ لگاؤ ہے اکثر رسالوں میں غزلیں چھپتی رہتی ہیں

نزع میں یار ہے مہماں میرا
دم نکلتا ہے کہ ارمان میرا

شہیدِ ناز کی آنکھیں کھلیں ہیں قبر میں بھی
ہے انتظار یہاں بھی کسی کے آنے کا

رہ رہ کے کھٹک ہجر کی شب ہوتی ہی ظالم
دل میں تری حسرت ہے کہ کانٹا ہی جگر میں

اب دونوں کی برآئیں مرادیں تو مزا ہو
دل اُنکی نظر میں ہے وہ ہیں میری نظر میں

اُس دستِ حنائی نے تو اور آگ لگادی
سمجھا تھا کمی ہوگی مرے سوزِ جگر میں

بھلا راحت کہاں تقدیر میں ہم غم نصیبوں کی
اگر ہوں شادماں دم بھر رہیں اندوہگیں سو ل

زاہد نہ چھیڑ اسکو زیادہ یہ خوف ہے
کچھ اور رُٹھ نہ جائے دِل بادہ خوار میں

بلبل نے دیکھکر ترے رخسار یہ کہا
ایسے بھی پھول ہیں چمن روزگار میں

الٰہی ایک مٹ جائے تو اک داغ اور پیدا ہو
چراغِ خانۂ دِل حشر تک میرا نہ ٹھنڈا ہو

تمھیں اک بوسۂ رُخ دینے میں انکار ہیں سو سو
سمجھکر سوچکر دِل میں ذرا دِل کا تقاضا ہو

تری محشر خرامی اک نہ اک دن قہر ڈھائیگی
عجب کیا ہے قیامت وقت سے پہلے ہی برپا ہو

تڑپنے کا مزا یہ برق اور سیماب کیا جانیں
یہ اُسکے دل سے پوچھا چاہیئے جو نیم بسمل ہو

نظر سے قتل کرتے ہیں وہ ٹھوکر سے جلاتے ہیں
جو قاتل ہو تو ایسا ہو مسیحا ہو تو ایسا ہو

یہ کیا آغازِ الفت ہی میں تم گھبرا گئے رفعت / ابھی تو دن پڑے ہیں دیکھئے انجام میں کیا ہو

شان و شوکت سے غرض کیا کام بیہوشی سے ہے / جام جم مجکو مرا ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے

بعد اُسکے میں ہوا ہوں مالکِ اقلیمِ عشق / اب مرے قبضے میں رفعت قیس کا ویرانہ ہے

کیا جانے کہاں اب دلِ دیوانہ ہے اپنا / پہلو میں نہیں یار کی محفل میں نہیں ہے

اے قیس کہاں ڈھونڈنے جاتا ہے سوئے دشت / لیلیٰ ترے دل ہی میں ہے محمل میں نہیں ہے

جو داغ مرے دل کو ملا عشق میں رفعت / لالہ میں نہیں ہے مہ کامل میں نہیں ہے

دل پہ قابو نہ رہے ہوش ٹھکانے نہ رہیں / سامنے میرے اِس انداز سے آئے کوئی

ہنستا ہے دیکھ کے بسمل کا تڑپنا قاتل / جان سے جائے کوئی لطف اُٹھائے کوئی

ہوئیں پوری مرادیں مُدعی کی / نہ نکلی کوئی حسرت میرے جی کی

تری آنکھوں کے جادو کے مقابل / نہیں کچھ اصل سحر سامری کی

وہ دو ہی باتوں میں دل لیگئے ہائے / نہ جانے کونسی افسوں گری کی

لیئے جاتی ہے دنیا سے عدم کو / تمنّا شیخ جی کو حور ہی کی

وہ ملتے ہیں تو یوں ملتے ہیں مجھسے / شناسائی نہیں گویا کبھی کی

کروں میں بے وفائی یہ نہو گا / بُرائی میرے حق میں تمنے کی کی

ہمارے حال کے پُرساں وہ کیوں ہوں / انھیں ہے یاد ہر دم مدعی کی

کہا جب میں نے مرتا ہوں تو بولے / کہی یہ بات تو نے میرے جی کی

نگاہِ یار بھی ہے کیا زمانہ / کبھی کی دوست ہے دشمن کبھی کی

نہ آیا راہ پر وہ شوخ رفعت / کریں کیا ہمنے تو کوشش بڑی کی

اپنی تصویر ہی بھجوا دو تسلی کے لیئے / تمھیں انکار اگر ہے مرے گھر آنیسے

داستانِ غم و اندوہ کہانی ٹھیری / نیند آجاتی ہے اُنکو مرے افسانے سے

شہادت کے بہت خواہاں ہیں تیغِ نازِ قاتل سے / عطا اب دیکھئے کسکو یہ دولت ہونیوالی ہے

رفعت

رفعت مولانا غلام جیلانی، گیلانی۔ بیاض قاضی خلیل سے کلام لیا گیا۔

جوں شمع اگرچہ بے زباں تھے — پرسوز تمام کہہ گئے ہم
کچھ نہیں ہم ہیں بغیر از دلِ سوزاں رفعت — پیرہن صورتِ فانوس نظر آتا ہے

رفیع

رفیع مرزا محمد طاہر صاحب خلف و شاگرد حضرت اوج لکھنوی و نبیرہ مرزا دبیر اب ریاستِ رامپور میں ملازم ہیں، ۴۰ سال کے قریب عمر ہے مرثیہ بھی کہتے ہیں، شعر گوئی کی طرف میلان ہو جاتا ہے تو اس میں بھی قوتِ فکر سے دُرِ خوش آب نکال لاتے ہیں دو بار لکھنؤ میں آپ سے ملاقات ہوئی، کلام دینے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر باوجود تقاضوں کے شاعرانہ تجاہل و تساہل مانع رہا۔

اُسوقت سے وہ جلوہ گہہ بزم طور تھا — کعبہ تھا نے خلیل نہ موسیٰ نہ طور تھا
سچ تو یہ ہے رقیب نے ڈالا ہے تفرقہ — ورنہ مری خطا نہ کچھ اُسکا قصور تھا
اب وہ تمام جسم میں ہے یادگار غم — جو دل کہ تن بدن میں بساطِ سرور تھا
رستہ کوچۂ قاتل کا اجل نے ندیا — ضعف نے پاؤں وہ پھیلائے کہ چلنے ندیا
منہ اندھیرے ایک بھی چلو پلا دے تو اگر — ساقیا دینگے دعائیں شام تک میخوارِ صبح
بام پر آیا ہے بہرِ سیر وہ خورشید رو — آج دُونی ہوگئی ہے گرمیِ بازارِ صبح
داغ بر دل ہے قمر خورشید تفتیدہ جگر — شام کا بیمار ہے کوئی کوئی بیمارِ صبح

جملہ زنگار رنگ عالم کا ہے مسکن پھول ہیں — چشم حق بیں کو نظر آتا ہے گلشن پھول ہیں
یہ زرِ گل باغباں غنچوں کی مٹھی میں نہیں — حسرت و ارمانِ بلبل کا ہے مخزن پھول ہیں
جلوہ افگن ہے یہ کسکا روئے روشن پھول ہیں — کیا چمکتا ہے چراغ زیرِ دامن پھول ہیں

یہ ناز ہے کہ تیرے ہم آستاں پر ہیں — جو پاؤں تھے زمین پر اب آسمان پر ہیں
آہوں سے میری نکلے اکدن تجھے کچھ شرارے — بن بنکے وہ ستارے اب آسمان پر ہیں
شوقِ دیدار تو ہمراہ چلے گا تیرے — نامہ بر حسرتِ تقریر ہے تحریر کے ساتھ
واہ واے قدر انداز تیرا کیا کہنا — طائر دل کو اڑایا ہے پر تیر کے ساتھ

اے خدنگ نگہِ ناز کوئی کیا جانے
دل یہ کہتا ہے کہ اظہار تمنّا کیجے

دلِ مجروح سے پوچھے کوئی لذت تیری
عقل کہتی ہے کہیں آئی ہے شامت تیری

گئیں جو اپنی کے ساتھ اُمنگیں چراغ جسطرح رات کے ساتھ
نہ اب وہ شعلہ رہا ہے باقی نہ شعلہ میں وہ بھڑک رہی ہے

ہوائے گلشن سنک رہی ہے گلوں سے شبنم ٹپک رہی ہے
یہی سبب ہے کہ آتشِ گل دہک رہی ہے بھڑک رہی ہے

بہار آئی چمن میں نکھرے ہوا سحر کی سنک رہی ہے
روش پہ موتی بچھے ہوئے ہیں گلوں سے شبنم ٹپک رہی ہے

ابھی ہیں نام خدا وہ کمسن نیا ہے جوبن نئی جوانی
جو چاک کہنی تک آستیں ہے تو پیچھے چولی مسک رہی ہے

شہید الفت ہے یہ مقرر لحد پہ جسکی بجائے چادر
قمر کی اُجلی سی چاندنی ہے گلاب شبنم چھڑک رہی ہے

گرے ہیں خود طفلِ اشک ہر سو نہیں مژہ کی خطا سرِ مو
کہ دستِ شفقت سے دامن اپنا اُٹھا اُٹھا کر تھپک رہی ہے

جان دیدی اُسنے میرے آزمانیکے لیئے
ہائے میں لاؤں کہاں سے تجکو اے صبح وصال
میرے سر سے خنجرِ برّاں چھوا کرتے ہیں وہ

غیر خود ہی مٹ گیا میرے مٹانے کے لیئے
شام ہجراں آئی کالا منہ دکھانے کے لیئے
ہمنے چھوڑا اُسکو جھوٹی قسمیں کھانے کے لیئے

رفیع - مسٹر رفیع الدین صاحب، ضلع ہردوئی میں چھ سات برس ہوئے السپکٹر محکمہ آبکاری تھے بعد کا حال اور تلمذ کی کیفیت معلوم نہیں۔ کلام ملاحظہ ہو۔

رفیع

ہو نہ خاروں کی خلش جبتک نہیں ملتا ہے گل
چار ہی دن میں جا اسقدر بھولے کہ اب

گلشن عالم میں بے رنج والم راحت نہیں
شمع روشن کرنے بھی آتے سر تربت نہیں

ہائے کس دن رحم آیا عاشق ناشاد پر	جب اطبا کہہ چکے بچنے کی اب صورت نہیں
رنگِ دنیا دیکھ کر گھبرا گیا اپنا تو جی	بھائی سے بھائی کو بھی اِس دَور میں اُلفت نہیں
لاکھ منعم جمع کرے مال و زر لیکن رفیقؔ	فکر و زحمت کے سوا کچھ حاصل و دولت نہیں

رفیق

رفیق۔ مرزا اسد بیگ دہلوی مغل خواص ابو ظفر بہادر شاہ بادشاہ شاگرد ثنا اللہ خان فراق صاحب ہنر اور سپاہی پیشہ تھے، غدر سے پیشتر اپنے مکان میں مشاعرہ بھی کیا کرتے تھے طبیعت دار شخص تھے، فکر رسا اور زبان پاکیزہ تھی۔ یہ اُنکا کلام ہے۔

ہمدمو پوچھو ہو کیا اُلفت کے دیوانے کا شوق	ہے اُسے کوئے بتاں میں رات دن جانیکا شوق
چشم کے بنگلے کو جاروب مژہ سے جھاڑئیے	ہو اگر تم کو یہاں تشریف فرمانے کا شوق
آہِ آتشبار کے میرے شرارے دیکھئے	لامکاں سے بھی پرے رکھتا ہے یہ جانیکا شوق
ایک بوسہ اُنسے جو میں نے طلب شب کو کیا	ہنسکے بولے کچھ ہوا ہے گالیاں کھانیکا شوق
اُس کا سنگِ رہ گذر یہ دل بنا لیتا رفیق	ہے اُسے چلتے ہوئے پاؤں سے ٹھکرانیکا شوق
روشن رہے گا داغ دلِ عاشقاں مدام	ہوگا نہ حشر تک یہ چراغ مزار گُل
بہ رہی ہے ہجر میں تیرے سدا خونبار چشم	اور تُو ہمسے خفا ہے حیف ہو کر چار چشم
ہیہات رگڑ کے ہم نہ اُٹھے پھر زمین سے	مانند نقشِ پا ترے کوچے میں مر مٹے

رفیق

رفیق شیخ الٰہی بخش رفیق مرحوم خلفِ سالار بخش متوطن میرٹھ مقیم لاہور پنجاب کے شعرا میں نامور گذرے ہیں انکا کلام مشاعرہ دار العلوم پنجاب کے رسالوں میں اکثر شائع ہوا کرتا تھا اور فی الواقع طباع اور نکتہ سنج بزرگ تھے میر مہدی حسن فراغ کو شروع میں غزل دکھاتے تھے، پھر مولانا آزاد دہلوی سے فیضیاب ہوئے ۱۸۴۱ء سال پیدائش تھا ۱۸۸۲ء کے قریب انتقال کیا، تارا چند تارا انکے شاگرد نے اِنکا دیوان طبع کرا دیا ہے، کلام منتخب ملاحظہ ہو

فریفتہ ہیں جو مرغانِ دل نگہ پہ تری	گرا دے تیر نگہ سے شکار بیٹھے ہیں
مدتوں رہ چکے آوارۂ صحرائے فنا	اب وطن چلکے ہم اے اہلِ وطن دیکھتے ہیں

خود نمائی اُنھیں منظور نظر ہے ایسی
پھروں آئینے میں آپ اپنی پھبن دیکھتے ہیں

آنکل تو بھی کبھی جانب دشت اے لیلی
آکے پھریں ترے مجنوں کو ہرن دیکھتے ہیں

اُٹھی اونچے وہ پھر نیچی نظر آہستہ آہستہ
جہاں ہونے لگا زیرہ زبر آہستہ آہستہ

ہوا ہے مہرباں بیداد گر آہستہ آہستہ
کیا پیدا محبت نے اثر آہستہ آہستہ

رفیق -

آرزو دل کی بر آتی ہے دعا سے پہلے
مینہ برستا ہے مرے گھر میں گھٹا سے پہلے

اب تو خنجر ترا اک اک کو ہے کرتا سیراب
تشنہ لب سینکڑوں مرجاتے تھے پیاسے پہلے

میں بھی گلشن میں کوئی نالہ کروں یا نہ کروں
پوچھ لوں بلبل بے برگ و نوا سے پہلے

پھر کوئی جان نگاہوں سے سلامت لیجائے
دل بچا لیوے تری ناز و ادا سے پہلے

ہے دل زار چراغ سحری کا عالم
خود بخود گل ہوا جاتا ہے ہوا سے پہلے

جب دعا کی کبھی اے تیغ نگاہ قاتل
خیر مانگی ہے ترے دم کی خدا سے پہلے

اے گلو بند نظر ہے جو لباس رنگیں
رنگ دے لو اسے خون شہدا سے پہلے

رو برو تو اگر آئینہ صفت آ بیٹھے
بنکے تصویر ترا محو تماشا بیٹھے

شوخی چشم سے کہتی ہے نگہ اس بت کی
کوئی آرام سے بندہ نہ خدا کا بیٹھے

دیکھ آئے ہم تجھے ہیں دیکھا نہ غیر نے
کوچے میں تیرے جب گئے مثل صبا گئے

رفیق

رفیق منشی ابن علیصاحب رفیق خلف مولوی فرزند علی متوطن قصبہ ہاپوڑ ضلع میرٹھ، آپکا سن ولادت ۱۸۸۵ء ہے، اوائل عمری کا زمانہ اپنے بھائی منشی نصیب علی مرحوم مجسٹریٹ رامپور کے پاس رامپور میں بسر کیا اور یہیں ہوش سنبھال کر ملازمت بھی اختیار کی، ابتدائے سن شعور ہی سے مذاق سخن کا ذوق تھا، رامپور میں شعر و سخن کی گرم بازاری نے انکے شوق کو اور بھی چمکا دیا، جب طبیعت اس طرف مائل ہوئی تو حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے خرمن کمال کی خوشہ چینی کرنے لگے اُنکے انتقال کے بعد حضرت راز رامپوری کی طرف رجوع کیا۔ آپ بزمانۂ قیام رامپور ریاست کے مشاعروں میں اکثر داد سخن دیتے رہے اُسکے بعد اجین جاکر سکرار

گوالیار کی ملازمت کی، اب پھر ہاپوڑ میں مجسٹریٹ ضلع کے ہاں اہلمد ہیں، تھوڑا عرصہ ہوا کہ آپنے دلّی میں آکر ایک اخبار جاری کیا تھا جو کچھ عرصہ چلکر بند ہو گیا، یہاں کے قیام میں بزم کمال کے ماہواری مشاعروں میں شریک ہوتے رہے، ہاپوڑ میں اپنے اہتمام سے سالانہ ایک بزم مشاعرہ کا انعقاد کر رکھا ہے، آپکے کلام میں سادگی کے پہلو بہ پہلو شوخی بھی نمایاں ہے زبان میں چوچلا ہے اور روزمرّہ صاف ہے، اکثر چھوٹی بحروں میں معنی خیز شعر نکال لیتے ہیں اشعار ذیل انکی رنگینی طبع پر دال ہیں۔

تسلّی اُسنے جو دی اور دل فگار ہُوا　　ہمارے زخم کی قسمت میں اندمال نہ تھا

ہر بات میں ذکر ہے عدو کا　　یہ ڈھنگ نیا ہے گفتگو کا

رکھ چاکِ جگر میں دل کے ٹکڑے　　تب لطف ہے بخیہ گر رفو کا

ٹوٹا نہ عصائے محتسب سے　　کام آیا لیا دیا سبُو کا ❊

مُنہ موڑ کے کیوں چلی تری تیغ　　چکھنا تھا مزا مرے لہُو کا

ہلکی کر لے شراب واعظ　　پانی اِس میں مِلا وضو کا

دِل کو بھی ہمارے ہم سے کھویا　　ہو خانہ خراب آرزو کا

رحم اُس بیرحم کا آخر ادا ہو گیا　　دامنِ قاتل مرے زخموں کا پھاہا ہو گیا

کیا بگڑتا نیکو ہو نقشہ وصل کی تدبیر کا　　نامرادی پُوچھتی ہے گھر مری تقدیر کا

آگئے جب وہ رفیق مبتلا کے سامنے　　آہ بھر کر گر پڑا آنسو بہا کر رہ گیا

دیکھتے ہیں داغِ دل خارِ تمنّا چھوڑ کر　　پھُول وہ آنکھوں سے چُن لیتے ہیں کانٹا چھوڑ کر

اللہ اللہ کسقدر رہے اُنکو پردیکا خیال　　میری نظروں میں رہے آنکھوں کا پردہ چھوڑ کر

آنکھیں ملیں لحد سے محبت کے جوش میں　　نرگس کے پھُول اُسنے چڑھائے مزار پر

دنیا کے گرم و سرد سے چھوٹے نہ بعد مرگ　　رہتی ہے دھوپ چھاؤں ہمارے مزار پر

اُنھیں کھیل تھا اک حجاب اول اول　　پڑی بھی اُٹھی بھی نقاب اوّل اوّل

رحم تجھکو مجھے موت آئے یہ ممکن ہی نہیں — مجھسا بسمل ہے زمانے میں نہ تمسا قاتل
دیکھنے والو شہادت تمھیں دینا ہوگی — قتل کے بعد مکر جائیگا میرا قاتل
دل بھی تیرا ہے جگر بھی ترا ایں بھی تیرا — جو تجھے چاہیئے وہ شوق سے لیجا قاتل

عمر ہوگی بسر مصیبت میں — یہی لکھا ہوا ہے قسمت میں
جب توجہ ذرا ادھر ہوگی — بات دل کی زبان پر ہوگی
مرمٹیں گے جو آنکھ ادھر ہوگی — چلتا جادو تری نظر ہوگی
دشمنی ہو کہ دوستی کچھ ہو — لطف دیگی جو وقت پر ہوگی
تیری تصویر بھی ہے ہرجائی — ایک گھر کیا ہزار گھر ہوگی
کیجیئے صبر دل بھی دیدیں گے — آپ کی ضد یہی اگر ہوگی
حسن کی لوٹ آئینہ سے پوچھ — ساری دولت اسی کے گھر ہوگی

بہ چلے سوز عشق سے آنسو — کیا دھرا ہے جو آنکھ تر ہوگی
نگہ شوق بوسے شوق سے لے — سونے والے کو کیا خبر ہوگی
پھر لہو چشم تر سے جاری ہے — موج خون آستیں ہماری ہے
ملتی جلتی ہے ان کی شوخی سے — قابل قدر بیقراری ہے

آمد دم نزع ہے کیسی — ہے عمر دراز زندگی کی
سینے میں بجائے دل ہے پیکان — دل لیکے یہ آپنے دلدہی کی

گر پڑا ہاتھوں تک آکر میرے ساغر دیکھئے — بدنصیبی دیکھئے پھوٹا مقدر دیکھئے
بیٹھکر پہلو میں میرے وہ یہ کہکر اٹھ گئے — اس طرح بنتا بگڑتا ہے مقدر دیکھئے
غرض ہی کیا تھی جو کروٹ ادھر نظر لیتی — بلا میں ڈالکر اسکی بلا خبر لیتی
خوشی رقیب ہی کے پاس پاس رہتی ہے — کبھی تو آکے ادھر بھی مری خبر لیتی

اشک ہے مژگاں پہ روشن چشم تر کے سامنے — ہے ہماری آنکھ کا تارا نظر کے سامنے

خوشی بنکر مرے پھولوں میں آئے — گئے بو کی طرح بزم عزا سے

سب میں جل بھر کے جھلک اُنکی ادھر آئی ہے — آج قبضہ میں مرے جلوۂ ہرجائی ہے
آج باتوں میں تری درد کی بو آتی ہے — میں نہ مانوں گا کبھی چوٹ کہیں کھائی ہے
قدرداں بعد مرے اُسنے نپایا کوئی — میرے مرنے کی خوشی آپکے گھر آئی ہے
کیوں نہ آنکھوں میں جگہ دوں شبِ وصل آئے — مدتوں کی میری کھوئی ہوئی نیند آئی ہے
تابعِ حکم ہے چلتی ہے اشاروں پہ مرے — جب بُلایا ہے تو آنکھوں سے حیا آئی ہے

قطعہ بتصویرِ جاناں خطاب

بولتی کیوں نہیں بھلا تصویر — نہیں رکھتی زبان کیا تصویر
ہنس کے تو بجلیاں گرا مجھ پر — ہاں رُلا مجکو آج ہنس ہنسکر
میرے قابو میں اور یہ بیداد — نقش دیوار اور ستم ایجاد
ہاں خدا کے لیئے زباں تو کھول — میرے سر کی قسم تجھے کچھ بول
ہائے یہ خوشنما تری زلفیں — ہائے یہ دلربا تری زلفیں
نرگسیں چشم پر نثار غزال — ابرؤوں پر فدا ہزار ہلال
میری باتوں کا کچھ جواب تو دے — اِس خموشی کا ماجرا تو کھلے
بے زبانی میں تیری سو باتیں — خامشی میں ہزار ہا گھاتیں۔

رفیق

رفیق۔ ابو البرکات مولوی حبیب اللہ صاحب عرف آغا رفیقؔ خلف حاجی مولوی احمد اللہ صاحب بلند شہر کے رہنے والے حضرت داغ دہلوی کے شاگرد، ابتدائی عربی فارسی کی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی عربی کا سارٹیفکیٹ مدرسۂ مسجد فتحپوری دہلی سے حاصل کیا، طب کی تعلیم بھی پائی ہے، عربی میں اچھی استعداد اور لیاقت رکھتے ہیں، فلسفۂ مشرق و مغرب سے کمال شوق ہے نثر کے مضمون خوب لکھتے ہیں جو مشہور رسائل میں شائع ہوتے ہیں، شعر گوئی میں نیچرل رنگ زیادہ پسند ہے عاشقیہ بھی کہتے ہیں اور خاصہ کہتے ہیں، اساتذہ دہلی کے بہت مداح ہیں اُستادِ مرحوم کو بہت یاد کرتے رہتے ہیں اب ہاپوڑ میں رہتے ہیں، یہ اُنکا کلام ہے

غیر پر اپنا اثر پیدا کیا — جان دے کر یہ ہنر پیدا کیا

خالی نہیں رفیقؔ کی دیوانگی کا راز
بیساختہ وہ دیکھتے اُن سے لپٹ گیا

جو گذر جائے دم غنیمت ہے
کیا بھروسا ہے زندگانی کا
در پہ سائل کھڑے ہیں عرصہ سے
صدقہ للہ کچھ جوانی کا

کیوں آپ سے کہیں کہ خفا آشنا ہیں آپ
بس دل ہی جانتا ہے خدا جانے کیا ہیں آپ

واہ رے جذبِ محبت تری اُلٹی تاثیر
آج کس شوق سے وہ غیر کے گھر جاتے ہیں

غضب کی سادگی ہے بانکپن ہے جسپہ دلدادہ
خدایا خیر دلکی اُنکے ایامِ جوانی ہیں

نہ اتفاق کو چھوڑیئے ہاتھ سے ہرگز
خدا خدا نہ سہی رام رام کریں گے

متاعِ دل کا خریدار گر نہیں ملتا
ہم اُونے پونے بس اب سکے دام کریں گے

خدا کو مان بھی واعظ وہ چاندسی تصویر
ہمارے خانۂ دل سے بھلا نکلتی ہے

پاؤں پڑتا ہے جہاں مجنوں کا نوکِ خار پر
کہتی ہے لیلی کہ یہ کانٹا بھی میرے دل میں ہے

میرا دل لیکر نکرنا رنگ لائیگا ضرور
جھوٹ ہوگے وہاں بھی کیا خدا کے سامنے

رفیق

رفیق - جناب شیخ ملک قادر بخش صاحب منشی دفتر انسپکٹر جنرل رجسٹریشن حیدرآباد دکن تلمیذ حضرت سلام - حالاتِ زندگی نہیں ملے، کچھ اشعار انتخاب ہوکر درج ہیں -

میں آرزوئے خنجرِ قاتل میں رہگیا
ارمان دل کا ہائے مرے دلمیں رہگیا

بعدِ فنا لحد نے دی آغوش میں جگہ
لیلی کی طرح قیس بھی محمل میں رہگیا

ہدِ نظر نظارۂ عالم ہے رات دن
دیکھو سمٹ کے سارا جہاں تل میں رہگیا

اب خونِ بے گناہ سے مکریگا کس طرح
دھبہ لہو کا دامنِ قاتل میں رہگیا

ہزاروں تیر ہیں پیوست دامن دلمیں
غضب میں پڑ گئے آنکھیں لڑا کے یار سے ہم

رہینگی خاک میں بیتابیاں دلکی کبھی
مثالِ برق نکل جائینگے مزار سے ہم

رفیق

رفیق صاحبزادہ محمد رفیق خان برادر نواب صاحب بہادر والئ ٹونک نواب صاحب کے سب سے چھوٹے حقیقی بھائی ہیں، تعلیم و تربیت بنارس میں پائی تھی اپنے والد کے آخر عمر تک

اُنکے پاس رہے عرصہ سے عزلت گزیں ہیں چھ سات ہزار کی جاگیر بھی ہے۔

بہت دیکھے حسیں ہمنے نہ دیکھا آپ سا کوئی	ہمیشہ سے ہیں ہم بھی اچھی صورت دیکھنے والے
چھپائے لاکھ دل ہیں پر چھپائے سے نہیں چھپتی	ذرا میں تاڑ جاتے ہیں محبت دیکھنے والے

رفیق

رفیق مولوی عبدالمجید رامپوری نائب سررشتہ دار عدالتِ عیسیٰ گڈھ شاگرد آغا غمی، فارسی آغا محمد یوسف علی ایرانی سے تحصیل کی تھی اور اس زبان میں ملکہ راسخہ حاصل ہے، خوش فکر موزوں طبع شخص ہیں عمر ۵۰ سال سے متجاوز ہے۔

رخسار سے ہٹاؤگے زلفوں کے بال کب	دینگے اذان صبح کی حضرت بلال کب
ڈر ڈر کے پوچھتا ہوں میں قاتل سے اے رفیق	زخم جگر کو ہوگا میرے اندمال کب
شرم سے کرتے ہو کیوں نیچی نظر وصل کی رات	کون ہے میرے سوا کس کا ہے ڈر وصل کی رات
قتل ہو کر بھی کہاں جاتی ہے روح	خنجر قاتل سے دم پانی ہے روح
کھلا گل انگلیوں سے اسکی شمع طور کا یہ تو	کہ شعلہ کی طرح دل ہو گیا فی النار ٹپکی ہیں
جمائی لینے سے اسکے چمن میں تازہ گل پھوٹے	بنادے پھول غنچے کو وہ گل رخسار چٹکی ہیں

رفیق

رفیق حافظ محمد رفیق صاحب باشندۂ صوبہ بہار شاگرد حضرت کوثر خیر آبادی جو مشاعرہ سید ظفر نواب صاحب کی کوٹھی نواب منزل گیا میں ہوا اُس میں جو غزل پڑھی اُس کے چند اشعار درج ہیں۔

تاثیر شوق طالب دیدار دیکھنا	خود دیکھنے کو آئیگا اے یار دیکھنا
زاہد خیالِ حور بُھلادے تو کیا عجب	ہنسکر کسی حسین کا اے یار دیکھنا
چھپتی نہیں نگاہِ محبت کسی طرح	رسوا کرے گا یہ مرا ہر بار دیکھنا

رقت

رقت مرزا قاسم علی رقت انکے بزرگ عراق اور مشہد کے رہنے والے تھے اور قوم کے مغل انکا جائے مولد شاہجہاں آباد تھا لیکن بہ فیض آباد میں سنِ تمیز کو پہنچے اور جوانی لکھنؤ میں گزاری صاحب دیوان تھے، پہلے حسرت اور پھر جرأت کے تلمذ سے فیضیاب ہوئے تذکرۂ شوق

ہیں انکا ذکر اور کلام نظر سے گزرا، یہ چند شعر اُنکے ہیں - ایک دوسرے تذکرہ میں انہیں کا نام رستم علی درج ہے

لباسِ سُرخ جب سے تو نے ہی اے گلبدن پہنا
ہر اک عاشق نے قبل از مرگ ہی رنگین کفن پہنا

لچکتی تھی کلائی بوجھ سے تعویذ کے پیارے
نزاکت کا یہ عالم ہے تو نے نورتن پہنا

اُس طرف وہ ہاتھ سے دامن چھڑا جانے لگا
اِس طرف چاکِ گریباں پاؤں پھیلانے لگا

ہوش کی اپنے خبر لے تجکو رقت کیا ہوا
اُسکے جاتے ہی تجھے کیا غش پہ غش آنے لگا

ہاتھ اُس سینہ پہ میں از راہِ نسیاں رکھدیا
بدگماں لوگوں نے کچھ کچھ مجھپہ بہتاں رکھدیا

پڑ گیا تھا آنکھ میں کچھ میری میں رونا نہ تھا
مجھپہ یہ ناحق پیارے تم نے طوفاں رکھدیا

یار کی مژگاں نے منہ پھیرا جو میرے قتل سے
اُسکے آگے تیر کا اک میں نے پیکاں رکھدیا

کہتے ہیں جدول کلام اللہ کا خط کو ترے
نام اُس کافر کا یہ کس نے مسلماں رکھدیا

خط وہ بھیجے رقیب کا لکھا
یہ بھی اپنے نصیب کا لکھا

ہمارے سامنے مت ابر بار بار برس
جو ہمسے ہو سکے تجھ سے نہو ہزار برس

پھنس گیا یہ آپسے اُسنے تو لپٹایا نہیں
ہے گناہ دل عزیزو کچھ نہیں تقصیر زلف

ہے پریشان دلکی اپنے اب خبر رقت ذرا
بے طرح اب ہوگئی ہے اسکو کچھ تاثیر زلف

ہے دلِ بیتاب میرا خصم جان زیر بغل
وہ مثل مجھ پر ہوئی دشمن کہاں زیر بغل

دیا اک بوسہ پنہاں اُسنے ہمسے رات لیکر دل
سو ہم بھی یہ سمجھتے ہیں حسابٌ دوستاں در دل

قطعہ

تجھے پہلو میں پالا تھا اِسی خاطر
کیا رُسوا مجھے تو نے ستمگر دل ستمگر دل

یہی کل بیٹھے بیٹھے آئی میرے دلمیں اے رقت
کہ مِل آؤں نہیں مجھ سے گیا ہے آہ ملکر دل

گیا جو کوچہ دلبر میں وہاں اور ہی تماشا تھا
پڑے تھے سینکڑوں اُس جا پہ چاک و خوں میں لتھڑے دل

لگا کرنے تجسس میں تو دیکھا ایک گوشے میں
پڑا ہے گا بصد غربت مرا بھی زار و مضطر دل

لگا حسرت سے مجکو دیکھنے وہ اور میں اُسکو
دل من گریہ بر من کرد و من ہم گریہ ہا بر دل

دو رنگے اُس پہ سب نادان و دانشمند ہوتے ہیں
یہ عالم اُس کا دیکھا ہے کہ رستے بند ہوتے ہیں

جس میں جو بات سمائے وہ بھلا جائے کہاں	حسن آخر ہوا اُس کا پہ ادا جائے کہاں
یہ کس کا رقص دیکھ آیا دلا تو	کہ بیٹھا زندگی سے ہاتھ اُٹھا تو
نشانِ غیر کو وہی ہے تو پہلے	نشانِ زندگی میرا مٹا تو
تو نہیں دیتا لگانے سینہ پر چھاتی پہ ہاتھ	اِس لئے غم سے چلا جاؤنگا دھر چھاتی پہ ہاتھ
چھٹ جائے کسی سے نہ ملاقات کسی کی	اللہ بگاڑے نہ بنی بات کسی کی
آنکھوں میں بنی تُنے سرمہ نہیں دیا ہے	کہتے ہو تم جو یار و ناحق کا طوطیا ہے
دیوار گلرخاں کا سایہ مگر پڑا ہے	زاہد بتا تو مجھکو طوبیٰ میں شاخ کیا ہے

رقت مولوی حافظ حبیب النبی تلمیذ رحمت۔ تاذکرۂ قاضی خلیل سے کلام لیا گیا۔

مثل حباب کھولتے ہی آنکھ تھی فنا	ہمکو دم نخست دم واپسیں ہوا
آئے گر رُو بروشب ہجراں	صبح کر دینگے داغِ روشن سے
اپنی آنکھوں سے بانگہ سے تری	سینے میں پڑگئے ہیں روزن سے

رقت مولوی حبیب الٰہی رقت مرحوم معاون مدرسۂ عالیہ کلکتہ باشندۂ رامپور ۱۲۶۱ھ میں ۵۳ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ یہ اُنکی طبع موزوں کا نتیجہ ہے ✤

دوسرے کا سوگ کیجے ایک کا غم ہو چکا	اب جگر کو روئیے دل کا تو ماتم ہو چکا
ہم تو گل کھا کے مُوئے اور وہاں غیروں کو	جاتے ہیں تا تبلک اپنے اُسی معمول پہ پھول
اپنی تربت پہ نہیں مارتا پتھر کوئی	چڑھتے ہونگے کسی اللہ کے مقبول پہ پھول
زندگی گر عذاب ہے تجھ بن	موت بھی تو خراب ہے تجھ بن

رقت سید علی محمد خلف سید غلام محمد شاگرد سید شبیر علی اسد باشندۂ جالندھر۔ اوائل عمر ہی سے مذاقِ سخن طبیعت میں ہے۔ بزرگوں اور قادر الکلاموں کی صحبت سے فیضیاب ہونیکے شوقین ہیں۔ نوعمر اور نو مشق شاعر ہیں۔ تقریباً چوبیس پچیس برس کا سن ہے۔ آپ گورنمنٹ پریس شملہ میں کلرک ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

کیونکر نہ اشتیاق ہو ابرو کی دید کا
رمضاں کے بعد چاند یہ نکلا ہی عید کا

چھوئی جو میں نے خواب میں اسکے ناز کی
بے کل رہی صنم کی کلائی تمام رات

جذبۂ شوق تو ہی کھینچ کے لاوے اُنکو
ورنہ مرجائینگے ہم اُنکو خبر ہونے تک

قطرۂ آب تھا اللہ جو چاہے کر دے
پہلے کیا تھا کوئی پوچھے یہ گہر ہونے تک

روتا ہوں یاد عارضِ گلرنگ یار میں
لالہ کے گل پروتا ہوں شکوں کے تار میں

نکلی ہماری روح جو فصل بہار میں
بوبُو کے رنگئی ترے پھولوں کے ہار میں

اُس شعلہ رُو کے عکس کی تاثیر دیکھنا
چھالے سے پڑ گئے کفِ آئینہ دار میں

چُھپکر کدھر کو جاؤگے میدانِ حشر میں
پہچان لونگا تمکو تو سو کیا ہزار میں

شرارت کے یہ معنی ہیں شرارت اسکو کہتے ہیں
ہمارے چھیڑنے کو وہ عدو کا نام لیتے ہیں

مژدۂ فصل بہاری ہے صبا لائی ہوئی
پھرتی ہی بلبل جو اک گل پہ اترائی ہوئی

رقم حکمت مآب فضائل اکتساب صاحب پایۂ ارجمند حکیم سکھانند رقم کایستھ باشندۂ دہلی محلۂ دھرم پورہ میں سراوگیوں کے بڑے مندر کے قریب رہتے تھے، فضیلت علمی کے ساتھ شعر بھی عمدہ کہتے تھے طبابت میں وحید العصر اور فن شعر میں شاہ نصیر مرحوم کی شاگردی سے بہرہ ور تھے۔ مرض کی تشخیص کا یہ عالم تھا کہ صورت دیکھکر مرض کو دریافت کر لیتے تھے ایام ضعیفی تک اپنی اوقات فارغ البالی اور مرفعۃ الحالی سے بسر کرتے رہے انکو علم نجوم اور رمل میں بھی عمدہ مہارت تھی، اور اس فن کو حکیم مومن خان مرحوم سے کسب کیا تھا، کتب درسیہ فارسی و عربی مختلف اُستادوں سے پڑھیں، اور مدت تک طالبانِ کمال کو پڑھائیں حق پسند و حق شناس تھے، سراپا کمال وجاہت ظاہری و باطنی سے پیراستہ تھے، وضع ایسی رکھتے تھے کہ خاص و عام کی نظروں میں آداب احترام قائم کرتی تھی۔ ہمیشہ خوش پوشاک خوش لباس رہتے، اور اس میں سدا ایک ہی وضع کی پابندی کی۔ ان کمالات پر مزاج میں مسکینی و غربت بدرجۂ کمال تھی، اور حلیم الطبعی و سلیم المزاجی بردباری

ملنساری، خوش اخلاقی میں یگانۂ آفاق تھے، لوگوں سے سُنا ہے کہ عنفوانِ شباب میں انکا یہ حال تھا کہ بغیر اچھی صورت دیکھے رہ نہ سکتے تھے خود بھی شکیل تھے اور حسینوں کو چشمِ محبت سے دیکھتے متانت کے ساتھ مزاج میں ظرافت بھی تھی اور خوش طبعی سے یارانِ ہم جلیس کے دلوں میں گھر کر لیتے تھے، ہر فرد بشر کے ساتھ نہایت خلوص سے پیش آتے جو لوگ انکی صحبتوں کا لطف اُٹھائے ہوئے ہیں وہ ابتک اُن کو یاد کرتے ہیں، بعد ایامِ غدر بسبب دل شکنی و مایوسی اُمورِ دنیوی سے دست بردار ہو گئے، خانہ نشینی اختیار کی تھی البتہ مطب جاری تھا، المختصر تریسٹھ برس کئی مہینے زندگانی بسر کر کے ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا، فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، دیوان تو غدر میں تلف ہوا مگر صدہا متفرق کاغذات پر غزلیات و اقسام کلام سے شعر انکے بیٹے کے پاس موجود تھے، اِنکے پوتے حکیم امیر سنگھ جو مدرسہ طبیہ دہلی کے پہلے ہندو سند یافتہ اور حکیم حاذق الملک عبد المجید خاں کے رشید تلامذہ میں سے ہیں اب آبائی مطب کے جانشین ہیں۔ یہ چند اشعار انکے نتائج افکار سے ہیں۔

جہاں میں کون سا ہمکو ہنر نہیں آتا
لگا کے دل کا چھڑانا مگر نہیں آتا

بجھانا آتش دل کا بھی کچھ حقیقت ہے
ذرا سا کام تجھے چشمِ تر نہیں آتا

عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملحق ہے
گیا اُدھر جو گذر پھر اِدھر نہیں آتا

یہ لاغری نے سکھایا کہ جسم زار مرا
اجل کو بسترِ غم پر نظر نہیں آتا

ہو خاک چارہ گری اُس مریض کی تیرے
نظر میں تجھسا کوئی چارہ گر نہیں آتا

سرِ مزارِ شہیدانِ شوخ آہو چشم
رقم طواف کو کب شیر نر نہیں آتا

دھوکے میں ہی نظر تنِ لاغر کو دیکھکر
سو بار خالی پھر گئی بستر کو دیکھکر

رُخ پر تمھارے کان کے گوہر کو دیکھکر
حیران ہے خلق ماہ پہ اختر کو دیکھکر

بے دیکھے دیکھتا ہوں نیا داغ دیکھنا
کیا جانے حال کیا ہو ستمگر کو دیکھکر

سیماب ہمسری کرے کیا بلکہ برق بھی
کیونکر نہ سر بزانو ہوں غیرت سے رشکِ حور
اس تشنہ لب کو شوقِ شہادت ہے یا نشک

مانگے ہے الاماں دلِ مضطر کو دیکھکر
زانو پہ تیرے غیر کے ہم سر کو دیکھکر
تر سے ہے آبداری خنجر کو دیکھکر

نہ تو زور ہے مجھ میں جو دیکھوں اُسے نہیں زر ہے جو پاس بلاؤں اُسے
کہو کیونکہ میں راہ پہ لاؤں اُسے کوئی ملنے کی اس سے تو راہ ہی نہیں

مرے درد کی تجکو ہو کیونکہ خبر مرے آہ کا دل پہ ہو کیونکہ اثر
تری عیش میں گذری ہے رشکِ قمر کبھی عشق سے کام پڑا ہی نہیں

کبھی گھر سے نکل مرے ماہ لقا ذرا عاشق زار کے پاس تو آ
مرے حال کو دیکھ ہوا ہے یہ کیا مرے مرنے میں کچھ تو رہا ہی نہیں

مری نبض کو دیکھ طبیب ہم لگے مل کے یوں کہنے برنج و الم
نا حق کو دوائیں کرو ہو قمر میاں ایسا مریض سنا ہی نہیں

مجھے لاکھ جلا مجھے لاکھ ستا ترے در سے ہٹوں گا نہ میں بخدا
رہوں پٹ سے لپٹ کے میں تیرے کھڑا کبھی ہٹ سے میں اپنی ہٹا ہی نہیں

وفورِ شوق میں رُخ کے لئے وہاں کے لیئے
نہیں تمیز کہ بوسے کہاں کہاں کے لیئے

ہچکیوں نے بھی مری یاد دلائی نہ انھیں
بیٹھے گننے کو جو بوسے تو عجب لطف اٹھا
مدعا غیر کا چاہا تری چاہت کے سبب
اپنے غش آنیکے صدقہ ہوں کہ اُنسے بے مہر
سچ ہے نسیان و خطا سے ہو مرکب انسان
ولکی جب یاد دلاتا ہوں تو کہتے ہیں قمر

نام سب سب کا لیا نام مرا بھول گئے
بھولنا یاد رہا یاد جو تھا بھول گئے
مانگنی اپنے خدا سے بھی دعا بھول گئے
ایسے گھبرائے حواس ہوش ربا بھول گئے
باعثِ فکر بتاں ذکرِ خدا بھول گئے
گم ہوا، کھو گیا، یا جاتا رہا بھول گئے

رقیب منشی محمد ظہیر حسن مدرس بھیرا قصبہ ضلع فتحپور ۱۹۲۳ء کے نتائج افکار کا خلاصہ

درج ذیل ہے:

بنا یہ سبحۂ زنّار میں رشتہ ہوا کیوں ہے	مرے دلکو تمنائے بتانِ بیوفا کیوں ہے
تصوّر روئے جاناں کا ہے ہر دم کعبۂ دل میں	پریشاں طائرِ دل صورتِ قبلہ نما کیوں ہے
مصلّے پر تو بیٹھا ہے نظر ہے ماہرویوں پر	بتا اے زاہدِ مکّار دل میں یہ ریا کیوں ہے
خدا کو ہمنے جب ڈھونڈا تو پایا خانۂ دلمیں	پریشاں [illegible] ہی اُسکی بہر خلق خدا کیوں ہے

رُکن

رُکن، منشی سیّد غلام نبی، منشی عابد علی کوثر خیر آبادی سے تلمّذ ہے اور یہ کلام کا خلاصہ ہے

ڈھلی مے آج ساقی کی دُوکاں پر	گھٹائیں آگئی ہیں آسماں پر
اُمید و یاس میں جھگڑے پڑے ہیں	فقط انصاف ہے اب اُنکی ہاں پر
حلب آئینہ رُخ پر تصدّق	عدن صدقے لبِ گوہر فشاں پر
اُٹھے کس طرح بارِ زندگانی	گراں ہے جسم جانِ ناتواں پر
کوئی دیکھے یہ واعظ تو نہیں ہے	چُھپائے مُنہ کھڑا مے کی دُکاں پر

رمز

رمز دہلوی، مرشدزادۂ آفاق صاحبعالم و عالمیان مرزا فخرالدین فتح الملک بہادر رمز معروف بہ میرزا فخرو ولیعہد دومی حضرت ظلِ سبحانی بہادر شاہ ثانی، صاحبعالم کی شادی اپنے حقیقی چچا میرزا جہانگیر کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ مرزا ابوبکر مرحوم جو غدر میں مارے گئے اُنھیں کے بطن سے تھے ۱۲۶۹ھ میں ولیعہد ہوئے "چراغ دُنیا" مادۂ تاریخ نواب ضیاءالدین خان نیر رخشاں نے نکالا، حضرت رمز کی اوّل تو شاہی زبان اُسپر خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کی شاگردی کا طرّہ خود ہی گویا ہے کہ انکا کلام کس درجہ فصیح و بلیغ ہوگا، اِنکے اشعار میں عجب لطف انگیز چوچلا ہے، میٹھی میٹھی باتوں سے چُٹکیاں لینا اشاروں ہی اشاروں اور رمز کنایوں میں مطلب ادا کرنا اِنہی کا کام ہے، کیوں نہو پیدایش کہاں کی تھی، تربیت کہاں اور کن بزرگوں کے زیر نظر پائی تھی؟ اُس شاہجہان آباد کے قلعۂ معلّی میں جو ہمیشہ سے زبانِ اُردو کا مولد اور ملجا رہا تھا جہاں کی زبان ہر ایک شہر و

دیار میں مستند سمجھی جاتی تھی عجب طبیعت تھی اور غضب کی رسائی تھی، خاندان تیموریہ کے چشم و چراغ اور سپہر سلطنت کے درخشاں مہتاب تھے، سرکار انگلشیہ نے اُنکے وجہی حقوق کو تسلیم کرکے خاص عہدنامہ کرلیا تھا جس سے مشرح اور واضح طور پر یہ تعین ہوگیا تھا کہ بعد وفات بہادر شاہ یہی اُنکے جانشین قرار پائیں گے مگر مرضی پروردگار یوں نہ تھی۔ چالیس برس کی عمر پاکر ۱ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرض ہائے ہیضہ میں مبتلا ہوکر راہی ملکِ بقا ہوئے "کیتہ مرزا فتح الملک ولیعہد" تاریخ وفات ہے دیوان مرتب ہوگیا تھا، مگر غدر میں تباہ ہوگیا، ایک مثنوی خوب لکھی تھی جو میرے کتبخانے میں موجود تھی مگر اتفاق سے تلف ہوگئی۔ ایک واسوخت جو غدر سے پیشتر چھپا تھا میرے پاس اتبک موجود ہے بڑی تلاش سے چند غزلیں ملیں جو ہدیۂ ناظرین کیجاتی ہیں، مرزا خورشید عالم اور مرزا فرخندہ جمال آپکے بیٹے دہلی میں رہتے ہیں اور راقم تذکرہ کے عنایت فرما ہیں، مرزا خورشید عالم بہادر خود بھی فکر سخن فرماتے تھے افسوس کہ ستّر برس کی عمر پاکر دسمبر ۱۹۱۲ء میں بمقام رامپور انتقال فرماگئے، اُنکی وفات سے گویا خاندان تیموریہ کی رہی سہی وقعت جاتی رہی۔

دل مرے سینے میں یہ کوئی ستم پیدا ہوا	جب سے دل پیدا ہوا ساتھ اُسکے غم پیدا ہوا
دل میں آتی ہے نظر اپنے مجھے تصویر یار	کیا تماشا ہے کہ کعبہ میں صنم پیدا ہوا
ہے میرا سینہ کہ یارب کوئی دارالضرب عشق	داغ جو پیدا ہوا شکل درم پیدا ہوا
اپنی صورت آئینہ میں دیکھکر کہتا ہے وہ	کوئی دنیا میں حسین مجھسا بھی کم پیدا ہوا
مجھ سے کی پہلو تہی بیدردُ نے جس روز سے	درد پہلو میں ہمارے دمبدم پیدا ہوا
دیکھتے ہیں سارے عالم کا تماشا دل میں ہم	ساغرِ دل اپنا رشکِ جامِ جم پیدا ہوا
میں وہ مجنوں ہوں کہ جسکے باغ جنت میں بھی رمز	خارِ صحرائے جنوں زیرِ قدم پیدا ہوا

کیا قتل ظالم نے کس کس ادا سے	ملا مجھکو قسمت سے جلاّد اچھا

آنکھیں تو اُسکو دیکھ کے ہوتی ہیں بیقرار	بن دیکھے دل تڑپنے لگا اسکو کیا ہوا
سب کچھ آساں ہے تجھے گردش دوراں کرنا	ایک مشکل مری مشکل کا ہے آسان کرنا

ہوا شوقِ تماشا جب سے تیرے روئے نیکو کا
ڈھونڈو گے جان کو بھی محبت کی راہ میں
نہ ہیں قابو میں ہوں ڈھلکے نہ دل ہے صبر قابو کا
پھرتے ہو رمز دل کی ابھی جستجو میں کیا

طرزِ رفتار نے تری ظالم
رفتہ رفتہ مجھے تمام کیا
ہیں جو رسوائے زمانہ ہو گیا
اسکی شہرت کا بہانہ ہو گیا
جا پڑے ہم کوچۂ جاناں میں رمز
بارے اپنا بھی ٹھکانا ہو گیا

دلِ بیتاب ہو کیا تجھ سے رفاقت کی امید
کوئی ہوتا ہے بُرے وقت میں جو تو ہو گا

بل کچھ ایسا کاکل خمدار میں پیدا ہوا
پیچ و تاب اپنے دلِ بیمار میں پیدا ہوا
کٹ گئے دن رنج و غم کے بلکہ ساری عمر کے
کاٹ یہ اچھا تری تلوار میں پیدا ہوا
واہ وا کیا ترے ہر گام پر محشر خرام
فتنہ تازہ اک تری رفتار میں پیدا ہوا
بل بے جوشِ گریہ بیدرد و فورِ اشکِ خوں
ایک طوفاں دیدۂ خونبار میں پیدا ہوا
کشتگانِ ناز زندہ ہو گئے اک بات میں
معجزہ اچھا لبِ دلدار میں پیدا ہوا
لکھ غزل اے رمز تبدیلِ قوافی میں کوئی
اور عالم اب ترے اشعار میں پیدا ہوا

لیگئی دل جو تری کاکلِ پیچاں میرا
تا دمِ مرگ رہا حال پریشاں میرا
چھوڑوں کسطرح سے میں دامنِ صحرا کو جنوں
خارِ صحرا ہی نہیں چھوڑتے داماں میرا
رمز اُس آئینہ رو کی کوئی کیا جانے ہے رمز
یا تو میں جانتا ہوں یا دلِ حیراں میرا

غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا
درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
تیز کرتے ہیں وہ چھری کو ابھی
قتل پر میرے اکتفا نہ ہوا
حال کھل جائیں غیر کو سارے
پر کروں کیا کہ تو میرا نہ ہوا
درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر
بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا
وہ تو ملتا مگر دلِ کم ظرف
تجکو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
مر گیا ہجر میں جو بن آئی
شکر منت کشِ قضا نہ ہوا

شکوۂ یار اور زبانِ رقیب
کھیل ٹھیرا کوئی گِلا نہ ہُوا

یار آیا نہ موت ہی آئی
ایک بھی رمز مدعا نہ ہُوا

تم رہو اور مجمعِ اغیار
میرا کیا ہے ہُوا ہُوا نہ ہُوا

پھر تمھارے ستم اُٹھانے کو
رمز اچھا ہُوا بُرا نہ ہُوا

دل دیا تھا جسے دلدار سمجھ کر میں نے
رمز اب وہی دلِ آزار ہوا ہائے نصیب

اور صورت سے کیا غرض ہے رمز
ہے پسند اپنے یار کی صورت

غم کے آثار خوشی میں بھی ہیں دیکھو موجود
جو کہ ہنستے ہیں بہت اشک بہاتے ہیں بہت

حال سُن سُن کے عشق میں تیرا
رمز کرتے ہیں خاص و عام افسوس

ذبح ہو ناحق میں میرے ہے حیاتِ جاوداں
آبِ خنجر میں ترے ہے آبِ حیواں کا خواص

جل گیا پروانہ تو یہ بھی سحر تک ہے تمام
فاصلہ اک شب کی شب کا درمیاں رکھتی ہے شمع

کیسی زمیں کہ غرق ہوا آسماں تلک
اے گریہ اب یہ جوششِ طوفاں کہاں تلک

جس میں نہ جذب ہو، [illegible] نہ درد ہو
اِس دل کو رکھ کے سینے میں پھر کیا کرینگے ہم

بیتابیوں سے اِس دلِ خانہ خراب کی
کیا کیا کیا ہے، اور نہ کیا کیا کرینگے ہم

دردِ فراق، طعنِ عدو، فکرِ دوستاں
اِس ایک جان پر مری کیا کیا بلا نہیں

اے دلِ بیتاب اتنا اضطراب
صبر تجھ پر اور تو میں کیا کہوں

کیوں نہ دوں زخم کو جگہ دل میں
کیا یہ قاتل کا یادگار نہیں

ہمکو کیا غیر کے آنے کی خبر
چٹکیاں نقشِ قدم کھاتے ہیں

خو کردۂ رفتار ترا بعدِ قیامت
یہ بھی تو نہ جانے کہ قیامت ہوئی کس دن

یاں یہ حالت کہ دم لبوں پر ہے
واں یہ غفلت کہ کچھ خیال نہیں

لب ہلے کیونکہ تیری مجلس میں
دیکھ کر تجھکو جان ہے کس میں

نہ حرم میں جگہ نہ دیر میں جائے
ہم سے گنے جائیں یا خدا کس میں

ذبح کر خواہ چھوڑ دے صیاد
آ پھنسے ہم تو اب ترے بس ہیں

چوسے لب میگوں دم خواب ایسے مزے ہیں
پی تھی نہ کبھی ہیں نے شراب ایسے مزے ہیں
ساقی مری توبہ کے ٹھہرنے کے نہیں پاؤں
گر جھوم کے آئیگا سحاب ایسے مزے ہیں

رمز وہ مستِ ناز ہے فتنہ
اسکو سونے دو کیوں جگاتے ہو
تم نہ جاتے غیر کے گھر میں شب کو
بس چلو یونہی سہی جانے دو
اُسکے آنے کی اگر کوشش ہیں
جاں جائے جو چلی جانے دو
مُنہ دکھانا ہے خدا کو اک دن
اے بتو اتنی خودی جانے دو
ہر سخن میں یہ کجی جانے دو
ہو چکی بس خفگی جانے دو
شُکر و شکوہ سے تعلق نہ رکھو
نبھ سکے جیسے تبھی جانے دو
رمز الفت میں جو چاہو آرام
تو یہ راحت طلبی جانے دو

تیر مارا ہے تو ظالم تو چھُری بھی پھیر دے
یہ بھی حسرت رہ نجائے اِس ترے نخچیر کو
پیٹوں جنوں میں سر کو کہ روکوں سرشک کو
تھاموں قلق میں دل کو کہ رکھوں جگر پہ ہاتھ

شوق کہتا ہے کہ چل اور ضعف سے
اُٹھ نہیں سکتا قدم کیا کیجئے
کیا جانے آج دل کو مرے ہو گیا ہے کیا
پہلو میں یار اور لے سے اضطراب ہے
ہاتھوں سے ترے بچا نہ وہ بھی
اک رمز تھا جاں نثار ہے ہے
رمز ہیں صورت پہ اُسکی شیفتہ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

کیوں نہ لب حسرت سے کاٹوں ہیں کہ میرے سامنے
بوسہ اُس لب کا لیا جام شراب ناب نے
الٰہی موت تو ہو گی مگر یوں ہو تو بہتر ہو
کہ سر ہو پاؤں پر قاتل کے اور سجدے میں دم نکلے
بعد مُردن بھی نہ چھوٹا ہم سے ذوقِ میکشی
خاک سے اپنی سبُوئے مے بنے ساغر بنے

ہجنے تو غم یار میں یوں عمر بسر کی
مر مر کے جو کی شام تو رو رو کے سحر کی
ایسا لگا وہ تیر نگہ تم کہ ہو بلبند
ہر زخم دل سے میرے صدا واہ واہ کی

نہو جب ضعف سے طاقت کہ آئی جان ہو تنگ | تو ہمسے ناتوانوں کا کہو کس طرح دم نکلے

دل لے تو گئے ہیں وہ ہمارا
پر دیکھیے اِسکو کیا کرینگے
یاد بت میں عمر گزری یہاں تو رمز
کہا کہو گے وہاں خدا کے سامنے
ہوئی صورت نہ کچھ اپنی شفا کی
دوا کی مدتوں برسوں دعا کی
ہمیں منظور آج انکو بلانا ہے بلانا ہے
بلا کر داغ دل اپنا دکھانا ہے دکھانا ہے
ہجوم داغ دل کیا پوچھتے ہو میرے سینے میں
خزانہ ہے خزانہ ہے خزانہ ہے
جگر مرا تری تیغ نگہ کا ایک مدت سے
نشانہ ہے نشانہ ہے نشانہ ہے
ہنسو کیونکر نہ غیروں سے کہ منظور آپ کو میرا
رلانا ہے رلانا ہے رلانا ہے
شہادت سے مری ابتک نہ بان تیغ قاتل پر
فسانہ ہے فسانہ ہے فسانہ ہے
نہ بھیڑ کے دلمیں آگ اور کیوں آنسو نہ جاری ہوں
کہ شیوہ وہاں رقیبوں کا لگانا اور بجھانا ہے

رمز ۔ منشی محمد ابراہیم خان خلف مولوی محمد خان صاحب مرحوم داروغہ و ڈائرکٹر محکمہ رسائل ریاست ٹونک، نواب محمد اسد خان آسد لکھنوی کے شاگرد ہیں، چالیس پینتالیس برس کا سن ہے اور یہ کلام کا نمونہ ہے ۔

وحشت میں ہم سمٹتے پھرتے ہیں جابجا
صحرا کے خار کوہ کے پتھر چمن کے پھول
بے قدر کی نگاہ میں اے رمز ایک ہیں
صحرا کے خار ہوں کہ ریاض سخن کے پھول
کیوں کرتے ہو برباد اسے مفت میں دیکھو
اے رمز کبھی جا کے جوانی نہیں آتی
یہ بزم عام ہے اچھی نہیں اس جا نظر بازی
بھلا ایسا بھی کیا کرکچھ تو غیرت دیکھنے والے
حسیں پیدا کیے اس عالم ایجاد میں کیا کیا
خدائی کا تماشا دیکھ قدرت دیکھنے والے
فقط ہم تم ہوں اور کوئی نہو جب لطف صحبت ہے
شب وصل اسکو جانے دو یہ آنکھوں سے حیا کیوں ہے

رمز ۔ منشی برج بہاری لال رمز مراد آبادی علمی استعداد خاصی ہے بارہ پندرہ برس سے مشق سخن کرتے ہیں اور منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے بارادت تلامذہ میں ہیں ۔

اپنی طباعی اور خوش فکری کی وجہ سے ہم مشق شعرا میں ممتاز ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو۔

ہائے پتھرا گئیں آنکھیں مری تکتے تکتے | دم آخر بھی نہ وہ شوخ ستمگر آیا
مرگیا پاس وفا میں مجھے دیکھا تو نے | معجزہ اب تو دکھا کوئی مسیحائی کا
اے رمز تیر یار نشانی سے کم نہیں | پہلوئے دل میں رکھیے لگا کر جگر کے پاس

کب روح کو فنا ہے بدن کی فنا کے ساتھ | پتا کہاں ہے رنگ حنا کا حنا کے ساتھ
دل کی لگی بھڑکتی ہے آہ رسا کے ساتھ | اٹھتے ہیں جیسے آگ کے شعلہ ہوا کے ساتھ
ہو لطف مے دو چند جو ساغر سے لب ادھر | آنکھیں ادھر ملیں کسی نازک ادا کے ساتھ
پازیب کی صدا ہے تمھاری کہ شور حشر | فتنے ہزاروں اٹھتے ہیں آواز پا کے ساتھ

رمز اب روتے ہو کیا دلکو جگر کے سامنے | کیوں گئے سینہ سپر تیر نظر کے سامنے
ہے تصور میں بھی انکے کس قیامت کی حیا | سامنے ہیں اور نہیں آتے نظر کے سامنے

اک وار میں دو ٹکڑے کئے دل کے جگر کے | قائل ہیں ہم اس جوہر شمشیر نظر کے
کمسن ہی کہیں سہم نجائے وہ دم قتل | اے زلف تو آجا رخ قاتل پہ بکھر کے
دیکھا نہ کبھی پیار کی آنکھوں سے ادھر حیف | مجکو نہ دیا آپنے ساغر کوئی بھر کے
نرکھوں کیوں کلیجے سے لگا کر | یہ داغ دل مجھے اسنے دیا ہے

رمز۔ مرزا جلال الدین حیدر عرف حکیم ممتاز حسین دہلوی شاگرد مضطر بنارسی ۱۸۹۹ء میں مظفر پور بہار میں مطب کرتے تھے۔ اور حال معلوم نہ ہوا یہ چند شعر انکے ہیں۔ رمز

پس پردہ جو میرے شمع رو کا نور رخ پھیلا | مجھے عالم نظر آیا چراغ زیر داماں کا
ذریعہ ہمکو بخشش کا بتاتا ہے کرم اس کا | خدا سے منفعل ہوکر تو کر اقبال عصیاں کا
شکر ہے لب پہ ترے شکوۂ فریاد آیا | خیر میں تجکو کسی طرح سے تو یاد آیا
فاتحہ پڑھنے جو وہ بانیٔ بیداد آیا | قبر میں تجکو قرار او دل ناشاد آیا
انکار ہے جو بوسوں کے دینے میں آپکو | ہمسے بھی پھر حضور نہوں تو تنگ دل

داغ جگر شگفتہ ہیں لالہ سے بھی سوا	او گلعذار دیکھ تو آکر بہار دل

رمز

رمز۔ منشی بلاس رائے رمز شاگرد شوکت باوجود دریافت کچھ حال معلوم نہ ہوا کلام مطبوعہ کا انتخاب حاضر ہے۔

کشتۂ تیغ محبت کو جلاتے جاتے	کیا بگڑتا جو ذرا لب کو ہلاتے جاتے
کیا مزا ہوتا جو در کا ترے پتھر ہوتا	ٹھوکروں ہی میں تری رہتا میں آتے جاتے
شربت وصل گر نہ تھا مری قسمت میں	شربت مرگ ہی وہ مجکو پلاتے جاتے
رمز بیچارہ ترے عشق میں مرتا ہی رہا	حال بھی تُو نے نہ پوچھا کبھی آتے جاتے
قسمت جن و ملائک میں کہاں ہیں یہ مزے	ماہوش کیا کیا بنائے حق نے آدم کے لیے

رمز

رمز۔ میر فاضل حسین صاحب لکھنوی شاگرد مشتاق لکھنوی، موجودہ شعرا میں ممتاز ہیں۔ افسوس کہ باوجود دریافت حالات میسر نہ ہوئے۔ کلام بہم رسیدہ کا انتخاب درج کیا جاتا ہے

بے خبر موسیٰ کو کب تھی شوق تھا دیدار کا	برق بن جائیگا ان آنکھوں میں جلوہ یار کا
ابر الطاف خدا برسا جو ابراہیم پر	آتش نمرود تختہ بن گیا گلزار کا
ہے قضا قبضے میں میرے قاتل سفاک کے	ہے اجل کا اک طمانچہ وار اس تلوار کا
سجدے کرتے ہیں ہزاروں اشتیاق ذبح میں	ہے خم محراب کعبہ خم تری تلوار کا
ہے آئینہ میں وہ رخ گلرنگ جلوہ گر	دریا میں یا کہ عکس پڑا ہے گلاب کا
دی کیوں تڑپ کے جان عنادل نے باغ میں	کانٹا لگا زبان میں شاید گلاب کا
اُٹھتے ہی آپکے سب مٹ گئے اسباب طرب	بزم عشرت نہ رہی عیش کا ساماں نہ رہا
دلچسپ ہے اس درجہ ترا حسن مصفا	عارض سے نگاہوں کو پھسلتے نہیں دیکھا
مآل سبحہ و زنار کا نہیں ہے جدا	کہ ایک ہی ہے خدا شیخ اور برہمن کا
نہ بیٹھیے آنکے رندوں میں اسقدر اے شیخ	جھکائے آپ ہیں گردن کہ ڈھل گیا منکا
جو پوچھا گھر کا نشاں اُس شریر دشمن سے	پتا بتا دیا ہنسکر مکان دشمن کا

وہ نہ آئیں گے شب وصل یقیں ہے مجھکو
تو ہی اے موت مرے پاس ذرا ہو جانا

کس کا دل بجھ گیا ہے شمع سحر کی صورت
ہنستے ہنستے جو ہوئی ہے تری محفل خاموش

خواب سے چونکی زلیخا جب تو کہتی تھی یہی
چھپ گیا نظروں سے وہ میرا مہ کامل کہاں

طائر دل کو پھنسا کر دام گیسو میں وہ شوخ
بھولے پن سے کہہ رہا ہے تمہارا دل کہاں

ایکدم بھر کو اٹھا دو رخ روشن سے نقاب
حسرت دیدار میں عاشق کو تڑپاتے ہو کیوں

ہے ابتدائے الفت ابرو میں انتہا
عاشق کی جان جانیکے ساماں ابھی سے ہیں

مسیحا نے محبت کی نظر کی
شکایت اب نہیں درد جگر کی

ہمیں تو یاد ہر اک وقت آپ ہی کی رہی
مگر حضور ہیں دل سے ہمیں بھلائے ہوئے

آکر نہ کبھی عاشق مضطر کو جلایا
اعجاز دکھائے نہ مسیحا کے کسی نے

ہٹا سینہ سے گر زانو تو ہوگا حشر عالم میں
ترا بسمل جو تڑپے گا زمیں زیر و زبر ہوگی

رمز۔ سوامی سدانند سرسوتی عرف بہاری لال جی، آپ دکن کے باشندے اور منشی کنہو لال نائب کے سنہ ۹۰ء سے شاگرد ہیں، کچھ اشعار ملے انکا انتخاب درج ذیل ہے۔

تیرے میرے بندھ گیا رشتہ صنم تقدیر سے
کھل نہیں سکتی گرہ اب یہ کسی تدبیر سے

بھوک میری کھاتے کھاتے گالیاں جاتی رہی
پیاس بھی ظالم بجھا آب دم شمشیر سے

پھر گئی ساری خدائی ہو گیا دشمن جہاں
پھیر لیں آنکھیں جو تو نے وائے مجھ دلگیر سے

کچھ ایسی بھول بھلیاں ہیں اسکے کوچے میں
تمام عمر جو گھومے نہ پھر بھی راہ ملے

حرم میں، دیر میں، مسجد میں، کوہ و صحرا میں
کہاں کہاں مرے نالے مجھے تباہ ملے

رمز۔ منشی حافظ انوار الحق مدرس مدرسۂ غوثیہ رامپور، حضرت داغ کے عقیدت مندوں میں ہیں پہلے کچھ عرصہ انکے شاگرد حضرت احسان رامپوری سے بھی اصلاح لی تھی۔ چند شعر ملے درج کیے گئے

جب وہ چہرے سے نقاب اپنے اٹھاتے ہیں
شگفتہ اپنا زمانے کو بنا لیتے ہیں

فرق آنکھوں میں نہیں فرق ہے بینائی میں
عیب بیں عیب ہنرمند ہنر دیکھتے ہیں

ہدفِ تیر نظر دیکھئے کرتے ہیں کسے	دل کبھی دیکھتے ہیں گاہ جگر دیکھتے ہیں
وابستہ تیرے لطف سے ہے میری زندگی	مرجاؤں میں جو چشمِ عنایت ادھر نہ ہو

رمق

رمق نجیب اللہ خاں خورجہ کے رہنے والے اور حضرت فتح خاں عم ڈپٹی عبدالعلیم نصر اللہ خاں صاحب تذکرۂ گلشن ہمیشہ بہار کے عزیز اور شاگرد تھے غدر سے پیشتر کامل ۲۳ برس اُن کے پاس اعظم گڈھ میں بسر اوقات کی۔ ڈپٹی صاحب موصوف الصدر سے تعلقات قلبی تھے۔ عرصہ ہوا انتقال کر گئے، کلام بہم رسیدہ کا انتخاب حاضر ہے۔

جبکہ دردِ عشق سے رُخ زرد سارا ہو گیا	رازِ پنہاں دل کا میرے آشکارا ہو گیا
لختِ دل جب آکے ٹھیرا نوکِ مژگاں پر مرے	دار پر منصور پیدا پھر دوبارہ ہو گیا
دیکھنا اُس کا نگاہِ قہر سے عشاق کو	قتل کرنے کا رمق ساماں دوبارا ہو گیا
دل میں ہے اب قرب میں آئینہ سا پیچ اگر ہو	وہ مجھے دیکھا کرے اور میں اُسے دیکھا کروں
رُخ زرد دمِ سرد ہے چشم اشک سے تر ہے	واللہ یہ سب تیری محبت کا اثر ہے
دل میرا ترا گھر تھا سو اب غم نے لیا چھین	اے بیخبر اب تجکو بھی کچھ گھر کی خبر ہے

رنج

رنج خواجہ محمد نصیر محمدی رنج خلف الصدق خواجہ ناصر پرست عرف میر کلو اکبر آبادی مقیم دہلی، آپ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے نواسے اور بقول بعض نبیرہ تھے ولادت آپ کی سنہ ۱۱۸۹ھ میں ہوئی، چھٹ پن ہی میں حضرت خواجہ میر درد اپنے نانا صاحب سے دست بیع ہوئے جب اُنکی عمر دس بارہ برس کی ہوئی خواجہ میر درد نے وفات پائی اُسوقت سے ہمیشہ اپنے بزرگ پیر کے فراق میں دل شکستہ اور مغموم رہے آپ کو اکثر علوم خصوصًا ریاضیات میں خوب دخل تھا، علم موسیقی بھی خوب جانتے تھے اور تال اور لے سے ایسے واقف تھے کہ بڑے بڑے اُستاد انکے سامنے کان پکڑتے تھے، اور خاک چاٹ کر نام لیتے تھے، اپنے ماموں خواجہ صاحب میر متخلص الم خواجہ میر درد کے فرزند ارجمند کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ ہر مہینے دوسری اور چوبیسویں کو

مجلس میں نوازی کی آپکے رُو برو ہوا کرتی تھی، آخر کو دوسری شوال روز یکشنبہ ۱۲۶۱ھ میں آپنے وفات پائی کبھی کبھی آپ شعر بھی کہا کرتے تھے، حکیم مومن خان مومن آپکے داماد تھے اُنھوں نے یہ تاریخ وفات آپکے غم میں جاجرت میں موزوں کی تھی۔

شیخ زماں شد زدہر وز پئے سالِ وفات	تاریخ	فکر بلندم رہ جنتِ ماوی گرفت	
گفت بہ مومن ملک خواجہ محمد نصیر		در قدم ناصر و دردنکو جا گرفت	
خط دیکھکر ادھر تو مرا دم اُلٹ گیا		قاصد اُدھر بدیدۂ پُرنم اُلٹ گیا	
اپنا وہ تھا کہ جس سے بیگانہ رہے ناواقف سے		بیگانہ وہ تھا کہ جسکو جانا اپنا ۔ کیا قہر کیا	
یقین ہو گیا دیکھ کر اُس کا قامت		کہ بیشک قیامت میں دیدار ہوگا	
تیرے بِن جبتک کہ میرا دم رہا		آہ اور نالہ ہی بس ہمدم رہا	
کھڑکی نکال جانبِ دشمن نہ بام پر		کوٹھے چڑھی جو بات کھلی خاص و عام پر	
دل یہ جسکے لیئے پہلو میں تپاں رہتا ہے		یوں سُنا ہے کہ اُسے بھی خفقاں رہتا ہے	
آنکھ سے آنکھ جب دوچار ہوئی		زندگی تلخ و ناگوار ہوئی	

رنج

رنج حکیم فصیح الدین شاگرد میرزا غالب مرحوم، قاضی خلیل کی بیاض میں ایک شعر قابلِ انتخاب نظر آیا درج ہوا، میرٹھ میں اُنکی شاعری کا اچھا چرچا تھا مگر کلام باوجود تلاش نہ ملا۔

اِک بار اور میری عیادت کو آیئے		اچھی طرح سے میں ابھی اچھا ہوا نہیں

رنج

رنج میرزا جان علی نام ابن مرزا تقی بیگ مرحوم کوتوال آگرہ، اور خود بھی محکمۂ پولیس میں نکلنہ لہ میں ملازم تھے، فن سخن میں بانکے رائے فرحت سے تلمذ تھا۔ یہ اُنکے کلام کا نمونہ ہے۔

کہا میں نے کہ میں اکثر مسیحا تمکو سُنتا ہوں	ق	دوا کرتے ہیں تو کس مرض کی تم دوا ٹھیرے
گذارش اُسکی سنئے دُور سے جو پوچھنے آئے		سماعت اُسکی کیجے جو کہ بہرِ التجا ٹھہرے

تو ہنس کر بوسے صحت تمکو رب العالمین بخشے	مرض کیسا مجسم تم تو مالیخولیا ٹھیرے
مروت چیز کیا ہے ہم تو اک بیدرد قاتل ہیں	ہماری قوم سے باہر رہے جو اہل وفا ٹھیرے

رنج

رنج میر محمد علی صاحب تلمیذ حضرت داغ دہلوی مرحوم نبیرہ میر محمد حسین خان مرحوم قلعہ گولکنڈہ کے برگیڈ میں کیڈٹ تھے پھر درجہ بدرجہ ترقی پاکر لفٹنٹ ہو گئے، موزونی طبع کے اقتضا سے شاعری کا بھی شوق عرصہ سے ہے اور خاصہ کہہ لیتے ہیں کوئی خاص بات قابلِ ذکر اِنکے کلام میں نہیں۔ چند غزلیں ہم پہنچیں اُسکا انتخاب درج ہے۔

رکھدو مرے مزار میں شیشہ شراب کا	بھاگے گا اُسکی بو سے فرشتہ عذاب کا
توبہ کہاں کی اور کہاں کا پھر اتقا	آیا جب اپنے سامنے ساغر شراب کا
پھیر دیتے مجھے بیکار ہے لاحاصل ہے	آپکا یہ نہیں ہونے کا پرایا دل ہے
جب کہا غیر سے اب ترکِ محبت کیجے	ہنسکے فرمایا کہ یہ بات بہت مشکل ہے
اِن حسینوں کی جو باتوں میں نہ آیا اے رنج	وہی ہشیار ہے دانا ہے وہی عاقل ہے
در بدر خاک بسر چاک گریباں مضطر	رنج کا حال ذرا دیکھنے کے قابل ہے

سامنے میرے غیر سے شوخی	آنکھ میں تیرے کچھ حیا بھی ہے
وعدہ کرکے بتو نہ ہم سے پھرو	کچھ تو دل میں ڈرو خدا بھی ہے
قیامت میں ہے یہ کون آنیوالا	کہ جسکو دیکھنے خلقت کھڑی ہے
زمین پر گھس رہا ہے سر جو زاہد	یہاں کمبخت کیا دولت گڑی ہے
یہ بیچینی جو اے دل ہر گھڑی ہے	مصیبت تجھپہ کیا ایسی پڑی ہے
نہ جائینگے کبھی مر کر بھی یاد رکھ ظالم	مزار ہوگا ہمارا تری گلی ہوگی

اگر درکار ہے تمکو تو لو حاضر مرا دل ہے	تم اپنے پاس رکھو چیز یہ رکھنے کے قابل ہے
وہ اک میں ہوں کہ میری عمر ساری رنج میں گزری	وگرنہ اک زمانہ یا خدا بشاش و خوشدل ہے
ترے وعدے پہ ظالم صبر کرنا سخت مشکل ہے	یہ میرا ہی کلیجہ ہے یہ مجھ کمبخت کا دل ہے

مرے پہلو میں تھا جبتک نہ تھی کچھ قدر مجکو بھی
گیا جس روز سے یہاں سے زباں پر اُڈن وائی ہے

رنجور

رنجور شمس العلمار مولوی محمد یوسف عظیم آبادی چیف مولوی بورڈ آف اگزامینرز کلکتہ، پٹنہ کے ایک موقر اور باعلم خاندان کے رکن ہونے کے علاوہ خود بھی صاحب جوہر اور باکمال ہیں، زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے اور طبیعت میں شوخی اور بذلہ سنجی کا خاص مادہ ہے، پرگو بھی بہت ہیں اکثر رسالوں میں ہطرح کلام چھپواتے رہتے ہیں، اخلاقی اور عشقیہ دونوں طرح کے مضامین نظم کرتے ہیں، فن سخن کی استعداد بھی عالمانہ ہے، متانت کے ساتھ جابجا شوخی کا اظہار بھی دل پسند پیرایہ میں کلام میں موجود ہے۔

دشمن نظر بچا کے دبے پاؤں ہٹ گیا
میں اپنے سر پہ کھیل کے مقتل میں ڈٹ گیا

کیا کروں ذکر نوجوانی کا
بھولنا بہتر اس کہانی کا
تاب دیدار یار دیکھ سنبھل
اسکو دعوی ہے لنترانی کا
مجکو تحقیق سے ہوا ثابت
لفظ مہمل ہے شادمانی کا
جھیل لیں جب بلائیں فرقت کی
خوف کیا مرگ ناگہانی کا

شرر عشق نے وہ آگ لگائی دل میں
گھر جلا سا منے اور ہم سے بجھایا نہ گیا
کہتے ہیں دیکھ کے مُلکِ دلِ ویراں میرا
آجتک کیوں کوئی شہر اسمیں بسایا نہ گیا
زندگی میں تو رفاقت کا بھی بھرتے تھے دم
قبر میں ساتھ کوئی اپنا پرایا نہ گیا
کسکے کام آئیگی پھر تیری مسیحائی یار
کشتہ اپنا ہی اگر تجھ سے جلایا نہ گیا

شوق تھا چلمن اٹھانے کا کہ روکا شرم نے
مجھپہ حسن یار آفت ڈھاتے ڈھاتے رہگیا

بولے وہ مجکو مرنے پہ تیار دیکھکر
خوش ہوگئے ابتو حور وکل دیدار دیکھکر
کرتے وہی ہیں راہ ترقی کی جلد طے
چلتے ہیں جو زمانے کی رفتار دیکھکر

کب سے دل میں مرے مہمان بنے بیٹھے ہیں
مجھ سے ابتک مگر انجان بنے بیٹھے ہیں
انتظار اُن کا عبث اے دلِ مشتاق نہ کر
وہ کسی اور کے مہمان بنے بیٹھے ہیں

ہر ادا انکی مری جان لئے لیتی ہے
گو وہ ظاہر میں مری جان بنے بیٹھے ہیں

دل میں تو حضرت رنجور کے ہے عشق بتاں
گو یہ ظاہر میں مسلمان بنے بیٹھے ہیں

ساری دنیا سے ہم انجان بنے جنکے لیے ٭ ہائے ہم سے وہی انجان بنے بیٹھے ہیں ٭

کیوں ہم تری تلاش کو دیر و حرم میں جائیں
وہ کونسا مکان ہے جہاں تو مکیں نہیں

کیا حور کی تلاش میں آتا ہے روز ادھر؟
زاہد یہ کوئے یار ہے خلد بریں نہیں

اے دل سمجھ کے کوچۂ دلبر کا قصد کر
واقع میں ہے وہ چرخ ستمگر زمیں نہیں

کچھ لامکاں میں گھر تو نہیں ہے رقیب کا
پوچھا کہاں گئے تو وہ بولے کہیں نہیں

رنجور حال دل بت کافر سے کیا کہوں
کہتا ہے تیری بات کا مجکو یقیں نہیں

آپ اس وقت اگر غیر کے گھر جاتے ہیں
ہم بھی اب کرتے ہیں دنیا سے سفر جاتے ہیں

شیخ جی پوچھتے کیوں ہیں کہ کدھر جاتے ہیں
ہم بھی جاتے ہیں ادھر آپ جدھر جاتے ہیں

شیخ جی! حوروں کے مسکن کی تو یہ راہ نہیں
کوچۂ یار ہے یہ آپ کدھر جاتے ہیں

ایسے وعدوں سے ہو کیا خاک میرے دلکو خوشی
وعدہ کرتے تو ہیں پھر کرکے مکر جاتے ہیں

شیخ دوزخ سے ڈرانے کی ضرورت کیا ہے
ہمتو صورت ہی تری دیکھ کے ڈر جاتے ہیں

کوئے دلدار میں کچھ ایسی کشش ہے ناصح
لاکھ چاہیں نہ وہاں جائیں مگر جاتے ہیں

یوں ایک دوسرے کا ہی ہمدرد ہیں
دل میرا غمگسار تو میں دکھایا رہوں

گمرہان قوم کے کیا خاک ہونگے راہبر
خود چلو اے واعظو تم راہ پر اتنا تو ہو

سامنے تیرے اگر وہ پیاری صورت آئیگی
پھر نہ واعظ تجکو یاد حور جنت آئیگی

اس بلائے جاں کی الفت میں کہاں راحت نصیب
ایک آفت جائیگی تو ایک آفت آئیگی

میں وہ وحشی ہوں کہ آئے روبرو مجنوں اگر
میری صورت دیکھکر اسکو بھی وحشت آئیگی

کھو کے امیدوں کو واں یاس تجھے پایا ہے
تو بجا ناکہ غنیمت ہے تری ذات مجھے

بیاں کیا ہو سکے رتبہ مرے دلکا کہاں تک ہے
یہ ہے عرش خدا اسکی بلندی لامکاں تک ہے

ستم اس بانی بیداد کا چھپ رہا کہاں تک ہے
کہ اسکو دیکھ کر چلکر ہیں ظالم آسماں تک ہے

تمھاری خانقاہ اے شیخ جی تمکو مبارک ہو
جہت تحقیق پر میں نے اگر پایا تو یہ پایا
تجھے کیا واسطہ شوقِ حصولِ قربتِ حق سے
کروں کس منہ سے یارب شکوہ تیری مہربانی کا
معطر ہے دماغ حضرتِ رنجور مرقد میں

رسائی ہمسے رندوں کی در پیرِ مغاں تک ہے
وجودِ دوستی گر ہے تو یارو نکی زباں تک ہے
تری پرواز اے واعظ فقط حورِ جناں تک ہے
کہ مجھپر مہرباں اب وہ بتِ نامہرباں تک ہے
کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے

مدح گوئی کا صلہ دشنام ہے
اب کہاں وہ نامۂ پیغام ہے
تھی خطا میری کہ میں نے دلدیا
اُنکے بھولے پن کے صدقے جایئے
پوچھتے ہیں آکے میری قبر پر
اُن سے اے رنجور امیدِ وفا

واہ کیا سرکار کیا انعام ہے
دوستی باقی برائے نام ہے
آپ کا بیشک بجا الزام ہے
کہتے ہیں مجھ سے تمھیں کیا کام ہے
انتو تم کو ہر طرح آرام ہے
کس طرف تیرا خیال خام ہے

پر یو تمھارا اقاف ہے اب کس شمار میں
کس کو غرض دھرم سے کسے کام دین سے
پڑھتے ہیں سب بجائے غزل کے بلینک ورس
ماں باپ کا ادب ہے نہ اُستاد کا لحاظ
کیوں بیخ و بن سے اُکھڑے نہ وضعِ قدیم شرق
سطرب نیا ہے یار نیا مے بھی ہو نئی

یورپ میں ہر طرف ہیں پرستاں نئے نئے
ہندو نئے نئے ہیں مسلماں نئے نئے
اب ہیں مشاعروں میں غزلخواں نئے نئے
پڑھتے سبق ہیں طفلِ دبستاں نئے نئے
آتے ہیں سمتِ غرب سے طوفاں نئے نئے
عیش و طرب کے ہیں سبھی ساماں نئے نئے

گناہ دھونے کو یہ التزام کرلیں گے
نماز شیخ ریائی کے پیچھے ہے مکروہ
بتوں کے عشق میں واعظ مضائقہ کیا ہے
کبھی یہ حضرتِ دل چپ سے نہ بیٹھیں گے

وضو شراب سے ہم صبح و شام کرلینگے
ہم اپنے پیرِ مغاں کو امام کرلینگے
خدا خدا نہ سہی رام رام کرلیں گے
ہمارا کام نہ جبتک تمام کرلیں گے

میری تُربت پہ وہ آتے ہی ہوا اشک فشاں
دیکھ کر خاک مری ہو گیا پتھر پانی

جبکہ نیت پہ ہے اے شیخ مدارِ اعمال
پی بھی لے مَے کہیں کمبخت سمجھکر پانی

کیوں کہوں یہ مکان میرا ہے
رات بھر کا فقط بسیرا ہے

چاندنی رات میں اندھیرا ہے
کہ جُدا مجھ سے ماہ میرا ہے

سوالِ وصل کا گر وہ ندیں جواب نہیں
سکوت سے بھی تو آدھی رضا نکلتی ہے

ادا، ناز، انداز، شوخی، کرشمہ
حسینوں کو آتے ہیں فن کیسے کیسے

وصف لکھتا ہوں اُس پری رو کا
شعر میرا پری نہ ہو جائے

غیر میری بدی کے درپے ہے
یہ مری بہتری نہ ہو جائے

وہ عیادت کو آتے ہیں رنجور
دلدہی دلبری نہ ہو جائے

[illegible]

سُنائیں کیونکہ اُسے رحلتِ عدو کی خبر
نہ جانیں سُن کے وہ کیا اپنا حال کر بیٹھے

کُچھ نہ پوچھو حال مستانِ شرابِ عشق کا
جھوم کر جس وقت آتی ہو گھٹا برسات کی

آسماں پر جابجا ہیں کالی کالی بدلیاں
یا یہ ہے بکھری ہوئی زلفِ رسا برسات کی

بدلیوں کا گھر کے آنا۔ بجلیوں کا کوندنا
کیا ہی دل آویز ہے ہر اک ادا برسات کی

شیخ! کیوں تیرے تقدس پہ ہم ایماں لائیں
وحی کیا آئی ہے یہ عرشِ بریں سے کوئی

آنے والا ہے عیادت کو وہ رشکِ عیسیٰ
مژدہ کہہ آئے یہ رنجورِ حزیں سے کوئی

رند

رند۔ لالہ کھیم نراین رند لکھنوی نبیرۂ راجہ لچھمی نراین امیر عہد عالمگیر ثانی۔ طب میں معقول دستگاہ رکھتے اور مہاراجہ ٹکیت رائے دیوان آصف الدولہ کی رفاقت میں بسر اوقات کرتے تھے، فارسی شعر بیشتر کہتے تھے، آخر عمر میں کلکتہ جا رہے تھے اور ہوگلی میں مکان بنا لیا تھا، مولوی حفیظ الدین شہید انکے نامور شاگرد تھے۔

نالۂ طنبور و چنگ اے اہلِ غفلت تم سُنو!
گوش زد ہوتی ہے ہر دم یہ نصیحت ساز سے

ق

ہے سزا اُسکی کہ روز و شب وہ پائے گوشمال
رازِ دل بے پردہ جو کہدے بلند آواز سے

رند

رند مہربان خان از ملازمانِ نواب احمد خان بنگش فرخ آبادی، شوق لکھتے ہیں کہ جوان قابلِ قدردان اہلِ دل، دوستدار انسان اور طبیعت انکی علمِ موسیقی کی طرف از حد مائل تھی، مرزا رفیع السودا اور سوز کے شاگردوں میں سے تھے طبیعت موزوں اور مناسب پائی تھی بقولِ شوق ایک دیوان ضخیم پچاس ہزار اشعار کا ترتیب دیا تھا، کچھ دنوں نواب افراسیاب خاں کی سرکار میں بھی متوسل رہے، مرزا رفیع السودا نے انکی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں، شرف الدین احمد لکھتے ہیں کہ باوجود بے علمی شعر خوب کہتا تھا اور اکثر ٹپّہ انکے بنائے ہوئے لوگ گاتے پھرتے تھے، یہ چند شعر انکے ملے ہیں۔ درج تذکرہ کیے جاتے ہیں +

رات کو امید ہے کچھ دن کو ہوجاتا ہے کچھ	کیا کروں شکوہ الٰہی گردشِ افلاک کا
بے وطن، بے رفیق، بے اسباب	کون ایسا غریب ہووے گا
ترستے ہی چلے دنیا سے ہم او بیوفا ظالم	نہ دیکھا مرتے مرتے آخری دیدار یا قسمت
کبھی جو روبرو جاتا ہوں تو کہتا ہے جھنجلا کر	پرے ہو سامنے سے سُن بلا و فریاد کی صورت
غنیمت ہے جس ڈھب سے کٹے زندگانی	کہاں دن کہاں غم، کہاں یار جانی
یارب کہیں سے گرمی بازار بھیجدے	دل بیچتے ہیں کوئی خریدار بھیجدے

ہمکو نہ کچھ سیم نہ زر چاہیے	لطف کی اک تیری نظر چاہیے	مجکو صدقے تو یار ہو جیے	آپ پر سے نثار ہو جیے

نوٹ چند شعر اُنکے دیوان میں دیکھے گئے جن کی نسبت میر سوز کہتے ہیں کہ یہ اُنکا کلام ہے اور بعض میرزا رفیع السودا سے منسوب کرتے ہیں واللہ اعلم وہ اشعار یہ ہیں۔

مبارکباد دو ہمکو کہ پیغامِ بہار آیا +	جنوں نے پھر ستایا پاؤں اب پڑنے کو خار آیا
جس کا تجھ سا رقیب ہووے گا	اُس کا عالم رقیب ہووے گا
سبھی ہیں وہ کے لیجانیکی باتیں	سمجھتا ہوں یہ پھسلانے کی باتیں
گئے بس کے پائے یار سے کیا لگ چلی حنا	صبا آفریں یہ کام جو یوں دست بستہ ہو
بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی	بیچ کھاتے ہیں جو یوسف سا برادر ہووے

میرے سینے کا داغ روشن ہے | تیرے گھر کا چراغ روشن ہے

دلکا گھبراتا کہوں یا کہ قفس کی تنگی | دیکھئے کیا کرے صیاد قفس کی تنگی
ہے یہی میری جان کا دشمن | رند اس دل کو خوار ہونے دے

رند

رند۔ پنڈت گنگا پرشاد کشمیری لکھنوی، خلف پنڈت بشن چند۔ جوان۔ خوشرو و خجستہ خو، مشرب رندانہ رکھتے تھے، سررشتہ دار عدالت آگرہ رہکر تحصیلدار و افسر پولیس مقرر ہوئے اور ایک عرصہ تک میرٹھ، بریلی، بجنور، فرخ آباد، آگرہ اور متھرا میں بسلسلۂ ملازمت اقامت پذیر رہے گلشن ہمیشہ بہار میں لکھا ہے کہ نظیر الدین حسین شائق سے اصلاح سخن لیتے تھے اور مصنف کے بلاتکلف دوست تھے، بقول شیفتہ جرأت کے شاگرد تھے مگر یہ بات غلط ہے، ڈپٹی عبد العلیم انکی رعنائی جامہ زیبی، خوش خلقی، رنگین مزاجی، ہر دلعزیزی۔ رندانہ منشی۔ شگفتہ طبعی کی بیحد تعریف کرتے ہیں۔ اور فی الحقیقت انکی طبیعت کا رنگ کلام سے اچّھی طرح ظاہر ہے، زبان بہت صاف شیریں، روزمرّہ پاکیزہ۔ محاورات کا استعمال بہت مناسب طریقہ سے کرتے ہیں، مضامین میں تازگی اور خیالات میں جدّت اور نفاست انکا حصّہ ہے۔

سیلِ خوں تھا جو بہا آنکھوں سے | تم نے دلکو نہ جگر کو دیکھا
دیکھ! پھر ہمکو نہ دیکھے گا تو | یار جو تو نے اُدھر کو دیکھا
حُسن پریوں کا سُنا کرتے ہیں | عشق دیکھا تو بشر میں دیکھا
نہ تو کی نالۂ شب سے تاثیر | نہ اثر آہِ سحر میں دیکھا

ابتو چارہ کوئی باقی نہیں بیچاروں کا | آخری وقت ہے پیارے ترے بیماروں کا

دُنیا میں نہ ہو شیفتہ انسان کسی کا | دل ہاتھ سے جاوے نہ مریجان کسی کا
عشاق تو جل جل کے ہوئے سرو چراغاں | پروہ نہ ہُوا شمع شبستان کسی کا

جلاتی ہے تپ عشق آہ جیتے جی بدن میرا | موئے پر یا الٰہی کب یہ چھوڑیگی کفن میرا
مل چُکا میں خاک میں اور دل میں ہی تیرے غبار | جان! مجھ سے اس قدر کسنے مکدّر کردیا

یہ دل پھر ان دنوں وحشت میں آیا
نہیں تدبیر کچھ چلتی خدایا

سو بار میں اُس کوچہ میں جا شور کر آیا
یہ بھی نہ کہا اُس نے کہاں تھا کدھر آیا

وہ رشکِ قمر رات جو خود میرے گھر آیا
شاید مرے نالوں میں ہے اب کچھ اثر آیا

کیا خاک توقع ہو بھلا زیست کی یارو
جب اشک کے ساتھ آنکھوں سے لختِ جگر آیا

سچ ہے کہ جو آ بنتی ہے جی پر تو عزیزو
سوجھے ہے پھر اُس وقت نہ اپنا نہ پرایا

دم رکنے لگا نبضیں چھُٹیں بیٹھ گئے دانت
تس پر بھی وہ بے رحم نہ لینے خبر آیا

مارا مجھے ترسا کے جو بے ترس خدا یوں
کیا ہاتھ ترے او بتِ بیداد گر آیا

یہ حال ہے میرا کہ تڑپتا ہوں شب و روز
بے مہری پہ عجب ہے کہ وہ رشکِ قمر آیا

دل ہُوا خوں اور جگر بھُن کر کباب
ہٹ ترے عشق کا خانہ خراب

فصلِ گل ہے اور ہنگامِ شباب
ہاں مغنی نغمۂ چنگ و رباب

جُرعۂ مے حضرتِ پیرِ مغاں
اب ثواب اِس میں ہو صاحب یا عذاب

فصلِ گل میں منع مے کرتے ہو شیخ
ہے خطا پر آپ کی رائے صواب

دیکھ اِس بحرِ فنا میں آنکھ کھول!
رندؔ چشمک تجھ پہ کرتا ہے حباب

روتا ہوں چپکے چپکے آتا ہے یاد جس دم
وُہ دیکھنا کسی کا آنکھیں چُرا چُرا کر

تجھے جس نے دیکھا نگارا زمیں پر
کہے ہے کہ اُترا ہے تارا زمیں پر

کوئی پھُول گلشن میں تجھ سا نہ پھُولا
ہوا جب سے تو آشکارا زمیں پر

تری راہ میں فرش ہیں دیدہ و دل
نہ رکھ پاؤں پیارے خدارا زمیں پر

زمانہ میں تیرا یہ شہرہ ہے پیارے
کہ آیا دوبارہ مسیحا زمیں پر

جی میں آئے ترے بل خواہ تو مت مل آ کر
پر وفاداروں سے ٹلتے ہیں کہیں دل آ کر

مانتے ہو گر مرے معشوق کہنے سے بُرا
ہم تمھیں مشہور اپنا چاہنے والا کریں

آپ جب غیروں سے ہنس ہنس کے لپٹ جایا کریں
روتے روتے کیوں نہ پھر آنکھیں مری آیا کریں

آنکھ مجلس میں لڑایا مت کر ہر ایک سے
تم ہمیں دیکھا کرو اور ہم تمہیں دیکھا کریں

جاویں گر کوچے میں اسکے تو ہے بدنامی کا ڈر
اور نجاویں واں تو کب تک ہجر میں تڑپا کریں

سخت مشکل ہے غرض کچھ بن نہیں آتی ہے بات
یوں کریں تو کیا کریں اور وں کریں تو کیا کریں

قطعہ

ہم اٹھ تو چلے تری گلی سے
لیکن دلِ زار ناتواں کو

پھر دیکھئے آہ اپنی تقدیر
لیجاتی ہے یہ کہاں کہاں کو

بزم خوباں کو جو ساتھ اسکے لگا ہیں چلنے
تو لگے کہنے طبیعت کہیں آئی ہوگی

خیر چلنے کو تو چل پر یہ ذرا رکھیو یاد
گر کہیں آنکھ لڑائی تو لڑائی ہوگی

بدن ہے یاسمن یا نسترن ہے
الٰہی قد ہے یا سرو چمن ہے

خیالِ زلف میں رہنا پریشاں
ارے دل یہ ترا دیوانہ پن ہے

جہاں وہ گلبدن ہو جلوہ فرما
اگر بن ہے تو پھر وہ بھی چمن ہے

دمبدم لب پہ آہ جاری ہے
بیقراری سی بیقراری ہے

جو وہ گلرو نہیں چمن میں تو اب
بوئے گل سے دماغ بھاری ہے

دل کسی قدرداں کو دینگے رند
اب اگر زندگی ہماری ہے

دکھانا ہے تو آ صورت دکھا بہر خدا پیارے
کہ ہے یہاں کوئی دم کا اب عاشق ترا پیارے

کیا ہے اسنے یاں آنیکا وعدہ شاید آجائے
دلا تک صبر کر بھائی نہ اتنا تلملا پیارے

ہمیں تو بار بھی واں تک نہوا اور غیر ہم صحبت
تری تقصیر کیا یہ وقت کا ہے مقتضا پیارے

عبث کیوں چھیڑتا ہے سامنے غیروں کے تو مجھکو
برے ہیں یا بھلے ہیں پر ترے ہیں مبتلا پیارے

وہی فغاں ہے وہی آہ ہے وہی نالہ
خدا کے فضل سے اپنا جو حال ہے سو ہے

نکلا کبھی نہ گھر سے وہ بیرحم در تلک
چوکھٹ سے اسکی مر گئے سر مار مار کے

کئے زخم جگر کے ہائے درماں کتنے ہی ہمنے
گئے آخر کو مرہم پر نہ کی تاثیر مرہم نے

کاش وہ ترکِ خطا کاکلِ پیچاں باندھے
بے خطا جاتے ہیں بت گبر و مسلماں باندھے

بھلا وحشت نہ کیونکر فصل گل میں ہو ترقی کو ہوا رند
لئے باد بہاری ہاتھ میں زنجیر پھرتی ہے

خدا کے واسطے تو دل کسی سے مت لگا پیارے
بگڑ جاویگی یہ صورت بھلی چنگی سنا پیارے

تمھیں کیا عشق کرنا زیب دیتا تھا بھلا پیارے
نہیں مٹتا ہے یہ تو سچ ہے قسمت کا لکھا پیارے

لگا کیا روگ تمکو سچ کہو بہر خدا پیارے
وگرنہ ان دنوں کیوں مضمحل ہو تم بھلا پیارے

رواں ہیں لخت دل آنکھوں سے اور چہرہ پہ زردی ہے
یہ ہے کیا رنگ ہے ہے اور یہ کیا گل کھلا پیارے

ہوئی کیا ہائے وہ گرمی وہ شوخی اور وہ چالاکی
یہ کس کے غم میں حال ایسا تمھارا ہو گیا پیارے

گریباں چاک سر پر خاک لب خشک اور آنکھیں تر
زباں پر آہ اور دل یوں رہا ہے مبتلا پیارے

خدا حافظ ابھی سے ہے اگر یہ عشق کی گرمی
تو جلدی حال ہو گا رند کا سا آپ کا پیارے

عشق تو وہ بد بلا ہے یہاں کہ غارت ہو گیا
قیس تیرے ہاتھ سے فرہاد تیرے ہاتھ سے

دیکھ کر تصویر ہی لاچار ہم بہلائیں جی
کھنچ سکے نقشہ اسکی گر بہزاد تیرے ہاتھ سے

اے جزاک اللہ مدت بعد سنتے ہیں کہ رند
پھر ہوا ہے دشت قیس آباد تیرے ہاتھ سے

رند - نواب احمد علی خاں بہادر رند والی رامپور ۱۲۵۶ھ میں چھپن برس زندہ رہکر اور سینتالیس سال حکومت کرنے کے بعد انتقال کیا، ریاست انکے عہد میں بالکل تباہ ہو گئی تھی، انتظام و کاروبار ریاست کی طرف سے بالکل بے خبر رہتے تھے، امیرانہ عیش و نشاط سے زندگی بسر کرنا ہی اپنا اصول سمجھتے تھے انکے چچازاد بھائی نواب محمد سعید خاں جو اس زمانے میں دہلی میں ڈپٹی تھے اور نواب کلب علیخاں کے دادا انکے جانشین ہوئے۔ یہ چند شعر انکے ہیں۔

قطعہ

سیر کو جب چمن کی جاتا ہے
باغ پھولا نہیں سماتا ہے

مہر ہو یا کہ بے وفائی ہو
رند اس ور سے کوئی جاتا ہے

حشر کو جب حساب مانگیں گے
الاماں شیخ و شاب مانگیں گے

اپنے ساقیٔ لاابالی سے
رند واں بھی شراب مانگیں گے

رند منشی اکرام الدین دہلوی رند برادر ماموں زاد مولوی عبد الکریم سوز خلف مولوی امام بخش

رند

رند

صہبائی۔ اپنے بھائی کے شاگرد اور علم طب میں بھی دخل رکھتے تھے ایام غدر میں جوان قضا کر گئے منتخب کلام درج ذیل ہے۔

تری زلف بکھری بکھری جو نہ دیکھتے کبھی ہم مرے نام سے ہے ظاہر مرا حال میکشی کا	تو نہ ہوتے یوں پریشاں نہ یہ حال ار رہتا مجھے رند کون کہتا جو نہ بادہ خوار ہوتا
تو نے جلا جلا کے ہمیں خاک کر دیا تو نے ہماری یاد کو خاطر سے اپنی ہائے ہم پر تو التفات نہ تھی لیک بزم میں کار گر دل میں یوں ہوئے مژگاں دل میں آنا ترے نہیں مشکل	اور خاک ہو گئے تو صبا نے اڑا دیا حرف غلط کی طرح سے ظالم مٹا دیا ساقی نے رند جان کے ساغر پلا دیا جس طرح ناوک قضا بیٹھے ہو گئے جب غبار آ بیٹھے

رند۔ نواب سید محمد خان خلف الرشید نواب سراج الدولہ غیاث محمد خان نیشا پوری جو نواب سعادت خاں برہان الملک صوبہ دار اودھ کے حقیقی بھانجے تھے بعہد آصف الدولہ بہادر ۱۲ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو جمعہ کے دن بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ چونکہ انکی دادی نواب سعادتخان برہان الملک کی حقیقی بہن تھیں خاندان شاہی سے قریبی تعلق تھا۔ اور ۲۸ سال تک زیر نگرانی جناب امتہ الزہرا بیگم عرف بہو بیگم زوجۂ نواب شجاع الدولہ مرحوم محلات شاہی میں بناز و نعمت پرورش پائی۔ جب تک فیض آباد میں مقیم رہے میر مستحسن خلیق سے جنکی صفت صرف اسقدر کافی ہے کہ وہ میر انیس کے والد بزرگوار اور استاد تھے۔ اصلاح لیا کرتے تھے اور اس زمانہ میں وفا تخلص کرتے تھے ایک دیوان بھی مرتب کر لیا تھا۔ جب بہو بیگم صاحبہ جنت نصیب ہوئیں اور استاد موصوف بھی فیض آباد سے فرخ آباد چلے گئے تو یہ رجب ۱۲۴۷ھ میں لکھنو آئے اسوقت یہ دار السلطنت بھی علم و فضل کا مخزن، شاعری و نثاری کا معدن زبان و محاورات و فصاحت و بلاغت کی ٹکسال تھا۔ اس باکمال عہد میں فن شاعری میں کامل ہو جانا ہر شخص کے لیے ایک ادنی توجہ سے ممکن تھا، نہ کہ رند جیسے ذہین، طباع، نکتہ رس، عاشق مزاج کے لیئے جو وارد لکھنو

ہونے سے قبل ہی اپنے ہمچشموں سے کچھ بہت نیچے نہ تھا، یہاں آکر آتش کے زمرۂ حلقہ بگوشان میں داخل ہوگئے، اور سابقہ کلام تمام وکمال تلف کردیا۔

اِن کی شاگردی رند کے لیئے تو باعثِ شرف ضرور تھی لیکن آتش کے لیئے بھی یہ کچھ کم باعثِ فخر نہ تھا کہ رند کا ساطباع اور نغز گو الکلام اُستاد اُس کا شاگرد ہوا، آتش کے تلامذہ میں علاوہ رند کے خلیل۔ صبا اور نسیم نے بھی بہت شہرت پائی اور اُستاد کا نام خوب روشن کیا۔ لیکن باغِ خلیل پر قبل از وقت خزاں آگئی۔ صبا کا کیا ٹھکانا، نکتہ چین کہتے ہیں کہ ہوا کا ایک جھونکا تھا جو ادھر آیا اُدھر گیا۔ نسیم نے البتہ بقائے دوام کا خلعت پایا مگر وہ صرف گلزار کی بدولت لکھنؤ کے بعض سن رسیدہ بزرگوں سے سُنا کہ خلیل جناب صبا رند سے بہتر اور افضل تھے۔

محاورات روزمرّہ، شوخی وطراری، فصاحت وسادگی، تاثیر اور معنی آفرینی کے جوہر کو قسّامِ ازل نے رند میں خاص طور پر ودیعت رکھا تھا۔ معاملات راز و نیاز میں کوئی جگ بیتی کہتا ہوگا مگر رند آپ بیتی کہتا تھا، اِن کا مجموعۂ غزلیات اُن تمام رندانہ، عاشقانہ مضامین کا گنجینہ ہے جو ایک مہذب زبان کے دلکش لفظوں میں ہونا چاہیئے۔ بااین ہمہ درد وغم، تصوف ومعرفت، تربیت واخلاق حکیمانہ وفلسفیانہ رنگ کی چاشنی انکے کلام میں موجود ہے، علاوہ ازیں انکی غزلیات میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ کبھی تو میر وسودا کے مقابل آتے ہیں کبھی باندازِ جرأت ومصحفی مترنم ہوتے ہیں یا مومن وغالب کا طرزِ بیان اختیار کرتے ہیں اور کبھی نواب مرزا شوق کی زبان بولنے لگتے ہیں۔ کلیات رند جو اس وقت رائج ہے اُس میں ایک تو دیوانِ گلدستۂ عشق ہے جس کو ۱۲۵۱ھ ہجری میں شاعر نے خود مرتب کیا تھا اور دوسرا دیوان غیر مکمل ہے جو غالباً بعد کو ترتیب دیا گیا، رند نے اس منزل کو کامیابی کے ساتھ طے کرکے ثابت کردیا کہ وہ اگرچہ اودھ کا ایک نواب زادہ ہے لیکن اُسکی نظر صرف معاملات دنیا اور معشوقان بازاری کے نازو انداز ہی کی طرف نہیں ہے بلکہ وہ نیچر کے ہر ایک حُسن اور دلکشی سے بہرہ اندوز ہوتا اور اُس سے ایک مفید سبق حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو مستفیض کرتا ہے۔

رند کی پرائیوٹ زندگی کی بابت یہی لکھنا کافی ہے کہ لکھنؤ کا ایک نوجوان حسین، عاشق مزاج اور دولتمند رئیس زادہ بادشاہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں جس چال ڈھال کا ہو سکتا تھا ویسے ہی حضرت رند بھی تھے مگر "محتسب را درونِ خانہ چہ کار" وہ آخر عمر میں تمام معاصی، ملاحی اور منہیات سے تائب ہو گئے بلکہ اُستاد کے مرنے کے بعد شاعری بھی رفتہ رفتہ بالکل ترک کر دی، دربار اودھ کی سازشوں اور فتنہ پردازیوں سے برداشتہ خاطر ہو کر غدر سے کچھ دنوں قبل ہجرت کی نیت کی اور بغرضِ حج و زیارت کربلا و نجف اپنے عزیز وطن اور پیارے اختر نگر (لکھنؤ) کو ہمیشہ کے لیئے الوداع کی اور نظم اردو نے بڑی حسرت و بیکسی سے اُنکو یہ کہکر رخصت کیا کہ (ع) "تم آپ چلے مجکو کیا کس کے حوالے" انسان کیا چاہتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ چونکہ حج و زیارات کی سعادت اُنکی قسمت میں نہ تھی اِس لیئے بمبئی میں پہنچتے ہی بیمار ہو گئے، اول تو پیرانہ سالی اُس پر اشتداد مرض تاب و طاقت نے جواب دیا اور چارپائی پر ایسا گرایا کہ چار ہی کے کاندھے پر اُٹھے۔

تو گرفتاری میں چندے یادِ گلشن کی رہی
اب قفس سے چھوٹ کے گھر یاد آئیگا صیاد کا

ضبط کرتے کرتے مرغانِ قفس تنگ آگئے ہیں
اب رہائی اُنکی ہو یا حکم ہو فریاد کا

صیاد تیرے دام سے آساں تھا چھوٹنا
مشکل یہ ہے کہ تجھ سے مرا دل اٹک گیا

مطلب میں صفا ہو نہ تکلف ہے زباں کا
دقت ہوئی معنی میں تو کیا لطف بیاں کا

مے پیکے جواں دیتے ہیں ساقی کو دعائیں
تا دورِ فلک دور رہے پیر مغاں کا

ہو گیا آب دمِ تیغ سے بسمل ٹھنڈا
کیوں؟ ہوا اب تو کلیجہ ترا قاتل ٹھنڈا

ہوا کیا چاہ سے حاصل نچا ہو گے تو کیا ہوگا
کیا یہ کچھ محبت میں خفا ہو گے تو کیا ہوگا

ٹوٹے بت، مسجد بنی، مسمار بتخانہ ہوا
جب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ ہوا

زلفیں چھوڑی ہیں کہ چھوڑا اُنسے جوڑا سانپ کا
دیکھیے کس کس کو ڈستا ہے یہ جوڑا سانپ کا

دونوں زلفیں یار کی بنتی ہیں نالوں پر مرے
وجد کرتا ہے صدا لَے سے یہ جوڑا سانپ کا

پائی خبر جو آمدِ فصلِ بہار کی
کیا پھڑپھڑا کے مُرغ گرفتار رہگیا

پھینک دونگا میں لیے چیر کے پہلو اپنا
تجھپہ قابو نہیں دلپہ تو ہے قابو اپنا

کب مِٹا عشق کا نشاں دل سے
زخم اچھا ہُوا تو داغ رہا

نازِ بیجا اُٹھایئے کس کے
اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا

مُسافر تھے عدم کے سیر کرنے یاں بھی آئے تھے
رہے یاں جبتلک قسمت میں پانی کا آب و دانہ تھا

میں بھلا کیونکر کہوں تمکو بُرا
آپنے جو کچھ کیا اچھا کیا

عشق میں حالِ جہاں نوعِ دگر ہونے لگا
لے پری دیوانہ تجھپر ہر بشر ہونے لگا

بُتانِ سنگدل سے بےسبب کیوں دل لگا بیٹھے
یہ شیشہ دیدہ و دانستہ کیوں پتھر پہ دے پٹکا

خاک چھنوائی اُس کے کوچے کی
بیٹھے بٹھلائے دل اُٹھا لایا

تابِ نظارۂ دیدار نہ لاؤ گے کلیم
پردے پڑ جائینگے آنکھوں پہ جو پردہ اُٹھا

ضعف اُسے کہتے ہیں سینے سے لبوں تک آتے
سو جگہ راہ میں نالہ مرا بیٹھا اُٹھا

بن پڑا کچھ نہ علاجِ تپِ فرقت اِس سے
ہاتھ ملکر مری بالیں سے مسیحا اُٹھا

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

کوہ فرہاد سے مجنوں سے بیاباں جیتا
وحشتِ دل ترے اقبال سے میداں جیتا

چلکے اب عرض کرو حضرتِ آتش سے زند
معرکہ آپکا یہ طفلِ دبستاں جیتا

کُھلی ہے کنجِ قفس میں مری زبان صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیان صیاد

دکھایا کُنجِ قفس مجھکو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد

اُداس دیکھ کے مجکو چمن دکھاتا ہے
بہت دنوں میں ہوا ہے مزاجدان صیاد

پروں کو کھولدے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لیکے اُڑ جاؤنگا کہاں صیاد

الٰہی دیکھئے کیونکر نباہ ہوتا ہے
زباں دراز ہوں میں اور بدزبان صیاد

پھر لہو سُرخ ہوا جسم میں کالا ہوکر
رہگیا اب کے برس بھی مجھے سودا ہوکر

اگر یہ کاسہ ہے گماں شک ہے بلا گیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہوکر

جب پیا پانی دعا ساقی کو دی
ہچکی آئی تو کہا یادش بخیر

عاشق صادق ہے تیرا رند، دل اسکا نہ توڑ
شیشہ بن سکتا ہے دل بنتا نہیں پھر ٹوٹ کر

تو بھی چل اپنے ذرا طالب دیدار کے پاس
سب عیادت کے لئے جاتے ہیں بیمار کے پاس

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دید گل کے تجھے پڑ جائینگے لالے بلبل
پڑ گئی گر کسی صیاد کے پالے بلبل

پھر وہی کنج قفس ہے وہی صیاد کا گھر
چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل

اسکو آزردہ کریں کس لئے فریاد سے ہم
ہمسے صیاد رضامند ہے صیاد سے ہم

تیلیاں ٹوٹیں قفس کی جو ابھی پر ماریں
رشتہ برپا ہیں فقط الفت صیاد سے ہم

دلکو پھر کاکل میں الجھاتے ہیں ہم
سر پہ پھر روز سیاہ لاتے ہیں ہم

اے اجل آ چک خدا کے واسطے
زندگی سے ابتو گھبراتے ہیں ہم

کل کہہ آئے تھے نہ آوینگے کبھی
بن بلائے آج پھر جاتے ہیں ہم

ہمپہ بہتان اور کی الفت کا ہے
لے ترے سر کی قسم کھاتے ہیں ہم

ق

رند جب ملتے ہیں وہ تنہا کبھی
دوڑ کر انسے لپٹ جاتے ہیں ہم

مسکرا کر کہتے ہیں وہ ناز سے
بس انھیں باتوں سے گھبراتے ہیں ہم

تمہارے ہاتھ سے تنگ آئے ہیں خون اپنا کرتے ہیں
بمجبوری گلے کو کاٹتے ہیں تم پہ مرتے ہیں

مہ و خور جائے قرص سیم و زر قربان ہوتے ہیں
نظر انکو ہوئی ہے رات دن صدقے اترتے ہیں

عاشق کی اور فقیر کی صورت سوال ہے
مطلب سمجھ لیں آپ تو روشن ضمیر ہیں

خوبرو جتنے زمانے میں ہیں سب عیار ہیں
آشنا اپنی غرض کے ہیں یہ کس کے یار ہیں

گلے لگائیں، بلائیں لیں، تم کو پیار کریں
جو بات مانو، تو منت ہزار بار کریں

ڈھونڈھینگے تجھسے بہتر اے ستمگر سیکڑوں
دل سلامت ہے اگر اپنا تو دلبر سیکڑوں

کھودوں بتخانہ کو کیوں؟ کسلیئے مسجد ڈھاؤں
مجکو کیا ہے جو دلِ گبر و مسلماں توڑوں

رُخ کو پوشیدہ عبث ماہِ لقا کرتے ہیں
اچّھی صُورت کو چھُپاتے ہیں بُرا کرتے ہیں

ایکدن ہچکی بھی غربت میں نہ آئی افسوس
مجھکو بھُولے ہوئے یارانِ وطن بیٹھے ہیں

برسے فلک سے آگ جو پانی کی ہو تلاش
دوزخ ملے بہشت کی گر آرزو کریں

نہ ستا در پہ پڑا رہنے دے کیا لیتے ہیں
اے شہِ حُسن فقیروں کی دُعا لیتے ہیں

عیب سے پاک و مبرّا ہے کلام اُنکا رند
جو غزل حضرت آتش کو دکھا لیتے ہیں

میں کیا جانوں چمن کہتے ہیں کسکو آشیاں کیسا
کھُلیں آنکھیں تو میری آنکر صیاد کے گھر میں

یا صنم دل میں ہے لب پر یا صمد بہرِ ریا
کُفر اس ایماں سے بہتر جیسے اب بیدار ہیں

فصلِ گل میں کیا آزاد قفس سے مجھکو
بھُولنے کا کبھی احسان ترا صیّاد نہیں

رُو بدیوارِ چمن کر کے اُڑاتا مجھکو
راستہ باغ کا صیّاد مجھُے یاد نہیں

عمر گذری ہے مجھے مشقِ خموشی کرکے
ہُوں وہ بلبل جسے اندازِ فغاں یاد نہیں

کعبہ و بتخانہ میں شیخ و برہمن شاد ہیں
دونوں گھر یُمنِ قدم سے عشق کے آباد ہیں

رہا شباب تلک تاک جھانک کا لپکا
وہی ہیں آنکھیں تو لیکن وہ دیکھ بھال نہیں

تنہا میں کس کے ساتھ کروں نغمہ سنجیاں
میں باغ میں قفس میں مرے ہمصفیر ہیں

ہوش میں آؤ پریزادو تم
مجھکو دیوانہ بنایا نہ کرو

آپ دوانہ نے کیا بند قفس میں لاکر
چھوڑا و حسرتِ پروازِ گلستاں مجھکو

ق

ہوکے بیزار عبث گھر کو نہ جاؤ آؤ؟
تھوڑے سے رنج کو اتنا نہ بڑھاؤ آؤ

دل نہیں دیتا ہیں اسبات پہ آزردہ ہو؟
روٹھے جاتے ہو اسی بات پہ آؤ آؤ

نگہِ یاس سے دیکھوں تو یہ کہتا ہے وہ شوخ
پھر بُری آنکھ سے اِسنے مجھے دیکھا دیکھو

یار آیا ہے احوالِ دلِ زار دکھاؤ
عیسٰے کو ذرا حالتِ بیمار دکھاؤ

فرمائیے قیامت کا نہ اقرار کرا یجاں
لو حشر سہی آج ہی دیدار دکھاؤ

وہ دیوانہ تھا میں جس کا ہوا غم اہلِ عالم کو
پریزادوں نے اپنے بال کھولے میرے ماتم کو

اب شیفتہ کسی کا دلِ زار تو نہ ہو
پہلو میں رہ کے جان کا میری عدو نہ ہو

کس طرح سے نہ فنِ شعر میں کامل ہو رندؔ
دس برس دیکھی ہو آتش سے جب استاد کی آنکھ

اچھا نہیں ہر وقت اسیروں کا ستانا
پڑ جائے کہیں آہ نہ صیاد ہماری

قدر میری تجھے نہ تھی صیاد
ہاتھ ملتا ہے کیوں رہا کر کے

گل کو بھڑکاتی ہے بلبل کو خفا کرتی ہے
تو در اندازیاں اے بادِ صبا کرتی ہے

باغباں دشمنِ جاں گھات میں ہر دم صیاد
بلبل اس باغ میں کیوں رہتی ہے کیا کرتی ہے

سیر کی خوب پھرے پھول چنے شاد رہے
باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

پر آبلہ ہے سوزِ جدائی سے سراپا
دیکھے تو کلیجے کے دکھاؤں تجھے چھالے

دل سینے میں بیتاب ہے جاں آئی ہے لب پر
اب جان کو روکے کوئی یا دل کو سنبھالے

کیا کہتا ہے ہر بار تجھے قتل کروں گا
اک جان ہے میری اسے تو لے کہ خدا لے

او دل ہدفِ تیرِ نگہ پھر کیا تو نے
اگلے ہی مرے زخمِ جگر تھے ابھی آلے

کیا خستگیٔ حال پہ عاشق کی ہو خنداں
توبہ کرو اللہ مصیبت میں نہ ڈالے

آنکھیں تری مدہوش ہیں تنہا ہے مرا دل
دو مست نہ سنبھلیں گے اکیلے کے سنبھالے

ڈرتا ہوں لہو دیکھ کے غش آئے نہ تجھ کو
تلوار لگا شوق سے پر منہ کو پھرا لے

بس اب آپ تشریف لیجائیے
جو گذرے گی مجھ پر گذر جائے گی

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

ق

شنیو یہ ماجرا بھی ہے یارو شنیدنی
لے لیکے خط جو میرے کئی نامہ بر گئے

کہتا ہے کیا وہ شوخ کہ جیتے ہیں رندؔ کیا
مدت ہوئی کہ میں نے سنا تھا کہ مر گئے

بت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

موت آجائے قید میں صیاد
آرزو ہو اگر رہائی کی

سانس دیکھا تنِ بسمل میں جو آتے جاتے | اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

خاک ہو کر ہی ہم اٹھیں تو اٹھیں | اب تو در پر تمہارے آ بیٹھے

داغِ فرقت دل پہ جانی دے گئے | چلتے چلتے یہ نشانی دے گئے

گھر بلا کر خاطریں کیا خوب کی مہمان کی | لاکھ ٹکڑے دل سے دی ہے اک گلوری پان کی

آئینہ ان کا ٹوٹ گیا میرے ہاتھ سے | اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی

چھری کس لطف سے پھیری گلے پر اپنے بسمل کے | جو بس ہوتا مرا تو چوم لیتا ہاتھ قاتل کے

ہوا آگاہ اپنے حسن سے تو دیکھیں کیا ہووے | دکھایا جس نے آئینہ تجھے اس کا برا ہووے

جلوۂ حسنِ خداداد ذرا دکھلا دے | منکروں کو بھی صنم شانِ خدا دکھلا دے

جاری ہے نیا مملکتِ عشق میں آئین | مجرم کو سزا ملتی ہے تقصیر سے آگے

شعلۂ رخ دکھا دیا کس نے | سر سے پا تک جلا دیا کس نے

پاسِ دیں کفر میں رہا ملحوظ | بت کو پوجا خدا کر کے

میں دل کو رو چکوں کہ یہ دل مجھ کو رو چکے | یارب جو کچھ نصیب میں ہونا ہے ہو چکے

دل لگی ہجر میں ہے آٹھ پہر نالوں سے | اب بسر ہوتی ہے لے رند برے حالوں سے

ق

اب تک وہ ایک ایک سے کرتے ہیں تذکرہ | ہر چند ترکِ عشق کو برسوں گذر گئے

واللہ رند سے یہ توقع نہ تھی مجھے | کیا کیا کہا نہ کرتے تھے پر کچھ نہ کر گئے

وعدے پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے | کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

یہ قول تھا کہ تجھ سے جدائی ہوئی اگر | ایجان مر ہی جائیں گے تو اب نہ مر گئے

برسوں میں مری یار کی لیکر خبر آئی | مدت میں تو او بادِ صبا راہ پر آئی

طبیعت کا میری کرو تم نہ دھیان | کسی اور سے اب بہل جائیگی

نہیں رہنے کا بعد چندے یہ حال | سنبھلتے سنبھلتے سنبھل جائیگی

رنگ سیٹھ پسٹن جی فرام جی متخلص بہ رنگ و پروین، پارسی اوریجنل وکٹوریہ کمپنی

رنگ

کے مالک تھے یہ ۱۸۶۸ء کا ذکر ہے منشی نواب علی نفیس سے اِس فن میں تلمذ تھا یہ چند شعر اُنکے طبعزاد ہیں اور اس امر کی دلیل ہو سکتے ہیں کہ غیر زبان والے بھی اُردو کی حلاوت سے ناآشنا نہیں رہے۔

سنگدل سے بھی نکلتا ہے کسی کا مطلب	وصل کی آرزو تجھ سے بُت بے پیر عبث
سخت جانی مری کب مانے گی اُس کا لوہا	تم دکھاتے ہو مجھے کھینچ کے شمشیر عبث

رنگ

رنگ۔ لالہ کیشو داس رنگ خلف رائے بہادر لالہ میا مل مرحوم۔ دہلی محلہ چھیپی واڑہ کے ساکن اور ۱۸۸۴ء میں بعالم شباب کلکتہ میں بسبب مشغلۂ تجارت بودوباش رکھتے تھے اُنہی ایام میں گاہ گاہ شعر بھی کہہ لیتے تھے۔

ہے نصیبہ کا راپنا جب وحید دوجہاں	لاکھ کوہِ غم اگر سر پر ہوں نازل کیا ہوا
ماہ رو تجھسا زمانے میں نہ دیکھا اے شوخ	چاندنی کو بھی کیا حُسن سے شیدا اے شوخ

رنگ

رنگ لالہ لکھپت رائے رنگ ساکن حسین پور کلاں ضلع مظفر نگر، علمی استعداد رسمی ہے پندرہ بیس برس سے شعر کہتے ہیں اور کچھ حال باوجود دریافت معلوم نہ ہوا۔

قتل عشاق کا بیڑا تو اُٹھا بیٹھے وہ	دستِ نازک سے مگر تیغ اُٹھائیں کیونکر

بتوں کو حضرت شیخ آپ کیا سمجھتے ہیں	سمجھ ہے جنکو وہ انکو خدا سمجھتے ہیں
جلا کے چرخ کو یہ ایک دم میں خاک کرے	وہ نالۂ دلِ عاشق کو کیا سمجھتے ہیں
خدا نے جن کو سمجھ دی ہے حضرتِ زاہد	بتوں کے حسن کو نُورِ خدا سمجھتے ہیں
دلکی تڑپ کا بعدِ فنا بھی یہ حال ہے	تربت میں بھی ہمارا ٹھہرنا محال ہے
چوٹی کیا ناگنی ہے کچھ نہیں کُھلتا عقدہ	رات دن یہ ترے پیچھے جو پڑی رہتی ہے
پسِ مردن مری تربت پہ لالہ رنگ لایا ہی	دلِ پُرداغ کا جوہر تھے نکلا خاک میں ملکے
آپ بھی ہے دلِ بیتاب گرفتارِ بلا	مجکو بھی ایسی مصیبت میں پھنسا رکھا ہے

رنگ

رنگ۔ حاجی محمد وزیر خان صاحب حیدر آبادی تلمیذ حضرت ظہیر دہلوی۔ دکن کے

طبیعت دار اور خوش فکر کہنے والوں میں ہیں۔ شوخی، آمد، مضمون آفرینی کے جوہر کے ساتھ زبان کا لطف بھی کلام میں موجود ہے۔ اپنے استادِ مرحوم سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ کربلا مشہد اور کعبہ ہو آئے ہیں۔

رنج و خوشی سے ہوگئی ایکدن مجھے نجات
جس دن میں جاکے قبر کے گوشہ میں سوگیا

وہ آئے بھی گئے بھی خبر تک نہیں ہوئی
کچھ ایسا انکو دیکھ کے میں محو ہوگیا

خدا ہی جانے کہ کیسی ہے سرزمینِ عدم
گیا ادھر کو جو وہ پھر اِدھر نہیں آتا

پہروں قاتل محوِ نظارہ رہا
لطف ایسا رقصِ بسمل سے ملا

زندگانی حباب کی صورت
دم کی دم میہمان ہے گویا

کہنے کو یوں تو کہاں ہیں سب ہے جہاں ہمارا
مانے بھی کوئی اے دل آخر بیاں ہمارا

خلاقِ دوجہاں ہو جب مہرباں ہمارا
پھر کیا کرے گا ہوکر دشمن جہاں ہمارا

کیا پوچھتے ہو ہمسے نام و نشاں ہمارا
ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

جام و سبو بھی اپنے ہیں میکدہ بھی اپنا
جب مہرباں ہے ہمپر پیرِ مغاں ہمارا

رہنے دے یہ نشانی گلشن میں اب ہماری
برباد کر نہ گلچیں تو آشیاں ہمارا

ایک سے اک خوبتر پیدا کیا
تم سا کب رشکِ قمر پیدا کیا

وصل میں چھیڑا تو فرمانے لگے
دیکھئے پھر تمنے شر پیدا کیا

رنگ ہم کسکو کہیں اچھا بُرا
جب خدا نے خیر و شر پیدا کیا

بلا سے دو گھڑی کیواسطے تسکین ہوجاتی
تمہارا خواب ہی میں گر مجھے دیدار ہوجاتا

دکھا دیتا نکل کر اپنی صورت تو جو پردے سے
ترا نقصان کیا اس میں بتِ عیار ہوجاتا

اگر جاتا ہے تو اُس بُت کی بزمِ ناز میں اے دل
کسی سے پہلے ہِل مِلکر وہاں پہچان پیدا کر

نازک ہو بل نہ آئے کلائی میں آپکی
چھوٹی سی لینا ہاتھ میں تلوار دیکھکر

کوئی شریکِ حال ترے وقت کا نہیں
آتی نہیں ہے موت بھی بیمار دیکھکر

نفرت کرو جہاں کے سب کاروبار پر ‏ — قائم رہو ارادۂ پروردگار پر

اپنے شہید ناز کو دفنا کے جایئے ‏ — احسان اتنا اور ہو اس خاکسار پر

دیئے جاتا ہے کیوں چرکے پہ چرکے مضمحل دل پر ‏ — خدا کیواسطے بیداد گر کر رحم بسمل پر

دو دن کی زندگی پہ نہ اتنا اُچھل کے چل ‏ — دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

محفل میں مجکو دیکھتے ہی آگ ہوگئے ‏ — کہنے لگے رقیب سے غصہ میں جل کے چل

تمہارے عشق نے کچھ ایسا کر دیا بے خود ‏ — کہاں ہوں، کون ہوں کس جا ہوں کچھ خیال نہیں

نہ ایرانی نہ تورانی، نہ رومی، اصفہانی ہیں ‏ — یہانکے جتنے باشندے ہیں سب ہندوستانی ہیں

ابھی دیکھا ہے کیا اے بوالہوس راہِ محبت میں ‏ — ہزاروں لاکھوں سر پر آفتیں تجکو اُٹھانی ہیں

ہمارے جیب و دامن آستیں پر ہی نہیں موقوف ‏ — ابھی تو دھجیاں دامانِ صحرا کی اُڑانی ہیں

کہا ہنس کے کہو تم رنگ کو بھی پیار کرتے ہو ‏ — تو حسن کے بولے کسکو یاد یہ باتیں پرانی ہیں

ایسا کیا ملکِ عدم میں ہے تماشا یارب ‏ — پھر پلٹ کر نہیں آتے جو اُدھر جاتے ہیں

بہت کم ایسے ہوتے ہیں محبت والے دُنیا میں ‏ — جسے وہ چاہتے ہیں آپ بِک کر مول لیتے ہیں

جنھیں یاد ورنہ ہو وہ جا کے امریکہ میں دیکھ آئیں ‏ — بتانِ سیم تن کے بوسے اکثر مول لیتے ہیں

زہے نصیب زہے بخت اے حنا تیرے ‏ — چمن جو چھوٹ گیا دست نازنیں میں رہی

فغاں سے آہ سے فریاد سے شیون سے نالوں سے ‏ — فلک کو چھید ڈالوں گا الٰہی تیر ونکے بھالوں سے

خدا کے واسطے بس بند کر منقار تو اپنی ‏ — جگر ٹکڑے ہوا جاتا ہے بلبل تیرے نالوں سے

حباب آسا کسی سیلاب میں بہتا نظر آئے ‏ — جو پڑ جائے کبھی پالا فلک کو رونیوالوں سے

ملی جو لذتِ صحرا نوردی دشتِ غربت میں ‏ — مزا اسکا کوئی پوچھے مرے تلووں کے چھالوں سے

کسیکی نکہتِ گیسو اُڑا کر کیا صبا لائی ‏ — اسیرِ زلف کے سر پر بلا پر ہے بلا لائی

سرِ مقتل کسی کا بھی کسی پر کچھ نہیں احسان ‏ — مجھے میری قضا لائی اُسے اُسکی جفا لائی

بٹھا کے سامنے بت کو سلام کرینگے ‏ — خدا خدا نہ سہی رام رام کرینگے

نہ ملی اسکی خبر ہم کو ابھی تک افسوس ٭ ہم یہاں آئے کہاں سے کدھر جاتے ہیں۔

آرزوئے خلد ہے کچھ اور شے
حسرت دنیائے فانی اور ہے

طالب دید بہت حضرت موسیٰ تھے مگر
دیکھتے ہی اسے پھر ہوش سنبھالے نہ گئے

پیچ سے ہمنے بہت اسکے بچایا لیکن
بے ڈسے دلکو ترے زلف کے کالے نہ گئے

دردِ سر کا کبھی حیلہ ہے کبھی عذرِ حنا
مہرباں آپکے یہ حیلہ حوالے نہ گئے

گر برا رنگ تھا جو روٹھ کے بیٹھا گھر میں
تم بھلے تھے تو اسے آکے منالے نہ گئے

رنگ

رنگ - حریف خاں صاحب عرف میرزا رنگیلے، مستعد و علمی رسمی ہے، تفنن طبع کے طور پر شعر کہہ لیتے ہیں جس میں بیشتر مسخرانہ پہلو مد نظر رہتا ہے، چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

سکونِ اختلاجِ دل ہوا جسنے اسے پھانکا
سفوفِ عاشقی ہو نام خاکِ کوئے جاناں کا

چالان ترا کیوں ستم ایجاد نہ ہوگا
کیا خون کا دعویٰ ستم ایجاد نہ ہوگا

وارنٹ میں ہو جائیگا آخر کو گرفتار
حاضر جو عدالت میں تو جلاد نہ ہوگا

بند آنکھیں ہیں تمہاری اونگھتے ہو رات دن
یہ بتلاؤ کہ افیون اسقدر کھاتے ہو کیوں

گھر بیٹھے دید رخ کی تری سب کو ہو نصیب
قد بڑھ کے گھنٹہ گھر کی برابر جو یار ہو

ہمارا یار ہمکو آج تلشکری چٹائے گا
سنا ہے یہ کہ تل رخسار کا لب کی شکر ہوگی

نہ پوچھو مفلسی کے عقد کا سامان قاضی جی
کنوئیں کا انکے پانی ہوگا اور میری شکر ہوگی

رنگین

رنگین میرزا سعادت یار خان نام رنگین تخلص، انکے والد مرزا طہماسپ بیگ خان ساٹھ برس کی عمر میں روم سے ہندوستان میں آئے تھے، لاہور میں نواب حسین الملک معروف بہ میر منو خلف الصدق وزیر الممالک اعتماد الدولہ کے ہاں ملازم رہے اور انکے بعد نواب نجیب الدولہ ضابطہ خان اور ذوالفقار الدولہ کی ملازمت میں نوبت بہ نوبت آسودگی کے ساتھ زندگی بسر کی، انھیں ایام میں بارگاہ سلطانی سے خطاب محکم الدولہ خان بہادر اعتضاد جنگ حاصل کیا، رنگین کی پیدایش قصبۂ سرہند میں ہوئی لیکن انہوں نے نشو ونما دہلی میں پائی اور بچپن سے دم واپسیں تک یہیں رہے، سپاہی کے بیٹے تھے

اسلئے جملہ فنون سپہگری میں معقول دستگاہ رکھتے تھے، سیر و سیاحت کا بھی شوق رہا۔ اکثر امراء کے ہاں ملازم بھی رہے خصوصاً میرزا سلیمان شکوہ بہادر اور اکبر شاہ ثانی کی مصاحبت کا شرف حاصل رہا۔ کبھی تجارت کا مشغلہ بھی کر لیتے تھے چنانچہ اسی سلسلے میں نواب آصف الدولہ و سعادت علیخاں کے عہد میں ایرانی گھوڑے لیکر لکھنؤ کے کئی سفر کیئے لیکن آخر عمر میں ترکِ تجارت و ملازمت کرکے گوشہ نشین ہو گئے تھے، فن شعر کا شوق عنفوانِ شباب ہی میں ہو گیا تھا اور شاہ حاتم کے ممتاز شاگردوں میں گنے جاتے تھے آپ وجاہت ذاتی و خاندانی کے باعث جس صحبت میں جا بیٹھتے تھے وہاں ہاتھوں ہاتھ لیئے جاتے تھے، رنگین میں بحیثیت ایک شاعر ہونیکے متضاد صفات کا مجموعہ پایا جاتا ہے، شوخی و بذلہ سنجی کے علاوہ ایجاد پسند طبیعت پائی تھی چنانچہ ریختی کا ایجاد انھوں نے ہی کیا جس کا سب سے اول تتبع سید انشاء نے کیا، کہیں عاشقانہ درومندی کی زبان میں پند و نصائح کی حکایات لکھتے ہیں اور ایسا لکھتے ہیں کہ خواص و عوام کو اپنا گرویدہ رنگین کلامی اور دلدادہ شگفتہ بیانی بنا لیتے ہیں۔ جو عام رائے انکے متعلق قائم ہے کہ وہ ریختی گو اور ظریف شاعر تھے یہ ناواقفیت پر مبنی ہے، قسام ازل نے رنگین کو عجیب پرلطف اور ہمہ گیر مذاق ودیعت کیا تھا، ریختی ہی پر کیا موقوف ہے وہ کونسا رنگ ہے جس میں رنگین نے اپنے نیرنگ فکر سے پھول نہیں کھلائے اور باغ سخن میں وہ کونسی روش ہے جس میں رنگین کی قلم نے گلکاریاں نہیں کیں، حقیقت میں انکا کلام عطر مجموعہ ہے جس میں ہر قسم اور ہر پایہ کا اعلیٰ سے ادنیٰ تک کلام موجود ہے غرضکہ رنگین نے ہمہ داں طبیعت اور ہمہ گیر مذاق پایا تھا، رنگین نے حقیقت میں یہ کمال کر دکھایا کہ ریختی کی ایجاد کے ساتھ ریختہ کو بھی ہاتھ سے نہ دیا اور نہ صرف ریختہ ہی پر حاکم رہا بلکہ عشق عاشقی کے افسانوں سے گذر کر پند و نصیحت کی دشوار گزار منازل سخن کو بھی بخوش اسلوبی تمام طے کیا۔ زبان کے معاملہ میں رنگین اپنا آپ ہی جواب ہے، اور چونکہ رنگین ریختی کا موجد ہے اس لیئے سخن سنجی کے قاعدۂ کلیہ کے مطابق اسکی ریختی کی ابتدائی حالت میں کچھ سادگی کے جوہر باقی ہیں اور وہ جان صاحب کی ریختی کی طرح سر تا سر فحش نہیں ہے۔ نورتن یعنی کلیات رنگین میں چار اردو دیوان موسوم بہ ریختہ، بیختہ، آمیختہ، انگیختہ کے علاوہ پانچ اور بھی کتابیں ہیں۔ مثنوی ایجاد رنگین، فرسنامہ، رنگین نامہ (محمود نامہ کے جواب میں)

مجالس رنگین، ایک نسخۂ نثر ہے جس میں تمام شعرار کی خبر لی ہے اور سب سے آخر میں ان کی بہترین تصنیف مثنوی دلپذیر ہے اور ان سب کا مجموعۂ نو رتن کے نام سے موسوم ہے رنگین کے ثبوت کمال کے دلائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انکی مثنوی دلپذیر اپنے زمانہ کی تمام اردو مثنویوں سے بہتر ہے، زبان اسکی نہایت صاف اور ستھری ہے اور حکایت بھی دلچسپ ہی، اور ترکیب و بندش ایسی بے تکلف کہ اس زمانے کے بڑے بڑے شعرا نے متفق ہو کر اسکی تعریف کی ہے، چنانچہ نامور معاصر شعرا مثل ثنار اللہ خان فراق بھورے خان آشفتہ شاگرد میر محمدی مائل، بسنت سنگھ نشاط، مرزا قتیل، مصحفی، انشار، سجاد علی بیگ راغب شاگرد رنگین اور جرأت سب کے تعریفی قطعات تاریخ آخر میں درج ہیں۔ چنانچہ جرأت کا مصرعۂ تاریخ ہے یہ ”ہے یہ بدر منیر سے بہتر“ ہر صنف شعر میں کم و بیش طبع آزمائی کی ہے اور مختلف قسم کے اخلاقی اور اور رخیل نظمیں بھی انکے ہاں ملتی ہیں اور شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انکی رنگین مزاجی اور شگفتہ بیانی کے خاص و عام اس عہد میں گرویدہ تھے، تیسرا دیوان ہزلیات سے پر ہے جس میں ایک قصیدہ شیطان کی مدح میں بھی لکھا ہے، چوتھا دیوان ریختی کا ہے، شاعری کے علاوہ رنگین اپنے عہد میں ایک لاجواب شہسوار اور گھوڑے کے ماہر اور اسکے خواص اور معالجات کی تدبیر میں بے نظیر سمجھے جاتے تھے بالآخر رنگین نے جمادی الثانی ۱۲۵۱ھ میں کامل اسی برس تک مشاہدہ نیرنگ عالم کر کے انتقال کیا، انکے چاروں دیوان نہایت خوشخط اور مطلا میرے کتب خانہ میں موجود ہیں اور مثنویات وغیرہ کا بھی مکمل مجموعہ موجود ہے، رنگین کے کلام میں اگر نقص ہے تو یہی کہ انکے کلام کی سادگی اکثر اوقات حد سے گذر جاتی ہے اور لطف سخن کو نقصان پہنچاتی ہے، پھر بھی اس ابتدائی زبان اردو کے زمانے میں آپ کی یہ سادہ بیانی ہزاروں قدر دانیوں کی مستحق ہے۔ کلکتہ کی بھی سیر کی تھی۔ آپکے کلام کا انتخاب ہدیہ ناظرین ہے۔

کیا کرتے ہو ناصح تم نصیحت رات دن مجکو	اُسے بھی ایک دن تم جا کے سمجھاتے تو کیا ہوتا

بوسہ تو ہمکو دیکر ثابت گناہ کرلے
گر قتل تجھکو قاتل منظور ہے ہمارا

کر اپنے دل میں تو انصاف میں روٹھا ہوں کیونکر
گلے میں ڈالکر باہیں منانا تیرا یاد آیا

تھی شعلہ یا وہ برق کہ جی میرا جل گیا
ایسی کی اک نگاہ کہ بس دم نکل گیا

تا حشر رہے یہ داغ دل کا
یارب نہ بجھے چراغ دل کا

رباعی

اے موجب عیش و شادمانی پھر آ
اے باعث لطف زندگانی پھر آ
میں ہوں بن تیرے چشم خوباں نہیں
پھر آ تو اب اے میری جوانی پھر آ

رہروان عدم ذرا ٹھیرو
ہم بھی چلتے ہیں ساتھ دم لیکر
آن سے کر خوف تیری محفل سے
اٹھ گئے جو کہ چشم نم لیکر
عاشق اُس مست کے ہیں جو نرگس
کیا کرینگے وہ جام جم لیکر

بازگشتی تیرے پھر کر یہ پھیرا دیکھنا
صدقہ تیرے اس ادا پر سے مجھے قربان کر
زاہد بتا کہ کعبہ میں کیا دیکھتا ہے تو
جاتے ہیں دیر میں تو صنم دیکھتے ہیں ہم
تو نہ گذرے گا جفا سے تو یار
جان سے اپنی گذر جائیں گے ہم

دیکھتے ہی انکو ہو جاتے ہیں شادی مرگ ہم
انکو پاتے ہیں تو پھر ہم آپ کو پاتے نہیں

دست قدرت نے عجب تیری بنائیں آنکھیں
مر گیا جن کو ذرا تو نے دکھائیں آنکھیں

[illegible]

ہاتھ میں ہاتھ ہے پر بوسہ نہیں لے سکتے
دسترس اتنی بھی ہرگز ہمیں ہیہات نہیں
اب ظلم کی ہم اُنکے جا کس سے داد چاہیں
اقلیم دل میں پھرتی جن کی دہائیاں ہوں
شب ہونے آئی لیکن اب تک نہیں وہ آیا
ایسا نہ ہو کہ قسمیں جھوٹی ہی کھائیاں ہوں
کچھ جھوٹ سچ کسی نے باتیں لگائیاں ہیں
جو آج تمنے پیارے آنکھیں چڑھائیاں ہیں
کس مست کی نگہ کی یہ بدشرابیاں ہیں
اوندھے پڑے ہیں ساغر ٹوٹی گلابیاں ہیں
رنگیں سرشک چشم اب کیونکر نہ سرخ نکلے
ہمکو وہ فندق پا اب یاد آئیاں ہیں
دل تھا جو لباطا اپنی سو گذران چکے ہیں
جی نذر کریں جی میں یہ اب ٹھان چکے ہیں

میں نے پُوچھا کہ چاہتے ہو مجھے مجھ کو تم چاہتے ہو کتنا کچھ	ق	سُن کے وہ بولے یوں اِدھر دیکھو اپنی چھاتی پہ ہاتھ دھر دیکھو
نشۂ حُسن سے جس وقت وہ مخمور ہوئے		ہاتھ سے اُنکے کئی شیشۂ دل چُور ہوئے
حوروں کے عوض مجھے الٰہی! کب مجکو بہشت کی ہے خواہش دل کو کوئی کس طرح سنبھالے روح نے جسم پر گرانی کی	قطعہ	دنیا میں تُو اِک نازنیں دے جو کچھ دینا ہے سو یہیں دے یاں جان کے پڑ رہے ہیں لالے اب یہ حالت ہے ناتوانی کی
مت اُچھالو پھول کو کچھ دشمنوں کو ہو نجائے دم آیا ناک میں اِس آہ اور زاری کے جینے سے		میرا جی ڈرتا ہے نازک ہے کلائی آپکی طبیبو موت ہی بہتر ہے اِس بیماری کے جینے سے
یہی رونا جو ہے تو تم رنگین		اُسکے کوچے سے آجکل نکلے
وہ نہ آئے تو تُو ہی چل رنگیں قیامت پر رہا موقوف پھر تو دیکھنا اُسکا اپنے کی بات دل میں کھٹکتی ہے راتدن		اِس میں کیا تیری شان جاتی ہے اگر اک دم کے دم آنے میں وہ تاخیر کرتا ہے کب دل پہ بار ہوئے ہی بیگانہ کچھ کہے
جب اپنی والیوں پر عشق آتا ہے تب اے رنگیں		اگر پتھر کا دل ہو اُس میں بھی تاثیر کرتا ہے

رنگین

رنگین - لالہ بلاس رائے برادر خورد مہاراجہ بینی بہادر قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں جوان خوبصورت خوش سیرت صاحب اقتدار بریلی کے رئیس اعظم تھے، اگرچہ دیوان مرتب کیا تھا لیکن انکے اشعار میں مزا نہیں۔ چند شعر درج ہیں۔

میں تیرے ظلم کو دیکھے ہوئے کہتا ہوں اے ظالم پہچان لیجو مشہدِ رنگیں کو اے صبا	جو بر تقدیر تو میرا خدا ہوتا تو کیا ہوتا اُٹھتا ہے اُسکی خاک سے اب تک غبار سرخ
غیروں کے پاس جانا ہمسے کبھی نہ ملنا	افسوس ہے تو یہ ہے ارمان ہے تو یہ ہے

رنگین

رنگین منشی موہن لال کایستھ ساکن دہلی، افسوس کہ بجز اس شعر کے نہ کلام مِلا

نہ حال معلوم ہوا۔

باد صبا نے مے سے بھرا ہے ایاغ گل		رنگین نہیں ہے قطرۂ شبنم یہ باغ میں

رنگین

رنگین - میر اکبر علی مرحوم عرف میر سنگی، لکھنؤ کے باشندے تھے چنانچہ انکے نام کا ایک محلہ اس وقت تک لکھنؤ میں موجود ہے، جس زمانے میں کہ مرزا سودا نے اپنی عمر کے آخری دس سال نوابانِ اودھ کے دامن دولت سے وابستہ ہوکر بسر کیے، میر رنگین نے بھی انہی ایام میں مرزا صاحب موصوف کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ انکے کلام میں لکھنؤ کا رنگ غالب معلوم ہوتا ہے، یہ چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

رہا کرتا ہے ہر دم وہ بت بے پیر آنکھوں میں		نئی ہے مردمک کی جلوہ گر تصویر آنکھوں میں
ہو جب تیر قضا سے مرغ دل نخچیر آنکھوں میں		برنگ طائر بسمل نہ کیونکر ہر گھڑی تڑپے
مگر لکھی ہے میرے قتل کی تحریر آنکھوں میں		تری آنکھوں کے یہ ڈورے نہیں ہیں صرح ابقاتل
ترے عاشق کا دم آیا بت بے پیر آنکھوں میں		دکھا جا آنکر صورت خدا کیواسطے اپنی
لگائی ہمنے خاک مرقد شبیر آنکھوں میں		تصور میں زیارت جب ہوئی حاصل ہمیں رنگیں

رنگین

رنگین - منشی انور علی باشندہ فتحپور ملازم محکمۂ تعمیرات ریاست بھوپال، حضرت صفا رئیس بھوپال کے تلامذہ میں سے ہیں زیادہ حال معلوم نہ ہوا یہ کلام کا انتخاب ہے۔

کہتا ہے پپیہا کہ زمانہ ہے پیار کا		اُس بھولی بھولی شکل پہ دل لوٹ کیوں نجائے
پژمردہ ہو گیا گل رخسار یار کا		اللہ رے نازکی جو تصور میں بھی چھوا
دیکھو رہے گا پھر نہ زمانہ بہار کا		جوش شباب کہتا ہے ارمان نکال لو

اللہ صدقے تیری کریمی کی شان پر		میرا فسانہ اور عدو کی زبان پر
پی آئیں چلکے پیر مغاں کی دکان پر		آئی بہار چھائی گھٹا آسمان پر
آسیب کا خلل تو نہیں اس جوان پر		کہتے ہیں ہم نشیں سے مجھے غش میں دیکھکر
مطلب کا کوئی حرف نہ آیا زبان پر		کہنے کو تو فسانۂ غم اُن سے کہدیا

رنگین

رنگین۔ منشی ناصر حسین خان بھوپالی شاگرد حضرت افسوں، بھوپال میں ملازم اور یہ کلام ہے

پھولا پھلا ہے باغ دلِ داغدار کا
زخمِ جگر دکھاتے ہیں عالم بہار کا

خود ہی جنابِ عشق نے رتبہ کیا بلند
خواہاں ہوا تھا کب سرِ منصور دار کا

کس شوخ کے خیال نے بیتاب کردیا
طاقت نہ ضبط کی ہے نہ یارا قرار کا

مژگاں سے کیا مقابلہ رنگیں بقولِ داغ
دل ایک ہاتھ کا ہے جگر ایک وار کا

رنگین

رنگین۔ منشی محمد ایوب حال مقیم حیدرآباد نسیم دکن سے کلام منتخب ہو کر درج ہوا۔

شوخی کہیں عیاں ہے ستم ہے نہاں کہیں
محمل کا اسکے پردہ نہو آسماں کہیں

اسجا نہیں ہے شیخ و برہمن کا کوئی فرق
کعبہ سے بڑھ نہ جائے ترا آستاں کہیں

مقتل ہیں تم بھی آؤ تماشے کیواسطے
بسمل تڑپ رہے ہیں کہیں نیمجاں کہیں

رنگین

رنگین۔ عالیجناب سری راجہ ہری دت صاحب دوبے بہادر رنگین راجہ جونپور اودھ کے تعلقہ دار ہیں اِنکے بزرگ بڑے صاحب اقتدار امیر گذرے ہیں پچیس برس سے فن شعر کا شوق ہے، حضرت وسیم اور حضرت ریاض خیرآبادی اِنکے اُستاد ہیں، کلام ہمرشید کا انتخاب ہے

دمِ نزع دیدار آکر دکھاؤ
دم آنکھوں میں اٹکا ہوا ہے کسیکا

ادائیں غضب شوخیاں ہیں قیامت
شبِ وصل کیا پوچھنا ہے کسیکا

تڑپتا ہے دل کی طرح اپنے کوئی
کسی پر جو دل آگیا ہے کسیکا

اثر تو فلک سے اُتر آ خدارا
بلند آج دستِ دعا ہے کسیکا

گھبرائی ہوئی پھرتی ہے گردوں پہ پریشان
فریاد ہماری، دلِ مضطر سے نکلکر

کیا گت بنی ہے شیخ فضیلت مآب کی
رندوں نے مے سے ریش رنگی ہے جناب کی

تیری نگاہِ شوخ کی شوخی نے بزم میں
تصویر کھینچدی ہے مرے اضطراب کی

دستِ نازک سے ہے اِسکا پھیرنا مشکل اگر
آپ یوں ہی حلق پر تلوار رہنے دیجئے

اِس ظلم کا تجھ پر فلکِ پیر پڑے صبر
کیا مفت جوانی ہوئی برباد کسی کی

سینے سے ہیں کیا داغِ محبت کو مٹاؤں
زاہد کی جب سے دخترِ رز آشنا ہوئی
رندوں کو دختِ رز جو لگاتی نہیں ہے مُنھ
کہتا ہے لیکے دلکو مرے چھیڑ سے وہ شوخ

یہ تو ہے نشانی دلِ ناشاد کیسی کی
حوروں سے چاہ آپ کو اسکی سوا ہوئی
صحبت میں رہکے شیخ کی یہ پارسا ہوئی
پھر مجکو دیجئے وہ مری چیز کیا ہوئی

مرنیوالوں سے تمھارا یہ سوال اچھا ہے
کہتے ہیں مجکو سُنا کر کہ یہ مال اچھا ہے
بعدِ مُردن بھی وہی چھیڑ چلی جاتی ہے
کبھی آتا تو ہے تو اُسکی عیادت کے لیئے
پیتے ہی ایک جام کے مدہوش ہو گئے

وصلِ حور اچھا ہے یا میرا وصال اچھا ہے
دل کے لینے کو یہ اندازِ سوال اچھا ہے
قبر پر پوچھتے ہیں آکے یہ حال اچھا ہے
یہ بُرا بھی ترے بیمار کا حال اچھا ہے
دُنیا کے رنج ہم کو فراموش ہو گئے

قفس لیچل مرا گلشن میں صیاد
دکھادے سیر مجکو بوستاں کی

روان

روان۔ بلبلِ شاخسار معانی، گلِ نو دمیدہ چمنستان سخندانی سخنورِ رنگین بیان منشی جگت موہن لال روان تخلص، وطن قصبہ موراوان ضلع اناؤ، مولد اناؤ خاص تاریخ ولادت ۱۴ جنوری ۱۸۸۹ء فارسی و عربی کی تعلیم اناؤ کے مکتب میں مولوی سبحان خاں سے پائی مشکل تعلیم شروع ہوئی تھی کہ ۱۸۹۸ء میں آپکے والد منشی گنگا پرشاد صاحب وکیل کا انتقال ہو گیا اور اسکے بعد ایک عرصہ تک اوقات پریشانی میں کٹی، انٹرنس تک کی کتب مکان ہی پر خارجی طور سے پڑھیں ۱۹۰۷ء میں موراوان ہائی اسکول ضلع اناؤ میں داخل ہو کر انٹرنس درجۂ اول میں پاس کیا، ۱۹۰۹ء میں ایف اے کیننگ کالج لکھنؤ سے پاس کیا اور اپنے کالج میں اول نمبر ملا جسکے صلہ میں کالج کا نقرئی تمغہ عطا ہوا ۱۹۱۱ء میں بی اے اُسی کالج سے پاس کیا اور اس امتحان میں بھی کالج میں اول نمبر رہا جسکے صلہ میں تمغہ طلائی عطا ہوا ۱۹۱۳ء میں ایم اے اور ۱۹۱۴ء میں اول سال ایل ایل بی پاس کیا۔

شاعری کا شوق بچپن سے ہے، الف بے شروع کرنے سے پہلے شعر کہنے لگے لکھنؤ

پہنچکر شعرائے حال سے نیاز حاصل کیا اور جناب افضل خلف جناب سیر مرحوم وجناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز سے تلمذ حاصل کیا، اُردو میں غالب اور فارسی میں حافظ کے کلام سے دلی اُنس ہے۔ قریب قریب تمام ہندوستان کی سیر کرچکے ہیں، تاریخی واقعات اور قدیم عمارتوں کے دیکھنے کا خاص شوق ہے اور فرصت کا بیشتر وقت اِسی سیر میں کٹتا ہے گویا یہی زندگی کا اُصول ہے، سیر کرو، خواہ سیر کتب، خواہ سیر دنیا، آپ نوجوان، نومشق مگر بڑے طباع اور ذہین کہنے والے ہیں، تین چار سال اُدھر کیننگ کالج کے مشاعروں میں انھیں کا نمبر اول رہتا تھا، نیچرل نظمیں بھی خوب لکھتے ہیں، غزل گوئی کیطرف البتہ میلان کم ہے، مشاہدات نیچر خوب نظم کرتے ہیں، دل میں درد اور زبان میں تاثیر پائی جاتی ہے۔ تلاش مضامین کے ساتھ ساتھ ترکیبیں ستھری دلنشین اور الفاظ موزوں اچھی بندش میں سلک نظم میں پروتے ہیں۔ آپکے کلام کا بیشتر حصہ تاریخی معلومات علمی قابلیت اور قدرتی مناظر کی دلکش تصاویر سے مملو ہے، نشستِ الفاظ قابلِ تعریف ہے اور تخیل کی بلند پروازی قابل داد الغرض آپ ایک ہونہار سخنور ہیں اور اُمید ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ آپکا کمال روز بروز ترقی حاصل کریگا

وحشتِ دل عشق گیسو میں یونہی کچھ کم نہ تھی
اور سودا بڑھ گیا سیر بیاباں دیکھکر

ہونیوالا ہے کسی بیکس کا ان ہاتھوں سے خوں
یہ بتاتا ہے برہمن دستِ جاناں دیکھکر

ہو گیا اُن پر اثر انداز میرا ضبطِ عشق
آپ حیراں ہوگئے وہ مجکو حیراں دیکھکر

یہ نہ پوچھو کاٹتا ہوں قید میں دن کسطرح
سقفِ زنداں دیکھکر دیوارِ زنداں دیکھکر

جُونتو اپنی ہستی موہوم یاد آتی نہیں
دِل بھر آتا ہے مگر گورِ غریباں دیکھکر

دستِ بستہ سر سے جب باندھے کفن پہنچا رواںؔ
قتل ہی کرنا پڑا اُن کو یہ ساماں دیکھکر

بتوں کا ذکر کرتے ہیں خدا کی یاد کرتے ہیں
فرشتے بھی نہیں کرتے جو آدم زاد کرتے ہیں

ہماری آخری ہچکی پہ وہ ارشاد کرتے ہیں
اُنھیں کو ضبط کا دعویٰ تھا جو فریاد کرتے ہیں

ترے بیمارِ غم کا آج شاید وقت نازک ہے
کہ سارے چارہ جُو بیٹھے خدا کو یاد کرتے ہیں

یہ حالت دیدنی ہے تیرے بیمارانِ الفت کی
کہ اہلِ درد چپ ہیں چارہ گر فریاد کرتے ہیں

تلوّن کا اثر تیرے ترے عشاق تک پہنچا
کبھی آہیں، کبھی نالے کبھی فریاد کرتے ہیں

رواںؔ کے نزع کا عالم کسی نے اُنکو لکھا تھا
جواب آیا، کہ بسم اللہ ہم بھی صاد کرتے ہیں

دیکھنا اے ناخدائے بحرِ اُلفت دیکھنا
دل کی کشتی سنگِ عصیاں سے کہیں ٹکرا نجائے

کیا غضب ہی ہوں تو آنکھیں دیکھنے کیواسطے
اور ہم چاہیں کہ کچھ دیکھیں مگر دیکھا نجائے

اُف رے کمزوریٔ دل، اللہ رے کارِ تیر دست
اپنا ہی چاکِ جگر دیکھیں ہم اور دیکھا نہ جائے

پھونکا ڈالا سوزِ غم نے جسم وجاں کیسے سرشک
یہ قیامت ہے کہ ہم روئیں مگر رویا نہ جائے

کھینچتی ہے اُنکو ہر دل کی کشش اپنی طرف
اپنے گھر سے وہ جو نکلیں بھی تو اب نکلا نہ جائے

کر دیا ہے کام میرا ختم جب فریاد نے
آسماں تک اب نہیں جاتی تو خیر اچھا نجائے

پھونک دے جسم و جگر کیا یہ بھی امکاں میں نہیں
آسماں تک آہِ سوزاں جسنے یہ مانا نجائے

اپنی قسمت ہی وگرنہ ای دلِ وحشت سرشت
اپنے گھر میں وہ بلائیں ہمکو اور جایا نجائے

ایک ہی دریائے بے پایاں کے قطرہ ہم ہیں سب
حیف ہی گر ہم میں کوئی جانبِ دریا نجائے

آنکھیں کھل جائینگی اس بے مائگی کو دیکھ کر
خیر اسی میں ہے کہ قطرہ جانبِ دریا نجائے

ضعف کا تو جب مزہ ہے ای خیالِ روئے دوست
دلسے ہم چاہیں کہ کچھ بولیں مگر بولا نجائے

منزلِ راہِ عدم میں جا بجا لکھا ہے یہ
لوٹنا ہو جس کو وہ اِس راہ سے اصلا نجائے

اب نفس کے ساتھ ساتھ آنے لگے ہیں لختِ دل
حال بہتر ہے مریضِ غم کا کچھ پوچھا نجائے

غرض رہبر سے کیا مجھکو گلہ ہے جذبِ کامل سے
کہ جتنا بڑھ رہا ہوں ہٹ رہا ہوں دور منزل سے

حصولِ آرزو کی کیا توقع ایسے غافل سے
جو دل میں رہکے بھی واقف نہیں بیتابیٔ دل سے

سکوتِ بیمحل تقریرِ بے موقع کی تہمت کیوں
اُٹھانا ہو تو یوں ہمکو اُٹھا دو اپنی محفل سے

یہ ارمانِ ترقی آج ہے دعویٰ خدائی کا
اُسی دل کو جو کل تک تھا لہو کی بوند مشکل سے

گلِ و لالہ پہ آخر کر رہا ہے غور کیا گلچیں
یہ وہ خوں ہے جو ٹپکا تھا کبھی چشمِ غزالِ دل سے

شب مہتاب دریا کا کنارا اور یہ سناٹا
تمھیں اس ساز پر ہم خوش کرینگے نغمۂ دل سے
تمھیں یہ ہٹ کہ پہلو میں تمھارے ہم نہ آ بیٹھیں
ہمیں یہ ضد کہ تمکو کھینچ لینگے جذب کامل سے
غضب ہی جلتے پروانوں کا انکی بزم میں کہنا
رواں یا یوں فدا ہو جاؤ یا اٹھ جاؤ محفل سے

شاعری

مرحبا مشاطۂ زلف مضامین بلند
رازدار ضبط دل اے پردہ دار راز نفس
اے بہار بیخزاں ای آفتاب لازوال
اے نشان زندگاں - ای رنگ خوناب جگر
جیپہ سو جاں سے ہو دل صدقے ترا وہ نادے
خون دل کھا کر بھی جبکو تیری لغت لگگئی
عاشق شیدا ہی ہر بلبل ترا وہ گل ہے تو
اے رئیس گوشۂ عزلت گزینان الم
اے زبان غیبای نیچر کی سچی ترجمان
جی لبھاتی ہی تپش جسکی وہ دردجاں ہی تو
تو وہ سودا ہی کہ لیں ہم راحت جان کے عوض
کب تری معراج کی ہمسر ہے معراج شہی

رہبر راہ خدا، ہادیٔ جان دردمند
کاشف اسرار باطن عکس سوز و ساز نفس
کر نہیں سکتا تجھے جور زمانہ پائمال
نور قلب باصفا - تعبیر جذب پُر اثر
جسنے عالم کو کیا بسمل ترا انداز ہے
صدمۂ جانکاہ تنہائی سے فرصت ملگئی
شاہد رعنا ترا ہر گل ہی وہ بلبل ہے تو
اے شریک حال زار صاحبان درد و غم
نیر افلاک شہرت یادگار جاودان
دل کو بھاتی ہے خلش جسکی وہی پیکان ہی تو
تو وہ سودا ہے نہ دیں ہم جنس دوراں کے عوض
تیرے قدموں پر نچھاور سینکڑوں تاج شہی

.....

پپیہا

وہی تان پھر سنا دے مرے خوشنوا پپیہے
اسی دردمند دل سے اسی صوت مضمحل سے
مری نیند اچٹ گئی ہے تری صوت جانفزا سے
یہ گھٹائیں کالی کالی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے جس طرح ہے حاصل یہ کمال عشق نسیاں
یہ دھرا ہے نسخۂ دل یہ کھلا ہے باب حدت

مرے دلربا پپیہے مرے خوش ادا پپیہے
ترے عشق کے تصدق وہی راگ گا پپیہے
دل مضطرب ہے بیکل اسے تو سلا پپیہے
کوئی تان اونچے سُر میں وہی پھر لگا پپیہے
وہی راہ و رسم الفت مجھے بھی سکھا پپیہے
جسے پھر کبھی نہ بھولوں وہ سبق پڑھا پپیہے

تجھے روئے گل دکھا دوں تجھے سرو سے ملا دوں — تری بیکلی کا آخر ہے علاج کیا پپیہے؟
ترا صبر اور توکل، ترا ضبط اور قناعت — تجھے آفریں پپیہے، تجھے مرحبا پپیہے
یہ غضب کی آہ و زاری یہ بلا کی بے قراری — تجھے کس کا ہے تصور ہمیں کچھ بتا پپیہے

[illegible] ۱۹۱۱

آہ اے نو واردِ بزمِ رباطِ روزگار — آہ اے تازہ اسیرِ گردشِ لیل و نہار
آہ اے دیباچۂ شرحِ کتابِ دردِ دل — آہ اے عنوانِ بابِ اضطرابِ جانگسل
آہ اے سرنامۂ افسانہائے جانگداز — آہ اے سرخیِ مضمونِ نوائے سوز و ساز
آہ اے نوبت نوازِ ماجرائے حسن و عشق — آہ اے افشائے رازِ انتہائے حسن و عشق
آہ اے تازہ بیانِ داستانِ وصل و ہجر — آہ اے زندہ نشانِ ترجمانِ وصل و ہجر
آہ اے پُر فن سراغ نامہائے اشتیاق — آہ اے روشن چراغِ کلبۂ تارِ فراق
آہ اے تعبیرِ خوابِ مستِ ایامِ شباب — آہ اے تفسیرِ کیفِ بادۂ جامِ شباب
آہ اے زنجیرِ پائے نازکِ وہم و گماں — آہ اے تصویرِ احساسات و جذباتِ نہاں
آہ اے خمیازۂ سرمستیِ اندازِ حسن — آہ اے آوازۂ جاں بخشیِ اعجازِ حسن
آہ اے آوازۂ خاموشیِ شبہائے تار — آہ اے نقارۂ روپوشیِ دورازِ دیار

۲

سچ بتا بچے ترا وارث ترا والی ہے کون — پھول ہے تو کس چمن کا اور ترا مالی ہے کون
سچ بتا وہ دل کہاں ہے جسکا اک ٹکڑا ہے تو — آہ وہ آنکھیں کہاں ہیں جنکا اک تارا ہے تو
زینتِ آغوش ہے تو جسکی وہ مادر ہے کون — نور ہے جس گھر کا تو بچے بتا وہ گھر ہے کون
اختصارِ طولِ آزارِ نہانی سچ بتا — اے خمارِ بادۂ جوشِ جوانی سچ بتا
سچ بتا بچے تجھے اپنے وطن کا واسطہ — پھول ہے تو جس چمن کا اس چمن کا واسطہ
سچ بتا بچے مجھے کس باپ کا پیارا ہے تو — سچ بتا کس حسن کا ٹوٹا ہوا تارا ہے تو
کیا اُڑا لائی کسی گلزار سے تجکو ہوا — پھول ہوتے ہیں جہاں ایسے ہی پیدا خوشنما
یا عناصر میں ہوئی ترتیب پیدا اسقدر — خود مرکب ہوگئے اور بنگئے شکلِ بشر

تو کوئی مجموعۂ انوارِ اعلیٰ تو نہیں؟ — پھول غور و تو کسی خودرو شجر کا تو نہیں؟
تو کوئی اسرارِ پنہانی کا دفتر تو نہیں؟ — تو کسی میخانۂ معنی کا ساغر تو نہیں؟
تو کوئی آئینۂ رمزِ حقیقت تو نہیں؟ — تو کوئی گنجینۂ اسرارِ قدرت تو نہیں؟
یہ تو ہاں ہم جانتے ہیں عالمِ صغریٰ ہے تو — یہ بھی کچھ سمجھیں کہاں سے کس لیے آیا ہے تو
گر نہیں لائی صبا تزئینِ گلشن کے لیے — لائے ہونگے وہ تو ہم سب کے درشن کے لیے
آہ کیا میں مان لوں دنیا کے لوگوں کی دلیل — تجھ کو سمجھوں ثمرۂ کمزوریِ نفسِ ذلیل (۳)

آہ یہ تیری ادا، حسنِ تحیر زا ترا — روکشِ لطفِ تبسم آہ یہ رونا ترا
یہ ترا ننھا سا قد اور ننھے ننھے ہاتھ پاؤں — یہ ترا بھولا سا مکھڑا، گورے گورے ہاتھ پاؤں
دل نہیں کہتا کہ بدکاری کا ہے انجام تو — ہو رہا ہے گرچہ دنیا میں یونہی بدنام تو
حیف ہے لیکن اگر لوگوں کا کہنا ٹھیک ہو — حیف ہے گر آدمی کی عقل یوں تاریک ہو (۴)

آہ کیا انساں کا ہو سکتا ہے یوں بھی خون سفید — ڈالدے گھورے پہ اپنا مرکزِ جذبِ امید
توبہ توبہ حضرتِ انساں کی یہ کمزوریاں — اشرف المخلوق ہونیکا ہے دعویٰ پھر بھی ہاں
پال لینا کچھ ترا ماں کو تری مشکل نہ تھا — سنگ ریزہ تھا مگر پہلو میں اُسکے دل نہ تھا (۵)

یوں نکرتی ورنہ ماں اپنا فشارِ آرزو — یوں بناتی خود نہ ماں اپنا مزارِ آرزو
حسن کا برباد ہو جانا ہمیں بھاتا نہیں — میرے مولا یہ سمجھ میں راز کچھ آتا نہیں
باپ ماں سے نفسِ سرکش کی کہانی ہائے ہائے — اے معاذ اللہ بچے کی زبانی ہائے ہائے
خود غرض انسان تیری خود پرستی الاماں — یہ تری ناعاقبت اندیش مستی الاماں
خیر جو کچھ بھی تھا، ماں باپ ہی کا فعل تھا — اہلِ دنیا کو خلش معصوم بچے سے ہے کیا (۶)

آہ اے معصوم اے رمزِ حقیقت کی شبیہ — آہ اے مظلوم اے اسرارِ قدرت کی شبیہ
دارِ فانی کی ابھی تو نے ہوا کھائی نہیں — تجھ میں نامعصومیت بدباطنی آئی نہیں
رفتہ رفتہ ہوگا جب عالم میں ترا سن دراز — پیش آئینگے تجھے دنیا کے پستی و فراز

یا خوشی ہو جائیگی پیری مدارِ آرزو   یا کرے گا آسماں تیرا انتشارِ آرزو

ہمکو لیکن یہ نہیں امید بڑی زینہار   دیکھے زندہ رہکے تو اپنی جوانی کی بہار

چند روزہ عالمِ فانی کا ہے مہمان تو   جائیگا دنیا سے لیکر حسرت و ارمان تو

منظرِ عالم سے تو کرلے گا جبدم آنکھ بند   یوں کھینچیگے سانس ٹھنڈی بھرکے تیرے دردمند

پھول تو کھلکر بہارِ جانفزا دکھلا گئے   حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

لطف تو جب ہے کہ ہمکو کچھ بھی تیرا غم نہ ہو   اور تو سب روئیں لیکن آنکھ اپنی نم نہ ہو

ہمسے گر کوئی رواں پوچھے کہ یہ کیا ہوگیا   ہم کہیں دریا سے قطرہ ملکے دریا ہوگیا

یوں تو ہو جاتا ہے مایوسی میں ہر دل بیقرار   ہے مریضِ غم کا لیکن سخت ابتر حالِ زار

ضعف سے بیکار سب اعضا سراسر ہوگئے   لاغری سے ہے تنِ محزوں کی رگ رگ آشکار

جسم میں اب فرطِ غم سے خون اتنا بھی نہیں   جسکو کردے قلبِ مضطر نذرِ چشمِ اشکبار

منظرِ عالم سے ساری خوبیاں جاتی رہیں   اب کہاں لطف ہوائے باغ و سیرِ کوہسار

بار ہے آنکھوں کو پلکوں کا اُٹھانا اُف رے ضعف   ایک دفتر ہے نگاہِ لاغرِ بیمار زار

اب کہاں ہیں آرزوئے دل کی وہ بیباکیاں   اب کہاں ہے شوق کا وہ جذبۂ بے اختیار

ایک محشر ہے بپا اُسکے تخیل میں مگر   کشمکش میں ہے مریضِ مضطرب کی جانِ زار

اک طرف متمنئ عالم ہے جانِ دردمند   اک طرف دامن کشاں بچوں کا اخلاق و پیار

اک طرف مایوسئ دل مقتضائے ترکِ حرص   اک طرف ہے خوف بربادئ جملہ کاروبار

اک طرف ہے بندِ غم سے رستگاری کی اُمید   اک طرف دل میں خیالِ صحبتِ غمگسار

جانِ بیمارِ حزیں کو چین آئے کسطرح   مبتلا ہے سخت حیرانی میں عقلِ سادہ کار

رفتہ رفتہ پھر تخیل اس سے جاتا ہے گذر   دل پہ چھا جاتا ہے یادِ عمرِ رفتہ کا غبار

پھرتا ہے نظروں میں اُسکی پھر لڑکپن کا سماں   پھرتی ہے آنکھوں میں اُسکی پھر جوانی کی بہار

دیکھتا ہے ہر طرف حسرت بھرے انداز سے   یاد آتے ہیں اُسے سب ہمنشین و غمگسار

یاد آتے ہیں اُسے پھر اپنے اعمال قبیح — دل ہی دل میں اپنے ہوتا ہے نہایت شرمسار
غور کرتا ہے کرے اُنکی تلافی کچھ مگر — یہ خیال آتا ہے آخر ہے حیاتِ مستعار
دل ہی دل میں ہوتا ہے اپنے پشیماں وہ مریض — بازگشتِ عمر کی کرتا ہے خواہش بار بار
پھر اسی حالت میں ہو جاتا ہے غالب ضعفِ قلب — اور ہو جاتا ہے آنکھوں میں جہاں تاریک و تار

روح

روح محمد غیاث الدین تلمیذ حضرت وطن حیدرآبادی، رسالہ محبوب الکلام میں انکی بہت سی غزلیں نظر سے گذریں اُن میں سے چند اشعار انتخاب کر کے درج ذیل کیئے جاتے ہیں۔ دورِ موجودہ کے نو مشق کہنے والوں میں ہیں

روزِ محشر نہ ہوگا اتنا دراز — جتنا ہوتا ہے دن جدائی کا
ایک مدت سے ہیں اسیرِ قفس — مٹ گیا دھیان بھی رہائی کا
کھلے کیونکر دہن کا بھید اُنکے — نکتہ ہے سرِّ کبریائی کا
چھپکے پیتا ہے شیخ شب کو مے — کھل گیا حال پارسائی کا
اگر زنگِ خودی سے ہو صفا دل — تو ہے حسنِ ازل کا آئینہ دل

بے وصل ہی مر جانا تھا تقدیر میں اپنی — تدبیر کا کیا دخل ہے امرِ شدنی میں
اے منعمو کب تک طلبِ جاہ میں کوشش — مر جاؤ گے اک دن غمِ دنیائے دنی میں
نہ دل سیر ہوتا ہے ہوگا نہ ہرگز — تمہارے ستم میں کچھ ایسا مزا ہے

طاعتِ حق تم نہیں کرتے ہو حق کے واسطے — شیخ صاحب حور کی خواہش تمہارے دل میں ہے
تعجب کیا جو وقتِ دید آنکھ اپنی جھپک جاتی — تمہارے رخ میں کیا خورشید انور سے ضیا کم تھی
ضرورت کیا تھی ہمکو ہم جو کرتے سیرِ گلشن کی — چمن سے کیا دلِ پُر داغ میں اپنے فضا کم تھی

روحی

روحی۔ حافظ غلام یسین صاحب حیدرآبادی عرف یسین بادشاہ تلمیذ حضرت مسکین تھانوی، دو تین غزلیں ایک دوست نے دکن سے ارسال کی تھیں مگر حالات باوجود دریافت معلوم نہ ہوسکے، نمونہ کلام یہ ہے:

بناکے سہرا گریبانِ تار تار سے ہم
مراد لینے کو جاتے ہیں نوکِ خار سے ہم

تم اپنے ناز سے جنون سے پوچھ لو باعث
کہ مضطرب سے ہیں کیوں، کیوں ہیں بیقرار سے ہم

شب وصال وہ عشوہ کے ناز سے بولے
معاف کیجئے باز آئے ایسے پیار سے ہم

عجب طرح کی ہے یہ بیخودیٔ شوق وصال
کہ یار ہی کا پتہ پوچھتے ہیں یار سے ہم

وہ دن بھی یاد ہیں جھک کر کبھی نہ ملتے تھے
غرورِ حسن سے تم غیرتِ وقار سے ہم

روش

روشؔ میر حسین علی خلفِ میر خلیل باشندۂ فیض آباد نواب نظام الدولہ رئیس لکھنؤ عہد نواب غازی الدین حیدر کی سرکار میں داروغہ تھے اور مولوی محمد بخش شہید کے شاگردوں میں ممتاز

نہ کیوں ہو داغِ جگر کی بہار پہلو میں
کھلا ہوا ہے عجب لالہ زار پہلو میں

نہیں انیس کوئی ہجرِ یار میں اپنا
دلِ حزیں ہے فقط غمگسار پہلو میں

فقط اثر ہے یہ اُس گل کے خارِ مژگاں کا
کھٹک رہا ہے جو دل مثلِ خار پہلو میں

جو شب کو رہتا ہے گھر میں ہمارے یار روشؔ
تو ساتھ سوتا ہے رکھکر کٹار پہلو میں

جب وہ دکھلاتے ہیں آکر سرِ بازار آنکھیں
مانگتے پھرتے ہیں یوسف کے خریدار آنکھیں

اُسکی آنکھوں سے بھلا کرتی ہیں کیا ہمچشمی
جا کے بنوائیں کہیں نرگسِ بیمار آنکھیں

باغ میں جبکہ چلے ناز سے وہ سروِ رواں
کبک و طاؤس بچھاویں دمِ رفتار آنکھیں

تو وہ بت ہے کہ اگر دیر و حرم میں جائے
تیرے تلووں سے ملیں کافر و دیندار آنکھیں

پھرتی ہے نظروں میں کسکے دُرِ دنداں کی شبیہ
مثلِ نیساں ہیں ہماری جو گہر بار آنکھیں

اور کچھ جرم نہیں اسکے سوا اُن سے ہوا
ہاں فقط ایک نظر کی ہیں گنہگار آنکھیں

صورتِ قبلہ نما ہیں تری جانب او بت
نہیں پھرنے کی روشؔ کی کبھی زنہار آنکھیں

روشن

روشنؔ - روشن شاہ باشندۂ بریلی غدر سے چند سال پیشتر میرٹھ میں آرہے تھے بڑے خوش فکر موزوں طبع، حاضر جواب بزرگ تھے، ۱۸۷۵ء تک زندہ تھے، درویشانہ زیست بسر کرتے تھے، میرٹھ میں قیام کے زمانہ میں شیخ غلام محی الدین عشق سے بہت ارتباط تھا - اُردو

فارسی دونوں زبانوں میں شعر اچھا کہتے تھے۔

دیکھ کے مجکو منہ کو چھپایا اور حیا کا نام کیا
واہ رے تیری دانشمندی آپ ہی آپ کا کام کیا

نہ دُنیا کا رہا میں اور نہ دیں کا
پھپھولے پڑ گئے سینے پہ میرے
نچھوڑا عشق نے مجکو کہیں کا
جو تو نے ہار پہنایا سمیں کا

نہ کھینچ اے ماہرو شانہ سے اپنے بال جوڑے کا
وبالِ جانِ عاشق ہے ترا ہر بال جوڑے کا
پھرا رکھا ہی منہ اسکی طرف سے رشکِ مہ اپنا
سدا رہتا ہے اس باعث پریشاں حال جوڑے کا

قاصد جو اُسکے آنے کا لایا پیام رات
آنکھوں میں میری نیند نہ آئی تمام رات
جانے کو اُسکے پاس کے بے اختیار تھا
میں نے رکھا ہے دلکو بہت تھام تھام رات

یہ بات خوب نہیں ہم تو رات دن تم کو
دعا کیا کریں اور گالیاں سناویں آپ

رکھ لیے سر پہ جو اس بت نے کہیں چھو کے پھول
پیرہن میں نہ سمائے بخدا پھول کے پھول

آپ کرتے ہیں پیار نہیں
ہم کو ہاں کا بھی اعتبار نہیں
غیر سے ہوں پیار کی باتیں
ہیں یہ پروردگار کی باتیں

کوچہ میں ترے بیٹھ گئے جبکہ ہم اے یار
جوں نقشِ قدم پھر نہیں اُٹھنے کے زمیں سے
آنکھوں میں ذرا ٹھیر تو تا دیکھ لیں اسکو
اقرار یہ ٹھیرا ہے دمِ بازپسیں سے
پردہ وہیں دل پر سے اُٹھا اپنے دوئی کا
در پردہ جو باتیں ہوئیں اُس پردہ نشیں سے

سامنے تیرے اے کماں ابرو
تُرکِ عالم سے بانکپن سے گئے
تیرے کوچے کے اشتیاق میں یار
گھر سے ویراں ہوئے وطن سے گئے

ہم اپنے جی سے تری جستجو میں جانے لگے
نہ پایا تیرا ٹھکانا و ہم ٹھکانے لگے
ہم اپنے دل کی جو کلفت اُنھیں سنانے لگے
تو آپ ہنسنے لگے اور ہمیں رُلانے لگے
جہاں کے باغ میں جو گلبدن کہاتے تھے
وہ خود تمھارے لیے گل بدن پہ کھانے لگے
اثر کیا مرے نالے نے بارے کچھ رونق
جو اُس طرف سے سلام و پیام آنے لگے

نظر سے شفقت کی دیکھو پیارے کہ دل سے بندے ہیں ہم تمہارے
خدا پہ روشن ہے بندہ پرور رہے ہیں جیسے کہ ہم تمہارے

روشن یہ خراب ہمنے ہستی دیکھی — جو کچھ تھا بلند اُسکو پستی دیکھی
رباعی
جب جیتے تھے بستی نظر آتی تھی — اب نیست ہوئے تو ہمنے ہستی دیکھی

گر آنکھ ہمسے اپنی وہ لاکھ بار بدلے — دل ایک ہو رہا ہے آنکھیں ہزار بدلے

دلکی طپش سے گرمیٔ خورشید سرد ہے — سینہ اگر یہی ہے تو دوزخ بھی گرد ہے
کونسی جا ہے کہ جس جا نہ گذر اُس کا ہے — مثل خورشید جہاں دیکھئے گھر اُس کا ہے

منحصر ہے قاصد و پیغام خط پر دوستی — سو نہیں منظور اُسکو اس خط پر دوستی
بھولنا آتا ہی یاد اب اُس فرامشکار کا — کی غلط بد عہد کے عہد غلط پر دوستی

روشن — **روشن** ۔ مرزا جہاں شرف روشن ولد جہانگیر شرف گورگانی ساکن دہلی آپ کو تلمذ مولانا سید وحید الدین صاحب بیخود سے تھا ہیں۲۰ برس کی عمر سے شعر و سخن کا شوق رہا اور سب سے زیادہ تعجب خیز یہ بات ہی کہ بالکل ناخواندہ تھے بلکہ جو کچھ کہتے تھے دوسروں سے لکھوا لیتے تھے اپنی عقل و طبع کی جدت سے شعر و سخن کا چرچا مدام ہمدم رہا۔ دہلی میں کم اور لاہور وغیرہ مقامات میں زیادہ قیام رہا تقریبًا دو تین برس کا عرصہ ہوا کہ راہیٔ ملک بقا ہوئے بتیس برس کی عمر پائی ۔ یہ اُن کا کلام ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے ۔

اُسکی قدرت یہ اُسی کی شان ہے — خاک میں گویائی پیدا ہو گئی
خاک کے پتلے میں بھر دیں شوخیاں — شان خالق کی تماشا ہو گئی
قدِ آدم ڈھل گئی تصویر یار — آنکھ کی پتلی بھی سانچا ہو گئی
کیوں نہیں ملتا ہے مجھ سے تو بتا — بیوفا ایسی خطا کیا ہو گئی
اُسکے لب ہلتے ہی روشن جی اُٹھے — بات کافر کی مسیحا ہو گئی

تڑپ تڑپ کے گزاری ہی رات بھر ہمنے — وہ کہہ گئے تھے کہ آئینگے ہم چراغ جلے
دکھائے جلوہ جو داغ جگر پس مردن — ہماری قبر پہ آٹھوں پہر چراغ جلے
سنائیں سوزشِ فرقت کا حال کیا روشن — وہ آگ بھڑکی کہ سارے جگر کے داغ جلے

تیری چشمک بھی خوشی کے ساتھ ہے
دل لگی دل کی لگی کے ساتھ ہے

دردِ دل جاتا ہے کوئی چارہ گر
یہ ہماری زندگی کے ساتھ ہے

لڑکے جاتے ہو کہاں روشن سے تم
لطف جانیکا خوشی کے ساتھ ہے

روشن

روشن بابو منی لال روشن شاہجہانپور کے متوطن پہلے حضرت جوہر سے اصلاح لیتے رہے پھر حضرت احسان سے تلمذ اختیار کیا قاضی محمد خلیل کے مشاعرہ میں بریلی میں انکو دیکھا ہے، ذہین اور طبیعت دار شخص ہیں، شوخیٔ طبعی کا اثر کلام میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کوہکن کو کوہ اور مجنوں کو صحرا دیدیا
خاک اُڑانے کو مجھے اُس بت کا کوچہ دیدیا

عاشقوں میں آپنے اچھی مری توقیر کی
داغِ دل کیسا مجھے اُلفت کا تمغا دیدیا

تیرا غم مہماں ہوا تو یہ تواضع میں نے کی
خونِ دل پینے کو کھانے کو کلیجا دیدیا

کھیلتے پھرتے ہیں ہاتھوں میں لیئے شوخی کیساتھ
میں نے اُنکو دل دیا، گویا کھلونا دیدیا

آج وہ سہم گیا دیکھ کے حسرت کا ہجوم
وسعتِ دل کو مرے حشر کا داماں سمجھا

کس ناز سے کہتا ہے قیامت ہیں وہ قاتل
کیوں آج یہاں خون کا دعویٰ نہیں ہوتا

تمہارا ہیں نہیں عاشق تو تم عاشق سہی میرے
یہ کوئی بات بھی ہے کھیلنے جامہ سے باہر ہو

حسین خلق ہوئے ہیں ہنسی خوشی کے لئے
بنے ہیں عاشقِ ناشاد بیکلی کے لیئے

نہ دم لیا کہیں اکدم نہ چین سے بیٹھے
تمام عمر بھٹکتے پھرے کسی کے لیئے

او وعدہ فراموش کدھر بھول پڑا آج
تقدیر ہماری جو یہ صورت نظر آئی

مجبور ہوں معذور ہوں اے ناصحِ مشفق
اتنی تو یہ طبیعت جدھر آئی اُدھر آئی

آنکھوں میں پھرا کرتی تھی پہلے مگر اب تو
تصویر کسی شوخ کی دل پر اُتر آئی

حسینوں کا بھی یہ انداز عالم سے نرالا ہے
جفاکاری کا شیوہ ہے وفاداری کا دعویٰ ہے

خدا جانے کہ کیا ہم بیخودی میں کہہ گئے اُن سے
نہ اب کچھ بات بنتی ہے نہ اب کچھ عذر چلتا ہے

محبت اُٹھ گئی دنیا سے ایسی والئے بیدردی
کسی کی جان جاتی ہے کوئی محوِ تماشا ہے

جو مجھے بدنام کرتے تھے وہ رسوا ہوگئے	لو وہ جھوٹا لکھے مجکو آپ ہی جھوٹے ہوئے

روشن

روشن منشی اکرام اللہ خان روشن ہیڈ محرر تھانہ نصیر آباد ضلع بارہ بنکی معیار سے کلام منتخب ہوا

کیا اثر ڈالے مری تقدیر دیکھا چاہیئے	اے زباں تجھ میں ہے کیا تاثیر دیکھا چاہیئے
سامنے آئینہ رکھنے سے جسے آئے حیا	کس طرح کھچوائے وہ تصویر دیکھا چاہیئے
گھس گئے سب ناخن تدبیر ہے کوشش کی حد	حل ہو کیونکر عقدۂ تقدیر دیکھا چاہیئے
بل دیئے جاتے ہیں زلفوں میں الٰہی خیر ہو	پاؤں پڑنے کو ہے کیا زنجیر دیکھا چاہیئے

روشن

روشن منشی دیوان بخش لال صاحب متخلص بہ طالب و روشن ابن منشی دیوان منالال صاحب کایستھ دہلوی حضرت غالب مرحوم سے تلمذ کا دعویٰ ہے مگر بظاہر اسکی کوئی اصلیت معلوم نہیں ہوتی، انکے بعض احباب انھیں مرزا دولھا اور بعض صرف استاد کہتے ہیں اور فی الحقیقت انھیں دعوی کمال ہے، باسٹھ[۶۲] ترسٹھ[۶۳] برس کی عمر ہے انکے بیٹے نے کچھ کلام انتخاب کر کے بھیجا تھا اُس میں سے چند شعر درج ہیں

کاوشِ مژگانِ جاناں کی دلا دیتا ہے یاد	پاؤں میں چبھ چبھ کے ہر دم ٹوٹ جانا خار کا
کرم ہو یا ستم الفت میں ہمکو سب برابر ہے	خوشی ہے وصل کی اچھی نہ فرقت کا ہی غم اچھا
روشن میں لبھاتا ہوں اُنھیں شعر سنا کر	وہ مُنہ بھی لگاتے نہیں مجھ ہرزہ سرا کو
الٰہی کیا فسوں دل پر کیا ہے چشم میگوں نے	کہ ہم کعبہ سے پھر کر ہوگئے رہ گیر میخانہ
یہی گردِ دور دورہ میکشی کا ہے زمانہ میں	تو کعبہ سے کہیں بڑھ جائیگی توقیر میخانہ

رونق

رونق شاعر نازکخیال ظہوری ظہور نظیری نظیر نواب احمد علیخاں بہادر رونق رئیس ٹونک شاگرد رشید نواب مرزا ظہیر دہلوی و سید امراؤ مرزا انور مرحوم آپ بانئے ریاست ٹونک کے ساتویں صاحبزادے اور رموز فن سخن سے خوب واقف تھے، جب سنہ ۱۲۵۱ھ میں نواب امیر خاں نے انتقال کیا اور نواب وزیرالدولہ مسند نشین ہوئے بیس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ انکا مقرر ہوا، رونق مرحوم وسیع المشرب، خندہ پیشانی، خوش اخلاق، مہمان نواز سیر چشم رئیس تھے اوائل مشق میں نوازش حسین خاں تنویر دہلوی سے اصلاح لیتے رہے

لیکن ۱۵ برس کی عمر میں سید آمراو مرزا انور سے تلمذ اختیار کیا اور سالیقہ کلام ضائع کر دیا۔ اُنکی توجہ سے بہت جلد خود اچھا کہنے لگے۔ مہاراجہ رام سنگھ بہادر والی جیپور سے دوستانہ مراسم تھے اور اسی تقریب سے سالہا سال جیپور میں بطور انکے مہمان کے قیام پذیر رہے اجمیر میں بھی کئی برس بسر کیئے۔ چند سال ہوا جب حضرت انور کا انتقال ہوگیا اور حضرت ظہیر بھی مہاراجہ رام سنگھ کے سرگباش ہونیکے بعد خانہ نشین ہو گئے تو انھوں نے اُنھیں اپنے پاس بُلا لیا اور کلام میں اُن سے مشورہ لیتے رہے بعض بعض غزلیں انکے دیوان میں ایسی ہیں کہ اچھے اُستادوں کے کلام سے ٹکر کھاتی ہیں مشکل زمینوں میں بالخصوص بہت خوب کہتے تھے اور روزمرہ اہل زبان پر اچھا عبور تھا۔ ایک دیوان مطبوعہ دوسرا غیر مطبوعہ ان سے یادگار ہے آخر ۱۳۱۹ھ میں بعالم ضعیفی انتقال کیا۔ حضرت ظہیر انکے بڑے ثناخوان اور رئیسانہ دلنوازی اور حسنِ سلوک کے بڑے مداح تھے اور بڑی محبت اور احترام سے انکا ذکر راقم تذکرہ سے کیا کرتے تھے انکے شاگردوں میں علی محمد خاں ضیا عبدالقادر خان ضمیر انکے صاحبزادے چھیتر مل مجبور ملا شمس الدین خان شمس مشہور ہوئے

ہے یہی فکر یوں نہ ہو یوں ہو	ان ہوسہائے خام نے مارا
آب خنجر سے تر ہوا نہ گلو	سر بہت تشنہ کام نے مارا
دل زمانے سے ہٹ گیا اپنا	ہم بھلے اور گھر بھلا اپنا

دل ہی کہاں جو مانگتے ہیں آپ بار بار	سو بار سینہ چیر کے تمکو دکھا دیا
خیالِ وصل کجا اور کجا وہ خلوتِ ناز	کہ جس میں وہم و گماں کا گذر نہیں ہوتا
میرا سوال کیا ہے تمہارا جواب کیا	گئے ہو پی کے گھر سے عدو کے شراب کیا
بچ گئے ہم صدمہائے ہجر سے	موت کا اچھا بہانا مل گیا
تجھ سے نہ یہ گماں تھا اے بانیِ تغافل	غیروں کے واسطے ہو ہم پر عتاب اتنا
اک وار میں شمشیر کے ہوتے ہیں سبکدوش	سن لیجئے قصہ ہے بہت مختصر اپنا

سر جائے محبت میں کہ ایمان پہ بن جائے
ہو جائے کسی طرح وہ کافر مگر اپنا

سمجھتے تھے اُسے ناداں مگر وہ تو بلا نکلا
کہ دشمن بن گیا نام محبت منہ سے کیا نکلا

یوں گراں ہے نفس نفسِ شبِ ہجر
جیسے بیمار پہ ہے بھاری رات

کہئے تجھے کس لیئے چلے اب کیوں
حیف اِس کا نہ کچھ کھلا باعث

عیسیٰ سے ہو سکا نہ ترے زار کا علاج
مشکل بہت ہے عشق کے بیمار کا علاج

پھر بڑھے ہیں ناخنِ دستِ جنوں
پھر ہمارے داغ پر آیا کھرنڈ

حضرتِ دل ہی اگر لطف اٹھانا منظور
کیجئے زہرِ غمِ عشق کا کھانا منظور

دلِ بیتاب تو سو بار ہدف ہو جائے
ناوکِ یار کو ہو بھی مگر آنا منظور

اِس طرح واعظ بیاں کرتا ہو واں کا حال کچھ
آسماں سے جیسے آیا ہی خدا کو دیکھ کر

خدنگِ نیم کش اُس کے کہیں رک کے سے رکتے ہیں
نگاہیں پار ہوتی ہیں جگر میں تیر بن بنکر

یکساں ہیں اہلِ دل کے لیئے دونوں صورتیں
جو شکلِ بیخودی ہے وہی ماجرائے ہوش

قتل خنجر سے نہ کر یہ مان لے یاروں کی ایک
ہے نگاہِ ناز تیری لاکھ تلواروں کی ایک

وہاں ہے انتظامِ غیر یاں تک
کہ ہم کیا جا نہیں سکتا گماں تک

تغافل سے ترے غفلت یہ چھائی
کہ غافل سو رہے ہیں پاسباں تک

دوئی جب مٹ گئی پھر بحث کس سے
یہ سب جھگڑے ہیں رونق ایں و آں تک

کہتے ہیں مرے اشکِ مژہ سے کہ چلے ہم
پیدا ہوئے جب سے ترے سایہ میں پلے ہم

گھر آئے مرے شکوہ وہ اِس شرط سے رونق
واں چلنے کو چلتے ہیں نہ ٹھیرینگے ولے ہم

لیجائے وہ ناوک جگر و دل کو تو اچھا
یوں ہی مرے سینے میں یہ بیکار پڑے ہیں

تشہیر کا یا حکم ہو یا دفن کا اُن کے
قاتل ترے کشتے سرِ بازار پڑے ہیں

ہے سب کو گماں دامنِ قاتل میں کہ گل ہیں
چھینٹے جو مرے خوں کے دو چار پڑے ہیں

رونق ہے غضب جوش ہیں دریائے محبت
گرداب میں لاکھوں ہی ہوس کار پڑے ہیں

ترے چمن حسن سے ہرگز نہیں بہتر
ہم بھی کوئی آفت ہیں کہ پھرتے ہیں طلب گل
دیکھنے سے ترے زاہد کی یہ حالت بگڑی
کس طرح ہم اٹھیں دزدیدہ نظر سے تکیں
پھر دوبارہ اسنے حالِ زار ہم کیونکر کہیں
دل تو کیا امیدِ دل مثلِ رگِ جاں قطع کی
سایۂ لطفِ خدا ہے سایۂ دیوارِ یار
کیا دخل مہرباں جو کسیکو خبر بھی ہو
دیوار و در سے سرکو نہ پھوڑیں تو کیا کریں
کچھ زخم الم دل میں ہیں کچھ داغ جگر میں

ہم خواب میں گلزارِ ارم دیکھ چکے ہیں
فرقت کے بھی رنج والم دیکھ چکے ہیں
خود کہیں سبحہ کہیں جبہ و دستار کہیں
خوف ہے یہ کہ نہو جائیں گنہگار کہیں
کہدیا اک بار سو سو بار ہم کیونکر کہیں
وہ نگہ کچھ اور ہے تلوار ہم کیونکر کہیں
رونق اس کو سایۂ دیوار ہم کیونکر کہیں
پرہے سے دوستی تجھیں تہِ نظر بھی ہو
کافر کسی طرح سے شبِ غم بسر بھی ہو
یہ پھول ملے ہیں چمنِ دہر سے مجھ کو

شرمِ عصیاں سے ہم ایک ایک سے ہیں چھپتے پھرتے
ڈھونڈتی پھرتی ہے اللہ کی رحمت مجھ کو

تصدق اس زباں کے اس پیامِ ناز کے قرباں
کہ اپنا حالِ دل کاغذ پہ لکھکر بھیجدو ہمکو

دل سے اپنی یاد پر قربان ہوں
دل تک ہو چاک تیغ جو سر پہ لگایئے
نسخہ میں طبیبوں نے لکھا اور ہی کچھ ہے
اعدا کی ملاقات سے انکار ستم
اب اس مقام پہ ہیں بیخودانِ جلوۂ دوست
نشاطِ پرسشِ احوال میں چھلک اٹھی
جو ربطِ خسرو و شیریں کا ذکر میں نے کیا
کہا جو میں نے کہ رونق سے رم ہے کیوں تو کہا
ایک جلوہ میں مٹادی وہ پریشان نظری

بیخودی میں بھی مجھے ہے یاد تو
عاشق ہوں ہاتھ سوچ سمجھ کر لگایئے
بیمارِ محبت کی دوا اور ہی کچھ ہے
کیا کہتے مگر ہمنے سُنا اور ہی کچھ ہے
کہ آزمایش دار و رسن لگے کرنے
ہم اُن سے شکوۂ رنج و محن لگے کرنے
وہ شرح جانکنیٔ کوہکن لگے کرنے
یہ خوف ہے کہ نہ دیوانہ پن لگے کرنے
خوب بگڑے ہوئے عاشق کو سنوارا تو نے

دیکھ کر مجھکو جو دامن سے کیا تمنے حجاب
لب پہ ایک ایک کے کیا کیا سخن دامن ہے

نہ باتیں کیں نہ سنیں دی نہ پہلو میں ذرا ٹھیرے
جو تم آئے تو کیا آئے جو تم ٹھیرے تو کیا ٹھیرے

سر اٹھا کر تیغ براں سے وہ یوں کہنے لگے
کیوں ہمارے ہاتھ کی دیکھی صفائی آپنے

جلوہ اپنے حسن کا دکھلا کے ہر ہر رنگ میں
کافر و مومن میں ڈالی ہے لڑائی آپنے

مہر تیغ لگا دے رونق
پھر گئی جس طرف صفائی ہے

عشق کے فیض و لطف سے ہم بھی لشکر شاہی کہتے ہیں
دستہ دستہ یاس و الم ہے حسرت لشکر لشکر ہے

ایسا کچھ آیا ہے زمانہ جسکو دیکھو وہ ہے حزیں
کوچہ بکوچہ رنج کی فوجیں غم کا گھر گھر لشکر ہے

تری تکرار بیجا سے ہمارا دل الجھتا ہے
تو اپنا وار کر کس واسطے قاتل الجھتا ہے

صباحت روئے دلربا سے نزاکتیں مٹ گئیں سمن کی
شمیم گیسوئے جانفزا سے اڑی ہے بو نافۂ ختن کی

نہ ہار انا کبھی کجی سے اگرچہ دشمن بھی جائے جی سے
نظر جو سیدھی ہوئی کسی سے تو مٹ گئی بات بانکپن کی

مرتا ہوں کہا میں نے تو جھنجلا کے یہ بولے
مرنے پہ جو مرتے ہو تو مر کیوں نہیں جاتے

خبر لیجے کہ اک عالم ہے بیخود
شمیم گیسوئے عنبر فشاں سے

غلط ہے کہ دل کا لگانا برا ہے
محبت کا لیکن جتانا برا ہے

کہاں رہگئی لب پہ جاں آتے آتے
کہ رک رک گئیں ہچکیاں آتے آتے

گل و لالہ سے میکدہ بھر گیا ہے
مغاں کے لیئے ارمغاں آتے آتے

نہ آسان سمجھ قصۂ غم کو رونق
کہ آئیگی یہ داستاں آتے آتے

غیر کا نام لیا ہو تو زباں ہی جل جائے
بیجا آپکی مجھپر خفگی ہوتی ہے

آپ کیا بزم میں خوش ہیں مری رسوائی ہے
دلمیں سمجھو تو ذرا آپکی ہنسی ہوتی ہے

رونق - لالہ رام سہائے کائیتھ ولد حکیم منا لال راجہ جھاؤ لال لکھنوی کے عزیزوں میں تھے اور شیخ ناسخ کے شاگرد، فارسی شعر کہنے کا شوق بہت تھا، گاہ گاہ اردو بھی کہہ لیتے تھے امجد علیشاہ اور واجد علیشاہ کا زمانہ پایا تھا، یہ کلام کا خلاصہ ہے ❊

رونق

غصّہ میں ترے موت ہے آئی مرے دل کی	ہے چین جبیں دشمنِ جانی مرے دل کی
پانی عرقِ شرم سے ہوکر نہ بہے کیوں	دیکھے جو سحاب اشک فشانی مرے دل کی
صدچاک ہوں شانہ کی طرح زلف کے غم میں	قاصد یہ اُسے کہیو زبانی مرے دل کی
اب کوئی نہیں کہتا ہے فرہاد کا قصّہ	رونق ہے وہ مشہور کہانی مرے دل کی

رونق۔ منشی حافظ محمد جان صاحب رونقؔ باشندۂ رامپور تلمیذ مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی، علمی استعداد اور اس فن کی مشق خاصی ہے، پندرہ بیس برس سے مشق سخن کرتے ہیں اور طبیعت کے رنگ کا یہ نمونہ ہے۔

ہمیں کچھ پوچھنا تھا میکدہ کا حال رونق سے	مگر جب اُس سے ملتے ہیں نشہ میں چور پاتے ہیں

خاک میں ملکے اُنھیں خاک ملیگا آرام	فکرِ آرام میں اک دم جنھیں آرام نہیں
کم سے نازنینوں کی کہاں نسبت اے بلبل	یہ مانا مانتے ہیں ہم رگِ گل کو نزاکت میں
دلِ مضطر کا اپنے چارہ گر اللہ حافظ ہے	وہی ہے وصل میں حالت کہ جو حالت تھی فرقت میں
زیاں ہے غیرت و ناموس عقل و ہوش کا یکسر	فقط اک سود سودا کا ہے بازار محبت میں
وُنیا عجب مکان ہے کہ جس کا ہر اک مکیں	راہِ فنا میں چلنے کو پا در رکاب ہے
اگر منظور ہے سیر فضائے لامکاں پہلے	مٹا دے چار ارکانِ عناصر کا نشاں پہلے
رسائی درگہِ معرفت تک کالے کوسوں ہے	مٹے جبتک نہ لوحِ دل سے نقش این و آں پہلے
کیا رُسوا حرم میں خرقہ و دستار نے مجکو	نہ چھوٹا داغ مے ہر چند دھویا آب زمزم سے

رونق۔ لالہ لچھمی نراین صاحب رونقؔ خلف لالہ بالکشن صاحب دھوں کھتری، بزرگوں کا اصل وطن آگرہ تھا لیکن ابتدائی تسلط سرکار انگلشیہ میں ملازمت کی وجہ سے آپکے بزرگوں نے لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی، آپکے حقیقی چچا لالہ رام نراین چیف کمشنر اودھ کے میر منشی تھے، رونق صاحب نے انگریزی میں یونیورسٹی الہ آباد کا امتحان ایف اے ۱۸۹۳ء میں پاس کیا، اب گورنمنٹ جوبلی ہائی سکول لکھنؤ میں مدرس ہیں، فارغ البالی کے زمانے میں

شاعری کا اکثر مشغلہ رہتا تھا، افکارِ خانگی کی وجہ سے آجکل تائب ہیں، چالیس پچاس غزلیں اِنکے ایک دوست لالہ ہردیال لکھنوی سے ارسال کی تھیں اُن میں سے یہ چند شعر منتخب ہوئے

کچھ نہ پوچھو حال کیا میرا شبِ دیجور تھا
بے طرح بے چین پہلو میں دلِ رنجور تھا

کوئی لاکھ ڈہلائے سینہ پہ آنچل
چھپائے سے جوبن چھپا ہے کسی کا

ہر آئینہ سے نہ دعوے کرو صفائی کا
پھسل نجائے کہیں پاؤں خودنمائی کا

بنا کر تو نے آئینہ حسینوں کو کیا خودبیں
تجھے پہلے ہی منہ اپنا سکندر دیکھ لینا تھا

بکھرنے کو ہے عنبریں زلف رخ پر
گھٹا میں چھپے گا قمر دیکھ لینا

جلوۂ طور سے روشن ہوں ہماری آنکھیں
بام پر آپ کا دیدار جو ہو آجکی رات

پھیر دو خنجر گلے پر تم اگر ملتے نہیں
گر وفا آتی نہیں تو کیا جفا آتی نہیں

عدو کو پان بنا کر کھلائے جاتے ہیں
کہ میرے قتل کے بیڑے اُٹھائے جاتے ہیں

کچھ نہیں دیکھتے جز جلوۂ جاناں رونق
جس طرف عاشقِ جانباز نظر کرتے ہیں

جن کو دل اور جگر شوق سے ہم دیتے ہیں
وہ ہمیں ساری خدائی کا الم دیتے ہیں

فدائے حسن ازل سے ہے عشقِ سوختہ جان
پتنگ شمع کے شعلہ پہ کیوں نثار نہو

مثل سرمہ کے میں چھپا لوں گا
میری آنکھوں میں تو سما دیکھو

بانوں باتوں میں اُس پری رو نے
دل ہمارا اُڑا لیا دیکھو

تقدیر کا گلہ نہ شکایت فلک کی ہے
راضی ہیں ہم اُسی میں جو تیری رضا ہوئی

مانگتا ہوں یہ دعا میں شبِ تنہائی میں
موت آئے پہ کسی پر نہ طبیعت آئے

عبث ہے بخت واژوں کی شکایت
زمانے کی خوشی میں غم ملا ہے

اُسنے پیدا ہیں کہاں جسکے ستانیوالے
ہمسے دنیا میں کہاں ناز اُٹھانیوالے

جامِ مئے طہور پلا ساقیا انھیں
آتے ہیں شیخ ساغر و مینا لیے ہوئے

چادرِ گل کی نہیں کچھ احتیاج
بیکسی تربت پہ ہے سایہ کیے

رشکِ پری و حور ہوں آئینہ رو ہزار | ہمکو جہاں میں آپکی صورت پسند ہے

رونق

رونق - لالہ شیوناتھ سہائے ولد منشی کشندیال صاحب مرحوم، بکھری براِنوان صوبۂ بہار کے باشندے اور حضرت اکبر داناپوری کے شاگرد ہیں، فارسی میں کافی دستگاہ ہے، لکھنؤ و بریلی کے رسالوں میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا ہے - یہ چند شعر انکے ہیں۔

خوشخرامی میں بھی صاحب کی توجہ چاہیئے | دیکھئے دل خاکساروں کے ہیں غلطاں زیرِ پا
وہ دل سے ایسا ہی سمجھیں تو لطف ہی ورنہ | لکھا جو عاشقِ شیدا خطاب کیا ہوگا
پانو میں چھالے جگر شق دل میں درد | میں سراپا غم کا پُتلا ہو گیا
کسقدر پُر درد ہے رونق بیانِ عندلیب | ہوش اُڑ جاتے ہیں سُن سُنکر بیانِ عندلیب
بُود و نابود ہے انساں کے لیئے مثلِ حباب | ہستی و نیستی ہے اپنی خبر کی مانند

رونق

رونق - حافظ شیخ محمد عبد الباری خلف مولوی محمد عبد الرحمٰن صاحب مرحوم و نواسہ حکیم محمد حسنخاں تاثیر مولد و مسکن بنارس ہے بتیس اکتیس برس کی عمر ہے، آپکے والد بھی شاعر تھے اور جاناں تخلص کرتے تھے، حضرت رونق کو عرصہ دس گیارہ سال سے شعر گوئی کا شوق ہے اور اس فن میں حضرت فریاد ندروی شاگرد حضرتِ تسلیم لکھنوی سے اصلاح لیتے ہیں نومشق شاعر ہیں کلام میں کوئی بات قابلِ ذکر نہیں - انتخاب یہ ہے -

الفتِ چشم میں اِس طرح ہی مجھ زار کا رنگ | زرد جس طرح سے ہو نرگسِ بیمار کا رنگ
سُنکے آوازِ مری کہتے ہیں | کون اللہ سے فریادی ہے
یُوں فرقتِ حبیب میں حالت تباہ کی | اُٹھے اگر تو روئیے بیٹھے تو آہ کی
داغوں میں ضو ہے آہِ دلِ بیقرار سے | گھر میں جلے چراغ نسیمِ بہار سے
کیوں چشمِ تر سے داغِ جگر کے نہوں ہرے | سرسبز کھیت ہوتے ہیں ابرِ بہار سے
ہر قدم پر جو ناتواں دل ہے | ایک منزل ہزار منزل ہے

رونق

رونق - محمود میاں رونق، کئی تھیٹریکل کمپنیوں میں ڈراما نویس رہے ہیں اور متعدد ناٹک

انگریزی سے ترجمہ کئے اور چند خود بھی بنائے ۱۸۹۲ء کے قریب حیات تھے اور بمبئی میں رہتے تھے اب عرصہ سے کچھ حال معلوم نہیں یہ چند شعر انکے ہیں

گردشِ تقدیر سے اپنے ہی ہو جاتے ہیں غیر
تیشۂ فرہاد دشمن ہو گیا فرہاد کا

کس قدر تھا تشنہ کام آبِ خنجر الحفیظ
ہر لبِ زخمِ جگر پر شکر ہے جلّاد کا

ٹھہرائے شوقِ شہادت دم لے ای ذوقِ طپش
ہاتھ قبضے پر ذرا جمنے تو دے جلّاد کا

تو اسیرِ زلف ہوں کیا جانوں رسم و راہِ عشق
رفتہ رفتہ آئیگا ڈھب نالہ و فریاد کا

بھر کے ساقی نے شبِ مہ میں جو ساغر رکھدیا
زاہدوں نے طاق پر سب حور و کوثر رکھدیا

عاشقوں کو امتیازِ دیر و کعبہ کچھ نہیں
اسکا نقشِ پا جہاں دیکھا وہاں سر رکھدیا

جنوں میں ہوش دامن کا نہ غم ہے کچھ گریباں کا
نہ یہ معلوم کیوں اودھڑا نہ یہ مفہوم کیوں ٹانکا

سر جائے تو کچھ غم نہیں مطلب تو بر آئے
وہ قتل ہی کو آئے بلا سے مگر آئے

عاشق کو حور و خلد سے کیا کام واعظا
اُجرت ہے یہ تو آپ سے مزدور کے لئے

رونق — منشی رادہا موہن لال اہلمد راج ریاست ترواضلع فرخ آباد ۱۸۹۳ء کے بیام عاشق سے چند شعر درج ہوئے۔

ملبوس بظاہر ہے فقیرانہ ہمارا
پر حوصلۂ دل تو ہے شاہانہ ہمارا

اُلجھاتے ہو دل گیسوئے پرپیچ ہیں لیکن
اے آئینہ رو ٹوٹے نہ یہ شانہ ہمارا

ہر اک کو فراموش ہوا قصۂ مجنوں
اب وردِ زباں سب کے ہے افسانہ ہمارا

مے پیکے نظر آئے ہیں اسرارِ نہانی
کم ساغرِ جم سے نہیں پیمانہ ہمارا

دیکھا جو مئے عشق سے معمور تو بولے
کیا جھومتا آتا ہے وہ مستانہ ہمارا

قیس ہر دم یہی کہتا ہے بیابانوں میں
ہم بھی ہوتے کہیں لیلیٰ کے شتربانوں میں

کچھ بھی اے غیرتِ یوسف نہیں انکار مجھے
بیچ لے شوق سے چلکر سرِ بازار مجھے

رونق — منشی پیارے لال صاحب دہلوی تلمیذ رشید حضرت تسکین مرحوم خلف منشی جے نراین

مرحوم کا بستھ ماتھر ساکن روشنپورہ دہلی، بیالیس چوالیس برس کی عمر، ذہین، زود گو اور خوش کلام کہنے والے ہیں، دو دیوان مرتب کر لیئے ہیں جس میں سے پہلا موسوم بہ "رونق سخن" کئی برس ہوئے چھپکر شائع ہو گیا، دوسرا جس میں زیادہ تر تصوف و معرفت کا رنگ ہے مکمل موجود ہے اور دونوں کا انتخاب یہاں درج ہے، سب سے پہلے جب آپنے غزل کہی تو حضرت داغ کے پاس اصلاح کے لیئے دکن بھیجی، جسپر اُنھوں نے اصلاح دیکر ہدایت کی کہ مولنٰنا راسخ کو دہلی میں دکھالیا کرو چنانچہ آپ اُنکے شاگرد ہو گئے، اُنہیں ایام میں مولنٰنا راسخ نے "زبانِ دہلی" نامی رسالہ جاری کیا اُسکے مشاعروں کا اہتمام انہیں کے متعلق رہا چنانچہ اُستاد کے قابل ترین تلامذہ میں سمجھے جاتے ہیں، زبان، بندش، مضمون، سب باتوں کا خیال رکھتے ہیں، رسالہ "کمال" جو تین برس تک دہلی سے شائع ہوتا رہا اُس رسالہ کے آپ ہی اڈیٹر تھے کنور بدری کرشن صاحب فروغ کے مکان پر برسوں مشاعرہ انکے اہتمام سے ہوتا رہا، بڑے محنتی، جفاکش، خلیق، بامروت انسان ہیں، بیرونجات کے شعرا جو دہلی آتے ہیں وہ انکے خلق کے اکثر مداح پائے گئے، اب کچھ عرصہ سے ظروف کی تجارت کا مشغلہ ہے، اور کارخانہ نیلام بھی جاری کر دیا ہے، دس بارہ شاگرد بھی کر لیئے ہیں، منشی قصیر، شیدا، فروغ کے ہم مشق و ہم صحبت ہیں

کچھ نہیں اور یہاں جلوۂ وحدت کے سوا — کیا نظر آئے نگاہوں کو حقیقت کے سوا
نور آنکھوں میں رہا تیرا تصور دل میں — ہم نے جلوت میں بھی دیکھا تجھے خلوت کے سوا
ہم حسیں چاہیں جہاں میں تو بہت ای زاہد — تجکو حوریں نہ ملینگی کہیں جنت کے سوا
درد و غم، رنج والم، حسرت و یاس و حرمان — اور اُلفت میں دھرا کیا ہی مصیبت کے سوا
کچھ عجب نیند کے ماتے ہیں یہ سونیوالے — ایسے سوئے ہیں نہ اُٹھینگے قیامت کے سوا
پی کے کھل جاتے ہیں اسرار نہانی رونق — اور کیا شغل ہو جام مئے وحدت کے سوا

بند نقاب توڑ گئی شوخی نظر — جو پردہ حجاب تھا حائل نہیں رہا

مری تردامنی کا حشر میں ڈھک جائیگا پردہ — جو آیا جوش پر دریا کہیں اشکِ ندامت کا

جبینِ نازِ قاتل میں نشاں ہیں میری ہستی کے
بنی ہے چینِ پیشانی نوشتہ خطِ قسمت کا

بوسہ لیکر جب کہا میں نے کہ یہ کیا ہو گیا
ہنس کے فرمانے لگے تیرا کلیجا ہو گیا

دل چاہتا نہ تھا کہ محبت کسی سے ہو
میں کیا کروں مجھے ترا انداز بھا گیا

دیوانے تیری زلف کے پھرتے ہیں کو بکو
وحشت اگر یہی ہے تو اب شہر بن ہوا

تم نے گھونگٹ منہ سے جب سرکا دیا
آفتابِ حشر کو شرما دیا

جام کے بدلے دکھائی محب کو آنکھ
واہ اچھا یار نے چھینٹا دیا

آپ کیوں رونق سے برہم ہو گئے
کچھ خطا تقصیر! اُسنے کیا کیا؟

جہاں میں بُت نہیں ملتے خدا نہیں ملتا
نگاہ ڈھونڈنے والی ہو کیا نہیں ملتا

اُسکے غم میں ہو گئیں آنکھیں سفید
جسنے ان آنکھوں میں گھر پیدا کیا

ٹھوکروں سے یار کی یہ خاک نے پایا عروج
تھا زمیں پر پہلے گھر اب آسماں پر ہو گیا

سرور رنگ مے بنکر لہو آنکھوں میں چھایا ہے
تماشا ہو گیا ساغر میں بھرنا چار چلو کا

شوقِ نظارہ نے چھپنے نہ دیا پردہ میں
دل میں رہ کر بھی نگاہوں سے وہ پنہاں نہ ہوا

کسی کا نقشِ قدم بن گئی مری ہستی
مٹا مٹا سا نشانِ سرِ مزار رہا

کسی کے دیدۂ میگوں سے وہ پلائی مجھے
کہ حشر تک مری آنکھوں میں اک خمار رہا

جل گیا آہِ شرربار سے بلبل کی چمن
ہر طرف گل کیجگہ ڈھیر ہے انگاروں کا

روز پیتے ہیں روز توبہ ہے
کوئی رونق سا پارسا نہ ملا

اکھڑے نہ راہِ شوق میں پائے طلب کبھی
ثابت قدم میں کب سرِ منزل نہیں رہا

فانوسِ دل میں جب سے نہاں ہے وہ شمعِ حسن
پروانۂ نظر سرِ محفل نہیں رہا

جسنے مٹا دیا ہے وہ تھی آرزوئے یار
رونق مجھے کچھ اب گلۂ دل نہیں رہا

رکھنا ذرا تصورِ مژگاں سنبھل کے پاؤں
ٹوٹے کہیں نہ آبلہ پائے خیال کا

یوں وہ ٹھکرا رہے ہیں نعش مری
مرنیوالے میں جان ہے گویا

وصال میں بھی رہی شکلِ یاس پیش نظر
ہماری صبحِ تمنا میں رنگِ شام رہا

مزہ ہے جب کہ نشانہ پہ اک نیا دل ہو
نگاہِ ناز کا ہر وقت یہ پیام رہا

پڑھائی شیخ نے ممبر پہ بیٹھکر واعظ
امام محفلِ رنداں میں بھی امام رہا

غریقِ اشکِ ندامت ہوں اسقدر رونق
کہ ڈوبی رہتی ہے فردِ حساب درتہ آب

تیغِ قاتل نے کھلا رکھا ہے دلمیں اک چمن
خندۂ زخمِ جگر ہے خندۂ گل کا جواب

یوں نہ باہر جایئے بگڑے ہوئے تیور سے آپ
لوگ طعنے دینگے آئے ہیں کسی کے گھر سے آپ

اُف رے آسودگیٔ دشت کہ بھولا ہوں چمن
ایک مدت ہوئی دیکھی نہیں گھر کی صورت

سیکھے رے تم سے کوئی آنکھ چرانے کی ادا
ٹھیکری رکھتے ہیں اس طرح بشر آنکھوں پر

وہ تو رونق سے بگڑتے رہے ناحق ناحق
اور وہ ناز اٹھاتا رہا سر آنکھوں پر

ایمان آپ کا جو مکر جائیں لیکے آپ
ہمنے تو دل دیا ہے فقط اعتبار پر

مرتے ہیں تابشِ دُرِ دندانِ یار پر
چادر ہو موتیوں کی ہمارے مزار پر

نرالی آن نکلے جس میں تُو وہ شان پیدا کر
ادائیں شوخیاں ہوں، شوخیوں میں جان پیدا کر

ہیں گلشنِ جہاں میں کہیں ہوں کہیں نہیں
دھوکا سا بوئے گل کا ہے مجھ ناتوان پہ

دل لگائے کوئی کیا گل سے چمن میں رہکر
بیوطن ہوتا ہے اک روز وطن میں رہکر

صورتِ نکہتِ گل ہے یہ جہاں کی ہستی
رنگ سب دیکھ لیئے ہمنے چمن میں رہکر

چشمِ بلبل میں کھٹکنے کو ملا پہلوئے گل
آبرو پائی یہ کانٹوں نے چمن میں رہکر

بادِ صرصر کا ہوا ڈر نہ کبھی خوفِ خزاں
اپنی اک حال سے گزری ہے چمن میں رہکر

تھا وہ اک رنگِ طلسماتِ جہانِ فانی
جو کرشمہ نظر آیا ہے چمن میں رہکر

کبھی مژگاں پہ نظر ہے کبھی رخساروں پر
کبھی کانٹوں پہ رہے ہم کبھی انگاروں پر

مٹا ہی جاتا ہے دل ابروئے ستمگر پر
دیئے ہی دیتا ہے کمبخت جان خنجر پر

ہیں صورتِ عنقا جو دلِ زار کے انداز
پھرتے ہیں نظر میں کمرِ یار کے انداز

کس شوق سے لیتی ہیں تمھیں مول نگاہیں ۔ دیکھے تو کوئی چشم خریدار کے انداز
انکی نگاہ پھرتے ہی ہم ذبح ہو گئے ۔ لو آج ذبح ہو گئے اُلٹی چھُری سے ہم
چُپ ہیں سوالِ وصل پہ گویا زباں نہیں ۔ بُت بن گئے جب آپ تو پتھر سے کیا کہیں

کہیں کیا کس مصیبت سے بسر اوقات کرتے ہیں ۔ کہ روتے رات کٹتی ہے تڑپتے دن گذرتے ہیں

رونق بہارِ باغِ جوانی گذر گئی ۔ تم جس ہوا کو ڈھونڈتے ہو وہ ہوا نہیں

ہر نہیں کے ساتھ ہاں ہے اور ہر ہاں میں نہیں ۔ نام کو بھی اُستواری تیرے پیماں میں نہیں
محبت کا طوق اسکو کہتے ہیں رونق ۔ کہ باہیں گلے میں وہ ڈالے ہوئے ہیں
شوخی سے اڑے پھرتے ہیں اللہ رے چھل بل ۔ دم بھر میں یہاں ہیں ابھی دم بھر میں نہیں ہیں

دلِ نگہ کو جان دیدی آپ کو ۔ دو ہی باتیں تھیں مرے امکان میں

قیامت کی بھری ہے کج ادائی چشم پُرفن میں ۔ مری تقدیر کا بل آگیا ہے اُنکی چتون میں
مزہ ہے موت آئی ہے خیالِ روئے روشن میں ۔ عجب کیا تا قیامت نور برسے میرے مدفن میں
سمٹکر رنگ لائیگی مسی کا بیدگی اکدن ۔ سما جاؤنگا تِل بنکر نگاہِ سامری فن میں
ذرا اے شورِ محشر کچھ تو ہاں پاسِ مروت بھی ۔ تھکے ہارے مسافر چین سے سوتے ہیں مدفن میں

دیکھکر ناز و ادا جی سے گذر جاتے ہیں ۔ مرنیوالے تری ہر آن پہ مر جاتے ہیں
اِس تلوّن کا بھی کیا ٹھیک ہے اللہ اللہ ۔ مُنہ سے اقرار نگاہوں سے مُکر جاتے ہیں
فلک کے پاس بھی رُخ کا ترے جواب نہیں ۔ اِس آفتاب کا ثانی وہ آفتاب نہیں
کہا تھا خواب میں کس بیوفا نے آنیکو ۔ کہ چشم خواب میں بھی دیکھنے کو خواب نہیں

اُٹھ گئیں آنکھیں جدھر لاکھوں کلیجے چھد گئے ۔ سیدھی نظریں بھی تمھاری نوکِ پیکاں ہو گئیں
بھویں تنتی ہیں جب وہ چین جبیں ہو کر نکلتے ہیں ۔ ادھر کھنچتی ہیں تلواریں اُدھر خنجر نکلتے ہیں

کسکو دل بیخودی میں دے بیٹھے ۔ ہائے یہ بھی نہیں خیال ہمیں
دیکھ کر اُنکو پھر غشی چھائی ۔ بیخودی لے چلے سنبھال ہمیں

کسکی صورت جما گئی نقشہ — خواب بھی ہو گیا خیال ہمیں
ایسا بھی کیا ہے ابھی آئیے ہو جانا ٹھیر — اور دو چار گھڑی دل کو بہل جانے دو

بنا دیتے ہیں خورشیدِ قیامت ذرہ ذرہ کو — اُٹھا دیتے ہیں جس دم وہ نقاب رُوئے روشن کو
چھری، برچھی، کٹاری، تیغ و خنجر، جانتا ہوں میں — نگہ کو، ناز کو، انداز کو، شوخی کو، چتون کو
مجھے بھی کیا کوئی وہ فتنۂ خوابیدہ سمجھے ہیں — لگا جاتے ہیں ٹھوکر چلتے چلتے میرے مدفن کو
مزا پینے پلانے کا جب آئے ہمکو گلشن میں — ہوا ہو، ابر ہو، برسات ہو، ساقی ہو، صہبا ہو
رونق کے نام سے تو نہ سمجھا مجھے وہ شوخ — شرما کے پھر کہا اجی تم پیارے لال ہو
بہ اتصالِ حسن تقاضائے شوق ہے — ڈھونڈھے جسے نگاہ وہ دل میں ضرور ہو
مزہ فریاد کا جب ہے خدا ہی سننے والا ہو — نہ ہو محشر میں اپنا کوئی بہتر ساری دنیا ہو
جو بحرِ غم میں آ جائے تصور اُسکی مژگاں کا — غنیمت ڈوبنے والیکو تنکے کا سہارا ہو
کٹیں ہر رہ ہر قدم غیرت سے عاشق کوئے دشمن میں — جوابِ خنجرِ براں ترا نقشِ کفِ پا ہو
وہاں غش ایک موسیٰ تھے یہاں بیہوش لاکھوں ہیں — وہ برقِ طورِ سینا تھی، یہ ہے تنویرِ میخانہ
گلے سے جب اُترتی ہے جگر تک کاٹ کرتی ہے — یہ ہے موجِ مئے سر جوش یا شمشیرِ میخانہ
جو گھر سے بن سنور کر وہ بتِ کافر ادا نکلے — اُڑا دے ہوش عالم کے پری بنکر قضا نکلے
ملکر لبوں سے نکلے جو دو حرف پیار کے — بوسے مری زباں نے لئے نطقِ یار کے
لایا شباب رنگ دن آئے نکھار کے — گل باغِ آرزو میں کھلے ہیں بہار کے
شعلے زمین پہ ہیں تو تڑپ آسمان پر — نالوں میں میرے رنگ ہیں برق و شرار کے
ٹھکرا کے تم نے خاک کا رتبہ بڑھا دیا — گردوں پہ اب دماغ ہیں مشتِ غبار کے

جب اُٹھے وہ صورتِ محشر اُٹھے — جب چلے تیغِ قضا بن کر چلے
چھوتے ہو زلفِ یار کو رونق — کام کرتے ہو مار کھانے کے

کئے ہیں واہ وا کس لطف سے ٹکڑے مرے دل کے — دہانِ زخم سے ہیں چوم لونگا ہاتھ قاتل کے

حسن قیامت کا زمانہ میں ہے شہرہ ہر سو
ٹھوکروں میں تری ہر وقت پڑی رہتی ہے

آگ سی شوق شہادت نے لگا رکھی ہے
آبِ خنجر سے مری پیاس بجھا دے کوئی

غمزہ و ناز و ادا، عشوہ، کرشمہ، شوخی
سب نے وہ چھکے چھڑائے ہیں کہ جی جانتا ہے

دم ہے یہاں لبوں پہ وہاں وا ہے چشمِ شوق
ادھر ادھر، قضا کا اُدھر انتظار ہے

ہم جن کو جان دیجئے ہم جن پہ مرٹ گئے
اللہ رے نصیب انھیں ہم سے عار ہے

وہ اٹھا ابر چلو بادہ کشو میخانے
وہ برستی ہوئی اللہ کی رحمت آئی

امیدِ وفا جن سے تھی رونق وہ بس مر گ
وہ آنسو بھی آئے نہ جنازے پہ بہانے

جذبۂ شوقِ شہادت کے الٰہی قربان
تیغِ قاتل سے رگِ جاں کو ملا رکھا ہے

کیا تلون ہے خوشامد سے بگڑ جاتا ہے
غدر کا نام بھی ظالم نے خطا رکھا ہے

ساغر میں کس کا عکسِ رخ بے حجاب ہے
پیالہ اک آفتاب میں اور آفتاب ہے

شوخی میں ناز، ناز میں کچھ کچھ حجاب ہے
واللہ یہ ادا بھی تری انتخاب ہے

پامال کر کے کہتے ہیں رونق وہ نعش کو
یوں دل لگانیوالوں کی مٹی خراب ہے

نہ دل ہے عشق میں بس کا نہ قابو کا جگر میرے
کیسے تھاموں کسے روکوں الٰہی سخت مشکل ہے

تیرہ بختی کو مری اور بڑھانے آئے
بال کھولے ہوئے تربت کے سرہانے آئے

وہ جتنا مجھ سے کھنچتے ہیں میں اتنا ان سے ملتا ہوں
بلا کی ہے کشش ان میں غضب کی مجھ میں الفت ہے

ساقی کی چشمِ مست کہیں کام کر گئی
بوئے شرابِ ناب جو خونِ جگر میں ہے

اس نازکی پہ قتل کی دھمکی خدا کی شان
دیکھے ہوئے ہیں ہم جو تمھاری کمر میں ہے

جو آج غم کی ہے، کل وہ گھڑی نہیں رہتی
ہمیشہ یار کسی کی اڑی نہیں رہتی

کسی کے حسن میں ہے رازِ الفت اپنا پوشیدہ
حجابِ روئے روشن پردۂ چشمِ تمنا ہے

دکھاتا ہے ہمیشہ سرکشوں کو آسماں نیچا
حبابوں کے لیئے زنجیرِ پا ہر موجِ دریا ہے

رہے جو حشر تک دل میں وہ حسرت ہے مری حسرت
نہ نکلے جو کبھی مر کر تمنا وہ تمنا ہے

یکہ بربادیوں ظالم مرے نخلِ تمنا کو / کہ ہیں نے مدتوں زخم جگر سے اسکو سینچا ہے

تقدیر کا گلہ نہ شکایت قضا کی ہے / مارا ہمیں بتوں نے دوہائی خدا کی ہے

بن گئی کیا غازۂ رخسار حیرانی مری / اُنکی صورت سے برستی ہے پریشانی مری

خاک ڈالی نہ گئی، نعش اُٹھائی نہ گئی / میری مٹی بھی ٹھکانے سے لگائی نہ گئی

کیا کدورت تھی پس مرگ نکالی نہ گئی / خاک بھی اُسنے مری قبر پہ ڈالی نہ گئی

دیکھ لی محشر خرامی آپ کی / آگئی صاحب قیامت آگئی

رؤف بابو رؤف الدین باشندۂ ناگپور صوبۂ متوسط وکیل درجہ اول ریاستِ بھوپال
تفریحاً کبھی کبھی فکر سخن کا بھی اتفاق ہو جاتا ہے، یہ چند شعر اُنکے طبعزاد ہیں۔

جو رات کو کوئی رشک قمر نظر آیا / گماں ہوا کہ زمیں پر قمر اُتر آیا

رؤف ہو گئے اب تو آپ سے باہر / جنوں کا زور الٰہی اتنا پارسال نہ تھا

رہنے کو مل گئی ہے جگہ کوئے یار میں / پھر کیوں نہ ہو دماغ مرا آسمان پر

کچھ دن تو یونہیں رہیں جو تمھاری رکھائیاں / اک روز کھیل جائینگے ہم اپنی جان پر

سرمہ نہیں لگایا ہے آنکھوں میں وقتِ قتل / تلوار کو چڑھایا ہے قاتل نے سان پر

رئیس۔ نواب محمد عمر علیخاں بہادر رئیس مخاطب بہ فیروز جنگ والئی ریاست باسودہ صوبہ مالوہ
کے قریب بطریق سیر شمالی ہندوستان کے اکثر شہروں کی سیر کی اور ہر مقام کے نامور اور باکمال
لوگوں سے ملاقی ہوئے، سفرنامہ بھی لکھکر شائع کیا تھا۔ اپنے وقت کے روشن خیال، تجربہ کار
ذی استعداد اور باکمال رئیس سمجھے جاتے تھے۔ ۵۰-۵۲ برس کی عمر پائی، موزونی طبع کبھی
شعر و سخن کی بھی محرک ہو جاتی تھی، چھ سات غزلیں نظر سے گذریں اُنکا انتخاب درج ذیل ہے

کثرت گل یہ ہوئی اللہ رے شانِ بہار / بن گئی ساری زمیں گویا گلستانِ بہار

لگ رہے ہیں جسطرف دیکھو اُدھر پھولوں کے ڈھیر / گلفشاں ہیں ان دنوں شاید کہ دامانِ بہار

باغ ہو، مینا ہو، مے ہو، ساقی گلفام ہو / اور کیا ہیں بس یہی دو چار سامانِ بہار

دیر کیا ہے کشتی بادہ ہو ساقی ناخدا
موج زن ہی ہر طرف سے آج طوفان بہار

غنچۂ دل کو کیا فصل خزاں نے پائمال
رہگیا بس دل ہی دلمیں آج ارمان بہار

جو دکھاتا ہے وہ سب کچھ دیکھتے ہیں نیک و بد
اب خزاں کا رنج ہے دل میں نہ ارمان بہار

نہ جب بس چل سکا تو مر مٹے ہم
رسائی بھی رئیس اپنی یہیں تک

سوزش وہی ہے لیک شرارے نہیں عیاں
جلتا ہوں سوز عشق سے لیکن دھواں نہیں

عمر آخر ہوئی افسوس نہ پھولا نہ پھلا
نخل امید کا لائیگا ثمر کون سے دن

اُنکے دل ہی میں ہے دھودو میری جانب سے غبار
کام آوینگے نم اے دیدۂ تر کون سے دن

خاک کب میری کو بہ کو نہ گئی
مٹ گئے اُسکی جستجو نہ گئی

چھٹ گئے سارے مونس و ہمدم
آفریں بیکسی کہ تو نہ گئی

رئیس

رئیس مرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبرآبادی اُنکے شاگرد رشید سیّد سخاوت علی شوخ اکبرآبادی نے جو حالات ارسال کیئے اُنکا خلاصہ یہ ہے کہ آپکے آبا و اجداد صاحب جاگیر و مناصب تھے آپ کو بھی خاصی جائداد ترکہ میں ملی تھی لیکن اُس کا کثیر حصّہ تلف ہوگیا، تاہم سرکار انگلشیہ کے دربار میں کرسی عطا ہوتی ہے، مرزا صاحب موصوف کو فن شعر میں کما حقہ دخل ہے۔ باوجود اسقدر باکمال ہونے کے مرزا صاحب نے زانوے تلمذ کسی اُستاد کے سامنے نہیں جھکایا جو کچھ استعداد ہے خداداد ہے، ہرچند زبانِ عربی و فارسی میں کامل مہارت حاصل ہے لیکن اشعارِ اُردو نہایت صاف اور عام فہم کہتے ہیں، اِس وقت تک مرزا صاحب کے شاگردوں کا نمبر دو سو تک پہنچ چکا ہے جس میں اکثر اچھا کہنے والوں میں ہیں، شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ ساتھ پختہ کلامی آپکے کلام سے ظاہر ہے، موجودہ مذاق کی اچھی تقلید کرتے ہیں۔ انکی اکثر غزلیں آگرہ میں زبان زدِ خاص و عام ہیں عمر اب ساٹھ سال کے قریب ہے، نازک خیالی اور مضمون پیدا کرنے کی بہ نسبت زبان کی صفائی محاورہ کی پابندی اور مضمون کی شوخی کی طرف توجہ زیادہ ہے، دو تین دیوان آپکے مرتب ہو چکے ہیں مگر چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

کلام کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے ؎

سمجھے ہوئے تھے ہم جسے مسکن حضور کا
دل سے بہت قریب تھا آنکھوں سے دور تھا

لکھے تھے ہمنے وصفِ رخِ یار یک قلم
روشن تمام کوچۂ بین السطور تھا

رحم تجکو نہ کبھی او ستم ایجاد آیا
اور آیا بھی تو اک ظلم نیا یاد آیا

کیا مزا حشر میں ہو داورِ محشر کے حضور
میں ہوں اور تو ہو مرا ہاتھ گریباں تیرا

بیمارِ محبت کو سنبھلتے نہیں دیکھا
آئی کو کسی کی کبھی ٹلتے نہیں دیکھا

تصویر میں اترا نہ فروغِ رخِ روشن
سلانچے میں کبھی دھوپ کو ڈھلتے نہیں دیکھا

ہم خاک نشینوں سے ہے اس درجہ کدورت
مٹی کا انھیں عطر بھی ملتے نہیں دیکھا

جس طرح نکل جاتی ہیں آپ شبِ فرقت
یوں وصل میں ارماں کو نکلتے نہیں دیکھا

ظالم کو بھی ہوتا ہے کسی شے کا سہارا
ہتیار کو بے ہاتھ کے چلتے نہیں دیکھا

ہم کہتے ہیں روکو نگہِ شوخ کو روکو!
تمنے دلِ مضطر کو مچلتے نہیں دیکھا

مے پینے سے شوخ اور ہوا رنگ سنہرا
اس سونے کو تیزاب میں گلتے نہیں دیکھا

نہیں شریک خدا کا جو کبریائی میں
ترا جواب بھی اے بت نہیں خدائی میں

وہ گل جو اوڑھکے سویا تھا وصل میں اکدن
وہ بھینی بو رہی برسوں بسی دولائی میں

برنگِ آئینہ منہ پر کچھ اور پشت پہ اور
تمھیں بتاؤ صفائی ہے یہ صفائی میں

شراب وصل میں کافی ہے رات بھر کے لیئے
پیالہ زہر کا رکھا ہے اک سحر کے لیئے

اٹھا کسی کا نہ احساں دماغِ نازک سے
زبان پر بھی نہ آئی دعا اثر کے لیئے

اسنے باندھی جو کمر میرے ستانیکے لیئے
آسماں ساتھ ہوا ہاتھ بٹانیکے لیئے

چشمِ پرنم میں نظر آتی ہے تیری تصویر
یا پری اتری ہے دریا میں نہانیکے لیئے

لطف ہے بادہ کشی کا رمضان میں زاہد
اک مہینہ ہے یہی پینے پلانیکے لیئے

وہ ستم کرتے ہیں دل داد ستم دیتا ہے
ہاں میں ہاں اور یہ آیا ہے ملانیکے لیئے

خاکساروں کی رہی دیدۂ مردم میں جگہ
لیکے سرمہ ہوئے آنکھوں میں سمانیکے لیئے

ہو پڑا لو ملک الموت سے جھگڑا آخر
نزع میں کسنے کہا تھا ہمیں آنیکے لیئے

کونسے کھائے دوہتڑ پڑے، لاتیں کھائیں
ہاتھ رکھا تھا کہیں پاؤں دبانیکے لیئے

کبھی پی لیتے ہیں منت سے کسی کی زاہد
مینہ برستے میں لگی دل کی بجھانیکے لیئے

رد نہ کر دعوتِ مے پیرِ مغاں کی زاہد
اب خدا آئیگا کیا تجکو پلانیکے لیئے

غمزہ بیجا نہ اُٹھائینگے کہ ہم بھی ہیں رئیس
ڈھونڈ لو اور کوئی ناز اُٹھانیکے لیئے

ظلم پر ظلم حضور آپ تو کرتے ہی رہے
جاں نثار آپکے دم آپکا بھرتے ہی رہے

آرزو آئی، کبھی دل میں تمنا آئی
روز مہماں نئے اِس گھر میں اُترتے ہی رہے

آج یہ دکھ ہوا، کل دوسرا آزار ہوا
جب سے ہم آپ پہ مرنے لگے مرتے ہی رہے

ناتوانی نے نگاہوں پہ بھی چڑھنے نہ دیا
ہم سے لاغر تری نظروں سے اُترتے ہی رہے

بحرِ عالم میں ہی ہستی بشر شکل حباب
ہم فنا ہونیکو دنیا میں اُبھرتے ہی رہے

وہ بھی لاکر مری تُربت پہ چڑھائے نہ کبھی
ہار باسی تری چوٹی کے اُترتے ہی رہے

حسرتِ دید میں یہاں مر گئے آخر مشتاق
آپ بیٹھے ہوئے واں گھر میں نکھرتے ہی رہے

مجلسِ وعظ میں میں پی گیا بوتل غٹ غٹ
لوگ ہاں ہاں بہت ہر سمت سے کرتے ہی رہے

سبزہ رنگوں کی نگاہوں کا جو کشتہ ہوں رئیس
سبزہ تربت کا ہرن دشت کے چرتے ہی رہے

رہا۔ غلام محمد خاں رہا اکبر آبادی شاگرد اسیر پسر نظیر، بزرگ اِنکے ریاست بھرتپور میں فوجی عہدوں پر مامور تھے اور یہ خود بھی اسی ریاست میں ملازم تھے، غدر کے قریب قریب زمانہ میں انتقال کیا، یہ فکرِ سخن کا نمونہ ہے۔

کہنا ترا ہماری سر آنکھوں پہ ناصحا
پر کیا کریں جو دل ہی نہو اختیار میں

کی آخر کو رو رو جگہ اُسکے دل میں
رہا ہم تری چشمِ تر پر فدا ہیں

اُسے غیر کی بزم سے کھینچ لایا
ہم آہِ جگر کے اثر پر فدا ہیں

بو آج کسکی زلفِ معنبر کی لے اُڑی — یہ بوئے عطر بیز جو بادِ سحر میں ہے
پیکاں جو ٹوٹ کر مرے سینے میں رہ گیا — کہنے لگے کہ مفت گیا تیر ہاتھ سے

رہا

رہا۔ میر رضی رہا۔ ولد میر عباس عرف میر مغل فیض آباد کے اصلی باشندے اور کانپور میں ۱۲۶۶ھ کے قریب رہتے تھے، حضرت ناسخ کے شاگرد رشید جناب رشک کے تلامذہ میں سے تھے، نازک خیال اور مشاق کہنے والے تھے۔

آشنا خواب سے ہوتی نہیں اصلاً آنکھیں — دیدۂ روزنِ دیوار ہیں گویا آنکھیں
دیدۂ آبلہ و دیدۂ داغِ سودا — میرے اللہ نے دی ہیں مجھے کیا کیا آنکھیں
بولتی مجھ سے نہیں باتیں اشارہ نہیں ہیں — لب جو خاموش ہوئے ہو گئیں گویا آنکھیں
فرقتِ گل میں غم کھائے کہیں افیون بلبل — چار سو رکھتا ہے اسواسطے لالا آنکھیں
شکلِ طاؤس مرے تن پہ ہیں داغِ حسرت — دید کو تیری بنا ہوں میں سراپا آنکھیں
ہے تصور میں جو اک پردہ نشیں کی آمد — روشنی دور ہوئی کرتی ہیں پتھرا آنکھیں
آنکھیں موسیٰ کی کہاں پاؤں جو دیکھوں اسکو — شجرِ طور ہے قامت یدِ بیضا آنکھیں
آرزو ہے کہ رہا وادیٔ ایمن دیکھے — عاریت اسکو عنایت کرو موسیٰ آنکھیں

رہائی

رہائی۔ ڈاکٹر شیخ عبداللہ خلف شیخ فقیر محمد متوطن رانگوپور پرگنہ عظیم آباد پٹنہ، انگریزی تعلیم پاکر غدر سے پیشتر ڈاکٹری کا امتحان پاس کرکے سرکاری ملازمت اختیار کی تھی۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔ چند شعر نتائج طبع سے درج ہوئے، عبداللہ خاں مہر لکھنوی سے اس فن میں استفادہ کیا تھا۔

تیری گلی پکڑتی ہے مجھ خستہ تن کے پاؤں — جنبش ہی جانتے نہیں دیوارِ بن کے پاؤں
باہر ہے چشمِ شوخ سے دنبالۂ دراز — کچھ حد سے بڑھ چلے ہیں غزالِ ختن کے پاؤں
مجھ پا شکستہ کے لئے کیا احتیاجِ قید — قابل نہ بیڑیوں کے نہ لائق رسن کے پاؤں
باغِ جہاں میں کاش نہیں ہوتا حنا کا رنگ — لیتا کنارِ شوق میں اُس گلبدن کے پاؤں

باقی ہیں آج تک وہی شعلہ مزاجیاں	رکھتے نہیں مزار پہ مارے جلن کے پاؤں

رہبر

رہبر۔ نواب مصطفیٰ علی خان رہبر خلف و شاگرد نواب ہادی حسن خان بریلوی از خاندان حافظ الملک بہادر خاندانی وظیفہ سرکار انگلشیہ سے پاتے ہیں، ۵۰ سال کی عمر ہے، عنوان شباب میں اکثر شعر گوئی کا چرچا رہتا تھا اب بہت کم کہتے ہیں۔

خاکساری نے مری رام کیا اس بت کو	زور آیا نہ کبھی کام نہ کچھ زر آیا
گھر ہمارے بھی کسی روز کرم فرماؤ	منتیں تیری ہم اے رشک قمر کرتے ہیں
دیر ہوجاتی ہے آنے میں جو وعدے سے انھیں	وہم کیا کیا دل رہبر میں گذر کرتے ہیں
وہ پریشاں خواب ہے وابستگان زلف کا	جسکی مشکل سے بیاں یوسف سے کچھ تعبیر ہو
زور کا بل ہے نہ زر کا زور مجھ ناکام کو	پھر ترے ملنے کی ای خود کام کیا تدبیر ہو
کام جادو سے نکلتا ہے نہ کچھ تعویذ سے	کس عمل سے یا الٰہی وہ پری تسخیر ہو
وہ تو اے رہبر خوش و خرم ہیں بزم غیر میں	تم عبث مغموم ہو بے فائدہ دلگیر ہو

رہبر

رہبر۔ منشی محمد مہدی رہبر۔ آپ کو حضرت داغ سے تلمذ رہا ہے، کئی برس ہوئے آپ بھوپال میں تھے اسکے بعد کچھ حال معلوم نہ ہوا۔

یارب یہ برق ہے کہ دل بیقرار ہے	یہ مہر جلوہ گر ہے کہ چہرہ ہے یار کا
پھر کب یہ مشق جور و جفا کی کروگے تم	دیکھو نشاں مٹاؤ نہ مرے مزار کا
میں تو کبھی نہ بوسہ رخسار مانگتا	سارا قصور تھا یہ دل بے قرار کا

ریاست

ریاست شیخ ریاست علی صاحب ریاست لکھنوی شاگرد جناب مرحمت الدولہ بہادر الملک سید غضنفر علیخان بہادر صولت جنگ المتخلص بہ حکیم، اسکے والد میر ہادی علی بیخود خواجہ وزیر کے نامی شاگردوں میں تھے، یہ خود انقلاب سلطنت اودھ کے زمانہ کی پیدایش ہیں، چند شعر نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں۔

نہیں کہتا نظر مجھ پر کرے وہ شادماں ہوکر	توقع تو ہو غیروں ہی کو دیکھے مہرباں ہوکر

عدم سے جانب ہستی بڑی سختی سے آیا ہوں
شرار سنگ ہوں مٹجاؤں گا دم میں عیاں ہوکر

دم محشر جھینپیگے اپنے عصیاں کیا چھپاینگے
کھینگے موئے تن سب حال اپنا اک زباں ہوکر

نہیں چھریوں سے کچھ کم تیز باتیں اس ستمگر کی
نہ اچھے ہونگے اپنے زخم دل زخم لساں ہوکر

بوقت سجدہ زینت دینگے محبوبوں کے چہروں کو
بنینگے ہم عبیر اُس بت کی خاک آستاں ہوکر

چلے گا اک قدم جس روز وہ مہر و تعلی سے
زمیں بھی دُون کی لینے لگے گی آسماں ہوکر

ریاض

ریاض - شاعر معجز نگار سخنور جادو طراز استاد مسلم الثبوت منشی سید ریاض احمد صاحب ریاض خیر آبادی فخر تلامذہ و سرمایہ نازش حضرت منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی، آپکے والد منشی سید طفیل احمد صاحب بڑے عالم اور خیر آباد کے مؤقر لوگوں میں تھے منشی ریاض کی ابتدائی تعلیم خیر آباد کے مدرسۂ عربیہ میں ہوئی، مگر ابھی فارغ التحصیل نہیں ہوئے تھے کہ شاعری کا چسکا پڑ گیا - اُس زمانہ میں منشی تدبیر الدولہ اسیر کا بڑا شہرہ تھا، آپنے اُن سے تلمذ اختیار کیا اور اُنکی خدمت میں حاضر ہونے کو لکھنؤ گئے، اسکے چند ہی روز بعد خیر آباد سے اُردو شعرو سخن کا ایک رسالہ "گل کدۂ ریاض" نامی جاری کیا - جسنے حضرت اسیر و امیر کی قدر افزائی کی بدولت بہت شہرت حاصل کی تھوڑے عرصہ بعد ۱۲۹۶ھ میں خیر آباد سے ریاض الاخبار نکالا لیکن چونکہ ہمیشہ سے لکھنؤ کی صحبت پسند تھی دفتر یہاں اُٹھا لائے، مگر کئی برس بعد اخراجات نہ چلنے کے باعث اخبار گورکھپور منتقل کرنا پڑا، گورکھپور میں حکام اور رؤسا نے اُنکی اچھی مدارات کی اور ریاض الاخبار پندرہ سولہ برس تک نہایت کامیابی سے جاری رہا اور حضرت ریاض کو اُنکی شوخیٔ طبع اور خداداد ذہانت کی خوب داد ملی، اس عرصہ میں حضرت ریاض نے سرکاری ملازمت کرلی، سپرنٹنڈنٹ پولیس گورکھپور کے سر شتہ دار ہو گئے انھیں ایام میں نواب کلب علیخاں مرحوم نے اُنکی تیزی طبع اور خوش فکری کی شہرت سنکر انھیں رامپور طلب کیا اور خلعت خاص اور انعام سے سرفراز فرمایا، مگر ریاض نے کچھ زیادہ عرصہ وہاں قیام نہ کیا - اخبار کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا ضمیمہ "فتنہ" و "عطر فتنہ" کے نام سے

انھیں ایام میں نکلنے لگا جس میں چلبلے مضامین اور چوٹی کے اشعار درج کیئے جاتے تھے۔
منشی ریاض خلیق ملنسار، زندہ دل شخص ہیں، گورکھپور میں پندرہ برس فارغ البالی سے
گذارنے کے بعد ریاض کو پھر لکھنؤ کی یاد نے گدگدایا، اور اگرچہ رہایش تبدیل کرنے
اور اخبار کے دفتر اٹھانے میں سخت خسارہ ہوتا تاہم اپنے شوق کی خاطر اسے گوارا کیا۔ اور
لکھنؤ چلے آئے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

ریاض تھی جو مقدر میں بازگشتِ شباب	جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

اب ریاض کی عمر چھپن برس کی ہے اور دس سال سے راجہ صاحب محمود آباد کی سرکار کے دعاگو ہیں
ریاض کی زباندانی مسلّم ہے، اغلاط سے کلام پاک ہوتا ہے اور ایک طرز خاص کے موجد سمجھے
جاتے ہیں، آپکا ہر ایک شعر قبولِ عام کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور شوخی و بے چینی اسکے
خاص جوہر ہیں، اِنکے اکثر اشعار ضرب الامثال کے طور پر لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے
ہیں اور اُنکے سننے کے وقت یہ خیال بھی نہیں گذرتا کہ انکا مصنف زندہ و سلامت موجود ہے
پہلے ریاض کو مشاعروں میں شریک ہونیکا بڑا شوق تھا اب وہ جوش باقی نہیں رہا، مزاج
میں لاابالی پن اور وارفتگی جو رندانہ مزاجی کا لازمہ ہے زیادہ ہے، انکے اندازِ بیان کی
چُستی مضمون کی شوخی، اور بے چینی، زبان کی صفائی اور فصاحتِ روزمرّہ اس امر کو ثابت
کرتی ہیں کہ مبدءِ فیاض سے انھیں شاعری کی نعمت عطا ہوئی ہے، یہ ضرور ہے کہ سچّے
عشق کی تصویریں اُنکے ہاں کم ملتی ہیں، بلکہ اُسکے برخلاف بعض بعض شعر غزل میں ایسے
ہوتے ہیں کہ جنکو بداخلاقی کا محرک کہنا نازیبا نہیں اور یہ بات اُصولِ شاعری کے خلاف ہے
شاعر کے دماغ سے اگر ایسے مضامین اُتریں کہ جن سے روحانی جذبات کو ترقی ہو تو وہ نہایت
قابلِ تحسین امر ہے، معاملہ بندی، ہنسی ٹھٹھول، جلی کٹی، واغطوں پر پھبتی، رندانہ بے تکلفی
کے مضامین، جابجا انکے کلام میں بڑے دلکش پیرایہ میں ملتے ہیں، ساتھ ہی یہ امر قابلِ
ذکر ہے کہ تصوّف اور اخلاق کے رنگ کی بھی جھلک کہیں کہیں نظر آجاتی ہے اور اِنکے

کلام کو عامیانہ مذاق کے تتبع ہونے کے ابتذال سے کسی قدر بچا لیتی ہے، نازک خیالی کی بھی
کمی نہیں، فکرِ رسا کی امداد سے بعض بعض شعر فی الحقیقت بڑے پایہ کے نکل جاتے ہیں۔ گو انکے
تخیل کا میلان قدرتی طور پر رندانہ حسن پرستی، معاملہ اور مذاق کا پہلو لیئے ہوئے ہے، مگر
اُن شعبوں میں بھی طبیعت بند نہیں اور یہ انکی قادر الکلامی اور مشاقیِ فن کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ حضرت
ریاض نے چند ناولوں کے اُردو میں ترجمے بھی کیے ہیں، مگر وہ چیز جس سے ہمیشہ اُردو
کی تاریخ میں اُنکا نام زندہ رہیگا وہ ناول نہیں ہیں بلکہ صدہا مضامین جو ریاض الاخبار اور
اودھ پنچ کی پُرانی جلدوں میں بکثرت ملتے ہیں اور وہ غزلیں جنکو پسند عام کے اعتبار سے
حضرت داغ کے کلام کے قریب قریب ہمپایہ ہونیکی عزت حاصل ہے۔ حضرت دلگیر کی تحریر
سے یہ معلوم کر کے کہ حضرت ریاض چند سال سے مختلف مصائب اور پریشانیوں کے آماجگاہ
بنے ہوئے ہیں سخت افسوس ہوا منجملہ دیگر حوادث کے اُنکی عمر بھر کی کمائی یعنی دیوان
غیر مطبوعہ بھی جاتا رہا۔ ہمیں افسوس ہے کہ انکے سوانح زندگی بالتفصیل باوجود کوشش بلیغ
ہمیں نہ مل سکے ؎

نذرِ اُس بت کی ہو ایمان یہ کچھ دور نہ تھا — اپنے اللہ کے صدقے اُسے منظور نہ تھا
میں پُرانا ہوں ترا چاہنے والا اے دوست — وہ بھی جلوے مری آنکھوں میں ہیں جب طور نہ تھا
شوق سے میں نے رہِ عشق کے کاٹے ہیں پہاڑ — کوہکن ہو تو ہو میں تو کوئی مزدور نہ تھا
بیٹھکر کیا دلِ مرحوم کو روتے ہو ریاض — بگڑی بن جائے یہ اللہ کو منظور نہ تھا

نہ آیا ہمیں عشق کرنا نہ آیا — مرے عمر بھر اور مرنا نہ آیا
کیئے ہونگے کتنے نمکدان خالی — نمک تمکو زخموں میں بھرنا نہ آیا
سُنا کر وہ کہتے ہیں کس ڈھب سے پیچھے — ہمیں وعدہ کر کے مکرنا نہ آیا
ریاض ایسی دیوانگی روزِ محشر — ارے چھوڑ کمبخت دامن کسی کا
مے چُرانے میں ہمیں ید طولیٰ کیسا — ہم اُڑا لائے سبو آج اچھوتا کیسا

جائیے جائیے ہم حشر میں سنتے کے نہیں | آیئے آیئے اب وعدۂ فردا کیسا
حشر کے روز امنڈ آئی ہے دنیا ساری | دیکھنا یہ ہے کہ ہوتا ہے تماشا کیسا ؟
چلمن اٹھی کسی کمرے کی قیامت نکلی | ہو رہا ہے سر بازار تماشا کیسا ؟
قرض لایا ہے کوئی بھیج کر شاید | میفروشوں کا ہے واعظ سے تقاضا کیسا
جب یہ ملجائیں کلیجے سے لگانے انکو | ان حسینوں سے کسی بات کا شکوا کیسا
پڑنے والو ہے یہ خواہش کہ اٹھائیں پردہ | اٹھ گیا آنکھ سے اب لوگوں کی پردہ کیسا
تو نے چٹکی سے جو توڑے گل رنگیں اے شوخ | ہل گیا دیکھ کے بلبل کا کلیجا کیسا

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض | زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

ناز سے اترا کے چلنا قہر تھا | ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دامن محشر گرا

روگ تھا، آزار تھا، اچھا ہوا جاتا رہا | ایسے دل کا رنج کیا جاتا رہا جاتا رہا
صدقے صبح وصل کے شکوہ امرا جاتا رہا | انکا شکوہ رہگیا میرا گلہ جاتا رہا
صبح ہوتے جب کہا میں نے کہ کچھ ہے التماس | ہنسکے بولے وقت عرض مدعا جاتا رہا
اس طرح بیچین دلکو ڈھونڈنے نکلے ہیں ہم | پوچھتا ہے ہر حسیں گھبرا کے کیا جاتا رہا
شرم ہے صبح شب وصل اور بھی دونی مگر | شام کو جو تھا وہ انداز حیا جاتا رہا
میری صورت پر ترس کیوں دشمنوں کو آگیا | تیرے صدقے کیوں وہ انداز حیا جاتا رہا
دست شفقت اس طرح اک رند نے پھیرا ریاض | بیٹھکر یاد خدا میں جھومنا جاتا رہا
یہ سن کے لیں بلائیں جو سو بار کیا ہوا | ہے ہے بلائے جاں یہ ہوا پیار کیا ہوا
میں دست شوق پیار سے گردن میں ڈالدوں | کہتے ہیں وہ گلے کا مرے ہار کیا ہوا
مجھکو ادب حجاب تھا پھر یہ کون تھا | آنکھوں سے جسنے شرم کا پردہ اٹھا دیا
ساغر دیا کسی نے مگر کس ادا کے ساتھ | یہ کہکے ہمنے زہر ہی اس میں ملا دیا
شوخی سے ہر شگوفے کے ٹکڑے اڑا دیے | جس غنچہ پر نگاہ پڑی دل بنا دیا

کہتے ہیں کوس کوس کے وہ عندلیب کو
کمبخت کی فغاں نے مرا دل دکھا دیا

بدلی ہوئی رت وقتِ سحر پی بھی لے زاہد
یہ وقت سہانا یہ سماں ہو نہیں سکتا

یہاں وہ لے دے ہوئی آکر کہ الہیٰ توبہ
ہم سمجھتے تھے کہ محشر میں تماشا ہوگا

بھرا بیساختہ پن سے ہے عالم اُنکے جوبن کا
جوانی میں ابھی کچھ طور باقی ہے لڑکپن کا

یہ دن ہے حشر کا ہوکر رہے گا وہ جو ہونا ہے
ارے جھوٹے کچھ اب قول و قسم سے ہو نہیں سکتا

نہ بچ جائے جو دنیا میں جوانی کی ہوا سے
ہوتا ہے فرشتہ کوئی انسان نہیں ہوتا

عالمِ وحشت میں میرا گھر کوئی گھر رہگیا
سر جدھر ٹکرا دیا دیوار کا در رہگیا

ایسی ضد ہے تو انہیں کون منائے یارب
اس پہ مچلے ہیں کہ کوئی مجھے کیوں یاد آیا

صدقے ہونٹوں کے جنہیں نازِ مسیحائی ہو
صدقے باتوں کے جنہیں شیوہ جلانا آیا

کیا کہا پھر تو کہو بھول گئے ہم کسکو
صدقے اُسکے جو تمہیں بھولکے یوں یاد آیا

چھپکے راتوں کو کہیں آپ نہ آئے نہ گئے
بے سبب نام ہوا آپ کا روشن کیسا

اب خدا جانے بہار آتی ہے اس میں کہ نہیں
میرے دم سے کبھی آباد تھا گلشن کیسا

ہمنے دیکھے ہیں مقاماتِ تجلی اُنکے
طور کہتے ہیں کسے وادیٔ ایمن کیسا

کئے ہیں داغ نیا دینے وہ مجکو پسِ مرگ
آج پھیلا ہے اُجالا سرِ مدفن کیسا

باغباں کام ہمیں کیا ہے وہ اُجڑے کہ رہے
جب ہمیں باغ سے نکلے تو نشیمن کیسا

ہنگامِ نزع گریہ یہاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ وقت بھلا کیا ہنسی کا تھا

مُردے کو میرے دفن اُسی خاک میں کیا
دل میں بھرا غبار جو اُنکے کبھی کا تھا

اُٹھے نہ میری گور سے پھر وہ بھی بیٹھکر
کیا عالم آج ہائے میری بیکسی کا تھا

دل نے مجھے خراب کیا کوئے یار میں
دشمن پہ اعتبار مجھے دوستی کا تھا

مے چھین کر کسی سے جو پیتے تو تھی خطا
جب دام دیکے پی تو گنہ کیا کسی کا تھا

صحرا میں پھر رہے تھے سلیماں بنے ہوئے
یعنی جنوں میں بھی ہمیں سایہ پری کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام میفروش
دنیا کی کاہشوں سے ہمیشہ رہا اداس

ہوش کس کو کون روکے جام مے
پھیرتے ہیں بہت آہستہ گلے پر خنجر

دے خدا عقل تو دیوانہ بنے
خمِ قد ہے خمِ مینا سوئے جام

جائے بھی میرے سیہ خانے سے
مستِ مینا ہوں پیا ہے میں نے

ساتھ ہے قیس سے صحرائی کا
دلِ پر داغ ہیں گلدستوں میں

پہلو سے یوں کوئی سرِ محفل نکل گیا
سینے میں دیکھیے تو کوئی زخم بھی نہیں

چُن چُن کے آج شیخ نے انگور کھا لیے
لائیگا رنگ حشر میں کل خونِ بیگناہ

وہ بھی تھا بیقرار بہت اے نگاہِ شوخ
شاید گلوں کے دامنِ رنگیں میں ہو تو ہو

وحشت زدہ ریاض نہ زنداں میں رہ سکا
کچھ عجب لطف سے مل جل کے رہا ایک سے ایک

جو کھِلا پھول بنا زخم مرے دل کا ریاض
میرے گھر مثلِ تبرک کے یہ ساماں نکلا

شفقِ شام بنی لالہ رخوں کا دامن
سنکر چپ ہی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

پر آدمی ریاض عجب دل لگی کا تھا
ساقیا لے ہم چلے ساغر گرا

ڈر یہ ہے ٹوٹ نہ جائے کہیں خنجر میرا
کہ جنوں کام ہے دانائی کا

موجِ مے ہاتھ ہے انگڑائی کا
مُنہ ہو کالا شبِ تنہائی کا

جام امیر احمد مینائی کا
کیا ٹھکانا ترے سودائی کا

شوق ہے انجمن آرائی کا
معلوم یہ ہوا کہ مرا دل نکل گیا

تیرِ نگاہ لیکے مرا دل نکل گیا
اب کیا کھچیگی ناک کا حاصل نکل گیا

دامن بچا کے آج تو قاتل نکل گیا
تو لیگئی نکال کے یا دل نکل گیا

بن بن کے اشک خونِ غم دل نکل گیا
لیکر وہ سب کے طوق و سلاسل نکل گیا

غم ترا جان مری رنج ترا دل میرا
جو کلی رہ گئی کھِلنے سے بنی دل میرا

آستیں قیس کی فرہاد کا داماں نکلا
مہِ نو بن کے حسینوں کا گریباں نکلا

وہ مزے وصل کے وہ مینہ کا برسنا رم جھم
اُف ترے برسات کی رُت ہائے برسات کی رات

میں نے چھیڑا تو کس ادا سے کہا
کچھ سنو گے مری زبان سے آج

نیچی ڈاڑھی نے آبرو رکھ لی
قرض پی آئے اک دکان سے آج

ہٹے نہ در سے ترے ٹھوکریں بھی کھا کھا کر
وہیں جمے رہے ہم سنگِ آستاں کی طرح

ہمیں ہے گھر سے تعلق اب اسقدر باقی
کبھی جو گئے تو دو دن کو مہماں کی طرح

شریکِ درد تو کیا باعثِ اذیت ہیں
وہ لوگ جن سے روابط تھے جسم و جاں کی طرح

ترا اٹھان ترقی کرے قیامت کی
ترا شباب بڑھے عمرِ جاوداں کی طرح

ریاض موت ہو اس شرط پر ہمیں منظور
زمیں ستائے نہ مرنے پر آسماں کی طرح

رہے ہم آشیاں میں بھی تو برق آشیاں ہو کر
لگا دی آگ اپنے گھر میں سرگرم فغاں ہو کر

نہ اپنے غمزدوں کو خوش کرو اب مہرباں ہو کر
بتوں تم خوش رہو ہم کیا کریں گے شادماں ہو کر

چلے ہو گل بداماں کچھ تو کہتے جاؤ ان سے بھی
کہ تم سے کہہ رہی ہیں کچھ عنادل ہمزباں ہو کر

جواں ہونے نہ پائے تھے کہ دل آیا حسینوں پر
اجل یہ کہتی آئی کیا کرو گے تم جواں ہو کر

ملایا خاک ہو کر حسرتوں کو ہم نے مٹی میں
چھپایا کارواں کو ہم نے گردِ کارواں ہو کر

ترے کوچے میں پیسا ہے اسی نے ہم ضعیفوں کو
گرا ہے سایۂ دیوار ہم پر آسماں ہو کر

کوئی منہ چوم لے گا اِس نہیں پر
شکن رہ جائیگی یونہیں جبیں پر

لہو بیکس کا مقتل کی زمیں پر
نہ دامن پر نہ اُن کی آستیں پر

اڑا لے خاک دورِ آسماں تک
پھر آخر گردشِ قسمت کہاں تک

گلہ بھی کیا کسی کا تھا کوئی راز
کہ آ کر رہ گیا میری زباں تک

وہ خوگر نالہ دشمن کا ہو جائے
نہ سنتا ہو جو میری داستاں تک

یہ تیرہ تھی شبِ تنہائی ہجر
نہ نکلے گھر سے اپنے پاسباں تک

آگیا ایسا ہی اب کافر زمانہ کیا کہیں
لیے پھرتے ہیں بغل میں لوگ ایماں آجکل

دن کو روزہ، عید شب کو ہے عجب شغلِ ریاضؔ
رات بھر پیتا ہے یہ مردِ مسلمان آجکل

محشر میں حوریں جام بکف پائیں زاہدو
اچھے رہے یہاں بھی تمھاری دعا سے ہم

ضد آپ کو دعا سے اثر کو دعا سے لاگ
فرمایئے تو ہاتھ اُٹھالیں دعا سے ہم

جو آج وصل میں اِس طرح چُھو سے جاتے ہیں
اِنھیں لبوں سے سُنی ہے ہزار بار نہیں

رہے گی یاد اُنھیں بھی مجھے بھی وصل کی رات
کہ اُن سا شوخ نہیں مجھ سا بیقرار نہیں

جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا
مزا بھی تلخ ہے کچھ بُو بھی خوشگوار نہیں

سحر بھی ہوتی ہے چلتے ہیں اے اجل ہم بھی
اب اُنکے آنے کا ہمکو بھی انتظار نہیں

خالگا کے پہنچے ہیں گل رخوں میں ریاضؔ
کچھ اُنکی ریشِ مبارک کا اعتبار نہیں

ادھر ہے بیخودی شوق اُدھر ہے نشۂ حسن
شبِ وصال ہے اور کوئی ہوشیار نہیں

یہ حشر ہے کہ الٰہی کوئی عدالتِ ناز
کھڑے ہیں دیر سے ابتک ہوئی پکار نہیں

یہ اُلجھے ہیں رندوں سے کیوں شیخ صاحب
بڑھاپے میں کیوں ڈاڑھی رنگوا رہے ہیں

جب میں کہتا ہوں کہ تھوڑا زہر ہی دیجے مجھے
ہنسکے کہتے ہیں کہ منہ مانگی قضا آتی نہیں

اُلٹے پیامِ وصل تو وہ اُنکی زباں کے ہیں
حیراں ہوں ایسے دوست وہ میرے کہاں کے ہیں

راتیں خدا جو دے تو کسی کے وصال کی
پھر صبح ہو تو لطف بھی خوابِ گراں کے ہیں

تیور ہیں تیغِ یار کی سب ہیں کھچاوٹیں
کس بل شباب میں اجلِ ناگہاں کے ہیں

سر پہ زمینِ حشر اُٹھائیں گے ڈر نہیں
جس کا جنوں میں پاس تھا وہ رہگذر نہیں

میں بھی مرا رقیب بھی دونوں ہیں خلد میں
جنت اگر یہی ہے تو اپنا گذر نہیں

لطف جی بھر کے اُٹھا لیتے ہیں بیباکی کا
ہم تصوّر میں ترے اور مزا پاتے ہیں

کسقدر گورِ غریباں کے ہیں افسردہ چراغ
جسقدر تیز کرو اور بجھے جاتے ہیں

وہ خوش کہ فریب اسکو دیا ہمکو تسلی
دونوں کو مزے آتے ہیں پیمانِ وفا میں

اُٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے کو ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

دامانِ کفن ڈال کے ہم منہ پہ چلے ہیں
اُڑتی ہے بہت خاک سُنا راہِ فنا میں

آنکھوں میں شرارت ہے کہ رُکتے نہیں رُکتی
شوخی ہے کہ بچپن سے ہے آغوشِ حیا میں

اے بیکسیٔ گور خدا تجھ میں اثر دے
ہیں پھول بھر سے آج تو دامانِ صبا میں

ہماری قبر پہ اب خاک اُڑانے جاتے ہیں
مٹے ہوؤں کا وہ شکوہ مٹانے جاتے ہیں

کلیم جا کے جہاں اپنے ہوش کھو آئے
وہاں تو روز ہم آنکھیں لڑانے جاتے ہیں

ستم ستم ہے نہ کچھ لطف لطفِ نزع کے وقت
ہماری یاد سے سارے فسانے جاتے ہیں

اب اضطراب ہے ہم میں نہ صبر ہے نہ سکون
نئے رفیق ملے ہیں پرانے جاتے ہیں

چلے یہ کہہ کے بجھانے وہ شمع تربت کو
کسی کی دل کی لگی کو بجھانے جاتے ہیں

نظر بچائے بغل میں دبائے شیشہ ہے
کہیں ریاض بھی پینے پلانے جاتے ہیں

ہم سے وفا کریں کہ وہ ہم پر جفا کریں
پائیں خدا سے ہم جو بتوں سے دعا کریں

صیاد اُڑا دیا مجھے سر سے اُتار کر
صدقے ترے ہُما ترے سر پر اُڑا کریں

سمجھائے تو ہی جا کے انھیں اے نگاہِ یاس
اب کوسنے کا وقت نہیں ہے دعا کریں

رکھ لیں ہم آپ لاؤ دلِ بیقرار میں
ایسا نہ ہو کہ تیر تمھارے خطا کریں

وہ دن کہاں ریاض وہ راتیں کہاں ریاض
بیٹھے ہوئے کسی کی بلائیں لیا کریں

اِک ٹیپ ماری زور سے زاہد کے اے ریاض
اب ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

ریاض اک چلبلا سا دل ہو ہم ہوں
حسینوں کی بھری محفل ہو ہم ہوں

کھٹکتے ہیں نگاہِ باغباں میں
جو ہیں دو چار تنکے آشیاں میں

بوتل کا کاگ زور میں توبہ کو لے اُڑا
ہم گلچلوں کے ہاتھ کی گولی رُکی نہیں

ہم جانتے ہیں لطف تقاضائے مے فروش
وہ نقد میں کہاں جو مزا ہے اُدھار میں

دل تجھے کیوں نہ کرے پیار مری جان ہے تو
دل کو میں کیوں نہ کروں پیار کہ تو ہے دل میں

تمھارے کوچے میں آئیں یہیں قیامت ہے
کہاں یہ لوگ نکل کر لحد سے جاتے ہیں

[illegible]

کریں گے کیا نہ کریں گے جو مے سے ہم توبہ
کہ اب دوکان سے ملتی اُدھار بھی تو نہیں

شبِ وصل اٹھے یہ باہم مرے
نہ وہ ہوش ہیں نہ وہ ہیں نہ وہ تھیں

نزع میں یار سے پیمانِ وفا کرتے ہیں
اُس دغا باز سے ہم آج دغا کرتے ہیں

یہ مجھ پر کیسے آج پیار آگیا
یہ کون آگیا میری آغوش میں

سجدے کرتے تھے بتوں کو کبھی ذرات ریاضؔ
اب تو ہم خدمتِ خاصانِ خدا کرتے ہیں

یہ بھی اک موج تھی وحشت کی ہیں بے زنجیر
ایسے جکڑے ہوئے کچھ طوق و سلاسل میں نہیں

آنکھ کی سُوئی نکالی ارے قاتل تُو نے
جان اٹکی ہوئی اب دیدۂ بسمل میں نہیں

بُت اپنے آپ کو کیا جانے کیا سمجھتے ہیں
خدا کی مار سمجھ پر خدا سمجھتے ہیں

دل جلوں سے دل لگی اچھّی نہیں
رونے والوں سے ہنسی اچھی نہیں

کبھی پی لی تو پی لی اب نہیں آتی بھی کچھ پرا
الگ گوشے میں ہم بیٹھے خدا کی یاد کرتے ہیں

کیا قیامت ہے مری قبر پہ وہ آتے ہیں
اپنے سایہ کو جو چلتے ہوئے ٹھکراتے ہیں

شرم سے کچھ سحرِ وصل کو کہتے تو نہیں
کروٹیں لیتے ہیں بیتاب ہیں جھنجھلاتے ہیں

ہائے سبزی ہیں وہ سیہ بوتل
کبھی ایسی گھٹا اُٹھی ہی نہیں

شیخ صاحب کیا چھپا کرکے چلے رومال میں
کچھ نہ کچھ حصّہ رہے یاروں کا بھی اس مال میں

ساتھ ہی سرکار کے جانا تھا مجکو بھی ریاضؔ
ماہئ بے آب کو رہنا تھا نینی تال میں

دل کی ہے قدر تو کچھ حسن کی سرکاروں میں
یہ وہ سودا نہیں بکجائے جو بازاروں میں

تیشہ بردوش نظر آتی ہے شب کو اک شکل
روحِ فرہاد پھرا کرتی ہے کہساروں میں

اِس لئے میں نے ترے جرم کئے دانستہ
میری گنتی بھی رہے تیرے گنہگاروں میں

مے ریاضؔ آپ بھی پیتے ہیں ہاں ریشِ سفید
ہائے یہ نور کی شکل اور سیہ کاروں میں

دلکو ہونے دے ہدف ممکن نہیں دلکی تڑپ
یہ اُڑاتی ہے ہمیشہ چٹکیوں میں تیر کو

کیوں ہوا ناوک خطا ہے شرم سے نیچی نگاہ
لاؤ ہم رکھ لیں کلیجے میں تمھارے تیر کو

ناوک افگن دیکھ لے آکر ذرا تو دلکی پھانس
یہ ذراسی پھانس تو شرما رہی ہے تیر کو

ہم بند کئے آنکھ تصور میں پڑے ہیں
ایسے میں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو

ہم گذری ہوئی یاد دلاتے ہیں کسیکو
منہ پھیرے ہوئے کوئی ہمیں کوس رہا ہو
کیا جام دیا ہے مجھے کیا جام دیا ہے
ساقی کا بھلا ہو مرے ساقی کا بھلا ہو

ڈر ہے کہ اسنے خوں کسی کا کیا نہ ہو
اتنا بھی شوخ ہا غصہ کا رنگ حنا نہ ہو
بھی باغباں کو لاگ نشیمن کی شاخ سے
صیاد کوئی اور نیا گل کھلا نہ ہو
وہ بھی یہ چاہتے ہیں ٹھہر جائے دل ذرا
ہم بھی یہ چاہتے ہیں کہ ناوک خطا نہ ہو
چلتی ہوئی ہے تیغ رواں اُنکی کسقدر
اُسکی بھی جان جاتی ہے جسکی قضا نہ ہو
تمکو جو نیند آئے تو دشمن کو موت آئے
افسانہ وہ سناؤں جو تمنے سنا نہ ہو
ہمنے بھی اِن حسینوں کو چھیڑا ہی اسقدر
ایسا بھی کوئی ہے جو ہمیں کوستا نہ ہو
اللہ حسن دے تو حیا بھی ضرور دے
کس کام کی وہ آنکھ کہ جس میں حیا نہ ہو
کافر حسیں بلا سے خفا ہیں ہوا کریں
ہمسے خفا ریاضؔ ہمارا خدا نہ ہو

رکھا ترے دامن میں ہے کیسے گلِ تر کو
رکھ آنکھ میں لے قبر مرے نورِ نظر کو
ہے آگ لگی آگ لگے اسکے اثر کو
جاتا ہے کہاں نالۂ دل پھونکنے گھر کو
پہلو میں ہمارے غضب اک پھانس چبھی ہے
رہ رہ کے بڑھاتی ہے وہی درد جگر کو
یکساں ہے مرے گھر میں شب روز کا عالم
پھرتے ہیں مہ مہر لیئے شام و سحر کو
جب خاک سے بچتے نہیں پروردۂ دامن
کیا لیکے کریں لالہ و گل لعل و گہر کو
شب گورِ غریباں میں بسر کرتے ہیں اے موت
ہم شام کو جا رہتے ہیں آتے ہیں سحر کو
مقبول دعائیں نہیں ہوتیں نہیں ہوتیں
قسمت میں ترسنا ہے ترستے ہیں اثر کو
تنکوں میں نشیمن ہیں کبھی چھپتے تھے ڈر سے
خوش ہوتے ہیں اب دیکھ کے ہم برق و شرر کو
گریاں ہیں ریاضؔ آپ غمِ مرگ میں کسکے
درپیش یہی راہ ہے ہر فرد بشر کو

داد خواہوں میں دمِ حشر جو دیکھا ہے ریاضؔ
پیار سے پوچھتے ہیں بھول گئے تم مجکو
پچھلے گناہ کیسے انھیں سے ملے نجات
محشر میں جو کیئے ہیں انھیں کا حساب ہو

اے شیخ دو چھڑا کے پئے جب کبھی پئے
تیری طرح کسی کی نہ نیت خراب ہو

لاکھوں حسین ہیں حشر میں جی چاہتا ہے یہ
اس میں سے کوئی اپنے لیے انتخاب ہو

چلتے ہیں جب ریاض تو کچھ جھومتے ہوئے
جیسے پئے ہوئے کوئی مست شراب ہو

خداوندا یہی مے آستاد شہد و شیر جنت ہو
جو رند صاف باطن ہو جو رند پاک طینت ہو

قیامت کو کہیں کیا لٹکے چلتے لینے جاتا ہے
تم اس فتنہ کو ٹھکراؤ یہی فتنہ قیامت ہو

ہمیں کیا بھر دیئے ہوں کوٹ کر مرتی جو قدرت نے
ہمارے کام کی وہ آنکھ ہے جس میں مروت ہو

نہ اس میں دھوپ کھلتی ہے نہ شب کی اوس گرتی ہے
مرے گھر کا وہ عالم بیکسوں کی جیسے تربت ہو

مے میں ڈوبا نامۂ اعمال کا ہر حرف ہو
رنگ وہ ہو گئے کہ صدقے سرخی شنجرف ہو

پاک طینت رند پی کر مجھکو پہنچائیں ثواب
میری پونجی نیک کاموں میں الٰہی صرف ہو

[illegible]

لگ گئے آ با چاند سی صورت لیے ہر آئینہ
چوٹ پر کھائی چوٹ ٹوٹا آئینہ پر آئینہ

شکل عبرت بن کے بیٹھا ہے سر منبر آج
پھر واعظ چاہیے ہے پیش منبر آئینہ

کیسوں بلائیں لیکے منہ چوما [illegible]
اٹھ گئے وہ پھینک کر شانہ ٹپک کر آئینہ

دل میں چبھ جائے وہ کانٹا چاہیے
دل میں بس جائے وہ صحرا چاہیے

حشر کے دن ہیں شوخی یہ شرارت اچھی
لگ گئے دیکھ کے ہم حشر میں صورت اچھی

نہ بنے کام تو کس کام کی نازک شکلیں
نازک اچھے نہ حسینوں کی نزاکت اچھی

وہ بری لاکھ ہیں اٹھے جو لب واعظ سے
تیری ٹھوکر سے جو اٹھے وہ قیامت اچھی

ہے لباس پارسائی پردہ پوش * زیر دامن جام صہبا چاہیے

مرا دل ناز پرور وہ تمھا کیسا کیا ہوا اس کو؟
بہت غمگیں بہت محزوں، بہت مہجور رہتا ہے

زمانے میں بہت اللہ کے بندے ہیں ایسے بھی
کہ جنکے پاؤں پر تاج سر فغفور رہتا ہے

نہ اس کافر کے گیسو میں نہ مجھ بیکس کے پہلو میں
خدا جانے کہاں میرا دل رنجور رہتا ہے

ادب سے واعظ کی صحبت میں ہم وہ شے نہیں پیتے
ہمارے جام میں افشردۂ انگور رہتا ہے

خمار آلودہ آنکھوں پر ہزاروں میکدے قربان
وہ کافر بے پئے بھی راتدن مخمور رہتا ہے

لحد پر شمع سے بڑھ کر ہے دودِ شمع کا جوبن | وہ بن کر حور تو یہ بن کے زلف حور رہتا ہے
ریاض احباب گورکھپور اکثر یاد آتے ہیں | زباں پہ میری اکثر ذکر گورکھپور رہتا ہے

جاتا ہوں تو آتی ہے یہی طور سے آواز | ہم دیکھنے والوں کو سنبھلنے نہیں دیتے
یہ ایک لطف لاکھ ستم کا جواب ہے | محشر میں ہنس کے کہہ گئے کچھ دادخواہ سے
سیری ہوئی نہ لذتِ عصیاں سے عمر بھر | کیا کچھ کیا مگر نہ بھرا جی گناہ سے
جاتے ہیں اب ریاض کہاں سوئے میکدہ | مسجد میں آ رہے جو اُٹھے خانقاہ سے
بالوں میں اپنے بیٹھ کے موتی پروئیے | آنسو نہ پونچھئے کسی آشفتہ حال کے
شبِ غم کی سحر نہیں ہوتی | ہو بھی تو میرے گھر نہیں ہوتی
یادِ پیری میں ادھر آئی اُدھر بھول گئے | اے جوانی تیری ہم شام و سحر بھول گئے
روؤں کیا بیٹھ کے میں اپنے مصائب کو ریاض | اب تو رونا بھی سرِ دیدۂ تر بھول گئے
اُگتے تھے جس میں نخلِ امیدِ وصال کے | کیا ہو گئے وہ باغ طلسمِ خیال کے
اُٹھواؤ میز سے مے و ساغر ریاض جلد | آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے
انھیں کے کام الٰہی مرا لہو آئے | رنگیں جو ہاتھ لہو میں حنا کی بو آئے
دبی زبان سے میرا بھی ذکر کر دینا | کلیم طور پہ اُن سے جو گفتگو آئے
نہ جھوٹ بول کہ ہم شام سے کل آئیں گے | دکھا قسم ارے جھوٹے کبھی جو تو آئے
کھلے جو کوئی تو کھل کر کسی سے باتیں ہیں | اُٹھے حجاب تو کچھ لطفِ گفتگو آئے
دلائے یاد جو وعدے تو بولے جھنجھلا کر | یہ اور حشر میں لینے کو آبرو آئے
لگائے باغ کہاں داغِ آرزو آئے | جہاں نہ پھول نہ پھولوں میں رنگ و بو آئے
چمن سے شیخ بھی اُٹھ کر کنارِ جو آئے | ہم آئے پینے کو مے وہ پئے وضو کے
کھلیں نہ قبر میں جنت کی کھڑکیاں زندہ | دماغ میں جو بسی ہے اُسی کی بو آئے
مری نگاہ میں بھی کوئی بجلیاں بھر دے | کوئی چمک کے ذرا میرے روبرو آئے

لگائی ہنسنے لب جو قطار مینا کی　　لگانے سرو نئے ہم کنارِ جو آئے
نہ ہو یہ کہنے کو ہم بے کہے گئے واعظ　　حرم کو جاتے ہوئے منہ بتوں کا چھو آئے
ریاض آئے تو لوگوں نے میکدہ میں کہا　　کہاں یہ آج بزرگ فرشتہ خو آئے

مرے دل کے ارمان مر کر نہ نکلے　　جو دل میں چبھے تھے وہ نشتر نہ نکلے
کلیم آئے تو کھل کے جلوہ دکھایا　　ہم آئے تو پردے سے باہر نہ نکلے
ہماری نظر حشر میں شیخ پر تھی　　وہ سر پر لئے حوضِ کوثر نہ نکلے
رہا ہے جو اس دل میں ہنگامہ آرا　　وہی بزم آرائے محشر نہ نکلے

لرز گئے فتنہ محشر سے ترے نقشِ قدم　　اک قیامت ترے کوچہ میں بپا اور ہوئی
چلی ہے آج ستانے انھیں فغاں میری　　ارے ضرور یہ کٹوائے گی زباں میری
تم اپنے بام سے فریاد کی اجازت دو　　یہاں سے تو نہیں سنتا ہے آسماں میری
کہے کہے نہ کہے کوئی مجھکو کیا اس سے　　سنیں سنیں نہ سنیں آپ داستاں میری
وہ بولے ابرو و مژگاں کو کیا ہوا شب وصل　　دھرے رہے یونہی ناوک مرے کماں میری
اٹھاؤں عفو کی لذت بھی لطفِ عصیاں بھی　　مرے کریم یہ تقدیر ہے کہاں میری
ستانیوالوں کو کچھ قدر ہو ستانے کی　　انھیں ستائے یہ مانے جو آسماں میری
وہ میں ہوں آج زمانے کو ناز ہے جسپر　　ریاض دھوم ہے جسکی وہ ہے زباں میری

ابھی چپ ہوں محشر میں افشا کروں گا　　حسینوں کے رازِ نہاں کیسے کیسے
بڑی کوئی نٹ کھٹ ہے یارب قضا بھی　　چھٹے بانکے ترچھے جواں کیسے کیسے
ہمیں چاٹ کوثر کی دی واعظوں نے　　ملے ہمکو پیرِ مغاں کیسے کیسے
جھپکا ہوا خیال ہے عقبیٰ کہیں جسے　　بھولا ہوا سا خواب ہے دنیا کہیں جسے
دیکھے شبِ فراق میں کوئی تو ہم دکھائیں　　دل کا وہ داغ چاند کا ٹکڑا کہیں جسے
ظالم کی آرزو نے جگہ لی ہے اس طرح　　دل میں چبھا ہوا کوئی کانٹا کہیں جسے

اِن آرسی کے نہ بجھنے والوں کو کیا پرکھ
اچھا ہے وہ حسین ہم اچھا کہیں جسے

گلزار میں وہ پھول ہی جس کا ہو نام مے
زاہد وہ سروِ باغ ہے مینا کہیں جسے

واقف نہیں وہ روزِ قیامت کے طول سے
وعدہ کیا ہے وعدۂ فردا کہیں جسے

حاصل اگر ہوئی بھی تو حاصل نہیں ہے کچھ
بے اعتبار چیز ہے دنیا کہیں جسے

اتنی تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی
ہم رندِ حسن کے تعلّق مینا کہیں جسے

اہلِ حرم میں جا کے بنا آج شیخِ وقت
کافر ریاض پیرِ کلیسا کہیں جسے

اُڑتے ہوئے میخانے چلے آتے ہیں لاکھوں
اُٹھتی ہوئی ساون کی گھٹا اور ہی کچھ ہے

کیا ہاتھ اُٹھے ہاتھ اُٹھا بیٹھے دعا سے
اُٹھ جائے تو ہاں دستِ دعا اور ہی کچھ ہے

نشتر سے چلے کام تو سو بار چبھو لوں
اے دردِ جگر تیری دوا اور ہی کچھ ہے

دردِ فرقت کی اذیت کا نہ پوچھ کچھ حال
آج گھبرا کے کئی بار قضا بھی آئی

حشر کے دن بھی رہی بات وہی آنکھ وہی
جھوٹے وعدوں سے تجھے شرم ذرا بھی آئی

آئے میخانے میں جب مسجدِ جامع سے ریاض
ساتھ ہی آپ کے قبلہ سے گھٹا بھی آئی

عمر کیا ہے ابھی کم سن ہیں نہ تنہا لیٹیں
سو رہیں پاس مرے خواب میں ڈرنیوالے

خم مسجد میں مے ناب بھریں جاڑوں میں
ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے ٹھٹھرنیوالے

پھرتے ہیں کیسے حشر میں وہ ہنستے کھیلتے
کچھ داد گر سے کام نہ کچھ داد خواہ سے

مرنیوالے اسی قابل تھے کہ بے موت مریں
بات کیا ہے جو پشیمان قضا ہوتی ہے

واعظ انگور میں ہے دخترِ رز رو بہ نقاب
آنکھیں پھوٹیں جو ادھر تاک لگائے کوئی

بیکسی کہتی ہے یہ دیکھ کے تربت کا چراغ
آپ بجھ جائیگا اسکو نہ بجھائے کوئی

بھرے خم ہم کیا کرتے تھے خالی اب وہی ہم ہیں
بھری محفل میں خالی ہو کے ہم تک جام آتا ہے

ہمارا عیب کھلتا ہی نہ کھلتی ہے چھپی بوتل
ہمارے کام کیا کیا جامۂ احرام آتا ہے

پائیں تو اے حسینوں تمکو رُلا کے چھوڑیں
ہیں یہ ریاض ایسے انکو ترس نہ آئے

بنائیں آشیاں کیونکر لدی پھولوں سے ڈالی ہے
یہ مشکل پاؤں رکھنے کی جگہ ہم نے نکالی ہے

ریاض اک چیز تھے انساں اگر ہوتے قرینے کے
مزے کے شخص ہیں لیکن طبیعت لاابالی ہے

ضعف یہ ہے کہ آنکھ اوپر کو
کم سے کم دو پہر میں اٹھتی ہے

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اٹھا لے

عادت وہ بری شے ہے جو کھانے کو ملا بھی
بے مے کے مرے حلق سے اترے نہ نوالے

برسات کی رت اور یہ گھنگھور گھٹائیں
اب ہم ہیں ریاض اور حسیں گیسوؤں والے

بے موت مری سوت کہاں مر رہی جا کر
ہم آئے تو وہ کوچۂ قاتل میں نہیں ہے

دل نہ مانا حضرتِ واعظ کو آتے دیکھ کر
کچھ یونہیں تھوڑی سی پی لی دل لگی کیواسطے

گود میں جھٹ سے بس اٹھا لیجے
چھم سے گھر میں جو کوئی آ جائے

جان لو کچھ گذر گئی اس پر
منہ چھپائے جو کوستا جائے

مجھے تو ہائے حسینوں پہ رحم آتا ہے
کبھی نہ چین سے راتوں کو اپنے گھر میں رہے

سب بھول گئے اسکو ترے عہدِ ستم میں
اب شکوۂ گردوں کوئی کرتا ہی نہیں ہے

دیوانہ ریاض اوروں سے کیا بات کریگا
معشوقوں سے تو بات وہ کرتا ہی نہیں ہے

اے دلِ ناداں بہت ناداں نہ بن
جان دیتا ہے ارے کن کے لیئے

دل کسی طرح چین پا جائے
غیر کی آئی ہمکو آ جائے

دیدہ و دل ہیں کام کے دونوں
وقت پر جو مزا دکھا جائے

شیخ صاحب برائیاں مے کی
اور جو کوئی چپت کی آ جائے

ہے ریاض اک جوانِ مست خرام
نہ پیئے اور جھومتا جائے

جو اپنے گھر سے آیا ہے تو یہ رنگِ حیا کیوں ہے
ترے صدقے یہ شرمائی ہوئی تیری ادا کیوں ہے

عدو کی خیر کسکے غم میں یہ حالت بنائی ہے
پریشاں کیوں ہیں گیسو چاک دامانِ قبا کیوں ہے

حسینوں کا عالم نیا ہو رہا ہے
کہ جس بت کو دیکھو خدا ہو رہا ہے

یہ زاہد بتوں کے ستائے ہوئے ہیں
کہ جب دیکھو ذکرِ خدا ہو رہا ہے

آنچل ڈھلا رہا مرے مستِ شباب کا
اوڑھا گیا کبھی نہ دوپٹہ سنبھال کے

چلے آتے ہیں خوش خوش کسکے گھر سے
وہ ہنسنے کھیلتے بادِ سحر سے

مزے کی چیز ہے یہ مجمعِ حشر
حسیں کیا کیا گذرتے ہیں نظر سے

ہمیں تو جیتے جی کوثر کی پلوا
خدایا چھوڑ دی ہے تیرے در سے

ذرا چلکر تمہیں اسکو چھڑا دو
کسی کی آہیں اُلجھی ہیں اثر سے

کاتب اعمال نکلے کام کے
ملگئے دو دو شریک الزام کے

ایک آفت تھا تمہارا کوسنا
مرگئے لو سب ہمارے نام کے

پڑ وہ ڈالا مجھ سراپا جرم پر
صدقے اپنے جامۂ احرام کے

قیامت ہے کسکی اُٹھائی ہوئی
یہ آفت ہے سب اُنکی لائی ہوئی

نہیں آتشِ طور دلکی لگی
بجھیگی نہ اُنکی لگائی ہوئی

خم بہ خم اُف رے تری زلفِ دراز
چھوٹتے ہیں کب اسیر اس دام کے

آبتا دیں ہم تجھے منہ چوم کر
کس طرح ٹوٹے مزے دشنام کے

وہاں میکشی مے پرستی رہی
یہاں عمر بھر فاقہ مستی رہی

دکھاؤ نگہ کی جو تم شوخیاں
چھپے برق بھی تلملائی ہوئی

اُنھوں نے تو دیوانہ ہمکو بنایا
وہی اب کریں پاسبانی ہماری

یہ ساقی نے ساغر میں کیا چیز دیدی
کہ توبہ ہوئی پانی پانی ہماری

پاک صاف ایسی ہے جسنے پی فرشتہ بن گیا
زاہدو یہ حور کے دامن میں ہے چھانی ہوئی

قحط تھا کیسے مزے کا حسن ارزاں بک گیا
اِس گرانی میں مزے آئے یہ ارزانی ہوئی

غم مجھے دیتے ہو غیروں کی خوشی کیواسطے
کیوں بُرے بنتے ہو ناحق تم کسی کیواسطے

حشر میں او کاتبِ اعمال کچھ تو ہو شریک
ساتھ رکھا تھا تمھیں نیکی بدی کیواسطے

ہجر سے بڑھکر مصیبت کوئی آنیکی نہیں
موت کو رکھ چھوڑیئے کس زندگی کیواسطے

پاسِ آدابِ بزرگی ہے باین وضعِ جنوں
جب چلے ناصح جھکے ہم بندگی کیواسطے

یہ سمجھ کر کم نہیں یہ دل دکھانے کے لیئے
دل مجھے دیتے گئے میرے ستانیکے لیئے

ساتھ اُنکے ہے ہزاروں عندلیبوں کا ہجوم
آئے ہیں دو پھول تربت پر چڑھانیکے لیئے

حشر کے دن وعدہ کس کا کون کرتا ہے نباہ
ہیں یہ باتیں ہمکو دیوانہ بنانے کے لیئے

نزع کیسی موت کسکی اب مرے دشمن مریں
پاس آ بیٹھے ہیں وہ باتیں بنانیکے لیئے

کوثر و تسنیم، حور و خلد کے ہوتے ہوئے
جائیں گے ہم آگ دوزخ میں لگانے کے لیے

آستانِ یار سے کوئی اٹھائے کیوں ہمیں
ہم بھی آ بیٹھے ہیں قسمت آزمانے کے لیے

چھیڑ کیسی بات کہتے روٹھے جاتے ہیں ریاض
اک حسیں ہر وقت ہو انکے منانے کے لیے

بیمار کی بالیں سے یہ کہتے ہوئے گذرے
دیکھی نہیں جاتی ہے مصیبت ہو کسی کی

دیدے دیدے مرے ساقی ترے صدقے دیدے
دستِ رنگیں سے چھلکتے ہوئے پیمانے سے

جہاں ہم خشتِ خم رکھدیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

تمھیں کیونکر بتائیں دلبر اپنے کیا گذرتی ہے
تمھیں کیونکر دکھائیں تم میں کیا عالم نکلتا ہے

اتنی تو پتے کی ہے کہ بہکے ہوئے ہم تھے
مجرم ہیں جو واعظ کی کہیں سے خبر آئے

جو سکر کسنے چھڑائی ہے مسی ہونٹوں کی
سامنے منہ تو کریں بات نہ کرنے والے

ہے زمانے میں محبت کی نظر کی تعریف
صدقے ان آنکھوں کے یہ تیز نگاہی کیسی

ہنسے جو محفلِ ماتم میں تم ہنسی ہوگی
پکارتا ہے تبسم مری ہنسی ہوگی

غلط ہے آپ نہ تھے ہمکلام خلوت میں
عدو سے آپکی تصویر بولتی ہوگی

نہ شیشہ پنبہ دہن ہے نہ خم ہے بے منہ کا
کھلے جو حضرتِ واعظ تو دل لگی ہوگی

جھجک جھجک کے لیا ہوگا ہاتھ میں ساغر
جو پی بھی ہوگی تو ڈر ڈر کے ہنسے پی ہوگی

اتر گئی سرِ بازار شیخ کی پگڑی
گرہ میں دام نہ ہونگے ادھار پی ہوگی

ہجوم دیکھ کے سمجھے یہ صبحِ محشر ہم
کھلی دکان کسی میفروش کی ہوگی

شریکِ مے میں کیا ہوگا آب زمزم بھی
ریاض نے پس توبہ جو پی کبھی ہوگی

اذاں کا کام چلجائے جو ناقوسِ برہمن سے
بڑا یہ بوجھ اترے ای مؤذن تیری گردن سے

مسل دو دلکو چٹکی سے اگر چھیڑے کبھی تم کو
یہ جب ابھرے ذرا اسکو دبا دو اٹھتے جوبن سے

جگایا ہے بہت جادو جگا کر ان حسینوں کو
بہت کچھ سحر سیکھا ہے انھیں کی چشمِ پرفن سے

برا ہو خانقہ کا چار دن میں کیا ہوئی صورت
یہ عالم ہے کہ گویا اٹھکے ہم آئے ہیں مدفن سے

شبِ غم کا یہ عالم ہے چراغ اِس طرح جلتا ہے
گلے ملنے کے اِن کافر حسینوں سے بھی فن سیکھا

اُٹھا لائے ہیں گویا ہم کسی بیکس کے مدفن سے
جوانی جب گلے ملتی ہو آ آ کر لڑکپن سے

داورِ حشر طرفدار ہمارا ہو تو ہو
میکدہ بھی ہے مقاماتِ ادب سے شاید
شیخ جی گر گئے تھے حوض میں میخانے کے
بالس پر میکدہ میں تجکو چڑھایا اے شیخ
نہ جفا سے ہے میرے دل کو قرار
شمع کھُل کھیلے گی پروانے سے آج
ملتی جلتی ہے مری فردِ عمل
آ گرے آنے کا حاصل تھا یہی

دلِ محشر تو طرفدار تمھارے نکلے
جو اِدھر نکلے وہ وستار اُتارے نکلے
ڈوب کر چشمۂ کوثر کے کنارے نکلے
پھر بھی اُونچے تری مسجد کے منارے نکلے
نہ تسلّی وفا سے ہوتی ہے
کچھ سنیگی یہ لبِ گلگیر سے
کاتبِ تقدیر کی تحریر سے
دل گرفتہ رہل سے لیے دستگیر سے

[illegible]

بھولی بھولی شکل دیکھی کس کی گھبرائی ہوئی
جوشِ مے اور سبزہ زاروں میں گھٹا چھائی ہوئی
ہائے وہ دن ہمسے یوں زاہد لبِ کوثر کہے
ہائے کیا جھٹ پٹ قفس میں بال و پر پیدا کیے
کیا پڑے ہو گوشۂ مسجد میں اُٹھو زاہدو!
ساتھ شوخی کے کچھ آنکھوں میں حیا رہنے دے
اِن جفاؤں پہ بھی حشر میں کام آئے گی
مجکو ارمان منائے کوئی میرے دل کو
درِ میخانہ نہیں ہے یہ درِ کعبہ ہے
رحم آتا ہے مجھے اپنی غریبی پہ ریاض

پھر گئی گھر سے مرے کیوں شامِ وصل آئی ہوئی
بات ایسی ہے کہ توبہ بھی ہے للچائی ہوئی
پیجیے تو کس تکلف کی ہے کھچوائی ہوئی
جب سُنا ہمنے کہ جاتی ہے بہار آئی ہوئی
پھوٹی آنکھوں سے ذرا دیکھو گھٹا چھائی ہوئی
یہ بھی اک چیز ہے او فتنہ ادا رہنے دے
اپنی آنکھوں میں مروّت بھی ذرا رہنے دے
اُنکو یہ ہٹ کہ خفا ہے تو خفا رہنے دے
ہر جگہ چھیڑ یہ اے لغزشِ پا رہنے دے
اپنے در پر کوئی مجکو بھی پڑا رہنے دے

[illegible]

وہیں آ بیٹھنا اُٹھ کر اُدھر سے

ملا ہے گھر مرا دشمن کے گھر سے

ہمارے پاس دل سی چیز رہتی؟
ہوا پر ہے مزاج ابر کرم کا
رات دن بزم میں دورِ مئے گلفام چلے
سنگ بتخانوں سے میخانوں سے شیشے آئے
کوئی دیکھے تو خوشی غیر کے گھر جانیکی
یہی کثرت ہے اسیروں کی تو میرا تتمہ
کاٹے کٹتی نہیں مجھ مست سے برسات کی رُت
دام اس انداز سے پھیلائے چمن میں صیاد
طلب کیجے کبھی ہمنے اگر پس توبہ
اُترنے والے ابھی تک نہ بام سے اُترے
نثار وصل کی راتیں ہیں ایک ساعت پر

بچائے رکھتے ہیں اُنکی نظر سے
پیو رندو! وہ برسے یا نہ برسے
زور تجھ سے جو مرا گردشِ ایام چلے
طرف کعبہ جو ہم پیروِ اسلام چلے
شام سے پہلے وہ بنکر شفقِ شام چلے
ارے صیاد جو دو دن بھی ترا دام چلے
میکدے والی چلیں آج تو کچھ کام چلے
میں سرِ شاخ چلوں سایہ تو دام چلے
بہت بھرے ہوئے ہمسے خم و سبو آئے
تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھو آئے
ہم انتظار میں تیرے ہوں اور تو آئے

خفا یہ کہتی ہے لو بے زبان پا کے مجھے
خفا یہ کہتی ہے اُن سے سنا سنا کے مجھے
ذرا سے درد نے ڈھائی ہیں آفتیں کیا کیا
میں اپنے خون کا بیڑا اٹھاؤں خود کیونکر
یہ کیا مذاق فرشتوں کو آج سوجھا ہے
ستانے والو قیامت بھی آئے جاتی ہے
کہاں وہ نور کی صورت وہ نور کی آواز

جب آپ آئے گئے چوریاں لگا کے مجھے
نہیں شہیدوں میں ملنا لہو لگا کے مجھے
پٹک دیا ہے زمیں پر اٹھا اٹھا کے مجھے
وہ پان دیتے ہیں شوخی سے مسکرا کے مجھے
ہجومِ حشر میں لے آئے ہیں بلا کے مجھے
جفا کے لطف تمھیں آئینگے وفا کے مجھے
ریاض کون سنائے غزل یہ گا کے مجھے

مری آہِ رسا چنچل بڑی ہے
مزے لوٹو کلیم اب بن پڑی ہے
توبہ کرنے سے شرم آئی

یہ بجلی بن کے کانوں میں پڑی ہے
بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے
اعمال پہ اپنے جب نظر کی

آہ کیا بے اثر ہی جائیگی
کچھ نہ کچھ پُر کام کر ہی جائیگی

حال ہے گر یہی تو اپنی جاں
وقت سے پیشتر ہی جائیگی

میرے گھر میں اگر بلا آئی
ڈر ہی جائے گی مر ہی جائیگی

شمع تربت صبا کو آنے نہ دے
کچھ نہ کچھ گل کُتر ہی جائیگی

تیری رحمت ہے تو گنہ کیا ہیں؟
سر سے گٹھڑی اُتر ہی جائیگی

ہمتو کیا جائیں گے وطن کو ریاضؔ
اب ہماری خبر ہی جائیگی

چھیڑکر مجمع زہاد کو ڈرتا ہوں ریاضؔ
کُہنہ مسجد کے عوض ہو نہ مرمّت میری

کیا ٹھکانا ہے بات کا اُنکی
دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ ہے

چشمِ تر کی اشک باری آپنے دیکھی نہیں
یہ اگر طوفاں اُٹھاتی سینکڑوں گھر بیٹھتے

بارشِ ابرِ کرم نے اورلت پت کر دیا
حشر میں ہم کیا سکھانے دامنِ تر بیٹھتے

بزمِ محشر میں نہ رکھتی اُسکی رحمت امتیاز
لطف ہوتا رند و زاہد سب برابر بیٹھتے

میکدے میں جائے ممبر خم تو تھا اے میکشو
میرے گھر واعظ جو آتے میرے ممبر بیٹھتے

ہو گی وہ دل میں جو ٹھانی جائیگی
کیا کسی کی بات مانی جائیگی

آگ بنکر آئی کیا تیغِ پُر آب
آئی ہے تو ہو کے پانی جائیگی

تیغ ہی کیا ہاتھ میں قاتل کے تھی
اے خنا تو بھی تو سانی جائیگی

خدمتِ میخانہ کر لے ورنہ شیخ
رائیگاں یہ زندگانی جائیگی

آگ بنکر جام میں آئیگی مے
زمزمی میں ہو کے پانی جائیگی

موت سے بدتر بڑھاپا آئے گا
جان سے اچھی جوانی جائیگی

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی
میکدے سے اب پرانی جائیگی

عرش پر ہے خوش جمالوں کا مزاج
کیونکر ان کی لن ترانی جائیگی

جل چکے ہیں آپ کل دشمن کے گھر
آج مرگِ ناگہانی جائیگی

ساتھ لائے ہیں قفس سے ناتواں ۔۔۔ جاتے جاتے ناتوانی جائیگی
پینے آتے ہیں فرشتے حور ریاض ۔۔۔ حور کے دامن میں چھانی جائیگی

ناپائدار زندگی مستعار ہے ۔۔۔ آئے نہ آئے سانس کا کیا اعتبار ہے
ساقی ہمیں چھکائے کہ رخصت ہے فصل گل ۔۔۔ برساتے آج پھول کہ جاتی بہار ہے
قربان اپنی کثرت عصیاں کے لاکھ بار ۔۔۔ محشر میں سب سے پہلے ہماری پکار ہے
پی لی تھی کچھ کہ چین سے گذری شب لحد ۔۔۔ دن ڈھل چکا ہے حشر کا ابتک خمار ہے

پہنچ جائے کسی کے بام تک یارب فغاں میری ۔۔۔ لگی لپٹی گئی ہے ساتھ جان ناتواں میری
بتوں کے بام سے مجھپر یہ کیوں پتھر برستے ہیں ۔۔۔ گرے اس طور پر بجلی لڑی قسمت کہاں میری
وہ کیا دن تھے کہ راتیں اس طرح باہم گذرتی تھیں ۔۔۔ دہن میرا زباں انکی دہن انکا زباں میری
کیا یہ رنگ پیدا مدتوں رہکر کلیسا میں ۔۔۔ حرم میں نغمۂ ناقوس بنتی ہے اذاں میری
کہیں ایسا نہ ہو چھینکیں فلک سے بام پر اُنکے ۔۔۔ کہاں لیجاکے پھینکیں گی مجھے بیتابیاں میری
دم آخر جو آئیں بھی تو یارب اس طرح آئیں ۔۔۔ مزا دیں قلقل مینا کا مجکو ہچکیاں میری
ریاض اک عمر گذری دیر میں آئے مگر ابتک ۔۔۔ حرم میں گونجتی پھرتی ہے راتوں کو اذاں میری

ریاض

ریاض - سردار مرزا ریاض لکھنوی مقیم مٹیا برج کلکتہ شاگرد نعیش الدولہ عیش بعد وفات سلطان عالم واجد علیشاہ وطن چلے گئے اسکے بعد کا حال معلوم نہوا یہ چند شعر انکے منتخب ہو کر درج ہوئے

سبزہ رنگوں میں چلے گر جھوم کر جام شراب ۔۔۔ رقص طاؤسی دکھائے سربسر جام شراب
جمگھٹا حوروں کا ہے مجھ بادہ کش کی بزم میں ۔۔۔ جام کوثر کا دکھاتا ہے اثر جام شراب
ہائے کہہ کر دل پکڑ لیں بادہ کش میخانہ میں ۔۔۔ طرز رفتار صنم سیکھے اگر جام شراب
نشۂ دولت میں عاقل ہے تو رکھ فکر خمار ۔۔۔ پیتے ہیں مثل دوا اہل ہنر جام شراب

ریاض

ریاض - سید رضا حسین عرف ننھے صاحب لکھنوی شاگرد جناب آغا مظہر لکھنوی آپ لکھنؤ کے دور موجودہ کے خوش فکر کہنے والوں میں ہیں کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو ٭

قصد اُٹھنے کا وہ کرتے ہیں مرے پہلو سے
ہوں ذرا درد جگر اور سوا ہو جانا

اُٹھا شورِ قیامت ہم جو اُٹھے
زمیں بیٹھی اگر بیٹھے زمیں پر

آنکھیں تلووں سے ملو نگا بام سے کہتے ہیں وہ
آنکھ بھر کر تم اگر دیکھو گے درباں کی طرف

ہر دم تڑپ تڑپ کے گذرتی ہے ہجر میں
یہ کون آکے لے گیا صبر و قرار دل
دل اب کہاں کہ ہو گئی مدت مٹے ہوئے
اک داغ میرے سینے میں ہے یادگار دل

دوشِ صبا پہ گل جو روانہ چمن کے ہیں
جنگل میں آج پھول کسی بیوطن کے ہیں
عبرت کی ہے جگہ جنھیں کل تک عروج تھا
محتاج آج حیف وہ گور و کفن کے ہیں
جب میں کہتا ہوں کہ تھوڑا زہر ہی دیجے مجھے
ہنسکے کہتے ہیں کہ منہ مانگی قضا آتی نہیں

جگہ میں آ گئی دل سے گذر کے
تصدق آپ کی ترچھی نظر کے
مرا سینہ ہے اے گل لائق دید
کھلے ہیں پھول کیا داغ جگر کے
گھٹا چھائی ہوئی ہے آسماں پر
ارے ساقی ادھر لا جام بھر کے
یہ کہتا ناز سے اُس کا شبِ وصل
ترے مہماں ہیں ہم رات بھر کے

یہ انتہا ہے کہ سر رکھدیا ہے قدموں پر
کسی طرح نہیں سنتا ہے پاسباں میری

ریاض

ریاض ۔ نواب سید جعفر مرزا خان عرف منّے صاحب لکھنوی سنہ ۱۹۱۱ء تک زندہ تھے اِس سے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا، محشر لکھتے ہیں کہ اچھا کہنے والوں میں تھے باوجود تلاش زیادہ کلام دستیاب نہو سکا ۔

بولی بیتابیٔ دل وہ جو اُٹھے پہلو سے
کیا کروں ہجر میں اتنا تو بتاتے جاؤ
اپنے وحشی کو مری جان دکھا دو گیسو
اور دیوانہ کو دیوانہ بناتے جاؤ
وقتِ رخصت کے ستمگر نے یہ ٹھانی جی میں
دلِ بیتاب کو کچھ اور جتاتے جاؤ

خوب آئے میکشوں کی صحبت میں شیخ صاحب
بیشک یہ باتیں زیبا حضرت کی شان پر ہیں
اظہار کر رہا ہے اُڑ اُڑ کے رنگ رخ کا
دردِ جگر کے صدمے جو جو کہ جان پر ہیں

تربت مٹی ہوئی کیوں ڈھنڈوائی جا رہی ہو	وہ مہربان یارب کس بے نشان پر ہیں

ریاض

ریاض منشی محمد یعقوب صاحب ریاض سب جسٹرار ویراؤتی مدراس شاگرد شوکت میرٹھی سنہ ۹ کے قریب رسالہ "پروانہ" میں انکا کلام شائع ہوا کرتا تھا، تعجب ہے کہ صوبہ مدراس جیسے دور افتادہ مقام میں انھیں اردو میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا، اکثر اخلاقی مضامین نظم کرتے ہیں، زبان اور بندش بھی بُری نہیں ؎

شاخِ گل پر کرتی ہے بلبل بیاں توحید کا	شیخ ممبر پر پڑھے جس طرح خطبہ عید کا
گوشۂ دل میں نہاں ہو جلوہ تیرا جانجان	بوالہوس دل منتظر پھرتا ہی پھر بھی دید کا
پھرتے ہیں جسکو ڈھونڈتے دیر و حرم میں ہم	کیا وہ ہمارے کعبۂ دل میں مکیں نہیں
بہار آئی چمن میں پھر ہوا جوشِ جنوں سر میں	مزا ہے نشترِ فصاد کا خارِ گلِ تر میں
لکھے جو کاتبِ تقدیر انسان کے مقدر میں	وہی پیش آئے ہر پھر کر اُسے دنیا کے چکر میں
نیچر کے سارے کام تصور سے دور ہیں	فہم و خرد کو اس میں خیال و چنین ہو
حق کے کوچے میں غنی کا ہو بھلا کیونکر گذر	اِس سفر میں بے سر و ساماں گدا ہی چاہیئے
قضا جب آئی لیکر ہاتھ میں فرمان رحلت کا	تو جام آبِ حیواں ساغرِ زہر ہلاہل ہے

ریاض

ریاض منشی ریاض الدین احمد صاحب ریاض دہلوی، کلام رسالہ "زبان" جلد ۹ سے نقل ہوا، تو مشق کہنے والوں میں ہیں ـ اشعار ملاحظہ ہوں ـ

بہاتے ہیں جو آنسو نعش پر وہ دیدۂ تر سے	ہمارا غسلِ میت ہو رہا ہے آبِ گوہر سے
مزہ ہو گر وہ بگڑیں آسمانِ فتنہ پرور سے	تماشا ہو چلیں چوٹیں ستمگر کی ستمگر سے
جوانی میں غضب کے ہو گئے ہو چلبلے چنچل	بپا ہوتا ہے محشر ابتو کافر تیری ٹھوکر سے
ہنسی بھی دل لگی تھی کھیل تھا کیا اے دلِ ناداں	ہدف ہو ہو کے بچ جاتا نگاہِ شوخِ دلبر سے
اگر دشمن سے ملنا ہے تو پھر مجھسے بھی مل ظالم	یہ کون انصاف ہے قاتل کوئی خوش ہو کوئی تر سے
ریاض اس چرخ نے عشاق کو کب چین سے رکھا	نہ بر آئی کسی کی آرزو اس کینہ پرور سے

ریاض

ریاض۔ مولوی ریاض الدین احمد ریاض عدالتِ منصفی متھرا میں وکالت کرتے ہیں شعر میں مضمون پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ معلوم نہ ہوا کہ تلمذ کس سے ہے کلام درج ذیل ہے۔

وجہ کیا کیوں نہ تحیر ہو ہمیں دنیا میں
آئینہ خانے میں جو آئے وہ حیراں بھی نہ ہو

کیا کروں حضرتِ عیسیٰ تپ فرقت کا بیاں
وہ مرض ہے کہ حضور آپ سے درماں بھی نہ ہو

ایک آفت ہو تو کہیئے اے ریاض
دل ہمارا موردِ آفات ہے

بیدہانی حق نے جو دی ہے تمہیں
لے بتو اس میں بھی کوئی بات ہے

دیر و حرم میں ایک سا جلوہ ہے زاہدو
حق بیں اگر ہو آنکھ تو پہچان چاہیئے

میں سمجھوں شہسوار اُسکو جو روکے
عناں اس توسن عمر رواں کی

جو برسات میں اُنکی یاد آگئی
تو گھنگھور غم کی گھٹا چھا گئی

غیروں کے گھر نہ راتوں کو ریحان جایئے
کہنا مرا خدا کے لیئے مان جایئے

ریحان

ریحان۔ ماہر رموز سخن شاعر شیریں زبان دیوان دیا کرشن ریحان لکھنوی، خلف منشی گنگا کشن عزیز راجہ صاحب رام، قوم کے سری باستب کا یستھ اور شاہ آباد کے متوطن تھے مگر عرصہ سے لکھنؤ میں اقامت گزیں تھے، منشی موجی رام موجی سے جو حضرت مصحفی کے نامور تلامذہ میں تھے اس فن میں استفادہ کیا تھا اور پھر منشی جواہر سنگھ جوہر سے بھی مشورہ رہا، عاشقانہ شعر خوب کہتے تھے، بڑے شیریں کلام، نازک خیال معنی آفریں سخنور تھے انکا دیوان مسمّیٰ بہ "باغ ریحان" چھپ گیا ہے، سلطان عالم واجد علیشاہ کے عہد میں بخشی الممالک راجہ اُلفت رائے کے رشتہ دار رہے، بعد انتزاع سلطنت پنڈت شیو دین وکیل کے ملازم رہے، بڑے نازک مزاج، وضعدار، خوش تقریر شخص تھے، استعدادِ علمی بہت معقول تھی، خاندانی شخص تھے، مگر تباہی سلطنت کے بعد آسودگی اور فراغبالی نصیب نہ ہوئی، ہمیشہ بادشاہ کی استرداد سلطنت کے لیئے دست بدعا رہے، سرد و گرم زمانے سے بخوبی آگاہ تھے، بڑے بڑے باکمالوں اور مشہور استادوں کی صحبت پائی تھی، اور فن شعر کے رموز

وو قائق پر پوری طرح عبور رکھتا، طبیعت عاشقانہ پائی تھی معاملہ بندی کا مذاق بہت اچھا تھا، کلام بہت پاکیزہ صاف اور اکثر اشعار اخلاقی مضامین سے مملو ہیں، تعجب ہے کہ شیخ ناسخ کی خشک بیانی اور بے تاثیر رنگ سے جو لکھنو کی آب و گل میں اُس زمانہ میں سرایت کرچکا تھا، کس طرح انھوں نے اپنے آپ کو بچایا، کلام میں آورد بہت کم اور بول چال صاف و شستہ ہے، اکثر غزلیں انکی زندگی ہی میں رائج ہوگئی تھیں اور عام و خاص میں اچھی شہرت حاصل کرلی تھی، انکا دیوان قابل دید ہے اور اس میں ہر مذاق کے شائق کی تفریح اور دلبستگی کا کافی مصالحہ موجود ہے، اکثر غزلوں سے انکی قادر الکلامی اور مشاقی فن کا ثبوت ملتا ہے، اپنے وقت کے مشاہیر شعرا میں انکا شمار تھا اور فی الواقع یہ اسکے اہل تھے، ۱۸۵۵ء کے قریب پیرانہ سالی میں انتقال کیا۔

پہلے خیالِ زلف ہو پھر شغل آہ کا
تہمت ہے تیغ تیز پہ خنجر پہ اتہام

لام والف ہے تاج سرِ لا آلہ کا
قاتل ہیں کشتہ ہوں تری ترچھی نگاہ کا

کسقدر فضل اے خداوند جہاں پرور کیا
روزِ پیدایش سے مجکو رزق بے منت دیا
بے خیالِ بندگی بابِ عنایت کھل گیا

تو نے مجھ گمنام کو دنیا میں نام آور کیا
اپنی خواہش سے زیادہ ہی نے صرف زر کیا
رنج میں ہیں نے رجوع قلب جب دم بھر کیا

دم آخر بھی جہاں سے خدا نے سرخرو رکھا
ملے ملکِ اودھ واجد علی سلطاں کو دی ریحان
قناعت نے ہمیں گنج فراغت جب سے دکھلایا

مرے خوں سے ہوا پاں خوردہ لب قاتل کے خنجر کا
خدا چمکائے پھر اک دن ستارہ میرے اختر کا
نہ شادی کی رہی شادی نہ غم دل میں رہا غم کا

خدا کے ہاتھ ہے انصاف ای بت بیرحم
ہمیشہ رہتے ہیں چالاک آفتوں سے بری

ہمارے صبر کا اور تیرے دل کے کھانے کا
سمند چرخ کو کب طور ہے تازیانے کا

عقدہ کھلتا ہی نہیں تقدیر کا
نوکِ مژگاں کی خطا اس میں نہیں

گھس گیا ناخن مری تدبیر کا
خود بنا عاشق نشانہ تیر کا

جب دیا حور نے مجھ رند کو جام کوثر
کچھ دام کا قصور نہ دانے کی ہے خطا

رشک زاہد کو ہوا میری گنہگاری کا
صیاد تیرے گھر میں مرا آب و دانہ تھا

نگاہِ غور سے ہمنے تماشائے جہاں دیکھا
نہیں معلوم کیسے وقتِ بد میں باغ سے نکلے
قسمت سے زیادہ کبھی حاصل نہیں ہوتا
اے سرو کر نہ یار کے قامت کا سامنا

کسیکو بھی نہ اپنا یار وقتِ امتحاں دیکھا
کہ جیتے جی نہ پھر بلبل نے رخ آشیاں دیکھا
جو صابر و شاکر ہے وہ سائل نہیں ہوتا
قامت کا سامنا ہے قیامت کا سامنا

نہ کچھ جینے کی راحت ہے نہ کچھ مرنیکا ہے کھٹکا
علاقہ اٹھ گیا دونوں سے جب سے دل کہیں اٹکا

بے صنم جی سے گذرنا ہی بھلا
ظلم عاشق پہ بے سبب دیکھا
ناحق سوال ہے کسی ناکس کے سامنے

ایسے جینے سے تو مرنا ہی بھلا
نہ سنا تھا کبھی جواب دیکھا
رزق بھی دیگا جسنے ہے منہ دیا ہے گدو دیا

شیخ جی تکتے ہیں ہم بھی پر
فرہاد تیری ہمت عالی کو آفریں
کھلجائیگا کبھی مرتبے دونوں کا لطف

کہو کعبہ میں تمنے کیا دیکھا
جی کھو کے عاشقی کا تماشا دکھا دیا
حسن لیجیو چراغ جہنم بجھا دیا

الفت پہ جسکی ناز تھا وہ بیوفا ہوا
کیا اپنے دلمیں سمجھے تھے ہم ہائے کیا ہوا

موجی سے مجکو کیوں نہ ہو ریحاں خصوصیت
میں اسکی روح ہوں جو وہ ہے مصحفی کی روح

جائے جو چاہے سوئے دیر و حرم
رشکِ جم ہیں دہر میں روشن ضمیر

ہم تو بیٹھے ہیں درِ دلدار پر
ناز دل پر انکو اسکو جام پر

مریضِ عشق مرجائے کہیں ہو زندگی اسکی
کعبۂ روئے صنم کی دید سے کافر ہوئے
کھلجائیگا منھ انکا کیا کھیلا جو کوئی جی پر
کب رشک چاہتا تھا ہو نامہ بر کبوتر
کھل پڑی زلفِ مسلسل جو تری شانوں پر
کیا عجب جبہ و دستار جو ہوں رہنِ شراب
دیکھ کر اسکو کسیکا نہیں رہتا ایماں

شفا کو مانگتا ہے کون خواہانِ شفا ہو کر
رکھدیا ایمان طاقِ ابروئے خمدار پر
واجب ہے رحم کرنا عاشق کی بیکسی پر
عاشق ہی آڑ کے جاتا رکھتا جو پر پیچ کے
کیا بلا آئی خدا جانے پریشانوں پر
شیخ جی چڑھ گئے رندوں کے اگر قابو پر
ہے مسلمان پہ موقوف نہ کچھ ہندو پر

[illegible]

خوش آئی کسے سیرِ چمن بے رخِ رنگیں
ہے گرم نسیمِ سحری لو کی برابر

دیکھیں تو وہ موزوں ہے کہ بوٹا سا یہ قامت
ہو جاؤ کھڑے سروِ گلستاں کی برابر

رہیں پوشیدہ ریحاں بات جو منصور پر گذری
نکالے حرف منہ سے کوئی کیونکر رازداں ہو کر

خواب میں بھی نہ کبھی ہجر کی شب دیکھی تھی
یہ بلا سر پہ مرے ہو گئی نازل کیونکر

چاہیئے اسکے لئے ذہن رسائے ریحاں
گفتگو عشق کی سمجھے کوئی جاہل کیونکر

محبت میں تمیز اختلافِ دیں نہیں باقی
مسلماں دیتے ہیں ہندو پہ جاں ہندو مسلماں پر

حسیں پر دل نہ ہو مائل کسیکا ہم نجانینگے
کوئی گنگا اٹھائے خواہ رکھے ہاتھ قرآں پر

زباں اُردو کی غالب آگئی بھیجے پہ فارس کے
چڑھائی کرتے ہیں ہندوستانی ملکِ ایراں پر

دشمن کسیکا ہو سکے کوئی کیا بنائیگا
انساں کا اختیار نہیں اپنی جان پر

پھیر رُخ الفت کی طرف اے دلِ ناشاد مگر
آبرو جتنی ہے باقی اُسے برباد نکر

کیا کہوں بھول گیا ورنہ خدا سے کہتا
مجکو دیوانہ نکر اُسکو پریزاد نکر

کہیگا کیا زمانہ اُسکے شکوہ ظلم کا ریحاں
بھلا کہتے تھے جنکو اب کہیں اُنکو بُرا کیونکر

خاک میں تمنے ملایا دل جلا عمر بھر
شمع کو تربت پہ میری اب جلانا کیا ضرور

دی ہمنے اپنی جان خطِ سبز یار پر
اُگتا ہے بعد مرگ کے سبزہ مزار پر

رند و زاہد کی لڑائی کو نجانے کم کوئی
خون کی ندی بہے گی خلد میں کوثر کے پاس

رکھتا نہیں دنیا میں وہ آرام کی خواہش
جس شخص کو ہوتی ہے فقط نام کی خواہش

سخت مشکل ہوئی جسدم قفسِ تن چھوٹا
طائرِ جاں کو ہوئی وقتِ رہائی تکلیف

زلفوں میں دل رہیگا گرفتار کب تلک
چھوٹے گا قید سے یہ گنہگار کب تلک

مصروفِ عیش یار ہے گھر میں سنیگا کون
نالے کریگا دل پسِ دیوار کب تلک

رندوں کی بزم میں وہ اگر روز آئے گا
ریحاں بچے گی شیخ کی دستار کب تلک

نہ آج کھولا تو کل کھلیگا رہیگا منہ پر نقاب کب تک
جو پاس رہتا ہے ہر گھڑی کا تو اُٹھ سکیگا حجاب کب تک

قسم نہیں عمر بھر کی کھائی کہ ہو نہ آپس میں پھر صفائی
نگاہ ترچھی رہیگی کبتک لڑائی کبتک عتاب کبتک

اور جینے کی آرزو کیا ہو؟
کیا نبایا اگر جیے اب تک

کیا پاس دوستی جو رہا جانِ زار تک
تم فاتحہ بھی پڑھنے نہ آئے مزار تک

اتنا غبار سادہ دلوں سے بچا رہیے
کیوں اے نسیم آئی نہ مجھ خاکسار تک

صبحِ فراق کیوں نکروں انتظارِ مرگ
تھا زندگی کا لطف شبِ وصلِ یار تک

بشر کی صورت و سیرت کا دیکھنے والا
نظر پڑا ہمیں لاکھوں میں کوئی انساں ایک

گراں تھا چترکا بھی جن کو سایہ
ہے اُنکے سر پہ اب بے انتہا خاک

نچھوٹے مرکے بھی آوارگی سے
پریشاں پھرتی ہے اب جا بجا خاک

اگر ہے ایک خوش قسمت سے اپنی
حسد سے جلتے ہو کیوں دوسرا خاک

اہلِ دنیا کی مروت کا بھروسا تاکب
جز خدا کوئی بھی ہوتا نہیں ہر بار شریک

فرق ایمان میں ہے صورتِ انساں میں نہیں
بات سچ کہیے تو ہوتے ہیں ابھی برہم لوگ

خنجر کا نہ پیکان کا نہ تلوار کا گھائل
ہے عاشقِ شیدا نگہ یار کا گھائل

مرے بس میں کبھی اے دلربا اپنا نہ آیا دل
وہ کیسے ہیں جو کر لیتے ہیں قابو میں پرایا دل

خضر پیتا کبھی نہ آبِ بقا
ہوتی گر لذتِ فنا معلوم

دل کے آئینہ کی جلا مشکل
جب غبار آگیا صفا معلوم

سچ ہے کہ نردبان حقیقت مجاز ہے
ملتا نہیں خدا جو نہوں راہ پر صنم

بتخانے میں کبھی کبھی بیت الحرام میں
پھرتے ہیں ڈھونڈنے تجھے ہم دربدر صنم

زندگی کس طرح اے ریحان کٹے
عاشقی سے جی کو بہلاتے ہیں ہم

آتشیں رو کا تصور ہے دلِ بیتاب میں
ہے چمک برقِ تجلی کی چہ سیماب میں

یوسف کو دیکھا دیدۂ بیدار نے تو کیا
ہے جسکی چاہ وہ نظر آیا نہ خواب میں

عاشقی کا نتری کچھ لطفِ دلِ زار نہیں
یار اغیار کا ہے یار ترا یار نہیں

صدائے صور سے کمتر نہیں کچھ وہ کے نالے ہیں
تب ہی تک خیر ہے جبتک طبیعت کو سنبھالے ہیں

عاشق شب وصال ہیں گھبرائے جاتے ہیں
پچھلے سے جانِ مرغِ سحر کھائے جاتے ہیں

لائینگے آفتاب کو وہ اپنے جال میں
زلفوں کے بال موپیں سکھلائے جاتے ہیں

تمکو قسم خدا کی خدا کے رسول کی
ہمسے چھپا کے خط کسے بھجوائے جاتے ہیں

آنکھوں پہ اختیار ہے اچھا نہ روؤں گا
کچھ آپ میرے دلکو بھی سمجھائے جاتے ہیں

ریحان مجھیں خدا کی قسم سچ بیاں کرو
کس گلبدن کیواسطے گل کھائے جاتے ہیں

عاشقی کا تری کچھ لطف دلِ زار نہیں
یار اغیار کا ہے یار ترا یار نہیں

جو ہوا اُس سے ستم اپنے مقدر سے ہوا
شکوہ تقدیر سے ہی یار سے زنہار نہیں

تیرے لب کو نبات کہتے ہیں
ہم بھی کیا میٹھی بات کہتے ہیں

خواہ ثابت ہوں خواہ سیّارے
سبکو ہم بے ثبات کہتے ہیں

یہی اُسکی سزا ہے جو ہوا آوارہ اُلفت کا
صدائے روحِ مجنوں آجتک ہے یہ بیاباں میں

خبر دی آہ نے کیا یوسفِ گم گشتۂ دل کی
نسیمِ مصر بوئے پیرہن لے آئی کنعاں میں

میسّر وصل رشکِ گل نہ آیا جیتے جی ہمکو
گلِ حرماں لئے جاتے ہیں اس گلشن سے داماں میں

خوش ہوں بلبل کہ بہار آئی ہے پھر گلشن میں
پھول چن چن کے حسینوں نے بھرے دامن میں

جن میں فن دلبری کے ہوتے ہیں
آشنا کب کسی کے ہوتے ہیں

بد بھی کرتا ہے نیکی اپنے ساتھ
جبکہ دن بہتری کے ہوتے ہیں

مُنہ کفن میں جو چھپائے ہوئے ہم چلتے ہیں
ملکِ ہستی سے خجل سوئے عدم جاتے ہیں

کوچۂ یار سے کب میں اُٹھا ہوں
توڑ کے اپنا پاؤں بیٹھا ہوں

بیمارِ عشق دونوں ہیں تدبیر کیا کریں
میں چشم کا علاج کہ دلکی دوا کروں

اے چشمِ پرنم اے دلِ پرزخم کیا کروں
رویا کروں کہ حال پہ اپنے ہنسا کروں

یہ بھی اُسی کی اے بتِ بیرحم شان ہے
بندہ خدا کا ہو کے میں سجدہ ترا کروں

حق دوستی کا کس پہ ہے اور دوست کون ہے	کہہ منصفی سے تو ہی میں کس کا گلا کروں
سوال کرتے نہیں گو زبان رکھتے ہیں	گریہ اے عشق بھی کیا آن و بان رکھتے ہیں
کسی کے حسد سے نہیں اپنا نقصان	بھلا اُنکا ہو جو بُرا چاہتے ہیں
زباں سے عشق کرنے میں سخن بہتر نکلتے ہیں	جو ہو صیقل زیادہ تیغ سے کے جوہر نکلتے ہیں
مصر سے کنعاں میں بوئے پیرہن آئی نہیں	مدتوں سے اپنے یوسف کی خبر آئی نہیں
مجکو کہتے ہو برا کوئی بھلا کہتا نہیں	تم ہی رسوا ہوتے ہو میری ہی رسوائی نہیں
بچ گئی جانِ حزیں اب کے خدا نے خیر کی	دل پھر اپنا دوں تمھیں ایسا میں سودائی نہیں
نہیں کوئی احسان کو مانتا	مروت کے قابل زمانا نہیں
سنا ہمنے کانوں سے عنقا کا نام	وفادار آنکھوں سے دیکھا نہیں
دوستی اُسنے نبھے یا نہ نبھے	دب کے رہنا ہمیں منظور نہیں
کیا مرض ہے دردِ دل جسکی دوا ہوتی نہیں	جب تلک مرتا نہیں کوئی شفا ہوتی نہیں
تو نے اے عشق جان کو ڈالا	کس اذیت میں کس مصیبت میں
یار سے جب فریب یار کریں	کہیے پھر کس کا اعتبار کریں
کسنے وعدہ کیا ہے سچ بولو	کرتے ہو اضطراب کی باتیں
دوستی میں نفاق کی باتیں	یہ بھی ہیں اتفاق کی باتیں
صحبت کا لطف ای دل آپس میں تب عیاں ہو	معشوق قدرداں ہو عاشق فراجداں ہو
دیکھیں رقیب سے ہو یا ہمسے جاں نثاری	تیغِ ستم کا تیری دونوں پہ امتحاں ہو
اب بھی ہمسے غبار باقی ہے	قبر کو پائمال کرتے ہو
کہیے کس طرح سے بہلے گی طبیعت میری	آپ بھی جاتے ہو دل کو بھی لیے جاتے ہو
کدورت ناروا ہے دوستی جبتک رہے قائم	غبار رکھئے تو جیتے جی صفائی کا نہ ساماں ہو
دلِ پُر درد کیا سمجھے ہجوم صدمۂ غم کو	ضرر کچھ سنگِ باراں سے نہیں ہے نخلِ ماتم کو

نہیں قابل سماعت کے یہ بھڑکانا رقیبوں کو
یہ ناحق گرم کرتے ہیں ادھر ہم کو ادھر تم کو

نہیں اک بوسۂ لب دین و دنیا سے زیادہ ہے
اگر تم مول لو ہم بیچتے ہیں دونوں عالم کو

بنایا دل کو محرابیں بنا کر کعبہ اے زاہد
خدا رکھے سلامت عاشقوں کے ناخنِ غم کو

جال میں تو پھانسنے آیا ہے مجھ دلگیر کو
کیا سنوں ناصح تری الجھی ہوئی تقریر کو

ہے نگاہِ ناز بے پروا ادا و ناز سے
کیا پر و پیکاں کی حاجت ہے قضا کے تیر کو

ہر طرح کے کام میں تائیدِ خالق چاہیئے
ہم مقدم سمجھتے ہیں تدبیر پر تقدیر کو

نہ لکھا کاتبِ قدرت نے تیرے صفحۂ دل پر
محبت کو، وفا کو، مہر کو، الفت کو، احساں کو

بھلایا اس بتِ بد عہد نے کیا دفعتاً دل سے
قسم کو، قول کو، اقرار کو، وعدے کو، پیماں کو

محبت کا نتیجہ لے دل و جاں دیکھتے جاؤ
زیاں پر اک زیاں نقصاں پہ نقصاں دیکھتے جاؤ

ہجوم درد و رنج و یاس و حرماں دیکھتے جاؤ
ہماری لاش کے اٹھنے کا ساماں دیکھتے جاؤ

بغل میں ہے بتِ پندار نفرت بت پرستی سے
بڑا دیندار ہے زاہد کا ایماں دیکھتے جاؤ

شہرۂ آفاق ہیں رنگیں بیاں اس شہر کے
بلبلِ شیراز کرتا ہے ثنائے لکھنؤ

مجنوں کے آبِ اشک سے تر ہے تمام دشت
پھسلے نہ پاؤں ناقہ کا اے ساربان دیکھ

بوسے اسی طرح سے دیئے جایئے اگر
واللہ ناگوار نہ ہوں گالیاں مجھے

جو بات آدمی نہ سنے کیوں سنایئے
ناصح نہیں پسند تیری داستاں مجھے

اب کہتے ہیں جواں مجھے طفلانِ خورد سال
تھوڑے دنوں میں پیر کہینگے جوان مجھے

اتنی کڑی تو ضعف میں جھیلی نہ جائیگی
ہوں ناتواں پہناتے ہو کیوں بیڑیاں مجھے

کہتا ہے یار میری طرف دیکھ دیکھ کے
اوروں کو ہے معاف نہ دیکھے فلاں مجھے

دلِ رنجیدہ کہتا ہے نہ بولوں یار سے لیکن
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروت آہی جاتی ہے

چھپائے سے نہیں چھپتا ہے ریحاں نشۂ الفت
ضرور آنکھوں میں کچھ اس مے کی رنگت آہی جاتی ہے

اب کہاں ساقی کہاں شیشہ کہاں پیمانہ ہے
ہجر میں کیفیتِ وصلِ صنم افسانہ ہے

بڑی تکلیف تیرے ہجر میں او بے وفا پائی
خدا شاہد ہے ہمنے دل لگا کی سزا پائی

ہم آزادوں کے دلکو شوقِ آسایش پسند ہی ہے
وہیں کچھ دیر ٹھیرے جس جگہ ٹھنڈی ہوا پائی

بے وصالِ جانِ جاں آرام دل دشوار ہے
جان کو راحت نہیں تو زندگی بیکار ہے

زیادہ اِس سے بھی کیا شر کرے خدا جانے
اگر بشر کہیں جینے کی انتہا جانے

جو میرے دل پہ گذرتی ہے غیر کیا جانے
خبر ہے یا کہ نہیں یار کو خدا جانے

ہیں کس خیال میں کس دُھن میں ہیں خدا جانے
کوئی کسی کی طبیعت کا حال کیا جانے

جان آگئی ہے آمدِ فصلِ بہار سے
سوکھے ہوئے درخت دوبارہ ہرے ہوئے

کوئی دل اپنا دیتا ہے، کوئی ایمان دیتا ہے
تمھارے واسطے ہر ایک اپنی جان دیتا ہے

اے بے خبر حیات کا کیا اعتبار ہے
ہر وقت موت سر پہ بشر کے سوار ہے

کی وفا ہر چند ترک اُسنے جفا کاری نہ کی
دشمنی کی جسقدر خونریز نے یاری نہ کی

اے صنم جو کچھ گذرتی ہے خدا آگاہ ہے
یہ نہ کہیے لیجے دل ہمنے دل آزاری نہ کی

واہ رے شرطِ محبت واہ رے رسمِ کرم
ہمنے دل تمکو دیا اور تم نے دلداری نہ کی

دل کسیکو دیجئے کیا عشق سے دل بھر گیا
جس سے کی ہمنے وفا اُسنے وفاداری نہ کی

گھبرایئے نہ حضرتِ دل طعنِ خلق سے
وہ کیجئے جو جی میں ہو سنیئے ہزار کی

محمود اُسکے پھندے سے نکلا نہ عمر بھر
دامِ بلا تھی زلف نہیں تھی ایاز کی

پیامِ وصلِ دلبر لیکے جب قاصد پھرا میرا
پلٹ کر لب پہ پھر سینہ میں جانِ بیقرار آئی

دونوں عالم کو نہ لوں ایسا غنی دل ہو جائے
بے نیازی تری رحمت سے جو حاصل ہو جائے

جو مہلت قضائے الٰہی کرے گی
تمام آپ کی کم نگاہی کرے گی

دغا ہے محبت کا انجام اے دل
بھلائی میں بھی یہ بُرائی کرے گی

علاجِ تپِ عشق کیا جانے عیسیٰ
دوا اِس مرض کی قضا ہی کرے گی

محبت مجھے سبز فاموں کی ریحاں
نہ معلوم تھا زنگ کا ہی کرے گی

خرد کہتی ہے کیا ناقدرداں سے ملکے پاؤگے	محبت کہتی ہے دیکھوں ہیں تم کیونکر بچاؤگے
بریں کعبہ دل ٹوٹے نہ ہوگا صاف بندے کا	قسم اللہ کی مسجد میں بھی چلیے جو کھاؤگے
اک جان پہ ہزار طرح کی کڑی سہی	کھوڑلیسی زندگی میں مصیبت بڑی سہی
عشق جی کا وبال رہتا ہے	زندگی بھر ملال رہتا ہے
ہاں کے دستیاب ہونے پر	کسکو خوفِ مآل رہتا ہے

ریحانی

ریحانی منشی محمد سجاد حسین مرحوم خلف منشی سید احمد حسن فرقانی متخلص بہ شاکی باکی مرحوم رئیس میرٹھ مالک و مہتمم اخبار طوطی ہند اپنے والد مرحوم کے جو بڑے ذی لیاقت شاعر تھے شاگرد تھے ۱۲۶۸ھ سال پیدائش تھا ۱۳۰۰ھ میں انتقال کیا، بڑے جید فاضل و زودی ستعداد سخنور تھے، انکے بھائی منشی کرار حسین روحانی سے بارہا کلام طلب کیا مگر باوجود اقرار وں کے ہنگام طبع تک ترسیل کی فرصت نہوئی مجبوراً ایک غزل جو مسودہ میں پہلے سے موجود تھی درج کی گئی

اُلجھی زلفیں میرے ماتم میں پریشاں ہوگئیں	مشکلیں جو جو پڑی تھیں مجھپہ آساں ہوگئیں
سب اُمیدیں جو رسائی کی تھیں زائل ہوگئیں	میرے آہیں جب سے زیبِ طاقِ نسیاں ہوگئیں
زور پر تھا بحرِ گریہ پر یہ اچھا ہوگیا	دونوں آنکھیں میری کشتیہائے طوفاں ہوگئیں
دعویٔ حسنِ خود آرائی زلیخا مٹ گیا	کیوں زنانِ مصر محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں
آرزوئیں کچھ نہیں جن کا لقب ہے کامیاب	مشکلیں کیا خاک ہونگی وہ کہ آساں ہوگئیں

ردیف زائے منقوطہ

زار — **زار** منشی برہان الدین خان زار شاہجہان آبادی شاعر دربار اکبر شاہ ثانی فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، خط شکستہ لکھنے میں کمال حاصل تھا پہلے اکبر شاہ کے خواصوں کے زمرہ میں منسلک تھے پھر شعرا میں داخل ہو گئے۔

کیونکہ اس بُت کو یہ حالِ دلِ بدنام لکھوں — کب وہ دیکھے ہے خدا کا بھی اگر نام لکھوں

چشم طوفاں خیز بھی اب گریہ پر تیار ہے — جسکے آگے اے سیہ رو ابر تو بیکار ہے

چرخ کے کیسے انقلاب ہوئے — پر کبھی ہم نہ کامیاب ہوئے

زار — **زار** لالہ بینڈو لال زار بلگرامی خلف لالہ چندی لال شاگرد منشی طوطا رام عاصی، شاعر نامور ہندی فارسی میں صاحب دیوان تھے اور اسکے شاگرد بھی بہت تھے، انکی انشاء موسوم بہ گلزار فصاحت درسی کتب میں تھی، غازی الدین حیدر کے زمانے میں زندہ موجود تھے۔

گھر سے اُسے نکالا خدا کا بھی ڈر نہ تھا — دل قصہ خوانِ عشق تھا قضیہ کا گھر نہ تھا

باندھے وہ آج ہی نہیں پھرتا ہی نیمچہ — کس دن ہمارے قتل پہ باندھے کمر نہ تھا

تھا شوق نذر کرتا تمھاری وہ نقد جان — گر تم بلاتے زار کو گھر میں ضرر نہ تھا

جبدم دھواں اُٹھا دلِ پر اضطراب کا — گُل ہو گیا فلک پہ چراغ آفتاب کا

کون کرتا میکشوں کی گور پر روشن چراغ — ہمکو چشمِ غول ہے گویا سرِ مدفن چراغ

کام کیا ہے شمع کافوری سے اور فانوس سے — گور ہے فانوس داغِ دل ہیں یاں روشن چراغ

یار کے آنے میں کیا ہے شمع کافوری ضرور — ہو گئے اُسکے نور سے دیوار و در روشن چراغ

اشک گر جاری نہوں سوزاں ہو گیا سینہ کا داغ — عمر بھر جلتے نہیں دیکھا ہے بے روغن چراغ

جان سے گذرے جو عاشق غم نہو معشوق کو — موت پر پروانے کی کرتا نہیں شیون چراغ

اُسنے زلفیں کھولدیں یاں داغ غم کم ہو گیا — زار سچ ہے سانپ کے آگے نہو روشن چراغ

یہ آتشِ غم یار کی محفل سے لگی ہے — اے شمع ترے سر سے مرے دل سے لگی ہے

آنکھ اپنی بتِ حور شمائل سے لگی ہے — جنت میں لگے جنت کی ہوا دل سے لگی ہے

لیلی رگِ جاں قیس کی کھنچ آتی ہے شاید — دوری یہ نہیں پردۂ محمل سے لگی ہے

تلواریں بناتا ہے مری خاک کے بارے — مٹی لوہے کا نے کفِ قاتل سے لگی ہے

آویں گے مرے پاس پئے قتل وہ کیونکر — مہندی بھی تو نہیں پائے بتِ قاتل سے لگی ہے

زار

زار۔ لالہ دھنپت رائے زار خلفِ لالہ شنکر لال بہادر ناظر اور راجہ کندن لال رئیس بریلی مقیم لکھنؤ، خواجہ وزیر لکھنوی کے تلامذہ میں بڑے استعداد اور جوہرِ قابل تھے، فارسی زبان کے زبردست ماہر تھے، اردو کی طرف بہت کم توجہ تھی فارسی میں صاحبِ تصانیف بھی تھے الغرض ذی لیاقت، ذی مروت شخص تھے، غدر کے بعد انتقال کیا۔

میری طرح کسی پہ تمھارا جو آئے دل — سینہ پہ ہاتھ رکھ کے کہو ہائے ہائے دل

کیونکر تمھارے روئے مصفا تک آئے دل — اس درجہ ہے صفا کہ پھسلتا ہی جائے دل

داغوں پہ داغ صدموں پہ صدمے اٹھا چکے — دیکھیں ابھی یہ اور نہ کیا کیا دکھائے دل

میں گرمیاں کروں جو پھریں آپ آ دو سر — کیا خوش ہوں گر کسی پہ تمھارا بھی آئے دل

صبحِ عذار و گیسوئے شبگوں دکھا دیے — صدمے یہ رات دن کے کہاں تک اٹھائے دل

زار

زار۔ حافظ امام بخش لکھنوی بیاضِ مرتبہ قاضی محمد خلیل سے ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔

آشنا ہوتی ہے اس لب سے جو دشنام تو ہم — دل میں کہتے ہیں کہ دشنام ہمیں کیوں نہ ہوئے

زار

زار۔ مرزا مظفر علی سرکار محمد علیخان شوکت جنگ میں ملازم تھے، غدر سے کم و بیش پچیس ۲۵ سال پیشتر انتقال کیا، کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے یہ انکا کلام ہے شرف الدین احمد نے انکا نام مظہر علی لکھا ہے

فصلِ گل کا کچھ ہوئی آمد کہ اس دل کے تئیں — شور و غل طفلوں کا اور دشتِ جنوں بھانے لگا

ایک تجھکو زار کے احوال پر آیا نہ رحم — ورنہ ہر اک حال اس کا دیکھ غم کھانے لگا

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں — خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

ایک دن آگے ہی دنیا سے اُٹھانا ہمکو
یا الٰہی شبِ فرقت نہ دکھانا ہمکو

اب رہائی لے کیا اور پریشاں مجکو
خوب تھا اِس سے وہی گوشۂ زندان مجکو

اگر کچھ بس بھی ہوا اپنا تو کاہیکو یہ خواری ہو
نچا ہیں اُسکو لے ناصح جو اُلفت اختیاری ہو

زار

زار ۔ منشی احمد حسین زار غدر سے پیشتر دہلی میں موجود تھے ۔ اور کچھ حال معلوم نہ ہوا ۔

تو کرلے امتحاں میری وفا کو
خوشی سے آزما تیغ جفا کو

تجھے کیونکر کوئی ڈھونڈے کہ جس جا
نہ ہو بار اپر مرغ صبا کو

لب جاں بخش کے تیرے مقابل
نہیں کچھ آبرو آب بقا کو

تڑپتا مجکو چھوڑا نیم بسمل
نہ آیا رحم کچھ اُس بیوفا کو

مجھے رکھ قبر میں ای زار وہ شوخ
چلا کہکر تجھے سونپا خدا کو

زار

زار ۔ میر امداد علی زار حیدرآبادی نبیرہ نواب مکرم جنگ بہادر شاگرد میر بادشاہ علی صاحب ضیا لکھنوی

وصل کی رات نیا عیش کا ساماں ہوتا
دلِ پُر داغ مرا سروِ چراغاں ہوتا

کیا غرض تھی جو چڑھا جاتا لحد پر دو پھول
کیوں گذر تیرا سوئے گورِ غریباں ہوتا

نہ دختِ رز کا ہونا محرموں میں زاہد ذکر
تو اِس کا نام بھی جب لے تو با وضو ہوکر

غمِ جدائی دلدار ایک مدت سے
مقیم خانۂ دِل میں ہے آرزو ہوکر

کب نہ بلبل کا دل خزاں سے جلا
کب ہے گل وہ نوحہ گر نہ ہوئی

زار

زار ۔ میر محمد ہادی زار لکھنوی شاگرد عشق مرحوم داماد میر واجد علی داروغہ تعلقدارانکے والد میر عابد علی فوجِ شاہی میں کمیدان تھے ۱۸۶۵ء سالِ پیدایش ہے ✤

بھیڑ اسدرجہ تھی ارمان غم و حسرت کی
پاس میرے ملک الموت کو آنے ندیا

لطف ملتا تھا جو آفاق میں غم کھانے سے
وہ مزا گلشنِ جنت کی غذا نے ندیا

مثلِ شمع سحری کچھ بھی نہ تھا دم بھر یاں
اخترِ بخت جو چمکا بھی تو جگنو ہوکر

۱ گلشنِ ہمیشہ بہار میں یہ شعر میر جیون کشمیری دہلوی شوریدہ کے نام سے درج ہے ۔

دلکی فریاد و فغاں سے ہے قیامت برپا	کب پتہ چلتا ہے پہلو میں جگر ہے کہ نہیں
دم رخصت جو کہا میں نے نشانی کچھ دو	ہنسکے فرمانے لگے درد جگر ہے کہ نہیں
رکھکے تربت میں چلے جاتے ہیں سارے احباب	بیکسی تو ہی ٹھہر پاس کہ تنہا ہوں میں
اُفتادہ تیرے پہنچیں گے کیا قتل گاہ میں	ہر گام پر ہے ضعف قدمبوس راہ میں
سُرمے کے پھیلجانے کی کیا وجہ کیا سبب	برچھا ہمیں لگی کیا تیرے تیز نگاہ میں
باغوں میں تیرے عارض و خط کی بہار ہے	سُرخی جو پھول میں ہے تو سبزی گیاہ میں
دُنیا اُلٹ گئی جو ذرا آنکھ پھیر لی	عالم کے انقلاب ہیں اُنکی نگاہ میں
تہ و بالا زمانے کو کرے گا بیقراری سے	کہاں ہیں عرش کے حامل فرار و کیں مرے دلکو
برپا کیا وہ حشر کہ دُنیا تباہ کی	دل تھام کر جو عاشق مضطر نے آہ کی
قاتل کی ترچھی نظروں سے دل زیر تیغ تھا	برچھی چلی جگر پہ جو سیدھی نگاہ کی
اچھا کیا جو قبر کو روندا لپس فنا	یہ بھی تو آرزو تھی ترے بے گناہ کی

زار - منشی رحم الہیٰ خلف مولوی غلام دستگیر ساکن مارہرہ ضلع ایٹہ ۱۲۶۷؁ ہجری میں پیدا ہوئے معمولی فارسی تعلیم کے بعد الہ آباد وغیرہ میں بسلسلۂ ملازمت گورنمنٹ مقیم رہے ، ذہین اور خوش مزاج آدمی ہیں ، اور نہایت نحیف و زار ہیں ، شوق سخن ابتدائے عمر سے رہا ، اپنا کلام احسن مارہروی کو دکھا لیتے ہیں ؎

وہ باتوں میں ہرگز نہیں آنے والے	اُنھیں کیا سمجھتے ہیں سمجھانیوالے
بھلا ہم کہیں ترک اُلفت کرینگے	نہ بہکائیں اب ہمکو بہکانیوالے
یہی جھوٹی سچی لگاتے ہیں باتیں	ادھر آنیوالے اُدھر جانیوالے

زار - سید حسن عسکری صاحب خلف جناب منشی علی حسن صاحب مرحوم شاگرد جناب شہیر رئیس مچھلی شہر نواح جونپور ۱۸۸۸؁ء میں جوان تھے اور زیادہ حال معلوم نہوا ؎

رہنے کو سر تھا پائے صنم پر وہ رہگیا	جانے کو دم تھا چشم زدن میں نکل گیا

باغ میں آئی ہے بہار افسوس
قید ہے عندلیب زار افسوس

توڑتے ہم کبھی نہ توبہ کو
کیا کریں آ گئی بہار افسوس

خود ہی کرتے ہو ظلم عاشق پر
خود ہی کرتے ہو بار بار افسوس

کیوں دیا بے وفا کو دل صد حیف
کیوں کیا ہے نے اسکو پیار افسوس

ہم رہا بھی ہوئے نہ تھے صیاد
چل بسی باغ سے بہار افسوس

دل ہی جب ہو نہ اپنے قابو میں
کیا کسی پر ہو اختیار افسوس

میرے مرنے سے مسرت دشمنوں کو بھی تو تھی
دوست تھے تم تمکو اس درجہ خوشی کا ہے کو تھی

سر جھکا کر چلتی تھی مقتل میں تیری تیغ کیوں
بسملوں سے اسقدر شرمندگی کا ہے کو تھی

ہر گھڑی ترندگی رفتہ کے ماتم میں رہے
جب سے ہوش آیا ہمیں تب سے اسی غم میں رہے

عمر بھر ان کی پریشانی خاطر نہ گئی
قید ہو کر جو ترے گیسوئے پرخم میں رہے

داغ کا نام جو سنتا ہوں تو یہ کہتا ہوں
یا تو لالے میں رہے یا دلِ پرغم میں رہے

زار

زار - محمد عبدالقادر صاحب خلف اکبر مولٰنا حکیم فیاض علی صاحب مرحوم متوطن عظیم آباد پٹنہ تحصیل علم فارسی و عربی اپنے نانا سید شاہ ابو تراب کے چھوٹے بھائی مولانا حکیم سید شاہ محمد واعظ عظیم آبادی سے کی تھی اکیس سال کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر کسب معاش کی طرف متوجہ ہوئے، وکالت کا امتحان پاس کیا، بارہ برس وکالت کرنے کے بعد ہزارہا روپیہ کی املاک پیدا کر کے دفعۃً آپ کو خیال آخرت پیدا ہوا اور وکالت ترک کردی، جناب حضرت سید شاہ میاں جان رحمۃ اللہ علیہ سے بمقام دہلی بیعت حاصل کی اور وہیں سے حج کعبہ کو چلے گئے، آپ نہایت منکسر، سیر چشم، خوش وضع، خوش تقریر، عالی خاندان شخص تھے، پندرہ جمادی الاول ۱۳۳۵ھ بمقام پٹنہ عالم جاودانی کی طرف راہی ہوئے کلام کا انتخاب درج ذیل ہے

ہے نہ کچھ شیریں کلامی اور نہ ایسا بانمک
ہاں کلام زار محزوں ہے مگر پھیکا نمک

حسن پر پس پس گیا ہے اسکے مثر پا نمک
دست قدرت نے اسے کیا کیا نہیں بخشا نمک

حسن انسانی نہیں انساں کا جز حسنِ خلق
ہے غرور اُس کا تواضع حسنِ ظن اُسکا نمک

ہے کمال ظہور سے مخفی
اس خفا کو ظہور کہتے ہیں
ذکر اللہ کا ہو جب دل میں
اسکو دار السرور کہتے ہیں
میرے کہنے پہ کیوں بگڑتے ہو
کیا غلط ہے جو جور کہتے ہیں
اور کچھ ہم تمھیں کہیں نہ کہیں
بے وفا تو ضرور کہتے ہیں

شوقِ نظارہ میں ٹھیری ہے لبوں تک آکر
جان جاتی بھی نہیں اور وہ آتے بھی نہیں
ہے اُنکے تصور سے مرے دل میں جو تصویر
دل اپنا کہیں اس سے بہلجائے تو جانیں
بلبل یہ کہہ رہی ہے گلوں سے پکار کے
کچھ اب کے سال رنگ نئے ہیں بہار کے
کس رشکِ آفتاب کا اس پر قدم پڑا
ذرے چمک رہے ہیں ہمارے غبار کے

ان دنوں زور نا توانی ہے
میری پیری کی اب جوانی ہے

زار

زار - مولوی احسان الحق زار لکھنوی وظیفہ خوار دولتِ آصفیہ حیدرآباد، حکیم نیاز احمد خان ہوش بریلوی کے تلامذہ میں سے تھے اس سے زیادہ حال معلوم نہیں ۔

بلبلوں سایہ پڑا عکسِ گلِ رخسار کا
رنگ آتا ہے نظر بدلا ہوا گلزار کا

کیا اطبا، دم بخود کیوں ہوں نہ عیسیٰ بھی یہاں
ہو نہ جب ممکن علاج اس عشق کے بیمار کا
گرمیِ بازار یوسف کی کہاں تھی اس قدر
اک جہاں دل دیکے طالب ہے ترے دیدار کا
ڈالے چادر کی جگہ یار جو دامن اپنا
پھیلے یہ چاندنی پُر نور ہو مدفن اپنا
جان دی یادِ رخِ یار میں کیا دور ہے یہ
دے کفن کے لئے خورشید جو دامن اپنا

زار

زار - پنڈت تربھون ناتھ صاحب زار کشمیری دہلوی خلف الرشید پنڈت پربھی ناتھ صاحب زتشی مرحوم ناظم محکمۂ حفظانِ صحت ریاست پٹیالہ، پرورش تعلیم و تربیت لاہور میں پائی اور ایام طالب علمی ہی میں حضرت داغ دہلوی کے تلمذ سے بہرہ ور ہوئے، طرزِ گفتار پر لطف ہے، مضامین خوب الفاظ مرغوب، بندش چست، خوش بیانی میں فرد ہیں ۱۸۷۱ء

سالِ پیدایش ہے، انگریزی فارسی، اُردو ہر سہ زبانوں میں استعداد علمی معقول ہے، پہلے کئی برس دفتر اگزیمینر آف اکونٹس لاہور میں کلارک رہے اب اکونٹنٹ ہیں، اوائل میں شمیم تخلص کرتے تھے، پھر زار تخلص اختیار کیا۔ شعر گوئی کا اب آٹھ دس برس سے کم اتفاق ہوتا ہے، راقم تذکرہ کے کالج کے ہمدرس تھے، اُسی زمانے کی فکر کے کچھ مسودے اُن کے دیئے ہوئے عرصہ سے تذکرے کے فائلوں میں پڑے تھے، ہنگام نظر ثانی اُنکا انتخاب درج کیا گیا

سر کو سودائے لبِ جاں بخش جاناں ہی رہا — دل ہمارا آشنائے آبِ حیواں ہی رہا
دل ہمارا قید لامِ زلفِ پیچاں ہی رہا — عشق میں بھی قائلِ توحید یزداں ہی رہا
پہلے تھا ہندوئے گیسو کا اور اب تِل کا خیال — کعبۂ دل اپنا دائم کافرستاں ہی رہا

اُٹھا جو روئے صنم سے نقاب محمل کا — فلک پہ پھیکا پڑا رنگ ماہ کامل کا
خلش جگر میں وہ پیکاں کی درد وہ دل کا — وہ لب پہ آہ و فغاں وہ تڑپنا بسمل کا
جگر پہ، سینہ پہ، پہلو پہ، دل پہ وار کرو — نکالو خوب مری جان حوصلہ دل کا
ہے دل میں جلوہ فگن اپنے وہ شہِ خوباں — بہت بلند ہی رتبہ اس اُجڑی منزل کا
الٰہی غدر یہ کروں ایک دل کو کس کس جا — نگہ کا، دید کا، مژگاں کا، زلف کا، تِل کا
ملے تھے زار سے ہم، اب تو مر گیا ہوگا — تڑپ رہا تھا پہ تھا نام لب پہ قاتل کا
جناں سے مورثِ اعلیٰ تمہاری بزم سے ہم — کچھ ایسے نکلے کہ کوئی کبھی نہیں نکلا
مے سے لبریز ہے ایاغ اپنا — ساقیا دل ہے باغ باغ اپنا
گر کانِ جواہر لکھوں اے زار تو ہے ٹھیک — بیجا نہیں دعوی ہے اُسے سیمبری کا
مینائے مے جو پھینک دی بیوجہ تو نے شیخ — کم ظرف یہ بتا تو سہی تجھکو کیا ملا

جی بھر کے ستا لے مجھے اے راحتِ جاں اور — مجھ جیسا ترے ظلم کو دنیا میں کہاں اور
ظاہر ہوئے صاحب میں قیامت کے نشاں اور — سینے پہ اُبھرنے لگے وہ دشمنِ جاں اور
یوں چلنے والے تو بہت تم کو ملیں گے — دنیا میں مگر زار سا شیدائی کہاں اور

ایک بوسہ کے طلب گار ہیں ہم — اور مانگیں تو گنہگار ہیں ہم

بادۂ عشق سے سرشار ہیں ہم
دامِ گیسو کے گرفتار ہیں ہم

بے وفا طرزِ وفا بھول گیا
با وفا جیسے کبھی تھا ہی نہیں

دل ہمیں چھوڑ کے اِس طرح گیا
جیسے پہلو میں کبھی تھا ہی نہیں

خدا جانے سوالِ وصل پر کیا رنگ لا بیٹھے
ہوئے جاتے ہیں ٹیڑھے میں تو اک بوسہ کا سائل ہوں

گیا جب اُن کے گھر طنزاً مجھے کہتا ہے کیوں آئے
وہی جلاد ہوں، خونخوار ہوں، ظالم ہوں، قاتل ہوں

نہ پوچھو ہمنشینو حالِ دور از عیش ہجراں میں
حزیں ہوں، نیم جاں ہوں، زار ہوں، بسمل ہوں گھائل ہوں

پہلو میں میرے دیکھ کے اُس گلعذار کو
گل کھائے سینکڑوں نے حسد سے ہزار کو

میں جانتا ہوں آپ کے قول و قرار کو
سمجھاؤں کہہ کے کیا میں دلِ بیقرار کو

بے پردہ اگر حشر میں وہ فتنہ گر آئے
خورشیدِ قیامت کو حقیقت نظر آئے

بل کھا کے اگر زلف تری تا کمر آئے
ظلمات کا رستہ ہمیں سیدھا نظر آئے

یادِ رخِ محبوب میں پھر اشک بھر آئے
پھر نوکِ مژہ پر مرے لختِ جگر آئے

سینہ ترا جب دیدۂ مشتاق سے دیکھا
اُٹھے ہوئے دو فتنے برابر نظر آئے

دم لیتا ہے رک رک کے مرے ذبح میں قاتل
اِس وقت بھی ظالم کی نزاکت نہیں جاتی

کچھ ایسا مزہ ملتا ہے اُس بت کے ستم میں
مر مر گئے پر جینے کی حسرت نہیں جاتی

شوخی میں تغافل ہے رکاوٹ میں لگاوٹ
تیری نگہِ یار شرارت نہیں جاتی

باہر وہ نظر آئے ہیں کہ جی جانتا ہے
داغ بھی ایسے اُٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

فتنہ پرداز، ستمگار، جفاجو، قاتل
تُو نے وہ فتنے اُٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

چھیڑ کر زخمِ جگر ناوکِ مژگاں میرا
تو نے وہ تیر لگائے ہیں کہ جی جانتا ہے

جاں بلب ہوں مر رہا ہوں عشق کا آزار ہے
رنج مونس، یاس ہمدم، غم گلے کا ہار ہے

کیا کہوں نوکِ مژہ جب سے جگر کے پار ہے
درد بھی اُٹھتا ہے تو میٹھا عجب آزار ہے

ہے نسیمِ صبح، یا بادِ صبا، یا بوئے گل
برقِ خرمن سوز یا ظالم تری رفتار ہے

شعلہ ہے، مشعل ہے، یا ہے شمع یا ہے آفتاب
ہے تجلّی طور کی یا جلوۂ رخسار ہے

دیکھتا ہی ہوں

در نہ ہیں

دیکھکر جلوے تمہارے
رہگئے دھکتے بجا تھام کے

روزِ وعدہ، دیکھنا ذوقِ وصال
صبح سے ہم منتظر ہیں شام کے

ہائے کب لے آسمانِ فتنہ ساز
دن پھرینگے عاشقِ ناکام کے

مرگیا گھل گھل کے زارِ نیم جان
عشق ہیں افسوس اِک خودکام کے

زارؔ منشی بانکے لال باشندہ بدایوں سنہ ۱۸۸۳ء میں چھاتہ میں مقیم تھے اور نیاز خیرآبادی سے اِصلاح لیتے تھے سنہ ۱۸۸۶ء میں امیر مینائی سے اصلاح لینے لگے پھر سنہ ۱۸۹۰ء میں گورکھپور گئے

زار

وعدہ جو کچھ کیا بھی تو تیور بدل لیے
اقرار سے عیاں ترے انکار ہی رہا

عیسیٰ بھی سر پٹک کے فلک پر چلے گئے
بیمار تیرے عشق کا بیمار ہی رہا

زاہد تجھے قسم ہے ذرا چکھ کے دیکھ لے
کیسی کھنچی ہوئی یہ مئے خوشگوار ہے

کیا خاک آئے مجمعِ محشر نگاہ میں
دیکھے ہیں ہمنے رنگ تری جلوہ گاہ کے

کہتے ہیں آج موت سے میری جھجھک کے وہ
ہٹ آ نہ پاس بسملِ تیغِ نگاہ کے

جھرمٹ میں زار ہیں وہ حسینوں کے اِسطرح
گویا ستارے گرد چمکتے ہیں ماہ کے

...رو فور — ...رن حال بیا

میری الفت کا یقیں انکو ہوا میرے — ...ہوں مگر میری دعا میرے بعد

دفتر عشق کے برہم ہوئے سارے اوراق — اٹھ گئی پردۂ دنیا سے وفا میرے بعد

ہاتھ جب دیکھے میرے یار نے بچپن کیا — رنگ لایا ہی نیا رنگِ حنا میرے بعد

ہیں کجا غیر کجا اُس سے اُلجھنا کیسا؟ — منہ کی کھائے نہ کہیں تیغِ ادا میرے بعد

کِسکو ہر بار جلائیں گے کرشمے تیرے — ہر ادا پر کسے آئیگی قضا میرے بعد

جو دیکھ لیتا نگاہ بھر کر تو اپنے بسمل کو اے ستمگر — نہ کرتی بیچین نوکِ نشتر کھٹک کھٹکر کھٹک کھٹکر

کہا داستانِ غمِ ہجر سُنکر — یہ قصہ ہے سُننے سنانے کے قابل

غیر سے ہے سازگاری آج کل — کون سنتا ہے ہماری آج کل

بادل آرائے و مینائے بدست — خوب کٹتی ہے ہماری آج کل

مدتیں گذریں یہی سُنتے ہوئے — ختم بھی ہوگی تمھاری آج کل

موہوم ہے خود اپنے گماں میں مری ہستی — عنقا تری تصویر کا خاکہ تو نہیں ہیں

میں زیر بارِ منتِ ساقی نہیں ہُوا — وہ رند ہوں کہ مست ہوں بوئے شراب میں

تم آئے نہ موت آئی لاچار اسے کہتے ہیں
جینے ہیں نہ مرنے ہیں آزار اسے کہتے ہیں

ہوتا ہی نہیں فیصل جھگڑا ہے قیامت کا
ہے حشر ہی ایک محشر تکرار اسے کہتے ہیں

تم خاک مسیحا ہو جب کر نہ سکے اچھا
موت آئی عیادت کو بیمار اسے کہتے ہیں

تم ابھی آئے ابھی جاتے ہو
ایسا کیا نام گن نا تھا تمھیں

گو عیادت کو نہ آئے نہ سہی
میری میت پہ تو آنا تھا تمھیں

حیرت ہے مری چشم تصور کو کچھ ایسی
کچھ ہو کہ نہ ہو سامنے تم پیشِ نظر ہو

زاہد کو عبادت پہ گھمنڈ ہم کو خدا پر
تم اپنی کہو حضرتِ ناصح کہ کدھر ہو

ابرِ رحمت گھرا ہے چوطرفہ
ساقیا آج تو نکر صرفہ

آئینہ کو بھی چھیڑ ہے اُن سے
منہ پہ کہہ کہہ کے مُنہ کی کھاتا ہے

میں تجھے بھول کر نہیں بھولا
تو مجھے جان کر بُھلاتا ہے

کوئی پہلو سے لے گیا دل کو
آپ پر بھی گمان جاتا ہے

وہ آجاتے کسر تھی کوئی دم کی
قضا جانے کہاں سے آن دھمکی

نویدِ وصل پر غش کیوں نہ آتا
یہ برقِ طور تھی جو دل میں چمکی

ہوئے آباد ویرانے تھے جتنے
یہ برکت ہے ہمارے دم قدم کی

حالِ دل سُنکر وہ فرمانے لگے
جُھوٹا قصہ ہے مگر پُر درد ہے

دم نزع نہ جا منہ پھیر کر پہلو سے بسمل کے
نکلنے دے ذرا تو حوصلے حسرت بھرے دل کے

بہارِ ہجراں حاصل ہے یادِ چشم میگوں میں
تڑپنے سے ہرے ہو جاتے ہیں ٹکڑے چھل چھل کے

کر کے اظہار بے کلی دل کی
بات کھو دی رہی سہی دل کی

ہے تصور میں کوئی غنچہ دہن
جا نہیں سکتی بے کلی دل کی

وقتِ رخصت نہ کہہ سکا کچھ بھی
دل ہی میں ہائے رہ گئی دل کی

سانس کے ساتھ بٹیں ہیں اے نزار
حالت ایسی کبھی نہ تھی دل کی

بازگشتی تیر ہی بن کر مجھے گھائل کیا
نالہائے نارسا اُلٹا ستم ڈھانے لگے

زائر

زائر ۔ منشی سیّد علی حسین زائر کلرک دفتر کمسریٹ لاہور (۱۸۹۶ء) اُس زمانے میں جو لاہور میں مشاعرے ہوا کرتے تھے اُن میں شریک ہو کر غزلخوانی کیا کرتے تھے، یہ چند شعر اُنکے نتائج افکار سے ہیں ۔

جمع کس طرح سے اِس خستہ کا دیوان ہوگا ۔۔۔ جس کا مجموعۂ خاطر بھی پریشان ہوگا
کھائیگا دانتوں پہ ہیرے کی کنی دُرِ عدن ۔۔۔ لب سے شرمندہ ترے لعلِ بدخشان ہوگا
پنجۂ دستِ جنوں بڑھنے تو دے اے وحشی ۔۔۔ جیب ہوگی تری دامن نہ گریبان ہوگا
لے اجل یوں تو تجھے آنا ہے اک روز ضرور ۔۔۔ ہجرِ جاناں میں جو آجائیگی احسان ہوگا
فرقتِ گلزارِ خوبی نے کھلائے خوب گُل ۔۔۔ سینہ داغوں سے مرا رشکِ گلستان ہوگیا
کیفیت ہے آج بیہوشی کی بزمِ حور میں ۔۔۔ دے مے گلرنگ ساقی ساغرِ بلّور میں
ہیں توام البتہ نیش و نوش عالم میں دلا ۔۔۔ قند ہوتا ہے ہمیشہ خانۂ زنبور میں

زاہد

زاہد ۔ شاہزادہ میرزا زاہد الدین زاہد ابن میرزا کام بخش خلفِ میرزا سلیمان شکوہ شاگرد خواجہ آتش، لکھنؤ میں جو دہلی کے شاہزادوں کا خاندان رہتا تھا اُسکے ایک رُکن تھے وہیں عرصہ ہوا انتقال کیا ۔ کلام ملاحظہ ہو

چھُٹ جائے جان زلفِ شبِ غم کے دام سے ۔۔۔ اپنی کشش سے اُسکو اگر کھینچ لائے دل
اُس برق وش کے ہجر میں کیا جان کھوئیے ۔۔۔ ہر دم جو بات بات میں اپنا جلائے دل
بے وجہ تیرے دامِ محبت میں اے پری ۔۔۔ دیوانہ ہے جو بیٹھے بٹھائے پھنسائے دل

زاہد

زاہد ۔ برہمچاری پرم آنند جی دہلوی، منشی دیبی پرشاد بشاش ملازم ریاست جودھپور مؤلف تذکرۂ شعرائے ہنود کے گرو تھے، علم تصوّف و باطن سے خوب ماہر تھے، سنسکرت کے علاوہ اُردو فارسی میں بہت اچھا دخل حاصل تھا، فارسی اُردو زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ کلکتہ بنارس ۔ راجپوتانہ کی اچھی طرح سیر کی تھی ۔

تلاشی کیوں نہ لی بادِ صبا نے باغبانِ گل کی ۔۔۔ گیا ہے دل ترے گلزار سے چوری عنادل کا

گل پکارے کہ آب جو آیا	چشمِ بلبل سے یوں بہے آنسو

زاہد

زاہد - میرزا مصطفےٰ حسین منشی عباس حسن فصاحت کے تلامذہ میں ہیں اور منشی نولکشور کے مطبع میں مصوری کرتے ہیں۔ چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

دیکھیں گے وہ کیا رخِ پُر نورِ جاناں کی طرف	ایک جلوہ میں تو آیا طور پر موسیٰ کو غش
شامت آئی ہے چلے ہیں بزم رنداں کی طرف	شیخ جی کا آج عمامہ اُچھالا جائے گا
کیا اپنے اچھے پھول تمہارے چمن کے ہیں	کیوں ہنس کے دیکھتے ہو مرے داغہائے دل
سامان اس طرف مرے گور و کفن کے ہیں	کپڑے بدل کے غیر کے گھر وہ گئے اُدھر

کہ خود جس کی رگِ گل سی کمر ہو	بھلا کیونکر وہ پہنے پھولوں کے ہار
نہ میری بے خبر کو کچھ خبر ہو	تڑپ کر جان بھی دیدوں جو زاہد

زاہد

زاہد منشی ولایت حسین اکبرآبادی شاگرد اعظم مرحوم۔ بیاض قاضی خلیل سے کلام نقل ہوا۔

نہ پوچھو یہ کہ کٹی کس طرح تمہاری رات	خدا کے واسطے فرقت زدوں کو مت چھیڑو
وہ لب ہلائیں تو آجائے جسمِ زار میں روح	قضا پکار رہی ہے یہ لاشِ زاہد پر

زاہد

زاہد - جناب سید عابد حسین صاحب تحصیلدار علاقہ نواب حامد علیخان ضلع نینپال گنج ہمشیرزادہ و شاگرد جناب عزیز لکھنوی ۱۹۲۶ء کے مشاعروں کا کلام ہے۔

بیتاب مجھ سے بڑھکے دلِ ناصبور تھا	اب کیا کہوں جو ہجر میں حال اے حضور تھا
بیتابیوں پہ دل کی مجھے بھی غرور تھا	نازاں تھے اپنی شوخ نگاہی پہ وہ اگر

زاہد

زاہد - سخنور شوخ طبع سید زاہد حسین زاہد ابن سید علی حسین مرحوم سادات موسوی اثنا عشری اور عمائد سہارنپور سے ہیں آپنے جو حالات لکھکر بھیجے اُنکا یہ خلاصہ ہے کہ انکے جدِّ اعلیٰ سید عبدالہادی عرف شاہ چراغ سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان آئے حضرت زاہد کے دادا حاجی سید اکبر علی مرحوم پہلے مالیر کوٹلہ کی ریاست میں ملازم رہے، پھر بہادر شاہ بادشاہ کی سرکار میں معتمدی و وکالت کے عہدہ پر ممتاز ہوئے اور اُسی زمانہ میں لارڈ کمبر میر کمانڈر انچیف ہند کے میر منشی کے عہدۂ جلیلہ پر بھی فائز رہے، حضرت زاہد کے والد ڈیرہ دون میں وکالت

کرتے تھے لیکن اُنکا انتقال اُنکی صغرسنی میں ہوگیا اِس لیئے جو کچھ قابلیت انھوں نے بہم پہنچائی
اُسے اپنے دلی شوق اور رغبت کا نتیجہ کہنا چاہیئے۔ فارسی کی درسی اور عربی کی ابتدائی کتب
قاضی محمد غلام عباس منیر شاگرد خواجہ آتش و حضرت دبیر سے اور بعض کتب مولوی غلام حسین
شاگرد مولانا صہبائی سے پڑھیں اور انٹرنس کے درجے تک انگریزی مدرسہ میں بھی پڑھا۔
خداداد ذہانت اور ذوقِ سلیم کی امداد سے اچھی استعداد اور قابلیت حاصل کرلی اور کتب
بینی کے شوق سے اُسے درجہ بدرجہ ترقی ہوتی چلی گئی۔ فنِ شعر کا مذاق فطرتاً طبیعت میں موجود
تھا اور شفیق استاد کی فیضِ صحبت اور توجہ سے اُس میں فی الجملہ اچھی استعداد بہم پہنچالی ۱۸۸۱ء
سے حضرت امیر کے دم آخر تک تخمیناً سترہ اٹھارہ برس اُنسے اصلاح کا سلسلہ جاری رہا محاورات
زبان کی تحقیق و چھان بین کا بیحد شوق رہا۔ اپنے استاد کے عقیدت مند تلامذہ میں رہے
اور اُنکی خدمت بھی کرتے رہے، چنانچہ امیر اللغات کی ترتیب میں بھی حصہ لیا شعر گوئی
بطور تفنن طبع کے ہے ورنہ اس سے صلہ و شہرت کے طالب نہیں ہوئے، کلام میں کثرتِ
مشق سے روانی اور پختگی اور بندش میں چستی اور زبان میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا ہوگئی
ہے تخلص کے برعکس انکے اکثر اشعار میں معاملہ بندی، رنگینی خیال، اور شوخی کے مضامین
پائے جاتے ہیں، زبان میں صفائی اور مضمون میں جدت کا زیادہ لحاظ رکھتے ہیں خوشنویس
بھی ہیں۔ خلیق۔ متواضع، پُرگو اور آزادمنش شخص ہیں۔ اب تینتالیس چوالیس برس کا سن
ہوگا۔ مکتوبات امیر مینائی میں اکثر خطوط آپکے نام کے چھپے ہیں۔ دیوان مرتب ہوگیا ہے
مگر شائع نہیں کیا۔ حالات اور کلام مرسلہ کا انتخاب درج تذکرہ کیا گیا۔

حشر کے دن قدِ آدم آفتاب آ ہی گیا
تو بھری محفل کے اندر بے نقاب آ ہی گیا

وعظ کی محفل سے ہم چھپکر کھسکنے ہی کو تھے
جھٹ سے واعظ لیکے اتنے میں کتاب آ ہی گیا

ہم رہے سرمستِ غفلت صبح پیری آ گئی
پڑکے ایسے سوئے سر پر آفتاب آ ہی گیا

ہے پیامِ مرگ پیری اب تو کر فکرِ سفر
زندگانی کی طرف سے تو جواب آ ہی گیا

دیر تک محفل میں وہ آنکھیں لڑاتے تو رہے
پھر بھی وہ معشوق تھے آخر حجاب آ ہی گیا

ہو چرا اس دل کا رکھا عمر بھر خانہ خراب
جسکو دیکھا اسپہ یہ خانہ خراب آ ہی گیا

شوقِ پابوسی میں جوشِ صید دیکھ او شہسوار
لاکھ زخمی تھا تڑپ کر تا رکاب آ ہی گیا

کچھ یہ مستوں پر کرم ہے جب لگایا منہ سے جام
جھومتا مغرب سے مستانہ سحاب آ ہی گیا

صحبتِ رنداں سے زاہد مدتوں بچتا پھرا
میکدے میں ہو کے آخر کو خراب آ ہی گیا

کرتے کرتے انتظار آخر کو میں مر ہی گیا
لے اب آ، چاہے نہ آ تو، میں تو اے ساقی گیا

میرا مرنا سن کے بولے لے چلو اچھا ہوا
مر گیا، اسکو نہ کہیے وہ تو صاحب جی گیا

لوگ جب لانے لگے انکو مری میت کے پاس
ہٹ کے بولے "واہ صاحب اور اگر یہ جی گیا"

اِس دھج سے وہ آیا کہ خدا ہی نظر آیا
کافر نے مرا آج تو ایمان لیا تھا

ہر بار نئی آن نئی شان تھی لیکن
ہمنے تجھے ہر رنگ میں پہچان لیا تھا

پہلو میں عبث ڈھونڈتی ہیں دل کو نگاہیں
تیروں نے تو پہلے ہی یہ گھر چھان لیا تھا

کچھ کھل ہی گئی انپہ بدی غیر کی ورنہ
کمبخت نے ساتھ اپنے مجھے سان لیا تھا

اظہارِ عبودیت ادھر سے جو نہ ہوتا
بندوں نے ید اللہ کو خدا مان لیا تھا

جب یہ کہتا ہوں بھلا دل دوں تمہیں کیا دیکھکر
ناز سے کہتے ہیں وہ "اپنا کلیجا دیکھکر"

بے خبر سوتے تھے تم تو اب میں تمسے کیا کہوں
لطف اٹھائے رات ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھکر

ظاہرا تسکیں تو بیماری میں دیتے ہیں۔ مگر
یار گھبرائے ہوئے ہیں حال میرا دیکھکر

تیغِ ناحق تولتے ہو دم ہی بسمل میں نہیں
ہاتھ روکو، کیا ستم کرتے ہو۔ ہاہا دیکھکر

نہ رنجِ رفتگاں کر رفتہ رفتہ
پہنچ جائے گا تو بھی کارواں تک

احباب کا دنیا سے سفر دیکھ رہے ہیں
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہے ہیں

دیا ہے دل تمھیں یہ بات رنج کی تو نہیں
ہمیں نے دی ہے کوئی چیز تمسے لی تو نہیں

وصال میں جو ذرا حد سے بڑھ چلی شوخی
کہا حیا نے یہ کیا؟ میں کہیں گئی تو نہیں

ازل میں دیکھ کے دل دیچکے تھے ہم جسکو
تجھے قسم ہے بتادے کہ تو وہی تو نہیں

یہ کون چھپکے ابھی میکدے سے نکلا ہے
یہ کون چور سا جاتا ہے؟ "شیخ جی تو نہیں"

جان دیں ہم وہ ہوں دشمن جان کے	کیا کریں قسمت ہی سے لینا نہیں
چلے جانا ٹھہرنے دو میرے اشکوں کے طوفاں کو	معاذ اللہ یہ جلدی ہے برس لینے دو باران کو
چبھے ہیں اسقدر کانٹے کہ تلوے ہو گئے چھلنی	بہت اچھی طرح چھانیں گے اب ریگ بیاباں کو
چھلکتا ہے تپ غم سے پڑا دل بھی جگر بھی	بھڑکی ہوئی اک آگ ادھر بھی ہے ادھر بھی
کچھ آبلہ دل ہی نہیں پھوڑا ہے جگر بھی	ناسور سے بہتے ہیں پڑے دیدۂ تر بھی
او بانکے سپاہی تری تلوار کے صدقے	مشتاق ہیں ہم، بڑھ کے کوئی وار ادھر بھی
ساماں ہیں نئے دیکھئے کیا ہو کے رہیگا	وہ بھی ہیں امنگوں پہ جوانی ہے ادھر بھی
دھڑکا شب تاریک لحد ہی کا نہیں ہے	سنتے ہیں کہ اس شب کی قیامت ہی سحر بھی
گو خوش ہیں یہ سنکر وہ ہیں بنتے بھی ہو الفت	نشتر سے سوا کر گئی ہے کام "وہ مگر بھی"
کیوں بھری محفل میں یاں کئے کہ رسوائی ہوئی	بال بکھرے، مستی چھوٹی آنکھ شرمائی ہوئی
ہیں نے جھک جھکا کر بھڑادی جب نگاہوں سے نگاہ	پشت پا سے تب ہٹی وہ آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے وہ غش کھا کے گر پڑنا مرا رخصت کیوقت	اسکا وہ کہنا کہ "دو لو یہ اور رسوائی ہوئی"
حشر میں فریاد کیسی خود ہی میں گھبرا گیا	اسکی صورت دیکھکر گھبرائی گھبرائی ہوئی
کیا کہا کیا گھر سے آنیکی یہی ہوتی ہے شکل	ہونٹ سوکھے، سانس پھولی، بات گھبرائی ہوئی
دل نہ مانے گا مرا کہنا کہ اسکا ہو چکا	بس چلے پھر اسپہ کیا جو چیز بیگانی ہوئی

گھٹا چھائی ہے بجلی کوندتی ہے رات کالی ہے * یہ عالم یہ شباب اب توبہ کا اللہ والی ہے *

زبیر

زبیر - صاحب عالم میرزا محمد رئیس بخت عرف مرزا محمد زبیر الدین گورگانی۔ صاحب عالم مرزا محمد دارا بخت میران شاہ بہادر ولیعہد اول حضرت ابوظفر بہادر شاہ غازی خاتم خانوادۂ تیمور کے بیٹے تھے غدر کے بعد کچھ عرصہ جودھپور میں رہے پھر بیس پچیس برس تک ریاست دربھنگہ میں ایکسو پچاس روپیہ ماہوار کے وظیفہ خوار رہے۔ مہاراجہ صاحب مرحوم اور انکے جانشین والی حال انسے بہت مانوس تھے۔ علمی استعداد بہت معمولی تھی مگر تصنیف و تالیف کا شوق تھا چنانچہ مہاراجہ دربھنگہ کی فرمایش سے تاریخ موج سلطانی لکھی دیوان و رتاریخ چھپ چکے ہیں، چند رسالے بھی شایع کئے تھے۔ کلام کچھ اعلیٰ درجہ کا نہیں ہے مگر طرز بیان

صاف ہے اور کہیں کہیں اشعار میں شوخی کے ساتھ بلند پروازی بھی پائی جاتی ہے دیوان میں سے کچھ اشعار منتخب ہو کر درج ہوئے۔ شوق نیموی سے تلمذ تھا۔ کبھی کبھی دہلی بھی آتے رہتے تھے۔ چھ سات برس ہوئے ساٹھ سال سے زائد عمر پا کر دربھنگہ میں انتقال کیا ♦

اشکوں کو ہمنے روکا تو چہرے کے رنگ نے	اُڑ اُڑ کے ہائے رازِ دلِ زار کہدیا
کچھ ایسا میں طریقِ عشق میں مدہوش و غافل تھا	اُسے بھی کھو دیا ہاتھوں سے پہلو میں جو اک دل تھا
جھکی جاتی تھی گردن آپ ہی شوقِ شہادت میں	کچھ ایسا دلفریب ادائے ہمدم وہ اندازِ قاتل تھا
کعبہ ہو کہ بتخانہ زبیرؔ آنکھ اگر ہو	اُس شوخ کا نظارہ کہاں ہو نہیں سکتا
ارض و سما کو چشمِ بصیرت سے دیکھئے	جلوہ ہے ذرہ ذرہ میں اُس خوشجمال کا
کچھ تو باعث زبیرؔ ہے اِس کا	دشمنِ جان ہر اک بشر جو بنا
عشق کی ہمپر جو روز افزوں عنایت ہے تو پھر	دردِ دل چھوٹا اگر دردِ جگر ہو جائیگا
عشقِ خوبانِ ماہرو نہ گیا	ہائے اے داغِ دل سے تو نہ گیا
خود لپٹ جائیگا خنجر سے گلا اے قاتل	جب ترے دستِ حنائی میں یہ عریاں ہوگا
وصل کا سُن کے وہ پیغام یہی کہتے ہیں	کھا گئے جان ہماری اجی ہاں ہاں ہوگا
سامنے رُخ کے ترے زلفوں نے میرا دل لیا	کیا غضب ہے دن دہاڑے مجھپہ یہ شبخوں ہوا
زباں پہ ذکرِ خدا دل میں حور کی خواہش	بتاؤ ہ حضرتِ واعظ کی پارسائی کیا
کھٹک جو آج میرے دل میں ہوتی ہے بیڈھب	نگاہِ یار نے برچھی سی پھر لگائی کیا؟
جبہہ سائی بتوں کے درپہ کی	پھر بھی لکھا مٹا نہ قسمت کا
کیسا رسوائے خلق مجکو کیا	یا خدا ہو بُرا محبت کا
لڑتے ہیں وہ ہوا سے یہ حیلہ نکال کے	کمبخت تجھ سے پھولوں کا زیور بکھر گیا
ہنس دئے پہنا کے ہار جو بوسہ طلب کیا	وہ گلبدن گلے کا مرے ہار ہو گیا
اور ہونگے جن کو ہوگا اپنی طاعت پر گھمنڈ	ہم گنہگاروں کو ہے اک اُسکی رحمت پر گھمنڈ
بعد مُردن جز کفن کیا خاک لیجاؤ گے ساتھ	منعمو! اتمکو عبث ہے مال و دولت پر گھمنڈ

وائے قسمت ہم نے قاصد کی زبانی یہ سنا
پڑھ کے خط کچھ چپ ہوئے اور پھر کہا ہنسکر کہ خوش

تفرقہ باہم پڑے گا بعد مردن زیر خاک
روح کوئے یار میں رہجائیگی تن زیر خاک

زنگ و بوئے باغ عالم پر کروں کیا اعتماد
لگئے آنکھوں کے آگے کتنے گلشن زیر خاک

تیرے عارض ہیں یا گلاب کے پھول
کسنے دیکھے اس آب و تاب کے پھول

تجھ سا نازک بدن جو تولا جائے
کلیاں گنتی کی ہوں حساب کے پھول

نہ کیوں روئے روشن پہ پروانہ دل ہو
کہ یہ شمع ہے لو لگانے کے قابل

یہ جھکر اسکے کہتا ہے قدموں سے قاتل
نہیں سر یہ اس آستانے کے قابل

تا عمر رہے ہم شجر خشک کی صورت
اس باغ جہاں میں کبھی پھولے نہ پھلے ہم

اشکوں سے بھی ٹھنڈی نہ ہوئی آتش پنہاں
سوز غم دلدار میں رہ رہ کے جلے ہم

قتل سے پہلے ہو چکے ہیں قتل
کشتۂ غمزہ و ادا ہیں ہم

اچھا یونہی سہی چکے جھگڑا
بیوفا ہم ہیں یا وفا ہو تم

بھلائیں دل سے اسے کس طرح ہم اے ناصح
رہی جو شکل تصور میں روبرو برسوں

با وفا ہم سا پر جفا تم سا
ڈھونڈ لاؤ تو ہم سلام کریں

رکھنے دیتی قدم زمیں بھی نہیں
اب ٹھکانا مرا کہیں بھی نہیں

اس فسونگر کے تلون کا ٹھکانا کچھ ہے
ہاں جو کہتا ہے کسی وقت تو دم بھر میں نہیں

کر لیا ایک زمانے کو دکھا کر انداز
بخدا آپنے اے ماہ لقا مٹھی میں

کوچۂ زلف کی دل سیر کریگا کیونکر
خضر سے راہبر اس راہ میں بھٹکے لاکھوں

میرے اشکوں سے لگی دل کی نہیں بجھنے کی
آب خنجر سے وہی آگ بجھا کر دیکھیں

قتل کرنے کو نہیں خنجر ابرو کافی
آپ کیوں ہاتھ میں شمشیر لیے پھرتے ہیں

یہ ضد یہ ہٹ کوئی اس قاتل بیرحم کی دیکھے
کہ شوخی سے وہ کہتا ہے گلا تلوار پر رکھو

تھی پہلے رہزن دل شوخی نگاہ ادا
ہوئی ہے دشمن جان آجکل حیا دیکھو

اُسکے مرنے کی خبر میری کہا یوں ہنسکر
کیا کریں حسن تو لیا مرگئے مرجا ہندو

ہے پسے جاتے ہیں لاکھوں دل دم رفتار اے ظالم
خدا کے واسطے رکھ تو قدم آہستہ آہستہ

اشکوں سے بجھی نہ آتش عشق
سینہ میں رہی جلن ہمیشہ
بھولے ہے کوئی سفر میں دل سے
ہے پیش نظر وطن ہمیشہ

زخم دل بے سبب ہیں کیوں خنداں
کیا کوئی اور گل کھائیں گے
اُسکے وعدے کا ہے یقیں کسکو
دیر لگتی ہے کیا مکر جاتے

نہ چھری میں ہے نہ خنجر میں نہ تلوار میں ہے
کاٹ کچھ اور تری ابروئے خمدار میں ہے

صد شکر اُن کو یاد رہا بعد مرگ میں
ٹھوکر سے آکے وہ مری تربت مٹا گئے

کیا اک جنبش ابرو میں تو نے قتل عالم کو
غضب کی باڑ رکھتی ہے تری شمشیر چھوٹی سی

رقیبوں سے وہ کہتے ہیں بلا کر شانہ بسمل
جو ہیں جانباز الفت اُنکی حالت ایسی ہوتی ہے

لذت فزا ہیں تیرے ستم ورنہ اے صنم
دلدار اور بھی ہیں، دل آزار اور بھی

چھوڑو بھی اے زہیر کہیں ذکر غیر تم
ورنہ بڑھے گی دیکھنا تکرار اور بھی

شب وصال ہے اور رنگ فق ابھی سے ہے
سحر کے ہونے کا دل کو قلق ابھی سے ہے

کچھ حیا کے ساتھ شوخی کا اثر آنکھوں میں ہے
کیا ہی انداز جفا و فتنہ گر آنکھوں میں ہے

کس طرح دیکھے تجھے کو تیرا گھر آنکھوں میں ہے
رات دن تو اے پری شکل نظر آنکھوں میں ہے

ان بتوں سے دل بچائے کوئی یہ ممکن نہیں
موہنی باتوں میں جادو کا اثر آنکھوں میں ہے

جب سے کہ بسا دل میں تصور ہے کسی کا
ہر وقت ہے اک صورت زیبا مرے آگے

رخ پہ گیسو ہیں پڑے اور چڑھی ہے چتون
نہیں معلوم کہ آج آئیگی شامت کسکی

بوسہ رخ جو لیا بولے وہ ہنسکر یہ زہیر
دیکھئے اب ہوئی آغاز شرارت کسکی

زر

زر۔ شیخ بلاقی زرؔ۔ لاہوری سادہ کار ابن شیخ سعد اللہ مقیم اکبر آباد شاگرد حاتم علی مہر۔ استعداد علمی بہت کم تھی سنہ ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے ساٹھ سال سے زیادہ عمر پائی۔

دل ہیں جگر ہیں سینے ہیں یکساں ہیں درآج
اے چارہ گر بتاؤں کدھر کم کدھر بہت

کبک وطوطی میں کچھ کمال نہیں
ان میں تیری سی بول چال نہیں

سنگدل بیرحم بھی اتنا نہ ہو
کوئی مرجائے تجھے پروا نہ ہو

پھنسی ہے موبمو جانِ حزیں زلفوں کے پھندے میں
اسیرانِ خم وکاکل گرفتارِ بلا ٹھیرے

کون سی صورت ہے ملنے کی بتوں سے یہ بتا
وہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خلا اکانام ہے

زخم

زخم - حکیم ابوالفیض فتح محمد خان لبسوی مقیم کانپور - جناب اثر کانپوری سے مشورہ سخن کرتے ہیں

عالم اک حسرت وعبرت کا نظر آتا ہے
جب نظر بھر کے سوئے گورِ غریباں دیکھا

بہت دیدیئے صدمے خوش نہو تو
فلک اکروز تو ہے اور میں ہوں

شب غم میں کوئی ہمدم نہیں اور
اک انکی آرزو ہے اور میں ہوں

زخمی

زخمی - منشی راج بہادر زخمی کابیتھ سری باستب ساکن کاکوری - آپ کو جناب طاہر موہانی سے تلمذ رہا ہے - ایک رسالہ موسوم بہ "نالۂ زخمی" سنہ ۱۸۸۶ء میں نکالنا شروع کیا تھا جو چند سال بعد بند ہوگیا - سنہ ۱۸۸۷ء میں کانپور میں رہتے تھے بزرگ انکے کاکوری کے قانون گو تھے نعتیہ کلام بھی اکثر کہتے تھے -

کیا ہوائے نفس پر غالب ہو انسانِ ضعیف
کچھ ہوا سے زور چل سکتا نہیں ہے کاہ کا

دوستو دفن میں کسواسطے یہ عجلت ہے
میرے مرنے کی انھیں بھی تو خبر ہو نیدو

کہدو یہ طبیبوں سے عبث لکھتے ہیں نسخے
بیماریٔ الفت کی دوا اور ہی کچھ ہے

جگر نوحہ کناں ہے دل کفِ افسوس ملتا ہے
ہزاروں حسرتوں کے ساتھ میرا دم نکلتا ہے

زخمی

زخمی - منشی محمد شرف الدین زخمی اہلمد عدالتِ سلطانپور ابن منشی یقین اللہ ساکن قصبہ جالیس ضلع رائے بریلی، سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے پیشتر ضلع پرتاب گڈھ کے رئیس بابو مہیش بخش تعلقہ دار کے ہاں مختار رہے، جبتک پرتاب گڈھ رہے حیدر علیشاہ صغیر سے اصلاح لیتے رہے، لکھنؤ آئے تو سید غلام حسین قدر بلگرامی سے تلمذ اختیار کیا - پہلے بسمل تخلص کرتے تھے - حضرت قدر نے زخمی تخلص عنایت کیا - سنہ ۱۸۹۰ء میں کم بیش پچاس

برس کا سن تھا۔ بعد کا حال باوجودِ تلاش دستیاب نہ ہو سکا۔

دل کسی روزنہ ٹھنڈا ہوا اصلا میرا
پھک رہا ہے تپِ فرقت سے کلیجا میرا

خبر آمدِ دلدار سُنی ہے جب سے
دل پھڑکتا ہے اُچھلتا ہے کلیجا میرا

اُٹھ گئے روٹھ کے پہلو سے مرے وہ زخمی
کر گئے اور بھی مجروح کلیجا میرا

دیکھ کر شوخ نے دیوانہ گیسو کو کہا
سر سے ٹلتی یہ بلا میرے تو اچھا ہوتا

نئے انداز سے حلقے وہ زلفوں کے بناتے ہیں
کسی کے طائرِ دل دام کے پھندوں میں لاتے ہیں

بجائے اشک آنکھوں سے نہ کیونکر خونِ دل ٹپکے
غضب ہے غیر اُنکے پاؤں میں مہندی لگاتے ہیں

ہو چکے عمر نے بس اب آؤ گلے سے لپٹو
مانعِ وصل نہیں شرم و حیا ہوتی ہے

ناتوانی ہجر میں ایسی بڑھی
لب تک آنا آہ کا دشوار ہے

قد بالا ہے نمونہ حشر کا
فتنۂ محشر تری رفتار ہے

زعم۔ سید غلام محمد زعم عرف احمد الدین کنیت ابوالفخر۔ حیدرآباد دکن کے باشندے ہیں اور حضرت فصیح الملک داغ کے خرمن کے خوشہ چین ہیں، بیس برس سے مشقِ سخن کرتے ہیں طبیعت موزوں پائی ہے اور مشق بھی خاصی ہے۔

بوسہ لب و رخسار کا مانگا تو وہ بولے
میں ایک ہوں اور آپکے ارمان بہت ہیں

ہم سا نہ ملے گا کوئی جانبازِ محبت
گو چاہنے والے ترے ایجان بہت ہیں

اِس دل کے عوض اور کوئی دل مجھے دیدے
بندوں پہ الٰہی ترے احسان بہت ہیں

ہوتا نہیں نوشتۂ قسمت کو انقلاب
ٹلتا نہیں لکھا ہوا تقدیر کا کبھی

یا میرے گھر میں وعدہ فراموش آ کبھی
یا اپنی بزمِ ناز میں مجھکو بلا کبھی

کیا واقعی وہ آئیں گے یا طنز سے کہا
قاصد نے ایسا مژدہ سنایا نہ تھا کبھی

فتنہ پردازی تو معشوقوں کی آب و گل میں ہے
اِسکو تاکا اُسکو مارا رات دن یہ دل میں ہے

قیس نے نالہ اگر منہ سے نکالا ہی نہیں
اُٹھی پھر بے چین لیلیٰ کس لیئے محمل میں ہے

کیا بتائیں ہم کہاں ہیں آپکی مژگاں کے تیر
ایک پہلو میں ہے اک سینہ میں ہے اک دل میں ہے

چاندسی صورت پہ تیری غیر کیوں دیتا ہے جان	یہ تو میری آنکھ میں ہے یہ تو میرے دل میں ہے
یا مرے پاس جفاکار کو لائے کوئی	یا مرا قصۂ غم انکو سنائے کوئی
زعیم کس ناز سے وہ رات کو فرماتے ہیں	نیند آتی ہے نہیں اب نہ ستائے کوئی

زکی

زکی - مرزا محمد خان زکی لکھنوی نبیرۂ نواب تفضل حسین خان بہادر مغفور مصاحب و مشیر نواب سعادت علیخان والیٔ اودھ شاگرد مولوی محمد محسن صاحب شہید و حضرت انیس سلطان عالم واجد علیشاہ کے زمانۂ سلطنت کے شاعروں میں تھے، عرصہ ہوا انتقال کیا۔ خمسہ اچھا کہتے تھے جو بخوف طوالت نظر انداز کئے گئے۔ کلام کا انتخاب حاضر ہے

ہم غم سے جاں بلب تھے اور درد تھا جگر میں	منہ پھیر کر سدھارے ہنستے ہوئے وہ گھر میں
لب پہ ہے نام تیرا ہے تو ہی تو نظر میں	سینے میں تو کبھی ہے اور ہے کبھی جگر میں
دیوانہ جانکر وہ کرتے ہیں ہوشیاری	دل چھین کر کبھی میرا کہتے ہیں جاؤ گھر میں
ایسی کچھ اسکو سوجھی لگ جائے خود گلے سے	تاثیر دے الٰہی اِس آہ بے اثر میں
دھیان اُسکی ابروؤں کا ہے کعبہ کی زیارت	معبود کا ہے جلوہ ہر دم مری نظر میں
ہم تیرے قد کے شیدا قمری کو سرو کا غم	ہوتا ہے فرق اتنا انساں میں جانور میں
ناسازیٔ مسیحا جانباز کی قضا سے	تاریک ہے زمانہ اندھیر ہے نظر میں
قاتل سے بل نہ نکلا گشتۂ جنوں کا	سر کٹ گیا ہے لیکن باقی ہے درد سر میں
ملکِ عدم کا جانا بارِ گناہ سر پر	گذرے گی اے زکی کیا اس راہ پُر خطر میں

زکی

زکی - سید محمد زکی خلف غلام رضا بلگرامی شاگرد جناب دبیر لکھنوی، انکے نسب کا سلسلہ زید شہید سے ملتا ہے بڑے طباع اور قابل بزرگ تھے۔ ریاستِ رامپور میں ملازم تھے مرثیہ اور قصیدہ کہنے میں اچھی مشق تھی اور مرثیہ خوانی میں بھی کمال حاصل تھا ۱۲۸۸ھ میں پچاس سال کی عمر میں وفات پائی۔ منشی افضل حسین ثابت لکھنوی سال وفات کے بارہ میں ۱۸۸۰ء تحریر کرتے ہیں۔ انکے شاگردوں میں نواب ببنے صاحب مشتاق لکھنوی بڑے طبیعت دار خوش مذاق مشاق شاعر تھے انکا بھی ۸-۷ برس ہوئے انتقال

ہو گیا۔ یہ اُنکے کلام کا نمونہ ہے۔

تصور بندھ گیا سودے ہیں کس قتالِ دوراں کا / رگیں گردن کی دم بھرنے لگیں شمشیرِ بُراں کا

وہ آنکھیں ترک ہیں جنکو ہے خونریزی کی چٹکی ہو / چلینگی برچھیاں ایما ہے یہ تحریکِ مژگاں کا

مثلِ خزاں بہار کا لطف نظر میں ہے / لالے کی طرح داغ ہمارے جگر میں ہے

لیکن جواب خط ابھی قاصد پھرا نہیں / اے چشم تر نہ رو کہ مسافر سفر میں ہے

اللہ رے اسیریِ بلبل کا اہتمام / صیاد بات کونسی اِس مُشتِ پر میں ہے

عاشق کی جانِ زار بھی قاصد کے ساتھ ہے / دل ہے کہ خطِ شوق کفِ نامہ بر میں ہے

زکی

زکی۔ افسرِ اقلیمِ نازک خیالی سر دفترِ فصحائے زمان حافظ سیّد محمد زکریا خاں صاحب زکی دہلوی سابق ڈپٹی انسپکٹر مدارس ممالک مغربی و شمالی۔ دہلی کے ایک موقر خاندان سادات کے رکن تھے اور شاعری اُنکی میراث آبائی تھی۔ اِنکے بزرگ نواب مختار الملک مجد الدولہ عبدالاحد خان وزیر شاہ عالم ثانی کے قریبی رشتہ دار تھے، اِنکے والد سید محمود خان مرحوم صاحبِ دیوان اور انکے نانا (جد) دادا کے بھائی بھی تھے، نواب اعظم الدولہ میر محمد خان صاحب سرور صاحبِ دیوان و مصنف تذکرہ شعرائے اُردو تھے۔ اُنکی پیدائش ۱۸۳۹ء میں شاہجہان آباد میں ہوئی "زینت باڑی" میں انکے بزرگوں کے مکان تھے۔ یہ خود نواب اسد اللہ خان بہادر غالب مغفور کے شاگرد رشید بڑے نازک خیال اور ذکی الطبع شاعر تھے علم عروض و قوافی پر عبور کامل اور فن سخن میں ملکہ راسخہ حاصل تھا۔ حق یہ ہے کہ میرزا غالب کے شاگردوں میں حضرت زکی سے زیادہ کسی نے انکا رنگ نہیں برتا اور ان سے زیادہ کوئی اُنکے رنگ کی تقلید میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میرزائے مرحوم بھی اِن سے بہت خوش تھے۔ چنانچہ چند سطور بطور سندِ شاعری انہیں لکھکر عنایت کی تھیں جسکی نقل دیوان زکی کے دیباچہ میں بھی درج ہے۔ آپ اِس سارٹیفکیٹ کو نہایت فخر کے ساتھ اپنے احباب کو دکھایا کرتے تھے مَیں نے بھی یہ سارٹیفکیٹ اُنکے پاس دیکھا تھا۔ راقم تذکرہ کی بھی کئی بار آپ سے دہلی میں

ملاقات ہوئی تھی، آپ وجیہ، مہذب، ذی لیاقت، متین، اور بڑے جہاندیدہ بُردبار آدمی تھے۔ غدر سے پیشتر ہی پنڈت رام کشن بسمل مرزا غالب و شیخ امام بخش صہبائی کے فیضِ تعلیم سے فارسی، عربی، منطق و ریاضی میں بہرہ ور ہوچکے تھے، فنِ طب میں بھی دخل تھا اور ماسوا اُردو شاعری کے فارسی نظم و نثر میں بھی قدرت رکھتے تھے، ہنگامۂ غدر کی اشراف گردی کے زمانے میں دلّی سے قدم باہر نکالا، اُس وقت اُنیس بیس برس کی عمر تھی اور بسبیل روزگار میرٹھ، گورکھپور، بریلی، الٰہ آباد اور بدایوں میں مقیم رہے۔ آپکی عمر کا آخری حصہ بدایوں میں بسر ہوا جہاں آپ عہدۂ ڈپٹی انسپکٹری مدارس سے پنشن لیکر جا رہے تھے، وہیں ۱۹۰۳ء میں تخمیناً ساٹھ سال کی عمر پاکر اس جہانِ فانی کو خیرباد کہکر راہی ملکِ بقا ہوئے حصولِ پنشن کے بعد وہاں سب جسٹرار بھی ہوگئے تھے، آپ فنِ شاعری کے اصول و نکات سے ماہر اور جملہ اصنافِ سخن پر قادر تھے، آپکے کلام بلاغت نظام میں خیالات کی تازگی۔ مضمون آفرینی، نازکخیالی، اور طرزِ ادا کی لفاست، خاص طور پر قابل داد ہیں، فارسی تراکیب بھی موقعہ بموقعہ بکمالِ صفائی نظم کی ہیں، کوئی شعر معنی خیز لطافت سے خالی نہیں، دشوار پسندی کے باوصف آپکا کلام بلحاظِ فصاحتِ زبان نہایت مستند ہے، دیوان میں ایسی غزلیات کم ہیں جن میں ایک یا دو شعر کم از کم مرزا غالب کی یاد دلانے والے نہ ہوں۔ آپکے دورانِ حیات ہی میں ایک دیوانِ غزلیات موسومۂ دیوان زکی شائع ہوکر مقبول عام ہوچکا تھا۔ اسکے علاوہ غیر مطبوعہ کلام جس میں غزلیات، قصائد، رباعیات وغیرہ شامل ہیں آپکے عزیزوں کے پاس موجود ہے، کلام غیر مطبوعہ ہمیں انکے حقیقی برادر زادے سید محمود حسین صاحب ثاقب وکیل کوٹہ کی مہربانی سے دستیاب ہوا جس کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے سید زکی مرحوم کثیر العیال شخص تھے، جائداد آبائی باقی نہ رہی تھی اِس لئے فکرِ معیشت سے کبھی فارغ البال نہ ہوسکے اُنکے انتقال کے بعد ایک صاحبزادے کی شادی نواب نور الحسن خاں ہئیں بھوپال کی دختر سے ہوئی اور اب وہ لکھنؤ میں قیام پذیر ہیں بقیہ بھائی سب دہلی میں رہتے ہیں نواب زکی قدیم تہذیب کے ایک دلپسند نمونہ تھے، پابندی وضع، انکسار، خلق، کم سخنی سے

متصف ہونے کے علاوہ نکتہ سنج اور زود فہم بھی تھے، آپ کو نئے مضامین پیدا کرنیکا خیال ہر وقت رہتا تھا اور اس میں کچھ کلام نہیں کہ اپنے زمانے کے مسلم الثبوت اساتذہ میں آپکا شمار تھا۔ فقیروں سے بہت عقیدت تھی۔ شعر و سخن سے طبیعت کو اسقدر لگاؤ تھا کہ جہاں جاتے تھے وہاں انکے دم سے شعر و سخن کا چرچا ضرور ہو جاتا تھا اور مشاعرے بھی ہوتے رہتے تھے مولوی حشمت اللہ حشمت ایم، اے کلکٹر صوبجات متحدہ۔ پنڈت جواہر ناتھ کول ساقی دہلوی اختر صدیقی، اسیر بدایونی۔ انکے نامور شاگرد ہیں، انکے کلام میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جن مضامین سے طبیعت کو لگاؤ نہ تھا اُنکو خواہ مخواہ اپنے اشعار میں داخل نہ کرتے تھے۔ چنانچہ رندانہ بولی ٹھٹولی، زہد کی مذمت، شراب کی تعریف، درد و سوز کے مضامین کم ہیں الغرض آپکی وفات سے دُنیائے شاعری کا ایک زبردست رکن جاتا رہا۔ شائقین کی دلچسپی کے لیئے آپکے کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ کا انتخاب درج کیا جاتا ہے

ساتھ ساتھ اہل تماشا کا وہ ششدر جانا — اللہ اللہ ترا جانب محشر جانا
لیکے دل پوچھتے ہیں تو نے ہمیں کیا سمجھا — ابھی آفت ہوا گر کہیئے کہ دلبر جانا
شرم پر اُسکی مٹا ہوں کہ نظر کو جسکی — ننگ ہے پردۂ مژگاں سے بھی باہر جانا
کھل گیا عاشقِ دیوانہ کا دانا ہونا — خاک اُڑانے کو ترے کوچہ میں اکثر جانا
ٹوٹ کر جس سے صدا نکلے وہ کیا نازک ہے — شیشہ جانا جو مرے دلکو تو پتھر جانا
غیر کے حق میں نہ کھو دلِ ناداں کوئی حرف — وہی بہتر ہے جسے یار نے بہتر جانا
خاموش ہوں ہیں دیکھکے اندازِ خامشی — جو بات لاجواب ہو اُسکا جواب کیا
سو رنج سو الم ہیں یہاں ہر نفس کے ساتھ — دم کا نہیں شمار تو غم کا حساب کیا
ہم ہیں ادا میں رہتے ہیں محوِ لقائے دوست — اندازِ مہر کیا ہے نگاہِ عتاب کیا
رو رو کے مَیں نے اپنا بیاباں بنا لیا — زنداں ہُوا خراب تو آباد گھر ہوا
حسرت یہی رہی کہ حسینوں کو دیکھئے — مَیں خاک بھی ہوا تو غبارِ نظر ہوا

کیا برباد سعیِ ناخدا کو میری قسمت نے / کہاں جاکر ڈبویا جب کنارے پر سفینہ تھا
ہر اک کام ہو مشکل تو کیا کرے انسان / مجھے تو جاں کا دینا بھی وصلِ یار ہوا

عجب کیا ہے جو وہاں رحمت سے ہو زاہد کی آمرزش / عذاب اُس پر یہاں کچھ کم نہ تھا زہد ریائی کا
خرسند تیرے جلوہ سے ہی جانِ ناتواں / تجھ سے ہی رابطہ ہے دلِ بیقرار کا
او چشمِ بے نیاز ذرا دیکھ تو سہی / کیا حال ہو گیا ترے امیدوار کا

داغِ بیکسی اللہ اکبر کیسا عالی ہے / کہ ملکر خاک و خوں میں قصد ہے ایوانِ قاتل کا
شبِ غم مرتے ہی آخر ہوئی یعنی برابر ہے / نکلنا جان کا آسان ہونا ایک مشکل کا

پیکانِ تیر آپ کا رہا سینہ میں صد شکر / یہ قطرہ ہے باعث مرے تسکینِ جگر کا
لبوں سے جان ہی نکلے تو حرفِ مدعا نکلے / کلیم آساں نہیں اہلِ وفا کا ہمزباں ہونا
سکونِ دل سرورِ چشم رنگا رنگ حاصل ہے / ترا دیدار ہے نظارۂ باغِ جناں ہونا
مٹا کر ہائے غمخواروں نے تزئینِ فنا کھوئی / خراشِ تیرِ جاناں خاتمِ دل کا نگینہ تھا
غضب ہے اب تغافل مجھ سے میں وہ ہوں کہ میرا دل / فریبِ مہر دیکر آپ کی آنکھوں نے چھینا تھا
وہ دیکھتے ہیں بزم میں یہ دیکھتا ہے کیوں / بارے ہوا اب مجھے بھی سزاوارِ دیکھنا

لگا دل میں وقتِ جگر ہو گیا / ترا تیر تیری نظر ہو گیا
تری راہ کسنے بتائی نہ پوچھ / دلِ مضطرب راہبر ہو گیا
ہمنے بھی اُنکی نیم نگہ کا دیا جواب / کی کھنچی آنکھوں نے نیم نگہ نیم جاں ہوا

وہ گرمِ خواب ہو گئے اس آہ و بکا میں کیا / دردِ شکستِ دل نہیں میری صدا میں کیا
گل کی طرح ہیں جیب تا دل ہزار چاک / پنہاں رہیگا داغِ تمنا قبا میں کیا
ایسا ہوں محوِ آرزوئے انتقام میں / دشمن سے پوچھتا ہوں کہ مانگوں دعا میں کیا
ہم جان و دل تو نذرِ غمِ عشق کر چکے / حیراں ہیں اب کہ لائینگے راہِ وفا میں کیا
کیوں گل فشانیاں ہیں میانِ زمین و چرخ / خونِ جگر نہیں تو ہے آہِ رسا میں کیا

اُڑے جاتے ہیں مگر شوق میں اندیابِ جفا ۔ راہ میں ورنہ کہیں نقشِ کفِ پا ہونا ۔ تری وضعِ تغافل میں ہلاک یکساں مخفی ۔ تری طرزِ تبسم سے عیاں آرامِ جاں ہونا ۔

غیر مطبوعہ

انداز شوخ اسکے ہیں سرمایۂ فریب / دلکش ادائیں کیا نگہ جانفزا ہیں کیا
ذرے ہیں بے قرار تو اختر ہیں حیرتی / جلوے ترے سمائے ہیں ارض و سما میں کیا
مجرم ہے تو کیوں نکل نہیں جاتا سرشک میں / یارب بھرا ہے اِس دلِ درد آشنا میں کیا
آلودۂ کدورتِ باطن ہے ہر نفس / منہ لے کے زکی دکھاؤ گے بزمِ صفا میں کیا
دیوانگی سے چھوٹ کے اسیرِ بلا ہوا / دل آشنا ہوا ابھی تو غم آشنا ہوا
جب دل ہی محوِ لذتِ دردِ وفا ہوا / کیا کیجئے ستم کی شکایت ہوا ہوا
گویا بہارِ رفتہ چمن میں پھر آگئی / اچھا ہوا کہ زخمِ جگر پھر ہرا ہوا
محروم سازگاری طالع ازل سے ہوں / ہونا جو کچھ نہ تھا وہ مرا مدعا ہوا
نیرنگ کائنات میں بازی دلفریب / کرتا ہے کوئی شوخ تماشا چھپا ہوا
جب درمیاں حجابِ تعین نہیں رہا / ذرہ سے تا بمہر خدا ہی خدا ہوا
تو وہ کہ تیری خاکِ قدم سرمۂ نظر / میں وہ کہ میرا سجدہ ترا نقشِ پا ہوا
دل فرطِ غم سے خستہ ہے ذوقِ فغاں کہاں / سچ ہے جو شیشہ ٹوٹ گیا بے صدا ہوا
اسکے سِوا کہ شاہد و مشہود ایک تھا / میں کیا کہوں کہ عالمِ حیرت میں کیا ہوا
قیامت میں کیوں اسنے ملنا نہ ہوگا / کہ اس دن تو کچھ عذرِ فردا نہ ہوگا
مقرر ہے اثبات نفی مکرر / کہو وصل ہرگز نہ ہوگا نہ ہوگا
مریضِ وفا کا مداوا ہے مرنا / یہ اچھا بھی ہوگا تو اچھا نہ ہوگا
کہتے تھے اور دی نکلی اسکو جان حیف / کرتا ہے آدمی کو زکی شرمسار جھوٹ
دنیا میں جب خدا ہی بتوں کو بنا چکا / کرتا ہے او فلکِ ستمِ آسمان عبث
ٹھکراتے ہیں وہ مار کے خنجر بری طرح / جاتی ہے جانِ عاشقِ مضطر بری طرح
وفا پرست ہوں اہلِ وفا بنائیں گے / تبرکاً مرے خاکِ مزار کی تسبیح
تمہاری آرزوئے وصل شغلِ جانِ حزیں / تمہارا ذکر دلِ بیقرار کی تسبیح

عشق کا وہم ہے زمانے پر
میری قسمت میں تھا کہ شک پہ یاں
حدِ شوق سے پہنچتا ہوں

کیا بگڑتے ہیں وہ فسانے پر
مُہر ہوتی ہے دانے دانے پر
تیر سے پہلے ہیں نشانے پر

وہ دل خستہ ہوں دُکھ جاتا ہے دلِ اندوہ دشمن پر
رولایا بیکسی نے طالعِ ناکام رہزن پر

نصیبوں سے مرے ہوتا ہے سب پہلے ہی خاکستر
پشیماں برق ہو جاتی ہے جب گرتی ہے خرمن پر

کتنے رہرو ملے کہ راہ میں ہے | کارواں کارواں غبار ہنوز
بارہا مر کے ہم جیے شبِ ہجر | ہو گیا عمر کا حساب غلط

بھرنے میں زخم کے وہ گل افشانیاں کہاں
جی میں ہے دلکو چھیڑ دیں پھر نیشتر سے ہم

ہے شبِ غم کسقدر ذوقِ تماشائے بلا
بند ہونا دیدۂ بیدار کا اچھا نہیں

ہمکو ستمگر کہیں اور بُرا کیا کریں
اسکے سوا کیا کہیں اسکے سوا کیا کریں

حقِ محبت عزیز اور ادا کیا کریں
آپ ہیں بیمارِ غم میری دوا کیا کریں

اُنکو مذاقِ ستم عذرِ جفا کیا کریں
خو ہمیں تسلیم کی اس کا گلہ کیا کریں

بزم کو بیخود کیا جلوے نہ اب دیکھئے
چشم و نگہ کیا کریں ناز و ادا کیا کریں

یہ سُرمگیں نگہ یہ تبسم نقاب میں
کیا بے حجابیاں ہیں تمہارے حجاب میں

لیلیٰ کے نام میں بھی تھی مقصود ایک شان
ذوقِ خیال یار سے ہوں محو خواب میں

کیوں آؤں ہوش میں کہ ہو پھر حسرتِ فراق
ذوقِ خیال یار سے ہوں محو خواب میں

آوارگی تھی فطرتِ آدم کہ خلد سے
آباد ہونے آئے جہانِ خراب میں

محرومِ انبساط ہوں رنجورِ بے کسی
پیتا ہوں خونِ دل قدحِ مشکبو کہاں

اُس مہوشِ یگانہ کو دل میں کرو تلاش
پھرتے ہو جستجو میں ذکی کو بکو کہاں

ہو گئے جذبِ محبت سے یہ دونوں کیا ایک
کیوں دلِ تنگ میں یارب خلشِ تیر نہیں

یہ مٹ نجائے کہیں نقشِ آب کی مانند
کہ تابِ موجِ نفس جسمِ ناتواں میں کہیں

دہن سے اُنکے کھُلا مجکو رازِ بیم و اُمید
وہ بات کرتے ہیں ایسی کہ نکلے ہاں ہیں نہیں

ناصح قمارِ عشق کو چھوڑینگے آپ ہم
باقی ہے ایک جان ذرا اسکو ہار لیں

کہاں ہے حسرتِ ذوقِ طپیدن
دلِ بسمل وہ خنجر آزما ہیں

بڑھا ذوقِ اسیری جب انھوں نے
کہا کہدو کہ اب سے یہ رہا ہیں

جمع ہو نہ ہم تپش سے خاطرِ قاتل کہیں
ہو چکے ٹھنڈا نگارِ نازکا بسمل کہیں

کہہ نہ بیٹھیں عاشقانِ مضطرب غافل کہیں
یوں نہ کھینچے قابلِ تسکیں تپا یا دل کہیں

ہر بات میں حوالہ ہے ہر بحث میں سند
ناصح کو مانتے ہیں ہم اہلِ کتاب ہیں

وہی سبزہ، وہی وحشت، وہی ویرانی ہے
اور کیا وحشت میں ہوگا جو مرے گھر میں نہیں

پاسباں غیر وہ مغرور، رسائی معلوم
بیکسی عرضِ وفا کی کوئی تدبیر نہیں

کہتے ہیں سرزنشِ غیر سے مرتے کیوں ہو
بیوفا لفظ ہے، خنجر نہیں، تلوار نہیں

فروغِ شعلۂ داغِ جگر سے محوِ حیرت ہوں
فروزاں ہو گئی گویا کہ شمعِ طور سینے میں

ہمنے کاٹی ہر شبِ غم نالہ و فریاد میں
وائے گر ہوں یہ نفس بھی زیست کی تعداد میں

کیوں نگاہِ قہر کرتے ہو دلِ رنجور پر
بیکسوں پر کھینچنا تلوار کا اچھا نہیں

وہ لے لیں دل تو چھٹ جاؤں میں غم سے
کمال مصلحت ہے اس زباں میں

جان و دل سازگار ہیں دونوں
یعنی تم پر نثار ہیں دونوں

آفریں تم کو - ایک ناوک میں
جگر و دل فگار ہیں دونوں

غیر مطبوعہ

میسر جو نہو صہبا پئیں گے خونِ دل اپنا
یہ ہمنے تاک رکھی ہے مئے انگور سینے میں

یار سے غیرِ فنا وصلِ حقیقی ہے محال
بیخودی خواب بھی خواب کی تعبیر کہاں

سینہ میدانِ قیامت نہیں دم صور نہیں
حسرتِ مردہ عجب کیا ہے جو محشور نہیں

روبرو جلوہ فزا ہے چمنستانِ شہود
نگہِ شوق کبھی دید میں معذور نہیں

مئے پندار سے کیوں پُر ہو مرا جامِ سفال
جامِ جمشید نہیں یہ سرِ فغفور نہیں

کر دیا خوئے خموشی کو وفا میں داخل
بیقراری میں بھی فریاد کا مقدور نہیں

ہو گیا پردہ برانداز انا الحق کہنا
بزمِ توحید میں گنجایشِ منصور نہیں

غیر مطبوعہ

اشکِ خوں کی یہ تراوش ہے تو کیونکر مانوں
نہ محرومِ تماشا ہیں نہ ہم نظارہ کرتے ہیں
ہوائے دولتِ فانی میں غافل کیا اُبھرتے ہیں
تری آنکھوں کے آگے فق ہو رنگت سبزہ رنگوں کی
ترے گیسو بھی نیرنگِ جہانِ بے بقا نکلے
ترے طرزِ تغافل سے میں کیوں طرزِ وفا چھوڑوں
تماشا ہے اُمید و بیم کا یہ گو مگو اُن کی
ازل میں جو کہا اُس پر رہیں گے تا ابد قائم

جگر و دل میں جراحت نہیں ناسور نہیں
پڑے ہیں بزم میں بیخود نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
حبابِ بحر ہیں گویا کہ ہستی سے گذرتے ہیں
یہی سفاک آہوئے سبزۂ فردوس چرتے ہیں
سنورتے ہیں بگڑتے ہیں، بگڑتے ہیں سنورتے ہیں
بہت عاشق ہوا ہوں میں بہت معشوق بنتے ہیں
نہ ہے اقرارِ وصل اُن کو نہ وہ انکار کرتے ہیں
ترے عاشق کہیں عہدِ وفا کرکے مکرتے ہیں

مایوس ہوں اثر سے تو فریاد کیا کروں
غم کا یہ ہے ہجوم کہ ہے تلخ زندگی
حیرت سے شش جہت نگران و خموش ہوں
نہ پہنچے کیوں ترے قدموں سے تا سرِ دامن
نگاہِ بیخودیِ شوق بھی تماشا ہے
عجب ہے دست درازی کفن سے دستِ جنوں
نمودِ عشق ہے بیگانگی کے پردے میں

شیریں کا رنج ماتمِ فرہاد کیا کروں
وہ سنتے ہی نہیں دلِ ناشاد کیا کروں
ہردم جو سامنے ہو اُسے یاد کیا کروں
مرا غبار مری آہِ نارسا تو نہیں
حجابِ چشم و دل اندازِ ماسوا تو نہیں
لباسِ مردہ ہے یہ زندہ کی قبا تو نہیں
وہ مجھ سے اور میں اُس شوخ سے جدا تو نہیں

ہوگیا غرق مرے گریہ سے بن پانی میں
شدتِ گریہ میں وہ کیا مری فریاد سنیں
خستہ ہے کشمکشِ دہر سے ہر ایک وجود
ہوگیا خاک مگر جوشِ صفائے دل سے
عرقِ شرم سے تر ہیں گلِ عارض اُن کے
نہیں گلشن نہ سہی زخمِ جگر دیکھتے ہیں

تیرتے پھرتے ہیں مچھلی سے ہرن پانی میں
قابلِ فہم نہیں صوت و سخن پانی میں
موج کے نام سے پڑتے ہیں شکن پانی میں
صورتِ آئینہ ہوں میں ہمہ تن پانی میں
جلوہ گر آب چمن میں ہے چمن پانی میں
ہم خزاں میں بھی بہارِ گلِ تر دیکھتے ہیں

غیر مطبوعہ

پردۂ غنچہ میں ہوں یا وہ نقابِ گل میں
آنکھ ہر رنگ میں اربابِ نظر دیکھتے ہیں

امتحاں بزم میں ٹھیرا ہے جگرداری کا
دلِ بیتاب سنبھل جا وہ اِدھر دیکھتے ہیں

لاش پر میری وہ حسرت سے ہیں شکلِ تصویر
بولتے کچھ نہیں حیرت سے مگر دیکھتے ہیں

[illegible]

بس اسی پر ہے مدارِ انجمن
شمعِ کشتہ یادگارِ انجمن

شکلِ گل آنکھوں نے پائی تازگی
تیرا جلوہ ہے بہارِ انجمن

یار مہماں شوق و ارماں میزباں
اور دل ہے پردہ دارِ انجمن

وائے حسرت دل میں نقشہ رہگیا
مٹگئے نقش و نگارِ انجمن

بزم سے جانا ہے شکلِ برہمی
اُسکا آنا ہے قرارِ انجمن

[illegible]

تم مضطرب ایسے ہوئے جاتے ہو کہوں کیا
آئی ہے عدو کی خبر ایسی کہ نہ پوچھو

ہیں دمِ نزع بھی لطارشے محروم رہوں
اسقدر رنجِ دئی شوق نہ کرم مجکو

جوشِ وحشت سے رہا ہیں تمھارے دلمیں
کیا گلہ تمسے اگر بھول گئے تم مجکو

کھینچو نہ مرے سینے سے یوں تیر کو دیکھو
بیدل نہ کرو بسملِ دلگیر کو دیکھو!

ہاں ذبح کرو شوق سے گھبراؤ نہ اتنا
زانو پہ نہ رکھو سرِ نخچیر کو دیکھو!

بدگمانی یار کے حق میں دلِ مہجور حیف
وہ خدا ناکردہ کیوں اغیار کی محفل میں ہو

کیا اِس سے فزوں خوبیٔ جنت کا گماں ہو
یا باغ ہو، یا میکدہ یا کوئے بتاں ہو

یہیں ملجاؤنگا میں خاک میں نقشِ قدم ہوکر
نچھوڑا ہے نچھوڑونگا تمہارے آستانے کو

یہ اربابِ طلب کیا بیخبر ہیں ذوقِ وحدت سے
معاذ اللہ بیگانہ سمجھتے ہیں یگانے کو

ادائے شوخ جب دِل چھین کر آزردہ کرتی ہے
نگاہِ صلح جو اُٹھتی ہے عاشق کے منانے کو

ڈوبتا ہے سفینۂ امید
ناخدا کون ہے خدا سے کہو

آرزو ہے کہ اپنا کہہ لیجے
گو کسی لفظ نا روا سے کہو

تم سے کیا خوش ہو کوئی عرضِ تمنا کر کے
حسرتیں خاک میں ملجاتی ہیں انکار کے ساتھ

ہم اٹھا جو تیری بزم سے سوئے عدم گیا	مطبوعہ	عاشق کو دیکھ اور چراغ سحر کو دیکھ

کیوں سوئے بوالہوس یہ نگاہیں ہیں متصل
سوتا ہوں میں نثار ذرا تو ادھر کو دیکھ

اسیری میں تباہی رونق کاشانہ ہو جائے
قفس ہی نالوں سے جلا کر چراغ خانہ ہو جائے

تغافل سازگار درد اہل شوق کیا ہوگا
ادا سے وہ فریب ایسا کہ دل دیوانہ ہو جائے

فغاں کرتے ہوئے جا پہنچو اسکی بزم عشرت میں
کبھی تو اے زکی یہ شوخی رندانہ ہو جائے

کہو وہاں سے کوئی کیا مراد دل پائے
جہاں زباں نہ ہلے عرض مدعا کے لئے

چلے ہیں عرض وفا کو ہم اور سب کہتے ہیں
گرہ میں ایک دل اس کاکل دوتا کے لئے

زکی ہم اپنے دل دیں کسیکو کیوں دیتے
بتوں نے حسن کے جلوے دکھا دکھا کے لئے

رہائی میں مجھے بیجا نہیں حسرت اسیری کی
سمجھ لیتے اگر اپنا تو وہ آزاد کیوں کرتے

ثبات وضع پر اہل وفا بھی مرتے ہیں
نثار عشق رہے جاں کا زیاں ہو جائے

نہ پوچھو مجمع اعدا میں کون ہے جانباز
کھنچیں نہ کھینچ تو خنجر کہ امتحان ہو جائے

تمہارا ذکر نہ ہو روداد شوق نہ ہو
تو یہ بھی کیوں نہ کہو کوئی بے زبان ہو جائے

جنون عشق بھی ہے علم حکمت ورنہ کیا معنی
جو دیوانہ ترا ہو جائے وہ فرزانہ ہو جائے

نفس نفس ہے نسیم وفا محرک شوق
یہ وہ مزا ہے جسے ذوق جاوداں کہئے

چاک داماں کیجئے ٹکڑے گریباں کیجئے
کچھ تو آخر چارۂ طبع پریشاں چاہیئے

ہم اسکا ہر شیوہ زبس ہوش ربا ہوتا ہے
ناز بیجا بھی حسینوں کا بجا ہوتا ہے

چشم ظاہر میں تو دل آبلہ سا ہوتا ہے
جزو و کل راز جہاں اس میں چھپا ہوتا ہے

قتل ہو کر بھی تو رہتے ہیں پریشاں عشاق
سر جدا، ہاتھ جدا، پاؤں جدا ہوتا ہے

دم گھٹا جاتا ہے کب تک سہے کوئی یہ عذاب
جل بھی چک لے دل پرسوز دھواں ہوتا ہے

کیا بحث ہے اس بخت کو کیا کہئے میں یارب
نالہ بھی ہے لب پر تو ہے محروم اثر سے

تیر نگہ یار کی امداد سے شوخی
بیٹھا ہی تھا دل میں کہ ہوا پار جگر سے

فرمانِ شہِ حسن کی ہے داغِ جگر مہر
جاگیر محبت بھی عطائے سندی ہے

رسوا کو تیرے فائدہ کیا ضبطِ آہ سے
غم کی طرح برستی ہے حسرت نگاہ سے

ڈالا جو دل میں تھا وہی منصور نے کہا
گویا یہ بازگشت صدا کی ہے چاہ سے

دل ملگیا جو خاک میں افسوس کیا کریں
ہم اور ڈھونڈھینگے تری جلوہ گاہ سے

محشر میں جاؤں کیا کہ بتایا نہ جائیگا
قاتل کا نام پوچھتے ہیں دادخواہ سے

از روئے فطرت ایک ہیں انسان درد وغم
دل داغ سے الگ نہ جدا دم ہے آہ سے

دی تھی حیرت تو ہمیں آئینہ پیدا کرتے
کہ انہیں دیکھتے ہم وہ ہمیں دیکھا کرتے

یہ کہنا ننگ ہے اپنا کہ مرتے ہیں محبت میں
وہ اظہارِ وفا کیا جس میں شکوہ یار کا نکلے

دل ہے ناچیز انھیں توڑ کے کیا یاد رہے
یہ تو شیشہ بھی نہیں ہے کہ صدا یاد رہے

باغ میں بلبل نے پھر تنکے لیے
خانماں برباد کے دن کے لیے

یار سے ہوتا ہے دوری میں بھی وصل
قرب ہے یہ اہلِ باطن کے لیے

بت وہ کافر ہیں کہ انکا جلوہ ہے
نورِ ایماں قلبِ مومن کے لیے

کہاں ہے پیچ سرِ مغرور پامال
تمھاری زلف قدموں پر پڑی ہے

وہ کیونکہ آرام سے رہیگا جنا میں کیا خاک جی لگیگا
نظر میں جسکی سمائی ہوگی بہار نقش و نگار دہلی

آہ کی دل کھولکر کس دل گرفتہ نے کہ وہ
بنا ریوں کھوئے ہوئے پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

راضی رہے جورِ دوست پر بھی
عاشق نہ تھے ہم گویا ولی تھے

وصفِ دہن و کمر نہ پوچھو
صانع کے یہ نکتہ خفی تھے

صد شکر قتیل دوستی تھے
ورنہ ہم ننگِ زندگی تھے

حاصل عمر وہ دم ہے جس میں
دیکھ لیں صورتِ زیبا کوئی

اللہ رے نازِ حسن تری خودستائیاں
جاں اور نذرِ تبسم مگر نہ لی

کاہشِ انتظار میں جینا!
ایک وعدے نے جانفزائی کی

تماشا عام ہوگا اور کیفِ بیخودی ارزاں
عجب کیا ہے قیامت صحبتِ رندانہ ہوجائے

ہم ملکے کسی اور سے دل شاد کرینگے
جو کچھ نہ کیا تھا ستم ایجاد کرینگے

میں دل میں نہیں ہوں تو بھلاتے ہیں وہ کسکو
ہے چاہ مری جب نہ مجھے یاد کرینگے

کر دیکھیں گے نالہ بھی وہ آئیں کہ نہ آئیں
تیرا بھی کہا اے دلِ ناشاد کرینگے

غیر مطبوعہ

جلنے کو شمعِ غیر کی محفل میں آگئی
اے خانماں خراب یہ کیا دل میں آگئی

شوخی کی خو جو قاتلِ سفاک تجھ میں تھی
بنکر وہی تپش وہی ترے بسمل میں آگئی

راہِ وفا کے کرب کو کیا جانے کوہکن
اسکو تو موت پہلی ہی منزل میں آگئی

محرومیوں نے ذوقِ تمنا مٹا دیا
جو آرزو تھی حسرتِ حاصل میں آگئی

خانہ خراب عشق کا اللہ رے جذبِ شوق
لیلی بھی سیرِ دشت کو محمل میں آگئی

جاتے ہو خوار ہونیکو پھر اسکے کوچے میں
بیٹھے بٹھائے کیا یہ زکی دل میں آگئی

مرا نام و نشاں قائم ترے نام و نشاں تک ہے
وہ عمرِ جاوداں ہے تو یہ عمرِ جاوداں تک ہے

ہمیشہ سے نظر افروز عرش و لامکاں تک ہے
خدا جانے کہ اسکا جلوہ کب سے ہے کہاں تک ہے

بہارِ باغِ ہستی وقفہ ہے رنگِ تغیر کا
شبِ آرایشِ بزمِ چمن صبحِ خزاں تک ہے

ٹھہرنا کیسا محمل کا؟ کہاں دیدار لیلی کا
یہ سب سودائے مجنوں التفاتِ ساربان تک ہے

پہنچنے کے نہیں آثار گم ہے جادۂ منزل
اسیرِ دامِ حیرانی غبارِ کارواں تک ہے

خموشی میری ہمدم ہے کہا کسنے سنا کسنے
ترا رازِ محبت بدگماں میری زباں تک ہے

ہماری آرزوؤں کا زکی جب کچھ نہیں پایاں
تو کیا پوچھیں کہ حد اسکے تغافل کی کہاں تک ہے

دلکش انداز خموشی اور ادا تقریر کی
واہ کیا بات آپکی اور آپ کی تصویر کی

ذوقِ قاتل سے بڑھا شوقِ شہیدانِ وفا
مرحبا میں گم ہوئی یارب صدا تکبیر کی

آفرینش سبکہ دمسازِ شکستِ رنگ تھی
بنتے بنتے اڑ گئی رنگت مری تصویر کی

وصلِ دشمن کیوں نہ ہو ہوکر رہے گا جو کہا
اسکی ضد تحریر ہے گویا مری تقدیر کی

وصل کیسا آخر اُسکا پھل ہوا قطع حیات
آرزوئے دل میں بُرش تھی تری شمشیر کی

بارک اللہ مرحبا اے شیوۂ حسنِ سلوک
اِنکو آمرزش کی عادت ہمکو خُو تقصیر کی

حسنِ یوسف کو کیا شوقِ زلیخائے عزیز
خواب سے وقت زیادہ ہوگئی تعبیر کی

جسکو دیکھا بندۂ طرزِ تغافل کرلیا
بے نیازی سے اُسے حاجت نہیں تسخیر کی

زکی

زکی - مولوی سیّد زکی حسین صاحب ملازم محکمۂ کلکٹری ضلع رائے بریلی - صاف شستہ عاشقانہ شعر کہتے ہیں، بندش اور نشست الفاظ بھی درست ہے اِس فن سے خاصہ لگاؤ معلوم ہوتا ہے حالات باوجود تجسّس دستیاب نہ ہوسکے - چند غزلوں کا انتخاب درج کیا جاتا ہے -

شکوہ کریں ہم کسکا کہ خود اُنس ہمارا
صیّاد کے پنجے سے نکلنے نہیں دیتا

صیّاد ذکرِ باغ نہ آئے زبان پر
بن جائیگی قفس میں اسیروں کی جان پر

رخصت ہوئی بہار کے ہمراہ دختِ رز
خاک اُڑ رہی ہے پیرِ مغاں کی دکان پر

جھانک کر دیکھ تو مجنوں نہ کہیں ہو لیلی
دوڑتا آتا ہے کوئی پسِ محمل خاموش

شوق سے کیجیے باتیں میں اُٹھا جاتا ہوں
کیوں رہے میرے سبب آپکی محفل خاموش

شدّتِ قید نہ کم ہوگی تمھارے غل سے
بس خدا کے لیے اے طوق و سلاسل خاموش

جشن کر لو شمعو دنیا میں جا ہو جسقدر
قبر میں پھر یہ سرورِ عیش کی محفل کہاں

شبِ فرقت میں بھلا نیند کا آنا کیسا؟
موت ہی بن کے اب آئیگی اگر آئی بھی

صحبتیں جن سے تھیں دن رات کی یکجائی بھی
اب وہ کرتے نہیں اقرارِ شناسائی بھی

زاہد بھی مرے ساتھ ہوا حشر میں رسوا
وہ آگ لگائی مرے دامن کی تری نے

گلشن میں بہار آئی ہو پرواہ ہے قسمت
رکھا ہے قفس میں ہمیں بے بال و پری نے

بیوجہ نہیں گل ہیں عنادل سے مکدّر
کچھ کان میں پھونکا ہے نسیمِ سحری نے

بجھوا دی سرِ قبر مری آکے کسی نے
گر شمع جلائی بھی ترس کھا کے کسی نے

جا نیکو گئے سیکڑوں ہی قافلہ لیکن
دی ملکِ عدم کی نہ خبر آکے کسی نے

منظور جو اس پردے میں تھا میرا جلانا | بھجوایا ہے خط غیر سے لکھوا کے کسی نے
اتنا جو سُنا بوسۂ لب اسکی ہے قیمت | دل پھینکدیا ہاتھ سے جھنجھلا کے کسی نے
کیا حال ہے جیتے ہو کہ مرتے ہو زکی تم | اتنا بھی تو پوچھا نہ کبھی آ کے کسی نے

زکی

زکی ۔ جناب میرن صاحب زکی، میرزا سلیمان قدر مرحوم کے مشاعرہ ۱۳۱۰ھ کی ایک غزل کا انتخاب درج ذیل ہے ۔

کبھی ہوگی کسیکی آرزوئے دل کہیں نکلی | نہ اپنی ایک بھی حسرت تہِ چرخِ بریں نکلی
نہ مُردے کو بھی تیرے دور میں دو گز زمیں نکلی | ابھی حسرت تری اے چرخ نکلی یا نہیں نکلی
وہ آئے دیکھنے کو جبکہ اپنا دم نکلتا تھا | ہماری حسرتِ دیدار وقتِ واپسیں نکلی

زکی

زکی منشی عبد الغفور خان متوطن گیا مئی ملازم لشکر نہایت معمولی شاعر ہیں مگر دیوان شائع کردیا ہے

خلق میں ایک ہوا ایک سے بڑھ کر پیدا | نہوا پر مرے محبوب کا ہمسر پیدا
عشاق سینکڑوں ہیں جہاں میں مگر زکی | عاشق مزاج ہنسا کہاں دوسرا ہوا
بوسے کے بدلے ملینے بہت کھائیں گالیاں | ادنیٰ سی بات پر ہوئی تکرار بے سبب
اک نگاہِ کرم ادھر کیجے | میں ہوں دم بھر کا میہماں افسوس

زندہ

زندہ ۔ منشی محمد یحییٰ ساکن گلاؤٹھی ضلع بلند شہر تلمیذ کا حال معلوم نہ ہوا یہ چند شعر انکے ہیں

ظلم حدِ ظلم سے بھی بڑھ گیا | انپر انکو رحم کھانا چاہیئے
فصلِ گل ہے اور گھٹا چھائی ہوئی | آجکل پینا پلانا چاہیئے
یوں کیا زندہ کو زندہ دیکھکر | خاک میں انکو ملانا چاہیئے

زندہ

زندہ ۔ منشی زین الدین اورنگ آبادی تلمیذ حضرت ثاقب بدایونی چند شعر حاضر ہیں

کہاں میں اور کہاں ہنگامۂ روزِ جزا لیکن | محبت ان بتوں کی کھینچکر پیشِ خدا لائی
رہیگا ایک بھی تختہ نہ ثابت اپنے مدفن کا | ہماری بیقراری زنگ گر بعدِ فنا لائی
اٹھا خنجر لگا اک ہاتھ کر دے فیصلہ قاتل | کہ بے مر مر کے مقتل میں مجھے میری قضا لائی

زوّار

زوّار - جناب سید زوار حسین صاحب الہ آبادی تلمیذ جناب ظہیر دہلوی۔ پندرہ بیس برس سے شعر کہتے ہیں شاید حیدرآباد دکن میں بھی رہے ہیں۔ کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

ہماری آنکھوں میں رہکر ہمیں سے پردہ ہے
رقیب سامنے آئے تو کچھ حجاب نہیں

سوالِ بوسۂ لب پر وہ نہیسکے کہتے ہیں
یہ وہ سوال ہے جسکا کوئی جواب نہیں

گرے جو طور پہ موسیٰ تو طور خاک ہوا
سنبھال برقِ تجلی کہ مجھ میں تاب نہیں

اُنہیں سے لونگا فصاحت کی داد اے زوّار
جو کہہ رہے ہیں کہ میری زبان ہے اُردو

کل تو یہ مشہور تھا مہندی لگی ہے پاؤں میں
آج سنتا ہوں اُنہیں میرا لہو درکار ہے

زور

زور - منشی میر تراب علی زور صیغہ دار دفتر خزانہ حیدرآباد۔ حضرت جلال لکھنوی سے تلمذ تھا، زبان فصیح اور طرز بیان شگفتہ ہے۔ غزلیات بہم رسیدہ کا انتخاب درج ذیل ہے

زلفوں کے اُلجھنے سے پریشان بہت ہیں
آئینہ جو چُوری گیا حیران بہت ہیں

گردن سے ٹلا بوجھ سبکدوش ہُوا میں
جانباز کے سر پر ترے احسان بہت ہیں

نہیں سکتے رات اپنے گھر میں تم نظریں چراتے ہو
ہمارے چور اندر دیدۂ روشن کے بیٹھے ہیں

حیا و شرم کا پردہ اُٹھا کر دیکھئے تو ظالم
وہ باندھے ٹکٹکی کشتے تری چتوں کے بیٹھے ہیں

شبِ وصال نے آنکھوں میں کھینچ لی تصویر
کسی کے ناز سے دامن اُٹھا کے آنے کی

گئی نہ یاد شہیدانِ ناز کی دل سے
وہ قتل کو ترے دامن اُٹھا کے آنے کی

لگی ہیں خاک نشینوں کی آنکھیں سوئے فلک
خبر ہے بام پہ اُس مہ لقا کے آنے کی

ملازمانِ جناب جلال تک اے زور
کمال دل میں تمنا ہے جا کے آنے کی

ہے تجکو شب و روز عبث یاد کسیکی
پرواہ بھی ہے اُسکو دلِ ناشاد کسیکی

وہ بام پہ فرماتے ہیں نالہ میرا سنکر
لو عرش پہ آنے لگی فریاد کسیکی

زہیر

زہیر - مولوی آغا حسین صاحب کڑہ مانکپوری شاگرد مشتاق لکھنوی۔ علمی استعداد خاصی ہے اور مشق بھی عمری نہیں۔ یہ چند شعر انکے نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں۔

عاشقو تم میں اُسکو ایجان ہوگئی شاہی نصیب
جسکو دم بھر مل گیا سایہ تری دیوار کا

فصل وہ برسات کی وہ بادہ نوشی کی بہار
گھر کے وہ آنا چمن پر ابرِ دریا بار کا

ہے سراسیمہ تلاشِ یوسفِ گم گشتہ میں
لو زلیخا کو نیا سودا ہوا بازار کا

کیا تھا پرزے پرزے اسنے جو دامن گریباں کا
پڑا لپکا اُسی سے ہاتھ کو چاکِ گریباں کا

جنوں کے جوش میں میں نے نظر کی جب سوئے گردوں
تو مجکو کہکشاں پر شک ہوا چاکِ گریباں کا

آجکل مہماں مرا وہ حور وش جانانہ ہے
غیرتِ فردوس رونق میں مرا کاشانہ ہے

اِس طرح آیا ہے زاہد محفلِ رنداں میں آج
شیشۂ مے ہے بغل میں ہاتھ میں پیمانہ ہے

بلبلیں عاشق ہیں اُس گل پر تو گلچیں ہے نثار
غیر اس گلزار میں اِک سبزۂ بیگانہ ہے

خوانِ بخشش پر ترے موعود ہیں جن و بشر
یہاں سبھی مہمان ہیں اک تو ہی صاحبخانہ ہے

زہیر

زہیر - قاضی عبدالحق صاحب بریلی کے اک خوش فکر سخن گو ہیں حالات کے لیئے بار بار لکھا مگر دستیاب نہو سکے کچھ کلام ملا اُس کا انتخاب درج کیا جاتا ہے -

آپ بن ٹھن کے جو پھر گھر سے چلے ہیں باہر
آج کیا حشر بپا کرنے کی پھر ٹھانی ہے

آپنے دوست جو دشمن کو سمجھ رکھا ہے
مہرباں یہ بھی تو اک آپ کی نادانی ہے

میں کسی اور سے اور آپ کا شکوہ کرتا
بندہ پرور یہ فقط غیر کی لسانی ہے

کھائے جا رنج زہیر اور پیئے جا آنسو
تیری قسمت کا یہی دانہ یہی پانی ہے

عنایت تو ہمیشہ ہی زیادہ اُسپہ ہوتی تھی
جفا بھی آج آپنے میرے اُوپر غیر سے کم کی

ہماری آنکھ سے باندھا تو ہی بیرا بنے لیکن
دھوئیں اُڑ جائینگے جسوقت بجلی آہ کی چمکی

ہماری یاد بھی اے ہمنشیں اُنکو دلا دینا
اگر مہلت ملی غیروں کی باتوں سے کوئی دم کی

زہیر

زہیر - سید قلندر پیران مدرس مدرسۂ چنیاپٹن علاقہ ریاست میسور میسور جیسے دُور اُفتادہ مقام پر کسی کا اُردو شعر گوئی کیطرف ملتفت ہونا بھی بڑی بات ہے - چند غزلیں نظر سے گزریں جو کثرت سے زبان کی غلطیوں سے مملو تھیں صرف یہ چند شعر قابل درج سمجھے گئے

شعلے بھڑک رہے ہیں مرے جسمِ زار میں | آتش لگی ہوئی ہے دلِ بیقرار میں
چہرہ نظر جو آیا کبھی زلفِ یار میں | بجلی تڑپ کے رہ گئی ابرِ بہار میں
اب مرغِ دلکو سیرِ چمن کی ہوس نہیں | وہ پھول ہیں کھلے جگرِ داغدار میں
وہ شمع رو جو قبر پہ آنسو بہا گیا | لاکھوں چراغ ہوگئے روشن مزار میں

زیب

زیب - مرزا جمال الدین عرف میرزا کلن زیب، اولاد امجاد عالمگیر ثانی۔ شاگرد ذوق مرحوم۔ دارِ فانی سے رحلت کئے عرصہ ہوا۔ چند شعر یادگار ہیں۔

لہو میں بھر کے جو دامن کو اپنے یار آیا | یقین ہے آج کسی بیگنہ کو مار آیا
بعد اک عمر لگی آنکھ ذرا سونے دے | نکرے اے شورِ قیامت ابھی بیدار مجھے
زندگی دیکھئے ہو ہاتھ سے دسکے کیونکر | اسکے آتے ہیں نظر اور ہی اطوار مجھے

زیب

زیب - عالیجناب راجہ چھنولال بہادر زیب مرحوم حیدرآباد کے نامی امیر راجہ راجان راجہ شیوراج بہادر کے اعزائے قریبہ میں سے تھے اور خود بھی عرصے تک دفتر بخشی گری دکن میں سررشتہ دار رہے کچھ دنوں نواب اقتدار جنگ بہادر اور نواب نصرت جنگ بہادر کی سرکار میں مختار بھی رہے تھے، فنِ سخن کے دلدادہ اور سخنوروں کے بڑے قدردان تھے۔ آپکا دیوان رائے سوامی پرشاد نے چھپوادیا ہے اس کا انتخاب حیطۂ تحریر میں آیا۔ کوئی خاص بات قابلِ ذکر انکے کلام میں نہیں ہے۔

کیا حلاوت اٹھائی شیریں نے | عشق میں کوہکن نے کیا دیکھا
رہا زیب تا صبح اختر شمار | سرِ شام ٹھیرا تھا آنا ترا
خستہ و آشفتہ و آوارہ و رسوا کیا | حضرتِ عشق آپنے جو کچھ کیا اچھا کیا
گھر کیا کرتے تھے ہر اک دل میں تصویرِ بتاں | آئینہ نے اب تمہارے دل میں گھر پیدا کیا
تیغ کے ہیں جگر پہ وار بہت | تیر دل کے ہوئے ہیں پار بہت
دیدہ و دل کی آبیاری سے | نخلِ غم اسکے لایا بار بہت

کم ملے گا مگر کوئی مجھ سا — گرچہ تم کو ملیں گے یار بہت

حسن پر اپنے خود ہوئے مفتوں — آئینہ سے ہو تم دو چار بہت

کیا کروں تدبیر اب ملے ہمنشیں — یار روٹھا ہے مناؤں کس طرح

بندۂ بت بنا دیا ہمکو — ہے نرالی تری خدائی عشق

تیرے دامن سے آلگا ہے غریب — زیب کی کر نہ جگ ہنسائی عشق

نوکِ مژگاں پہ تُل رہے ہیں اشک — اب ہے انکا سنبھالنا مشکل

اپنے بختِ زبوں کو کیا کیجے — شک نہیں آپکی مہربانی میں

زلفِ پرخم پہ دل وجاں سے فدا ہوتا ہوں — جانکر آپ گرفتارِ بلا ہوتا ہوں

زیبا

زیبا۔ مرزا بندہ علیخاں زیبا لکھنوی ۔ نواب اشرف الدولہ شریف الملک نواب رمضان علیخاں کے پوتے اور نواب ذازش علیخاں کے بیٹے تھے خان علامہ نواب تفضل حسین خان اجداد مادری میں تھے سنہ ۱۲۴۸ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور صغر سنی میں ہی کربلا و نجف کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ابھی تحصیل علمی کی تکمیل نہوئی تھی کہ انقلابِ سلطنت اودھ ہوگیا۔ اور دلجمعی و اطمینان کا سلسلہ منقطع۔ پھر بھی اپنے دلی شوق سے عربی۔ فارسی اور رمل وغیرہ میں خاصی استعداد فراہم کرلی اور خواجہ آتش کے شاگرد نواب محمد حسن خان شیدا سے فن سخن میں بہرہ ور ہوئے نہایت شریف اور خلیق صاف دل پاک طینت انسان تھے کبر غرور نام کو نتھا مشاعروں میں اکثر ہم طرح غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ عیوبِ شاعری سے انکا کلام پاک ہے۔ فکر معاش سے بدرجۂ اوسط فارغ البال تھے پچاس برس سے کچھ زیادہ عمر پاکر سنہ ۱۲۹۴ھ میں انتقال کیا۔ حضرت جلال نے تاریخ وفات کہی سہ زیبا شد زیب بہشت برین۔ زبان صاف شستہ، بندشِ الفاظ و طرز بیان دلکش و پسندیدہ، اپنے ہمعصر شعرا میں وقعت و اعزاز کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ سید عاشق حسین عاشق اُنکے شاگرد نے دیوان موسوم بہ "مرقع زیبا" مرتب کرکے چھپوا دیا ہے

جب تک اُسنے زلف میں شانہ کیا — آئینہ حیرت سے مُنہ دیکھا کیا

مر گئے ہم عشق کا آزار اچھا ہو گیا / لیجئے آج آپ کا بیمار اچھا ہو گیا

تازیانے بیکسوں کی آہ کے اتنے پڑے / جسم نیلا ہو گیا سب آسمان پیر کا

نزاکت نے اک جبر خوبی کے مارا / کفن چاہیئے مجکو آب رواں کا

جب اُسنے کہتا ہوں اچھا کیا تباہ مجھے / تو ہنس کے کہتے ہیں جو کچھ کیا خدا نے کیا

رہا یہ حال ایجان شوق دید و بوسہ لب میں / کبھی آنکھوں میں دم آیا کبھی مُنہ کو جگر آیا

تُو نے کہیں دیکھا تو نہیں اے نگہ ناز / مدت سے ہمارا دل مضطر نہیں ملتا

جسکو نیاز تم سے ہوا بے نیاز تھا / جسنے جھکایا پاؤں پہ سر سرفراز تھا

انداز یہ نہ آتے جو آتا نہ دل مرا / کمسن ادا یہ آپ میں تھی کب یہ ناز تھا

آپ کا بیمار الفت ہو گیا وقف قضا / اے مسیحا بس یہی اپنی ادا پر ناز تھا

تسکین کیسی اور وہ بے تاب کر گئے / مجھکو دلاسے دیکے نجاتے تو خوب تھا

آج اُسے پھر مرا دھیان اور دل ناشاد آیا / اے مبارک ہو کوئی اور ستم یاد آیا

طفل کو ہے یہی ہنگام ولادت رونا / ہائے میں کیوں طرف عالم ایجاد آیا

بیمار محبت کو سنبھلتے نہیں دیکھا / بے جان لیئے موت کو ٹلتے نہیں دیکھا

فقرے ہیں ترے بس میں مرے فرق ہے اتنا / چلبلاتا ہے وہ اور اسے چلتے نہیں دیکھا

کس ناز سے چلتے ہو لبھاتے ہوئے دلکو / اِس طرح تو جادو کو بھی چلتے نہیں دیکھا

کہے دیتی ہے چال اٹکھیلیوں کی / لیئے جاتا ہے دل وہ دلبر کسی کا

ہوئے ہونگے برہم ضرور آئینہ سے / نہ توڑا مگر دل سمجھکر کسی کا

وہ دن لائے خالق میں اسد کے قربان / مرا حلق ہو اور خنجر کسی کا

اُمید وصل پر اُنکے ستم کیا کیا اُٹھائے ہیں / مقدر آزمائی ہے محبت آزمائی ہیں

بہت ملتے مگر ان ترچھی نظر والوں سے اے زیبا / کہیں یہ راست بازی ہی نجانے کج ادائی ہیں

ہجر میں لاکے خیال رخ جاناں دل میں / شام غم کو شب وصلت کی سحر کرتے ہیں

اپنی خاموشی نے کھلوائیں زبانیں خلق کی
میرے چپ رہنے کے چرچے جا بجا ہونے لگے

آپ سے دل پھیر لینگے ہم سمجھیے تو ذرا
دل لگی میں آپ تو صاحب خفا ہونے لگے

یہ بھی غیرت تمھیں آئی نہیں ای رشک مسیح
جاں بلب عاشق صادق ہو تمھارے ہوتے

ہوں وہ بے جرم اگر قتل کروگے مجکو
تیغ بھی دیکھ کے رہجائیگی صورت میری

دمِ وصلِ صنم فرطِ خوشی سے دم نکلتا ہے
زمانے میں کسیکا یوں بھی ارماں کم نکلتا ہے

مسرت سے کبھی ہوتا ہے تو بھی آپ سے باہر
کبھی تیرا بھی ارمان ای دل پرغم نکلتا ہے

کوئے جاناں سے کیا جب قصد جانیکے لیئے
ہوک اک اٹھی کلیجے میں بٹھانے کے لیئے

منکرِ رحمت سزاوارِ سقر ہے زاہد!
ہم نجائیں گے تو ہے باغِ جنان کس کے لیئے

ہم تو اے سفاک کشتہ ابرو و مژگاں کے ہیں
تیغ کسکے واسطے ہے اور سناں کس کے لیئے

جو تیرِ ناز کسی کا کبھی ادہر کو چلے
یہ آرزو ہے کہ لیتا ہوا جگر کو چلے

تھا کوئی نہ پسِ دفن فاتحہ پڑھ کے
اکیلا چھوڑ کے سب اپنے اپنے گھر کو چلے

کسی کے دلمیں نہ پائی جگہ جو نالوں نے
تو آسماں کیطرف ڈھونڈنے اثر کو چلے

کہیے انصاف سے مرجانے کی جا ہے کہ نہیں
قتل کا حکم ہوا اوروں کو ہمارے آگے

عشقِ جاناں سے ہی قدر آپکی ای حضرتِ دل
جان سے بڑھ کے کبھی آپ نہ پیارے ہوتے

چشمِ مخمور کسیکی مجھے یاد آتی ہے
خود بخود آنکھ مری بند ہوئی جاتی ہے

شب وعدہ یہ رہا کرتی ہیں باتیں دل سے
دیکھیں یار آتا ہے پہلے کہ قضا آتی ہے

غیر کے ہاتھ نہ بھیجیں طلبِ دل کا پیام
مجھ سے خود کہتے ہوئے کیا انھیں شرم آتی ہے

کششِ مرگ کی اچھی یہ زبردستی ہے
کوئے قاتل ہیں مجھے کھینچے لیئے جاتی ہے

کیا جو عہدِ وفا اُن سے زندگی بھر کا
تو ہنسکے بولے اگر زندگی وفا نکرے

وہ مجھ کو دیکھکے ترچھی نگہ سے کہتے ہیں
یہ تیر وہ ہے نشانہ پہ جو خطا نہ کرے

دل سے اُس نرگسِ فتاں کے اشارے ہیں یہی
جو ہماری طرف آئے وہ سمجھ کر آئے

ہے وصل کے بوسے کا تقاضا نہیں کرتے
ہم بات کوئی آپ سے بیجا نہیں کرتے

زیبا

زیبا منشی محمد قاسم زیبا دہلوی داستان گو خلف میر کاظم علی داستان گو تلمیذ راسخ دہلوی ۲۸-۲۹ برس کی عمر اور حیدرآباد میں سکونت پذیر ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

پاؤں پر پھر حم کے بسمل نے جب سر رکھ دیا
بلبے قسمت ہاتھ سے قاتل نے خنجر رکھ دیا

ڈھنگ سیکھا برق نے آہِ دلِ ناشاد کا
رنگ اڑایا شور محشر نے مری فریاد کا

اشک گو لختِ جگر نور بصر ہیں لیکن
بری اولاد کو نظروں سے گرا دیتے ہیں

ہے نمکپاش مرے زخموں پہ اور کہتا ہے
آج الفت کا مزا تجکو چکھا دیتے ہیں

کریں ہم اس خلش کا درد کا کس سے گلہ یارب
کہ اپنا دل ہی جب پہلو میں کانٹا سا کھٹکتا ہو

یہ بت بیباک ہیں سفاک ہیں انکو نہ پروا ہو
کسی کی جان جائے یا کسی کا دم نکلتا ہو

اللہ رے پردہ کہ مری نعش پہ ہے ہے
رونے کو بھی وہ آئے تو منہ ڈھانپ کر آئے

زیبا

زیبا منشی عبدالمجید خان زیبا انکے والد سواؤلی ضلع بندیل کھنڈ میں وکیل تھے وہیں نومبر ۱۸۸۱ع میں یہ پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۰ع میں علیگڈھ کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ کوٹ فتح پور ہسوہ کے رہنے والے ہیں۔ غضب کے ذہین ہیں آجکل سشن جج رائے بریلی کی عدالت میں سررشتہ دار ہیں۔ احسن مارہروی کی صلاح سے چند غزلیں مضطر خیرآبادی کو دکھائیں پھر حضرت شوق لکھنوی اور آخر میں حضرت شہیر مچھلی شہری سے تلمذ اختیار کیا بڑے پرگو اور موزوں طبع ہیں عرصہ ہوا کچھ کلام بھیجا تھا اُس کا انتخاب درج ذیل ہے۔

خریدار اسکے ہونگے تیرے عاشق بیچکر دل کو
گراں ہرگز تری اُلفت کا سودا ہو نہیں سکتا

ابھی دیکھو ابھی دیکھا کہاں ہے
خیالِ یار پر سو بار صدقے

نتیجہ دشمنوں کی دوستی کا
کہ یہ ساتھی ہے میری بیکسی کا

سب کچھ ملا جو بوسہ رخسار مل گیا
دنیا ملی جو وصل کا اقرار ہو گیا

وہ بوسہ مانگنے پہ مجھے دیتے ہیں سزا
فرماتے ہیں کہ جرم کا اقرار ہو گیا

گھٹ گئی ہے اسقدر تاب و توانِ اہلِ درد
ساتھ ہی اُف کے نکل جاتی ہے جانِ اہلِ درد

لب جاں بخش سے کیوں کوستے ہو
جیئں مر مر کے ہم آخر کہاں تک

نہ کچھ مسیح سے مطلب نہ کچھ طبیب سے کام
مرض مبغض کو مبغض کو دوا سمجھتے ہیں

جاؤں گلی سے اُٹھکے تمھاری میں کس لیئے
جنت میں کیا دھرا ہے وہاں جب تمہیں نہیں

شکوۂ ظلم نہیں جور کہ بیداد کریں
اپنے بھولے کو کسی طرح تو وہ یاد کریں

عشق میں دل گیا، ایمان گیا، جان گئی
کسے روئیں کسے پیٹیں کسے ہم یاد کریں

ایفاءِ وعدہ تم نہ کرو اس کا غم نہیں
جھوٹی قسم ہی میری تسلی کو کم نہیں

ایذ لے کوئے یار ہر ایک کو کہاں نصیب
زاہدا یہ عیش و راحتِ باغِ ارم نہیں

مجھ سے پردہ ہے تو کیوں چھپتے ہو نظروں میں مری
مجھ سے نفرت ہے تو کیوں گھر ہے تمہارا دل میں

نہوا پر نہوا وصل کسی صُحبت کا نصیب
ہائے افسوس رہی دل کی تمنا دل میں

اسقدر پاس تھا اُس پردہ نشین کا دل میں
اپنی آنکھوں سے بھی پنہاں اُسے رکھا دل میں

بیخود ایسا بھی نہوگا کوئی جیسا میں ہوں
آجتک مجکو نہ معلوم ہوا کیا میں ہوں

چھیڑ دیکھو کہ مری نعش پہ آئے تو کہا
بیمروت کہو اب کون ہے تم یا میں ہوں

ہائے بیمارِ محبت سے یہ کہنا اُن کا
تجکو کیا خوفِ اجل تیرا مسیحا میں ہوں

دل سے میرے ہے لڑی آنکی نگاہ
دیکھئے دل کرے یا ہم کیا کریں

عشق کا امتحان لیتے ہیں
اِس بہانے سے جان لیتے ہیں

رہرو تم سیر دیکھے جاؤ کچھ پوچھو نہ حال
کیوں گرے قدموں پہ ہم وہ سر کو ٹھکراتے ہیں کیوں

جراحت ہائے پنہاں کی سُنے تب داستان کوئی
دہانِ زخم میں جب تیغ کی رکھدے زبان کوئی

حرم میں، دیر میں، مسجد میں، دلمیں، چشمِ عاشق میں
کہاں رہتے ہو بتلاؤ کہیں ڈھونڈے کہاں کوئی

سند تو عشق کی ہم جان دیکے پاچکے زیبا
اُسے بھی پاس کرلیں اور اگر ہو امتحان کوئی

زیبا۔ مولوی عبدالمغنی ساکن بدایوں۔ صاف صاف عاشقانہ شعر خاصہ کہہ لیتے ہیں۔

زیبا

سنہ ۱۹۰۵ء میں اپنے استاد حضرت مضطر خیرآبادی کے پاس لشکر گوالیار میں مقیم تھے۔

تم اگر روز تصور میں نہ آیا کرتے
جینا پھر طالبِ دیدار کا مشکل ہوتا

دل جان بوجھکر تمہیں دینے سے فائدہ
دانستہ کوئی جان سے بیزار ہو تو کیوں

لاکھ اُلفت جتائیں ہم ان سے
وہ کہاں اعتبار کرتے ہیں

کوئی وعدہ وفا نہیں ہوتا
آپ وعدے ہزار کرتے ہیں

تمھیں کہو کہ گذر زمانہ بسر کا کیونکر ہو
تمھارے کوچے سے بچکر ہوا نکلتی ہے

جلوہ ترا اے پردہ نشیں تو ہی بتا دے
آنکھو نہیں ہیں ہے کہ مرے دل میں نہیں ہے

جز حسرتِ دیدار نہیں آنکھیں کچھ بھی
جز خواہشِ وصل اور ہوس دل میں نہیں ہے

آیئے بے پردہ اُسکی لاش پر
مُنہ چھپانا کیا شہیدِ ناز سے

ظلم اپنے طالبِ دیدار پر!
شرم اپنے عاشقِ جانباز سے؟

دل کو میں لوں تو جگر کی لے خبر
کہتی ہے شوخی نگاہِ ناز سے

دل لیا زیبا کا تم نے جس طرح
جان بھی لیلو اسی انداز سے

بڑھے میکشی کیوں نہ برسات میں
گناہوں کا پردہ گھٹا ہوگئی

یہ کہکر منایا اُنھیں وصل میں
چلو ہوگئی۔ جو خطا ہوگئی

یہ نشانی ہے ترے تیرِ نظر کی ظالم
اِس لیئے درد کو سینے سے لگا رکھا ہے

زیبا۔ رائے اجودھیا پرشاد زیبا رئیس شاہجہانپور شاگرد جناب احسان مرحوم پُرانے مشاق ہیں عمر پچاس پچپن کے قریب ہے، یہ چند شعر اُنکے ہیں۔

ترچھی نظریں بھی حسینوں کی غضب ہیں زیبا
چوٹ کھا کر کبھی دل کو نہ سنبھلتے دیکھا

زیبا نگہِ چشمِ حقیقت سے جو دیکھا
بتخانوں میں قدرت کے تماشے نظر آئے

ہجر میں یُوں ہو قصہ خوانی غم
جسکو وہ بُت تو کیا زمانہ سُنے

شکر ہے آج آبلے دل کے
روئے تلوار سے گلے مِلکے

زیبا

زیبا - مرزا عبد الرحمٰن بیگ تلمیذ حضرت فصیح الملک داغ دہلوی دکن کے باشندے ہیں اور یہ کلام کا نمونہ ہے

کیا کروں شکوہ بیوفائی کا	دوست وہ بت ہے اک خدائی کا	ہاتھ اوچھا لگا یا کیوں قاتل	وقت اب بھی نہ تھا صفائی کا
	خود تو ملتے نہیں یہ پھر کیسا	مجھ پہ الزام بیوفائی کا	

زید

زید - سید احمد زید بلگرامی خلف سید محمد حافظ مولد و منشا بلگرام اودھ آپکے دو دیوان غیر مطبوعہ ہیں اور فی الحال ریاست نظام میں کسی ضلع کے ناظم ہیں انکی بدو شعور کی چند غزلیات کا انتخاب درج تذکرہ کیا جاتا ہے جس سے موجودہ مشق سخن کا اندازہ ہوسکتا ہے؀

جو کاکلِ روئے یار دیکھا تو سنبل و لالہ زار دیکھا — عجیب لیل و نہار دیکھے قرینِ حلب کے تتار دیکھا
پھرے بہت دیر میں حرم میں چمن چمن کو ہزار دیکھا — مگر جہاں میں ترا مقابل نہ ہم نے پروردگار دیکھا
خزاں جو آئی تو باغباں نے چمن میں پھر کر ہزار دیکھا — نہ تخم دیکھے نہ پھول دیکھا نہ برگ دیکھا نہ بار دیکھا
مثالِ طفلی چلی جوانی وہ آئی پیری ہوئے وہ فانی — یہ عمر کی ہے سبک روانی نہ ایسا یک ٹٹ سوار دیکھا
شباب پیری میں یاد آیا تو دل لئے کیا کیا مزے اٹھائے — خدا کی قدرت سے زید ہم نے خزاں میں لطفِ بہار دیکھا

مجھ سے فرماتے ہیں کیا عشق کے بیمار ہیں آپ — کسقدر زار ہیں کیا جان سے بیزار ہیں آپ
جان بلب کر کے ہمیں جانے پہ تیار ہیں آپ — حالِ دل سنتے نہیں کتنے دل آزار ہیں آپ
کیا خطا، کون سبب، جرم ہے کیا، کون قصور — کس لئے ہم سے بتا دیجئے بیزار ہیں آپ
چشمِ مخمور کے بوسوں پہ مرا ہیں تو کہا — کیا تنگ ظرف ہیں دو جام میں سرشار ہیں آپ

اُٹھا ہے شور جو سینے سے میرے ماتم کا — یقیں ہے حضرتِ دل انتقال کرتے ہیں
چمن میں چلکے دکھا دیجئے قدِ موزوں — کہ یاد باغ میں سب نونہال کرتے ہیں
نگاہِ ناز سے خود ہو چکا ہے زید شہید — اب آپ غصہ سے کیوں چہرہ لال کرتے ہیں

سر چڑھا کر انھیں خود دار کیا خود تو نے — بل کی لینے لگے تجھ سے بھی ستمگر گیسو
رُخ ترا سورۂ والشمس ہے از سرتا پا — ہو گئے سورۂ واللیل سراسر گیسو
کفر و اسلام میں کچھ فرق نہیں رہتا ہے — جب قریں ہوتے ہیں رخسار کے آکر گیسو

زیدی

زیدی۔ منشی سید نورالدین صاحب ساکن ظفرآباد نواح جون پور۔ عدالت میں پیشکار اور حضرت جلال کے باعقیدت تلامذہ میں ہیں۔ دس بارہ برس سے فکر سخن کرتے ہیں۔

خدا کو منہ بھی دکھانا ہے ایک دن زیدی
تم آخرت کے لئے کچھ تو کام کر لیتے

دنیا کی نعمتوں سے کبھی دل بھرا نہیں
اللہ رے ہوس تری کچھ انتہا نہیں

مدت ہوئی کہ آنکھیں ترستی ہیں دید کو
اُس پر وہ کہہ رہے ہیں کہ میں بیوفا نہیں

ہنستی صورت پہ نچا دل کے لگانیوالے
برگل اندام ہیں ہنس ہنس کے جلانیوالے

تنکے چنوائی ہے انساں سے ہوس دنیا کی
چھانتے خاک ہیں اکسیر بنانیوالے

زیرک

زیرک۔ حافظ مولوی قلندر بخش صاحب باشندہ پانی پت شاگرد منشی کرامت علی مرحوم شہیدی تحصیل علمی دہلی و لکھنؤ میں کی۔ اپنی علمیت پر بڑا ناز تھا۔ شعر غزل بھی کہتے تھے۔ یہ اُن کے کلام کا نمونہ ہے۔

زیرک گل ایک طرف کو میں شکل خستہ دل
جاتا تھا ناگہاں وہ پری رو ملا مجھے

فی الفور دیکھتے ہی یہ اوسکو میں عرض کی
کب تک رکھے گا رنج میں تو مبتلا مجھے؟

سنتے ہی در جواب یہ بولا وہ تند خو
صحبت سے تری رنج نہیں ہو ذرا مجھے

لیکن یہ ڈر ہے اپنی محبت کے واسطے
ایسا نہو سکھائے تو جور و جفا مجھے

زیرک شباب ہی میں ہے کچھ لطف زندگی
یہ عیش پھر کہاں جو جوانی گذر گئی

مفصلہ ذیل کلام ترتیب حصہ سوم کے بعد موصول ہوا لہذا آخر میں درج کیا گیا۔

خاطر

خاطر۔ منشی ظفر حسن مندرجہ صفحہ ۳۰۴ حصہ سوم

چٹکیاں اور بھی لیں دلمیں جھکی جب وہ نگہ
اپنی شوخی سے نہ باز آئی جو شرمائی بھی

یاد گلشن میں بڑھی اور اسیروں کی تڑپ
نکہت گل جو صبا تا بہ قفس لائی بھی

دیکھکر پھیری ہیں ہم چشموں نے نظریں کیا کیا
بار خاطر تھی مصیبت میں شناسائی بھی

امید اس کے وصل کی جب جیتے جی نہ ہو
مرنے کی اپنے کس لیے ہمکو خوشی نہ ہو
ہے موت ہجر عاشق و معشوق بعد وصل
ملکر بہم جدا نہ ہوں یا وصل ہی نہ ہو
تم چھوڑ دو جو دیکھنا چشم عتاب سے
اتنا بھی اپنا پوچھنے والا کوئی نہ ہو
شوخی کیسی دیکھ کے ہوتا ہے شک کلیم
جو طور پر گری تھی وہ بجلی یہی نہ ہو

خرد

خرد - بقیہ کلام حکیم انور آغا صاحب خرد لکھنوی مندرجہ صفحہ ۴-۱۳

پامال ہم کئے ہوئے اُس جان جاں کے ہیں
انداز جسکی چال میں عمر رواں کے ہیں
کچھ یار کا قصور نہ اغیار کی خطا
سارے فساد میرے دل بدگماں کے ہیں
رخسار یار دیکھ کے کہتی ہیں بلبلیں
گل کس چمن کے پھول یہ کس بوستاں کے ہیں
زاہد ہی ایک راندۂ درگاہ ہو تو ہو
لاکھوں مرید حضرت پیر مغاں کے ہیں
شاہد ہے ضبط معنی یہ سوز نہاں کے ہیں
مُہر سکوت لب مجھے چھالے زباں کے ہیں
بربادی چمن کی لکھی ہیں حکایتیں
برگ خزاں رسیدہ ورق بوستاں کے ہیں

خلش

خلش - خواجہ کرامت علی اجمیری مرحوم مندرجہ صفحہ ۵-۲۸

رموز عاشق و معشوق کو اغیار کیا سمجھیں
بھلا دشمن بتا تو دے کہ وہ مجھ پر خفا کیوں ہے
تمھیں چاہا کئے دشمن کو اسنے کب تمھیں چاہا
تمھیں ہو مبتلا اُسپر وہ تمپر مبتلا کیوں ہے
وہ کہتے ہیں یہی دو چار باتیں تجھکو آتی ہیں
کرم کیوں تھا ستم کیوں ہو وفا کیوں تھی جفا کیوں ہے
وہ بگڑے ہیں تو بگڑیں حال ہبر کیوں بگڑتا ہے
وہ روٹھے ہیں تو روٹھیں خیر میرا دم خفا کیوں ہے
حیا کا یہ تقاضا ہیں یہی ہیں ہوں اگلی آنکھوں ہیں
ادہر شوخی یہ کہتی ہے جہاں میں ہوں حیا کیوں ہے
خلش کے نام پر مرتی ہو کیوں باتیں بناتی ہو
ہمیں اُلفت نہیں اُس سے تو ہر دم تذکرہ کیوں ہے

خلیل

خلیل - نواب صاحب ٹونک مندرجہ صفحہ ۲-۵۱

دل ناداں محبت میں پشیمانی سے کیا حاصل
جو ہونی تھی ہوئی اب سوچتا اچھا برا کیوں ہے
بتاؤ تو کھنچے کیوں ہو بتاؤ تو خفا کیوں ہو
یہ کھنچنا بے سبب کیسا یہ غصہ بے خطا کیوں ہے

جو کہتا ہوں جفا کا تمکو ارماں اسقدر کیوں ہی	تو کہتے ہیں تمھیں چاہت کا ایسا حوصلہ کیوں ہی
وہ کہتے ہیں کہ کہتے کیوں نہیں جو تمکو شکوہ ہے	کہونگا تو کہیں گے کیوں جی یہ میرا گلہ کیوں ہی

خورشید

خورشید۔ منشی خورشرفت علیخاں خلف داؤد خاں مندرجہ صفحہ ۱۷

بہت پھرا نہ بتوں نے سنی ہیری فریاد	خدا کے ہاتھ ہے خورشید فیصلہ دل کا
وہ صبح وصل کس کس ناز سے ہمکو جگاتے ہیں	سدھاری رات اٹھو صبح محشر سر پہ آئی ہی

خیال

خیال۔ مولانا فیض الحسن صاحب خیال۔ سہارنپور کے باشندے۔ بڑے جید اوستاد اور فاضل وھر مانے جاتے تھے اور نٹیل کالج لاہور میں پندرہ بیس برس تک علوم مشرقی کے پروفیسر رہے اور صدہا شاگردوں نے آپ سے فیض پایا۔ پروفیسر آزاد کے ہمعصر تھے سُنا ہے کہ خود مولانا مرحوم حضرت صہبائی کے نامور تلامذہ تھے چند شعر بڑی کوشش سے ہاتھ آئے بطور یادگار درج تذکرہ کیے گئے۔ مولانا شبلی کو بھی مرحوم سے تلمذ تھا۔

اس جفا پر بھی کی وفا ہم نے	کیا کیا تم نے کیا کیا ہم نے
کرتے ہیں زہر سے علاجِ فراق	خوب سوچی ہے یہ دوا ہم نے
چھیڑ کر اُن کو بزم دشمن میں	جو نہ سننا تھا وہ سُنا ہم نے
کہتے ہیں جور بھی غنیمت ہے	جب کیا شکوۂ جفا ہم نے
ملا جو خاک میں کوئی تو قبر یہ بولی	کہ اتنے روز رہے آپ ایجناب کہاں

روتے ہیں نتھا جو تری آنکھوں کا تصور	آئے گل نرگس مرے دامن ہیں کہاں سے
کسنے لیا اس چاند سے رخسار کا بوسہ	یہ داغ لگا یا رُخ روشن ہیں کہاں سے
اُڑتی تھی ابھی خاک گلستاں ہیں خدایا	اکبار یہ پھول آگئے گلشن ہیں کہاں سے

باب پانچواں ش

تین

تقاریظ و قطعات تاریخ خمخانۂ جاوید جلد سوم

تقریظ جیدہ کلک جواہر سالک فضیلت مآب کمالات انتساب جامع صفات صوری و معنوی فخر اطبائے ہندوستان حاذق زمان شفیقی حکیم غلام کبریا خان صاحب دہلوی

خمخانہ جاوید، کو میں نے جستہ جستہ پڑھا، زمانہ حال کے شعراء کا اتنا مبسوط تذکرہ لکھنا درحقیقت میرے دوست لالہ سری رام صاحب جیسے باہمت، اور سخن شناس ہی کا کام تھا، جو انھوں نے نہایت جانکاہی، اور عرقریزی کے ساتھ پورا کیا، میرے خیال میں دنیائے اردو کی یہ بڑی مہم تھی جو اردو کے "اس بہادر سپاہی" کے ہاتھوں سر ہوئی اردو میں بہت کم پڑھنے کے لائق کتابیں چھپی ہیں، خیرہ مذاقی کا یہ عالم ہے، کہ محض سطحی مذاق کی چیزیں ڈھونڈی جاتی ہیں، ادنی درجے کے ناول بار بار چھپتے ہیں، اور ایسی کتابیں جن سے پڑھنے والوں کے علم، قابلیت، میں کوئی مفید اضافہ نہیں ہوتا، مقبول بازار ہیں، عوام کے اس مذاق نے لکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور بہت کم اردو میں ایسی کتابیں چھپتی ہیں، جو لٹریچر کی کسی واقعی ضرورت کو پورا کرتی ہوں، اور اگر کوئی ایسی کتاب شائع بھی ہوتی ہے، تو قبول عام سے دور رہتی ہے

اِس جنسِ بد مذاقی نے اُردو ادب کے سرمایہ کو محدود کر دیا ہے، نہ او ریجنل کتابیں اس تعداد میں پیدا ہوتی ہیں، جو اُردو کی وسعت، اور رفعت، کے مناسب ہو، نہ غیر زبانوں کی اچھی اور سود مند، کتابیں ترجمہ ہوتی ہیں، اگر ترجمے بھی ہوتے ہیں تو محض معمولی ناولوں کے، جن کو پڑھکر نہ دل، نہ دماغ، میں روشنی پیدا ہوتی ہے، نہ اخلاق پر کوئی اچھا اثر پڑتا ہے، نہ تشنہ کام ذوقِ علمی سیراب ہوتا ہے۔

جس زمانہ میں عام طور پر لکھنے والوں کی ہمت کا یہ حال ہو، اور جس زمانے میں تصنیف و تالیف کا معیار بلندی کی طرف اتنا کم اُبھرتا ہو، اُس زمانے میں یہ حیرت انگیز مثال ہے، کہ لالہ سری رام صاحب نے ایسی کتاب لکھی، اور اس کتاب کے لکھنے میں سالہا سال تک اتنی بڑی محنت و کاہش گوارا کی !!!

سچے جذبۂ علم دوستی کے بغیر چند گھنٹے بھی کوئی شخص اتنی محنت نہیں کر سکتا، جتنی محنت کہ انھوں نے مُسلسل کئی برس تک کی ہے، انھوں نے ہزاروں اشعار کو پڑھ اور سمجھ کر، اور نقد، و تنقیح کے سانچے میں ڈھال کر، "خمخانہ جاوید کی شکل میں پیش کیا ہے، اور "دورِ جدید" کے صدہا شعراء کے حالاتِ زندگی بہم پہنچانے میں جسقدر محنت، اور کوفت اُٹھانے کی ضرورت تھی اُسے اِس لیئے گوارا کی ہے، کہ اُردو شاعری کی تاریخ "آبحیات" کے بعد ختم نہو جائے، اِنکے اِس عزمِ راسخ کی بدولت یہ صدہا تذکرے اور ہزاروں اشعار، آج اِس خوبصورت کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں، جس کا نام خمخانہ جاوید ہے ✣

میں اپنے دوست کو جو اس بڑی علمی مہم کے فاتح ہیں، اِس مہتم بالشان فتح پر مبارکباد دیتا ہوں جو اُنھوں نے اُردو شاعری کے "دورِ جدید" کو زندگی، اور موت، کی کشمکش سے بچانے، اور "دورِ جدید" کے لیئے "حیاتِ جاوید" بہم پہنچانے کی صورت میں حاصل کر لی ہے، اُردو شاعری، کے اِس دور کی یہ حیاتِ جاوید ہے، جو لالہ سری رام صاحب

کے عقدِ ہمت نے حاصل کرلی ہے، جس کی ٹھیک ٹھیک، قدر، و وقعت، اِس زمانے میں کیا ہو سکتی ہے؟ آیندہ زمانے میں ہوگی، جبکہ لوگ اُردو شاعری کے اِس پچاس سال کا تذکرہ ڈھونڈیں گے، اور اس دَور کی خصوصیات کو سمجھنے کے لیئے خمخانۂ جاوید مشعلِ راہ ہوکر اُنکے سامنے آئیگی ۔

غلام کبریا خان - ۲۴ - ۲/۱۵ ء

قطعہ تاریخ از فکرِ ارجمند و سادہ نشین ریاست نونہال گلشن امارت منشی سید التفات رسول صاحب ہاشمی تعلقہ دار سندیلہ نبیرہ و جانشین حضرت واسطی مرحوم

سخن شناس سرِ ایام صاحبِ ہمت　　جہاں کو جنکی بہارِ ریاض ہے مرغوب

ادا شناس کی ہوتی ہے قدر دلبر کو　　حبیب بن کے ہوئے وہ ہر ایک کو محبوب

لکھا وہ تذکرہ شاعرانِ ماضی و حال　　کہ جسکے شوق میں طالب بنا ہے ہر مطلوب

جو کوئی دن کو کہے رات اور رات کو دن　　تو اِس سے بڑھ کے نہیں کوئی بات بھی معیوب

نظر میں کیوں نہ ہو خمخانۂ سخن کا وقار　　ہے اہلِ دل کے لیئے باعثِ سرورِ قلوب

یہ ہاشمی نے لکھا سالِ طبع ثانی کا　　سخنوروں کی ہوئی یادگار بھی کیا خوب

۱۹۱۵ء

تقریظ از نتائج افکار گہر بار فخرِ شعرای زمان نادرِ رنگین بیان سخن طراز جادو نگار مشاق طرزِ قدیم و نوی صاحبِ تصنیف کثیر منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی از ارشد تلامذہ منشی تدبیر الدولہ اسیر لکھنوی

خمخانۂ جاوید کی دو جلدیں میں نے دیکھیں، اب تیسری کا انتظار ہے، یہ کیا چیز ہے؟ اِس سوال کا جواب اِس سبب سے مشکل ہے کہ قلم دل نہیں بن سکتا ۔

اِس تذکرے نے اِدھر تو ہمیشہ کے لیئے مُردوں کو زندہ کیا، اور اُدھر ہمیشہ کے لیئے زندوں کو زندگی دی پچھلے شعرا، جو گمنامی کے گورستان میں پڑے ہوئے تھے، وہ زندہ ہوگئے اور حال کے شعرا، جن کو گمنامی ڈھونڈھ رہی تھی وہ اُس سے بچ کے ناموری کی بلندی پر پہنچ گئے، لوگ کہتے ہیں کہ اُردو اور اُسکی شاعری زوال کیجانب جا رہی ہے، اور میں کہتا ہوں کہ وہ ترقی کے زینے پر چڑھ رہی ہے۔ ایک "خمخانہ جاوید" میرے دعوے کی ایسی دلیل ہے کہ جو رد نہیں ہوسکتی ♦

اُردو کی خدمت کا دعویٰ جتنا آسان اُتنا ہی اُس کا پورا کر دکھانا مشکل ہے، اِس مشکل کو خدا جانے کتنی مشکلوں کے ساتھ دیوان سری رام صاحب ایم۔ اے۔ نے آسان کیا قابلیت، ہمت، دولت، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُردو کی محبت میں اُنھوں نے اپنی صحت تک صرف کردی ♦

اِس تذکرے میں صرف اِتنا ہی نہیں ہے کہ شعرا کے نام جمع کر دیئے گئے ہوں، بلکہ مناسب حد تک، یا یُوں کہو کہ حسبقدر مِل سکی اُسقدر ہر شاعر کی لائف بھی موجود ہے، یہ ایک ایسی بات ہے جسکی قدر شاعری کی حیثیت سے نہیں بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی کیجائے گی اولاد سے تو وہی تین پشتوں تک نام چلتا ہے، اور یہ تذکرہ اُس وقت تک ناموں کو روشن رکھے گا، جبتک علم کی ٹکسال میں حرفوں کے سکّے چلتے رہیں گے، اِس صورت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ جس کا نام "خمخانہ جاوید" میں داخل ہوا، اُسکے خاندان پر حضرت مؤلف کا احسان رہا، جب چاہو اپنے باپ دادا کو اُسکے صفحوں پر دیکھ لو ♦

یہ آواز بھی ملک میں گونج رہی ہے کہ اُردو شاعری کا رنگ بدل گیا، اسکو میں تسلیم کرتا ہوں

(۱) زمانے کی رفتار نے بہت سے دماغوں کو فطری مذاق کا رستہ بتا دیا۔

(۲) تغزّل کا رنگ بدل گیا۔

پہلی بات سے میں بحث نکروں گا، اِس لیئے کہ وہ ایسی خوبی ہے جو اُردو کی شاعری

ہیں نہیں تھی اور اب آگئی ✤

دوسری بات کو میں بحث کے قابل پاتا ہوں، لیکن یہ وسیع بحث کا محل نہیں ہے مجھے اِس موقع پر صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے، کہ خمخانہ جاوید، میں جذبات انسانی کے نقشے بھی موجود ہیں اور ادّعائی شاعری کے بھی، فہم سلیم دونوں کا موازنہ خود کر سکتا ہے۔ اور اگر میرا فیصلہ کوئی چاہے تو میں یہ کہوں گا کہ جذبات پر دل سے آہ نکلتی ہے، اور ادّعا پر صرف ہونٹوں سے واہ، دل اور ہونٹوں میں جو فرق ہے اُس سے دونوں شاعریوں کا فرق سمجھ لیا جائے، اگر سخن سنج میں فہم سلیم کا مادہ موجود ہے تو وہ اس تذکرے کے ورقوں سے ایسا سبق لے سکتا ہے جو اُسے صرف نام کا شاعر نہیں بلکہ کام کا شاعر بنا دے۔

انتخاب پر قلم کا اُٹھانا کچھ مناسب نہیں ہے "خمخانہ جاوید" کا پھیلاؤ اتنا ہے کہ مَیں اسکو انتخاب کے دامن میں نہیں سمیٹ سکتا، صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس میں ہر مذاق کے اشعار موجود ہیں، اور اس سے میں یہ عمدہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ حضرتِ مؤلف نے ہمہ گیر مذاق سے کام لیا ہے، میں اسکی مثال ایک ایسے آراستہ باغ سے دونگا جس میں مختلف رنگوں کے بیشمار پھول کھلے ہوں۔ اگر ایک ہی رنگ ہوتا تو ایک ہی مذاق والے کی دلچسپی ہوتی اور اب ہر مذاق والا اپنی پسند کے پھول چُن سکتا ہے ✤

لوگ سخن فہمی کو سخن وری سے زیادہ مشکل کہتے ہیں۔ یہ ہے بھی صحیح، سخن ور اپنے مذاق کے موافق کہہ لیتا ہے، مگر سخن فہم کو ہر مذاق کی خوبیاں اور باریکیاں فہم رسا کی انگلیوں سے ٹٹولنا پڑتی ہیں، حاصل یہ کہ سخنوری کے لئے ایک ہی مذاق کی ضرورت ہے، اور سخن فہمی کے لیئے ہزار مذاقوں کی۔ میں دیکھتا ہوں کہ حضرت مؤلف نے قلم و سخن فہمی پر اپنا ایسا سکہ بٹھا دیا ہے کہ اس کا انکار علم ادب کی عدالت میں ایک جُرم قرار پا سکتا ہے، لوگ تو ایک ہی غزل کے انتخاب میں چکرا جاتے ہیں، اور اُنھوں نے ہزارہا انباروں کو چھان ڈالا، گویا عالم اُردو کے سمندروں کو پھیر پھیر کر موتی نکالے ہیں ✤

ایک بڑا لطف یہ بھی ہے کہ عبارت سلیس، فصیح، متین اور سنجیدہ تحریر فرمائی جس نے مذاقِ نظم کے ساتھ مذاق نثر کو بڑھا کے حُسنِ سخن کو دوبالا کر دیا، اور پھر کتاب کو چھپوایا بھی ایسے عمدہ کاغذ پر اسقدر خوشخط کہ آنکھوں میں کھُبی جاتی ہے، گویا خمخانہ جاوید، ایک ایسے معشوق کا نام ہے جو حسین بھی ہے اور نیز تکلفِ لباس اور جواہر کے زیوروں سے آراستہ بھی ہے، میں حضرت مؤلف کو جتنی داد کا مستحق سمجھتا ہوں اُتنی داد کے لیئے مجھے الفاظ نہیں ملتے، آخر میں یہ دعا مانگتا ہوں کہ خدا لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے کی عمر میں برکت دے اور اُنکو ایسا تندرست رکھے کہ "خمخانہ کی ابتدا اپنی انتہا کو پہنچے، اور اسکے بعد پھر وہ اُردو کے خزانے کو اور جواہر سے بھرتے رہیں؂ احمد علی شوق، قدوائی۔ اپریل ۱۹۱۵ء

اقتباس از نامہ عنبریں شمامہ چکیدہ خامہ جواہر سلک فخر شعراء دورِ جدید افتخار عرفی و طالب پیرو مرزا غالب مولانا میرزا رضا علیصاحب وحشت رئیس کلکتہ

مخدومی و محترمی۔ تسلیم و نیاز، گرامی نامہ شرفِ صدور لایا، اِس ذرّہ نوازی کے لیئے ہمہ تن زبان شکر گذار ہوں، اگرچہ جناب کی زیارت ابتک میسّر نہیں آئی ہے لیکن آپکے غائبانہ مدّاحوں میں ہوں، اُردو لٹریچر کی جو خدمت جناب نے تذکرہ خمخانہ جاوید لکھکر فرمائی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے، زمانہ جانتا ہے اور مانتا ہے، میں اپنے دیوان کا ایک نسخہ خدمتِ عالی میں روانہ کرتا ہوں اُمید ہے کہ آپ اسکو قبول فرمائیں گے، خمخانہ کی تیسری جلد کے لیئے قطعہ تاریخ انشاء اللہ بہت جلد لکھکر بھیجوں گا۔

آپنے جو الفاظ اس حقیر کی شاعری کے متعلق تحریر فرمائے ہیں اگرچہ میں اپنے کو ان کا مستحق نہیں سمجھتا پھر بھی شکریہ ادا کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اِس خبر کو دریافت کر کے کہ جناب علیل ہیں بہت افسوس ہوا، دعا کرتا ہوں کہ خدا

آپکو جلد صحتِ کامل عطا کرے کیونکہ آپکی ذات بابرکات سے بہی خواہانِ زبانِ اُردو کی اُمیدیں وابستہ ہیں ✤
نیازمند رضا علی وحشت، ۲۲ ستمبر ۱۹۱۴ء

اقتباس از تحریر منشی سید محمد نوح صاحب نوح ناروی شاگرد رشید حضرت فصیح الملک مرزا داغ مغفور

خمخانہ جاوید کی تیسری جلد کا حال معلوم کرکے نہایت خوشی ہوئی، آپ باوجودیکہ اسقدر عدیم الفرصت ہیں لیکن پھر بھی جس مستعدی سے اُردو زبان کی خدمت کئے جاتے ہیں وہ ہر طرح قابلِ قدر ہے لوگوں کے کہنے سننے پر نہ جایئے، اپنا کام کیے جایئے
محمد نوح، ۹ جولائی ۱۹۱۳ء

اقتباس از تحریر منشی علی محمد خان صاحب برق شاہجہانپوری

شہرہ سنا ہو جس سے ترا شوق دید ہے	پوری یہ آرزو ہو مری کیا بعید ہے

آپنے شعرائے ماضی و حال پر وہ احسان کیا ہے کہ زندہ تو زبانِ حال سے شکرگزار ہیں اور گذرے ہوؤں کا دوسرے لوگ تذکرہ پڑھکر شکرگزار ہیں، محمد حسن ۱۶ نومبر

اقتباس از عنایت نامہ مسٹر محمد حیات خان ڈپٹی پولٹیکل سکرٹری ہز ہائنس مہاراجہ صاحب سیندھیہ گوالیار

آپکی مرتبہ کتاب موسوم بہ "خمخانۂ جاوید" کی پہلی، دوسری جلد نظر سے گذری، واقعی آپنے بیحد کاوش سے اِس تذکرہ میں حالات شعرائے ماضی و حال اور اُنکے کلام کے نمونے جمع کیے ہیں - آپ کی اِس بیش بہا خدمت کا جب تک کہ اُردو ادب زندہ ہے زمانہ مرہون منت رہے گا -
محمد حیات خان دہلوی - ۱۵ فروری ۱۹۱۵ء

اقتباس از تحریر مولوی محمد یونس خان صاحب بی اے زمیندار آرہ

جناب من - تسلیم عرض ہے، اتفاق زمانہ دیکھئے کہ جلد اول خمخانہ جاوید ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا ابھی تک اِس سے فیضیاب نہو سکا تھا، اب مجھے اس سے فیض حاصل کرنیکا موقع

بلا ہے، واقعی حضرت مؤلف نے سرشاران بادۂ سخن کو باخوبی انٹروڈیوس کرانے اور ان کے اشعار کے انتخاب اور انکی نسبت رائے قائم کرنے میں جو داد انصاف دی ہے اسکی شکرگذاری سے سبکدوش ہونا کوئی آسان بات نہیں وہ جہان ہے جسکے صلے میں حضرات شعرا کی جماعت کو زندگی بھر جناب مؤلف کیلئے دربار خداوندی میں دست بدعا رہنا چاہیے

قطعہ تاریخ از نتائج افکار گہربار محقق کامل فن مشاق قدیم سخنور ماہر منشی رام پرشاد صاحب طاہر دہلوی وکیل گوالیار شاگرد رشید مرزا صابر گورگانی مرحوم

	دیگر	
چھپا خمخانہ جاوید جس دم		پئے تاریخ پھر تو میں نے سوچا
ندا دی غیب دان نے لکھدے طاہر		چہ زیبا ہے بہارستان شعرا
لکھی تاریخ دیگر فکر کرکے		نسیم گلشن اشعار عقلا ۱۳۳۳
بصد آب و تاب و بکوشش تمام		یہ خمخانہ جاوید جس دم چھپا
لکھی میں نے تاریخ فی الفور طاہر	دیگر	گل تازہ اشعار فرحت فزا ۱۹۱۵ء
چھپا جب تذکرہ خمخانہ جاوید		بصد آب و بصد تاب مسجّل
سن عیسیٰ میں طاہر نے یہ لکھا		گلستان مسرت خیز بادل ۱۹۱۵

دلا این گلشن شعار نادر (سنہ ۱۳۳۳ف)	باغنچہ اشعار مصفا اعلی (سنہ ۱۹۱۵ء)	مکمل مصفا باغ شعرا (سنہ ۱۹۱۵ء)
مخزن اشعار بین (سنہ ۱۳۳۳ھ)	خوشا این باغ (سمت ۱۹۷۱)	چہا این نادرہ باغ (سنہ ۱۳۳۳ھ)
گلستان شعرائے فایق ؍؍	مو بمو باغ سخن سنجان ؍؍	غنچہ نادر زیبا (سنہ ۱۳۳۳ھ)
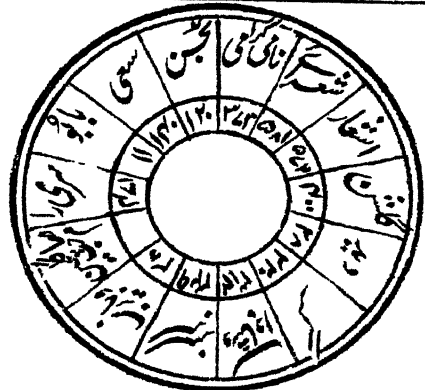
کسی خانہ کو مبدء قائم کرکے اس کے اعداد لیجیے اور ایک خانہ چھوڑکر دوسرے کے اعداد لیتے جاویں اس طرح ایک ایک خانہ چھوڑکر سات خانہ کے اعداد جمع کیے جائیں سنہ ۱۹۱۵ء برآمد ہونگے۔

از نتیجہ فکر پربہار پنڈت کامتا پرشاد صاحب مسرور ڈپٹی کلکٹر بجنور

مجموعہ کیا لالہ سری رام نے تالیف
ہر مطلع پُر نور ہے عبرت دہ خورشید
مسرور نے تاریخ دعائی یہ رقم کی
آباد و ہمیشہ رہے خمخانہ جاوید

۱۹۱۴ء

از نتائج افکار گہربار منشی کنور بہادر فصیح لکھنوی تلمیذ منشی فدا احمد صاحب آتش لکھنوی

حبذا خمخانہ جاوید را ترتیب داد
نام آن عالی خیال و پاک طینت بر زبان
ساکن دہلی کہ شہرے است رشک باغ خلد
جلد ثالث ہم بحمد اللہ و رپایاں رسید
در حروف معجمہ گفتہ بزبر و بینات
بود سال بکرمی آن عیسوی سالست ایں
سال ہجری ہاتف غیب از فصیح لکھنوی

بر حق تالیف میگویم مؤلف را سلام
آید از ترتیب لفظی از سری رز لفظ رام
پربہار و دلکش و دلچسپ و مرغوب انام
بہر اثبات تواریخش چنین شد انتظام
شد عجب این یادگار شاعران خوش کلام
واقعات شاعران بہر وقوف خاص و عام (۱۹۷۱ء)
گفت دراں نامہ حالات ہنرمندان تمام (۱۹۱۴ء)

۱۳۳۲ھ

تصریحات حروف معجمہ بزبر و بینات

شد عجب این یادگار شاعران خوش کلام — بکرمی

نام حروف	تعداد حروف	اعدادی حرف	جملہ اعداد
شین	۳	۳۶۰	۱۰۸۰
جیم	۱	۵۳	۵۳
با	۱	۳	۳
یا	۲	۱۱	۲۲
نون	۲	۱۰۶	۲۱۲
خا	۱	۶۰۱	۶۰۱

۱۹۷۱

واقعات شاعران بہر وقوف خاص و عام — عیسوی

نام حروف	تعداد حروف	اعدادی حرف	جملہ اعداد
قاف	۲	۱۸۱	۳۶۲
تا	۱	۴۰۱	۴۰۱
شین	۱	۳۶۰	۳۶۰
نون	۱	۱۰۶	۱۰۶
یا	۱	۳	۳
حا	۱	۸۱	۸۱
خا	۱	۶۰۱	۶۰۱

۱۹۱۴

گفت دراں نامہ حالات ہنرمندان تمام — ہجری

نام حروف	تعداد حروف	اعدادی حرف	جملہ اعداد
نون	۵	۱۰۶	۵۳۰
تا	۲	۴۰۱	۸۰۲

۱۳۳۲

قطعۂ تاریخ از نتائج افکار شاعر فصیح حکیم محمد اسمٰعیل خان صاحب ذبیح دہلوی

ہاں ذبیح مضطرب بنشین خموش زود خیز — شائقین تذکرہ را گو بگیرہ و زر بریز
در مسیحی دور یابی کیف این آتشہ — طبع شد جلد سوم خمخانۂ جاوید نیز
۱۹۱۵ع

قطعۂ تاریخ از نتیجہ فکر گرامی واقف رموز شیریں بیانی سخنور یکتا صاحب طبع سلیم منشی سید صمیم علی شاہ صاحب صمیم بلند شہری

کیا ساغر جم ذوق حیات ابدی ہے — پیمان سخن ہے یہی پیمانۂ جاوید
ولدادۂ ذکر شعراء یوسف جان ہے — بازار میں ہے نظم کے بیعانۂ جاوید
کسریٰ کا کہاں طاق کہاں قصر فریدوں — یہ دائرۂ علم ہے کاشانۂ جاوید
آنکھوں سے چھپا طور کے جلوہ کا ثبات اب — ہے صبح مضامین جلوخانۂ جاوید
کیونکر ہو زوال ابرشئے سلک سخن کو — نقطہ ہے ہر اک گوہر یکدانۂ جاوید
ہے وحشت دیوان سخن سر میں ازل سے — ایسا نہ صمیم اور ہے دیوانۂ جاوید
ایمان ہے اپنا تو یہی مصرعۂ تاریخ — واللہ کہ بے مثل ہے خمخانۂ جاوید
۱۳۳۳ھ

نثر و قطعۂ تاریخ چکیدۂ خامۂ عنبریں شمامہ شاعر خوش بیان سخنور نکتہ دان منشی مظفر حسین مظفر سلیمانی شاہ آبادی مؤلف حیات مسیح و دیگر تصانیف کثیرہ

چونکہ جناب نے احسان کرکے دوسروں کے نام زندہ کرنیکا بیڑا اٹھایا ہے اس لئے اور وں کی آپکی زندگی و صحت کے لیے بارگاہ احدیت میں دست بدعا ہیں اور یقین خاطر کمترین یہ ہے کہ یہ دعا درجۂ اجابت کو پہنچیگی۔ مظفر حسین ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۴ع

(اقتباس از نامہ مرقومہ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۴ء) جناب کی علالت مزاجی کا حال معلوم ہو کر دلکو سخت افسوس ہوا خدا وند شافی مطلق جلد جناب کو صحت و شفائے کلی عطا فرمائے اور راقم کمال محبت سے بطور مبارکبادی غسل صحت کا قطعہ لکھے۔ فی زمانہ آپکا دم مایۂ ناز ہے آپنے وہ کام کیا جس سے علمی بنیاد زندہ ہو رہی ہے، خداوند کریم آپکو زندہ رکھے اور آپکے ذریعہ اہل کمال کا نام روشن کرائے۔ مظفر حسین سلیمانی، ۲۲ ستمبر ۱۹۱۴ع

برآمد چوں پری جلدِ سوم از بزمِ خمخانہ
برِ شرے دہر از تصنیف دلکش زیب غازہ شد
مظفرؔ جست چوں تاریخ بہرِ سالِ تالیفش
ندا آمد بہارِ بوستانِ عشق تازہ شد

میر رام صاحب کی تالیف سے
ہوئی ختم پہلے ہی جلدِ دوم　الیضاً
مظفرؔ اس حصہ کی تاریخ لکھ
خداوند نعمت ہے جلدِ سوم

الیضاً

ایسے ساقی کو خداوند سلامت رکھے
تذکرہ ایسا خوش اسلوب مرصع لکھا
تیسری جلد ہوئی مثلِ پری کے تیار
جسکو دیکھو وہ ہے سرمست کہ میں بھی دیکھوں
بادہ نوشانِ سخن ہیں یہ دعائیں دیتے
غسلِ صحت ہو مؤلف کو الٰہی حاصل
فکرِ تاریخ مظفرؔ ہے اگر یہ لکھدے

ذات سے جسکی کھلا باب ہے خمخانہ کا
رنگ پھیکا کیا جسنے ہر اک افسانہ کا
دور چلنے لگا اب تیسرے پیمانہ کا
ایک عالم کو ہوا شوق ہے یارانہ کا
بانی زندہ رہے یارب مرے خمخانہ کا
لطف قائم رہے اِس فن اُنسے کاشانہ کا
تیسرا دور ہوا عطر ہے میخانہ کا
۱۹۱۴ء

اقتباس از عنایت نامہ و قطعہ تاریخ نتیجہ طبع وقاد ناثر باکمال ناظمِ شیریں مقال طوطیٔ شکرستانِ فن ڈرامانویسی منشی ونایک پرشاد صاحب طالب بنارسی شاگرد جناب داغ و حضرت راسخ

آپکے تذکرہ کی پہلی جلد میرے پاس ہے اُسکو بار بار پڑھا کرتا ہوں، آپنے کچھ ایسی مٹھاس اسکی تحریر میں ڈالدی ہے کہ سو دفعہ پڑھکر بھی نیت نہیں بھرتی ہے سچ تو یہ ہے کہ یہ تذکرہ لکھکر آپنے وہ کار نمایاں کیا ہے جسپر ہم ہندو جسقدر فخر کریں بجا ہے خدا ایسے فخرِ ملک و قوم کو سلامت باکرامت رکھے، براہ خداوندی مطلع فرمائیں کہ حرف ط کی نوبت کب آئیگی، ابتو بقیہ جلدیں بھی نکل جائیں تو بہتر ہے کہ ہم لوگ اپنی زندگی میں درشن کرلیں۔ طالب بنارسی ۲۶ مئی سنہ ۱۹۱۳ء از بمبئی

عالیجاہا تذکرہ جلد دوم شرف صدور لایا ممتاز فرمایا سبحان اللہ کیا خوب لکھا ہے اور کمال کیا ہے آپنے بیشک خونِ جگر کھایا ہے آنکھوں کے تیل سے یہ غیرتِ طور چراغ جلایا ہے ہماری ہندو قوم کے تاجِ افتخار میں ایک نیا اور قابلِ اعزاز طرّہ لگایا ہے خدا آپکو سلامت باکرامت رکھے اور تمام و کمال تذکرہ شائع کرادے، آپکی علالت سے دلکو سخت رنج ہے کیونکہ آپ مالی اور جسمانی

تکلیف اٹھاکر ایک بڑا مفید کام کر رہے ہیں جس پر آپنے اپنی ذاتی منفعت قربان کر دی، شافیٔ حقیقی آپ کو صحتِ تامہ عطا کرے ۔ طالب بنارسی ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء

حب ہوا سلطانِ شرق اسپِ فلک پر سوار ... آکے نقیبِ سحر ہو گیا خدمت گزار
مخزنِ گل شاخسار مستِ ترنم ہزار ... لائی صبا رو بکار ۔ آئی چمن میں بہار
لال مئی لالہ رنگ سُرخ رُخِ مے گسار ... موج میں دستاں سرا لہر میں ہر آبشار
شعبدہ گر چرخ نے پھونک کے سحر سحر ... کر دیا سادہ سفید سقفِ جواہر نگار
آنکھ کھلی میری جب دیکھا تماشا عجب ... طرفہ دو رنگی تمام دہر میں ہے آشکار
کوئی ہے آشفتہ حال کوئی پریشاں خیال ... کوئی شکارِ عسار ۔ کوئی ہے دولت مدار
عالمِ ناسوت یہ عالمِ بہبوت ہے ... آدمی کیواسطے آفتوں کا ہے حصار
دام میں ہے ایک کے طائرِ عیش و نشاط ... ایک جفادیدہ ہے شیرِ الم کا شکار
کوئی غمِ ہجر میں جان سے مایوس ہے ... کوئی ہے دلدار کے وصل کا امیدوار
ایک جو سر دار ہے ۔ ایک سر دار ہے ... ایک کو تحقیر ہے ایک کو ہے افتخار
اشرفِ مخلوق ہے آدمی اس دہر میں ... لیکن اسے بھی نہیں دارِ فنا میں قرار
روز ملالِ حیات ۔ روز خیالِ ممات ... زیست ہے مثلِ حباب، جان مثالِ شرار
ایک نفس کے لیئے آفتیں ہیں لاکھ لاکھ ... ایک بشر کے لیئے عارضے ہیں اک ہزار
سبزۂ خطِ یار سے ، زینتِ لب یار سے ... سبزۂ بیگانہ سے آج چمن میں بہار
اسکی شہادت کو صاف باغِ جہاں میں عیاں ... ہمسرِ انگشت ہے سرو لبِ جوئبار
شاہدِ معنی ہے آج جلوہ نما یا کہ سے ... ناقۂ انشار پر لیلیٰ محمل سوار
نقدِ گلِ نظم سے ، گلشنِ ایجاد میں ... دامنِ دولت ہے آج دامنِ ہر گلعذار
ساقیٔ گلفام نے دی جو مئی لالہ رنگ ... کیفِ دلاویز سے مست ہوئے بادہ خوار
پاکے الم سے فراغ ۔ ہو گیا دل باغ باغ ... روضۂ امکان میں آج ، آئی نرالی بہار

چھاپ کے اک تذکرہ لالہ سری رام نے ۔۔۔ نسخۂ اعجاز کا، چھاپ دیا اشتہار
آہ ہوئی آب آب، بن گئی مثلِ گلاب ۔۔۔ سینچ کے فرحت کا باغ اسکو کیا آبدار
ایک نئے چاند کا بن گیا عالم چکور ۔۔۔ ایک گلِ سرخ کے بن گئے بلبل ہزار
بن گئے موتی وہ آج آ کے سرِ شاخِ گل ۔۔۔ قطرۂ شبنم سے چرخ گرچہ ہوا اشکبار
لالہ سری رام کے اِس گلِ شاداب پر ۔۔۔ رشک سے گلزار میں لالہ بھی ہے داغدار
کون سری رام؟ وہ منصفِ والا حشم ۔۔۔ کون سری رام وہ صاحبِ عالی وقار
منصفِ علم و کمال، منصفِ شعر و کلام ۔۔۔ آپکے اجلاس کے فہم و ذکا پیشکار
کرم بیاں مدح ہیں جسکے امیر و غریب ۔۔۔ رطب لساں وصف میں جسکے صغار و کبار
نقدِ دلِ دردمند نذر کو لائیں یہاں ۔۔۔ بیٹھے ہیں انشا و پر لوگ جو کھائے ادھار
اسکے طلبگار ہیں عالم و اطراف میں ۔۔۔ مفلس و محتاج سے تا بہ سلیمان وقار
دولت و دینار سے محنتِ بسیار سے ۔۔۔ ڈالی مؤلف نے طرح تذکرہ خوشگوار
جلد بھی کچھ کم نہیں جلدِ گل اندام سے ۔۔۔ نقطۂ حرفِ کلام - اخترِ جلوہ شعار
شاعروں کے ہیں کلام حسن و معجز نظام ۔۔۔ باغِ شگفتہ ہے ایک روح فزا پر بہار
خط کی کتابت تمام مثلِ خطِ حور وش ۔۔۔ کاغذِ شفاف و صاف چہرۂ سیمیں عذار
حُسن میں ہے انتخاب وصف میں ہے لاجواب ۔۔۔ ہے یہ دل آرا کتاب ایسی جواہر نگار
کھائیں مٹھائی تو ہے وجع مفاصل کا ڈر ۔۔۔ کھائیں کھٹائی تو ہے ضعف سے حالت نزار
ایک سے صفرا کا ڈر، ایک سے سودا کا خوف ۔۔۔ ایک سے خوں کو ضرر، ایک سے بلغم کو عار
چین کسی طرح سے، دہر میں دل کو نہیں ۔۔۔ کوشش امید پر، جان کو آئے قرار
زال ہے دنیائے دوں، حسن ہے اسکا فسون ۔۔۔ کون ہوا اسپر نثار کون کرے اسکو پیار
قسمتِ انسان نہیں، جب گلِ باغِ نشاط ۔۔۔ بلبلِ دل کے لیے، دام ہے ہر مرغزار
بار سے پھولوں کے ہیں زیبِ چمن جو نہال ۔۔۔ پڑتے ہیں گلچیں کے ہاتھ اُن پہ یہاں بار بار

تارِ گُل ہے اگر تارِ رگِ عندلیب — دامنِ گل ہے مگر آفتوں سے تار تار
حوضِ چمن ہے اگر ہمسرِ چشمِ پُر آب — قامتِ شمشاد ہے واسطے قمری کے خار
دارِ فنا ہے سرا، آج رہا کل گیا — طالبِ دنیا نہ ہو کوئی یہاں زینہار
آئی صدا ناگہاں، طالبِ سینہ فگار — کھو نہ عبث جانِ زار ہو نہ عبث سوگوار (۲)
خانۂ قدرت میں دیکھ آئینہ روزگار — سعدی کی گفتار کو یاد رکھ اے غمگسار
"برگِ درختانِ سبز، در نظرِ ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار"
کوئی دم اندھیر ہے، کوئی گھڑی روشنی — مظہرِ اسرار ہیں روز کے لیل و نہار
حیرتوں سے انتساب ہر کا ہے انقلاب — ہوش ہوا ہے یہاں صبر و خرد ہیں فرار
مرد بہادر نگر، مرتے ہیں ایک ہی دفعہ — بزدلوں کو موت ہے آئے دن اور بار بار
آپ سے آتا ہے کون آپ سے جاتا ہے کون — ہے اجل و زیست پر کسکو یہاں اختیار
لائی ہے سب کو حیات، آئی ہے سب کو اجل — ہے کبھی آغوشِ یار، ہے کبھی کنجِ مزار
ہے وہ بشر نیک مرد، ہے وہ شرافت میں فرد — جورۂ تسلیم میں جاکے رہے بُرد بار
دیکھ نئے آب کے ایک گلوں کا چمن — دیکھ نئے رنگ کے لالہ و گل کی بہار
نظم کی پیچیدہ زلف دیکھ جسے دیکھ کر — سنبل و ریحاں کی زلف کو بھی ہوا انتشار
آیا ہے وہ شوخ چشم گلشنِ عالم میں آج — دیدۂ نرگس کو بھی جس کا رہا انتظار
طالبِ دل خستہ کی ہے یہ دعائے دلی — دہر میں یہ تذکرہ ہو سندِ روزگار

تاریخ

جب چھپی جلدِ سوم "خمخانۂ جاوید" کی
غیب سے پیدا ہوئی، ناگاہ ہاتف کی ندا
ہے یہ "ہزار داستان"، کیا ہی عجیب تذکرہ
طبع رواں مری ہوئی، طالبِ سال طبع جب

ہم نے کی تاریخ کی تفتیش، سُن کر حالِ طبع
تذکرۂ نعیم سے نکلے گا طالب سالِ طبع
۱۹۱۵ء
مونس ہر فریق ہے غم زدوں کا رفیق ہے
آئی ندائے ہاتفی، تذکرہ عتیق ہے

تقریظ و تاریخ ریختہ کلکِ جواہر سلکِ شاعرِ یکتا ناثرِ بے ہمتا محقق والا نظر سخن گستر

معدن صدق و صفا منبع فہم و ذکا نتیجۂ فکر منشی نراین پرشاد صاحب مہر شاگرد رشید نواب فصیح الملک مرزا داغ منصرم محکمۂ تعلیمات ریاست گوالیار

ہر بات جہاں میں شعرا کی ہے نرالی — ہو واقعہ کوئی کہ ہو مضمون خیالی
جادو کا اثر رکھتی ہے تقریر دل آویز — انکا کوئی مضمون نہیں تاثیر سے خالی
ٹکسال ہے یا انکی طبیعت ہے الٰہی — سانچے میں ڈھلی نکلی ہے جو منہ سے نکالی
وہ مال ہے انکے سخن نغز کی پونجی — جس کا بجز انکے کوئی وارث ہے نہ والی
آزردہ کسی حال میں انکو نہیں دیکھا — سر پر جو پڑی انکے وہ خوش ہو کے اٹھالی
ہر وقت رہا کرتے ہیں خوش فکر سخن میں — جاتی نہیں انکے کبھی چہرہ کی بحالی
چپ بیٹھے تو لب پر ہوئی قربان خموشی — کی بات تو ہر بات میں اک بات نکالی
اس طرح چہکتے ہیں یہ گلزار سخن میں — گویا روش بلبل خوش لہجہ اڑالی
سیکھے کوئی ان لوگوں سے انداز تکلم — رندوں سے اگر بات کی تو شیخ پہ ڈھالی
جو بات یہ کہہ دینگے پھر اس سے نہ ہٹینگے — ہٹ جائیں اگر قطب جنوبی و شمالی
ہر پھول سے یہ گوندھتے ہیں ہار سخن کے — ہے انکی طبیعت چمن نظم کی مالی
تشبیہ اگر ڈھونڈھتے ہیں سرخی لب کی — گلشن سے یہ پھولوں کی اڑا لاتے ہیں لالی
ہر چشم گہربار کے اشکوں سے بنا کر — موتی کی بنا دیتے ہیں یہ کان میں بالی
مر جاتے ہیں یہ دیکھ کے انداز خموشی — جی جاتے ہیں سنکر لب جاں بخش سے گالی
اللہ رے نزاکت نہ دہن ہے نہ کمر ہے — دنیا سے الگ انکا ہے معشوق خیالی
دیکھو تو انہیں پیار کی باتوں میں انھوں نے — کس پیار سے اردو کی زباں تھی کبھی پالی
جس طرح سے چاہیں یہ کریں صرف زر نظم — قدرت نے انھیں سونپی ہے اس گنج کی تالی
جی چاہا تو جاگی ہوئی قسمت کو سلایا — بن آئی تو بگڑی ہوئی تقدیر بنالی
دل میں جو سمایا کوئی انداز جنوں کا — مجنوں کی طرح سر پہ ہیں خاک اڑالی

صحرا میں لگی پیاس تو شکوے سے بجھالی
جنگل میں لگی بھوک تو ٹھوکر کوئی کھالی

زاہد کی مذمت سے کیا ہی کبھی جی خوش
میخانے کی تعریف سے رندوں کی دعا لی

یا ہجر کی شب بند کیے دل میں سب ارمان
یا وصل کی شب حسرتِ دل خوب نکالی

یا دل ہی میں اک شوخ کو مہمان بلا کر
آئی ہوئی سر پر سے گھڑی ہجر کی ٹالی

جنت میں بھی دنیا کے حسین پا رہے ہیں
اللہ رے ان لوگوں کی آشفتہ خیالی

عشق انکا مگر پاک ہے عاشق ہیں پہ اسیر
ہے دل کے مرقع میں جو تصویر خیالی

لاتے نہیں چھپ چھپ کے یہ میخانے سے بوتل
واعظ کی پڑی آنکھ تو دامن میں چھپالی

یہ رند سیہ مست ہیں صہبائے سخن کے
انکے لیے آتی ہے گھٹا جھوم کے کالی

پیتے ہیں یہ ہر وقت مئے ناب سخن کی
خالی کبھی رہتی ہی نہیں انکی پیالی

خمخانۂ جاوید سے مے ان کو پلا کر
ساقی ازل نے کیے خم سیکڑوں خالی

دنیا میں بھی انکے لیے اک بحر کرم نے
خمخانۂ جاوید کی بنیاد ہے ڈالی

اب اس میں یہ سب زندۂ جاوید رہینگے
صورت یہ نئی انکی بقا کی ہے نکالی

خمخانہ جاوید ہے یا بزم سخن ہے
ہیں اس میں ہزاروں شعرا ماضی و حالی

یہ تذکرہ وہ تذکرہ ہے جسکے سخنور
رکھتے ہیں یہ رتبہ جو ہوا اعلیٰ سے بھی عالی

اس تذکرہ میں اب وہ نظر آتے ہیں ہمکو
جن لوگوں کی صورت نہ کبھی دیکھی نہ بھالی

انکے لیے دیکھے ہیں کئی ہند کے قصبے
انکے لیے چھانے ہیں بہت شہر و حوالی

اس کام میں دولت بھی مصیبت بھی اٹھائی
جب جا کے ملے یہ دُرِ مضمون خیالی

مشہور سخنگویوں کے لکھے ہیں فسانے
گمناموں کی گمنامی پہ اک روشنی ڈالی

شاعر جو گرے جاتے تھے پھر انکو ابھارا
بیقدری نے جو بات بگاڑی تھی بنائی

ہر ایک کے اس طرح کیے منتخب اشعار
جس طرح پرکھتا ہے کوئی لعل و لآلی

کلیاں چنیں ہر طرز کی ہر باغ سخن سے
ہر رنگ کے پھولوں سے بنائی ہے یہ ڈالی

حالات دل آویز ہیں اشعار ہیں دلکش — دیکھے انھیں اب آنکھ جو ہو دیکھنے والی

اُٹھے گی کسی سے نہ اُٹھائے سے جہاں میں — یہ پوٹ جو احسان کی ہے باندھ کے ڈالی

مٹنے سے بچایا ہے فنِ شعر و سخن کو — یہ لالہ سری رام کی ہے ہمتِ عالی

ہیں نیک دل و نیک منش نیک طبیعت — دل انکا ہے بغض و حسد و رشک سے خالی

ہیں صاحبِ جود و کرم و دولت و ثروت — اللہ نے بخشا ہے انھیں رتبۂ عالی

فاضل نہیں، ہیں ورثۂ افضال کے وارث — عالم نہیں، ہیں مملکتِ علم کے والی

ہے شوق لڑکپن سے انھیں شعر و سخن کا — اِس کام کی بنیاد اسی شوق نے ڈالی

اِس کام کا کیا کہنا یہ وہ کام ہے جس سے — مُردوں کو کیا زندہ تو زندوں سے کما لی

دیدیئے رُوپے سینکڑوں دیواں لیئے ہیں — ایسوں سے جنھوں نے یہ گراں جنس چھپالی

اُن لوگوں کے دیوان بھی چھپوائے انھوں نے — شہرت کو سمجھتے تھے جو اک خام خیالی

بالیں پہ گئے اُنکی جو دم توڑ رہے تھے — دب جاتی جو ساتھ اُنکے وہ دولت بھی نکالی

تلچھٹ سے کیا صاف ہر اک جامِ سخن کو — ہر اک کی پیالی یُونہیں آنکھوں سے لگا لی

ہر طرح سے چمکایا غرض اہلِ سخن کو — حالت شعرا کی بخدا خوب سنبھالی

ہندو کی، مسلمان کی تفریق نہیں کچھ — ہے قابلِ تعریف یہ آزاد خیالی

یہ تذکرہ مجموعہ ہے اشعار کا نادر — تاریخِ سخن ہے یہ زمانے سے نرالی

دو جلدیں اِسی تذکرہ کی پہلے چھپی ہیں — اب تیسری جلد اسکی یہ چھپوا کے نکالی

اِس جلد میں جتنے شعرا جلوہ نما ہیں — ہے مرتبہ اُنکا مری تعریف سے عالی

یُوں اسکی چمکتی ہے سفیدی و سیاہی — جس طرح کوئی رات ہو اُجلی کوئی کالی

ہے خوب لکھائی تو چھپائی بھی ہے مرغوب — ہر طرح سے یہ نُور کے سانچے میں ہے ڈھالی

کیا آب ہے کیا تاب ہے اِس جلد کی واللہ — حُسّاد نے بھی دیکھ کے جاں اپنی جلالی

ہے دیکھ کے اسکو یہ دعا مہر کے لب پر — اللہ کرے اور بڑھے ہمتِ عالی۔

قطعہ تاریخ از رشحاتِ قلم جادو نگار شاعر نکتہ پرور سخن گستر منشی کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

یہ شاعروں کا تذکرہ یا جام ہے جمشید کا — جی چاہے جس سے ملنے کو مل لو کہ ہیں موجود سب
جانکاہیوں پر آفریں، واہ اے مصنف واہ وا — تحریر ہیں حالات کے کیا کیا اٹھائے ہیں تعب
زندہ ہیں جس سے زندہ دل ممدوح ہیں احسان کش — تاریخ اہلِ فن لکھی محنت اٹھائی روز و شب
دفتر یہ نظم و نثر کا لکھا گیا ہے بے نظیر — جسکے تمام اوراق ہیں سو سو ترقی سے سبب
محشر نے سالِ طبع کو یوں خاتمہ پر لکھدیا — خمخانۂ جاوید میں ہے نسخۂ حسنِ ادب
۱۹۱۵

قطعہ تاریخ تراوش خامہ جادو نگار مجموعہ فصاحت و بلاغت گلدستہ ذہانت و ذکاوت شاہد باز رعنائی خیال شاعر باکمال پروفیسر مولٰنا حامد حسین صاحب قادری ساکن بچھرایوں پروفیسر [illegible] کالج

تذکرہ مطبوع شد "خمخانہ جاوید" نام — ہست این کانِ سخن جانِ سخن شانِ سخن
حامد اگر فکر داری سالِ ترتیبش بگو — میکدہ گویا کشادہ بہرِ مستانِ سخن
۱۹۱۴ء

ایضاً

ذنگ ہیں سارے حسینانِ جہاں — تذکرہ میں ہے وہ شانِ دلبری
چھپ کے جب نکلا تو دل نے یہ کہا — آج نکلا تذکرہ بنکر پری
۱۹۱۴ء

ایضاً

کیفیتیں درجِ تذکرہ ہیں — سب فنِ سخن کے ماہروں کی
حامد لکھو سالِ جلدِ ثالث — تاریخ ہے یہ بھی شاعروں کی

ایضاً

گلِ اشعارِ سخن سنجاں سے — ہوا آراستہ کاشانۂ نظم
کہدو تاریخِ اشاعت **حامد** — یہ بھی اچھا ہے پریخانۂ نظم
۱۹۱۵

ایضاً

اسی تذکرہ سے ہے رونق سخن کی — کیا اس نے احسان سب شاعروں پر
کہی اسکی تاریخ **حامد** نے فوراً — یہی بادۂ شاعری کا ہے ساغر
۱۹۱۵

ایضاً

حوریں ہیں جس میں نثر کی جنت یہی ہے وہ — پریاں ہیں جس میں نظم کی وہ قاف ہے یہی
تاریخ ایک مصرعۂ روشن سے ہے عیاں — آئینۂ عروسِ سخن صاف ہے یہی
۱۳۳۳ھ

ایضاً

شایقِ فنِ سخن کے واسطے
کچھ عجب دلچسپ مجموعہ ہے یہ
کہدو حامد تذکرہ کا سالِ طبع
ظاہر و باطن ہیں دو نو زیب دہ

ایضاً

یہ تذکرہ ہزار دستان
شائع ہوا با ہزار تزئین
جلوہ گستر ہیں تذکرہ ہیں
اہلِ سخن پسین و پیشیں
ہیں صاحبِ تذکرہ سیہ سرام
بیشک ہیں وہ مستحقِ تحسین
وہ رشکِ مصورانِ چیں ہیں
یہ رشکِ نگار خانۂ چیں
دو سال ہیں ایک مصرعے ہیں
(باغِ نیرنگ) و (باغِ رنگیں)

صاحبِ تذکرہ ہیں خود ساقی بادۂ سخن
ساقی بادۂ عنب آپ سا ذی کرم نہیں
ساغرِ بادہ ہیں وہ سب شعر جو تذکرہ میں ہیں
جن کے مقابلے میں کچھ قیمتِ جامِ جم نہیں
سال کی فکر تھی مجھے ہاتفِ غیب بول اٹھا
میکشِ شاعری کو بھی میکدہ سے یہ کم نہیں

ایضاً

واہ کیا باغِ سخن آج نظر آیا ہے
شاد ہر شاعرِ اردو کا دلِ غمگیں ہے
شعرا اسکے ہیں مالک تو مولف اسکا
باغباں اسکا ہے اور لائقِ صد تحسیں ہے
جو غزل اسمیں ہے گلبن سے نہیں شان میں کم
تذکرہ کا جو خریدار ہے وہ گلچیں ہے
بوئے گل سے ہیں سوا روح فزا معنی شعر
شاخِ گل شعر ہے ہر لفظ گلِ رنگیں ہے
دیکھی یہ شان تو حامد نے یہ تاریخ کہی
واہ یہ تذکرہ اک گلشنِ نو آئیں ہے

قطعات تاریخ تراوشِ خامۂ جادو طراز شاعرِ بے نظیر سخنور پُر تاثیر منشی گوری شنکر صاحب قیصر انسپکٹر چونگی شاگرد حضرت ظہیر مغفور و برادر سخنور باکمال منشی بہاری لال مشتاق

جلوہ گر یہ گوشۂ خجلتِ دہِ مہتاب ہے
آج ہے اللہ کیسا نور افشاں آسماں
کہہ رہا ہے آج کچھ عقدِ ثریا کا نکھار
کر رہے ہیں کہکشاں سے کچھ ستارے شوخیاں
دل میں اٹھتی ہے کبھی جاتی ہے آنکھوں میں بہار
رنگِ عارض کیا حسینوں کا شفق میں ہے نہاں
چاندنی چٹکی ہوئی پھیلی ہوئی ہے بوئے گل
باغِ عالم بنگیا ہے رشکِ گلزارِ جہاں

کونسا ہے شاہدِ رنگیں ادا جلوہ نما — چھوٹتی مہتاب کے رُخ پر بھی ہیں مہتابیاں

فرطِ عشرت ہر طرف وہ نور برسانے لگا — کر دیا ہے چار جانب ایک نورانی سماں

یک بیک مغرب کی جانب سے اٹھی کالی گھٹا — بجلیاں سی جسکی رگ رگ میں نظر آئیں طپاں

دُور سے پانی کی لہریں صاف آتی ہیں نظر — اسقدر لبریز ہے ابرِ سیہ دامن فشاں

آرہی ہیں کیا ہوائیں عطر افشاں سرد سرد — ہو گیا جس سے مشامِ جاں بھی رشکِ بوستاں

عطر افشاں ہے صبا تو ابر گوہر ریز ہے — پڑ رہی ہیں آسماں سے ننھی ننھی بوندیاں

ہو گیا ہے صاف اب گردِ کدورت سے چمن — بنگیا صحنِ گلستاں مثلِ قلبِ صوفیاں

کھل رہے ہیں پھول ہر سو بوئے خوش ہے ہر طرف — ہو گئی ہے کیا و چنداں زیبِ گلزارِ جہاں

شاخِ گل مستی سے آتی ہے نظر ساغر بدست — مست ہو کر اس طرح کچھ جھومتی ہیں ڈالیاں

اک فقط گل ہی نظر آتا نہیں رنگیں قبا — باندھ لیں کلیوں نے بھی سر پر گلابی پگڑیاں

پھر رہی ہیں آج اترائی ہوئی کیا بلبلیں — نغمہ سنجی ہیں ہے جنکی اک مسرت کا نشاں

سبزۂ بیگانہ بھی اب تو یگانہ بن گیا — سبزہ رنگوں کی طرح ہے سبز سارا گلستاں

دل میں کہتا تھا یہ میں اللہ ہے کیسی خوشی — کیوں مسرت ریز ہر سو ہو گیا سارا جہاں

اب نہیں عشاق کے لب پر کہیں آہ و بکا — بیوفائی چھوڑ بیٹھے ہیں حسینانِ زماں

ابرُو کے بانکپن میں اب نہیں اندازِ ظلم — اب نہیں ہے تیغ جوہر دار وہ موئے میاں

مطلعِ مہر و وفا کا صاف ہے آنکھوں میں رنگ — مصرعۂ برجستہ گویا بن گیا قدِ بتاں

اب نہیں ترچھی نظر میں تیر کے انداز وہ — اب نہیں لیتی ہے بل کی کاکلِ عنبر فشاں

اُٹھ گیا جور و ستم کا اب زمانے سے رواج — بنگئے ہیں اب جہاں میں عیب سارے خوبیاں

شاہدِ رنگیں ادا نے سحر کچھ ایسا کیا — سبکو یکساں کر دیا ہے اے **ضمیر** نکتہ داں

کچھ خبر بھی ہے تجھے غفلت تری یہ تا کجا — ہو گیا عالم میں اک ناز آفریں جلوہ کناں

چھپ گئی جلد سوم خمخانۂ جاوید کی — جس میں لکھا ہے کلامِ نغز گویانِ جہاں

واہ اے لالہ سری رام اے سخن پیرائے دہر
کر دیا مخمور اک عالم کو وہ ساغر دیئے
ہے یہ مے اک آتشہ، دو آتشہ، سہ آتشہ
چھانٹ کر شائع کیا ہے وہ کلام دلپسند
ہے سکندر کا یہ آئینہ کہ جامِ جم کہوں
چھپ چکا جب تذکرہ لالہ سری رام آپ کا
اسکے چھپ جانیکا سمت تو یہ لکھدے اے قصیر

واہ اے خمخانۂ جاوید کے پیرِ مغاں
ہوگئے پُر کیف اس مے کے جو ہیں لذت چشاں
حال و ماضی کی ہے اس مینا میں رنگت بیگماں
جسپہ شیدا ہوگئے ہیں کل حسینانِ جہاں
لکھ نہیں سکتا جو لکھے کوئی اسکی خوبیاں
دی ندا یہ ہاتفِ غیبی نے مجکو ناگہاں
ہوگیا خمخانۂ جاوید مشہور جہاں

لوگ قربان ہو کے کہتے ہیں
آنکھیں دنیا کی ہوگئیں روشن
شعلۂ خوش شاعروں کا لکھا ہے حال
سالِ تاریخ ہے قصیر یہی

۱۹ ۷ ۲
غیرتِ حور تذکرہ یہ ہے
واہ کیا نور تذکرہ یہ ہے
روکشِ طور تذکرہ یہ ہے
چشم بد دور تذکرہ یہ ہے
۱۴ ۱۹ ع

دیگر

سری رام صد آفریں آپ کو
زبانوں پہ دنیا کی ہے اس کا نام
مجھے اسکی تاریخ کی فکر تھی
ندا غیب سے آئی لکھدے قصیر

یہ محنت سے لکھا ہے کیا تذکرہ
اسی کا ہے اب جابجا تذکرہ
یہی دوستوں میں ہوا تذکرہ
عجب شان کا جاں فزا تذکرہ

دیگر

عیاں تذکرہ کی ہوئیں خوبیاں
قصیر اسکی تاریخ ترتیب لکھ
لکھا کیا تذکرہ لالہ سری رام
قصیر اس کا لکھو تم سالِ ہجری

کھلا آج جوہر سری رام کا
کہ نامی ہے دفتر سری رام کا
۱۳ ھ ۳ ۲
کھلا ہے دہر میں گویا چمن یہ
چھپا ہے اک گلستانِ سخن یہ
۱۳ ۳ ۳ ع

دیگر

نہ کیوں فیضیاب اس سے ہو اک جہاں
کہی اسکی تاریخ ہیں نے قصیر

چھپا تذکرہ یہ بڑے کام کا
عجب ارمغاں ہے سری رام کا
۱۴ ۱۹ ع

لکھا ہے جامع یہ تذکرہ کیا سخنوروں کا ہے حال سارا
جہاں میں ثانی نہیں ہے جس کا دکھائے اِس کا جواب کوئی
کوئی جو خوش ہے تو کوئی غمگیں جہاں میں لاکھوں ہیں دوست دشمن
ہوا ہے مسرور کوئی اِس سے بنا ہے جلکر کباب کوئی
کلام سارے سخنوروں کا لکھا ہے کُل حال شاعروں کا
سُنی نہ دیکھی کبھی کسی نے جہاں میں ایسی کتاب کوئی
چمک یہ کس کی ہے نور کس کا زمانہ جس سے ہے جگمگایا
اُتر کر آیا ہے آسماں سے زمیں پہ کیا آفتاب کوئی
یہ اس کا ہر شعر کہہ رہا ہے کہ منتخب ہوں زمانے بھر کا
ورق ہے یا عارضِ حسیں ہے دکھائے ایسا شباب کوئی
مہک ہے اسکی وہ روح پرور مشام جاں جس سے ہو معطر
کھلادیا اک چمن سراسر کرے گا کیا انتخاب کوئی
چمک گئے گوہرِ مضامیں، ہیں شعر سب نخچۂ نگاریں
کہ ماند ہوں جس سے ماہ و پرویں دکھائے کیا آب و تاب کوئی
کہیں فروزاں دماغ رنگیں، کہیں نمایاں ریاضِ گلچیں
پیا ہے خونِ جگر کسی نے ہوا کہیں فیض یاب کوئی
دماغ کے ساتھ صرفِ زر ہے یہ ہے سریرامؔ ہی کا حصّہ
کبھی جہاں میں کہیں ہوا ہے **قصیریوں** کامیاب کوئی
یہ کسکی ہمت تھی اس طرح سے کہ تذکرہ شاعروں کا لکھّے
پلائے آبِ حیات سکو جہاں میں لے یوں ثواب کوئی
خیالِ عالی کو ہے یہ شایاں کہ ناز و تمکیں رہے نمایاں

جواب بنجائے آسماں کا جو سر اٹھائے حباب کوئی
ضرور سمجھیں گے نکتہ پرور کہ پھول انکے ہیں منتخب تر
نہ ایسی رنگت نہ ایسی خوشبو ہزار دیکھے گلاب کوئی
کیا ہے اے دل کمال کیسا کہ عطر کا عطر کھینچ لائے
درِ سخن منتخب کیا ہے گہرفشاں ہے سحاب کوئی
جہاں میں اہلِ کرم بہت ہیں مگر یہ ہمت کہاں کسی میں
کھپائے یوں جان زار کوئی لٹائے زر بیحساب کوئی
کہاں ہیں اب ایسے قدر افزا ہر اک ہے نام آوری کا جویا
کسی کو عہدے کی ہے تمنا تو مانگتا ہے خطاب کوئی
بنایا خمخانۂ نگاریں سبیل اس میں ہے رشکِ کوثر
سرور ہے جس کا روح پرور نہ ایسی دیکھی شراب کوئی
بھرا ہے رنگیں وہ اس میں بادہ سہ آتشہ سے بھی ہو زیادہ
دکھائے ایسی کتاب کوئی پلائے ایسی شراب کوئی
ہے رشکِ صد غنچہ مصرعہ مصرعہ بیان رنگین ہیں سراپا
چمن ہیں یا شعر ہیں یہ رنگیں کھلا گلستاں کا باب کوئی
کہا یہ ہاتف نے عیسوی ہو **قصیر** تاریخ طبع اسکی
چھپا ہے کیا تذکرہ یہ نادر نہیں ہے جس کا جواب کوئی
۱۴ ۱۹ ۶

قطعۂ تاریخ از تصنیف منیف منشی بنائک پرشاد صاحب شریف ساکن نواح بنارس

بہر تاریخ غنچۂ جاوید — فکر تھی کوئی مختصر کہیے
آ گئی اتنے میں یہ شریف ندا — اسکو منظوم نامور کہیے

دیگر

تاریخ ہزار داستان شد — از غیب ہمیں شریف مسموع
کز فیض تکرمی سر پرام — کتب نایاب گشت مطبوع

پئے تاریخ غنچۂ جاوید | چشمِ ہاتف کا یوں اشارا ہے | دیگر | کہ لکھو ہو شرف بیاں سکا | تذکرۂ نظم عالم آرا ہے ۱۳۳۳ھ

قطعات تاریخ از نتائج فکر نخلبند گلزار معانی طوطی شکرستان خوش بیانی، سخنور نازک خیال منشی پیارے لال رونق دہلوی تلمیذ رشید حضرت راسخ دہلوی صاحب دیوان رونق سخن

پھر بنا ابر سایۂ رحمت — پھر ہے ہر سمت بارشِ عشرت
پھر بہارِ نشاط آئی ہے — پھر کھلے باغ میں گلِ راحت
پھر بچھا فرش سبز مخمل کا — بدلی صحنِ چمن کی پھر رنگت
پتہ پتہ زمرّدیں ہے آج — ہے عیاں حُسن جوہرِ قدرت
نخلِ امّید پھر پھلا پھولا — پھر نظر آئی عیش کی صورت
شاخ ہر گل پہ ہے بہارِ نئی — ہر شجر کو ملا نیا خلعت
برگ و بار چمن نمونۂ حق — رنگِ ہر گل سے ہے جلوۂ صنعت
لوٹ ہے دل بہارِ تازہ پر — فرح بخشِ و ماغ کیفیت
نغمۂ طوطیانِ گلشنِ ہند — غلغلہ سازِ خوبئ فطرت
ہر سخن وقفِ زمزمہ سنجی — بانگ بانگِ ترانۂ عشرت
کوئی پڑھتا ہے کلمہ یا ہو — ہے کسی لب پہ نعرۂ وحدت

شورِ بلبل برنگِ سازِ آہنگ — نالۂ دل سے نغمۂ راحت
اب کہاں الغیاث و وا فریاد — کر سکے شور کسکی ہے طاقت
دیکھنے کو نظر ہیں کلفتِ دل — صاف روشن ہے آئینہ صورت
مست صہبائے نظمِ عیش جہاں — لب پہ ہے ذکرِ ساغرِ راحت
پھر جما آج رنگِ خمخانہ — رنگ پھر لائی مستئ عشرت
پھر ہے شورِ نشاط رندوں میں — جشنِ شادی کی پھر بجی نوبت

رنگِ دورِ سرورِ بادہ سے — صوفیوں کی بدل گئی نیت
وجد میں جھومتے ہیں مستی سے — ہے نگاہوں میں حسن کیفیت
غش ہیں حسنِ مئے سخن پر آج — زاہدوں کی تھی یہ کہاں قسمت
دیکھتے ہی اُدھر سرور آیا — ہو گئے مست بادۂ الفت
کر رہے ہیں طوافِ چشمِ بتاں — کیفِ مستی سے ہے عجب حالت
چھلکے پھر ساغرِ گلِ مضموں — مئے معنی کی پھر کھلی رنگت
رنگ لائے نہ کیوں سرورِ نشاط — دے نہ دورِ خمار جب فرصت
جسکی مشتاق دید تھیں نظریں — جلوہ گر وہ ہوا بصد زینت
رُونمائی ہے ایسے شاہد کی — جانِ عشاق جسکی ہے قیمت
یعنی وہ تذکرہ ہوا شائع — جسکی دنیا میں ہو گئی شہرت
ہر ورق رشکِ روئے محبوباں — چشمِ بینا کو جس سے ہو حیرت
سطریں ہیں کاکلِ مسلسلِ یار — مصرع مصرع ہے غیرتِ قامت
بانکپن کی ادا ہے لفظوں میں — نقطہ نقطہ ہے خال کی صورت
دلفریبِ زمانہ ہیں اشعار — شوخیٔ نظم سے عیاں جدّت
حسنِ معشوق کی ہے اِک تصویر — نقشِ آئینہ، نقشۂ حیرت
اِسکی اک شان میں ہیں حُسن ہزار — رنگِ وحدت میں جلوہ گر کثرت
دائروں پر ہے ماہِ نو قرباں — حسنِ تحریر پر فدا شوکت
مطلع مطلع ہے، مطلعِ انوار — جسپہ صدقے ہے مہر کی طلعت
جدولیں رشکِ کہکشانِ فلک — گوشہ گوشہ ہے آفتاب صفت
لوح لوح جبینِ حورِ بہشت — چرخ پر جس سے ماہ کو خجلت
دیکھکر رنگِ حُسن کی شوخی — تڑپے خورشید برق کی صورت

رنگ ہیں اس میں وہ عجیب و غریب / بن گیا ہے کرشمۂ حیرت
شانِ مضمونِ نو میں شانِ جمال / حسنِ معنی میں جلوۂ صنعت
دلفریبی و دلبری اسکی / رکھتی ہے ایک رنگِ محویت
لفظ لفظ اس کا سحر سازِ جہاں / فقرہ فقرہ نمونۂ صنعت
رنگِ صوری پہ معنوی کو فروغ / حسنِ صورت سے ہے فزوں سیرت
ہے یہ ایک جلوۂ ہلالِ عید / انگلیاں اٹھتی ہیں دمِ رویت
طالبانِ جمال کو اپنے / بخش دیتا ہے حسن کی دولت
دل میں بنکر سرور رہتا ہے / خالِ مردم میں نور کی صورت
عطر بیز جہاں گلِ مضموں / اسکی ہے ہر دماغ میں نکہت
اس میں ہے ذکرِ شاعرانِ ہند / جن پہ نازاں ہے نازشِ شہرت
ہر سخن ان پہ فخر کرتا ہے / ان سے ہے ہر کلام کی زینت
عہد کے اپنے عُرفی و سعدی / دل میں شوخی ہے طبع میں جودت
انکی ہے ہر دلیل میں منطق / ہر سخن میں ہے اک نئی حجّت
دخل حسنِ کلام میں کسکو / ہو کوئی حرف گیر کیا طاقت
کر دکھاتے ہیں کاہ کو یہ کوہ / اللہ اللہ خیال کی رفعت

علمِ ہیئت میں، علمِ ہندسہ میں / اک کرامت ہے طرفہ ماہیت
ہو اشارے میں طے رہِ مشکل / اک قدم ہے منازلِ وقت
دفترِ نظم دفترِ میزان / ہندسہ ہندسہ ہوا ہیئت
فلسفہ پر اگر اٹھائیں قلم / صفحہ صفحہ ہو دفترِ حکمت
ہاتھ علمِ رمل پہ گر ڈالیں / کھول دیں اک جہاں کی ماہیت
سیرِ سیّارگاں سے آئینہ / ہے نجوم فلک کی سب حالت

نقشہ نقشہ جدا ہے شکل جدا — خانہ خانہ کی اک نئی صورت
حسن معنی کی کھینچی تصویر — انکا ہے ایک رنگِ علمیت
گل کھلاتی ہے شوخیٔ مضمون — ہے فضا اسکی غیرتِ جنت
بند کرتے ہیں کوزہ میں دریا — حسن قلت میں ہیں جوہرِ کثرت
توڑ لاتے ہیں عرش سے تارے — لکھتے ہیں خالِ یار کی جو صفت
وہ خیالِ بلند ہے ان کا — پست ہے جس سے چرخ کی رفعت
دمِ اوصاف ابروئے پُرخم — خامہ بن جاتا ہے ہلال صفت
ہے علوم و فنون پر قادر — ہر ہنر میں جہاں پہ فوقیت
ان کا نیرنگِ طبع ایک طلسم — انقلابِ زمانہ ہے حالت
دل الگ سب سے ہے دماغ الگ — انکی خصلت ہے اک جدا خصلت
رندی و پارسائی ہے شیوہ — ہوشیاری و بےخودی عادت
محفلِ عام انکا رنگِ خیال — خلوتِ خاص گوشۂ عزلت
انکو یکساں کنشت و کعبہ و دیر — دلنشیں ہے خیال کی صورت
ہے کبھی باغ و راغ میں مسکن — گھر کبھی ان کا وادیٔ وحشت
ہیں کبھی محوِ یادِ روئے بتاں — ہے کبھی ذکرِ یار سے نفرت
ہے کبھی معرفت پہ چشمِ ادب — ہے بتوں سے کبھی انھیں رغبت
رازداں ہیں کبھی حقیقت کے — ہیں کبھی محوِ حسنِ کیفیت
ہیں کبھی فرطِ شوق میں مضطر — کبھی صبر و سکوں سے ہی خلوت
ناتوان و نحیف و زار کبھی — کبھی حاصل جہاں کی قوت
کبھی آہوں کی سرد بازاری — ہے کبھی تیز آتشِ الفت
مائلِ سیرِ آسماں ہیں کبھی — کبھی فرشِ زمیں ہیں خاک صفت

گلۂ جورِ آسماں ہے کبھی
کبھی حق سے شکایتِ قسمت

کبھی بیماریٔ فراق ہیں
شربتِ وصل سے کبھی صحبت

دل کبھی یاس و غم کا کاشانہ
آرزوؤں کا گھر کبھی راحت

دلِ پراگندۂ سخن ہے کبھی
چمنِ نظم سے کبھی فرحت

جلوۂ حسن ہے نظر میں کبھی
کبھی بے نور دیدۂ حسرت

ہیں کبھی نازکیٔ گل پہ فدا
ہے کبھی بوئے باغ سے نفرت

کبھی ماتم کدہ نظر میں جہاں
خانۂ عیش ہے کبھی تربت

کبھی دلدادۂ حسیناں ہیں
ہے کبھی حورِ خلد کی چاہت

ہے شریعت میں دخلِ شرک کبھی
ہے کبھی ان کو حجتِ بدعت

ننگِ و نام و نمود ہیں یہ کبھی
کبھی خواہانِ خلعتِ عزت

کبھی خودکاریوں پہ نازاں ہیں
کبھی فعلِ عبث پہ ہے لعنت

ہے کبھی خوئے انتہائے نیاز
کبھی علم و عمل پہ ہے نخوت

سخنِ تلخ اور لبِ شیریں
زہر میں ہے حلاوتِ شربت

انکی فکرِ رسا مطیعِ شوق
ان سے کب ہے خیال کو فرصت

نقشِ دل حسنِ نقشِ بوقلموں
ہے نظر میں جہاں کی کیفیت

ہے خودی انکی بیخودی کی مثال
ہوشیاری میں ہے نہاں غفلت

ان سے ہے بزمِ صوفیاں آباد
گرم ہے حال و قال کی صحبت

کبھی مجذوب ہیں، کبھی سالک
متغیر ہے ہر گھڑی حالت

رنگ ڈھنگ انکے سب نرالے ہیں
انکی دنیا سے ہے نئی خلقت

نے غمِ زر نے غمِ کالا
ایک ہے انکو عشرت و عسرت

ہوں بیاں وصف کیا مؤلف کے
ہے یہ سب آپکے فیض کی برکت

وُہ سری رام منبعِ خوبی | مخزنِ جود و صاحبِ ہمت
ذی ہمم، ذی شعور، ذی رتبہ | ذی کرم، ذی تبار، ذی حشمت
نیک دل۔ نیک ذات، نیک نہاد | نیک خو، پاک باز، خوش طینت
خوبی و وضع، اک غلامِ خاص | خادمِ بابِ عام ہے شوکت
لاکھ جوہر ہیں انکی اک خوبی | لاکھ اوصاف انکی ایک صفت
غیر ممکن جو پاس آئے غرور | خُلق سے اُنکے دُور ہے نخوت
ہمہ دانِ جہاں مشیر و انیس | ماہرانِ فنون سے صحبت
انکا اقلیمِ نظم میں سکّہ | ہر دیارِ سخن میں ہے شہرت
جانچ لینا سخن کو نظروں میں | ہے کرشمہ کلام کی صحبت
لکھدیا تذکرہ وہ لاثانی | ہر صفت اُسکی اک نئی ہے صفت
بن گیا کان جوہر و زر کی | اسپہ قربان کی ہے وہ دولت
ہر سخن کو طفیل سے اسکے | مل گیا آج تمغۂ عزت
انتخابِ کلامِ نادر سے | شاعروں کی ہوئی فزوں عظمت
نغز گویانِ ہند کو بخشا | شرفِ خدمتِ درِ دولت
حُسنِ ظن ہے کلام سے ظاہر | طبعِ روشن کی آئینہ جودت
دولتِ علم پاگیا گویا | مل گئی جسکو آج یہ نعمت
جو نہ پاتا تھا نام وُہ پایا | جو نہ ہوئی تھی وہ ہوئی شہرت
ہیں یہ پیرِ مغانِ "خمخانہ" | بھر دی ہر دل میں مستیِ عشرت
وہ لنڈھائے ہیں ساغرِ مضمون | پائی رندی نے زہد پر سبقت
اِس میں لُطفِ مے سہ آتشہ ہے | نشہ ہے اِسکا باعثِ فرحت
واعظ و شیخ و صوفی و زاہد | کی ہے اِن سب نے آپ سے بیعت

ہے یہ بنیادِ میکدہ ان سے
دم قدم سے انھیں کے ہے زینت

خوبیٔ دَورِ دوم و اول
کر گئی سب کو محو صد حیرت

صنعتِ حق سے رنگِ دورِ سوم
جلوہ اس کا ہے جلوۂ قدرت

نقشِ آئینۂ جہاں ہے یہ
جامِ جم کی ہے اِس میں خاصیت

ہے یہ پیوستۂ سرور و نشاط
اِس سے وابستہ ہوئے فرحت

کوششیں انکی لائقِ تحسیں
قابلِ داد و آفریں محنت

تا قیامت جہاں میں شاد رہیں
سر پہ ہر دم ہو سایۂ رحمت

خیر خواہوں کو انکے عیش مدام
دشمنوں کو نصیب ہو زحمت

حسنِ خمخانہ، اور یہ تقریظ
ذرہ کو آفتاب سے نسبت؟

تھا جو رونق کو پاسِ خاطرِ دوست
اسپہ فرمایشوں کی تھی کثرت

لکھدیا پہلے یہ سنِ ہجری
یعنی عکسِ کرشمۂ حیرت ۱۳۳۳

پھر یہ نکلا قلم سے برجستہ
کہ، ہے خمخانۂ مئے راحت ۱۷ ۱۹ ب

پھر کہا اور مصرعۂ رنگیں
ہے عجب دَور ساغرِ بہجت ۱۹۱۷

پھر یہ تاریخ عیسوی لکھدی
ہے یہ اک حسن غنچۂ فرحت ۱۹۱۵ء

ہر بیت اسکی سلکِ دُرِ آبدار ہے
قطعۂ دیگر
کس آب تاب کا ہے یہ واللہ تذکرہ

ہے اِسکی شانِ حسن پہ چشمِ جہاں فدا
آئینہ سامنے ہے کبھی۔ گاہ تذکرہ

جلوہ ہے اِس کا جلوۂ رنگِ بہار باغ
ہے دلکشا و دلکش و دلخواہ تذکرہ

تاریخ طبع اسکی ہے سمت میں آشکار
رونق کہو۔ یہ خوب چھپا واہ تذکرہ ۱۹۱۷ب

یہ ہے تذکرہ یا بہارِ بہشت
شنو اسکی تاریخ رونق سے تم
دیگر
گلِ نظم کا پُرفضا باغ ہے
سری رام کیا دلکشا باغ ہے ۱۹۱۵ء

لکھا ہے خوب لالہ سری رام تذکرہ
دیگر
گلہائے شعرِ تر کا کھلایا چمن عجب

اِس باغِ پُر بہار کا برجستہ سالِ طبع	رونق سے سُنئیے لُطفِ ریاضِ سخن عجب
جب مرتب ہو چکا مرغوب دلہا تذکرہ	دیکھکر حسنِ کلام فخرِ گویانِ جہاں
بُوئے گلہائے سخن بھی تازگی بخشِ دماغ	دل ہُوا نظّارۂ ہر شعرِ تر سے شادماں
غیب سے آیا یکایک مژدۂ فرحت فزا	لکھدے تاریخ اسکی رونقِ ارمغانِ شاعراں

چون سرِ انجام تذکرہ بنوشت	گشتہ بندہ محو از حیرت
جلد سوم باحسن و خوبی	کرد تیار صاحبِ ہمّت
مست و سرشار شد بیک ساغر	جرعہ نوشے ز بادۂ وحدت
عاشقاں را پیام وصلت داد	یافت ہر دل بشارتِ عشرت
وجد در بزمِ صوفیان آمد	دیدہ باید زحُسنِ کیفیت
لُطفِ صہبائے عیش یافتہ ام	در کلامے کہ داشت نوعیت
فکرِ تاریخ چوں شد ای رونق	داد ہاتف ندا پئے سمّت
از سرِ ہوش ہست مصرعِ سال	واہ خمخانۂ مے راحت

نثر و قطعہ تاریخ از شاعر نازک خیال ناظمِ شیریں مقال منشی عبدالخالق خلیق دہلوی تلمیذ منشی چندر بھان کیفی و حضرت سائل دہلوی

یہ دعا ہے خلیق کی حق سے	تذکرہ ہو یہ زندۂ جاوید

حق تو یہ ہے کہ دوسرا ایسا تذکرہ نہیں لکھ سکتا، کُل اہلِ دہلی کو آپ پر فخر کرنا چاہئیے شعرا کے آپ مسیحا ہیں، مردوں کو زندہ کردیا، اتنا روپیہ خرچ کرنا اور اتنی عرق ریزی کرنی بڑی مشکل ہے، بلکہ غیر ممکن ہے، یہ آپ کو ہی خدا نے غیور دل عطا فرمایا ہے، آپکا احسان نہ مانے کونسا ناداں ہے، قطعات تاریخ ارسال کرتا ہوں، گر قبول اُفتد زہے عز و شرف +

بارک اللہ کیا زمانہ ہے!	رات ہے شب برات دن ہے عید

جام ملتے ہیں ہر گھڑی ہر دم
بادہ خواروں کو ہے یہ سالِ سعید

پھر چھلکتے ہیں شیشۂ عشرت
پھر لبالب ہے ساغرِ امید

پارسائی کی روح کھنچتی ہے
بادۂ ناب ہو رہی ہے کشید

میکدے پر ہے بھیڑ جوش میں ہیں
توڑ ڈالیں گے رند سدِّ سدید

بادۂ ناب کی سبیل سے لگے
مے گساروں کی ہے یہی تاکید

ساقیِ مست سے ملا ہے دل
ہاتھ آئی ہے میکدے کی کلید

ہے خدائی کا نور آنکھوں میں
بن گئے جام ساغرِ جمشید

نوٹ پر نوٹ دے رہے ہیں آج
پیگ پر پیگ کر رہے ہیں خرید

وصول دھپے کی شیخ سے بھڑے
ایسے گستاخ ہیں مغاں کے مرید

دخترِ رز ہے بغل میں رندوں کی
محتسب کو نہ مل سکے گی رسید

آج مے نوش شادماں کیوں ہیں
میکدہ کیا کھلا ہے کوئی جدید

عشرت افزا ہے قلقلِ مینا
بادہ خواروں میں ہو رہی ہے عید

اور جاری ہوا ہے خمخانہ
مے کشی کے لیئے ہوئی تاکید

شیشے شعر و سخن کے ڈھلتے ہیں
علم کی ہوتی ہے شراب کشید

روح پرور کہیں شراب کہن
عشرت افزا کہیں ہے دورِ جدید

جسکے ہر رنگ میں نرالا رنگ
جس کی تجدید میں نئی تجدید

صفحہ صفحہ ہے روکشِ جاناں
مصرعہ مصرعہ ہے ابرؤں کی کشید

نقطہ نقطہ ہے خالِ محبوباں
مطلع مطلع ہے مطلعِ خورشید

عقدِ پرویں ہے ہر سطر اسکی
دائروں میں ہے صورتِ ناہید

تیوری میں پڑے ہوں بل جیسے
اسکے ہر حرف پر ہے یوں تشدید

شاعروں کا ہے حالِ تاریخی
یہ مبارک ہے ارمغانِ جدید

ہے سری رام کا یہ خمخانہ
علم کی جاں ہیں آپ ہیں ایم۔اے
ایک ہیں اپنے وقت کے نقاد
تذکرہ باغِ جاں فشانی ہے
خوب اشعار انتخاب کیے
صدقے سحبان ہے فصاحت پر
یوں تو سب شعر چھانٹ لیتے ہیں
اب اگر لکھتے گلشنِ بیخار
عاشقوں کا کہیں فسانہ ہے
جوش پر پھر بہار آئی ہے
بزم عرفاں کے سین کھینچے ہیں
کیوں نہو آپ خاندانی ہیں
نام مشہور تھا مدن گوپال
اونر سیل کی عزت افزائی
آپ اُنکی ہیں آنکھ کے تارے
دولت و جاہ کی ترقی ہے
شوق ہے تذکرہ نویسی کا
تذکرہ یہ خلیق ایسا ہے
بہرِ تاریخ صاف مصرع ہے

ذات جنکی ہے غیرتِ جمشید
حُسنِ ظاہر ہیں جلوۂ خورشید
لوگ کرتے ہیں آپ کی تائید
کہہ رہی ہے زباں سے تمہید
کردیا ختم حُسنِ قطع و بُرید
آپکے ہاتھ چومتا ہے لبید
لطف جب ہے کہیں نہو تنقید
کرتے بے شبہ آپ کی تقلید
محفلِ یار کی کہیں ہے وید
پھر ہرے ہو رہے ہیں زخم شدید
نور افگن ہے جلوۂ توحید
والدِ ماجد آپکے تھے وحید
شان رائے بہادری کی پدید
کیا بیاں ہو زباں سے وصفِ حمید
جلوہ آرا ہیں صورتِ خورشید
مرتبے پر نثار بختِ سعید
نام روشن کرے گا کارِ مفید
سب کریں اسکو جان و دل سے خرید
بے خزاں گلشنِ بہارِ امید
۱۳۴۳

تذکرہ لالہ سری رام نے لکھا ایسا
کتنا زیبا ہے زمانے میں جسے جانِ سخن
باغِ مضمون میں چھائی ہیں بہاریں کیا کیا
سب شگفتہ ہیں گل و لالہ و ریحانِ سخن

مصرع مصرع پہ فدا اُردو زباں کے شاعر
لہریں لیتا ہے سمندر کی طرح حسن کلام
آپ کس فکر میں بیٹھے ہیں خلیق شادان
نکتہ نکتہ پہ ہیں قربان ہمہ دان سخن
معدن گوہر مضمون ہے یا کانِ سخن
اسکی تاریخ ہے ۔ زیبِ چمنستانِ سخن

کیا پر یزداں ہے یہ خمخانہ
فکر تاریخ سے ہے خلیق اگر
واقعی اسے خلیق خمخانہ
ایک مصرع ہیں دو ہیں تاریخیں
دیگر
جلوہ حسن پر ہیں سب شیدا
لکھ چمن ہے نظیر نا پیدا
بے خزاں گلشنِ مضامیں ہے
باغ نیرنگ ، باغ رنگیں ہے

سر برآم ہیں خانداں کے چراغ
لکھو پھر تاریخ سمت خلیق
عجب نام روشن کیا باپ کا
رہے تا ابد تذکرہ آپ کا

یہ تیسری جلد چھپ گئی ہے
مداح ہیں سب ترے سر برآم
گاتے ہیں تری ثنا کے سب گیت
اس نسخہ سے تو ہے زندہ جاوید
مصرع ہے کہ سلکِ دُرِ شہوار
افسوس بھی ہیں اسمیں شاعروں کے
آخر میں ہے اسکے عیسوی سن
لکھا ہے خلیق نے یہ سائل[1]
دیگر
اُس تذکرہ کی جو ہے یگانہ
کرتا ہے صفت تری زمانہ
لب پر ہے جہاں کی یہ ترانہ
خم خانہ کا ہے یہ شادیانہ
صفحہ ہے کہ گوہریں خزانہ
نیز اہل سخن کا ہے فسانہ
بہتر نہیں طولِ شاعرانہ
"ارژنگِ سخن نگار خانہ"

قطعۂ تاریخ شاعر خوش بیان منشی سید محمد قاسم صاحب حزیں سونی پتی

بل بے بادِ بہار کی رفتار
عطر بیز نسیم صبح سے ہے
ہر گلی کوچہ بن گیا گلزار
دشت بر زن دکانچۂ عطار

[1] یہ مادۂ تاریخ جناب خلیق کا ہے اور مصرعے مکرمی مرزا سراج الدین احمد خان سائل نے لگائے ہیں ۔

قوت نامیہ بڑھی ایسی　　گل سے پہلے نمو ہیں اشجار
تازگی سے یہ انقلاب ہوا　　خار نرمی سے ہیں گلوں کے ہار
ابر نیساں ہے ابر جود و سخا　　آب گوہر ہے قلزم زخار
فلس ماہی کی طرح سے افلاس　　پہنے پھرتا ہے جامۂ دینار
پارۂ کاسۂ گدائی ہیں　　سبز گل جام جم کی ہے اظہار
دیکھو آئینۂ سکندر کو　　کیا حیراں ہے پشت بر دیوار
کیوں ہے پھر یہ تماشۂ حیرت　　کیا کسی نوعیت کا ہے اظہار
ہاں کسی مست ارغوانی نے　　میکشوں کے لیئے کیا تیار
ایک ایسا عجیب خمخانہ　　نام سے جسکے ہو ہر اک سرشار
اے سریرام واہ کیا کہنا　　ایسی تلچھٹ کا اور ایسا نکھار
اسکو لکھوں نگار خانۂ چیں　　یا کہوں اسکو غیرت گلزار
از سر جوش لکھ حزیں تاریخ　　ہے یہ بے مثل مخزن الاشعار
لکھ سن ہجری بے سر بد ہیں　　ہے عجائب خزینۂ اشعار

خلاصۂ تحریر و قطعہ تاریخ از نتائج افکار گہر بار ناظم خوش خیال سخنور عدیم المثال منشی جب لال صاحب رعد وکیل و آنریری مجسٹریٹ بھنڈ ضلع گوالیار

خمخانۂ جاوید کی پہلی جلد میرے پاس پہنچی، اسکی ترتیب، لکھائی، چھپائی، اور عمدگی کاغذ کو دیکھکر طبیعت بہت خوش ہوئی، اور عبارت پڑھکر اور بھی حظ روحی حاصل ہوا۔ آپ کی جانفشانی اور تلاش تہ دل سے قابل داد ہے، واقعی آپنے یہ بہت بڑا کارنمایاں کیا ہے جو تا حشر یادگار رہے گا، اور پڑھنے والے تا ابد جناب کی جانفشانی اور قابلیت کی داد دیتے رہیں گے۔

خوب شعرا کا تذکرہ لکھا	خوب کی جان توڑ کر محنت
باعث افتخار آپ کی ذات	قابلِ داد آپ کی محنت
اک زمانہ ہے آپ کا مداح	ہر نظر میں ہے آپ کی عظمت
زندہ جاوید شاعروں کو کیا	کر کے اُنکے کلام کی شہرت
سچ تو یہ ہے کہ رعدؔ شعرا کو	ملا اچھا ذریعۂ شہرت
دیکھتے ہی پھڑک اُٹھے شعرا	ایضاً تذکرہ کیا ہی لاجواب رہا
سالِ تاریخ کی جو فکر ہے رعد	لکھو یہ انتخاب خوب رہا ۱۹۱۴ء

تقریظ از نتائج افکار ناثر با کمال ناظم شیریں مقال منشی چندو لال صاحب شفق خلف الرشید منشی بہاری لال مشتاق مرحوم تلمیذ حضرت غالب مغفور

میں نے "خمخانۂ جاوید" کی دو جلدوں کو طبیعت کے ذوق اور دل کے شوق سے پڑھا اور تیسری جلد کو بھی جستہ جستہ دیکھا۔ شعرائے ماضی و حال کے جامع حالات اور اُنکے کلام کا انتخاب بلا لحاظ مذہب و ملت کے جو کچھ لالہ سری رام صاحب نے کیا ہے صرف اپنی اعلیٰ سخن فہمی کا ثبوت ہی نہیں دیا ہے بلکہ پبلک کو دکھلا دیا ہے کہ سچائی کے ساتھ کس طرح شعروں کا انتخاب کیا کرتے ہیں۔ "خمخانۂ جاوید" سے پہلے اور بھی کئی تذکرے اِس قسم کے میں نے پڑھے ہیں۔ اور میرے خیال میں مولانا آزاد کی کتاب "آبحیات" نے سب پر پانی پھیر دیا تھا۔ مگر اس کتاب میں بیچارے ہندو شاعروں کو کہیں کہیں فٹ نوٹوں یا حواشی پر جگہ دی گئی ہے اور لالہ سری رام صاحب کے تذکروں میں یہ کمی بھی پوری کی گئی ہے۔ لالہ سری رام صاحب نے پہلے ہر شاعر کا بسیط حال لکھا ہے۔ پھر اُنکے کلام کا ایسا انتخاب کیا ہے کہ اِس سے بہتر شاید ہی کوئی کرتا۔ آپکی دلی خواہش یہ رہی ہے کہ اُنکی کتاب میں کمالِ ہنر دکھلایا جائے اور ہر شاعر مناصب

مناسب پر جگہ پاوے اور پبلک سے انٹروڈیوس ہو۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند*
مجھے مؤلفِ تذکرہ سے بچپن سے نیاز حاصل ہے، وہ لگاتار پچیس سال سے ہندوستان کے
شعرا کے کلام کے انتخاب میں مصروف ہیں اور نہایت مستقل مزاجی اور محنت سے زرِ کثیر صرف کرکے اِس
کام کو خیر و خوبی کیساتھ انجام دے رہے ہیں، حق تو یہ ہے کہ شعرائے اُردو اور اُردو زبان پر جو احسان
آپنے کیا ہے اور کر رہے ہیں یہ صرف آپ ہی کا کام ہے اور پہلے تذکرہ نویسوں کا نام ہی نام ہے۔
میری ایشور پرآتما کی جناب میں پرارتھنا ہے کہ وہ مؤلف صاحب کو عمرِ طبعی عطا فرماوے
اور خمخانہ جاوید کی ساری جلدوں کو اُنکے ہاتھ سے ختم کرائے۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش ست	تو بدیں آرزو مرا برساں

قطعہ تاریخ از نتیجہ طبع وقاد لالہ گوپال سہائے صاحب ساکن گوالیار

سخن سنجو ابھی دیکھا ہی کیا ہے	چھلکنے دو جمالِ دورِ ثالث
سکئے گر نوش اب تک وہی ساغر	تو اب رکھنا خیالِ دورِ ثالث
حیاتِ جاوداں پائینگے شعرا	یہ ہی ہوگا مآلِ دورِ ثالث
ذرا سمجھے ہوئے تاریخ سُن لو	یہ دیکھو ہے، کمالِ دورِ ثالث ۱۳۳۳ھ

از سرِ دوستی و روئے یقین	غایت خبط و ہم زبان سراغ	[illegible]	بر سرِ راہ سالِ عیسائی	خامہ بر کرد زینک چراغ
الحمد دکی سبد ہائے گل نو	خامہ گلچیں بنا کے لایا		گلچیں کی نظر تھی طرز نو پر	دلکو تازہ شگوفہ بھایا
سالِ ہجری سنِ مسیحی	سمت کا پتا بھی سہل آیا		ہے صنعت معنوی توالی	رستا نہیں اک عدد لقبایا
	تاریخ لکھی قلم بھی رکھدی	-	طبع نازک نے چین پایا	

الحمد	حساب از روئے جمل	بروئے توالی	سبد ہائے	ازروئے جمل	بروئے توالی	گل نو	ازروئے جمل	بروئے توالی
ا		۱	س	۶۰	۳۱۴	گ	۲۰	۲۱۰
ل	۳۰	۴۶۵	ب	۲	۳	ل	۳	۴۶۵
ح	۸	۳۶	د	۴	۱۰	ن	۵۰	۲۷۵
م	۴۰	۸۲۰	ہ	۵	۱۵	و	۶	۲۱
د	۴	۱۰	ا	۱	۱			
			ی	۱۰	۵۵			
		۱۳۳۳ھ			۱۹۱۴			۱۹۷۱

تقریظ طبعزاد بلبل چمنستان خوش بیانی سخنور با مذاق منشی چندربھان کیفی دہلوی نواسہ پروفیسر رام چندر صاحب مغفور

آفریں نیک نفس لالہ سریرام ایم اے
تم جیو لاکھ برس لالہ سریرام ایم اے
جی اٹھے اہل سخن سب نے شفا پائی ہے
آپ کے ہاتھ میں اعجازِ مسیحائی ہے
دب رہا تھا جو معانی کا خزینہ اب تک
یاد اشعار تھے جو سینہ بسینہ اب تک
زیبِ اوراق کیا زندہ جاوید ہوئے
ذرّۂ خاک تھے جو مطلع خورشید ہوئے
دھوم آفاق میں خمخانہ جاوید کی ہے
جلد ہر طاق میں خمخانہ جاوید کی ہے
"تذکرہ کھیل نہیں تھا کوئی بچّہ کھیلے
عمر بھر آپ نے اسکے لیئے پاپڑ بیلے"
خاک پنجاب کی چھانی کبھی بنگال گئے
باکمالوں کی ملاقات کو بھوپال گئے
میرزا داغ سے ملنے کو دکن میں پہنچے
میر محبوب علیخاں کے چمن میں پہنچے
دلّی والوں میں رہے لکھنو والوں میں رہے
لطف صحبت کے عجب پاک خیالوں میں رہے
چُن لیا پھول وہ جس پھول میں خوشبو دیکھی
لکھ لیا شعر وہ جس شعر میں رو دیکھی
چارپائی نہ ملی فرشِ زمیں پر بیٹھے
جس جگہ مِل گئے ہمرنگ ہیں پر بیٹھے

آپ کی ہمتِ مردانہ کا خمخانہ ہے
میکشوں کے لئے ہر رنگ کا پیمانہ ہے
بادۂ شعر و سخن پیتے ہیں پینے والے
معرفت سیکھتے ہیں مکّے مدینے والے
مصرع مصرع میں موحد کو ہیں وحدت کے مزے
عاشقِ زار کو ملتے ہیں محبت کے مزے
جامِ جمشید کی ہے جلوہ نمائی اس میں
میکشوں کو نظر آتی ہے خدائی اِس میں
دَورِ افلاک کے نیرنگ دکھائے ہیں کہیں
رنگ اُڑتے ہوئے ہر رنگ دکھائے ہیں کہیں
کھینچ لی رُوحِ سخن رہ گئے دیوان خالی
کر دیئے ہیں مرے گلچین نے گلستاں خالی
کیا طلسمات ہے سب تاگِ سخن ہیں اس میں
ایک گلشن ہے مگر لاکھ چمن ہیں اس میں
دلپسند آپکے گلزار کی گلچینی ہے
سادگی ہے تو کسی شعر میں رنگینی ہے

شہرتِ عام کا دربار بنایا تم نے
بلبلوں کے لئے گلزار بنایا تم نے

مجرا کرنے کے لئے شاعرِ رنگیں آئے
نذر کو گوہرِ خوش آب مضامیں لائے

دیکھنا دیکھنا وہ حسن کے مارے تو نہیں
عشق میں ہمدم و ہمراز ہمارے تو نہیں

انکے دیوان میں اسرار نظر آتا ہے
ہر ورق مصر کا بازار نظر آتا ہے

چوٹ کرتے ہیں کبھی درد کے مضمون دلمیں
ہجر کی رات دمِ سرد کے مضمون دلمیں

پڑ گئے سوزِ تپِ غم سے کسی کے چھالے
تیر بن بن کے اترتے ہیں جگر میں نالے

موسمِ گل میں ہرے زخمِ کہن ہوتے ہیں
ہائے مرجھائے ہوئے پھول چمن ہوتے ہیں

جبہہ فرسا ہے کوئی سنگِ درِ جاناں پر
کوچۂ یار کو دیتا ہے شرف رضواں پر

روئے روشن کا تصور ہے کسی کے دلمیں
شکل لیلیٰ کی جھلکتی ہے کسی محمل میں

زلفِ پیچاں کے خیالوں میں کسیکو الجھن
گیسوئے یار کے کالوں میں کسی کو الجھن

لوٹتا ہے کوئی انداز سے بسمل ہو کر
چشمِ پُرفن نگہِ ناز سے بسمل ہو کر

ناتوانی سے کوئی ہو گیا ایسا لاغر
کہ اجل کو بھی دکھائی نہ دیا بستر پر

آتشِ رشک سے جل جل کے کوئی مرتا ہے
کوئی بدبخت رقیبوں کے گلے کرتا ہے

بعض نیچر کے مرقعوں کے تماشائی ہیں
بزمِ قدرت کے ہر اک سین کے شیدائی ہیں

دن نکلتا ہے تو سورج پہ فدا ہوتے ہیں
رات کو چاند کی سج دھج پہ فدا ہوتے ہیں

توڑ کر عرش سے مضمون کے تارے لائے
چاندنی رات کے نظموں میں نظارے لائے

ہو گئے مست جو گھنگھور گھٹائیں دیکھیں
پردۂ ابر میں بجلی کی ادائیں دیکھیں

مینہ کی بوندوں کو سمجھتے ہیں کہ موتی برسے
باغ کی سیر کو جاتے ہیں نکلکر گھر سے

موجۂ بادِ بہاری کے مزے لیتے ہیں
شعر میں نظم نگاری کے مزے لیتے ہیں

دیکھتے ہیں کبھی اندازِ صبا کا نقشہ
کھینچتے ہیں کبھی پھولوں کی قبا کا نقشہ

لوٹ جاتے ہیں کبھی تختِ چمن کے اوپر
رشک کھاتے ہیں کبھی بختِ چمن کے اوپر

برق کے سین پہاڑوں میں دکھاتے ہیں کہیں　　آب مضمون کے گنگا میں نہاتے ہیں کہیں
آفریں آفریں اللہ رے قدرت کی بہار　　نیچرل شعر ہوئے صنعتِ صانع کے نثار

نشۂ علم کے سرمست بہکتے آئے　　بلبلِ باغ کی مانند چہکتے آئے
ٹکڑے ٹکڑے ہوئی توبہ پہ مصیبت آئی　　وہ برستی ہوئی اللہ کی رحمت آئی
شور رندوں میں مچا دور چلے دور چلے　　ساقیا! ہاتھ ملا اَور چلے اور چلے
بادۂ ہوش رُبا تیر سی دل میں اُترے　　اسقدر تیز ہو شمشیر سی دل میں اُترے
چُور ہو جائیں مگر جائیں نہ میخانے سے　　عہد شیشے سے تو پیمان ہو پیمانے سے
بزمِ تہذیب جسے وِسکی برانڈی دیدے　　کوری کوری مئی گلرنگ کی ہانڈی دیدے
زاہد و شیخ کو منہ چھوٹ پلائے ساقی　　پاکبازوں کی انھیں جھوٹ پلا دے ساقی
میگساروں کو کوئی روک نہیں سکتا ہے　　جسقدر چاہیں پئیں ٹوک نہیں سکتا ہے
سُرخ بوتل میں مئے ناب بھری رہتی ہے　　کیا طلسمات ہے شیشے میں پری رہتی ہے
ہر غزل شیشۂ مینائی ہے میخواروں کی　　پوچھ جنت میں بھی ہے ایسے گنہگاروں کی

حال میں اپنے گرفتار ہیں قومی شاعر　　قوم کے رنج سے بیزار ہیں قومی شاعر
تا خدا سوچ میں ہیں کسکے سہارے لائیں　　کس طرح قوم کی کشتی کو کنارے لائیں
روز طیار ہیں بگڑی کو بنانے کے لئے　　اپنی آواز اُٹھاتے ہیں جگانے کے لیے
جاں نثارانِ وطن قوم کے ہمدرد بنو　　رانا پرتاب کی مانند جوانمرد بنو
خدمتِ قوم سے بہتر نہیں خدمت کوئی　　ایسی عزت کے برابر نہیں عزت کوئی
قومیت ایک ہے آپس میں رہو مل جل کے　　ایک کی ایک سنو بات کرو کھل کھل کے
دیو بانی میں سُناتے ہیں پُدر کی بیتی　　اپنی بیتی کبھی کہتے ہیں کبھی جگ بیتی
بھر دیا جوش مشاہیر کے افسانوں سے　　کہدی گذری ہوئی تاریخ مسلمانوں سے
کون بانی تھا ہر اک علم کے بانی تم تھے　　گر تمدن تھا گھڑی اُسکی کمانی تم تھے

الغرض انکا فسانہ ہے کہ یہ تھا وہ تھا
نظم میں گذرا زمانہ ہے کہ یہ تھا وہ تھا

اور کچھ لوگ چلے آتے ہیں دیوانے سے
کام ہستی سے کچھ انکو ہے نہ ویرانے سے

ہیچ ہے عالم امکان نظر میں ان کی
خاک ہیں عیش کے سامان نظر میں انکی

نقش بر آب سمجھتے ہیں پرستانوں کو
منظر خواب بتاتے ہیں شبستانوں کو

نفس سرکش کیلئے آگ ہیں دلمیں ویش
خواہشیں پھونک دیں برآگ ہے دلمیں ویش

بے ثباتی کے زباں پر ہیں برابر اشعار
دل پہ برچھی کیطرح لگتے ہیں اکثر اشعار

کہہ رہی ہیں کہ جوانی نہ رہی ہے نہ رہے
بہتے دریا ہیں روانی نہ رہی ہے نہ رہے

بلبل و لالہ و گلزار کوئی دن کے ہیں
ناز و انداز و طرحدار کوئی دن کے ہیں

واقعی مرگ تہِ تشنہ ہے سرابِ[1] ہستی
بلبلے بن کے بگڑتے ہیں حبابِ ہستی

عمر ہے حضرتِ انساں کی تماشے کیطرح
سیر ہے نیلے ہے فسونگر کے تماشے کیطرح

پیکرِ حسنِ جہاں نقش ہے پرچھائیں کا
کون رہتا ہے سدا نام رہے سائیں کا

خود فراموش تصوف کے قلندر آئے
ایسے دربار میں بھی گدڑی پہن کر آئے

جلوۂ حسنِ ازل کعبۂ دل کے اندر
ہے ہمہ اوست ہمہ اوست کا نعرہ لب پر

ایسے مجذوب کہیں ہیں تو کہیں کی باتیں
عرش کی کہتی ہیں پوچھو جو زمیں کی باتیں

انکے اشعار ہیں توحید کی یکتائی ہیں
آپ ہی آپ نظر آتے ہیں تنہائی میں

رام تیرتھ کی طرح کہتے ہیں آزاد ہیں ہم
سچدانند ہیں آنند ہیں دلشاد ہیں ہم

ماسوا ذات حقیقی ہے کوئی اور نہیں
وہم کا سانپ بھی رسی ہے کوئی اور نہیں

کثرتِ ذات نہیں ایک ہے نورِ عرفاں
آپ ہی ذاتِ احد آپ ہی ذاتِ انساں

آپ ہی عبد ہوئے آپ ہی معبود ہوئے
آپ ہی سجدہ کیا آپ ہی مسجود ہوئے

آپ ہی پھول بنے آپ ہی گلزار بنے
آپ ہی گل کے لیئے بلبل بیمار بنے

آپ ہی آپ ہیں ہم غیر کا کچھ کام نہیں
ذاتِ مطلق میں کہیں شکل نہیں نام نہیں

[1] سراب

"در حقیقت دگرے نیست خدا ہیچم ہمہ
لیک از گردشِ یک نقطہ خدا ہیچم ہمہ"

الغرض رند ہیں ہر رنگ کے خمخانہ میں
دور ہیں مے سے کبھی بنگ کے میخانہ میں

خوب سرچشمۂ اعجاز بیانی کھولا
خوب گنجینۂ اسرارِ معانی کھولا

قدر ہے حسنِ مضامیں کے خریداروں میں
بھاؤ یوسف کا گرا مصر کے بازاروں میں

ایک سے ایک ہی خمخانہ کا دفتر بھاری
علم و تہذیب کے ہیں چار سمندر جاری

جلوۂ بزمِ جہاں ست کہ خمخانۂ تو
آفریں باد بریں ہمتِ مردانہ تو

تذکرہ نورِ نظر جان کے پالا گھر میں
جو کبھی جوت کا رہنا ہی اجالا گھر میں

آپکا نام سیراہم کریگا روشن
جو خدا چاہے مرادوں سے بھریگا دامن

مدرسے والے سجائینگے کتب خانوں میں
مشرقی لائبریری میں کلب خانوں میں

نازبردار بنائینگے پریزاد اسے
اپنی رکھیں گے بغل میں ستم ایجاد اسے

آپ جب گلشنِ امید کا پھل پائیں گے
مطرب بزم یہ کیفی کی غزل گائیں گے

تا ابد آپ کا خمخانۂ جاوید رہے
رات دن لالہ سیراہم گھر عید رہے

دولت و جاہ کے دروازے پہ ہاتھی جھومیں
چومتی نقشِ قدم شوکتِ جمشید رہے

تازگی بخش ہے دہلی کی نسیمِ عشرت
باغ عالم میں شگفتہ گلِ امید رہے

حسنِ اخلاق سے روشن ہے زمانہ سارا
جلوہ آرائے جہاں جس طرح خورشید رہے

تذکرہ آپنے بے لاگ لکھا ہے ایسا
جس میں تردید نہ تائید نہ تقلید رہے

ایسے خیالات کہاں گلشنِ پنجاب میں تھے
لطف لکھنے کا اسی میں ہے کہ تجدید رہے

کون ایسا ہے سخن فہم جہاں میں نقاد
جسکی تحریر میں ہر شعر کی تنقید رہے

ہر کہ و مہ کے لئے برتی ہے یکساں نظری
آپکے علم میں حل عقدۂ توحید رہے

آرزو ہے کہ ملے قندِ مکرر کا مزا
کہدو کاتب سے کہ ہر شعر پہ تشدید رہے

جمگیا رنگ تو کیفی نے نکالی تاریخ
دور ہو ہند میں خمخانہ جاوید رہے

۱۹۱۵ء

تقریظ و تاریخ ریختۂ کلکِ عجز اسیر سالک شاعر یکتا راشد بے ہمتا محقق والا نظر سخن گستر معدنِ صدق و صفا منبع فہم و ذکا شفیقی منشی نراین پرشاد صاحب تلمیذ جناب داغ منصرم محکمہ تعلیمات گوالیار

سودا سلف کی خرید و فروخت کے لیے شاہجہانی لشکر کے مختلف زبان کے لوگوں نے آپس میں بات چیت کر کے اُردو کا ایک اَن گھڑ ڈول ڈال دیا تھا، جس صورت میں تم اسے آج دیکھ رہے ہو یہ شعراء کی بدولت نصیب ہوئی ہے، جن لوگوں نے اس زبان میں سخنگوئی اختیار کی انھوں نے تقبل و کرپہہ الفاظ کی کاٹ چھانٹ، نادر تراکیب اور سریع الفہم محاورات کی بھرت سے اسکو ایسا انجھا صاف کیا کہ اس سے بیگموں کے محلوں کی زینت، شاہی درباروں کی رونق ہوئی۔ ملک کی ساری زبانوں سے زیادہ فصیح، زیادہ مہذب بنکر یہ شرفا کی زبان کہلائی، دلّی میں اِسکی ٹکسال قائم ہوئی اور اُردوئے معلّی اس کا نام رکھا گیا، مگر آہ زمانے کی نیرنگیاں کسی چیز کو ایک حالت پر نہیں رہنے دیتیں، عروج و زوال ہر شے کے لیے لازمی ہے۔

دیکھو ایک وہ وقت تھا جبکہ وؔلی گجراتی نے پہلا شعر کہکر ہندوستان میں اُردو شاعری کی داغ بیل ڈالی، شاہ حاتم، فغان، خانِ آرزو نے اسے بڑے نازوں سے پالا، مظہر جانجاناں، میر سوز، میر تقی، میرزا سودا، میر درد نے اسے پروان چڑھایا۔ مصحفی، انشا، جرأت نے اِسکے آتشِ رخسار سے آنکھیں سینکیں، شاہ نصیر، مومن، ذوق، غالب، معروف، عارف، نیّر رخشاں نے اسکے شباب کی بہاریں لوٹیں اور تمام ہندوستان میں اپنی اُستادی کا ڈنکا بجایا، ایامِ غدر کی ہلچل اور مغلیہ سلطنت کے انتزاع نے اسکے چہرے پر کچھ چھائیاں سی ڈالدی تھیں کہ آزردہ، شیفتہ، مبشر، سالک، کوکب، عزیز، انور، ارشد، بشیر، صابر، رشک، شاکر، قلق، ثاقب، مبین، طالب، زکی، شیدا، مجروح کی رسا فکر، مشکور سعی کے ہاتھوں نے اُبٹنا ملکر پھر وہی جوانی کی چمک پیدا کردی، اور

آخر میں تو یہاں اُستاد فصیح الملک حضرت داغ دہلوی نے اپنی درد انگیز شاعری، سادگی زبان، صفائی بیان، معاملہ بندی، اور فصاحت کلامی سے اس حسن کے پتلے کو چار چاند لگا دیئے، یہ تو اس کا عروج تھا۔ مگر ابتدا ہی سے اس گھٹنیوں چلتے ہوئے بچے کی باتیں کچھ ایسی پیاری اور محبت کی پٹ بھی تھیں کہ بہت جلد یہ امرا اور روساء کا کھلونا بن گیا، شعرا کی وہ پوچھ گچھ ہوئی کہ سب انہیں آنکھوں پر جگہ دیتے اور جی کھولکر انکی قدر کرتے تھے، امرا کی انجمنوں کی گرمی تھی تو انکے دم سے، سلطانی بارگاہوں کی رونق بھی تو انکے قدم سے۔

یا ایک یہ زمانہ ہے کہ جن شاعروں نے اردو کو خراد پر اتار کر سڈول کیا اور سقم و اغلاط سے پاک کر کے سانچے میں ڈھالا جنکی کوششوں سے اسے معراج ترقی نصیب ہوئی جنکے احسانوں سے اس کا حرف حرف نقطہ نقطہ گرانبار ہے انھیں آج کوئی نہیں پوچھتا انکی اب کوئی آؤ بھگت نہیں کرتا، دلّی کی ٹکسال ٹوٹ گئی، نئے سکے ڈھلنے بند ہو گئے، پرانے سکوں پر بٹا لگنے لگا، ایک طرف سے سارا کارخانہ ہی درہم برہم ہو گیا، پھر بھی لے دیکے چند دکانیں بچ رہی تھیں جن پر یہ سکے چلتے تھے مگر اُن میں بھی بہت سی بند ہو گئیں، چند باقی رہیں۔ اب تو جناب حالی، حضرت ظہیر، جناب اشک۔ حضرت نوح ناروی، جناب بیخود دہلوی، نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی، جناب وجاہت، خان بہادر اکبر حسین اکبر۔ افسر الشعرا آغا شاعر۔ اور انکے جیسے چند نفوس رہ گئے ہیں جنکی شیوا بیانیاں لئے گرما رہی ہیں ورنہ بزم سخن تو کب کی تہ و بالا ہو چکی ہے۔ یا اللہ یہ کیسی ہوا چلی ہے کہ تقریر اور تحریر دونوں میں خود رنگی اور خود آہنگی پیدا ہو گئی ہے، نہ زبان سے واسطہ نہ روزمرہ سے غرض، نہ بندش کی پروا نہ محاورے سے مطلب، جو جسکے منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتا ہے، جو جسکی قلم سے نکلتا ہے لکھ مارتا ہے اور تو اور صرف نحو کی پابندی بھی ضروری نہیں رہی۔ اِس وقت ادبی دنیا میں ایک

شورانگیز آپا دھاپی پڑی ہے، قیامت کی ہماہمی مچی ہے، غیر زبانوں کے درشت اور غیر مربوط الفاظ کی جا بجا ٹھوس ٹھاس۔ غلط سلط محاورات کی بھرمار، الٹے پلٹے فقروں کی گھڑت غیر مانوس ترکیبوں کی کھپت سے ایک عجیب ست بجھڑی زبان بن رہی ہے جسکے کھرے کھوٹے کی کسوٹی بھی نہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ ہر نا آشنائے زبان زباندانی کا دم مارتا ہے ہر ناواقف علم لسان استادی کا دعویٰ کرتا ہے، ہاں اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ علوم و فنون کی کتابوں کے ترجموں سے علمی اور فنی اصطلاحات کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہے مگر ساتھ ہی ان میں کتنی ہی کتابیں وہی ہیں جنکی زبان ٹکسالی اردو نہیں ہے۔ کیا ایک فصیح زبان کی ہڈیاں پسلیاں توڑ مروڑ کر اس میں چند نئے الفاظ اور اصطلاحوں کا اضافہ کر دینا ہی زبان کی ترقی ہے؟ ناواقفوں سے بحث نہیں، اہل زبان اور زبان دان اس بات کو ضرور محسوس کر رہے ہیں کہ اب اردو زبان اپنی اصلیت اور فصاحت سے روز بروز گرتی جاتی ہے۔

اس پر آشوب زمانے میں جب آپس کے جھگڑوں مذہبی تعصبوں سے زبان کا اچھی طرح ستیاناس ہو رہا ہے اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اردوئے معلیٰ کے ٹکسال چڑھے سکے اور وہ بیش بہا جواہر جو سالہائے مدید کی بے کران محنتوں سے ہمارے شعرائے نامدار نے بہم پہنچائے ہیں نہایت احتیاط اور دوربینی کے ساتھ محفوظ کئے جائیں تاکہ آنے والی نسلیں ان سے فائدہ اٹھائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس ضرورت کی اہمیت کو خدا کے دو بندوں نے عین وقت پر محسوس کیا ہے، مولانا سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ اردو زبان کی مبسوط لغت لکھکر اس زبان کے تتر بتر خزف پاروں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اور ہمارے معزز دوست لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے مصنف دہلوی نے شبانہ روز محنت شاقہ اٹھا کر "ہزار داستان" کے نام سے اردو شاعروں کا تذکرہ بیبا بڑا اندکرہ لکھدیا ہے جس میں ولی سے لیکر آج تک کے نومشق شاعر تک موجود ہیں۔ پھر یہ

بھی اک حسن اتفاق ہے کہ ان دونوں گرانمایہ تالیفوں کو اعلیٰ حضرت قدر قدرت نظام الدولہ نظام الملک آصف جاہ قدر دان سخن میر محبوب علیخان بہادر شاہ دکن کا عہد معدلت مہد ملا اور آصفی قدر دانیوں کا سہرا انکے سر بندھا۔

لالہ سری رام صاحب دہلی کے ایک صاحب اقتدار رئیس، آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال صاحب مرحوم ایم۔ اے بیرسٹرایٹ لا کے خلف الصدق اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب ٹنڈن کے لائق بھتیجے ہیں، سری رام صاحب کے نام نامی سے کون واقف نہیں، مگر ہمکو یہاں یہ ظاہر کرنا ہے کہ آپ یونیورسٹی کے کوئی معمولی ڈگری یافتہ یا نئے پٹھو نمبر نہیں ہیں بلکہ ایک قدیمی علم دوست خاندان کے رکن اور پونڈوں کے رئیس ہیں۔ آپکے مورث اعلیٰ دربار اکبری کے رکن رکین مومن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈرمل بہادر نے جس طرح اس بے آئین ملک کی ارضی پیمایش کرکے مالی آئین باندھا تھا۔ آپ نے بھی اسی طرح ملک سخن کی برسوں کی جانچ پڑتال کے بعد یہ تذکرہ بنام تاریخی "خمخانۂ جاوید" لکھکر مردہ شاعروں کو زندگی جاوید اور زندہ سخنوروں کو بقائے دوام کا پٹا لکھدیا ہے۔

اس سے پہلے ملک کے بعض شعرا اور سر برآوردہ اہل قلم نے اردو شاعروں کے اور بھی چند تذکرے لکھے ہیں مگر جس تحقیق انیق اور کوشش بلیغ سے خمخانہ جاوید کے مؤلف نے تذکرہ نویسی کا حق ادا کیا ہے اس پر نظر کرکے ہم اس تذکرہ کو اردو شعرا کے مرقع کا اولین نقش کہیں تو بیجا نہ ہوگا، موازنہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان تذکروں کے مؤلفوں نے صرف مشہور شعرا کے حالات اور کلام کے نمونے لکھے ہیں اور ہزاروں شعرا کو جو زمانے کی سرد مہریوں کے ہاتھوں کنج گمنامی میں پڑے تھے ہمسے روشناس نہیں کرایا برخلاف انکے اس تذکرے میں جواہر سخن کے مالدار جوہریوں کے بجے سجائے صندوقوں اور کم مایہ خوردہ فروشوں کی تھیلیوں پوٹلیوں کی جانچ ایک ہی جوہر شناس نظر سے کی

گئی ہے، اِس لیئے اُردو میں فصاحت، بلاغت، تحقیق، تدقیق، تلاش جستجو۔ انتخاب فن تنقید کے لحاظ سے "خمخانۂ جاوید" انشاپردازی اور فنِ تذکرہ نویسی کا بہت مکمل بہت اچھا نمونہ ہے۔

اِس تذکرے کی ترتیب کے لیئے ہمارے عالیقدر مؤلف نے بدوِ شعور سے ہی سیکڑوں اساتذہ ماضی و حال کی تصنیفوں کو انگریزی تعلیم کے پہلو بہ پہلو اپنے درس میں پیش نظر رکھا۔ ہندوستان کے اکثر مشہور مقامات کا دورہ کیا۔ تقریباً تین ہزار پُرانے اور نئے شعرا کا کلام فراہم کیا، شہرت کو خیالِ باطل سمجھنے والے و بے چھپے شاعروں کو ڈھونڈ نکالا۔ کہنہ مشقوں کو جو مشقِ سخن چھیڑ چھاڑ کر اور ہی طرف ڈھل گئے تھے اُبھارا، نومشقوں کا دل بڑھایا، اور زرِ خطیر صرف کر کے قلمی اور مطبوعہ کلیات، دیوان، کچکول بیاض، رسالے۔ گلدستے خرید کر کے اسقدر اکٹھا کیئے کہ آج آپکے پاس اُردو کلام کا ایک اچھا خاصہ گنجانہ جمع ہوگیا ہے۔

پھر جس تذکرے کی ترتیب میں ستر، و اشاعت میں بحساب اوسط بارہ سال صرف ہوں، جسکی پانچ جلدوں میں سے پہلی تین ہی جلدیں اب تک نکلی ہوں، جسکی اوسط ضخامت تین ہزار صفحوں سے اُوپر ہو جسکی سوانح نگاری اور اشعار کی چھانٹ چھنٹ میں دس ہزار آٹھ سو پچاسی راتیں سفید اور دن کالے ہوں، جسکی تدوین و اشاعت میں مؤلف کے ہزاروں پر پانی پھرے، جسکی بزم سخن میں تک بند اور دو مصرعی شاعروں کا گذر نہ ہو جسکی انجمن سچے اور اعلیٰ پایہ کے شعرا سے سجے، جسکی کلامی تنقید میں دھڑے بندی اور جانب داری سے کام نہ لیا گیا ہو، اُس تذکرے کی جامعیت اور عمدگی کا مرتبہ اور تذکروں کے مقابلے میں کیونکر بلند نہ ہوگا، ہماری رائے میں یہ تذکرہ ایک نہایت ہی اعلیٰ درجے کا تذکرہ ہے، اور اسکے مؤلف کی محنت جانفشانی، بلند خیالی، بالغ نظری، ایثار نفسی، دریا دلی صرف تحسین و آفرین اور قدردانی ہی کے لائق نہیں بلکہ اُردو ادب کی تصنیف و تالیف کی تاریخ کے صفحوں پر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

ہاں ہم اس ضخیم انجم تذکرے کی دوسری جلد کے چھپتے وقت بعض حسّاد ناقہم نے چند اخباروں میں مضامین لکھ کر بہت کچھ زہر اگلا ہے، اور دل بعض کے جلے پھپھولے پھوڑے ہیں، انکی تحریروں کا جواب مہذب پیرایہ میں منشی چندی پرشاد شیدا دہلوی اپنی تقریظ مطبوعہ جلد دوم میں خوب منہ توڑ کے دے چکے ہیں۔ اسکے لیے یہاں ہم صرف یہی شعر پڑھکر چپ ہو جائینگے۔

	عیب نماید ہنرش در نظر	چشم بد اندیش کہ برکندہ باد	

ہاں اس تقریظ کے لکھنے کے لیے لالہ صاحب موصوف نے جو خط ہمارے پاس بھیجا ہے اس کا یہ فقرہ "باوجود اسقدر دماغ سوزی اور صرف کے ملک نے اِس تذکرہ کی کچھ قدر نہ کی"، ہمارے جسم میں ایک نہایت دردانگیز سنسنی پیدا کر رہا ہے انگلستان جیسے علم ادب کے قدرداں ملک میں جہاں آجکے دن ہزاروں معمولی درجے کے حکایت نگار اُجلی گذران زندگی بسر کرتے ہیں اگر اتنی بڑی نادر الوجود کتاب لکھی جاتی تو غالباً مؤلف کو اتنا صرف کر کے اسے کوڑیوں کے مول دے ڈالنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ایک ادبی دارالاشاعت اسکی ترتیب و اشاعت کا بار اپنے سر لے لیتا اور کتاب کے طبع ہوتے ہی اسکی تمام جلدیں ہاتھوں ہاتھ بک جاتیں، شاید دس پانچ اشاعتوں کی نوبت آجاتی اور پھر بھی تشنہ لبانِ سخن کی ان اوسوں پیاس نہ بجھتی۔ اسوقت جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں ادبی تعلیم روز افزوں ترقی کر رہی ہے ملکی علم ادب کی ایسی بیقدری نہایت افسوسناک ہے۔

بدقسمتی سے آجکل کے تعلیم یافتہ اصحاب اور اردو ادب کے جُہلا کرو نا واقفیت فن کے باعث اردو شاعری کی طرف سے ایک طرح کی بے اعتنائی ہی نہیں بلکہ چونک پیدا ہو گئی ہے، انکا خیال ہے کہ اول تو شاعری ہی فی نفسہ کوئی ضروری چیز نہیں۔ دنیا سے سارے شاعر ناپید ہو جائیں تو بھی دنیاوی کاروبار اور انسانی طرز معاشرت میں کوئی کمی

باہرج نہیں ہوسکتا، اور اُردو شاعری تو محض حسن و عشق کی داستان ہونے کے باعث مخرب اخلاق ہی ہے۔

ان دنوں مادی ترقی ہی انسانی ترقی کی معراج سمجھی جاتی ہے، سائنس مادیات کی ترقی پر بحث کرتا ہے، غالباً یہ خیال سائنس کے اُصول پر مبنی ہے، جنھیں روحانیات سے کوئی واسطہ ہی نہیں، ورنہ حقیقت میں تو مادی اور روحانی دونوں طرح کی ترقی کے بغیر انسانی ترقی کی تکمیل ہو نہیں سکتی، کیونکہ انسان میں روح اور مادہ دونوں چیزیں موجود ہیں جس طرح مادی اشیا کی ترقی سائنس کے اُصول کی واقفیت پر موقوف ہے، اسی طرح روحانی ترقی استغراق، تخیل، مناظر قدرت کے مشاہدے، اور فنون نفیسہ کی قدردانی پر منحصر ہے، موسیقی اور مصوری کی طرح شاعری بھی ایک لطیف فن ہے بلکہ اس کا مرتبہ اُن دونوں سے برتر ہے، شاعر کی طبیعت قدرتی مناظر کے جذبات و خیالات کا خزانہ ہوتی ہے اور انکی تصویریں اپنے جادو کار قلم سے کھینچتا ہے جن کو دیکھکر دوسروں کے دلی جذبات جوش میں آتے ہیں، اور دلی جذبات کے جوش سے روح کو ترقی ہوتی ہے پس انسانی ترقی کے لیئے شاعری بھی ایک ضروری چیز ہے، عالم موجودات کی ہر شے میں حُسنِ قدرت جلوہ گر ہے، انسانی حُسن بھی قدرتی حُسن ہے، حسنِ قدرت کے مشاہدے سے دلی جذبات جوش میں آتے ہیں، انسان مخلوقِ اشرف ہے، اسکے حسن و عشق کے جذبات بھی برتر ہیں، برتر جذبات کے برانگیختہ ہونے سے روح کا اوجاج منصور ہے، اس لیئے عاشقانہ شاعری انسانی ترقی کے لیئے ضروری ہے۔ مخرب اخلاق نہیں اب رہا یہ امر کہ انسانی حسن و عشق سے سفلی جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ یا علوی۔ یہ زیادہ تر سامع کی دلی تربیت اور حالت پر منحصر ہے، اُسکے خیالات ادنیٰ ہونگے تو ادنیٰ جذبات جوش میں آئیں گے اور اعلیٰ ہونگے تو اعلیٰ جذبات برانگیختہ ہونگے، اس لیئے عاشقانہ شاعری ہر انسان کے دل پر یکساں اثر کرے مگر کسی حسن و عشق کے شاعر کا

مفہوم انسانی فطرت کا حیوانی حصہ نہیں ہو سکتا۔

بات یہ ہے کہ اس مادی ترقی کے زمانے میں لوگوں کا روحانی مذاق گرا ہوا ہے اور حسن پرستی جو فلسفۂ حسن کے مطابق مہذب سوسائٹی کا اعلیٰ عنصر ہے مخرب اخلاق سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت ملک اس تالیف کی قدر کرے یا نہ کرے مگر وہ وقت بھی ضرور آئیگا جب ان تمام شعراء کے دل سے نکلی ہوئی دعائیں جنکو اس خمخانہ جاوید کی شراب ناب کے نشے نے ہمیشہ کے لیے سرخوش و دماغ کر دیا ہے مستجاب ہونگی، اور طالبان ادب اس ادبی تالیف کی قدر کرکے مؤلف کو دعائے خیر سے یاد کرینگے۔

طرب و عیش کا آنکھوں میں سمایا تھا سماں
کھنچی جاتی تھی نظر میں گل و ریحاں کی بہار

تھا غضب جلوۂ نیرنگیٔ خوبانِ چمن
تھی ستم شیوہ بدمستیٔ مستاں کی بہار

موسمِ گل کی ہوا نے وہ ہوا باندھی تھی
کہ ہر اک برگِ خزاں تھا چمنستاں کی بہار

شاملِ فصلِ بہاری جو ہوئی تھی برسات
تھی عجب روح فزا ابر بہاراں کی بہار

کثرتِ عیش سے بدلی تھی یہ غم کی صورت
وصل کی شب سے سوا تھی شبِ ہجراں کی بہار

دشتِ پُرخار میں بھی دیکھ کے سبزے کی نمود
یاد آتی تھی بہت کوچۂ جاناں کی بہار

پھول بن بن کے نکلتے تھے شرارے دل سے
پھلجھڑی تھی کہ تھی آہِ شرر افشاں کی بہار

دیکھکر اسکو کلی دل کی نہ کھلتی کیونکر
اِک نئے ڈھنگ کی تھی اک نئے عنواں کی بہار

شاد و بشاش تھا جی خوش تھی طبیعت میری
میرے چہرہ پہ کھلی تھی دلِ شاداں کی بہار

پھول جھڑتے تھے دہن سے مرے ہنگامِ کلام
قابلِ دید تھی میرے لبِ خنداں کی بہار

مجکو حیرت تھی یہ کیا بات ہے یا ربِ خدا
نظر آئی ہے جو یوں عیشِ فراواں کی بہار

غیب سے آئی وہیں کان میں میرے آواز
دلکش اس وجہ سے ہی آجکے زمستاں کی بہار

تذکرہ رائے سر رام نے جو لکھا ہے
جسپہ سو جان سے قربان ہی گلستاں کی بہار

جس کا وہ خمخانۂ جاوید ہے تاریخی نام
جس کا ہر جام ہے میخانۂ مستاں کی بہار

جس کا ہر حرف ہے معنی و بیاں کا زیور
جس کا ہر لفظ ہے ارژنگ کے دبستاں کی بہار

جس کا ہر غنچہ ہے گلزار سخن کی رونق
جس کا ہر پھول ہے گلزار حسیناں کی بہار

جسکے عنواں پہ ہے مدحت آصف مرحوم
جس پہ ہے خاتم محبوب علی خاں کی بہار

تیسری جلد اسی کی یہ چھپی اب کے برس
دیکھئے اس میں نئی طبع غزلخواں کی بہار

انتخاب سخن اس طرح کیا ہے جس سے
نظر آتی ہے ہر اک شعر میں دیواں کی بہار

پوچھنا نظم کا کیا نثر بھی وہ لکھی ہے
جس کا ہر فقرہ ہے نظم در غلطاں کی بہار

کاغذ اچھا ہے چھپائی بھی بہت اچھی ہے
لوح رنگیں بھی ہے رنگ رخ خوباں کی بہار

طبع رنگیں کا جو لکھنا تھا مجھے رنگیں سال
دیکھکر چہرے سے میرے دل جویاں کی بہار

مجھسے ہاتف نے کہا کس لیے خاموش ہو مہر
"یہ نئی جلد سوم گلشن رضواں کی بہار"
۱۳۴۰ھ

دیگر

کیا سر یرام دہلوی نے یہ
تذکرہ لاجواب لکھا ہے

شاعروں کے کلام کا اس میں
انتخاب انتخاب لکھا ہے

ہیں سوانح بھی زندگی کے درج
عمر کا بھی حساب لکھا ہے

جلد ثالث یہ اس کتاب کی ہے
جسکو با آب و تاب لکھا ہے

اس میں ہیں جلوہ گر فصیح الملک
کیا فصاحت کا باب لکھا ہے

کیا ہو اُنکے کلام کی تعریف
جو لکھا لاجواب لکھا ہے

اور بھی شاعروں کے شعروں کا
بے مثال انتخاب لکھا ہے

ہو نہ کیوں اس کا یہ شباب حسن
اس میں حسن شباب لکھا ہے

سب نے جب اس کتاب کو پڑھکر
منتخب لاجواب لکھا ہے

مہر نے اس کا زبر و بیّن میں
سال بھی "انتخاب" لکھا ہے
۱۳۴۳ھ

سریرام کا وصف کیا کیا کروں میں
وہ عالم، وہ فاضل، وہ قابل، وہ لائق

سخنور نہیں تو سخن فہم ہیں وہ
سخن سے ہیں یوں بھی تو اُنکے علائق

لکھا تذکرہ وہ اُنھوں نے کہ جس کا
بڑی مدتوں سے زمانہ تھا شائق
ہے یہ تیسری جلد اُس تذکرے کی
لکھائی چھپائی ہے سب اسکی فائق
اسے دیکھ کر میں دعا دے رہا ہوں
کہ ہو یہ الٰہی پسند خلائق
نہ سوچو نہ سمجھو، نہ پوچھو، نہ ڈھونڈو
اگر مصرعۂ سال کے تم ہو شائق
کہو مہر انکار کا سر اُڑا کر
"سری رام صاحب کی تالیف فائق"

نوٹ) اس مادۂ تاریخ میں "ر" کو "ری" مان کر حسب قاعدہ مروجہ دس عدد لیے ہیں

ہیں سری رام ایک دہلی کے رئیس
علم و بذل و خلق میں ہیں لاجواب
تذکرہ لکھا اُنھوں نے اک ضخیم
ہے وہ اُردو نظم کا نادر نصاب
کی ہے محنت سالہا سال اسقدر
کر دیا برباد ایّام شباب
ہم تو جب جانیں کوئی اس طرح کی
لکھ تو دے اتنی بڑی ایسی کتاب
ہے جو یہ مہر انتخاب منتخب
اسکی ہے تاریخ "عطر انتخاب"

(از مصنف)

بتائید یزدان و فضل اِلٰہ
چو لالہ سری رام رنگیں رقم
رقم کرد خمخانۂ شاعران
کہ از نشۂ بادہ اش سرخوشم
بہ نادر جمل سال خمخانہ مہر
بدیہہ نوشتم "سرور دلم"

قطعہ تاریخ از نتائج افکار گرامی بزم آرائے گلشن سخندانی واقف رموز نکتہ دانی شفیقی و مکرمی کنور بدری کرشن صاحب فروغ وکیل دہلی و رئیس سکندر آباد

فروغ آج کیوں ہے تو آشفتہ حال
ہوا کیا ترا کس طرف ہے خیال
نسیم سحر نے یہ مژدہ دیا
کہ دامانِ صحرا گلستاں بنا
ہوا نکہتِ گل سے پھر آشکار
کہ اب آ گیا موسم نو بہار
ترے سامنے اک شگفتہ ہے باغ
پراگندہ پھر کیوں ہے تیرا دماغ

پھر اس باغ کی سیر بھی ہے ضرور — طبیعت کو دے اپنی شور و سرور
ہے سبزہ سے سرسبز صحنِ چمن — گلوں سے ہر اک شاخ ہے گلبدن
ہوا آج رونق فزا سبزہ زار — کھلے پھول آئی ہے تازہ بہار
گلستاں میں ہر شاخ نوخاستہ — ہے پھولوں کے زیور سے آراستہ
ہے شمشاد و قمری کا باہم وصال — غزلخواں ہے طوطیِ شیریں مقال
ترنم سرا سوسنِ دہ زباں — تحیر فزا نرگسِ بوستاں
ہیں گلہائے رنگیں کہیں خندہ زن — کہیں نغمہ خواں بلبلانِ چمن
درختانِ سبز و خوش الحاں پرند — چمن کی بڑھاتے ہیں رونق دو چند
زمیں پر جھکی ہے ہر اک شاخِ گل — نہ ہو مجکو کیوں خواہشِ جامِ مُل
مِٹا اب جہاں سے نشانِ خزاں — مگر ہے یہی باغ، باغِ جناں
تمامی شہنشاہِ ملکِ سخن — ہوئے آج رونق فزائے چمن
ہر اک کا نیا طرزِ تحریر ہے — ہر اک ماہرِ علم تسخیر ہے
ہر اک اپنی تحریر سے سحر ساز — ہر اک محوِ حیرت بسوز و گداز
ہر اک کا جُدا رنگ آیا نظر — ہر اک نے دکھایا ہے اپنا ہنر
غرض ہے یہاں جمع سب کا کلام — اِسی تذکرہ کا ہے خمخانہ نام
سری رام ایم اے کی تالیف ہے — کہ جسکی زمانے میں توصیف ہے
خرد ور، خردمند، عالی خیال — سخندان، سخن سنج، صاحب کمال
لیاقت شرافت ہے اُسکی عیاں — ثنا گو ہیں سب اُسکے اہلِ جہاں
مؤلف کی تالیف کو دیکھ کر — ہُوا دل میں میرے سُرور اسقدر
کہ میں بھی اُسی کا ہوا مدح خواں — مگر میرے خامہ کو طاقت کہاں
کہ اُسکی صفت میں کرے کچھ رقم — یہاں پر شکستہ ہے میرا قلم

یہ ہے اسکی سب کوشش و جستجو
کہ حاصل ہوئے گوہر آرزو

زمانے میں ہر ایک نے یہ کہا
سر ہر اہم صد مرحبا مرحبا

کیا جمع یہ دفتر شاعراں
مضامین پنہاں ہوئے سب عیاں

یہ اوصاف ظاہر ہیں اسکے صریح
کہ تحقیق حالات سب ہے صحیح

وہ رنگین عبارت وہ شستہ کلام
وہ ترکیب مضموں و ترتیب نام

ہر اک کے مضامین کا ہے انتخاب
غرض انتخاب اس کا ہے لاجواب

وہ تحریر خوشخط وہ کاغذ نفیس
عیاں جس سے ہے صنعت خوشنویس

ہیں جتنے سخن سنج شیریں مقال
مفصل لکھا اس میں سب کا حال

مٹا دہر سے جن کا نام و نشاں
مکرر ہوئے زندہ سب بے گماں

جو موجود ہیں ان کو آب بقا
اسی جام خمخانہ سے مل گیا

یہ تحریر کار مسیحائی ہے
کہ اس سے صدا قم باذن آئی ہے

اسی سے ہوئی خضر کی ہمسری
ہوئی آب حیواں کی ہمنو نگری

زمانہ میں اسکی یہ شہرت ہے عام
کیا اسنے خضر و مسیحا کا کام

نتیجہ یہ اسکی طبیعت کا ہے
یہ دفتر اسی کی لیاقت کا ہے

جب اس تذکرہ کا ہوا اختتام
ہوا طبع کا اس کے پھر انتظام

ہوئیں طبع دو جلد با آب و تاب
کہ ہیں خوبی و وصف میں لاجواب

چھپی آج یہ تیسری جلد بھی
کہ جس کی اشاعت کی امید تھی

ہوا مجکو بھی فکر تحریر سال
کہا دل نے کیوں ہے یہ وہم و خیال

سن عیسوی کے ہوں حاصل نکات
جو دیکھے حساب زبر بینات

تو تاریخ گوئی میں فرزانہ ہے
یہ لکھدے، سوم جلد خمخانہ ہے

اگر سال ہجری کا ہے خواستگار
تو ہر حرف منقوطہ کو کر شمار

فروغ اس کا ہے سال ہجری یہی	کہ ہے سویں جلد خمخانہ کی

تقریظ نزاویدۂ خامۂ جادو طراز سحر پرداز فاضل یگانۂ دہر ناثر عدیم المثال ناظم نظامی خیال پروفیسر خواجہ عبدالمجید بی اے رئیس دہلی خلف الرشید خواجہ عبدالرحیم خان بیدل مرحوم

مرضِ عصبیت عام است وچارہ ناپیدا، ہرکس بخیالِ خویش دعویٔ انصاف میلاف عدل میزند
ہمہ سودائے خام، عدل معدوم وانصاف نایاب، اگر پاسداری بینش یعنی علتِ عصبیت
نیست پس جاہلیت، انسان انسان ہست چہ سفید وچہ سیاہ، چرا از روپ چرا زجبلتہ سیاہی
درچشم سفیدان خارست، وسفیدی در دیدۂ سیاہاں ناخنہ وار، تعصب مبنی براختلاف اقالیم
نیست، بلکہ ہرملک حصص ملک خلاف دارند، در ہند این قضیۂ نامبارک بیشتر از بیشتر اشاعت
یافتہ، از ابتدائے آفرینش اختلاف مذہب موروثِ فتنہ وفساد بود، مگر دریں زمانِ نامسعود
اختلاف زبان ہم در فتنہ خیزی کم مرتبہ نیست، واین فساد وعناد بیشتر از ہم زبانی می خیزد
وکمتر از تبائن السنہ، یکے گوید کہ زبانِ دہلی درست ست وزبان لکھنو نادرست، آں ثقیل
است واین لطیف، ندانیم در زبان چہ ثقیل وچہ لطیف، ہرچہ لطف دارد لطیف ہست، و
این بحث بے لطفی افزاید۔ پس بدتر از ثقالت باشد، موازنۂ دبیر وانیس را دیدیم وبرطبعِ
وقادِ شبلی آفرین گفتیم۔ مگر این بحث انیسیاں دبیر راخوش نمی آید۔ وباعثِ رنجش خاطر
شود، این مسئلہ ذوق شاعرانہ است وکسے برخاطرِ دیگرے جبر نتواں کرد، اگر کسے دبیر رادوست
دارد ما چرا اورا دوست نداریم اگرچہ شیفتۂ انیس باشیم، ہمچنیں اگر شما دلدادہ محاورہ لکھنو
ہستید چشم ما روشن دلِ ما شاد، ما زبانِ دہلی را پسند می کنیم بر ما ہم بحث وارد نیست ٭

ہرکہ خدمت میکند مخدوم باشد وسزاوارِ تحسیں، وخوبتریں نعمتے کہ انسان از خدائے
بزرگ یافتہ کلام است، وکلام الٰہی برآں گواہ، پس بہترین خدمت خدمتِ کلام باشد
وہرکہ دریں کارِ زیبا مشغول ست مرغوب ست وستایش را سزاوار، آں مرد کیست

کہ اکنوں از دم و قدم دریں کار سعی بلیغ می نماید، و در صحت و رنجوری این مشغلہ را از دست ندہد، ہر چہ میگویم نفس الامر ست نہ ژاژخائی و بیہودہ سرائی، مخدوم من ہمچنین ست، اگر خلاف می گویم تجسس را راہ ست و دروغ گو را سزا، و جلد سوم خمخانۂ جاوید بر دعوی من گواہ، لالہ سری رام صاحب ایم اے- دریں باب وکیلِ من ست و ہم ممدوحِ من، اگر کسے دریں زماں مثل او باشد بنمائید، و مرا شرمسار سازید، او ہمتِ والا بریں کار گماشتہ و خود را مثال ساختہ و وا می نماید کہ ہر کہ تعصب ندارد چنیں باشد و بیش روی کار از ذاتِ او وابستگی دارد، کلامے کسی را زندہ داشتن مانند آنست کہ او را زندہ می داریم، پس ایں مرد یک تنہ ہزاراں مردگاں را حیاتِ جاوید بخشیدہ و ہم خود را زندۂ جاوید کردہ، ہرگز آں کس نمیرد کہ نام نیکوئے او در جہاں جاری باشد و ذکر جمیل او در روزگار ساری* این بندہ حقیر کہ سطورے چند برآں کتاب نایاب می نویسد مثلِ خاک راہ است کہ بہ دامنِ بزرگاں می آویزد و از دستیاری دامن از پستی بہ بلندی گراید، حاشا کہ تمنائے بلندی در سر دارم چرا کہ ایں و فا من نا سزا را سزاوار نیست- اگر کسی گوید پس ایں خامہ فرسائی چیست در جواب میگویم تعمیل ارشادِ مخدوم ست و چوں امر شد مجبور شدم و امید کہ معذور دارند ختم کلام بر دعا می نمایم، مخدوم را ثنا ہائے بلند و دعا ہائے ارجمند می خوانم، فقط

رقم زدہ ۱۴ ر فروری ۱۹۱۵ء- احقر اللہ عبد المجید

تقریظ از نتائج افکار دُر بار کانِ فصاحت جانِ بلاغت اُستاد الوقت یادگارِ اساتذہ سرگروہِ اربابِ صدق و صفا عالیجناب بجالات انتساب مخدومی و مخترمی نواب سعید الدین احمد خان طالب جاگیر دار لوہارو رئیسِ دہلی یادگار نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر نیر رخشاں مرحوم

اللہ جلشانہ کی نعمتیں لاتعد و لاتحصیٰ ہیں، منجملہ نعمائے الٰہی کے ایک نعمت علم بھی ہے، جو اس نعمت کا شائق ہو، جسکو یہ نعمت حاصل ہو واقعی وہ خوش نصیب ہے اور جو اس نعمت کے ساتھ صاحب تالیف و تصنیف بھی ہو اُسکو بہا خوش نصیب سمجھنا چاہیئے، چنانچہ مؤخر الذکر وصف کا موصوف اور مصداق اس مقال کا حال فرخ فال

سنو وہ سبیر نیکو منظر لالہ سری رام صاحب ایم اے سلمہ اللہ تعالیٰ، میرے دیرینہ دوست
آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال صاحب بیکنٹھ باشی کے فرزند ارجمند کا ہے
شائقِ علم اور حصولِ علم کے لحاظ سے تو وہ ایم۔اے ہیں جو آجکل کی طرزِ تعلیم کی معراج
کمال ہے، رہی تالیف و تصنیف سو یہ تذکرہ خمخانۂ جاوید کی تالیف اِنکو انتہا درجہ خوش نصیب
ثابت کیا ہے کہ اگر وہ اول درجے کے دولت مند اور صاحبِ ثروت ہوتے، اور اس
دولتِ لازوال سے محروم ہوتے، تو اہلِ علم و فن کی نگاہ میں کبھی انکی اتنی وقعت نہ
ہوتی جواب ہے ؎

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت	نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت

مجھ سے مؤلفِ مذکور متقاضی ہیں کہ تیسری جلد کے لیئے کوئی تقریظ لکھوں، امتثالِ
امر ضرور ہے، تقریظ تو کیا خاک لکھونگا۔ یہ تو جن کا مرتبہ ہے انہی سے ہوگا، مگر ہاں چند
سطریں یوں ہی برائے نام لکھدونگا، لیکن جو کچھ معرضِ تحریر میں آئیگا، پیرانہ سالی،
مختلف عوارض کا ہجوم، بے مشقی، سب سے بڑھکر بے آہنگی کی وجہ سے کنایۃً یہ شعر حضرت
لسان الغیب اسد اللہ خان غالب رحمۃ اللہ علیہ کا لکھا آئیگا ؎

مجھ سے غالب یہ علائی[1] نے غزل لکھوائی	ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

خمخانۂ جاوید کی پہلی اور دوسری دونوں جلدیں مَیں نے فرداً فرداً بالاستیعاب نہیں، بلکہ
جستہ جستہ دیکھی ہیں، اللہ رے مؤلف کی محنت شاقہ اور واہ رے اسکی سلاست زبان کے
خلوصِ دل سے حفظِ مراتب کا خیال، انتخابِ اشعار میں سلیقہ شعاری، تذکرہ کے طبع کرانے میں
اسکے کاغذ، لکھائی، چھپائی، اور ترتیب کا حسن انتظام، یہ سب باتیں مؤلف کی دماغ سوزی جانکاہی
کے علاوہ اسکی طبیعی تہذیب اور شائستگی کی بھی خبر دیتی ہیں، سخنورانِ امصار و دیار، اور
دانشمندانِ روزگار اسقدر اس تذکرہ ہزار داستان کے محاسن نظم و نثر میں تحریر فرما چکے

[1] علائی تخلص انکے بزرگوار فخر الدولہ نواب علاء الدین احمد خاں بہادر مرحوم رئیس لوہارو ۔

ہیں مشکل نہیں بلکہ سخت دشوار ہے، کہ اُن پر کچھ اضافہ کیا جائے، اور اگر پہلو بچا کر کچھ لکھا بھی جائے اور از ہزار یکے، و از بسیار اندکے، پر قناعت بھی کیجائے تاہم اُنہی مضامین کی کاسہ لیسی ہوگی جو ضبطِ تحریر میں آچکے ہیں، اور تحصیل حاصل کیطرح بیوقعت و بیکار، مگر ہاں ایک امرِ واقعی کا اظہار ضرور ہے، جو کچھ میں عرض کرتا ہوں، یہ سوءِ ادبی پر محمول نہ ہو، بلکہ یہ اصول پیشِ نظر رہے کہ ہر شخص اظہارِ رائے میں آزاد ہے، حضرت اُستادی مطاعی و مولائی جناب حالی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس تذکرہ کی دوسری جلد پر تقریظ تحریر فرمائی ہے، اور اُس میں ترقیم فرمایا ہے، کہ "مسلمانوں پر سخت الزام لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے باوجود ایک ہزار سال کے ہندوستان میں آباد ہونے کے سنسکرت اور برج بھاشا کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا" یہ الزام یا اعتراض تو بجا ہے، مگر قدرے قلیل اس میں خامی بھی ہے، وہ یہ کہ اس الزام میں ہندو صاحبانِ تصنیف و تالیف کو بھی شریک کرنا چاہیئے، صیغۂ تصنیف و تالیف نظم و نثر اُردو میں مسلمانوں سے ہندو بھی کا حصۂ متناسبہ ضرور رکھتے ہیں، مگر یہی کمی یا لغزش اُنکی تالیف و تصنیف میں بھی پائی جاتی ہے، تاہم مسلمانوں کی جانب سے ہم کچھ پیش کرسکتے ہیں جو مسلمانوں نے سنسکرت یا بھاشا کی خدمت یا قدر و منزلت کی ہے، اکبر بادشاہ مرحوم کے زمانہ میں مہابھارت کا ترجمہ فیضی نے کیا جسکو سنسکرت کا شاہنامہ کہنا بیجا نہ ہوگا، فریلی ارمنی نے جوگ بسشٹ کا ترجمہ کیا۔ جو ہندو دھرم کی خاص مواعظ حسنہ کی کتاب ہے، دارا شکوہ کی سرِّ اعظم یہ بھی سنسکرت کا ترجمہ ہے اور اس میں از سرتاپا سنسکرت کے الفاظ بھرے پڑے ہیں، ملک محمد جائسی کی پدماوت خاص بھاشا میں ہے، حضرتِ[1] قبلہ ام مرحوم نے حسب التماس خواجہ امان صاحب مرحوم مترجم بوستانِ خیال[2] ریاض الابصار کا دیباچہ اُردو میں خواجہ صاحب موصوف کی طرف سے لکھا، چونکہ یہ دیباچہ راؤ راجہ شیودان سنگہ سکینٹھ باشی والی راج الور کی ستایش میں لکھا گیا تھا، حضرت

---

[1] نواب ضیاء الدین احمد خان صاحب نیر رخشاں مرحوم رئیس لوہارو ÷

[2] بوستانِ خیال کی تیسری چوتھی جلدوں کا ترجمہ ہے، یہ ترجمہ کی دوسری جلد ہے ÷

مرحوم کی جدّت پسند طبیعت نے اسقدر خاص سنسکرت کے الفاظ اُس میں داخل کیئے ہیں کہ غالبؔ وید ہے، اور تاریخی لحاظ سے تو دریا نہیں، بلکہ سمندر کوزہ میں بھرا ہے، ہاں اہلِ نظر نے اپنی اپنی طبیعتوں کے موافق ضرور حظ اُٹھایا، مگر عوام و خواص ہندو مسلمانوں میں تو کیا کسی پنڈت صاحب نے بھی اس کا تتبع نہیں کیا، پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار نے فسانۂ آزاد، اور سیر کوہسار دو ضخیم کتابیں لکھیں، مگر وہی مروجہ سلیس اُردو میں، رہی وہ فصیح و بلیغ اردو جو آجکل ہمارے آریہ صاحبان اپنے جلسوں اور لیکچروں میں برتتے ہیں، اُسکی نسبت نہایت ادب سے عرض کرونگا کہ اس فصاحت و بلاغت سے ہماری روزمرّہ کی زبان اگر محروم ہی رہے تو بہت اچھا ہے، صغرسنی کے زمانہ میں ہمنے سُنا تھا کہ شاہجہاں کے قلعہ کی زبان اُردوئے معلّٰی کہلاتی ہے مگر جب حضرت لسان الغیب نواب اسد اللہ خان غالبؔ مرحوم کے خطوط چھپے، اور اُن کی نثریں، اور شاگردوں کی اصلاحیں طبع ہوئیں، جن کا نام اُردوئے معلّٰی، اور عودِ ہندی رکھا گیا۔ اُس وقت ہر کہ ومہ کی آنکھیں کُھلیں اور زمانے نے تسلیم کیا کہ اُردوئے معلّٰی یہ ہے، چنانچہ یادگار غالب میں حضرتِ حالی مرحوم استادانِ وقت سے جہاں مقابلہ حضرت لسان الغیب کا فرماتے ہیں، وہاں اُردو کی نثر کی بابت لکھتے ہیں کہ یہاں غالب مرحوم کے آگے میر، سودا، ناسخ، آتش، انیس، دبیر، ذوق، مومن، سب کو صفر ہے، اِس اُردوئے معلّٰی کا تتبع یگانہ و بیگانہ اکثر نے کیا، مگر چھ آدمی مشہور و مقبول ہوئے، سر سید احمد خان، مولوی ڈپٹی نذیر احمد منشی ذکاء اللہ، مولانا حالی، علامہ شبلی، مولوی محمد حسین آزاد، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور یہ ایک عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ مؤخر الذکر پانچوں حضرات شمس العلماء کے خطاب سے منجانب برٹش گورنمنٹ مشرف و منور ہیں، ہر چند کہ ان حضرات میں ہر ایک نے اپنے مزاج کے موافق روش جداگانہ اختیار کی، مگر اصولاً یہ اُسی اصل کی فروع ہیں، میرے نزدیک زبانِ حال میں چاہے جس زبان کے الفاظ کی آمیزش کیجائے، غالب مرحوم کی اُردو پر فروغ پانا، ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے، چونکہ یہ تذکرہ نہایت خلوص اور دلسوزی سے لکھا گیا ہے اور بکار آمد ہونے

میں تو اسکے شک و شبہ کی گنجایش ہی نہیں، جن حضرات کو زبان کا اور شعر و سخن کا مذاقِ سلیم ہے وہ ضرور اسکو زیرِ مطالعہ رکھیں گے، اور لطف اُٹھائیں گے، انکے تفننِ طبع کے لیئے ہم ایک چھوٹا سا سوال اور اُس کا مختصر سا جواب لکھتے ہیں، اور اُن مابہ الامتیاز حضرات سے جن کو اپنی زبان کی ترقی اور توسیع کا شوق ہے عرض کرتے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ اس سوال و جواب پر غور فرما کر طبع آزمائی فرمائیں گے اور جو کچھ ہماری غلطی ہو اُسکی اصلاح۔ **سوال** بوجہ کثرت حروفِ ہجا، نیز مختلف المخارج و صوت حروف سے کونسی زبان کو وسعت اور فضیلت ہے۔

جواب۔ اس مسئلہ میں علم اللسان کا یہ اصولی فتویٰ ہے کہ بسبب کثرت و مختلف المخارج و صوت حروف ہجا ایک زبان کو دوسری زبان پر حقیقتاً فضیلت نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہر ایک زبان میں وہ مختلف المخارج و صوت حروف داخل کیئے گئے ہیں جو لفظ کے بار کو اُٹھا سکے مثلاً عربی میں یہ حروف داخل نہیں ہیں پ، چ، ژ، گ، اور فارسی میں ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق، انگریزی میں ٹ، ش، چ، وغیرہ نہیں ہیں، یہ بحث اگر مفصل دیکھنی ہو تو کتاب لغت انجمن آرائے ناصری یا فرہنگ ناصری کا دیباچہ قابلِ ملاحظہ ہے"۔ رہی وسعت زبان اسکے لیئے دنیا کی تمام زبانوں کے حروفِ ہجا کا مجموعہ زیرِ نظر ہو تو اُس وقت حکم لگایا جا سکتا ہے، اس سوال و جواب کو پیشِ نظر رکھ کر یہ ملحوظ خاطر ہونا چاہیئے کہ جب صرف ایک حرف کا بار جو ایک زبان سے مخصوص ہے دوسری زبان نہیں اُٹھا سکتی تو لفظ کا بار جو دو یا چند حروف کا مجموعہ ہوتا ہے کیونکر اُٹھایا جا سکتا ہے اور اسکی بدیہی دلیل یا تمثیل معرّب، مفرّس مہنّد، الفاظ کا وجود موجود ہے، حضرت اُستادی حالی مرحوم کے اتباع میں اتنا اور عرض کرونگا کہ لالہ سری رام صاحب کو صحتِ واقعات میں جہانتک ممکن ہو سعی بلیغ کرنی چاہیئے۔

---

۵۱ غیر زبان سے لفظ کو کسی حرف کی تبدیلی سے عربی بنا لیا گیا ہو +

۵۲ کسی اجنبی زبان کے لفظ کو کسی حرف کی تبدیلی سے فارسی بنا لیا گیا ہو +

۵۳ کسی غیر زبان کا لفظ کسی قدر تبدیلی کے ساتھ یعنی حرف کی تبدیلی سے ہندی بنا لیا گیا ہو، +

جلد اوّل میں زیر احسن تخلص لکھا ہے حکیم محمد حسن[۵۱] خان خلف حکیم محمد محسن خان، حالانکہ احسن خان اور محسن خان دونوں حقیقی بھائی تھے اور انکے والد کا نام حکیم محمد حسن خان تھا، صد حیف کہ یہ دونوں جوان چل بسے، زیر تخلص احسان لکھا ہے کہ حافظ نواب عبدالرحمٰن خان جہان کی حویلی بازار لال[۵۲] کنوئیں میں ہے، مگر نہیں یہ حویلی بازار سرکی والان میں ہے،

انجام فرخ فرجام کے لیئے اختتام کلام دعا پر ہونا مستحسن ہے، او تعالیٰ شانہ میرے مخلص دوست لالہ سیرام کو عمر طبیعی صد وسی سال مرحمت فرمائے، اور انکی صحت ثروت اور ہمت میں روز بروز ترقی عطا کرے تاکہ اس تذکرہ کی تکمیل کے بعد ایک دوسرا تذکرہ اُردو شاعروں کا بھی مرتب فرما کر شائع کریں، اور جو اہل زبان ہونے کے مدعی ہیں اُنکے جوہر کھلیں اور ایسے تذکرہ کا شیوع بالکل ایک نئی بات ہوگی + ۵

منم انچہ کردم زہر زہ کلام	تو دانی دگر بعدہٗ والسلام

احقر العباد میرزا سعید الدین احمد آف لوہارو عرف احمد سعید طالب دہلوی

۳۰ اپریل ۱۹۱۵ء روز آدینہ مبارک

نثر و قطعہ تاریخ از تصنیف لطیف شاعر بدیع نگار خوش گفتار منشی بسنت لال صاحب عنبر وکیل گورکھپور

آپنے اپنی صحت کا حال کچھ نہیں لکھا، میں ہمیشہ جناب باری سے آپکی صحت مزاج کے لیئے دعا کرتا رہتا ہوں کہ یہ بڑا کام ترتیب خمخانۂ جاوید کا جو آپنے اپنے ہاتھ میں لیا ہے انجام ہو جائے تقریظ بھیجتا ہوں درج فرما دیجیے + بسنت لال عنبر وکیل گورکھپور ۱۷ مارچ ۱۹۱۵ء

آغاز جس کا خوب ہو انجام کیوں نہ ہو	انجام نیک اگر ہو تو پھر نام کیوں نہ ہو

[۵۱] کاتب کی غلطی سے بجائے محمد حسن خاں کے محمد محسن خان جلد اول میں چھپ گیا مسودہ میں درست نام موجود تھا۔

[۵۲] لال چاہ سے جو سید ہا بازار ٹیڑیو کے کٹرہ تک جاتا ہے اُسکے ایک حصّہ کا نام "سرکی والاں" ہے +

یوں تذکرے تو ہیں شعرا کے بہت بہت
لبِ لباب لے لیئے سب کے کلام سے
یہ آپ ہی کا کام تھا احسنت و مرحبا
صحت خراب اور مشاغل ہیں انہماک
تھے محوِ سہو دہر ہیں اہلِ سخن پڑے
فیضِ عمیم آپ کا کرتا ہے نامور
وہ نامراد ٹوٹی تھی جنکی کہ جا کمند
اِس تذکرہ سے اُنکو حیات ابد ملی
اُردو کے شاعروں کی یہ انسائیکلوپیڈیا
ہیں قدر کی نگاہ سے سب اسکو دیکھتے
ہے اپنے آپ فرد یہ مبسوط "تذکرہ
وخمخانہ" ہی کے سیر سے معدوم ہوتا ہے
"خمخانہ" کے اثر سے ہے زاہد بھی میگسار
ہند و مؤلف آپ سا قادر کلام پائے
خالق نے دی ازل سے لیاقت یہ آپ کو
دلکش ہے انتخاب تو پاکیزہ روئداد
پر حیف ہے کہ ساقیٔ خمخانۂ سخن
تاریخ اسکی لکھتا ہوں میں تذکرہ ابد
عنبر کی نظم ہدیہ ہے احباب کے لیئے

"وخمخانہ" لکھنا اور ہی تھا کام کیوں نہ ہو
بیشک وہ آتشہ مئے گلفام کیوں نہ ہو
کیا تذکرہ لکھا ہے سربراہم کیوں نہ ہو
با ایں ہمہ یہ خوبیٔ اہتمام کیوں نہ ہو
روشن کیئے جناب نے سب نام کیوں نہ ہو
اُردو کا گرچہ شاعرِ گمنام کیوں نہ ہو
دوچار ہاتھ قربِ لبِ بام کیوں نہ ہو
مشہوران کا تذکرہ مادام کیوں نہ ہو
اُردو ادب میں قابلِ اکرام کیوں نہ ہو
یہ منعمِ حقیقی کا انعام کیوں نہ ہو
مرغوبِ خاص و منتخبِ عام کیوں نہ ہو
جانسوز کیسا ہی غمِ ایام کیوں نہ ہو
مستِ الست رند مے آشام کیوں نہ ہو
محظوظ پھر تو طبقۂ اسلام کیوں نہ ہو
تقسیم خوب خالقِ قسّام کیوں نہ ہو
پھر سیر اسکی دافعِ آلام کیوں نہ ہو
حصہ کا میرے خم میں ترے جام کیوں نہ ہو
کیا مادہ ہوا ہے یہ الہام کیوں نہ ہو
طرزِ بیاں یہ حملۂ تمام کیوں نہ ہو

اقتباس از تحریر لالہ پرتھوی پال سٹیشن ماسٹر لائٹ ریلوے ریاست گوالیار

میں نے آپکا "خمخانہ جاوید" ایام رخصت میں منشی حب لال صاحب رعد وکیل کے پاس

دیکھا، اسکے دلچسپ ہونیکے نسبت اگر میں کچھ عرض کروں تو میرے قابو سے باہر ہے مگر مختصر عرض کرتا ہوں کہ مجھے اپنے رخصت کے ایام تک کی خبر نہ رہی کہ وہ کب ختم ہوئے اور اسقدر شوق نے طول دیا کہ رات دن سوائے اِس مشغلہ کے کسی دوسرے کام کی فکر تک پیدا نہ ہوئی،

آپنے جو کام کیا ہے وہ ایسا مبارک و شائستہ ہے کہ جس کا ہر اہلِ سخن کو ہزار زبان سے شکریہ ادا کرنا چاہیئے، خصوص ہند و بھائیوں کو جو ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑے تھے، ٹیک چند بہار، چندربھان برہمن، اور راجہ پیارے لال آشفتی مستند فارسی کے شاعر ہوتے ہوئے جب ایک خفیف بہانہ سے آزادانہ صفِ شعرا میں بیٹھنے سے محروم رہے تو آپنے انکے اردو کلام کو ڈھونڈ نکالا اور اُن پر نہایت درجہ کا احسان کیا۔

یہ تو سچ ہے کہ آپکی محنت اور عرقریزی کا اندازہ ہم لوگ نہیں کرسکتے مگر اس کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتے کہ آپنے اپنی محنت سے کہیں زیادہ احسان جماعتِ شعرا پر کیا ہے کہ جسکے بارسے وہ ہزار آزادانہ روش پر بھی سبکدوش نہیں ہوسکتے، اور صرف یہی کیوں آپنے انکو زندۂ جاوید کرنیکے ساتھ ساتھ اپنی محبت عظمت اور کریم النفسی کا نشان روزگار کے دل پر ڈالدیا جو قیامت تک محو یا حک نہیں ہوسکتا۔ ؎

چو خواہی کہ نامت بود در جہان	مکن نام نیک بزرگاں نہان	

بندہ پربھودیال اسٹیشن ماسٹر لائیٹ ریلوے گوالیار ۲۸ ستمبر ۱۹۱۷ء

تقریظ از نتائج افکار گوہر نثار مہر اوج نکتہ دانی ماہ منیر بزم سخندانی مکرمی سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی یادگار حضرت فصیح الملک مرزا داغ مغفور

ادائے شکر ہے لازم تجھے زبانِ سخن	کہاں جہاں میں ہیں پیدا یہ قدردانِ سخن

دُھن کے پکے اور بات کے دھنی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے ہمارے دیرینہ عنایت فرما عالیجناب رائے سرِرام صاحب ایم۔ اے۔ مؤلف تذکرۂ خمخانۂ جاوید ہیں، خوشی ہو، غم ہو، سفر ہو حضر ہو، مرض ہو، صحت ہو، کسی وقت، کسی حال میں تذکرہ کے اضمام تذکرہ کے تک ودو

سے خالی نہیں، بر سبیل تذکرہ ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے، کوئی چار ماہ کا عرصہ ہوا ایک دن اتفاقیہ میں آپکی کوٹھی پر جا نکلا وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ رائے صاحب علیل ہیں، دیکھا تو اسبے دور صاحب فراش پایا، حال پوچھا تو کہا میں عرصہ سے علیل ہوں اور بخار کہنہ ہوگیا ہے، کچھ اوراق ہاتھ میں دیکھ کر آپ سے دریافت کیا کہ یہ کاغذ کیسے ہیں جو نصیب دشمناں ایسی سخت علالت کی حالت میں بھی دیکھے جا رہے ہیں، ارشاد ہوا کہ وہی تذکرہ کے متعلق ہیں، انکو ترتیب دے رہا ہوں، یہ سنکر مجکو حیرت ہوگئی، اور میں سمجھا کہ جس طرح عاشقان الٰہی فنافی اللہ، اور عاشقان نبی فنافی الرسول، اور عشق مجازی کے مبتلا فنافی المعشوق ہوجاتے ہیں، یہ ہمارے مکرم فنافی التذکرہ کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، اللہ غنی اس سرگرمی کا کیا ٹھکانا ہے، مگر یہ اسی سرگرمی کا نتیجہ ہے کہ اتنے بڑے تذکرہ کی یہ تیسری جلد اب ناظرین ملاحظہ کر رہے ہیں، ایسا تذکرہ لکھنا اسی عالی دماغ مؤلف کا کام تھا جسنے اُردو زبان کی بنیاد کو بے انتہا مضبوط کر دیا، افسوس ہے اگر ہمارے اہل ملک ایسے سچے شیفتہ علم ادب کی قدر نکریں، مؤلف کا احسان صرف اُردو زبان ہی پر نہیں ہے بلکہ اُن دس کروڑ اشخاص پر بھی ہے جو اُردو بولتے ہیں، ہماری رائے میں مؤلف کی دماغ سوزی اور جگر کاوی کی داد جیسی ملنی چاہیئے تھی ابھی تک نہیں ملی، خدا نے چاہا تو اب کوئی دن جاتا ہے کہ جس طرح شمع پر پروانے گرتے ہیں اس تذکرہ کے طالب بھی اسی طرح اس پر گرینگے۔

یہ وہ ہے جنس گرانبار خریدار وں ہیں	جسکا ثانی نہیں ملتا کہیں بازاروں میں

منصف نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ ہمارے مکرم ہر دلعزیز مؤلف نے اپنی قابل قدر جوانی اس معشوق دلنشیں کے آراستہ کرنے میں گنوادی ہے اور اپنی اور اپنے والد بزرگوار کی اندوختہ دولت کا ایک بڑا حصہ اسکی تلاش و جستجو میں صرف کر دیا ہے جب کہیں جا کر یہ صورت زیبا مشتاقان حسن معانی کے دیکھنے میں آئی ہے۔

یہ ہیچمدان ذرۂ بمیقدار ہیچ و دزار کمال احسانمندی کے ساتھ جناب مؤلف کی محنت کی

دینے کے بعد اس دعا پر ان سطروں کو تمام کرتا ہے۔

تم سلامت رہو ہزاروں سال	تم سے ملتی ہے داد اہل کمال

تقریظ و تاریخ طبع از فکر رنگین خوش گوئے دکنی شیخ محمد عثمان صاحب شاد سابق اڈیٹر رسالہ آفتاب سخن پونہ معتقد حضرت ظہیر دہلوی

تقریظ کے لکھنے میں جو سرگرم رقم تھا	سجدے میں جبینِ سرِ تسلیم قلم تھا

سبحان اللہ کیا قابل تحسین یہ ریاض پُر فضا ہے۔ اس چمن کی تازگی تازگی کو بلبل سے پوچھا چاہیے اور اس رنگین منظر کو چشم اہل بصیرت سے دیکھا چاہیئے۔ مہر منیر اسکے آبگینوں کا ظہور ہے۔ ہر الماری اسکی تجلی سے نور علی نور ہے۔ ہر کلیجہ شہید تسلیم و رضا ہے۔ ہر دلِ پُر حسرت و تمنا سائل حمد و ثنا ہے۔ جل جلالہ عم نوالہٗ و عظم شانہ و اعظم ذکرہ ٥

للہ الحمد کہ جس چیز کی خواہش تھی کمال	پردۂ غیب سے ظاہر ہوا اب اُس کا جمال

یہ مجھے آج پہلا اتفاق ہے کہ خمخانہ جاوید کی دوسری جلد دیکھنے کے بعد میرے دل میں تیسری جلد کی تقریظ نگاری کا خیال پیدا ہوا ہے۔ میں اسکی تقریظ بھی نہیں لکھ سکتا۔ اور لکھوں تو کیا لکھوں بقول شخصے کہ سورج کو چراغ تلے دکھانا۔ یہ تالیف جو اس وقت میرے سامنے ہے اور جس پر میں کچھ رائے ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے مؤلف کے دلی جذبات کا فوٹو ہے جو خاص دہلی کا رہنے والا اور اُردو زبان کا محقق۔ منصف مزاج جس کے سر پر اقلیم سخن کا تاج۔ لائق۔ فائق۔ عاقل فاضل۔ شاعر نکتہ شناس۔ سخنور روشن قیاس۔ ہم آغوش عروس کمال۔ ناظم نظامی مثال جان بلاغت۔ کان فصاحت۔ سخن گستر سراپا ہو مر۔ آتش زبان فصیح اللسان۔ شاعر خوش بیان شیریں بیان۔ اہل زبان۔ بلاغت عنوان۔ حاتم ہمت۔ فلاطون حکمت۔ والا جناب۔ معلی القاب عالی مقام۔ زیبا خیال۔ رنگین کلام جناب لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے ہے یہ نام سنہری حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے۔ میں مؤلف کو زیادہ داد کے قابل سمجھتا ہوں اس لئے

اس لیئے کہ اسنے زبان اردو پر بہت بڑا احسان کیا اور ہمکو فرض ہوگیا کہ مؤلف کا شکریہ ادا
کریں مگر میں حیرت میں ہوں کہ ایسے الفاظ کہاں سے لاؤں جس سے مؤلف کا شکر ادا کروں
اور احسان سے سبکدوش ہو جاؤں۔ شعرائے ماضی و حال پر احسان کرتے ہوئے ایک
یادگار قائم کردی ہے جو ہماری آیندہ نسلوں کی نظر سے گذریگی۔ ہائے مؤلف نے اپنا
کیسا عزیز وقت ضائع کیا۔ کتنی محنت و مشقت سے کلام۔ حالات شعرا کے جمع کیئے چوبیس
گھڑی قلم دوات کاغذ سے کام تھا۔ اور اپنا عزیز وقت ہماری یاد میں گذارا۔ ہر شاعر کے
کلام پر ایسی رائے ظاہر کی کہ کسی شاعر کو چون وچرا کرنیکا موقعہ نہ ملا۔ شعرائے جہان کے
سر پر وہ احسان کا پہاڑ رکھدیا ہے جس کا حشر تک بوجھ اترنا محال ہے۔ ہم اور شعرائے
مرحوم کی روحیں مؤلف کی محنت کی داد دیتے ہیں اور صدق دل سے دعا دیتے ہیں۔ یا اللہ
جبتک فلک پر شمس و قمر قائم ہیں اس مؤلف کی عمر دراز کر اور خوش و خورم رہے۔ آمین ثم آمین

اس کام کو اگر میں انجام دیتا تو مکرم جناب لالہ سریرام صاحب سے داد طلب ہوتا جن
شعرائے مرحوم کا ذکر پہلی دوسری جلد میں ہوگیا ہے انکی ارواح مؤلف کو دعائے خیر سے
یاد کرتی ہونگی خمخانہ جاوید کی پہلی دوسری جلد باغ پر بہار ہے جسکی ثنا کے لیئے ایک عمر دراز درکار
ہے۔ زبان کی کیا تعریف ہو اور طبیعت کی کیا توصیف ہو۔ انتخاب لاجواب۔ تقریر جوہر شمشیر۔
زباندانی۔ جادو بیانی۔ شاعر کے کلام پر ریمارک۔ اس پر دلچسپ تحریر کسی چلبلے معشوق کی تصویر
بندش میں سلاست۔ مضمون میں متانت۔ کہیں درد۔ کہیں ذکر آہِ سرد۔ کوئی تصویر نوجوانی۔
کوئی طاؤس کا شانی۔ کوئی یوسف کی نشانی۔ کوئی نقش و نگار مانی۔ جلوۂ قدرتِ باری۔
کرم ابر بہاری۔ کہیں توصیف کاکل۔ کہیں ذکر گیسوئے سنبل۔ کہیں بھولی بھالی صورت کہیں
تصویر کیجالت۔ کہیں دلکی بری گت۔ کاغذ اعلیٰ درجے کا۔ چھپائی عمدہ۔ لکھائی نفیس۔ خمخانہ
جاوید کا حرف حرف ستاروں کو جگمگا رہا ہے۔ نقطہ نقطہ روپوں کی طرح چمکتا ہے۔ کاغذ کی
چکنائی کسی معشوق کمسن کے رخسار۔ زبانی تعریف بے سود ہے۔ دیکھیئے تیسری جلد موجود ہے

آخری التجا۔ ہم اخیر میں جناب لالہ سری رام صاحب سے التجا کرتے ہیں کہ تیسری جلد میں اگر خ سے ی تک فیصلہ ہو تو بہتر ہے۔ اب ہماری آنکھیں جناب لالہ سری رام کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ کب تیسرا ایڈیشن چھپکر ہمارے ہاتھ آتا ہے۔ چاردن کی زندگی کا کیا بھروسہ ہے ؎

سہارا کیا لڑکپن کا بھروسا زندگانی کا	چھلک جائے کوہے بھر کر پیالہ زندگانی کا

جب کبھی میں رات کیوقت انسان کی بے ثباتی پر غور کرتا ہوں تو گھنٹوں اس دھن میں خاموش رہتا ہوں۔ معمارِ قدرت انسانی عمارت کو کتنے دنوں میں تیار کرتا ہے۔ اور جب وہ بلندی پر آجاتی ہے تو موت کا سیلاب اُسکو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

اِس غرض سے میں جناب لالہ سری رام صاحب سے باربار التجا کرتا ہوں کہ اس سال میں اگر تیسری جلد چھپ کر نکل جائے تو بہتر ہے تاکہ میں اُسے دیکھکر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لوں اور مؤلف کو دعائے خیر سے یاد کروں اور ڈبل شکریہ ادا کرنے کا مستحق بن جاؤں۔

تاریخ

مؤلف نے ایسا کیا انتخاب
نہیں منہ کسی کا کرے جو شکایت

نرالی ہے بندش نرالا ہے مضمون
ہر اک رنگ میں ہے نرالی یہ رنگت

ہر اک سطر رنگت میں ہے رشکِ سنبل
ہر اک صفحہ ہے رشکِ گلزارِ جنت

مقابل میں حرفوں کے آکر کے چمکے
قمر میں یہ طلعت نہ سورج میں طاقت

شگفتہ ہر اک شعر ہے صورتِ گل
فدا جسپہ سو جان سے مرغانِ جنت

مقابل میں نقطوں کے دیکھو تو صاحب
خجل ہو گئی ہے ستاروں کی طلعت

لکھائی چھپائی مضامین عمدہ
ہر اک صفحہ میں ہے نرالی یہ رنگت

کیا کام ایسا سری رام نے یہ
کہ چاروں طرف ہو گئی خوب شہرت

مطالع سے جو بیس گھنٹے تھا جھگڑا
نہیں کھانے پینے کی تھی اُنکو فرصت

مؤلف کو اشعار ہیں یاد لاکھوں
نہیں دیکھی ایسی کسیکی طبیعت

مؤلف مصنف ہیں جتنے جہان میں
سری رام ایم۔ اے نے لی اُنپہ سبقت

کرے لاکھ کوشش کوئی کچھ نہ ہوگا
سری رام کا ہے وہ رنگِ طبیعت

مؤلف سے دہلی میں ملنا ہوا تھا
یہ میری تھی واللہ خوبیٔ قسمت

نہ بھولونگا ہرگز۔ نہ بھولونگا ہرگز
مجھے یاد ہے آپ کی وہ عنایت

ہزاروں میں لاکھوں میں میں یہ کہونگا
ہے ان میں تو چاہت محبت، مروت

ملاقات کرتے ہیں ہر ایک سے آپ
وہ ملتے ہیں ہر ایک سے با محبت

ہیں لالہ سری رام ایم اے مؤلف
نہیں جن کا ثانی زمانے میں حضرت

کروں کیا سراپا کی تعریف اُنکے
حسینوں میں ہیں وہ حسیں با نزاکت

گدا در پہ آتے ہیں ان کے ہمیشہ
کہ وا رات دن ہے وہ بابِ سخاوت

سخاوت میں بیشک وہ ابن سخی ہیں
شجاعت میں رستم سے بڑھکر ہے طاقت

یہ اک بات ہے قابلِ داد اُن میں
کسی سے نہیں ہے بُرائی عداوت

لکھو شاد یوں مصرعِ سالِ طبع
ٹھکانے لگی نامیٔ محسن کی محنت

قطعہ تاریخ از تراوش قلم جادو رقم شفیقی و کرم گستری نواب مرزا کاظم علیخان صاحب بیرسٹر ایٹ لا متخلص بہ ذہین رئیس شیش محل لکھنؤ

ساقیا! لا شراب انگوری
دھوم رندوں میں ہے بہار آئی

گھر کے گھنگھور ابر آیا ہے
کوئی دم میں برستے ہیں موتی

کس غضب کا ہے سبزہ پر جوبن
اب اگر ہے کمی تو بس مے کی

تاک میں دختِ رز کی بیٹھا ہوں
اُس پری رو کی شاق ہے دوری

عشق میں بس اُسی کے ہوں مبہوت
دل میں ہے درد لب پہ مُہر لگی

خفقاں کچھ ہوا ہے کچھ سودا
مجھ پہ سحر اُس کا چل گیا ساقی

چہرہ پر زردی آج چھائی ہے
نشہ کی ہو گئی ہرن سُرخی

ضبط کرنے کا اب نہیں یارا
کیا کہوں ایسی ہی ہے مجبوری

تشنگی سے مرا جگر ہے کباب　　آتشِ تر کا جام دے جلدی
نظر لطف گر تری ہو جائے　　مے گلگوں کے چشمے ہوں جاری
بارشِ مے وہ ہو کہ چھک جاؤں　　فیض سے تیرے کشتِ دل ہو ہری
دم ترا پھر بہت غنیمت ہے　　بس تجھی تک ہو لطفِ میخواری
رہے آباد تیرا میخانہ　　روز ہی ہو ترقی روز ہی
جام پر جام بھر کے مجھ کو پلا　　حشر کا ڈر نہ فکر جنّت کی
لابرانڈی، کلیبرٹ، ایل مزیل　　وسکی، جن پورٹ شمپین شیری
اب تو عادت مری خراب ہوئی　　طاعتِ حق مجھے نہیں بھاتی
مے پرستی ہے اب تو دین اپنا　　اور مذہب سے مجکو کیا ساقی
حق پرستی کے نور کے بدلے　　چہرہ پر ہو شراب کی سُرخی

قطعہ

آتشِ تر ہے گو حرام ضرور　　اُسکے پینے سے ہونگا میں ناری
حشر میں محتسبہ جو قیامت ہو　　دے بھی دے آج بادۂ باقی
میں نے اسلام کو سلام کیا　　دُختِ رز کا بنا ہوں شیدائی

ق

حشر ہوگا بُرا مگر تقدیر؟　　پیش آئے گی جو ہے پیش آنی
پر یہاں اس چھُوٹنا ہے محال　　خوب جی بھر کے کرلوں ما دہ کشی

ق

تجھ سے تقریر کیا کروں واعظ　　مجھکو لازم ہے یاں پہ خاموشی
تُو نے پی ہوتی گر کبھی بھی مے　　پُوچھتا تب یہ چیز ہے کیسی؟
اِس میں لذت ہے کیا بتا واعظا　　کیوں تو کرتا ہے شغلِ مینوشی
مگر افسوس تو نے پی ہی نہیں　　ورنہ یہ وعظ پھر کہاں ہوتی
خواب میں بھی نہ جسنے دیکھی ہو　　اُس کو کیا قدر مے کشی ہوگی
ساقیا تو مجھے شراب پلا!　　جان واعظ کو بک رہا ہے سڑی

نتیجۂ فکر [illegible]

دے بیر، ہاک ٹام رم اسٹوٹ
اکشا تمبرون اور برکنڈی

پھروں اٹھکھیلیاں کروں مے کی
لوگ دیکھیں تو سمجھیں سودائی

تن بدن کا نہ ہوش ہو مطلق
سرسوں پھولی ہے نظر میں مری

جس سے پردے نظر کے سب اٹھ جائیں
ہو وہ جام جہاں نما ساقی

ساغر مے کو جام جم جو کہا
آسماں کو زمیں سے نسبت دی

کوئی ایسا سماں نظر آئے
جس سے کھل جائے میرے دل کی کلی

جس طرف دیکھ لوں اٹھا کے نگاہ
سامنے آ کھڑی ہو میرے پری

کچھ تعجب کچھ اشتیاق کے ساتھ
اُس سے پوچھوں کہ ای گل خوبی

آج کیوں مجھ کو سرفراز کیا
حال پر میرے کیا عنایت تھی

تجھسا بے رحم اور یہ الطاف
تجھسا بیدرد اور یہ ہمدردی

آج تک تیری دید کو ترسا
میری صورت سے تجھکو نفرت تھی

مسکرا کے جواب دے مجھکو
وُہ ہمارا تھا ناز معشوقی

میرا معشوق ساقیا مل جائے
بس اسی کی ہے اب تو بیتابی

نہ مجھی کو فقط محبّت ہے
اُلفت اسکو بھی مجھسے ہے ایسی

تُو نے دیر اتنی جو لگائی سن
تھی پہاڑ اسپہ ایک ایک گھڑی

تھا میں اسکے لیے یہاں بیتاب
شاق اُسے واں مری جدائی تھی

لا سکی اپنی گو زباں پہ نہ کچھ
دل ہی دل میں وہ پیچ کھایا کی

بن پڑی جب اسے نہ کچھ تدبیر
خون شیشے میں ہو گئی وہ پری

مجھکو لکھنا ہے قطعہ گرما گرم
نشۂ مے کی چاہیئے گرمی

مست ہو کے دو آتشہ مے سے
کہہ دوں اِک ایسا قطعہ تاریخی

جس میں ہجری ہو اور آلہی سال
بکرمی اور عیسوی فصلی

شور چاروں طرف اسی کا ہے
کیا سری رام کی کروں تعریف
شاعر بے نظیر خوش تقریر
با مروّت خلیق و نیک و سیر
اُن کا لاہور میں بھی شہرہ ہے
درحقیقت کیا اُنھوں نے کمال
جو جو اس میں اُٹھائی ہے تکلیف
کوئی کہدے کہ ایسا گلدستہ
شاہد طبع سے مخاطب ہو
لا سری رام کی کتاب ای شوخ
۱۹۱۲ء
مظہر اہل علم - اختر حسن
سنہ ۱۳۲۱ الہی سنہ ۱۳۱۹ فصلی

لالہ صاحب نے کتاب لکھی
گر بہت بھی لکھوں نہ ہو کافی
صاحب علم اور فہیم و ذکی
کیوں نہ نازاں ہو آپ پر دہلی
چشمۂ فیض واں بھی ہے جاری
خوب گوندھی ہے موتیوں کی لڑی
یہ وہی جانے جس پہ ہو گذری
ایسا خمخانہ بھی چھپا ہے کبھی
کہہ اُٹھا میں یہ قطعہ تاریخی
تشت پُر نور جام جمشیدی
سمبت ۱۹۶۹ بکرمی
پارۂ دل ذہین سیا گرنی
سنہ ۱۳۳۰ھ
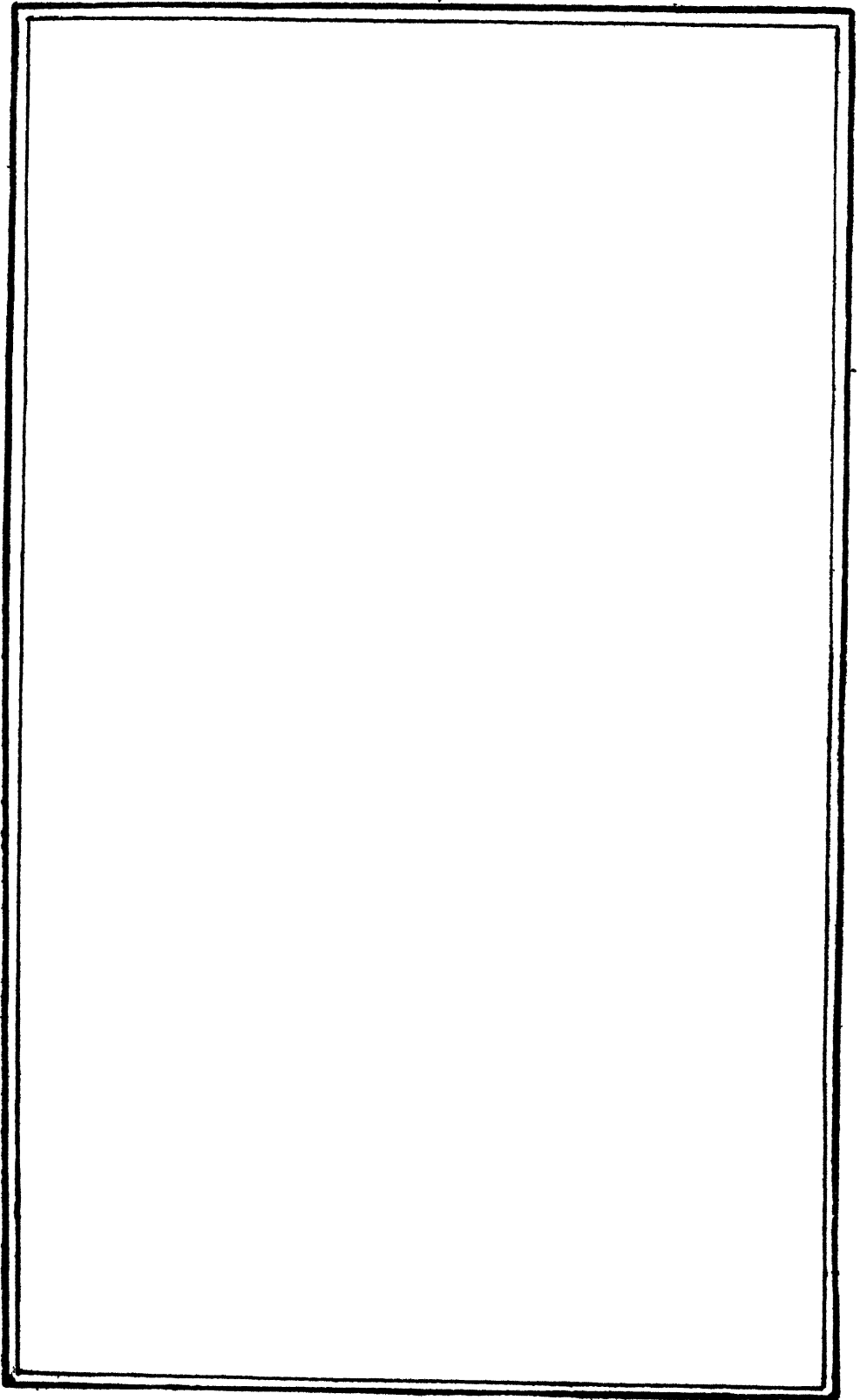
فہرست کتب نادرالوجود موجودہ دفتر خمخانہ جاوید۔ شہر دہلی

ضمیمہ یادگار داغ بلبل ہندوستان فصیح الملک نواب مرزا خان صاحب داغ مرحوم دہلوی کی آخری نغمہ سنجیوں کا دلچسپ و قابل قدر مجموعہ جسکو لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے نے بصرف زر کثیر مرزا کے مرحوم کے ورثا سے حاصل کرکے مرتب کیا۔ اس نایاب مجموعہ میں ستر غیر مطبوعہ غزلیں ہیں۔ قیمت فی جلد ۸ر

دیوان انور سید شجاع الدین حسین عرف امراؤ مرزا۔ انور دہلوی کا قابل دید کلام۔ جو بڑی محنت و تلاش سے مولف تذکرہ خمخانہ جاوید نے مرتب کرکے شائع کرایا ہے۔ آپ ظہیر مرحوم کے چھوٹے بھائی اور دہلی کے مشہور اساتذہ میں تھے۔ لکھائی۔ چھپائی صاف۔ ضخامت ۱۱ جزو۔ قیمت فی جلد ۱۲ر

تذکرہ ہزار داستان معروف بہ خمخانہ جاوید در سہ جلد چونکہ یہ تذکرہ فرط شہرت سے کسی تعریف یا توصیف کا محتاج نہیں رہا۔ اسلئے سب طرف سے قطع نظر صرف قیمتوں کی تصریح کردینی ضروری ہے۔ جلد اول کاغذ و کتابت نفیس ضخامت زائد۔ ۵ جزو۔ قسم اول مجلد صہ قسم دوم مجلد للعہ بلا جلد ہے۔ **جلد دوم**۔ مجلد قسم اول چار روپیہ آٹھ آنہ (للعہ) قسم دوم ہے۔ بلا جلد عہ ار

جلد سوم فی جلد مجلد پانچ روپیہ۔ بلا جلد چار روپیہ (للعہ)

مہتاب داغ حضرت فصیح الملک داغ دہلوی کا تیسرا دیوان جو ۱۸۹۳ء میں مرزا داغ مرحوم نے دکن سے شایع کیا تھا اور جس کی قیمت پانچ روپیہ مقرر تھی۔ اور جو عرصہ سے بالکل نایاب تھا۔ اب دوبارہ لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے مولف تذکرہ خمخانہ جاوید نے باخذ حق تصنیف زر کثیر خرچ کرکے شایع کیا ہے لکھائی۔ چھپائی صاف و روشن۔ کاغذ سفید چکنا و دبیز جس پر کلام بھی نور علی نور ہے۔

قیمت قسم اول تین روپے (سعہ) قسم دوم دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ) بلا ضمیمہ +

نوٹ مندرجہ بالا کتب کی ۵ جلدوں کے خریدار کو ۲۰ فیصدی کمیشن دیا جائیگا زائد کتب کے لیئے بذریعہ خط کتابت فیصلہ ہوسکتا ہے۔

المشتہر سری رام۔ ایم اے نمبر ۱۷ علی پور روڈ دہلی